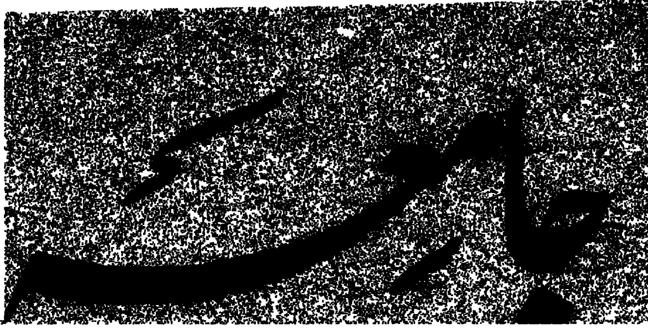


مکتبہ جامعہ دہلی

پیام تعلیم (سالنامہ)

سال گرہ نمبر کی تیاریاں شروع ہوگئیں ابھی یہ خاص نمبر ہر اعتبار سے بچوں کے
لٹریچر میں ایک نئی [illegible]

اس میں صرف وہی چیزیں نہ ہوں گی جنھیں بچے چند دن میں پڑھ کر رسالہ الماری میں رکھ دیں بلکہ وہ سال بھر تک ان کے ہاتھوں میں رہے گا۔ وہ انھیں بتائے گا کہ پڑھنے سے علاوہ کون کون سے مشغلے ان کے لئے مفید ہیں اور وہ اپنے ہاتھ اور دماغ کی کوشش سے کیسی کیسی اچھی مفید اور دلچسپ چیزیں بنا سکتے ہیں۔

کتاب نما

ادب اردو کے شائقین کے لئے مکتبہ جامعہ کا یہ رسالہ بہت ضروری ہے۔ تمام جدید کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے سے ہمیشہ مل سکتی ہے کسی قابل ذکر ادارے اشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں۔ کتاب نما پڑھ کر اردو ادب کی رفتار ترقی سے واقف رہیں گے۔ (چندہ سالانہ صرف ۸)

مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرِ ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے، پی ایچ، ڈی

جلد ۳۰ | جولائی سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

۱-	بچہ کی اخلاقی تربیت	جناب سعید انصاری صاحب بی اے جامعہ ایم اے کولمبیا	۳
۲-	جناح ہنر خط کتابت	ایک مسلم سوشلسٹ۔ دہلی	۱۱
۳-	ہندوستان کی تجارت خارجہ	جناب محمد عمر صاحب متعلم بی اے جامعہ	۲۷
۴-	غزل	حضرت جگر مرادآبادی	۵۰
۵-	روزِ جزا، (۲)	جناب سید نصیر احمد صاحب جامعی لاہور	۵۱
۶-	اقبال کی یاد	جناب آل احمد صاحب سرور ایم اے	۶۴
۷-	تنقید و تبصرہ	م - ع - غ -	۷۶
۸-	رفتارِ عالم	م - م	۷۸
۹-	تعلیمی دنیا	جناب عبد الغفور صاحب ایم اے	۸۵

اعتذار

گذشتہ پرچے میں فہرست مضامین کے سلسلہ میں دو بڑی غلطیاں ہوگئیں جن کا ادارہ کو بہت افسوس ہے '

۱ - حکیم ٹالسٹائے کے اعترافات ' غلام ابرار صدیقی صاحب آخر بی ۔ اے (علیگ) کا ترجمہ ہے ۔

۲ - دنیا - خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کا مضمون ہے ۔

ہم ان حضرات سے معذرت چاہتے ہیں کہ ان کے اسمائے گرامی رسالہ میں درج نہیں ہوسکے ۔

مدیر

بچہ اور اس کی اخلاقی تربیت

سعید انصاری صاحب پرنسپل استادوں کا مدرسہ جامعہ دہلی، نے امریکہ
سے واپس آکر بچوں کی تربیت و تعلیم پر ایک کتاب لکھنا شروع
کی ہے جس کے چند صفحے رسالہ جامعہ کو عنایت ہوئے ہیں
امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ "مدیر"

اگر بچے کی اخلاقی تربیت صرف چند کاموں کے کرنے یا کرنے کا نام ہوتا تو یہ بڑا آسان کام تھا کہ ایسے کاموں کی فہرست بنا کر دے دی جاتی اور سارا معاملہ حل ہو جاتا۔ لیکن اخلاقی تربیت اور بچے کی ساری زندگی میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ جب تک بچے کے اور میلانات اور اس کی زندگی کے دوسرے اثرات کو پیش نظر نہ رکھا جائے، اس کی تربیت صحیح طور پر نہیں کی جا سکتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب صحبت کے اثر کو اخلاق کے بننے یا بگڑنے میں بڑا دخل سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے لیکن آج ایسا ضروری نہیں کہ بچہ بروں کی صحبت میں برا ہی ہو اور اچھوں کی سنگت میں اچھا ہی ہو جائے بلکہ اور بہت سے عوامل خود اس کی زندگی کے اندر اور اس سے خارج ایسے ہیں جو اس کو برا یا بھلا بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صحت کے معاملے کو لیجئے۔ ایک بچہ جس کی صحت اچھی نہ ہو، اس کی قوت ارادہ بھی کمزور ہو گی اور وہ برے میلانات کا شکار صحت مند بچے کے مقابلہ میں آسانی سے ہو جائے گا۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس قسم کے اثرات قابو میں لائے جا سکتے ہیں اور انھیں صحیح راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے اثرات میں سے ایک بہت موثر اثر علم اور واقفیت ہے بعض وقت بچے غلط راہ پر لگ جاتے ہیں اس لئے کہ وہ صحیح راستہ نہیں جانتے ۔ لیکن جدید نفسیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ صرف صحیح علم کافی نہیں ہے بلکہ صحیح میلان بھی ہونا چاہئے۔ جب تک بچہ خود بہتر نہ بننا چاہے اس کے سامنے

غرار انبیاء اور مصلحین کی سیرت کا خاکہ پیش کیجئے۔ بے سود ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ بچہ ایسا ہونا کیوں نہیں چاہتا؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے دل میں اس سے کوئی قوی تر جذبہ کام کر رہا ہے ایسی صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی جذبے کی کارفرمائی ہوگی جس کے نما کا سب سے زیادہ موقع ہوگا لہٰذا عادت کو بھی سیرت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کو تنہا اس کی سیرت کے بنانے یا بگاڑنے کا اختیار نہیں ہے

اسی طرح صحت جسمانی کو بھی بچے کے اخلاق میں دخل ہے۔ بچے اگر تھکے ماندہ ہوں تو اُن سے ہمدردی کے اظہار کی کم توقع رکھنی چاہئے۔ آج کل تمام اچھے مدرسوں میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بچوں پر زیادہ زور نہ پڑے۔ بعض وقت ہم کسی بچے کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کاہل ہے حالانکہ بہت ممکن ہے اس غریب کو پیٹ بھر کھانا نہ ملا ہو۔ آج کل دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں بچوں کی عدالتیں ان پر فوراً قرار داد جرم لگا دینے کی بجائے طبیب اور ڈاکٹر رکھتی ہیں جو ان کی جسمانی صحت کا حال معلوم کرنے کے بعد انہیں مجرم یا غیر مجرم قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح لڑکوں کے جنسی اخلاق کے متعلق فوری فیصلہ کرنے کی بجائے اگر ہم یہ دیکھیں کہ کہاں تک اس کی عام صحت اس کی غذا اس کے سونے جاگنے کے اوقات اور اس کے کھیل کود کو اس میں دخل ہے تو شاید ہم اپنے فیصلے میں زیادہ صحیح ہوں۔ سب اخلاق جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بچے کی عام زندگی کو صحیح طور پر نشو و نما دینے سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہے

اس بنا پر تربیت اخلاق کے تین طریقے ہو سکتے ہیں (۱) ایسی باتیں جن سے بچے میں بُری چیزوں سے نفرت اور اچھی چیزوں سے الفت پیدا ہو، ہمیں اختیار کرنی چاہئیں (۲) یہی تمام واقفیتیں جن سے انسانی زندگی کے سمجھنے میں مدد ملے، بچے کے لئے مفید ہو سکتی ہیں (۳) ایسی تربیت جس سے بچے اپنی معقول اغراض پوری کر سکیں زندگی کے بنانے میں بہت مدد دے سکتی ہیں

قبل اس کے کہ ہم بچوں کی سیرت میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کی کوشش کریں، پہلے یہ دیکھیں کہ اُن کے غلط میلانات کو کس طرح راہ راست پر لایا جا سکتا ہے بعض بچوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ننھے ننھے پرندوں کا شکار کرتے ہیں اور انہیں ان معصوم جانوں کے لینے پر ذرا افسوس نہیں ہوتا۔ ان بچوں کے لئے اس سی

کوئی فائدہ نہیں کہ انھیں معصوم جانوں کے لینے پر گناہ سے ڈرایا جائے، یا انھیں زجر و توبیخ کی جائے بلکہ بہترین صورت یہ ہے کہ ان کے اس شوق کو پرندوں کی تصویریں بنانے اُن کے رہنے سہنے کے متعلق حالات معلوم کرنے اور پھر انھیں دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی طرف مائل کیا جائے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ ایک جذبے کو دوسرے سے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اس کے جماعتی احساس کو ابھار کر اسے قریب قریب بالکل روک دیا گیا ہے۔

اس طرح بعض تخریبی جذبات سے کام لے کر ہم اخلاق کی تربیت بھی کر سکتے ہیں مثلاً ایک بچے کو سگریٹ یا بیڑی پینے کی عادت پڑ گئی ہے اور وہ کسی طرح نہیں چھوٹتی ہے۔ آپ ہزار سگریٹ کی برائیاں بتائیں لیکن وہ ہے کہ اس لت سے باز نہیں آتا۔ وہی بچہ اگر کھیل کود کا عاشق ہے اور آپ اُسے ذرا یہ سمجھائیں کہ اس سے ٹیم میں تمھارا درجہ بہت کم ہو جائے گا، اس لئے کہ اس سے سینہ کمزور ہو جاتا ہے۔ پھر دیکھئے کہ وہ کبھی اس کے قریب بھی نہ جائے گا۔

بچے کی زندگی میں ایک بڑی موثر چیز شخصی مثال ہوتی ہے۔ ہزار وعظ و پند کے مقابلہ میں شخصی مثال . . . کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے بچے شروع شروع میں تو ایسے شخصوں کی مثال سے اثر لیتے ہیں جنھوں نے دلیری، بہادری اور جاں بازی کے کارنامے کئے ہیں۔ آگے چل کر بڑے بڑے مصلحین اور پیمبروں کے حالات سے اثر لیتے ہیں والدین اور استادوں کو چاہئے کہ بچوں کو شروع ہی سے نہ صرف ایسے لوگوں کے حالات زندگی پڑھانے پر اکتفا کریں بلکہ ممکن ہو تو انھیں زندہ مختلف قسم کی بڑی بڑی شخصیتوں سے براہ راست ملنے جلنے کے مواقع بہم پہنچائیں تاکہ وہ ان سے اپنے نمونے کا انتخاب کر سکیں۔

بچوں میں ایک بڑا جذبہ امتیاز حاصل کرنے اور نمایاں ہونے کا ہوتا ہے کھیل کے میدان میں اگلی صف کے کھلاڑیوں میں ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ گیند کو گول میں پہنچا سکے لیکن ہر ایک کو برابر کا موقع نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں کھلاڑی کو یہ چاہئے کہ وہ ٹیم کی خاطر شخصی امتیاز کو قربان کر دے اور گیند دوسرے ساتھی کو دے دے جس کو اس سے بہتر موقع حاصل ہو۔

بچوں میں اسی طرح یک جماعتی جذبہ بھی بہت قوی ہوتا ہے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُن کی ٹولیاں ہوتی ہیں اور یہی ٹولیاں بعض وقت ناپسندیدہ مشاغل میں شہرت حاصل کر لیتی ہیں۔ لڑکوں کے اس جذبے کی بنا پر اُن کی اچھی اچھی مجلسیں اور انجمنیں بنائی جا سکتی ہیں جو نہایت مفید کام انجام دے سکتی ہیں۔ اسی طرح ان میں ٹیم اور اسکول کی محبت کا جذبہ بھی موجود ہوتا ہے جو آگے چل کر قوم اور وطن کے جذبے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہی تربیت ہوتی ہے جو وقت آنے پر انسان سے بڑی بڑی قربانیاں کرا لیتی ہے۔

ہمدردی اور رحم کا بھی ایک جذبہ بچہ میں شروع ہی سے ہوتا ہے، اب سوال محض عادت کا رہ جاتا ہے کہ بچے میں اس جذبے کے ماتحت اس سے کام لیا جائے۔ بچوں کی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع پیش آتے ہیں مثلاً ایک کے پاس کئی کھلونے ہیں اور دوسرے کے پاس ایک بھی نہیں۔ وہ اپنے ان کھلونوں میں سے دوسرے کو دے سکتا ہے یا ایک مٹھائیوں سے بھرا ڈبہ ہاتھ میں لئے ہوئے ہے، اور دوسرا منہ تک رہا ہے۔ نہایت آسانی سے اُسے اس پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے کو بھی شریک کرے۔

اب ان کے علاوہ کچھ اور مواقع آتے ہیں جہاں اخلاق پر ناگوار اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے ہمیں چاہیئے کہ بچوں کی زندگی میں اُن سے پرہیز کریں تاکہ اخلاقی قوت اور مضبوط ہو۔ مثلاً اکثر بچے کسی نیک کام کے اس بنا پر عادی ہوتے ہیں کہ اُنھیں والدین یا استاد کی طرف سے شاباشی ملے گی۔ نیک کام خود اپنا اجر ہے اور بچے بھی شروع سے اسے محسوس کرتے ہیں ہمیں چاہیئے کہ ان کے اس احساس کو اور قوی کریں۔ بجائے اس کے کہ انھیں تحسین و آفریں کا عادی بنائیں۔

اسی طرح اکثر وہ کئی کام سے اس لئے باز رکھے جاتے ہیں کہ انھیں مار پڑے گی یا اُن کا ناشتہ بند ہو جائے گا۔ بچوں کے اندر اسی عمر سے اعتماد اور عزت نفس کے شریف جذبات بھی موجود ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ان جذبات سے اپیل کی جائے؟ بہت کم امکان ہے کہ وہ نہ سُنیں، اور اگر ایک بار نہ سنیں تو دوسری بار کوشش کی جائے۔ کوئی بچہ اپنے لئے ذلیل اور رسوا ہونا پسند نہ کرے گا۔

سیرت دراصل عادت سے پختہ ہوتی ہے۔ ایک بات کا کرنا اور بار بار کرنا سیرت کو پختہ کرتا ہے۔ پابندیٔ وقت، ایفائے وعدہ، ذمہ داری کا احساس، ہمت اور استقلال کون نہیں جانتا کہ یہ سب اچھی خصلتیں ہیں لیکن سیرت کے اندر ان کا جم جانا صرف عادت سے ہو سکتا ہے۔ عادت ہر صفت کی اور ہر حالت میں ہونی چاہیے۔ ممکن ہے ایک بچہ مدرسے تو وقت پر آئے لیکن جب آپنے کسی ساتھی کے ہاں آنے کا وعدہ کرے تو آدھ گھنٹہ دیر کر کے آئے یا اگر کسی دوست کی کتاب واپس کرنی ہے وہ تو کر دیتا ہے لیکن جلسے کے سلسلے میں ایک کام اپنے ذمے لیا ہے اور اُسے پورا کرنے سے بھاگتا ہے لہٰذا بچوں کے اندر ان تمام اخلاق حسنہ کی ہر حالت میں عادت ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ صرف ان کا علم ہونا کافی نہیں۔

ایک اور خرابی تربیت اخلاق کے سلسلے میں یہ ہے کہ وہ تعلیم سے علیحدہ کوئی جداگانہ شئے سمجھ لی گئی ہے۔ اب تک تعلیم ایک اور چیز تھی اور تربیت ایک دوسری شئے سمجھی جاتی تھی تعلیم کا کام ذہن اور علم سے تھا اور تربیت کا تعلق دل اور عمل سے لیکن اب جدید تعلیم میں یہ تصور بالکل بدل گیا ہے۔ بچوں کو بیشتر کام مدرسے کے اندر ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً باغبانی کے سلسلے میں پھولوں کو پانی دینا، کیاریاں بنانا، ڈرامے کے لئے اسٹیج تیار کرنا، قطب کی سیر کا پورا اہتمام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان میں محنت کرنے کی عادت، محنت کرنے والوں کی قدر، اشتراک عمل، ذمہ داری اور بہت سی اخلاقی خوبیوں کی تعلیم ہو جاتی ہے۔

بعض اچھے مدرسے اور ایک قدم اس سے آگے جاتے ہیں، وہ مدرسے کا پورا انتظام اُن کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے بُرے بھلے کی ذمہ داری سب اُن کے سر ڈال دیتے ہیں ایسی صورت میں بچے نہ صرف اس مدرسے کو اپنا مدرسہ سمجھنے لگتے ہیں بلکہ وہ ایک پورے ادارے کا بار بھی اپنے کندھوں پر اُٹھا لیتے ہیں اور وہ نہ صرف اشتراک عمل کا سبق اس سے سیکھتے ہیں بلکہ ایک ذمہ داری کا احساس بھی اُن کے اندر ترقی پاتا ہے۔

لیکن اس قسم کے اجتماعی کاموں میں ایک کمزوری ہوتی ہو تو یہ کہ اُن کی پشت پر کوئی نہ کوئی قوت ہوتی ہے جو ناکامی کے وقت اُن کا سہارا بن جاتی ہے بچوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں پر ایسے تجربات کا عادی بنایا جائے جب اُن کے خطرے کا کوئی سہارا نہ ہو بلکہ اس خطرے سے ایک یا دو

گذر بھی جائیں کہتے ہیں کہ اچھا تیراک وہ ہوتا ہے جو ایک دو دفعہ غوطے کھا چکا ہو۔ مثال کے طور پر بچوں کے پیسے کوڑی کا معاملہ لیجئے۔ والدین بچے کے ہاتھ میں روپیہ پیسہ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ وہ نہ صرف اڑا ڈالے گا بلکہ کہیں بد عادت بھی نہ ہو جائے لیکن ایسے ہی بچے ہوتے ہیں جب بڑے ہونے پر یا والدین کے مرجانے پر جہاں دولت اُن کے ہاتھ میں پڑتی آناً فاناً غائب ہوگئی اور وہ خود بھی اس کے ساتھ تباہ ہوئے والدین کو چاہیئے کہ وہ شروع ہی سے بچوں پر اعتماد کریں اور پیسہ کوڑی سب کچھ اُن کے ہاتھ میں دیں تاکہ وہ ضائع کرکے اس کی قدر کرنا سیکھیں۔

اسی طرح ہمارے اجتماعی کاموں کا حال بھی ہوتا ہے مدرسے کی پوری ذمہ داری گو وہ اپنے سر لیتے ہیں، لیکن وہ اسے بگاڑ نہیں سکتے۔ ہمیں چاہیئے کہ اُنھیں ایسے کام دیں جنھیں وہ چاہیں تو بگاڑ بھی سکیں اور اس کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ مثلاً کوئی رسالہ نکالنا، جلسہ منعقد کرنا، ڈرامہ کرنا اس میں انھیں پورا اختیار ہو کہ وہ خواہ بنائیں یا بگاڑیں۔ اور اگر بگاڑ بھی دیں تو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ اور سچ پوچھئے تو جو کام وہ بگاڑ کر بنا نا سیکھتے ہیں اس کے اعتماد اور قوت کا کیا کہنا؟

اخلاق کی تربیت میں ہم کو چند باتوں کا اور خیال رکھنا چاہیئے ایک تو یہ کہ جن اوصافِ حسنہ کی ہم بچے کو تلقین کرنا چاہتے ہیں وہ اُن کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھتا بھی ہو۔ صرف اطاعتِ مطلق کی عادت ڈالنا کافی نہیں۔ اس سے اس کے اعمال میں جو زندگی اور اس کی روح میں جو تازگی پیدا ہوگی وہ اطاعتِ مطلق سے ہرگز نہیں ہوسکتی جو بچہ جانتا ہے کہ کس طرح اس کے دیر میں آنے سے ساری جماعت کا نقصان ہوگا، اس پابندیٔ وقت اور اس کی جو صرف تعمیل حکم کے خیال سے وقت پر آتا ہے، بہت فرق ہوگا۔

اسی طرح تلقینِ حسنہ کے سلسلے میں اگر عمومی نصائح کی بجائے مخصوص ہدایت کی جائے تو اس کا بہت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً سچ بولنا نہایت اچھی بات ہے۔ اس کی بجائے اگر ہم یہ تلقین کریں کہ جب تم اپنا کام گھر سے کرکے نہ لاؤ تو جو وجہ ہو، سچ سچ استاد کے سامنے بیان کردو، تو غالباً اس کا زیادہ اثر پڑے گا۔

اسی طرح اخلاق کی تعلیم میں ہمیشہ نہی مفید نہیں پڑتی ہے۔ آپ نے کبھی سردی سے دانت
بجتے دیکھے ہیں۔ اگر آپ اس سے ہزار کہیں کہ دانت مت بجاؤ۔ برا لگتا ہے لیکن وہ نہیں باز رہ سکتا
ہے پر اگر یہ کہیں کہ دانت دبالو، تو دانتوں کا بجنا فوراً بند ہو جائے گا۔ یہی حال بعض وقت بچوں
کا ہوتا ہے۔ انھیں کسی کام سے منع کیجئے وہ نہیں رکیں گے۔ لیکن اگر کوئی اور بات کرنے کو کہئے
تو وہ فوراً اس سے باز آجائیں گے۔

علاوہ اس کے بچوں کے سامنے ایک اچھی زندگی کا یہ تصور آجاتا ہے کہ فلاں بات نہ کرو، فلاں
سے پرہیز کرو۔ ایسی زندگی کا تصور انسان کی سیرت کو بہت کم زور بنا دیتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ابتدا
ہی سے ایک اچھی زندگی کا تخیل پیش کریں جس میں فلاں فلاں باتیں کرنی ہیں۔ مثلاً جھوٹ سے نفرت
دلانے کی بجائے سچ کی خوبیوں پر زور دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

تربیتِ اخلاق کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا اور ضروری ہے ایک تو یہ کہ کہنے والا کون
ہے اور دوسرے یہ کہ باتیں کس وقت کہی جاتی ہیں بعض وقت اچھی سے اچھی باتیں اگر کہنے والے
کی عزت بچے کے دل میں نہیں ہے تو بالکل بے اثر رہتی ہیں۔ پھر اس طرح کہنے کا وقت بھی ہوتا ہے۔
دن کے ہنگامے میں جب کہ دماغ مختلف خیالات کے اندر مصروف رہتا ہے، بہت ممکن ہے کہنے
کا کچھ اثر نہ ہو۔ لیکن رات کو سوتے وقت یا اور ایسے وقت جب طبیعت میں یکسوئی ہو نصیحت کا
بہترین موقع ہوتا ہے۔

اسی طرح کہنے کے طریقے میں بھی ایک بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ باتیں اشارۃً کہی جائیں
براہِ راست کہنے کا نہ صرف برا اثر بلکہ بعض وقت الٹا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً سگریٹ پینے پر یوں کتنا ہی سخت
سست کہو لیکن کھیل کے وقت اس کی خرابی کا ذرا اشارہ ممکن ہی بہت اچھا اثر کر جائے۔ بڑوں کی طرح
چھوٹوں میں بھی اپنی خوبی اور خرابی کا احساس ہوتا ہے، اگر ہم اس احساس سے ذرا کام لیں تو بعض وقت
وہ کام نکل سکتا ہے جو براہِ راست پند و نصائح سے شاید ممکن نہ ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ اخلاق کی تعلیم مدرسوں کے اندر دینی چاہئے یا نہیں؟ اس کا جواب ہاں اور

نہیں دونوں میں ہوسکتا ہے۔ اخلاقی تعلیم سچ پوچھئے تو سب مضمونوں میں آسکتی ہے۔ زبان و ادب کو لیجئے اس میں ایسے قصے اور افسانے لے سکتے ہیں جن کا اثر بچوں کی سیرت پر بہت اچھا پڑسکتا ہے اس طرح تاریخ میں علاوہ اس کے کہ وہ انسانی کارنامہ ہے۔ اس سے بچوں کے دلوں میں ہمت اور بہادری، عزم اور استقلال، ایثار اور قربانی وغیرہ کے جذبات کی پرورش کی جاسکتی ہے۔ بڑے اشخاص کی سوانح عمریوں سے تو بہت کچھ سبق براہِ راست حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جغرافیہ اور سائنس سے بھی انسانوں کی خدمت اور راحت رسانی اور اس طرح کے دوسرے سبق مل سکتے ہیں

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اخلاق کی تعلیم علیحدہ ہو یا یوں ہی محض ضمنی طور پر رکھی جائے اس میں خرابی اور اچھائی دونوں ہیں۔ علیحدہ مضمون کے طور پر رکھنے میں یہ اگر کسی ایسے اُستاد کے ہاتھ میں پڑگئی جو اس کے لوچ لچک سے واقف نہیں تو پھر یہ ایک بے روح مضمون ہوکر رہ جائے گی اور اس سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا۔

اخلاق کی تعلیم میں ایک بڑا کام تیوہاروں اور قومی اجتماعوں سے لیا جاسکتا ہے جبکہ بچوں کے جذبات قبولِ اثر کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر عید کی خوشی میں دوسروں کا غم بھی یاد دلایا جاسکتا ہے۔ محرم میں امام حسینؓ کی شہادت جہاں حق کی فتح کا وہاں دسہرے میں رام چندر کی لنکا پر چڑھائی ناحق کی مغلوبیت کا سبق دیتی ہے۔ قومی اجتماعوں سے شہدائے وطن کی یاد تازہ کی جاسکتی ہے اور یہ سب اخلاق کی تربیت و تعلیم کا بہترین ذریعہ ہیں۔

جناح نہرو خط کتابت

اور

مسلمانوں کے لئے آئندہ پروگرام

جناح نہرو خط کتابت پر ذیل میں ایک مسلم سوشلسٹ نے تنقید کی ہے، اس موضوع پر کوئی اور بزرگ بھی بحث کرنا چاہیں تو ہم اس کو بڑی خوشی سے جامعہ میں جگہ دیں گے۔

(مدیر)

جناح نہرو کی خط کتابت کے شائع ہونے کا بڑا چرچا بہت دنوں سے تھا آخر شائع ہو ہی گئی مسٹر جناح نے تو اپنی طرف سے اس کے شائع کرنے پر کبھی اصرار نہیں کیا البتہ جواہر لال جی اور ان کے رفقا اسے شائع کرنے کے لئے بہت بے چین معلوم ہوتے تھے لیکن اس کی اشاعت جن حالات اور جس موقعہ پر ہوئی ہے اس کے لئے جواہر لال جی اور ان کے رفقا بھی راضی نہیں تھے پریس کے کسی ستم ظریف نمائندہ نے کسی طرح اس خط و کتابت کی نقل کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر سے اڑالیا اور اخبارو کو اشاعت کے لئے دے دیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی اشاعت کو روکنا بھی چاہا۔ لیکن پریس والے اس مزیدار خبر کو کیسے دبا کر رکھ سکتے تھے۔ بہر حال جن لوگوں کو اس کی اشاعت سے نئے انکشافات کی امید تھی انھیں یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔

جواہر لال جی اور مسٹر جناح کے نقطہ نگاہ میں جیسا جواہر لال جی کو خود اعتراف ہے بڑا فرق ہے۔ وہ مسائل پر بحث آزاد ہندوستان کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ برطانوی حکومت کی موجودہ ماتحتی کو وہ تسلیم نہیں کرتے اور کسی ایسے سمجھوتے کو جس کی بنیاد اس عارضی زمانہ کے حالات پر ہو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ دوسری بات جو ان کے دماغ پر اس وقت پوری طرح پر قبضہ کئے ہوئے ہے وہ موجودہ بین الاقوامی صورت حالات اور جنگ کا خطرہ ہے جن کا ان کے خیال میں ہندوستان اور اس کی

جنگ آزادی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اسے سب سے زیادہ اہمیت دینا چاہتے ہیں اور باقی امور ان کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسری بات عوام کے اقتصادی مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی غریبی اور بے کاری کا سوال۔ ان کا خیال ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ سوال سب سے زیادہ ضروری ہے جب تک اس کا حل دریافت نہیں کیا جائے گا ہماری جدوجہد فضول ہے۔

مسٹر جناح اس مکمل آزادی کو جس کا پنڈت جواہر لال خواب دیکھتے ہیں ایک ڈھونگ اور ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ جہاں تک لفظی جمع خرچ کا تعلق ہے انھوں نے بھی مسلم لیگ کا نصب العین مکمل آزادی قرار دیدیا ہے اور وہ کانگریس سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن موجودہ دستور کے صوبجاتی حصہ کو قبول کر کے ملے چلانا اور وفاق میں اگر چند ترمیمیں ہو جائیں تو اسے منظور کرنے کے لئے آمادگی کا اظہار کرنا ایسے طریقے نہیں ہیں جن سے مکمل آزادی کو حاصل کیا جا سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ نہ کانگریسی سرمایہ دار مکمل آزادی چاہتے ہیں اور نہ مسلم لیگ کے رہنما اس کا حوصلہ کر سکتے ہیں۔ مکمل آزادی کا دعویٰ کرنے کے لئے کچھ اہلیت ہونی چاہئیے۔ اس دعوےٰ کو منوانے کے لئے قوت چاہئیے۔ اور وہ اس کلجگ میں ہنسا (تشدد) کی ہی قوت ہو سکتی ہے اور اگر واقعی سرمایہ دار ہندو جو برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں پھلے پھولے اور پروان چڑھے ہیں مکمل آزادی کے لئے تیار ہیں تو مسلمان جنھوں نے اپنا سب کچھ برطانوی حکومت میں کھو دیا ہے اور اگر وہ سوچیں تو اپنی زنجیروں کے علاوہ اب کوئی اور دوسری چیز ان کے پاس کھونے کے لئے باقی نہیں رہی ہے تو انھیں مکمل آزادی میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔

یہی حال موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال اور جنگ کے خطرے کا ہے۔ جنگ سے وہ ڈرے جس کے پاس دولت ہو، عزت ہو قیمتی جان ہو، یہاں تو صورت یہ ہے ؎

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال

ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

اس کی فکر بھی ہندو سیٹھوں کو ہی ہونا چاہئیے۔ ہمارا جنگ کیا بگاڑ سکتی ہے۔ لے دے کے ایک جان ہے سو وہ گھل گھل کر آہستہ آہستہ ختم نہ ہوئی یکبارگی ختم ہو گئی۔ پھر ہم اس جنگ کے خطرے

سے بچنے کے لئے یا اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز ہمارے پاس نہیں سائنس نے جو ہزاروں نت نئے آلات حرب بنائے ہیں ان سے ہم ناواقف، ہاں انگریزوں کے دشمنوں سے ساز باز کرکے انگریزوں کو اس ملک سے نکالنے کی تدبیر کی جاسکتی ہے۔ سو اگر یہ ارادہ ہے تو بہت خوب ہے چشم ما روشن دل ما شاد۔ اگر انگریزوں کے دشمن فتح کے بعد اپنے معاہدے پر قائم رہے تب تو اچھا ہی اچھا ہے ورنہ ایک کی غلامی نہ سہی دوسرے کی سہی۔

اب تیسری چیز رہ گئی غریبی اور بے کاری کا سوال۔ اس کا حل سوشلزم تبلایا جاتا ہے جواہر لال جی چاہے جتنی دھواں دھار تقریریں اس کی حمایت میں کرلیں لیکن کانگریس کی پوری مشینری پر جن لوگوں کا قبضہ ہے وہ انگریزوں کو اس ہوّے سے ڈرانے کے لئے چاہے جتنا سوشلزم کو چمکاریں اور پیار کریں لیکن وہ جانتے ہیں کہ آستین کے اس سانپ کو کبھی زیادہ نہ ابھرنے دینا چاہئے۔ جب یہ ذرا سرکشی کرے فوراً اس کا سر کچل دینا چاہیئے۔

اس لئے اگر جواہر لال جی کی خیال پرستیوں سے قطع نظر کرلی جائے اور بے بسی اور محکومی کی جو واقعی صورت حال ہے اس کو نظر کے سامنے رکھا جائے تو گفتگو کو دوسری سطح سے شروع کرنا پڑے گا مسٹر جناح نے ہمیشہ جواہر لال کو ایک خیال پرست سمجھ کر ان کو کسی معقول سمجھوتہ کی گفتگو کے لئے نا اہل سمجھا ہے۔ لیکن چونکہ وہ جواہر لال کے خلوص کے قائل ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہندوؤں میں واقعی ایسا ہے جس کا دل تعصب سے پاک ہے اور جس کا اثر بھی ملک کے نوجوانوں پر بہت زیادہ ہے اور جو اگر چاہے تو اپنے اثر سے ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے ایک مناسب فضا بھی پیدا کرسکتا ہے تو وہ جواہر لال اور صرف جواہر لال ہے۔ ایسا شخص اگر خط کتابت شروع کرنے کی خواہش کرے تو اس کی درخواست کو آسانی کے ساتھ ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس سے کسی اچھے نتیجہ کی توقع کرنا بھی ٹھیک نہیں کہ جواہر لال اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔ ان کی رواداری بے تعلقی کی رواداری ہے ؎

لاگ ہو تو ہم اسے سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

ان کی اس بے لوثی اور بے تعصبی کو دیکھ کر تو بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے ۔۔۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دراصل ان کا اس قدر "بے لاگ" ہونا خود ہمارے لئے ایک مصیبت بن گیا ہے۔ کیونکہ یہ بے چارے نام نہاد کمیونل سوال کو دوربین سے ادھر سے ادھر سے الٹ کر ملیٹ کر دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں کہیں کچھ نظر نہیں آتا اور عاجز آکر کہتے ہیں کہ جب کچھ ہو ہی نہیں تو کوئی کیا دیکھ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار جناح سے پوچھتے ہیں کہ مجھے بتائیے تو سہی امور متنازعہ کیا ہیں میں ابھی تک انھیں نہیں سمجھ سکا ہوں اور جب تک میرے سامنے مسئلہ صاف طور پر نہ رکھا جائے میرا دماغ مؤثر طریقہ پر کام نہیں کر سکتا۔

بلا شبہ کمیونل سوال نہرو جی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ایسے باپ کی اولاد ہیں جنھوں نے مذہب کی پابندیوں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت خالص غیر مذہبی ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کو اپنے آبائی تمدن سے کوئی واسطہ نہیں رہا اس لئے وہ تمدنی اور مذہبی وابستگیوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کا بال بال اور رواں رواں مذہب اور اس کے مخصوص تمدن سے جکڑا ہوا ہے وہ کیسے اس طرح کی بیگانگی اپنے تمدنی ورثہ کے ساتھ جائز رکھ سکتے ہیں۔ مسٹر جناح کو بھی مسلم تمدن سے وہ وابستگی نہیں ہے جو عام مسلمانوں کو ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک کامیاب وکیل ہیں اس لئے اپنے موکل کے مقدمہ کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں مسٹر جناح پکے قوم پرست ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مسلم مطالبات کا کوئی ایسا حل نکل سکے جس میں مسلمان ہندوستانی قومیت میں شریک ہونے کے بعد یہ محسوس نہ کریں کہ وہ محکوم یا زیردست ہیں بلکہ خود مختار ہندوستانی قومیت کے ایک آزاد رکن کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکیں۔

اس تمہیدی بیان کے بعد اب آئیے دیکھیں کہ امور متنازعہ کیا ہیں۔ مسٹر جناح نے انھیں بیان نہیں کیا۔ مسٹر جناح انھیں بیان کر ہی نہیں سکتے تھے وہ بذات خود غالباً ان کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتے وہ تو وکیل ہیں۔ اور وکیل کا کام دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو اپنے موکل کا مقدمہ پیش کرنا اور دوسرے جج کو فیصلہ میں مدد دینا۔ وہ فریق مقدمہ خود نہیں ہوتا۔ بلکہ فریق مقدمہ کا معاملہ بہترین روشنی میں پیش کرتا ہے اور پھر جج کے ساتھ اشتراک عمل کر کے مقدمہ کے فیصلہ میں مدد دیتا ہے۔ یہی پوزیشن مسٹر جناح

کی بھی ہے۔ وہ اس مسئلہ میں فریق مقدمہ نہیں ہے اور جب جواہر لال انھیں فریق بنا کر ان سے ان کے مطالبات طلب کرتے ہیں۔ تو وہ اس پر بگڑتے اور ناراض ہوتے ہیں وہ ان سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سے کہہ سکیں کہ بھائی میں تو تم جیسا ہی ہوں البتہ میں نے اپنے موکل کا مقدمہ سمجھ لیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے۔ جب جواہر لال کسی طرح نہیں مانتے اور امور متنازعہ کے بیان کرنے پر برابر اصرار ہی کئے جاتے ہیں تو وہ انھیں چند حوالے دیتے ہیں جن سے مسلمانوں کا مطالبہ سمجھا جا سکتا ہے۔

بہ حال امور متنازعہ جو جناح نہرو خط کتابت سے لوگوں کے سامنے آئے ہیں اور جن کو جناح آخری یا قطعی نہیں سمجھتے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) چودہ نکات جو مسلم لیگ نے ۱۹۲۹ء میں مرتب کئے تھے۔

(۲) کانگریس کمیونل ایوارڈ کی مخالفت ترک کر دے۔ اور اسے نیشنلزم کے منافی قرار نہ دے۔

(۳) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب آئینی طور پر معین کر دیا جائے۔

(۴) دستور اساسی میں مسلمانوں کے پرسنل لا اور کلچر کی حفاظت کا یقین دلایا جائے۔

(۵) کانگریس شہید گنج کے مسئلہ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے اخلاقی اثر و رسوخ سے مسلمانوں کو شہید گنج واپس دلا دے۔

(۶) اذان اور دیگر مذہبی رسوم کے متعلق مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہو۔

(۷) مسلمانوں کو ذبح گاؤ کی کھلی اجازت ہے۔

(۸) ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایسی علاقے بندیاں نہ کی جائیں جن سے اکثریت پر اثر پڑے

(۹) بندے ماترم ترک کر دیا جائے۔

(۱۰) اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کر لیا جائے اور اس امر کی گارنٹی دی جائے کہ اُردو کے استعمال میں مزاحمت نہیں کی جائے گی۔

(۱۱) بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے اصول پر نمائندگی دی جائے

یعنی جداگانہ انتخاب ہو اور آبادی کے لحاظ سے۔

(۱۲) کانگریس جھنڈا ترک کردیا جائے یا مسلم لیگ کے جھنڈے کو وہی اہمیت دی جائے۔

(۱۳) مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا جائے۔

(۱۴) اتحادی وزارتیں قائم کی جائیں۔

ان مطالبات میں سے بہت سے مطالبے بادی النظر میں لغو اور مہمل نظر آتے ہیں اور جواہر لال جی اور ہندو پریس نے ان کو اسی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور جناح نہرو خط کتابت کی اشاعت پر جو اس قدر اصرار تھا اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی۔ یہ مسلمانوں کی واقعی بدنصیبی ہے کہ ان کے پاس ایسے رہنما اور ایسا پریس نہیں ہے جو ان کے جائز مطالبات کو معقولیت کے ساتھ پیش کرسکیں وہ اپنا اچھا مقدمہ وکیلوں کے خراب ہونے کی وجہ سے ہار جاتے ہیں وہ ابھی تک اپنے ذہن کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ وہ حالت موجودہ سے غیر مطمئن ہیں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے نصب العین ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کے خلاف ہو رہا ہے۔ وہ اس سے مختلف قسم کی ایک چیز چاہتے ہیں اور ان کو پورا حق ہے کہ وہ اس چیز کو چاہیں اور اس کے حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ خود ان کے ذہن میں ان کا نصب العین، ان کی تمنا اور آرزو واضح طور پر موجود ہو اور دوسروں تک بھی وہ اپنے خیال کو منتقل کرسکیں تاکہ ان میں جو منصف مزاج اور ہمدرد لوگ ہیں وہ ان کے مطالبہ کی صحت کا فیصلہ اور ان کی حمایت کرسکیں۔ انھیں ہر قسم کے مہمل مطالبات کو جا اور بے جا پیش نہ کرنا چاہیئے۔ ان میں تناسب کا احساس ہونا چاہیئے اہم اور غیر اہم، اساسی اور غیر اساسی عارضی اور مستقل، ممکن اور ناممکن، ہندوؤں کے کرنے، خود اپنے کرنے، اور دوسرے لوگوں کے کرنے کے جو کام ہیں ان میں فرق کرنا چاہیئے خیالات میں یک رنگی اور منطقی استدلال ہونا چاہیئے۔ اپنے مطالبات کو چوں چوں کا مربہ بنا کر پیش کرنے سے دنیا کے لئے تمسخر اور استہزاء کا سامان تو فراہم ہو جاتا ہے لیکن اپنا کوئی مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

ہمیں اس روشنی میں دیکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی کیا شکایات ہیں۔ کیا بے چینیاں اور بے اطمینانیاں ہیں کیوں وہ ہندوستان کی عام قومی تحریک میں شریک نہیں ہوتے۔ کیوں وہ ملک کی سیاسی اور معاشری

تحریکوں میں حصہ لینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ آیا یہ ان کی کم ہمتی، بزدلی، خودغرضی ہے جو انھیں باز رکھتی ہے یا کوئی حقیقی مانع موجود ہے۔ کیا ان کے نصب العین مختلف ہیں۔ کیا ان کی تمناؤں کی تشکیل کانگریسی تنظیم میں نہیں ہوتی۔ اگر نہیں ہوتی تو کیوں نہیں ہوتی کانگریس سے ان کو کیا حقیقی شکایتیں ہیں اس سے کیوں وہ گریزاں دل برداشتہ یا متنفر ہیں۔ کیا شرائط ہیں جن کے ساتھ وہ کانگریس میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں یا سرے سے کانگریس میں شریک ہونا ہی نہیں چاہتے۔ اور کانگریس کے علاوہ کسی اور دوسری پارٹی کو با اقتدار دیکھنا چاہتے ہیں یا مسلمانوں کی حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ بہرحال ان باتوں کے بارے میں ذہن میں صفائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

پھر تعمیری پہلو کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے مثلاً اگر موجودہ چیزوں سے مطمئن نہیں ہیں تو کس قسم کی نئی تنظیم پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ تنظیم محض ہوائی نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کا ربط و تعلق زمین ست زمین پر بسنے والے دوسرے گروہوں سے کام کے کرنے کے جو عام طریقے اور رواج ہیں ان سے ہونا چاہیئے۔

یہ بھی واضح طور پر بتا دینا چاہیئے کہ ہمارا نصب العین کس سے زیادہ قریب ہے ہم کس کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے۔ اور کس کے ساتھ غیر مصالحت پذیر مخالفت۔ مثلاً ملک کے مختلف اداروں مختلف طبقوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہوں گے اور ان کی طرف محض کوئی مبہم اشارہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ واضح تصریح ہونا چاہیئے مثلاً محض یہ کہ دنیا کے ہمارا معاشی اور معاشرتی نظام قرآن پر مبنی ہوگا کافی نہیں ہے۔ ہمیں اس کا ایک مکمل نقشہ موجودہ حالات کی روشنی میں بنا کر پیش کرنا چاہیئے تاکہ سب لوگ سمجھ سکیں کہ ہماری تمنا ہندوستان کو کیا بنانے کی ہے وغیرہ وغیرہ۔

چونکہ انگریزی پریس ہمارے ساتھ نہیں ہے اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہمارا مطالبہ نہایت واضح اور ابہام سے مبرا ہو۔

آئیے سب سے پہلے مسلمانوں کی بے چینیوں اور بے اطمینانیوں کا مطالعہ کریں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں مذہب کا بہت غلبہ ہے اور مذہبی رواداری نہ ہندوؤں میں موجود ہے نہ مسلمانوں میں۔ ہندوؤں کی غیر رواداری ان کے مذہب کا ایک جز بن گئی ہے۔ چھوت چھات مسلمان

سے دور دور رہنا کائے کی قربانی کو مہا پاپ سمجھنا کبھی ساتھ بیٹھ کر ایک دستہ خوان پر کھانا نہ کھانا بات بات پر پوچھنا کہ آپ مسلمان تو نہیں ہیں اپنے بیوی بچوں کے سامنے مسلمان کو ایک ہوّا بنا کر پیش کرنا یہ چیزیں موجود ہیں اور ان کا اثر محض معاشرتی تعلقات تک محدود نہیں ہے بلکہ معاشی معاملات پر بھی پڑتا ہے۔ دفتروں میں تعصب سے کام لیا جاتا ہے اور ہر جگہ اپنے مذہب والے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پھر طریقہ عبادت تہوار و رسوم۔ طریقہ معاشرت' لباس' غذا' زبان' رسم خط تاریخ روایات' خیالات ان سب کا فرق' اختلاف کو اور بھی بڑھا دیتا ہے خصوصاً زبان' اور رسم خط کا فرق جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے اعلیٰ خیالات سے واقف ہونے کا موقع ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چیز موجود ہے۔ اس میں کمی نہیں ہو رہی ہے بلکہ ترقی پر ہے فرقہ وارانہ رقابت بھی موجود ہے مسلمان کی ترقی محض اس لئے ناگوار ہوتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ اب تک اقتدار انگریزوں کا تھا دونوں فریق بن کر انھیں کے پاس داد و فریاد کے لئے جاتے تھے لیکن اب اگر ایک فریق برسر اقتدار آ جائے تو ظاہر ہے دوسرا فریق اس پر اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتا اس کو ہزاروں قسم کے اندیشے ہوں گے۔ وہ اس کو اپنی شکست سمجھے گا۔ فریق مخالف چاہے جتنا بھی یقین دلائے فریق اول یہی چاہے گا کہ کسی طرح برابری کی پہلی سی صورت دوبارہ پیدا ہو جائے۔ اب برابری کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو ترقی کی رفتار کو روک کر پرانی حالت کو قائم رکھا جائے یا اگر ترقی کو پسند کیا جائے تو حقوق کی تقسیم نئی بنیاد پر کی جائے تاکہ محکومی کی مساوات حکمرانی کی مساوات میں تبدیل ہو سکے۔

اتفاق سے صورت حال یہ ہے کہ کانگریس کی مقامی شاخوں پر ہر جگہ پہلے سے ہندو قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کانگریس کی رکنیت پر بھی ہندوؤں کا غلبہ ہے اور کانگریس کے اعلیٰ کارکنوں میں بھی ہندو ہی ہندو نظر آتے ہیں اور یہ ہندو مذہب سے بے تعلق نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر پکے مذہبی ہیں۔ اور ہندو تمدن کے احیاء اور اقتدار کے خواہش مند ہیں۔ سنسکرت کے عالم ہیں اس لئے ان کی تحریر میں سنسکرت کے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ ان کے آداب و اطوار اور وضع قطع میں بھی ہندو تمدن نمایاں ہوتا ہے ان میں سے جو ترقی پسند اور سوشلسٹ بن گئے ہیں۔ وہ بھی کل تک ہندو تمدن کے احیاء اور ترقی کے حامی تھے اور آج بھی جس ماحول میں پیدا ہوئے ہیں اس کے اثرات سے مجبور اور بے بس ہیں اور چونکہ انھیں ہندوؤں میں کام کرنا ہے

اور ہندوؤں کی حمایت سے ہی ترقی کرنا ہے اس لئے وضع قطع زبان اور معاشرت میں کوئی ایسی تبدیلی کرنا نہیں چاہتے جس سے ان کے مخالفوں کو انھیں بدنام کرنے کا موقع ملے۔ پھر اس کے علاوہ جو لوگ زندگی میں واقعتہً انقلاب پیدا کرنے پر تلے ہوئے میں وہ سب سے ہر پرانی چیز سے بیزار ہیں اور ان کے لئے مذہب اور تمدن سب لغو اور بے کار چیزیں ہیں۔ اور ان کی حمایت میں ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں ہیں اب اشتراک عمل کس سے کیا جائے ہندوؤں کے کسی فرقے اور طبقہ کو بھی ان چیزوں سے ہمدردی نہیں جن کو ہم جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہتے ہو تمھارا مطالبہ کیا ہے تم کیا چاہتے ہو۔ یہ تمدن وغیرہ کیا بلا ہے۔ پاجامہ ہے۔ لوٹا ہے گائے کے گوشت کا لوتھڑا ہے۔ شہید گنج کے کھنڈر کی اینٹیں ہیں۔ بندے ماترم کے گیت کی مخالفت ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ ان چیزوں کو سیاست سے کیا واسطہ ہے۔ اصل مسئلہ غربت اور بیکاری کو رفع کرنا ہے، برطانوی شہنشاہیت کو ختم کرنا ہے، جنگ جو ہونے والی ہے اس کے لئے اپنے کو تیار کرنا ہے۔ اور مکمل آزادی حاصل کرنا ہے۔ کانگریس کمیٹیوں کا سیاسی کام یہ ہے کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے مطالبوں کو منواتی ہیں۔ انگریزی سرکار سے جنگ کرتی ہیں۔ ملک کی سیاسی تنظیم کرتی ہیں انھیں کسی کے تمدن سے کیا واسطہ وہ ہندو تمدن کے زندہ رکھنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتیں اور نہ وہ مسلم تمدن کے زندہ رکھنے کے لئے کوئی کوشش کرنا چاہتی ہیں۔ ہندوؤں میں غیر سیاسی ادارے ہیں جو اس کام کو کر رہے ہیں مسلمان بھی اپنے غیر سیاسی ادارے ایسے ہی بنا سکتے ہیں۔ سیاست کو تمدن و مذہب سے واسطہ۔ تم گھر پر جا کر گائے کا گوشت کھاؤ۔ نماز پڑھو، مجھے اس سے واسطہ۔ میں تو سیاست کے مشترک کاموں میں تمھیں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ تم آزادی حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ تم غریبی اور بے روزگاری کو دور کرنا نہیں چاہتے؟ اگر چاہتے ہو تو آؤ میرے ساتھ کام کرو۔ تم اردو بولو میں منع نہیں کرتا۔ نماز پڑھو میں منع نہیں کرتا ڈاڑھی رکھو پاجامہ پہنو، کباب کھاؤ میرے لئے یہ سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ اگر صورت ایسی ہی سادہ ہوتی تو یقیناً کسی کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ لیکن معاملہ در اصل اتنا سہل نہیں ہے۔ کانگریس کی تحریک کے ساتھ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہند و تمدن کے احیاء کی تحریک

بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ مہاتما گاندھی سیاسی رہنما بھی ہیں۔ اور مذہبی رہنما بھی۔ ان کی طرف سے جو کارکن دیہاتوں میں پہنچتے ہیں ان کے فرائض میں ہندی کی اشاعت بھی شامل ہوتی ہے۔ وہ بھجن گاتے ہیں اور ایک پوری مذہبی فضا اپنے گرد رکھتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ جب سے سات صوبوں میں کانگریس برسر اقتدار آئی ہے یہ بات اور بھی واضح ہوتی چلی جارہی ہے کہ کانگریسی حکومتوں کی پالیسی مذہبی و تمدنی معاملات میں اپنے بنیادی حقوق اور دوسری اسی قسم کی قراردادوں کے باوجود غیر جانبدار نہیں رہ سکتی۔ تعمیری کام کا آغاز تعلیم سے کرنا ضروری ہے۔ اور تعلیم کے سلسلہ میں پورا ہندو مسلم مسئلہ اپنی انتہائی شدت کے ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ ذریعہ تعلیم کون سی زبان اور رسم خط کو بنایا جائے گا۔ یہ کہہ دینا کہ ہندوستانی زبان کو جو اُردو اور ناگری دونوں رسوم خط میں لکھی جائے گی اطمینان کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ "ہندوستانی" کیا چیز ہے۔ یہ کوئی زبان پچھلے زمانے میں رہ چکی ہے یا اس وقت موجود ہے یا آئندہ بننے والی ہے۔

اُردو ہندی کے ادب سے تو لوگ واقف ہیں لیکن ہندوستانی زبان کے ادب کا کہیں پتہ نہیں چلتا تو کیا اس کا نیا ادب تیار کرایا جائے گا اور وہی آئندہ مدرسوں میں پڑھایا جائے گا۔ لیکن اُردو میں اس وقت ادب کا جو ذخیرہ موجود ہے اور جسے ہم اپنے تمدنی ورثہ کا ایک بیش بہا جزو سمجھتے ہیں اس کا کیا حشر ہوگا۔ سرسید آزاد۔ نذیر احمد، حالی، شبلی، غالب، اکبر، اقبال اور ہمارے اور دوسرے ہزاروں شاعروں ادیبوں مصنفوں نے اُردو میں کتابیں لکھی ہیں ان کا کیا حشر ہوگا کیا انھیں کوڑے کی کھتی میں ڈال دیا جائے گا یا انھیں از سر نو ہندوستانی میں لکھایا جائے گا۔ یہ تو زبان کا مسئلہ ہوا اس کے بعد مضمون کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدرسوں کی درسی کتابوں میں کسی قسم کا مواد جمع کیا جائے گا۔ یو۔ پی۔ کے وزیر تعلیم سوامی سمپورنا نند جی نے ۱۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو یو۔ پی۔ اسمبلی میں جو تقریر فرمائی ہے اور جو اخبار مدینہ مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے اور جس کا حوالہ مدیر ترجمان القرآن نے اپنی جلد ۱۲۔ عدد ۱ میں دیا ہے۔ اس میں وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

> ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کو قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے ۔۔۔

> "ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور ان دوسروں کے لئے جو
> اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اسے اپنا گھر بنا لیا ہے بالکل ایک ہے ....
> اس لئے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اُمید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں
> کے مدارس میں ہندو مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں اس بات پر زور نہ دیں گے۔"

یہاں بھی اُردو ہندی اور ہندوستانی کی طرح یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندو تہذیب، مسلم تہذیب تو جانی پہچانی
چیز ہے لیکن یہ ہندوستانی تہذیب کیا ہے۔ مسلم تہذیب کی بنیاد تو مذہب اسلام ہے ہندوستانی تہذیب
کی بنیاد کیا ہوگی۔ جواب دیا جا سکتا ہے "مشترکہ قومیت" لیکن مشترکہ قومیت کا مفہوم بذات خود تشریح کا محتاج ہے۔ اس کے
عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ یہ ہم آہنگ ہیں یا متضاد اور متصادم کیا ہندوؤں کا چھوت چھات ماننے والا تمدن کسی
غیر چیز کے ساتھ اشتراک کر سکتا ہے۔ کیا مسلمانوں کا کفر و اسلام میں واضح فرق کرنے والا تمدن شرک
کو گوارا کر سکتا ہے۔ کیا قومیت کی طرف یہ رجحان لوگوں میں موجود ہے یا حکومت کی طرف سے ان پر
عاید کیا جائے گا۔ اور اس کے لئے کلیت پسند ریاستوں کے تمام وسائل نشر و تبلیغ اختیار کئے جائیں
گے اور مخالفوں کی قرار واقعی سرکوبی کی جائے گی یہ سوالات ہیں جو پیدا ہوتے ہیں۔ اب تک تو حکومت
کی پالیسی دیسی تمدن کی طرف سے غفلت، لاپرواہی اور عدم مداخلت کی رہی تھی یا کبھی کبھی برائے نام کچھ
امداد اور سرپرستی بھی کر دی جاتی تھی لیکن آزاد ہندوستان کی پالیسی کیا ہوگی۔ اگر اس کی پالیسی قومیت اور
قوم پرستی کی ہوگی اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ اس کا رویہ سخت گیری کا ہوگا تو یہ معاملہ
یقیناً سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا ہے بندے ماترم کا گیت یا ترنگے جھنڈے کا معاملہ بے حقیقت چیزیں
نہیں ہیں بلکہ ان سے بنیادی مسائل متعلق ہیں مسلمان اپنا علیحدہ تمدنی وجود کسی شرط پر بھی چھوڑنے کے
لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ ایک مقصد کے علمبردار ہیں۔ وہ ایک پیغام کے مبلغ ہیں وہ کائنات اور نظام اجتماعی
کے بارے میں اپنا ایک جداگانہ تصور رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخی روایات ہیں۔ ان کی غیر ملکوں کے مسلمانوں
سے تمدنی وابستگیاں ہیں۔ وہ ان چیزوں کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان کو قائم اور برقرار رکھنا چاہتے ہیں
جب سوشلسٹ کہتے ہیں کہ دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن جب

مسلمان کہتے ہیں کہ کائنات اور جماعت انسان کی تنظیم کے بارے میں ایک خاص تصور رکھنے والے لوگو ایک ہو جاؤ تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ مسلمان اس چیز کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ارکان اسلام میں فریضہ حج بھی شامل ہے جو ہر سال مسلمانان عالم کے لئے ان کے باہمی اتحاد و یکانگت کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ مسلمانان ہند کی حالت اس وقت چاہے کتنی ہی خراب اور ابتر کیوں نہ ہو، لیکن جب کبھی ان میں بیداری اور زندگی پیدا ہوگی وہ اسلام کے مرکز پر ہی مجتمع ہوں گے اور ہندوستان اور دنیا کے دوسرے رہنے والوں کو بھی اس بے نظیر تعلیم میں شریک کرنے کا حوصلہ کریں گے۔

غرضکہ مسلمانوں کی یہ شکایتیں، اندیشے، حوصلے اور تمنائیں ہیں لیکن یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا اس کی نوعیت تخریبی زیادہ اور تعمیری کم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر مسلمان کانگریس سے غیر مطمئن ہیں، جو جدید تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے متحدہ قومیت کے تصور سے بیزار ہیں تو وہ چاہتے کیا ہیں۔ ان کے پروگرام کا تعمیری اور اثباتی پہلو کیا ہے کس چیز سے وہ مطمئن ہو سکیں گے۔ اس ملک میں وہ رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ہندو اور دوسرے غیر مذاہب والے جو ہندوستان میں آباد ہیں ان کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوگی۔ اگر اس ملک میں رہنا چاہتے ہیں تو ان لوگوں سے معاملات اور تعلقات کی کوئی نہ کوئی صورت تو نکالنا ہی ہوگی۔ جہاں ان کی تعداد بہت زیادہ کم ہے وہاں وہ کس طرح رہنا چاہیں گے جہاں ان کی تعداد برابر ہے وہاں وہ کس طرح رہیں گے جہاں ان کی تعداد بہت زیادہ ہو وہاں ان کے تعلقات کا کیا اندازہ ہوگا۔ مجموعی طور پر ان کی پالیسی دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کیسی ہوگی۔ پھر ملک میں جو غیر مذہبی جماعتیں ہیں مثلاً سوشلسٹ پارٹی یا مزدوروں اور کسانوں کی انجمنیں یا اسی طرح کی اور انجمنیں جن کے مقاصد معاشی یا سیاسی ہیں ان کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہوں گے۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں میں جو اس وقت تصادم رونما ہے اور جو مذہبی بندشوں سے آزاد ہوتا جا رہا ہے اس کی طرف ان کا کیا رویہ ہوگا۔ یعنی جواہر لال جی نے جو بنیادی سوالات اُٹھائے تھے یعنی برطانوی شہنشاہیت سے ان کے تعلقات کی نوعیت اور غریبی اور بے روزگاری کے مسئلہ کی طرف ان کا رویہ اس کو متعین کرنا ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے یہ مسائل روز بروز زیادہ اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں

اور بہت ممکن ہے کہ اگر ان بنیادی چیزوں پر دوسری سیاسی جماعتوں سے آپ کا اشتراک خیال ہو جائے تو وہ آپ کے تمدنی اور مذہبی مطالبات میں آپ کی پوری حمایت کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ بہت ممکن ہے کہ انھیں آپ کا مذہب قبول کرنے اور آپ کے تمدن کو اپنا تمدن آپ کی زبان کو اپنی زبان بنانے میں کوئی تامل نہ ہو۔ آپ کی اقلیت اقلیت نہ رہے بلکہ اکثریت میں منتقل ہو جائے۔ آپ دوسروں سے تحفظات کا مطالبہ نہ کریں بلکہ دوسرے آپ سے تحفظات کے خواہش مند نظر آنے لگیں۔ آپ کے تمدن اور مذہب کا پیغام اگر دنیا کی موجودہ مشکلات کا حل ثابت ہو سکتا ہے تو آپ اسے کیوں اس شکل میں پیش نہیں کرتے جو وہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے اور ان کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر سکے۔ زندہ اور ترقی پسند قومیں اپنے ترکہ اور ورثہ کو بچانے کی فکر نہیں کرتیں بلکہ اس کو وسیع کرتی ہیں اور تمام دنیا کو تسخیر کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارا پہلا قدم تحفظات نہ ہونا چاہئے۔ نہیں ہو اور ضرور ہو۔ لیکن اسی جگہ پر ہم کو ٹھہرنا نہیں چاہئے۔ اپنی قوت کو ایک نئی ریاست قائم کرکے مستحکم بنانا چاہئے۔ اور پھر ریاست کے وسائل اور قوتوں سے کام لے کر اپنے مشن کی تبلیغ کرنا چاہئے۔ یہ نصب العین اگر ہمارے سامنے واضح شکل میں موجود ہو تو سب سے پہلے ہم اپنے لئے ایک ایسا پروگرام بنائیں گے جو دنیا کی موجودہ نسل کی مشکلات کا ایک معقول حل پیش کر سکے گا۔ بعد ہم اس نصب العین کے حصول کے لئے عملی کوشش شروع کریں گے۔ اور جب ہماری راہ میں دشواریاں اور دقتیں پیدا ہونگی تو ہم قانون سے آزادی عمل کے لئے تحفظات کا مطالبہ کریں گے۔ اگر یہ تحفظات مل گئے تو بہت خوب ورنہ ہم کو ہجرت کرنا ہوگی اپنی جداگانہ ریاست بنانا ہوگی اور اپنی تنظیم اور توسیع کی نئی راہیں اختیار کرنا ہوں گی۔ اسلام کی ابتدا اور توسیع اسی طرح ہوئی۔ ہر زندہ تحریک اسی طرح چلتی ہے اور اسلام کا احیاء اور ازسر نو اقتدار اسی طرح پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے عمل ریاضت اور مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ خالی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔

اس لئے سب سے پہلا سوال پروگرام بنانے کا ہے جو دنیا کی موجودہ بین الاقوامی فضا اور

ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور معاشرتی زندگی میں سب سے پہلے مسلم لیگ کو چاہئے کہ سب سے پہلے اس پروگرام کا تعین کرے۔ اس پروگرام میں جاذبیت، قوت اور زندگی ہونا چاہیے اور اسے زمانے کے نئے حالات اور مطالبات کا ساتھ دینا چاہئے۔ کیا مسلم لیگ اس کام کو کرسکتی یا وہ ایسا کرسکتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہاں کرسکتی ہے۔ وہ حرکت خیز اور ولولہ انگیز پروگرام جسے مسلم لیگ کو لے کر اٹھنا چاہیئے وہ اسلام کا پیغام عمل اور درس حریت، اخوت اور مساوات ہے۔ لیکن چونکہ دنیا کے بدلے ہوئے حالات نئے ماحول اور اظہار خیال کے نئے طریقوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس لیے اگر اس پرانے پیغام کے لئے نئی اصطلاح استعمال کی جاتے اور کہا جائے کہ مسلم لیگ کا پروگرام "مسلم سوشلزم" ہے تو میرے خیال میں ہم لوگوں کی توجہ کو زیادہ جذب کرسکیں گے اور اپنے مذہب کی تعلیمات کو ان کے لئے زیادہ قابل فہم بنا سکیں گے اسلام انقلابی مذہب ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ اسلام بین الاقوامی تحریک ہے یہ بھی مسلم ہے اسلام عدل، مساوات، اخوت اور آزادی کا حامی ہے اس پر بھی کسی کو اختلاف رائے نہیں ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بیت المال کے اصول کے حامی اور مال غنیمت کی غیر مساوی تقسیم کو ناجائز خیال کرتے تھے۔ پھر زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے احکام، سود کی ممانعت ان تمام باتوں سے اشتراکی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ کے اجتماع اور روپیہ کے لین دین کے کام میں مسلمان ہمیشہ بہت پیچھے رہے ہیں۔ یہودیوں، عیسائیوں یا ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد حکومت میں ان کاموں کو جاری رکھا ہے لیکن مسلمان اس قسم کے کاموں سے علیحدہ رہے ہیں انفرادی سرمایہ داری جس پر موجودہ صنعتی نظام کی بنیاد قائم ہے۔ نفع طلبی کی ذہنیت اور اجتماع اصل کا جذبہ مسلمانوں میں ہمیشہ مفقود رہا ہے۔ ان کی ذہنیت یا تو جاگیردارانہ اور زمیندارانہ ہے یا پرولیتاری یعنی اجرت پر کام کرنے والی۔ آج بھی سرکاری ملازمت یا اسی قسم کی اور دوسری ملازمتوں کو مسلمان پسند کرتے ہیں ان میں انفرادی کام کی خواہش نہیں ہے بلکہ اجتماعی کاموں کو تقسیم عمل کی مشین کے ایک پرزہ کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو تمدن

کا علمبردار بنیوں کا طبقہ ہے روپیہ جمع کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ یہ یا تو بورژوا بن گیا ہے۔ یا
کولک کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پٹی بورژوا (ٹٹ پونجیوں) کی منزل سے گذر کر لونچی پتی لکھ پتی
اور کروڑ پتی بننے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ہندوؤں میں اور ذاتیں طبقے اور فرقے بھی ہیں لیکن آج کل ان
سب پر بنیوں کا تسلط ہے اور برسراقتدار طبقہ بنیوں کا ہی ہے اور موجودہ ہندو تمدن پر سرمایہ دارانہ
رنگ بالکل چھا گیا ہے۔ ہندوؤں کے وہ طبقے جو بنیوں کے پاؤں کے نیچے دبے ہوئے ہیں ان کو ابھرنے
کی یہی صورت ہے کہ ان کے روبرو اسلامی سوشلزم کا پیغام رکھا جائے اور انھیں اسلام کی عدل پرور
اور انصاف دوست تعلیمات سے واقف کیا جائے۔ کانگریس پر آج بنیوں کا اثر غالب ہے۔ سوشلزم
کی جو تحریک کانگریس کے لوگوں میں پھیلنا شروع ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے کانگریس سوشلسٹ
پارٹی بنائی گئی ہے اس کا اور کانگریس کا ساتھ زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتا۔ اسے کانگریس سے قطع
تعلق کرنا ہوگا۔ بلکہ یہ لوگ فاشسٹ قوتوں کے زیر اثر کانگریس سے زبردستی نکالے جائیں گے۔
جب یہ لوگ کانگریس سے اس طرح نکالے جائیں اس وقت مسلم لیگ کی آغوش ان کا خیر مقدم کرنے
کے لئے کھلی ہوئی ہونا چاہیئے۔ فی الحال ناواقفیت کی بنا پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی اس اشتراک
مقاصد کا احساس نہیں کرتی جو مسلمانوں کے ساتھ اسے حاصل ہے ایم۔ این۔ راے اس کو سمجھتے ہیں اور
شاید جواہر لال بھی۔ لیکن جب مسلم لیگ کی طرف سے مسلم سوشلزم کے پروگرام کو صاف اور واضح شکل میں پیش
کیا جائے گا تو وہ سمجھیں گے کہ سوشلسٹ مسلمانوں سے کس قدر قریب ہیں اور پھر دونوں میں ایک نہایت
پائدار اتحاد قائم ہو سکے گا۔ مسلمانوں میں جو جاگیرداروں اور زمینداروں کا طبقہ ہے اس کی زندگی روز بروز
خطرہ میں پڑتی جا رہی ہے۔ ایک طرف بنیئے ان کی جائدادوں کو قرض کے معاوضے میں قرق اور نیلام
کرانے کی فکر میں ہیں اور دوسری طرف سرکار کی طرف سے جو کسانوں کے لیے قوانین بنائے جا رہے
ہیں وہ ان کے تمام پرانے اقتدار اور منافع کو ختم کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی قسمت میں فنا ہونا
لکھا ہے اور مایوسی کی حالت میں انھیں مجبوراً سوشلزم کو ہی اپنا مسلک قرار دینا ہوگا۔ مسلمانوں میں جو بڑے
بڑے تاجر ہیں ان کی ذہنیت بھی صحیح معنی میں سرمایہ دارانہ نہیں ہے۔ مسلمان تاجروں کے یہاں جن

لوگوں کو دعوتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے یا جو قیمیں وہ اپنی عورتوں کی پوشاکوں پر صرف کرتے ہیں اور جس اللّے تللّے سے عام طور پر روپیہ خرچ کرتے ہیں ان کے دیکھنے سے بھی جاگیردارانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور صحیح سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مقابلہ میں اس ذہنیت کو شکست اٹھانا پڑے گی اور آخر میں ناکام اور مایوس ہو کر ان لوگوں کو بھی سوشلزم ہی میں پناہ لینا ہوگی۔ یہی حال ہمارے ادیبوں، مولویوں اور عالموں کا ہے جو ابھی تک جاگیرداروں کے دامن دولت سے وابستہ رہ کر اور ان سے چندے اور نذرانے لے کر زندگی گذارتے رہے ہیں۔ لیکن جب ہندو سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ ان کے وظائف اور تنخواہیں اور انعامات بند ہوں گے تو انھیں بھی مجبوراً پرولتاری طبقہ سے اپنی قسمت کو وابستہ کرنا ہوگا۔ اور اسی طبقہ کی امداد و اعانت پر ان کا نان نفقہ چل سکے گا۔ لہٰذا ایک طرف تو حالات کا تقاضا اور دوسری طرف خود اسلامی تعلیمات اور روایات اس بات کے لئے مجبور کرتی ہیں کہ مسلم لیگ مسلم سوشلزم کو اپنے پروگرام میں داخل کرے اور اگر اس کی وجہ سے عارضی طور پر کچھ خود غرض اور ناعاقبت اندیش لوگ اس سے کنارہ کشی کریں تو اس کی بالکل پروا نہ کرے بلکہ عوام سے اپنے رابطہ کو روز بروز بڑھاتی جائے اور اپنی تبلیغ و اشاعت کا پروگرام ایسا بنائے جو غیر مذہب والوں کو بھی اپنی طرف مائل کر سکے۔ خصوصاً اچھوت اور دوسرے مظلوم طبقے خاص طور پر اس کی اولین توجہ کے مستحق ہیں۔ قرون اولیٰ کے اسلام کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ اس کی اپیل دنیا کے مصیبت زدہ اور مظلوم طبقوں سے تھی۔ وہ ان کے لئے امید اور روشنی کا پیغام بن کر نازل ہوا تھا اور ان ہی کی امداد و اعانت سے اس کو وسعت اور سرفرازی نصیب ہوئی تھی۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

ہندوستان کی تجارت خارجہ

ہندوستان کی قدیم اور موجودہ تجارت خارجہ پر اگر روشنی ڈالی جائے اور واقعات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو اغلب یہ ہے کہ تجارت خارجہ کی سرگزشت ایک طویل داستان کی صورت اختیار کر لیگی۔ مگر اس وقت نہ تو اس کا موقع ہے اور نہ ضرورت، یہاں اس بیان کے چند اہم پہلو نمایاں کر دینا کافی ہونگے۔

جس طرح ہندوستان کی سیاسی تاریخ ہندو مسلم اور انگریزی تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے اسی طرح ہم ہندوستان کی تجارت خارجہ کو بھی تاریخی لحاظ سے تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور قدیم عہد یا ہندوؤں کا زمانہ جو تقریباً دو ہزار قبل مسیح سے شروع ہو کر دسویں صدی عیسوی یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس عہد کے حالات ہمیں کسی باقاعدہ تاریخ سے نہیں ملتے تاہم ہندوؤں کی مذہبی کتابوں، سیاحوں کے سفرناموں اور آثار قدیمہ کے کتبوں سے اس زمانہ کے کچھ نہ کچھ حالات ضرور معلوم ہو جاتے ہیں جن سے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں بھی ہندوستان کی تجارت دور دراز ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی مغرب میں فارس، عراق عرب، مصر، شام، روم اور یونان تک، اور مشرق میں چین و جاپان تک ہندوستان کا تجارتی سامان جاتا تھا۔ یہ تجارت عرصہ تک فنیشین قوم کے ہاتھ میں رہی۔ یہ لوگ قدیم زمانہ میں ہندوستان کے ساحلوں پر آتے تھے اور یہاں کی مصنوعات اور پیداوار لے کر بحری راستے سے یمن پہنچتے تھے اور وہاں سے یہ سامان اونٹوں پر لد کر مصر و شام ہوتا ہوا بحر روم سے یورپ تک چلا جاتا تھا۔ اسی طرح وہاں کا تجارتی سامان یہ لوگ اِدھر ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان لے جاتے تھے۔

جب یونانیوں نے مصر پر قبضہ کر لیا تو تجارت بھی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ انہوں نے اسکندریہ سے ہندوستان تک براہ راست نیا بری راستہ بنالیا اور ہندوستان کا تجارتی سامان اونٹوں اور

خچروں پر لاد کر افغانستان، فارس اور ایشیائے کوچک کے راستے سے یورپ لیجانے لگے چھٹی صدی عیسوی تک یہ لوگ ہندوستان کی تجارت میں عربوں کے حریف بنے رہے لیکن ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا عروج ہوا، اور مسلمانوں نے مصر، شام اور بحر روم پر قبضہ کر لیا تو یہ تجارت ساری کی ساری پھر عربوں کے قبضہ میں آگئی۔ اور صدیوں تک یہ لوگ ہندوستان کی تجارت کے مالک بنے رہے، ہندوستان کے متعلق عرب ایک خاص عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ سے ایک عرب سیاح نے اس طرح بیان کیا کہ "ہندوستان کے دریا موتی، پہاڑ یاقوت اور درخت عطر ہیں" اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں یہ لوگ ہندوستان سے موتی جواہرات اور خوشبو کی چیزوں کی تجارت کرتے تھے اس کے علاوہ یہاں سے ریشمی، اور سوتی کپڑا، ریشمی تاگا، مختلف قسم کی چھینٹ، رنگ اور مسالے (لونگ، الائچی، سیاہ مرچ، دارچینی وغیرہ) بھی باہر بھیجے جاتے تھے۔ ان چیزوں کے عوض میں اونی کپڑا، تانبا، سیسا، ٹین، شیشے اور آئینے مختلف قسم کے عطر، شراب اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی برآمد ہوتی تھی اور باقی قیمت سونے اور چاندی کے سکوں میں نقد ادا کی جاتی تھی۔

گیارہویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں مسلمانوں کا دور شروع ہوتا ہے اور تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی کے شروع تک قائم رہتا ہے۔ اس دور میں صنعت و تجارت کی بڑی ترقی ہوئی۔ جس طرح آج ہندوستان کی آبادی کا عام پیشہ زراعت ہے اُس زمانہ میں تجارت کی گرم بازاری کی وجہ سے لوگوں کا عام پیشہ صنعت و حرفت تھا، خاص کر پارچہ بافی کی صنعت کا بہت رواج تھا۔ اور اس فن میں لوگوں کو اس قدر کمال حاصل تھا کہ اُس زمانے کے سوتی اونی، ریشمی اور زربفت کے کپڑے اور قالین آج تک لوگوں سے خراج عقیدت وصول کرتے ہیں۔ ملک میں چاروں طرف خوش حالی نظر آتی تھی، بحری تجارت کے ساتھ ساتھ برّی تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ چودھویں صدی عیسوی تک توبرابر ہندوستان کا تجارتی مال بحری اور برّی دونوں راستوں سے یورپ جاتا رہا۔ مگر جب اہل یورپ اور مسلمانوں میں جنگ چھڑی اور یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا تو مسلمانوں نے یہ راستے

ن کے لیے بند کر دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں ہندوستان کے مال کی درآمد بند ہوگئی اور تمام تجارت کا رُخ اسلامی ممالک کی طرف پھر گیا۔ اب یورپین تاجر بہت پریشان ہوئے اُنھوں نے سوچا کہ ہندوستان پہنچنے کا کوئی دوسرا بحری راستہ معلوم کرنا چاہیے۔ اس زمانہ میں پرتگیز جہاز رانی میں بڑے ماہر مانے جاتے تھے، چنانچہ اُنھوں نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور ہندوستان آنے کا ایک نیا بحری راستہ ڈھونڈھ نکالا۔ "واسکوڈاگاما" نامی مشہور پرتگیز کپتان ۱۴۹۸ء میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ افریقہ کے ساحل کے کنارے کنارے جنوب میں راس اُمید کا چکر لگاتا ہوا ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ کے بندرگاہ پر آ پہنچا۔ واسکوڈاگاما یہاں کے راجہ سے ملا اور پرتگال اور ہندوستان کے مابین تجارتی تعلقات قائم کرنے کی گفتگو کی۔ اُس وقت سے سو سال یعنی ۱۵۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک ہندوستان کی بحری تجارت زیادہ تر پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی۔ اُنھوں نے اپنی حفاظت کے لیے شہر گوا میں ایک قلعہ تعمیر کرایا جو آج بھی پرتگیزوں کے قبضے میں ہے۔

جب دوسری یورپین اقوام نے پرتگیزوں کو ہندوستان کی تجارت سے مالامال ہوتے دیکھا تو اُن کے مُنہ میں بھی پانی بھر آیا اور شوق ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس تجارت میں شریک ہونا چاہیے، چنانچہ ہالینڈ، انگلستان، فرانس، ڈنمارک، جرمنی اور سویڈن کے تاجروں نے بھی اپنے اپنے جہاز ہندوستان کی طرف روانہ کیے۔ مگر کامیابی صرف ہالینڈ، انگلستان اور فرانس والوں کو نصیب ہوئی۔

پرتگیزوں کے بعد ہندوستان میں ڈچ قوم یعنی ہالینڈ والوں نے اپنے قدم جمانے شروع کیے اگرچہ ہالینڈ چھوٹا سا ملک تھا مگر اُس کی بحری طاقت دوسری قوموں کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے پرتگیزوں کو زیر کر لیا اور گوا کے سوا تمام دوسری بندرگاہوں پر قابض ہو گئے ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک ہندوستان کی تجارت خارجہ انہی کے ہاتھ میں رہی انھوں نے ہندوستان کے علاوہ سیلون، جاوا، سماترا میں بھی بڑی ترقی کی۔

ہندوستان کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے یورپین اقوام میں برابر جنگ جاری تھی، تاجروں کے چھوٹے چھوٹے بیڑوں میں بھی بحری جنگ ہوتی تھی اور ایک دوسرے کے جہاز لوٹ لیتے تھے اکثر ہندوستان کے ساحل پر بھی کشت و خون کی نوبت آ جاتی تھی اس وجہ سے ان لوگوں نے اپنی حفاظت کے لیے قلعے تعمیر

کروائے۔

سنہ ۱۶۰۰ء میں تقریباً سو انگریزی تاجروں کی ایک جماعت جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا، ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئی۔ کمپنی نے سورت میں جو اُس زمانہ میں مغلیہ سلطنت کا سب سے بڑا بندرگاہ تھا اپنی کوٹھی تعمیر کروائی۔ یہ لوگ ہندوستان سے سیاہ مرچ، لونگ، الائچی، نیل، چاول، ناریل، پوست اور شکر وغیرہ کے علاوہ سوت اور ریشم کا کپڑا کثرت سے انگلستان اور دوسرے ملکوں میں لیجاتے تھے، اور وہاں سے تانبے، پارے، لوہے اور فولاد کا سامان لاتے تھے اور باقی رقم سونے اور چاندی کی شکل میں ادا کرتے تھے

اس تجارت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس قدر منافع حاصل ہوا کہ انگریزی تاجروں نے کئی اور کمپنیاں قائم کرکے ہندوستان کے ساتھ کاروبار شروع کردیا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں ان سب کمپنیوں نے متحد ہو کر ایک بڑی کمپنی کی بنیاد رکھی اور اُس کا نام متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی قرار پایا۔ سترہویں صدی کے آخر تک انگریزوں نے چندرگیری، بمبئی، کلکتہ وغیرہ مقامات پر قبضہ کرلیا اور وہاں اپنی کوٹھیاں اور قلعے بنا ڈالے، ان مقامات کے علاوہ اور جگہوں پر بھی ان کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔

انگریزوں کے بعد فرانسیسی تاجر ہندوستان میں آئے، اور اُنھوں نے بھی اپنے تجارتی مرکز قائم کیے۔ ابتدا میں تو اُن کو خاصی کامیابی ہوئی مگر بعد میں انگریزوں نے اُن کو تجارتی اور ملکی معاملات میں زک دی اور ہندوستان سے ان کا تعلق ختم کردیا۔ اسی طرح دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں بھی انگریزی کمپنی کامیاب رہی۔ اور اُس نے ہندوستانی تجارت خارجہ پر پوری طرح اپنا تسلط جما لیا۔

سترہویں صدی کے آخر تک ہندوستان سے جو چیزیں خاص طور پر باہر بھیجی جاتی تھیں ان میں سوتی کپڑا، ریشم اور ریشمی کپڑا، اُون، قالین، موتی، جواہرات، زیورات، لوہے کی مصنوعات، شورہ اور نیل وغیرہ شامل تھے جس طرح آج غریب سے غریب ہندوستانی کے جسم پر مانچسٹر اور لنکاشائر کا کپڑا نظر آتا ہے اسی طرح کسی زمانہ میں انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کا گھر گھر رواج تھا۔ امیر سے غریب تک سب لوگ یہی کپڑا پہنتے تھے، اس کے علاوہ زیب و زینت اور اعلیٰ فیشن کی ضرورت بھی ہندوستانی

کپڑے سے پوری کی جاتی تھی، ہندوستانی کپڑا خوش وضع، خوش رنگ، اور مضبوط ہونے کے علاوہ بہت سستا ہوتا تھا جس کی وجہ سے یورپ کے پارچہ باف اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے۔ چنانچہ اس سے تمام یوروپین ممالک کی خصوصاً انگلستان کی صنعت پارچہ بافی کو سخت نقصان پہنچا اور لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی حتیٰ کہ انگلستان کے جلاہوں نے ہندوستانی کپڑے کی مخالفت شروع کردی۔

ہندوستانی مصنوعات کے معاوضہ میں کمپنی انگلستان سے جن چیزوں کی درآمد کرتی تھی اس میں سونے اور چاندی کی مقدار زیادہ ہوتی تھی اور روز بروز اُس کی درآمد بڑھتی جارہی تھی، کیونکہ سونے اور چاندی پر ہی ہر ملک کی دولت کا انحصار ہوتا ہے اس لیے انگلستان والوں کو کمپنی سے سخت شکایت تھی کہ وہ ملک کی ساری دولت ہندوستان منتقل کررہی ہے، جس کی وجہ سے ملک میں مفلسی اور بے روزگاری کا اضافہ ہو رہا ہے مگر کمپنی کے لیے بھی اس کے سوا چارا ہی کیا تھا کیونکہ انگلستان کی مصنوعات تو اس قابل نہ تھیں کہ وہ ہندوستان میں رواج پاتیں اور نہ کوئی پیداوار تھی جس کو ہندوستانی معاوضہ میں قبول کرتے، مجبوراً کمپنی کو سونے اور چاندی کی شکل میں قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔

اِدھر اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالت ابتر ہوگئی، چاروں طرف طوائف الملوکی پھیل گئی اور آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے صناعوں اور دستکاروں کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ اُدھر کمپنی نے اپنی حفاظت کی غرض سے ملک کی سیاست میں دخل دینا شروع کردیا۔ فرانسیسی جو بہت دنوں سے ہندوستان میں اپنی سلطنت کے منصوبے گانٹھ رہے تھے انگریزی کمپنی کے سخت دشمن ہوگئے، دونوں فریقوں میں لڑائی ہوئی اور آخرکار فرانسیسیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ اس کامیابی سے انگریزی کمپنی کے حوصلے اور بڑھے اور اُس نے چند مقامات پر قبضہ کرکے اچھی خاصی حکومت قائم کرلی اور آہستہ آہستہ ملک کے ایک بڑے حصے میں اپنا اقتدار بڑھانے کی فکر کرنے لگی اس زمانہ میں انگلستان میں ہندوستانی مصنوعات کے خلاف سخت احتجاج شروع ہوگیا اور لوگ اُس کی روک تھام کی تدبیریں کرنے لگے۔ ملک میں سودیشی کی تحریک شروع ہوئی اور لوگ پورے انہماک کے

ساتھ اپنی صنعتوں کو فروغ دینے میں مشغول ہو گئے۔ مجلس تجارت اور نوآبادیات کے کمشنروں نے بھی پارلیمنٹ سے یہی سفارش کی کہ ہندوستانی مصنوعات اور پارچہ جات کی درآمد اور اُن کا استعمال اپنی سلطنت اور نوآبادیات میں ممنوع قرار دے دیا جائے۔ غرضکہ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی تجارت خارجہ نے پلٹا کھایا، اور یہی زمانہ ہے جس میں اُس کے جدید یا موجودہ دور کا آغاز ہوا۔

سترہویں صدی تک تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا مسلک یہی رہا کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستانی مصنوعات کو ترقی دی جائے اور اُس کی تجارت کو بڑھایا جائے۔ اس غرض کے لئے اس نے انگلستان سے کاریگر بلا کر اُن سے ہندوستان میں کام لیا کیونکہ وہ ابھی تک اپنے منافع کے پھیر میں رہتی تھی لیکن جب ہموطنوں کی مخالفت بڑھتی گئی تو اس کو مجبوراً اپنا رویہ بدلنا پڑا اور اٹھارہویں صدی سے اُس نے باقاعدہ کوشش شروع کر دی کہ ہندوستانی مصنوعات کو تباہ کر کے انگلستان کی بنی ہوئی چیزوں کو رواج دیا جائے اور اس کے بدلے میں ہندوستان سے خام پیداوار کی برآمد کی جائے۔ انگلستان سے جو خطوط کمپنی کے ڈائرکٹروں کے نام آتے تھے اُن میں عام طور سے یہی ہدایت ہوتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے خام اشیاء کی پیداوار بڑھائی جائے اور مصنوعات روکی جائیں اور اس کام میں قانون سے مدد لینے میں کوئی دریغ نہ کیا جائے۔ چنانچہ بنگال میں ریشم بننے والوں کو کمپنی کے سوا اور کہیں کام کرنے کی قانوناً ممانعت کر دی گئی اور اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرتے تو ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ نوجوانوں کے انگوٹھے تک کٹوائے گئے جو ریشم بنانے کے لیے مخصوص تھے۔ ادھر تو یہ سختیاں کی گئیں، اُدھر انگلستان میں ہندوستان کی مصنوعات کی درآمد پر بڑے بڑے محصول لگا دیے گئے اور ہندوستانی ریشمی کپڑا پہننا جرم قرار دے دیا گیا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں جو مال انگلستان سے آتا تھا اُس پر کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ ہندوستانی صنعت کو ختم کرنے کے لیے کمپنی اور حکومت برطانیہ نے جو رویہ رکھا اور ہندوستانی صناعوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ انہی کی زبان سے سُنیے۔ مشہور مورخ مسٹر ولسن لکھتے ہیں:۔

"۱۸۱۲ء میں جو شہادت پیش ہوئی اس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اُس زمانہ تک ہندوستان کا سوتی اور ریشمی کپڑا اس قدر ارزاں تھا کہ برطانیہ کے بازاروں میں برطانوی کپڑے

کے مقابلے میں ۵۰ اور ۶۰ فیصدی کم قیمت پر بھی کافی منافع سے فروخت ہوتا تھا۔ اس لیے کہ برطانیہ نے اپنی صنعت پارچہ بافی کی حفاظت کی خاطر ہندوستانی کپڑے کی درآمد پر ۷۰ اور ۸۰ فیصدی محصول لگائے۔ اگر یہ تدبیر نہ کی جاتی تو لنکا شائر اور مانچسٹر کے کارخانے شروع سے ہی بیکار پڑے رہتے، کسی طرح نہ چل سکتے، خواہ دُخانی انجن کتنا ہی زور لگاتے۔ لیکن ہندوستانی صنعت کو تباہ کرکے یہ کارخانے چلائے گئے۔ اگر ہندوستان بھی آزاد اور خودمختار ہوتا تو اس کا بدلہ لیتا، اور وہ بھی برطانوی مصنوعات کی درآمد پر اپنے ہاں محصول لگاتا اس طرح اپنی صنعت کو کبھی تباہ و برباد نہ ہونے دیتا لیکن اس میں اپنی حفاظت اور مدافعت کی طاقت ہی کہاں تھی وہ تو خوداردار اجنبی حکومت کے ہاتھوں میں بندھا ہوا تھا اور اس کے رحم و کرم کا محتاج تھا۔ برطانوی مصنوعات اس کے سر زبردستی تھوپی گئیں، جن پر کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ اس طرح برطانوی صناعوں نے جو برابری کے ساتھ ہندوستانی صناعوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے سیاسی ناانصافی کے زور سے مقابلہ روک کر اپنا کام بنا لیا۔"

مسٹر ولسن کا یہ بیان سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی اور برطانوی تجارت کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔

کمپنی کو ہندوستان میں بلاشرکت غیرے ابھی تک جو اجارہ حاصل تھا اس کے خلاف انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان کے تاجروں نے احتجاج شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کمیٹی ہندوستان میں معاشی تحقیقات کی غرض سے بھیجی گئی اور ۱۸۱۳ء میں کمپنی کا اجارہ ختم کر دیا گیا اور انگریزی تاجروں کو ہندوستان میں اپنے طور سے تجارت کرنے کی عام اجازت دیدی گئی۔ اپنی رپورٹ میں کمیٹی نے جس چیز پر زیادہ زور دیا تھا وہ یہ تھی کہ ہندوستانی مصنوعات کو ختم کر کے انگریزی مصنوعات کو کس طرح رواج دیا جائے، انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کرنے کے کیا کیا موقعے حاصل ہیں۔ نیز رپورٹ سے یہ بھی

یہ بیان ہے کہ کمپنی نے صنعتوں کو تباہ کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی تھیں وہ کس قدر کارگر ثابت ہوئیں۔

اس زمانے میں کلکتہ کی بندرگاہ پر جو دیشی مصنوعات درآمد ہوتی تھیں اُن پر صرف ۲½ فیصدی محصول لیا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں لندن میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

ہندوستانی مصنوعات	محصول فیصدی		
	سنہ ۱۸۱۲ء	سنہ ۱۸۲۴ء	سنہ ۱۸۳۲ء
ریشمی کپڑا	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۲۰ فیصدی
زربفت	"	۳۰ فیصدی	۳۰ فیصدی
شال	۷۱ فیصدی	۶۷½ فیصدی	۳۰ فیصدی
چھینٹ	۷۱⅔ فیصدی	۶۷½ فیصدی	۱۰ فیصدی
قالین	۶۶⅔ فیصدی	۵۰ فیصدی	۲۰ فیصدی
بانات کا آرائشی سامان	۷۱ فیصدی	۵۰ فیصدی	۳۰ فیصدی
سوتی کپڑا	۶۷½ فیصدی	۵۰ فیصدی	۲۰ فیصدی

ریشم کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی، سنہ ۱۸۱۲ء میں اس کی درآمد پر ۳ فیصدی محصول وصول کیا جاتا تھا، سنہ ۱۸۲۴ء میں تین روپے فی پاؤنڈ سنہ ۱۸۳۲ء میں صرف ایک آنہ فی پاؤنڈ رہ گیا۔

انگلستان کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی ہندوستانی کپڑے کا رواج بہت تھا، اُنہوں نے بھی اپنی اپنی صنعت کو ترقی دینے کی خاطر ہندوستانی مصنوعات پر بڑے بڑے تامینی محصول عائد کرکے اس کی درآمد روک دی۔ مختلف ملکوں میں ہندوستانی کپڑے کی درآمد میں جو کمی ہوئی وہ ذیل کے اعداد سے واضح ہوجائیگی۔

انگلستان سنہ ۱۸۰۳ء میں ۱۴۸۱۷ گانٹھ کپڑا

انگلستان	۱۸۲۹ء	میں	۴۲۳	گانٹھ کپڑا
امریکہ	۱۸۰۱ء	میں	۱۳۶۳۳	" "
	۱۸۲۹ء	میں	۲۵۸	" "
ڈنمارک	۱۸۰۰ء	میں	۱۴۵۷	" "
	۱۸۲۰ء	میں	۱۵۰	" "
پرتگال	۱۷۹۹ء	میں	۹۱۱۴	" "
	۱۸۲۵ء	میں	۱۰۰۰	" "
عرب و روس	۱۸۱۰ء	میں	۶۰۰۰	" "
	۱۸۲۵	میں	۱۰۰۰	" "

غرضکہ ہر ملک نے اپنی اپنی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر ہندوستان کی بنی ہوئی چیزوں کو اپنے ملک میں آنے سے روک دیا، سنہ ۱۸۱۳ء میں تین کروڑ روپے کا کپڑا ہندوستان سے لندن گیا اور سنہ ۱۸۳۰ء میں اُلٹا تین کروڑ روپیہ کا ولایتی کپڑا ہندوستان پہنچا۔ سنہ ۱۸۲۴ء میں انگلستان سے کل کپڑا آٹھ لاکھ اٹھارہ ہزار گز آیا لیکن سنہ ۱۸۳۵ء میں اس کی مقدار بڑھ کر پانچ کروڑ، چھہتر لاکھ گز ہوگئی۔ اس طرح اور مصنوعات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ دوسرے خودمختار ممالک کے ساتھ بھی ہندوستان کو ایسا ہی سابقہ پڑا اور کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی سوئی اور تاگے کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہوگئے۔

جوں جوں کمپنی کے مقبوضات بڑھتے گئے اس کی توجہ ملکی انتظامات کی طرف رہنے لگی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۳۲ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک کمپنی بحیثیت حکمراں کے ہندوستان میں رہی اور انگلستان کے عام تاجر ہندوستان سے کاروبار کرنے لگے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کمپنی حکومت سے دست بردار ہوگئی اور تاج برطانیہ نے سلطنت ہند کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ اور اس کے معاوضہ میں کمپنی کا جو روپیہ ہندوستان میں صرف ہوا تھا وہ قرض لے کر ادا کردیا اور یہ قرض ہندوستان کے نام لکھ دیا گیا، جس کا سود اب تک ہندوستانی محاصل سے ادا کیا جاتا ہے، تاریخ عالم میں ایسی خرید و فروخت کی یہ پہلی اور آخری مثال ہے۔

۱۸۵۸ء سے ۱۹۱۴ء تک یعنی جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان کی درآمد و برآمد پر وقتاً فوقتاً جو محاصل عائد ہوتے رہے۔ درآمد پر جو تبدیلیاں ہوئیں اُس کی مختصر کیفیت سُنیے۔

۱۸۵۸ء میں برطانوی مصنوعات کی درآمد پر پانچ فیصدی اور دیگر ممالک کی مصنوعات پر دس فیصدی محصول مقرر کیا گیا، اس طرح ولایتی سوت پر ۵ فیصدی اور سوتی کپڑے پر ۱۰ فیصدی محصول لیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں برطانوی اور غیر برطانوی مصنوعات کی تفریق اُٹھا دی گئی اور اب تعیشات پر ۲۰ فیصدی اور باقی سامان پر ۱۰ فیصدی محصول درآمد لیا جانے لگا تاکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں جو خرچ زیادہ پڑا تھا وہ پورا کیا جائے۔ ۱۸۶۰ء میں ملکی تفریق کے سوت اور کپڑے پر ۱۰ فیصدی کی بجائے ۳½ اور ۵ فیصدی محصول مقرر ہوا تاکہ ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا برطانوی کپڑے کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۸۶۵ء عام محصول کی شرح ۱۰ فیصدی سے گھٹ کر ۵ فیصدی رہ گئی، لیکن روئی کی مصنوعات پر محصول حسب سابق قائم رہا۔

۱۸۷۲ء میں بمبئی میں پارچہ بافی کے چار پانچ کارخانے کھل چکے تھے، اور ہندوستان میں سوتی کپڑا تیار ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر مانچسٹر اور لنکا شائر کے کارخانے دار گھبرائے۔ اُس وقت ولایتی کپڑے کی درآمد پر برائے نام محصول لیا جاتا تھا اُس کے خلاف شور مچایا اور ۱۸۷۷ء میں پارلیمنٹ سے حکومت ہند کے نام یہ حکم جاری کروایا کہ ہندوستان میں ولایتی کپڑوں پر جو محصول لیا جاتا ہے وہ ایک طرح سے ہندوستانی کپڑوں کو تامین دیتا ہے اور یہ آزاد تجارت کے اصول کے خلاف ہے، اس لیے جہاں تک ہو سکے ولایتی کپڑے کی درآمد پر محصول ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۷۸ء میں ولایتی کپڑے پر سرے سے محصول اُڑا دیا گیا۔ ان آزاد تجارت کے حامیوں کی عقل نہ معلوم اُس وقت کہاں ماری گئی تھی جب کہ ہندوستانی مصنوعات پر تاوانی محصول لگا کر اُن کو تباہ کیا گیا۔ لیکن اس پر بھی ان آزاد تجارت کے حامیوں کی تشفی نہ ہوئی اور وہ برابر دوسری اشیاء کی درآمد پر بھی محصول ختم کر دینے کا مطالبہ کرتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ء میں تمام ولایتی اشیاء کا محصول معاف ہو گیا۔ صرف شراب اور نمک پر تھوڑا سا محصول قائم رہا۔ ۱۸۹۲ء میں روپے کی شرح مبادلہ بہت بڑھ گئی اور حکومت کے فوجی اخراجات بھی بڑھ گئے۔

جس کی وجہ سے حکومت کے میزانیہ میں چار لاکھ کا خسارہ ہوا تب حکومت نے مجبور ہو کر بیشتر اشیاء پر پھر ۵ فیصدی محصول عائد کر دیا۔ لوہے اور فولاد کی مصنوعات پر محصول کی مقدار صرف ایک فیصدی رہی، ریل کا سامان صنعتی اور زراعتی مشینیں اور کلیں، سونا، کوئلہ اور مطبوعہ کتابیں محصول سے مستثنیٰ رہیں۔ روئی کی مصنوعات کی درآمد پر بھی اور اشیاء کی طرح ۵ فیصدی محصول مقرر ہوا۔ ہندوستانی ملوں کے باریک سوت پر بھی ۵ فیصدی محصول اس غرض سے لگایا گیا کہ ولایتی کپڑے کو ہندوستان میں تامین حاصل ہو مگر باوجود اس کے انگریزی تاجروں نے حکومت ہند پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہندوستانی کارخانوں کے ساتھ خاص رعایت کرتی ہے اور برابر اس کی مخالفت کرتے رہے۔ آخر حکومت نے ۱۸۹۶ء میں سوتی کپڑے کے محصول کے متعلق ایک نیا قانون پاس کیا جس کی رو سے ہر قسم کا ولایتی اور دیسی سوت محصول سے بری کر دیا گیا۔ اس کی جگہ ہر قسم کے دیسی اور ولایتی کپڑے پر ۳½ فیصدی محصول مقرر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے جو موٹا کپڑا جاپان جاتا تھا گراں ہو گیا اور دن بدن اس کی برآمد کم ہوتی گئی اور کچھ عرصہ کے بعد جاپان کے موٹے کپڑے نے اس کی جگہ لے لی۔ مصر اور امریکہ سے جو لمبے ریشے کی روئی ہندوستان میں آتی تھی اس پر ۵ فیصدی محصول مقرر کیا تاکہ ہندوستانی کارخانے ولایتی باریک سوت کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ غرضکہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت کی ترقی میں روڑے اٹکائے گئے۔ ۱۹۱۴ء تک ولایتی کپڑے کی درآمد پر یہی محصول قائم رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں ماریشس اور جمیکا برطانوی مقبوضات سے شکر درآمد ہوتی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں جرمنی اور آسٹریا سے بھی چقندر کی شکر آنے لگی۔ ماریشس اور جمیکا کی شکر اس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکی تو حکومت نے جرمنی اور آسٹریا کی شکر کی درآمد پر ۵ فیصدی محصول مزید عائد کر دیا تاکہ برطانوی شکر کو اس سے امن حاصل ہو مگر جرمنی کی شکر کو وہاں کی حکومت سے امداد ملتی تھی کہ باوجود زائد محاصل کے برطانوی شکر کے مقابلہ میں ارزاں ہی فروخت ہوتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں برطانیہ کی کوشش سے برسلز میں ایک شکر کی کانفرنس ہوئی اور آپس میں چند معاہدے ہوئے جن کی رو سے جرمنی اور آسٹریا کی شکر پر جو مزید محصول لیا جاتا تھا وہ معاف کر دیا گیا۔ ۱۹۰۳ء تک تمام ممالک سے

ہندوستان میں شکر کی درآمد ہوتی تھی اور سب یکساں قیمت پر فروخت ہوتی تھیں لیکن باوجود اس کے ہندوستانی شکر کی صنعت میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ دورانِ جنگ میں جب جرمنی سے شکر آنی بند ہوگئی تو اس کی جگہ جاوا کی شکر نے لے لی۔

سنہ ۱۹۱۰ء تک جتنے بھی محاصل حکومت نے درآمد پر لگائے اس سے اس کا مقصد ہندوستانی صنعتوں کو تامین دینا نہ تھا بلکہ یہ محاصل محض ملکی اخراجات کی رعایت سے عائد کیے جاتے تھے۔

ہندوستان سے جو اشیاء برآمد ہوتی تھیں اُن میں زیادہ تر خام پیداوار ہوتی تھی جس پر برائے نام محصول لیا جاتا تھا۔

ذیل میں بیسویں صدی کے شروع سے جنگ عظیم تک کی سالانہ درآمد برآمد کے اعداد و شمار درج ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ جنگ سے پہلے ہندوستان کی تجارت خارجہ کی کیا کیفیت رہی۔

سال	درآمد بحساب کروڑ روپیہ	برآمد بحساب کروڑ روپیہ	زائد برآمد بحساب کروڑ روپیہ
سنہ ۱۹۰۰-۴ء	۱۱۰٫۶۹	۱۳۵٫۵۹	۲۴٫۹۰
سنہ ۱۹۰۴-۵ء	۱۴۳٫۹۲	۱۷۴٫۲۶	۳۰٫۳۴
سنہ ۱۹۰۵-۶ء	۱۴۳٫۷۶	۱۷۷٫۳۰	۳۳٫۵۴
سنہ ۱۹۰۶-۷ء	۱۶۱٫۸۷	۱۸۲٫۷۴	۲۰٫۸۷
سنہ ۱۹۰۷-۸ء	۱۷۸٫۷۸	۱۸۲٫۹۳	۴٫۰۰
سنہ ۱۹۰۸-۹ء	۱۵۱٫۵۳	۱۵۸٫۴۶	۶٫۹۳
سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء	۱۶۰٫۱۷	۱۹۴٫۳۶	۲۴٫۱۹
سنہ ۱۹۱۰-۱۱ء	۱۷۳٫۴۷	۲۱۷٫۰۸	۴۳٫۶۱
سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء	۱۹۷٫۵۲	۲۳۸٫۳۶	۴۰٫۸۴
سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء	۲۲۸٫۴۶	۲۵۶٫۸۵	۲۸٫۳۹
سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۲۳۴٫۷۵	۲۵۵٫۲۵	۲۰٫۵۰

ان اعداد و شمار میں سونے اور چاندی کی درآمد بھی شامل ہے گویا ہندوستان کی برآمد درآمد کے مقابلہ میں کم و بیش ہمیشہ زیادہ رہی۔

ان سالوں میں خالص سونے کی برآمد کے اعداد حسب ذیل ہیں:-

سنہ ۱۹۰۰-۱ء	۸۴۲۱ ہزار روپے	سنہ ۱۹۰۱-۲ء	۱۹۳۷۶ ہزار روپے	سنہ ۱۹۰۲-۳ء	۸۷۵۴۶ ہزار روپے
سنہ ۱۹۰۳-۴ء	۹۹۱۳۷ "	سنہ ۱۹۰۴-۵ء	۹۷۰۵۹ "	سنہ ۱۹۰۵-۶ء	۴۶۸۰ "
سنہ ۱۹۰۶-۷ء	۱۴۸۵۶۱ "	سنہ ۱۹۰۷-۸ء	۱۷۳۶۷۷ "	سنہ ۱۹۰۸-۹ء	۴۳۴۵۴ "
سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء	۲۱۶۷۹۳ "	سنہ ۱۹۱۰-۱۱ء	۲۳۹۷۸۶ "	سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء	۳۷۷۵۹۸ "
سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء	۳۴۰۰۱۲ "	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۲۳۳۲۳۸ "	سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء	۷۶۴۷۸ "

دوران جنگ سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء میں ۱۰۹۱۰۰۰ روپے کا سونا برآمد ہوا اور جنگ کے بعد سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں اور سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ۵۵۶۳۷۰۰۰ اور ۲۶۶۴۵۰۰۰ روپے کا سونا برآمد ہوا۔

دوران جنگ میں اور اس کے کئی سال بعد تک تجارت خارجہ کی حالت بہت ناقابل اطمینان رہی۔ یہ زمانہ یورپ کے صنعتی ملکوں کی پریشانیوں کا زمانہ تھا۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی صنعتوں کو بہت فروغ ہوا اور باہر سے مال آنا کم ہو گیا سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء میں جا کر پھر کہیں تجارت خارجہ کی گرم بازاری شروع ہو گئی اس کے بعد کو درآمد و برآمد کے توازن کی جو حالت رہی وہ حسب ذیل ہے:-

سال	درآمد بحساب کروڑ روپیہ	برآمد بحساب کروڑ روپیہ	زائد برآمد و درآمد بحساب کروڑ روپیہ
سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	۲۵۳،۳۶۳۷	۴۰۰،۲۴۲۷	۱۴۶،۸۷۹۰ زائد برآمد
سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	۲۳۶،۰۰۱۳	۳۸۶،۸۱۲۲	۱۵۰،۸۱۰۹ "
سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	۲۴۰،۸۱۸۴	۳۱۱،۰۵۰۴	۷۰،۲۳۲۰ "
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	۲۶۱،۵۳۴۰	۳۳۰،۲۶۳۷	۶۸،۷۲۹۷ "
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	۲۵۳،۳۰۶۰	۳۲۰،۱۲۷۹	۶۷،۸۲۱۹ "
سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۲۴۰،۷۹۶۹	۳۱۰،۸۰۵۵	۷۰،۰۰۸۶ "
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۱۶۴،۷۹۳۷	۲۲۰،۴۹۲۴	۵۵،۶۹۸۶ "
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۱۲۶،۳۷۰۷	۱۵۵،۸۸۸۶	۲۹،۵۱۴۹ "

سال	درآمد بحساب کروڑ روپیہ	برآمد بحساب کروڑ روپیہ	زائد برآمد و درآمد بحساب کروڑ روپیہ
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۱۳۲٫۵۸۴۳	۱۳۲٫۴۰۳۷	۰۰٫۱۸۰۶ زائد درآمد
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۱۱۵٫۳۸۶۱	۱۴۶٫۳۱۶۶	۳۰٫۹۳۹۵ زائد برآمد
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۱۳۴٫۳۲۷۲	۱۶۰٫۵۲۱۹	۲۶٫۰۹۷۴ "
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۱۲۵٫۲۳۲۸	۱۹۶٫۱۲۴۶	۷۰٫۸۸۱۸ "

پچھلے چند سالوں میں سونے کی خالص درآمد و برآمد حسب ذیل ہیں۔

سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	درآمد ۷۳۰۹۲۶۶	سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	درآمد ۳۴۸۵۴۵	سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	درآمد ۱۹۴۰۰۵
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	" ۱۸۰۹۹۰	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	" ۲۱۱۹۸۷	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	" ۱۴۲۲۰۸
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	" ۱۲۷۵۳۲	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	برآمد ۵۷۹۷۲۸	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	برآمد ۶۵۵۲۲۸
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	برآمد ۵۷۰۵۳۶	سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	" ۵۲۵۳۷۵		

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے ہندوستان سے سونا برابر جارہا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی خام پیداوار کی مانگ بھی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے اب تجارت کا توازن ہمیشہ ہندوستان کے ناموافق رہتا ہے۔

جنگ سے پہلے اور بعد ہندوستانی تجارت خارجہ میں مختلف ممالک کا جو حصہ رہا وہ حسب ذیل ہے۔

ملک	درآمد			برآمد		
	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء
برطانیہ	۶۲٫۸	۵۷٫۶	۴۱٫۳	۲۵٫۱	۲۴٫۲	۳۲٫۲
جرمنی	۶٫۴	۲٫۸	۷٫۷	۹٫۸	۴٫۹	۶٫۶
جاوا	۶٫۴	۶٫۸	۲٫۱	۱٫۲	۱٫۰	٫۳
جاپان	۲٫۵	۶٫۹	۱۴٫۲	۷٫۵	۱۳٫۳	۸٫۷
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳٫۱	۸٫۵	۶٫۲	۷٫۵	۱۲٫۰	۹٫۶
بلجیم	۱٫۹	۱٫۸	۲٫۳	۵٫۳	۳٫۷	۳٫۰
آسٹریا	۲٫۲	٫۲	٫۴	۳٫۵	٫۲	۰
اسٹریٹ سٹلمنٹ	۲٫۱	۱٫۹	۲٫۳	۳٫۴	۲٫۷	۲٫۳
فرانس	۱٫۵	٫۹	۱٫۳	۶٫۶	۳٫۸	۵٫۰
فارس	٫۴	٫۷	۱٫۲	٫۵	۱٫۳	٫۶

ملک	درآمد سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	درآمد سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	درآمد سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	برآمد سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	برآمد سنہ ۱۹۲۴-۲۵	برآمد سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء
ماریشس	۱٫۸	۳٫۲	۰	٫۶	۳٫۱	٫۵
اٹلی	۱٫۰	۱٫۰	۲٫۵	۳٫۲	۳٫۲	۳٫۹
چین	۱٫۱	۱٫۲	۱٫۹	۳٫۹	۳٫۶	۴٫۰
نیدرلینڈ	٫۹	٫۹	۱٫۶	۱٫۵	۱٫۵	۲٫۸
آسٹریلیا	٫۷	۱٫۳	٫۹	۱٫۴	۱٫۷	۲٫۹
ہانگ کانگ	٫۷	٫۷	٫۴	۲٫۱	۲٫۳	٫۸
روس	٫۱	٫۰۵	۱٫۴	٫۹	۰	٫۱
سیلون	٫۵	٫۷	۱٫۱	۳٫۷	۴٫۸	۴٫۲
دیگر	۳٫۹	۳٫۸۵	۱۱٫۲	۱۰٫۴	۱۱٫۷	۱۲٫۵

پچھلے دو سالوں میں جن اشیار کی درآمد و برآمد ہوئی ان کی فہرست قیمتوں وار حسب ذیل ہے:-

درآمد

نام اشیا جن کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہو	سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء
روئی اور اُس کی مصنوعات	۲۷۸۹۶۲ ہزار روپیہ	۲۳۳۳۰۲ ہزار روپیہ
مختلف قسم کی مشنری	۱۳۶۹۶۶ 〃 〃	۱۴۱۳۹۴ 〃
خام دھاتیں	۱۲۰۳۳۲ 〃 〃	۹۶۸۷۰ 〃
تیل	۷۲۳۵۴ 〃 〃	۷۲۵۲۷ 〃
موٹر اور دوسری گاڑیاں	۶۹۲۱۴ 〃 〃	۶۵۷۷۸ 〃
اوزار، آلات اور پرزے	۵۱۷۶۲ 〃 〃	۵۱۹۱۴ 〃
مصنوعی ریشم	۳۱۵۷۸ 〃 〃	۳۸۵۶۰ 〃

کھانے پینے کا سامان	۳۱۱۸۷ ہزار روپیہ	۳۲۰۲۲ ہزار روپیہ
رنگ	۳۳۳۶۷ "	۳۰۱۳۴ "
دھات کے برتن اور سامان	۳۲۶۷۶ "	۲۸۹۳۵ "
اون اور اونی مصنوعات	۲۷۸۵۴ "	۲۸۶۹۴ "
کاغذ	۲۹۹۰ "	۲۸۱۶۰۱ "
کیمیائی چیزیں	۳۱۱۸۸ "	۲۷۲۱۹ "
ریشم اور ریشمی مصنوعات	۲۷۷۶۵ "	۲۴۱۸۷ "
شراب	۲۴۷۵۷ "	۲۳۹۶۱ "
ربڑ کی مصنوعات	۲۰۶۸۵ "	۲۱۱۳۱ "
دوائیں	۲۱۱۱۷ "	۲۰۷۰۲ "
مسالے	۱۶۱۷۷ "	۱۸۷۷۵ "
پھل اور ترکاریاں	۱۳۳۴۱ "	۱۴۱۶۹ "
شیشہ اور شیشے کا سامان	۱۳۹۴۰ "	۱۲۷۹۲ "
میزان قیمت اشیاء جنکی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہے	۱۰۸۵۰۲۱ ہزار روپیہ	۱۰۱۱۲۳۴ ہزار روپیہ
میزان قیمت اشیاء جنکی قیمت ایک کروڑ سے کم ہے۔	۲۵۹۲۵۱ "	۲۴۱۱۹۴ "
کل میزان درآمد	۱۳۴۴۲۷۲ "	۱۲۵۲۴۲۸ "

برآمد

نام اشیاء جنکی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہے	۱۹۳۵-۳۶ء	۱۹۳۶-۳۷ء
روئی خام اور گودڑ	۳۴۴۷۰۴ ہزار روپیہ	۴۵۱۷۳۵ ہزار روپیہ
روئی کی مصنوعات	۲۹۲۷۲ "	۳۷۸۴۳ "
سن خام	۱۳۷۰۷۶ "	۱۴۷۷۱۰ "

سن کی مصنوعات	۲۳۴۸۹۵ ہزار روپیہ	۲۷۹۴۷۵ ہزار روپیہ
چائے	۱۹۸۲۴۱ 〃	۲۰۰۳۸۱ 〃
مختلف قسم کے بیج	۱۰۲۳۰۵ 〃	۱۸۴۶۹۳ 〃
غلہ، دالیں اور آٹا وغیرہ	۱۲۴۰۸۷ 〃	۱۵۳۷۹۲ 〃
دھاتیں	۷۷۳۳۵ 〃	۸۰۱۹۲ 〃
دباغت کیا ہوا چمڑا	۵۶۲۸۹ 〃	۷۳۶۳۷ 〃
کھالیں	۴۱۳۱۰ 〃	۴۴۳۴۰ 〃
اون اور اونی مصنوعات	۲۹۲۵۶ 〃	۲۷۳۸۹ 〃
لاکھ	۱۵۸۳۶ 〃	۲۳۴۲۱ 〃
کھلی	۱۸۱۷۰ 〃	۲۲۶۹۳ 〃
متفرق	۲۲۷۸۷ 〃	۱۹۵۹۹ 〃
ٹمبر اور مختلف قسم کی دوسری عمارتی لکڑی	۱۳۴۵۷ 〃	۱۷۷۴۷ 〃
پھل اور ترکاریاں	۱۶۴۶۶ 〃	۱۶۹۸۹ 〃
میزان قیمت اشیا جنکی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہے	۱۴۶۲۴۸۶ ہزار روپیہ	۱۷۹۱۶۳۹ ہزار روپیہ
میزان قیمت اشیا جن کی قیمت ایک کروڑ سے کم ہے	۱۳۲۷۳۳ 〃	۱۶۹۶۰۷ 〃
میزان کل قیمت اشیاء برآمد	۱۶۰۵۲۱۹ 〃	۱۹۶۱۲۴۶ 〃

ان اعداد و شمار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درآمد و برآمد میں روئی اور روئی کی مصنوعات کو پرانے زمانہ کی طرح آج بھی سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے فرق صرف یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں کے بنے ہوئے کپڑے کی برآمد زیادہ ہوتی تھی لیکن اب خام روئی کی برآمد زیادہ ہوتی ہے اور مصنوعہ روئی کی درآمد کثرت سے ہوتی ہے۔ جنگ سے پہلے ہندوستان میں روئی کی مصنوعات کے محصول پر جو تبدیلیاں ہوئیں اس کا ذکر مختصراً ہو چکا ہے۔ جنگ کے بعد اس کی جو حالت رہی وہ یہ ہے :-

جنگ سے پہلے انگریزی تاجروں نے حکومت ہند کو مجبور کیا تھا کہ وہ مانچسٹر اور لنکا شائر کے کپڑے پر محصول درآمد کم کر دے چنانچہ ان کے حسب منشا، دیسی اور ولایتی پارچہ جات پر محصول ۳½ فیصدی ہو گیا تھا لیکن دورانِ جنگ میں حکومت کے اخراجات بڑھے تو محصول بڑھانے کی بھی ضرورت ہوئی حکومت نے بدیسی پارچہ جات کی درآمد پر بلا کسی امتیاز یا شاہی ترجیح کے ۳½ فیصدی کی بجائے ۷½ فیصدی محصول عائد کر دیا۔ اور دیسی کپڑے پر ۳½ فیصدی ہی قائم رکھا۔ کیونکہ ہندوستانی اس محصول کے پہلے ہی سے مخالف تھے۔ اس نازک موقع پر دیسی مال پر محصول بڑھانا گویا جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالنا تھا لیکن سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں حکومت نے چاہا کہ دیسی کپڑے پر بھی ۷½ فیصدی محصول عائد کر دیا جائے لیکن مجلس قانون ساز نے اسے نامنظور کر دیا اور یہ تجویز پاس کی کہ بدیسی کپڑے کی درآمد پر بجائے ۷½ فیصدی محصول کے ۱۱ فیصدی کر دیا جائے تاکہ ملک کے سوتی کپڑے کو تامین ملے۔ بدیسی سوت پر بھی ۵ فیصدی محصول لگا دیا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں روئی کی مصنوعات کو بہت ترقی حاصل ہوئی اور اس سال بہت سے نئے کارخانوں کا بھی اضافہ ہوا۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں کپڑے کے کارخانے کے مالکوں اور مزدوروں میں کشمکش شروع ہوئی۔ مزدور عام گرانی کی وجہ سے اُجرتیں بڑھوانا چاہتے تھے اور سرمایہ دار یہ عذر کرتے تھے کہ ابھی اُجرتوں میں اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مزدوروں نے ہڑتالیں شروع کر دیں۔ آخرکار کارخانہ کے مالکوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ سوتی کپڑے پر جو ۳½ فیصدی محصول جنگی لیا جاتا ہے وہ معاف کر دیا جائے تاکہ وہ مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ کر سکیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۶ء میں حکومت نے یہ محصول معاف کر دیا اور اعلیٰ قسم کے بدیسی اونی اور ریشمی کپڑے پر ۱۵ سے ۳۰ فیصدی محصول مقرر کر دیا۔ اس عرصہ میں جاپان نے صنعت پارچہ بافی میں بہت ترقی کر لی اور اپنا سامان ہندوستان میں بھیجنا شروع کر دیا جس کا مقابلہ نہ تو برطانوی کپڑا کر سکا اور نہ دیسی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ایک نیا قانون تحفظ پارچہ بافی منظور ہوا جس کی رو سے بدیسی کپڑے کی درآمد پر تین سال کے لیے ۵۰ فیصدی محصول عائد کر کے ہندوستانی پارچہ صنعت بافی کو تامین دی گئی لیکن برطانیہ کو ۵ فیصدی شاہی ترجیح حاصل رہی۔ سنہ ۱۹۳۳ء

میں غیر برطانوی کپڑے پر ۵۰ فیصدی کی بجائے ۷۵ فیصدی محصول لگا دیا گیا۔ حکومت کی اس حرکت سے جاپانی کارخانہ دار بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے بھی ہندوستانی روئی کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس وقت ہندوستانی روئی کا سب سے بڑا خریدار جاپان ہی تھا۔ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں جاپان میں ہندوستانی روئی گیارہ کروڑ روپیہ کی درآمد ہوئی۔ یعنی ہندوستانی روئی کی کل برآمد میں تقریباً آدھا حصہ جاپان کا رہا۔ اب اس نے امریکہ اور حبش سے روئی خریدنی شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے ہندوستانی روئی کی برآمد گھٹنی شروع ہوئی تو حکومت نے جاپان کو ایک نئے تجارتی معاہدہ کرنے کی اجازت دی اور کئی مہینوں کی گفت وشنید کے بعد ہندوستانی اور جاپانی نمائندوں میں ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جاپان ہر سال ۳۲۵ ملین گز کپڑا ہندوستان بھیجیگا اور اس کے بدلے میں ایک ملین روئی کی گانٹھیں ہندوستان سے خریدیگا۔

جنگ سے پہلے اور پچھلے چند سالوں میں جاپان سے سوتی اور ریشمی مصنوعات کی درآمد کا جو اوسط رہا وہ حسب ذیل ہے:۔

	سوتی مصنوعات	ریشمی مصنوعات
سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں	۱ر۸ فیصدی	۴۶ر۸ فیصدی
سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں	۳۸ر۰ 〃	۶۳ر۸ 〃
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں	۳۵ر۰ 〃	۷۳ر۲ 〃

اس کے مقابلہ میں برطانوی سوتی اور ریشمی کپڑے کا اوسط ملاحظہ فرمائیے:

	سوتی مصنوعات	ریشمی مصنوعات
سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں	۹۰ر۱ فیصدی	۹ر۰ فیصدی
سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں	۵۳ر۰ 〃	۳ر۷
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں	۵۸ر۰ 〃	۲ر۸

اس عرصہ میں سلطنت برطانیہ اور ہندوستانی کارخانہ والوں میں ایک معاہدہ اوٹاوہ پیکٹ کے

نام سے ہوا جس میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان میں بدیسی کپڑے کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا ہے اُس میں برطانیہ کو ۱۰ فیصدی شاہی ترجیح حاصل ہوگی اور اس کے مقابلہ میں انگلستان میں ہندوستانی اشیاء کی درآمد پر ۱۰ فیصدی محصول معاف ہوگا۔ دوسری نوآبادیات میں برطانیہ کو جو رعایتیں حاصل ہونگی اُس میں ہندوستان بھی شریک ہوگا۔ بظاہر تو اس معاہدہ میں کوئی بات قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی برآمد میں انگلستان کا ۳۰ فیصدی حصہ ہے اور اس میں بیشتر اشیاء ایسی ہیں جن کا ہندوستان کو پورا اجارہ حاصل ہے۔ مثلاً سن، روئی اور غلہ وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں کوئی رعایت دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کی مانگ دوسرے ملکوں میں بھی ہے۔ رعایت کی ضرورت تو اُس میں ہوتی ہے جس میں دوسروں سے مقابلہ ہو۔ برعکس اس کے ہندوستان میں برطانوی مال کی ۵۰ فیصدی سے بھی زیادہ درآمد ہوتی ہے اور مقابلہ میں دیسی مال کے علاوہ جاپان بھی ہے۔ ظاہر ہے اس کا اثر دیسی کپڑے پر پڑیگا جس کو ابھی تامین کی سخت ضرورت ہے چنانچہ اٹاوہ کے معاہدہ کے بعد سے برطانی مال کی درآمد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستانی روئی اور روئی کی مصنوعات کی درآمد و برآمد میں مختلف ممالک کا جو حصہ جنگ سے پہلے اور پچھلے چند سالوں میں رہا وہ حسب ذیل ہے۔

ملک	درآمد			ملک	برآمد		
	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء		سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء
برطانیہ متحدہ	۱ء۹۰ فیصدی	۵۳ء۰ فیصدی	۸ء۵۸ فیصدی	برطانیہ متحدہ	۳ء۵ فیصدی	۸ء۷ فیصدی	۶ء۱۲ فیصدی
امریکہ	۴ء۰ ״	۳ء۱ ״	۱ء۰ ״	امریکہ	—	۰ء۳ ״	۰ء۹ ״
جرمنی	۱ء۲ ״	۰ء۳ ״	۰ء۲ ״	جرمنی	۱۴ء۶ ״	۶ء۵ ״	۷ء۹ ״
جاپان	۱ء۸ ״	۳۸ء۰ ״	۳۵ء۰ ״	جاپان	۴۲ء۲ ״	۵۴ء۵ ״	۳۹ء۶ ״
فرانس		۲ء۰ ״	۰ء۲ ״	فرانس	—	۵ء۷ ״	۵ء۷ ״
اٹلی	۱ء۵ ״	۰ء۸ ״	۰ء۱ ״	اٹلی	۷ء۷ ״	۷ء۶ ״	۹ء۰ ״

ملک	درآمد			ملک	برآمد		
	سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء	سنہ ۳۴-۱۹۳۳		سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء	سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء
چین	۰٫۱ فیصدی	۳٫۳ فیصدی	۳٫۸ فیصدی	چین	۱٫۷ فیصدی	۶٫۵ فیصدی	۱۲٫۱ فیصدی
سوئٹزرلینڈ	—	۰٫۵ "	۰٫۲ "	بلجیم	۱۰٫۳ "	۶٫۳ "	۵٫۴ "
دیگر	۴٫۰ "	۰٫۸ "	۰٫۷ "	اسپین	—	۲٫۳ "	۲٫۴ "
				نیدرلینڈ	—	۱٫۶ "	۲٫۰ "
				دیگر	۸٫۰	۰٫۹ "	۳٫۴ "

ہندوستانی سوتی کپڑے کی ملوں کی رفتار ترقی حسب ذیل ہے :-

سال	تعداد مل	تعداد مزدور
سنہ ۸۰-۱۸۷۹ء میں	۵۸	۳۹۵۳۷
سنہ ۸۹-۱۸۸۸ء میں	۱۰۹	۹۲۱۲۶
سنہ ۰۱-۱۹۰۰ء میں	۱۷۴	۱۵۶۱۳۲
سنہ ۱۰-۱۹۰۹ء میں	۲۳۳	۲۳۳۶۱۲۰
سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں	۲۶۴	۲۶۰۸۴۷
سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں	۲۴۹	۲۹۰۲۵۵
سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں	۳۰۵	۳۷۶۰۱۲
سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں	۳۰۳	۳۹۲۵۳۲
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں	۳۴۴	۴۲۳۶۵۸

پچھلے چند سالوں میں روئی کی صنعت کو تامین دینے کی وجہ سے ترقی ہو رہی ہے اور اب ملک میں کافی کپڑا تیار ہونے لگا ہے۔ اگر اور چند سالوں کے لیے تامین بحال رکھی گئی تو ہندوستان اپنی ضرورت کا کپڑا خود پیدا کرلیگا اور دوسروں کا محتاج نہیں رہیگا۔ ابھی تک حکومت نے روئی کی پیداوار کی ترقی کی طرف توجہ نہیں کی۔ ضرورت ہے کہ اس طرف بھی توجہ کی جائے۔ اچھے اور گھٹیا قسم کے بیج کی تمیز

کی جائے اور اُن کی کاشت علیحدہ علیحدہ کرائی جائے جس طرح امریکہ نے روئی کی کاشت میں نئے مختلف ذرائع سے ترقی کی ہے اور اعلیٰ قسم کی روئی پیدا کرنی شروع کی ہے۔ ہندوستان میں بھی ابھی روئی کی کاشت کو ترقی دینے کے مواقع بہت ہیں۔

ہندوستان سے جو چیزیں برآمد ہوتی ہیں اس کا غالب حصّہ خام پیداوار کا ہے اور یہی پیداوار دوسرے ملکوں میں مصنوعہ شکل اختیار کر کے ہندوستان میں واپس آتی ہیں جس کا تمام تر خرچ آخر میں ہندوستانیوں ہی پر پڑتا ہے۔ حالانکہ خود ہندوستان میں ایسے وسائل موجود ہیں کہ ہم یہاں کی پیداوار کو صنعتی کاموں میں لا کر اپنی ضروریات مہیا کر سکتے ہیں۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ابتدائی صنعتوں کو تامین دے پچھلے چند سالوں سے حکومت نے شکر کی صنعت کو تامین دینی شروع کی ہے جس کی وجہ سے اس صنعت کو روز بروز ترقی ہو رہی ہے اور باہر کی شکر کی درآمد میں کمی ہو رہی ہے۔ جن علاقوں میں شکر سازی کے کارخانے کھولے گئے ہیں وہاں گنّے کی کاشت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ شمالی ہندمیں جہاں یہ کارخانے قائم ہوئے ہیں کُل کاشت کے ۲۰ فیصدی رقبہ میں گنّے کی کاشت ہوتی ہے اور اسی طرح دوسری صنعتوں میں بھی حکومت عوام کا ساتھ دے تو نہ صرف صنعت ہی کو فروغ ہوگا بلکہ زراعت میں بھی ترقی ہوگی۔

آج کل ہندوستان میں گھریلو صنعتوں کو رواج دینے کی بڑی کوشش ہو رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح پُرانے زمانے میں دیہاتوں اور قصبوں میں چھوٹے چھوٹے صنعتی مرکز ہوتے تھے، اسی طرح آج کل بھی ان دیہاتوں اور قصبوں میں صنعتی مرکز قائم کر کے اُن کو فروغ دیا جائے۔ میرے خیال میں اس زمانہ میں صنعتوں کا اس طریقہ سے ترقی کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس طریقہ کار سے اوّل تو ہم بیرونی صنعتوں کے مقابلہ سے قاصر رہینگے دوسرے یہ کہ جب تک ہم نئی ایجادات اور سائنس کی تحقیقات سے فائدہ نہیں اُٹھائینگے ہم اپنی صنعتوں کو فروغ نہیں دیسکتے۔ بجائے اس کے کہ دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے صنعتی مرکز قائم کیے جائیں، انھی دیہاتوں اور قصبوں میں صنعتی لوازم کا خیال کرتے ہوئے بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم کئے جائیں۔ ہمارے سامنے شکر کی صنعت کی مثال موجود ہے جن خطوں میں

شکر کے کارخانے قائم ہوئے و: ل ، گنے کی کاشت بلحاظ قسم اور مقدار کے خوب بڑھی اس کی پیداوار کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم کی گئیں اور جہاں تک ہو سکا اس کی اصلاح بھی کی گئی۔ جو لوگ بیکار تھے اُن کی تھوڑی بہت کھپت ان کارخانوں میں ہوئی۔ اگر اسی طرح اور صنعتوں کے بھی بڑے پیمانہ پر کارخانے کھولے جائیں تو صنعت کے ساتھ ساتھ زراعتی پیداوار میں بھی ترقی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ کی تو ہماری خام اشیاء کی جو مانگ باہر کے بازاروں میں ہے وہ بھی ختم ہو جائیگی کیونکہ بیرونی ممالک میں بھی صنعتوں کے ساتھ ساتھ زراعت کو بھی ترقی دینے کی کوشش جاری ہے۔ چنانچہ امریکہ کی روئی اور گیہوں ہندوستان کی روئی اور گیہوں کی جگہ لے رہا ہے پچھلے چند سالوں سے ہماری دوسری خام اشیاء کی برآمد میں بھی کمی ہو رہی ہے۔ اس لیے عوام اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔

جگر پارے

میری جانب نگراں ہے کوئی	اب زماں ہے نہ مکاں ہو کوئی
وہیں میں بھی ہوں جہاں ہو کوئی	دل ہو یا تختِ رواں ہو کوئی
اب تو یوں محرمِ جاں ہو کوئی	جیسے رگ رگ میں نہاں ہو کوئی
گرم اشکوں میں رواں ہے کوئی (قطعہ)	سرد آہوں میں نہاں ہے کوئی
میں نے گھبرا کے جو اک روز جگر	دی یہ آواز کہاں ہے کوئی
درد چیخا کہ مجھی میں ہے وہ شوخ	غم پکارا کہ یہاں ہے کوئی

ہمہ نغمہ، ہمہ خوشبو، ہمہ رنگ (قطعہ)	دوسرا تجھ سا کہاں ہے کوئی
تو ہی للہ بتا دے ناصح	ایسی بے درد کا جواں ہے کوئی

اے غمِ عشق ترا کیا کہنا	پہلے تو، بعد ازاں ہے کوئی
کیجیے شرحِ محبت کیونکر	کیا محبت کی زباں ہے کوئی
غیرتِ عشق یہ کیا سنتا ہوں؟	"غیر از دوست کہاں ہے کوئی"
نہیں ہٹتی، نہیں ہٹتی تری یاد	یہ بھی کیا رشتۂ جاں ہے کوئی
کس کے دل پر نہیں اس کا سایہ قطعہ	غم ہو یا سحرِ رواں ہے کوئی
ہمہ ساز و ہمہ سوز و ہمہ درد	زندگی ہو کہ فغاں ہے کوئی

ہر نفس اب تو یہ دیتا ہے صدا	کہ پسِ پردۂ جاں ہے کوئی

دل کی اب فکر کرے میری بلا
مجھ سے بڑھ کر نگراں ہو کوئی

روزِ جزا

(گذشتہ سے پیوستہ)

جج ولورا:۔ اس سے حلف اٹھواؤ۔

کلرک:۔ (باسربا سے) اِدھر آؤ۔

باسربا:۔ بہت بہتر (گھٹنوں کے بل گر کر صلیب کا نشان بناتا ہے۔ اور پھر کھڑا ہو کر گواہوں کے کٹھرہ میں گرتا پڑتا پہنچتا ہے) معاف کیجیے یور لارڈشپس یہ خیال نہ فرمائیگا کہ میں نشہ میں ہوں۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ اس کی وجہ میرے گھٹنے ہیں۔ ذرا کمزور۔ میرے لیے یہ ایک نئی چیز ہے۔ میں نے ہمیشہ عدالتوں سے باہر رہنے کی کوشش کی ہے۔

سرکاری وکیل۔ بکواس بند کرو۔

باسربا۔ جی ہاں، میں نہیں چاہتا تھا کہ یور لارڈشپس میرے متعلق یہ رائے ——

سرکاری وکیل۔ جو سوالات میں پوچھنے والا ہوں اُن کی طرف توجہ کرو۔

باسربا۔ بہت اچھا جناب، میں تیار ہوں (گلا صاف کرتا ہے)

سرکاری وکیل تم کہاں ملازم ہو۔

باسربا۔ جناب میں ایک قہوہ خانہ میں بیرا ہوں۔ جی ہاں ذرا حساب لگانے دیجیے۔ سترہ نہیں اٹھارہ برس سے میں رنڈوا ہوں اور میرے تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا فوج میں ہے۔ دوسرا ایڈریانوپل اسٹریٹ میں کام سیکھتا ہے۔ وہ اپنے کام میں بڑا ہوشیار ہے۔ مگر یور لارڈشپس میری لڑکی بڑی خراب نکلی ستو برس کی عمر میں اسے ایک پولیس کا آدمی اغوا کر کے لے گیا تھا اور ابھی تک اُس نے اپنی قدرتی اور صحیح زندگی اختیار نہیں کی ہے۔

سرکاری وکیل۔ ان تمام باتوں کو رہنے دو۔ کہاں ——

باسربا۔ معاف کیجیے گا جناب۔ مگر ایک بات

سرکاری وکیل۔ تم کہاں ملازم ہو۔

باسربا۔ جی ہاں جناب قہوہ خانہ ڈینیوب میں جو ایٹھتہ آف اکتوبر اسٹریٹ میں ہے۔ گھوڑا منڈی سے ذرا

... سا جگہ ہے یور لارڈشپس۔ قہوہ، سیاہ وسفید دم میں، بیر کا گلاس یا نیبذ اور فرانسیسی

شراب پیتے ہیں

جج ستر زاوا۔ ممکن کس قسم کی فرانسیسی شراب؟

باسربا۔ یور لارڈ شپ، بتانے کی بات تو نہیں مگر بوتل میں تھوڑا سا پانی بھی داخل کر دیا جاتا ہے۔

سرکاری وکیل۔ تم ان ملزموں میں سے جو یہاں ہیں کسی کو پہچانتے ہو۔

باسربا۔ جی ہاں یقیناً جناب سب کو

سرکاری وکیل۔ تم نے اس سے پہلے انہیں کہاں دیکھا ہے۔

باسربا۔ قہوہ خانہ میں جناب۔ خیتو نکلسے اسٹریٹ کے کونے میں رہتا ہے۔ وہ ہمارا باقاعدہ گاہک

ہے۔ یعنی گرفتار ہونے سے پہلے وہ تھا۔

سرکاری وکیل۔ اور میڈم کمان، کیا وہ بھی گاہک تھی؟

باسربا۔ جی ہاں جناب، یقیناً جناب۔ اور یہ جرمن صاحب مسٹر شنڈر ہیں نہ؟

سرکاری وکیل۔ ہاں، یہ بھی آیا کرتا تھا؟

باسربا۔ جی ہاں، کبھی کبھی میں اس سے چند جرمن الفاظ بول لیتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی جرمن اپنی بیوی سے

سیکھی تھی بیچاری اب مر گئی ہے۔ نمونیا سے اس کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ایک جرمن خاندان میں کام کرتی

تھی۔ جی ہاں کھانے پکانے کا۔ اسی لیے وہ تھوڑی سی جرمن سیکھ گئی میں غیر ملکی زبانوں میں گفتگو کرنا پسند نہیں

کرتا۔ ہمیں اپنی قومی زبان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مگر جب کوئی کسی قہوہ خانہ میں بہرا ہو تو گاہک تھوڑی

سی توجہ سے خوش ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب شنڈر آیا تھا ——

سرکاری وکیل۔ بہت اچھا۔ کیا میڈم کمان اکثر آتی تھی۔

باسربا جی ہاں آپ کنثر ہی کہہ لیجیے۔ ہمارے باقاعدہ گاہکوں کی طرح ہر رات نہیں بلکہ کبھی کبھی مسز ڈو ت
پی چھوٹی لڑکی کے ساتھ، بعض اوقات اپنے شوہر لگزبرگماں کے ساتھ۔ وہ بہت آ رہتی ہیں انسی
نے والی ہے

جج سانکو۔ یہ قہوہ خانہ ہے، یا سازشیوں کا اڈا؟

باسربا جی ہیں یور لارڈ شپ۔ یہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ شہر کے زیادہ تر ورسیا بی محلہ ما تو ر
ہیں۔ گھوڑا منڈی کے رہنے والے، کاشتکار ہیں ... جنہیں کسی ... ۔
لیے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لڑکیاں بھی لوگوں کو متوجہ کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض بہت ہی ...
نوجوان دیہاتی لڑکیاں جو مختلف صوبوں سے تازہ دم آتی ہیں اور قہوہ خانے میں اچھے لوگوں سے ... کد
برے آہی جاتے ہیں۔

سرکاری وکیل۔ قہوہ خانہ کا مالک جماعت کا وفادار رکن ہے۔ یور لارڈشپ میں اس کی تصدیق کرتا
ہوں۔ ایسی جگہوں میں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

جارج اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے بیرے قومی جماعت سے تنخواہ دار جاسوس ہیں۔

باسربا۔ مجھے جاسوس مت کہو خبیثو۔ میں نے ہمیشہ حلال کی روزی کمائی ہے۔ میں سات جائز بچوں کا باپ
ہوں جن میں سے تین ابھی تک زندہ ہیں۔ اگر میں اپنے کان کھلے رکھتا ہوں تو میں قابل الزام نہیں ٹھہرایا
جا سکتا۔

سرکاری وکیل۔ ہر ایک محب وطن کا فرض ہے کہ حکومت کو ہر اس بات کی اطلاع کر دے جو سازش
اس کے خلاف کر رہے ہوں۔

باسربا۔ جی ہاں یہی میں کہتا ہوں۔

سرکاری وکیل۔ باسربا تم نے ملزموں کو آخری بار قہوہ خانہ ڈینیوب میں کب دیکھا تھا؟

باسربا آخری بار؟ ذرا سوچنے دیجیے۔ آپ کا مطلب ہے تینوں کو میں نے انہیں کب وہاں دیکھا تھا

سرکاری وکیل۔ ہاں دس مارچ اتوار کی شام کو جب کہ وزیر اعظم پریذیڈنٹ پر قاتلانہ حملے سے ایک روز پیشتر

باسربا۔ جی ہاں بالکل ٹھیک۔ اتوار کی شام کو۔ دس مارچ۔ اور دوسرے ہی دن ہم نے پڑھا کہ ہمارے معزز قائد پر خونی حملہ کیا گیا ہے (بازو بڑھا کر قومی سلام کرتا ہے) خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمارے لیے ان کو بچا لیا۔

جج ولورا۔ کیا تمہارا مطلب یہ ہے تم نے ان تینوں کو ایک جگہ دیکھا تھا۔ تینوں کو؟

باسربا۔ جی ہاں یور لارڈشپس تینوں کو۔ خیتو، میڈم کمان اور جرمن صاحب کو

لاڈیا۔ یہ جھوٹ ہے۔

جارج۔ اس چھوٹے چوہے کو اپنی تنخواہ حاصل کر لینے دو۔

باسربا۔ خیتو اگر تم چوہے نہیں تو میں بھی نہیں۔ نہ معلوم اسے کیا حق ہے کہ مجھے چوہا کہے

سرکاری وکیل۔ کیا ملزموں کو اجازت ہے یور لارڈشپس کہ حکومت کے گواہوں کی ان کے مُنہ پر توہین کریں۔

جج ولورا۔ ملزم اس قسم کے توہین آمیز جملے نہیں کہیں گے۔ کارروائی جاری رکھیے۔

سرکاری وکیل۔ تم نے ملزموں کو وہاں کس وقت دیکھا تھا۔ تم نے سات بجے کہا تھا۔ ہے نہ؟

کنارڈ۔ معاف کیجیے گا

سرکاری وکیل۔ میرے پاس اس کا ابتدائی بیان موجود ہے جس میں اُس نے صاف طور سے سات بجے کا وقت بیان کیا ہے

باسربا۔ جی ہاں بالکل ٹھیک۔ سات بجے کا وقت تھا

سرکاری وکیل۔ اس کی تصدیق دوسرے گواہوں کے بیانات سے بھی ہو جائیگی یور لارڈشپس۔ باسربا ملزم کیا کر رہے تھے۔

باسربا کیا کر رہے تھے جناب۔ وہ بیٹھے تھے وہاں۔

سرکاری وکیل۔ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

باسربا۔ جی ہاں، پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

جارج۔ غالباً آنریبل سرکاری وکیل بھی ایک راہگیر کا بھیس بدلے وہاں موجود تھے۔ (ہلکا سا قہقہہ)

سرکاری وکیل۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس قسم کی باتوں کو ہمیشہ کے لیے روک دیا جائے۔

جج ولورا۔ خیتو اگر تم نے آئندہ ایسی بات کی تو تمہیں یہاں سے نکال دیا جائیگا۔

جارج۔ میں یور لارڈ شپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔

جج سانکو۔ رپورٹر! ہم چاہتے ہیں کہ اس قسم کے تمام توہین آمیز حصے روئداد میں لکھے جائیں۔

رپورٹر۔ بہت خوب یور لارڈ شپ۔

سرکاری وکیل۔ باسربا کیا تم نے ملزموں کی باتیں بھی سُنی تھیں۔

باسربا جناب آدمی اپنے کان تو بند نہیں کر سکتا (خیتو سے) لیکن میں اس کو جاسوس نہیں کہتا۔

جج ولورا۔ (گھنٹی بجا کر) قیدیوں کو مخاطب کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں

باسربا۔ مہربانی فرما کر مجھے معاف کیجیے یور لارڈ شپ۔ یہ محض اس لیے کہ میں عادی ——

سرکاری وکیل۔ تم نے انہیں کس قسم کی باتیں کرتے سُنا تھا۔

باسربا۔ میں نے اس لڑکی کو کہتے سُنا یعنی میڈم کمان کو، اُس نے کہا "بھائی بُوہربات کا انتظام ہو گیا ہے۔ ہماری تجویز پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ کل صبح میں اپنے محترم قائد گرگری وبنگ سے ملنے جا رہی ہوں۔ (قومی سلامی دیتا ہے)

سرکاری وکیل۔ کیا اُس نے کہا تھا "اپنے محترم قائد"

باسربا۔ نہیں جناب۔ اس نے ایسے الفاظ کہے تھے جنہیں میں دوہرا نہیں سکتا۔

لاڈیا۔ اچھا!

(کنارڈا سے خاموش رہنے کی درخواست کرتا ہے۔

سرکاری وکیل۔ کیا تم نے اور بھی کچھ سنا تھا

باسربا۔ نہیں جناب میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کچھ سُنا تھا۔ اتوار مصروفیت کا دن ہے۔ پھر گاہک اس کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی پاس کھڑا ہو کر ان کی گفتگو سُنے۔ یور لارڈ شپس متعجب ہونگے اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ لوگ قہوہ خانوں میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں

سرکاری وکیل۔ مگر وہ بڑی احتیاط سے گفتگو کر رہے تھے، ہے نہ؟

باسربا۔ جی ہاں جناب۔ وہ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

سرکاری وکیل۔ جہ بعد میں تم نے کچھ اور بھی ہوتے دیکھا تھا؟ (ججوں کی طرف دیکھتا ہے جن کے سامنے پستول پڑا ہے)
باسربا۔ (اُسی طرف دیکھ کر) بعد میں! مجھے سوچنے دیجیے۔ جی ہاں جناب۔ بعد میں ضیتو نے ایک پستول نکال کر شنڈر کو دیا تھا۔ (جارج زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

جج موریسی۔ تم کہتے ہو کہ جارج نے شنڈر کو پستول دیا تھا۔ تم نے خود دیکھا تھا؟

باسربا۔ جی ہاں یور لارڈشپ

سرکاری وکیل۔ (پستول کی طرف اشارہ کرکے) اور پستول یہی تھا؟

باسربا۔ جی ہاں۔ بالکل یہی۔

جج سانکو۔ دوسرے الفاظ میں ملزم سے ایک روز پیشتر تم نے دیکھا کہ ضیتو نے شنڈر کو وہی پستول دیا جس سے شنڈر نے منسٹر پریزیڈنٹ کو زخمی کیا تھا۔

باسربا۔ جی ہاں یور لارڈ۔۔۔ اس کا یہی مطلب ہے

جج سلوترسکی۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی پستول ہے؟

سرکاری وکیل۔ یور لارڈشپس ضیتو نے تسلیم کیا ہے کہ یہ اُس کا پستول ہے۔ اور اس سے بآسانی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شنڈر کے پاس یہ کس طرح پہنچا۔

جج سلوترسکی۔ نیتو کا دعویٰ ہے کہ یہ پستول اُس کے کمرہ سے چرایا گیا ہے

سرکاری وکیل۔ اسے اس بات کو ثابت کرنے دیجیے۔

جارج۔ کوئی اسے کیسے ثابت ــــ (رک جاتا ہے)

ستاملبو۔ باسربا یہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ ملزموں کی زندگیاں اس پر منحصر ہیں۔ کیا تمہیں بالکل یقین ہے کہ تینوں ملزم منسٹر پریزیڈنٹ سے میڈم کمان کی ہونے والی ملاقات کا ذکر کر رہے تھے اور یہ کہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ضیتو نے شنڈر کو پستول دیا تھا۔ براہ کرم ذرا سوچ کر جواب دو۔ مجھے یقین ہے تم نہیں چاہتے کہ بے گناہ لوگوں کے قتل کی ذمہ داری تم پر آئے۔

باسربا۔ میں انہیں بے گناہ نہیں کہتا۔ میں کوئی وکیل یا جج نہیں محض قہوہ خانہ میں ایک بیرا ہوں جو حلال

ن روزی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب لوگ جمہوری جماعت سے ملتے ہیں جو خلافِ قانون ہے
اور ریاست محترم و معززقد کی زندگی کے خلاف سازش کرتے ہیں جنہوں نے ہم میں قومی روح اور سر نو پھونک
دی ہے اور پوری قوم کو متحد کر دیا ہے تو میں انہیں کیسے بے گناہ کہوں (پر جوش نعرہ ہائے تحسین)
کنارڈ۔ باسربا کیا تمہارا یہ فرض نہیں تھا کہ جو کچھ تم نے دیکھا اور سُنا تھا اس کی اطلاع فوراً پولیس کو کر دیتے
سرکاری وکیل۔ کیوں؟ اُس نے کوئی ایسا جملہ نہیں سُنا تھا جس سے کہ دھمکی کا اظہار ہو۔ صرف میڈم کمان اور
منسٹر پریزیڈنٹ کی ملاقات کی طرف اشارہ کیا جا رہا تھا۔
کنارڈ۔ لیکن پستول؟
سرکاری وکیل۔ یہ تو دوسرے دن کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ اصل میں بات کیا تھی۔ اور پھر گواہ کی عقل۔
جارج۔ یہ بات ہے مسلم ہے۔
باسربا۔ قہوہ خانہ کے بیرے کا دماغ اُس کے پاؤں میں ہوتا ہے۔
سرکاری وکیل۔ صرف اس بات سے کہ ایک آدمی نے دوسرے کو پستول دیا تھا یہ ظاہر ——
جج موری۔ اسلحہ یہاں ایسے ہی عام ہیں جیسے امریکہ میں۔ (معمولی ہنسی)
جج سترزوا۔ (زور سے ہنستے ہوئے) بہت خوب!
سرکاری وکیل۔ اس کے علاوہ یور لارڈشپس جیسا کہ ابتدائی بیان سے ظاہر ہوتا ہے گواہ اس خونی حادثہ
کے وقوع کے بعد تین گھنٹے کے اندر پولیس کے پاس پہنچ گیا تھا۔
جارج۔ کاش وہ اتنا ہی تین گھنٹے پہلے پہنچ جاتا۔
باسربا۔ (غصے سے) تمہارا دماغ اس وقت کام دے گا جب تمہارا سر جسم سے الگ ہو جائے گا۔ (قہقہہ)
جج ولورا۔ (گھنٹی بجا کر) خاموش
باسربا۔ مجھے بہت افسوس ہے یور لارڈشپس۔ اگر ——
سرکاری وکیل۔ اور کوئی بات نہیں، باسربا تم جا سکتے ہو۔
باسربا۔ یعنی میرا کام ختم ہو گیا ہے۔

مالینو۔ ہاں نیچے اترو۔

باسربا۔ یقیناً جناب، بڑی خوشی سے۔ شکریہ جناب۔ آداب عرض ہے۔ یور لارڈ شپس۔

(نیچے اُترتا ہے اور چاروں طرف دیکھتا ہے۔ مالینوا سے چلے جانے کا اشارہ کرتا ہے)

شکریہ جناب (دائیں طرف جاتا ہے)

جارج۔ (جب باسربا دروازہ کے قریب پہنچتا ہے) بیرا، سیاہ شراب

باسربا۔ (عادتاً پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے) بہت اچھا حضور۔ (گھبرا کر) میرا مطلب۔ میں بھول گیا۔ اُف

توبہ۔ آج کا دن بھی کیسا ہے۔ (گرتا پڑتا باہر چلا جاتا ہے)

سرکاری وکیل۔ فینو جلاد تمہاری ہنسی بند کرنا خوب جانتا ہے۔

جج ولورا (گھنٹی بجا کر) کیا اور گواہ باقی ہیں جنہوں نے ملزموں کو ایک ساتھ قہوہ خانہ میں دیکھا تھا؟

سرکاری وکیل۔ جی ہاں یور لارڈ شپ۔ بیرا زمرنسکو اور پانچ دوسرے شہری جو وہاں موجود تھے

جج ولورا۔ اُن کو بلاؤ۔

سرکاری وکیل۔ یقیناً یور لارڈ شپ۔ مگر پہلے میں مجرم شنڈر کو بلاتا ہوں۔

(اُسے پکارتا ہے۔ مگر کرٹ شنڈر بالکل بے حس ہے) اسے کٹھرے میں لاؤ۔

(سنتری گلوکا اور گھیرا شنڈر کو ہلا کر اُسے اُٹھنے کو کہتے ہیں۔ شنڈر اُٹھ کر گلوکا کے ساتھ کٹھرے

میں جا کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے پیچھے ایک سنتری ہے)

جج سلوترسکی۔ کیا اس سے حلف لیا جائیگا۔

سرکاری وکیل۔ یور لارڈ شپ ملزم جرمن اور پروٹسٹنٹ ہے۔ حلف ایک ایسی مقدس چیز ہے جو صرف

سلاوی اور محبان وطن کے لیے مخصوص رکھنی چاہیئے۔

(جج ولورا آہستہ آہستہ جج سترزوا اور جج مورسی سے مشورہ کرتا ہے)

جج ولورا۔ اچھا حلف کی کوئی ضرورت نہیں۔

سرکاری وکیل۔ شنڈر تم جمہوری جماعت کے رکن ہو۔ ہے نہ؟ (سنتری اس کو ہلاتا ہے)

شنڈر۔ ہاں ہاں جمہوری جماعت کا رکن

جارج۔ یہ جھوٹ ہے۔ جمہوری جماعت لغوانسانوں کو رکن نہیں بنایا کرتی۔

سرکاری وکیل۔ میرے پاس شنڈر کی رکنیت کا کارڈ ہے جو گرفتاری کے وقت اس کی جیب میں تھا۔

(کارڈ عدالت کے رپورٹر کو دیتا ہے)

جارج۔ یہ کارڈ جعلی ہے۔

سرکاری وکیل۔ تم رکنیت کا رجسٹر پیش کردو تاکہ ہم دیکھ سکیں۔

جارج۔ نہیں جب جلاد صاحب نہیں وینسک کے تمام ظلم وستم کے باوجود بھی میں ہرگز ایسا نہیں کرونگا۔

جج سانکو۔ ہمارے قائد کا ذکر کرتے وقت اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔

جارج۔ وہ میرا قائد نہیں ہے۔

جج ولورا۔ رکنیت کا کارڈ ہمیں دیکھنے دو۔

(رپورٹر جج ولورا کو کارڈ دیتا ہے۔ دوسرے جج باری باری سے دیکھتے ہیں)

سرکاری وکیل۔ شنڈر کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے نسٹر پریزیڈنٹ پر گولیاں چلائی تھیں۔

شنڈر۔ کیا؟

سرکاری وکیل۔ کیا یہ ٹھیک ہے، کہ تم نے نسٹر پریزیڈنٹ پر حملہ کیا تھا؟

شنڈر۔ ہاں میں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔

جج ولورا۔ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟

شنڈر۔ ہاں میں نے کیا تھا؟

جج ولورا۔ کیوں وجہ کیا تھی۔

شنڈر۔ (آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے، دفعتہً) ظالم مردہ باد۔ اس نے میری آزادی چھین لی تھی۔ میں انسان ہوں۔ کرمے شنڈر۔ ظالم مردہ باد۔

جارج۔ (کھڑے ہوکر) شاباش، شاباش، ظالم مردہ باد، قومی حکومت مردہ باد۔

جج سانکو۔ باہر نکالو اس کو

جج ساتزروا (ایک ساتھ) خاموش

جج ولورا۔ لے جاؤ اس کو

کنارڈ۔ یور لارڈشپس

(سنتری سرزبیرا اور گھبرا جارج کو کرسی سے گھسیٹ کر دروازہ کی طرف لیجاتے ہیں، وہ مقابلہ نہیں کرتا مگر برابر بولے جاتا ہے)

جارج۔ ظالم مردہ باد، عوام زندہ باد، رکووسکی مردہ باد، وسینسک مردہ باد۔

(سنتری اس کو گھسیٹ کر لیجاتے ہیں عدالت میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔

جج ولورا۔ (گھنٹی بجاکر) خاموش، خاموش۔ (خاموشی ہو جاتی ہے) کارروائی جاری رکھو۔

کنارڈ۔ یور لارڈشپ۔

جج ولورا نہیں اس سے ہر قسم کی نرمی کی گئی مگر اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے

کنارڈ۔ یہ بڑی اہم شہادت ہے یور لارڈشپ۔ اس کو اپنے خلاف شہادت سننے کا حق ہے۔

جج ولورا۔ عدالت کا اجلاس برخاست ہونے پر اُسے یہ شہادت پڑھ کر سُنا دی جائیگی۔ اچھا

کنارڈ۔ یور لارڈشپ میں بڑے ادب سے درخواست ——

جج ولورا۔ خاموش! (کنارڈ بیٹھ جاتا ہے)

سرکاری وکیل۔ شنڈر کیا تم میڈم کمان اور ضبتو سے قہوہ خانہ میں حملہ سے ایک رات پہلے ملے تھے۔

شنڈر۔ قہوہ خانہ، قہوہ خانہ ڈینیوب۔ ایٹھ آف اکتوبر اسٹریٹ۔

لاڈیا۔ نہیں۔

شنڈر۔ ایٹھ آف اکتوبر اسٹریٹ۔ (ہاتھ ماتھے پر رکھتا ہے)

جج ولورا۔ یہ مریض معلوم ہوتا ہے۔ شنڈر کیا تم بیمار ہو۔

شنڈر۔ کیا؟ قہوہ خانہ ڈینیوب۔

سرکاری وکیل۔ یور لارڈشپ آج صبح جیلخانہ کے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا تھا۔

منیج۔ (کھڑے ہوکر) عجیب قسم کی بیماری ہے، یور لارڈشپ

سرکاری وکیل شنڈر اب غور سے سنو

شنڈر۔ (سینہ پر ہاتھ مار کر) میں ایک جلا وطن ہوں

سرکاری وکیل۔ سنو شنڈر۔ کیا قہوہ خانہ میں دوسرے دونوں قیدیوں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم کمان کے ساتھ مل کر منسٹر پریزیڈنٹ پر گولی چلا دینا۔ ٹھیک ہے نہ؟

شنڈر۔ ہاں۔ (کارڈ لاڈیا کو قطع کلام کرنے سے روکتا ہے۔

سرکاری وکیل۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ ہے نہ؟

شنڈر۔ ہاں

سرکاری وکیل۔ تم کمان پر عاشق تھے ہے نہ؟

لاڈیا۔ خوب!

شنڈر۔ (دانت پیس کر) ہاں میں اس کا عاشق تھا۔

لاڈیا۔ (کھڑے ہوکر) میں اس کو نہیں جانتی میں نے کبھی اس سے بات بھی نہیں کی

جج ولورا۔ براہ مہربانی بیٹھ جاؤ۔ تمہیں صفائی کا حق دیا جائیگا۔

لاڈیا۔ مگر یہ ——

جج ولورا۔ مہربانی کرکے خاموش رہو۔

شنڈر۔ (جج کی طرف مڑ کر) بہت سی عورتیں میرے پاس تھیں، بہت سی سب مجھے چاہتی ہیں میں بہت خوبصورت ہوں۔ صرف میرے نقش و نگار ہی میں۔ نہیں (بڑبڑاتا ہے)

سرکاری وکیل۔ اور اسی عشق کی وجہ سے تم یہ خوفناک جرم کرنے پر راضی ہوگئے۔

شنڈر۔ ہاں۔ خوبصورت گرلز مجھے دیکھتی ہیں۔

جج ولورا۔ تم نے پستول کہاں سے لیا تھا؟

شنڈر۔ کیا ؟

سرکاری وکیل۔ پستول۔ کیا خیتو نے تمہیں دیا تھا ؟

شنڈر۔ ہاں۔

سرکاری وکیل۔ دوسرے دن کمان کے ساتھ تم منسٹر پریزیڈنٹ کے کمرہ میں گیے اور جب اس نے اشارہ کیا تو تم نے پستول داغ دیا۔ یہی واقعہ ہوا تھا نہ ؟

شنڈر۔ ہاں۔

سرکاری وکیل۔ کیا تم اور بھی کچھ کہنا چاہتے ہو۔

شنڈر۔ نہیں، ہاں۔

جج ولورا۔ کیا ہے؟۔

شنڈر۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے گولی سے ہلاک کیا جائے قتل نہ کیا جائے۔ یہاں ایک گولی، تاکہ میرا چہرہ بدنما نہ ہو جائے۔

(تماشائی حیرت سے اُسے دیکھتے ہیں)

جج سالکو۔ تمہیں تو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہیے، جرمن کتے۔ (شنڈر اُس کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

شنڈر۔ (جنون کی حالت میں) گولی سے ہلاک کیا جائے قتل نہ کیا جائے۔

جج ولورا۔ ہم اس کا پورا بیان اُس وقت سُنینگے جب اس کا دماغ ٹھیک ہو جائیگا۔ کیا وکیل صفائی کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں ؟

ستالمیو۔ ابھی نہیں یور لارڈ شپس۔ جب تک ہم میڈم کمان کا بیان نہ سُن لیں۔

جج ولورا۔ بس شنڈر نیچے اتر جاؤ۔

(سنتری شنڈر کو اس کی جگہ لیجاتا ہے)

جج ولورا۔ اس پر مسلسل طبی توجہ ہونی چاہیے۔ غالباً جیلخانہ کا ڈاکٹر اس قابل نہیں کہ۔

سرکاری وکیل۔ یور لارڈ شپس، دوسرے ڈاکٹر کا انتظام ہو جائیگا۔

کنارڈ۔ یور لارڈشپ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کوئی نشہ آور دوا دی گئی ہے۔

جج سلوترسکی۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

جج ولورا۔ کیا کوئی ثبوت ہے۔

مینیج۔ میری رائے میں یہ اسی کا اثر ہے یور لارڈشپ۔

شنڈر۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) خوبصورت کرٹ مجھے عورتیں کہتی ہیں۔

جج مورسی۔ معلوم ہوتا ہے یہ اپنے حسن سے خود مسحور ہو گیا ہے۔ کاش اسے کوئی آئینہ پیش کرے۔

(قہقہہ۔ جج سترزوا کو کھانسی کا دورہ اٹھتا ہے۔ گھیرا واپس آتا ہے)

ستالبو۔ میڈم کمان اب تم تکلیف کرو۔ (لاڈیا سنتری گھبرا کے ساتھ کٹھرہ میں جاتی ہے)

کلرک۔ (جج ولورا سے) یور لارڈشپ کیا اس سے حلف لیا جائیگا۔

لاڈیا نہیں یور لارڈشپ، میں حلف نہیں —

سرکاری وکیل۔ ہم باغیوں اور مجرموں کو حلف اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

کنرڈ۔ وہ ابھی مجرم ثابت نہیں ہوئی۔ اس پر صرف الزام عائد کیا گیا ہے۔

سرکاری وکیل یہ امریکہ نہیں ہے۔ ہم سماج کے دشمنوں کو سزا دیتے ہیں انہیں ہیرو نہیں بناتے۔

(نعرہ ہائے تحسین)

جج ولورا۔ (گھنٹی بجا کر) کارروائی جاری رکھو۔

ستالبو۔ میڈم کمان تم نے ڈاکٹر کانسٹائن پروان سکرٹری منسٹر پریزیڈنٹ کا بیان سن لیا ہے!

لاڈیا۔ ہاں میں نے سن لیا ہے۔ اس میں رتی بھر بھی صداقت نہیں۔

ستالبو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہیں ڈاکٹر پروان کی بیان کردہ باتوں میں سے کس بات سے اختلاف ہے۔

لاڈیا۔ ہر ایک بات سے۔ الف سے لے کر تے تک غلط ہے۔

جج ولورا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بیان کرو۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ منسٹر پریزیڈنٹ سے ملاقات کا وقت مقرر کرنے کی غرض سے تم ڈاکٹر پروان سے نہیں ملی تھیں۔

لاڈیا۔ نہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتی۔ جب سپریم کونسل نے میرے شوہر کی سزائے موت پر مہر تصدیق ثبت کردی تو میرے لیے صرف ایک امید باقی رہ گئی۔ یعنی مسٹر پریزیڈنٹ سے التجائے رحم۔ ہر روز ایک ہفتہ تک میں اُسے خط لکھتی رہی کہ براہ کرم مجھے ملنے کی اجازت دے مگر جواب ندارد۔ آخر اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ میں خود وہاں جاؤں۔

جج سلوترسکی کیا یہ مشورہ تمہیں ضیتو نے دیا تھا۔

لاڈیا۔ نہیں یور لارڈشپ، بلکہ اس کے بالکل برعکس۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں نہ جاؤں اس نے کہا کوئی اُمید نہیں۔ لیکن میں گئی میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی چاہے وہ کتنا ہی معمولی ہوتا۔

ستالبو۔ پروان سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرو۔

جج ولورا۔ جمعرات کے دن سات مارچ کو؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ جمعرات کو میں نے ملاقات کی درخواست کی۔ اس نے میرا اور میرے شوہر کا مضحکہ اُڑایا۔ اور ہمیں خوب بُرا بھلا کہا۔ پھر اُس نے کہا دوسرے دن آنا۔ اور یہ میں بتا ہی چکی ہوں کہ اُس نے کونسی شرائط پیش کی تھیں۔

جج مورسی۔ مگر تم نے شرائط ماننے سے انکار کردیا

لاڈیا۔ جی ہاں، یور لارڈشپ میں نے انکار کردیا۔ لیکن اگر ضروری ہوتا تو میں یہ شرائط مان بھی لیتی۔

سرکاری وکیل ہاں ہمیں اس کا یقین ہے۔

لاڈیا۔ ہاں میں اپنے شوہر کی زندگی بچانے کے لیے سب کچھ کر گزرتی۔

سرکاری وکیل۔ چاہے مسٹر پریزیڈنٹ ہی کو قتل کرنا پڑتا۔

لاڈیا۔ میں اس جرم سے بالکل بری ہوں۔ جب میں دوسرے دن وہاں گئی تو ڈاکٹر پروان نے مجھے بتایا کہ مسٹر پریزیڈنٹ سے پیر کا دن ملاقات کے لیے مقرر ہوا ہے۔ میں بے انتہا خوش ہوئی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ انکار کردیگا۔

جج ترزاوا۔ اور کیا ڈاکٹر پروان نے اشارۃً ـــــ یعنی اُس نے پھر درخواست کی ـــــ؟

لاڈیا۔ نہیں یور لارڈشپ۔ اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ بڑی اچھی طرح سے پیش آیا میرا خیال تھا شاید

میں نے اُس کے متعلق غلط رائے قائم کی ہے۔ میں نے جرأت کر کے یہ بھی پوچھ لیا کہ کیا میں اپنے ساتھ کسی کو لا سکتی ہوں۔

جج سلوترسکی۔ کیوں؟

لاڈیا۔ میں چاہتی تھی جارج میرے ساتھ چلتا۔ وہ فصاحت کے دریا بہا سکتا ہے اور دوسرے کو ہموار کرنے کا طریقہ اُسے خوب آتا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ مسٹر پریزیڈنٹ کے سامنے میری ہمت جواب دے دیگی اور میں کچھ نہ کہہ سکونگی

ستاملبو۔ آگے چلو۔

لاڈیا۔ جب میں ایوانِ وزارت سے واپس ہوئی تو سیدھی ضینو کے کمرہ پر گئی مگر ——

سرکاری وکیل۔ تم اُس کے کمرہ پر گئی تھیں؟

لاڈیا۔ ہاں ہم دونوں قدیم دوست ہیں۔

سرکاری وکیل۔ بیشک میں تسلیم کرتا ہوں

لاڈیا۔ جارج اور میں دوست ہیں۔ ہمارا مضبوط ترین رشتہ یہ ہے کہ ہم دونوں الگزنڈر سے بیحد محبت کرتے ہیں۔

جج ولورا۔ تم نے اور ضینو نے پھر کیا کیا؟

لاڈیا۔ وہ مکان پر نہیں تھا یور لارڈشپ۔ میں وہاں اس مضمون کا ایک رقعہ چھوڑ آئی کہ ملاقات کا انتظام ہو گیا ہے اور میں اُسے ساتھ لیجانا چاہتی ہوں دوسرے دن ہفتہ کو اس کا جواب آیا کہ میں اُسے اتوار کی شام کو قہوہ خانہ ڈینیوب میں ملوں۔

جج موسی۔ تو پھر تم اتوار کی شام کو قہوہ خانہ ڈینیوب میں موجود تھیں! اور ضینو بھی تھا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔ میں اپنی چھوٹی بچی کو لے کر اس سے ملنے کے لیئے گئی ہم اکثر وہاں ملا کرتے تھے۔

جج ولورا۔ تمہاری بچی تمہارے ساتھ تھی؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ میں نے اُسے ملاقات کی اجازت ملنے کی خوشی میں سینما لے جانے کا وعدہ کیا تھا، مگر پہلے ہم جارج سے ملنے قہوہ خانہ میں گئے۔ ہم نے فوراً آنے والی ملاقات پر تبادلۂ خیالات شروع کر دیا۔ میں نے

اُس سے درخواست کی میرے ساتھ چل کر الگزنڈر کے لیے رحم کی التجا کرے لیکن اُسے خوف تھا کہ اس کی موجودگی سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ آخر کار اُس نے مجھے یقین دلادیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور میں تنہا جانے پر راضی ہوگئی۔

سرکاری وکیل۔ اُسے اپنی گرفتاری کا خوف تھا۔ ہے نہ ؟

لاڈیا۔ اُسے کسی چیز کا خوف نہیں۔

سرکاری وکیل۔ خیر معلوم ہو جائیگا۔

ستاملبو۔ پھر کیا ہوا ؟

لاڈیا۔ ہم قہوہ خانہ سے اُٹھے۔ سونیا اور میں ٹرنٹی بلیورڈ پر پیلس سینما کی طرف روانہ ہوئے اور جارج دوسری طرف

ستاملبو۔ وہ تمہارے ساتھ ہی قہوہ خانے سے روانہ ہوا ؟

لاڈیا۔ ہاں ہم نے دروازہ پر ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔ میں جلدی سے جانا چاہتی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہہ دیا تھا ملاقات کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلیگا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے آنسو دیکھ لے۔ سونیا بھی رو رہی تھی۔

ستاملبو۔ اور شنڈر ؟ جب تم فینتو سے باتیں کر رہی تھیں تو کیا وہ تمہارے ساتھ بیٹھا تھا۔

لاڈیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بالکل غلط، سراسر جھوٹ، وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف سونیا، جارج اور میں۔

سرکاری وکیل۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ اس وقت شنڈر قہوہ خانہ میں موجود نہ تھا

لاڈیا۔ میں کیسے انکار کر سکتی ہوں۔ وہ اتوار کی شب تھی، وہاں سینکڑوں لوگ تھے ـــ بہت سے آجا رہے تھے۔ ممکن ہے وہ دوسری میز پر بیٹھا ہو۔ میں کسی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے صرف اپنے شوہر کا خیال تھا اور یہ کہ اگلی صبح کو منسٹر پریزیڈنٹ سے کیا کہا جائے۔

کنارڈ۔ کیا جارج نے کسی کو پستول دیا تھا۔ شنڈر یا کسی دوسرے کو یعنی اپنی جیب سے نکالا تھا۔

لاڈیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم صرف ملاقات کی بابت گفتگو کرتے رہے۔

ستاملبو۔ اب پیر کا دن آتا ہے ـــ ملاقات کا روز۔ تم ایوانِ وزارت میں گئی تھیں ؟

لاڈیا۔ ہاں۔

جج سلوترسکی۔ تنہا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ، تنہا۔

ستاملبو۔ جو کچھ ہوا، بیان کرو۔

لاڈیا۔ منسٹر پریزیڈنٹ کے خاص کمرہ سے متصل ایک کمرہ میں میں نے ملازم کو اپنا نام بتایا۔ وہ کمرہ میں گیا اور واپس آکر مجھ سے کہا کہ میں ذرا انتظار کروں۔

ستاملبو۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے؟

لاڈیا۔ ہاں شاید پانچ یا چھ۔ کلرک اور افسر برابر آجا رہے تھے۔

ستاملبو۔ کیا ان لوگوں میں کرٹ شنڈر بھی تھا؟

لاڈیا۔ ہاں۔

جج ولورا۔ جب تم پہنچیں تو شنڈر اس کمرہ میں موجود تھا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔

جج مورسی۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ تم اُسے نہیں جانتی تھیں۔

لاڈیا۔ جی ہاں میں اُسے نہیں جانتی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تھا۔

جج مورسی۔ اس کے باوجود تمہیں یاد ہے کہ وہ وہاں بیٹھا تھا؟

لاڈیا۔ جی ہاں ایک خاص وجہ سے۔

جج ولورا۔ کس وجہ سے؟

لاڈیا۔ وہ میری طرف گھور رہا تھا۔ جب تک میں وہاں انتظار کرتی رہی اُس نے اپنی آنکھیں میرے چہرہ سے نہیں ہٹائیں۔ مجھے بڑی بے چینی سی محسوس ہوئی۔

ستاملبو۔ کیا اُس نے تم سے کوئی بات بھی کی تھی۔

لاڈیا۔ نہیں، بس وہ بیٹھا گھورتا ہی رہا۔

ستاملبو۔ کیا تم نے اُس سے کچھ کہا تھا۔

لاڈیا۔ بالکل نہیں۔

ستاملبو۔ کتنی دیر تک تمہیں انتظار کرنا پڑا۔

لاڈیا۔ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتی، شاید بیس منٹ یا نصف گھنٹہ، یہ مدت بڑی طویل معلوم ہوئی تھی۔

ستاملبو۔ اور پھر؟

لاڈیا۔ منسٹر پریذیڈنٹ کے کمرہ کا دروازہ کھلا اور جنرل رکووسکی وزیر تمدن و ترقی باہر آیا۔

جج ولورا۔ منسٹر پریذیڈنٹ کے کمرہ سے جنرل رکووسکی باہر آئے۔

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ

ستاملبو۔ اچھا، آگے۔

لاڈیا۔ ہر ایک نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

سرکاری وکیل۔ کیا تم نے بھی کھڑے ہو کر سلام کیا؟

لاڈیا۔ میں کھڑی ہو گئی تھی لیکن سلام نہیں کیا۔

جج سانکو۔ سلام کیوں نہیں کیا؟ (لاڈیا خاموش ہو جاتی ہے) جواب دو۔

لاڈیا۔ میرا خیال ہے اس کا جواب بالکل صاف ہے یور لارڈشپ

جج سانکو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جواب دو۔ چاہے صاف ہو یا کچھ اور۔

لاڈیا۔ یور لارڈشپ میں نے اس لیے سلام نہیں کیا کہ میرے دل میں جنرل رکووسکی کی کوئی عزت نہیں۔

(تماشائی حیرت سے دیکھتے ہیں)

جج ولورا۔ اچھا پھر کیا ہوا؟

لاڈیا۔ جنرل رکووسکی نے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور کمرہ سے چلا گیا۔ پھر ایک ملازم نے مجھ سے کمرہ میں داخل ہونے کے لیے کہا۔ میں داخل ہوئی شنڈر بھی میرے ساتھ داخل ہوا۔

جج ولورا۔ شنڈر بھی تمہارے ساتھ داخل ہوا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔

کنارڈ۔ تمہیں تعجب نہیں ہوا۔

لاڈیا۔ نہیں۔ میں سمجھی شاید یہ کوئی سیکرٹری ہے یا پولیس کا آدمی جو میری نگرانی پر مامور کیا گیا ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ وہ بغیر کسی سوال اور روک ٹوک کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

ستاملبو۔ جب تم داخل ہوئیں تو کمرے میں اور کون تھا؟

لاڈیا۔ صرف منسٹر پریزیڈنٹ اور ڈاکٹر بروان۔

ستاملبو۔ پھر تم نے منسٹر پریزیڈنٹ کے سامنے رحم کی درخواست شروع کر دی

لاڈیا۔ ہاں فوراً۔ مجھے صرف دس منٹ دیے گئے تھے۔

کنارڈ۔ کیا کہا تم نے؟

سرکاری وکیل۔ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں — اس لیے کہ یہ سب —

جج ولورا۔ اُسے پوری سرگزشت سُنانے دو۔

لاڈیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا الفاظ استعمال کیے۔ اس کے سامنے پہنچ کر ہر چیز بدل گئی۔ میں نے دل کی گہرائی اور الگزنڈر کی محبت کے جوش میں جو منہ میں آیا کہا۔ میں نے اُسے ایک انسان سمجھ کر مخاطب کیا۔ مدبر سمجھ کر نہیں۔ میں نے اُس سے فیاضی، رحم اور انسانیت کے نام پر التجا کی۔ میں نے کہا الگزنڈر کا قصور جو کچھ بھی ہو، اُس نے کیسی ہی سیاسی غلطیاں کی ہوں ان کی سزا موت نہیں ہو سکتی شاید جلا وطنی یا قید مگر موت نہیں۔ بیشک اُس نے حکومت کی مخالفت کی تھی اور اُسے سزا ملنی چاہیے لیکن موت! یہ سخت اور ظالمانہ سزا ہے۔ "تم ایک مضبوط آدمی ہو" میں نے اُس سے کہا، "ایک طاقتور انسان، تم نے میرے شوہر کو شکست دی ہے، تمہیں اُس کی زندگی کی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، اُس کی جان بخش دو ساری دنیا تمہاری فیاضی کو سراہیگی۔ ہمیں اُس کی ضرورت ہے، مجھے اور سونیا کو، وہ ہمیں پیارا ہے، اُس کی جان بخش دو" میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں نے زبان بند کر دی۔ (رونے لگتی ہے)

ستاملبو۔ اور اس کا جواب کیا ملا؟

لاڈیا۔ (اپنے آپ پر قابو پا کر) صاف اور کورا جواب۔ اُس نے الگزنڈر پر بہت بہتان تراشے، اُسے

باغی، مجرم اور نہ معلوم کیا کیا کہا۔ میں نے سُنا بھی نہیں۔ میں سمجھ گئی کہ میری آخری اُمید بھی ختم ہوئی۔

کنارڈ۔ ڈاکٹر پروان نے کہا ہے کہ تم نے شنڈر کی طرف متوجہ ہو کر کہا "جیسا میرا خیال تھا، ویسا ہی ہوا، اب کوئی اُمید نہیں۔ کرٹ اب ایک ہی چیز باقی ہے" کیا یہ صحیح ہے؟

لاڈیا۔ بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ میں نے آج تک شنڈر سے بات نہیں کی۔ ممکن ہے میں نے کہا ہو "اب کوئی اُمید نہیں" لیکن یہ اس لیے کہ اپنے خیالات کا بلند آہنگی سے اظہار کر رہی تھی، اور مایوسی کا مجھ پر غلبہ تھا۔

ستاملبو۔ اور پھر؟

لاڈیا۔ پھر؟ پھر میں جانے کے لیے مڑی۔ میں جلدی سے باہر نہیں نکل سکی۔ دفعتہً میں نے ایک چیخ سُنی میں نے شنڈر کو پستول ہاتھ میں لیے دیکھا۔ دھماکے کی آواز آئی، آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ مسٹر پریذیڈنٹ گر پڑا۔ پروان شنڈر سے گتھم گتھا ہو گیا۔ کمرہ میں بہت سے لوگ آ گئے اور ایک لمحہ میں یہ سب کچھ ہوا۔ بس یہ ہے سارا واقعہ۔ اس کا ہر لفظ صحیح اور درست ہے۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں۔

جج سانکو۔ کیا تمہیں اس امر سے انکار ہے کہ تم جمہوری جماعت کی رکن ہو۔

لاڈیا۔ نہیں مجھے اس سے انکار نہیں۔

جج سانکو۔ یعنی تمہیں تسلیم ہے کہ تم باغی ہو

لاڈیا۔ نہیں یور لارڈشپ۔ باغی نہیں بلکہ وطن کی سچی خیر خواہ جس کی خواہش یہ ہے کہ بدقسمت لوگ آزادی مسرت اور امن کی زندگی بسر کریں۔

جج سانکو۔ بکواس نہ کرو۔ میں تمہیں منع کرتا ہوں کہ اس کٹہرے کو اپنے باغیانہ خیالات کی اشاعت کا ذریعہ نہ بناؤ۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ تم قومی حکومت کو ختم کرنے کی سازش میں شریک ہو؟

لاڈیا۔ میں اُن میں سے ایک ہوں جن کا مطالبہ یہ ہے کہ لوگوں کو خود اپنے حکمران منتخب کرنے کا حق ہونا چاہیے

سرکاری وکیل۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ جمہوری جماعت کے سرغنہ حکومت کے اراکین اور ہمارے قائد کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے۔

لاڈیا۔ ہاں میں قطعی انکار کرتی ہوں۔

سرکاری وکیل۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تمہارے شوہر نے ایسی سازش کے وجود کو تسلیم کرلیا ہے تو تم کیا کہو گی؟

لاڈیا۔ میں کہونگی کہ یہ ایک اور جھوٹ ہے۔

سرکاری وکیل۔ تم غلطی پر ہو۔ میرے پاس اس کا تحریری اعتراف موجود ہے۔

(عدالت کے کمرہ میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔)

لاڈیا۔ (ججوں سے) کیا اسے توقع ہے۔ کوئی اس بات پر یقین کرلیگا۔

جج ولورا۔ تم کہتے ہو کہ تمہارے پاس الگزنڈر کمان کا تحریری اعتراف موجود ہے۔

سرکاری وکیل۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔ کیا آپ اسے سننا چاہتے ہیں

جج ولورا۔ ہاں ضرور

سرکاری وکیل۔ (پڑھتا ہے) "میں الگزنڈر کمان ——"

جج سلونزسکی۔ کیا اس پر کوئی تاریخ ہے؟

سرکاری وکیل۔ جی، یور لارڈشپ۔ اس پر کل کی تاریخ ہے شام کو ۸ بجے۔ کیا میں پڑھوں۔

جج ولورا۔ ہاں۔

سرکاری وکیل۔ "میں الگزنڈر کمان جو اس زمین پر صرف گنتی کے چند گھنٹوں کا مہمان ہے اور اس جرم کے وزن کو ہلکا کرنا چاہتا ہے جو اس کے ضمیر پر بار ہو رہا ہے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے غداری اور سازش جیسے جرائم کیے ہیں جس کی سزا مجھے دی گئی ہے۔ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں اور حکومت سے معافی کا خواستگار ہوں۔ ہمارے محترم قائد پر اس حملہ سے عوام میں نفرت و حقارت کے جو جذبات پیدا ہوئے ہیں انہوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں کس قدر خوفناک جرائم کا مرتکب ہوا ہوں۔ حملہ ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ میں اپنی بیوی، ضیتو اور دوسرے لوگوں سے متفق تھا کہ اگر دیگر ذرائع ناکام رہیں تو منسٹر پریزیڈنٹ کے قتل سے حکومت کا خاتمہ کردیا جائے۔ خدا کا شکر ہے یہ سازش

ناکام رہی۔ اس کا کفارہ میں اپنی جان دے کر ادا کرتا ہوں" دستخط الگزنڈر کمان

(پڑھنے کے دوران میں کمرہ عدالت میں ہلچل زیادہ ہو جاتی ہے۔ صرف لاڈیا حالت سکون میں ہے

جج ولورا۔ ہمیں یہ اعتراف دیکھنے دو۔

سرکاری وکیل۔ (دیتے ہوئے) یہ کمان کی اپنی تحریر ہے۔

لاڈیا۔ یور لارڈ شپس یہ جعلی ہے۔

سرکاری وکیل۔ اس پر جیلخانہ کے دو سنتریوں کی گواہی ہے۔ وہ اس کے اصل ہونے کی تصدیق کر دینگے۔

لاڈیا۔ حکومت کے گرگے! ان کی حقیقت ہی کیا ہے۔ یہ جعل ہے۔

جج مورسی۔ کیا اس کے جعلی ہونے کا کوئی ثبوت بھی ہے۔

لاڈیا۔ ثبوت میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں۔ کیا آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں، یور لارڈ شپس یہ تو بہت آسان بات ہے۔ کسی کو جیلخانے بھیجیے، وہ وہاں ہے۔ ایک کال کوٹھری میں، زنجیروں میں جکڑا ہوا تین ماہ سے وہ وہاں ہے۔ اُس کو بلوا لیجیے۔ اُس کو یہاں لائیے، اُس کو یہاں کھڑا ہونے دیجیے۔ اگر وہ اب تک کھڑے ہونے کے قابل ہے اور اُسے یہ جعلی اعتراف دکھا دیجیے۔ اُس سے پوچھیے کہ کیا یہ اُسی کا ہے اور جب وہ جواب دیگا تو آپ پر صداقت واضح ہو جائیگی۔

سرکاری وکیل۔ بدقسمتی سے یور لارڈ شپس الگزنڈر کمان کو یہاں بلانا ناممکن ہے۔

جج ولورا۔ ناممکن کیوں؟

سرکاری وکیل۔ آج صبح سویرے اُس نے خودکشی کر لی ہے۔ (سنسنی پھیل جاتی ہے)

لاڈیا۔ (چیخ کر) ہائے، انہوں نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ قاتل، جانور، جنگلی

کنارڈ۔ (آگے بڑھ کر) لاڈیا

لاڈیا۔ انہوں نے اس کو مار ڈالا ہے۔ (جارج کی پستول میز سے اُٹھا لیتی ہے)

کنارڈ۔ روکو اس کو، خدا کے لیے روکو۔

(ایک عورت چیختی ہے۔ لاڈیا پستول کا رخ اپنے سینہ کی طرف کرتی ہے مگر چلانے سے پیشتر ہی

کنارڈ اور ایک سنتری اُس سے پستول چھین لیتے ہیں۔

لاڈیا۔ نہیں نہیں، مجھے مرنے دو۔ الگزنڈر، الگزنڈر!

(کنارڈ اور سنتری اُسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جج ولور گھنٹی بجاتا ہے۔ عدالت کے کمرہ میں شور و غل ہے)

پردہ گرتا ہے

اقبال کی یاد

(از جناب آلِ احمد صاحب سرور علی گڑھ)

ابھی مسعود کے ماتم سے سنبھلی بھی نہ تھی ملت — خبر آئی کہ ہم سے ہو گیا اقبال بھی رخصت

مسلمانوں کو مسلماں کر دیا جس کے ترانوں نے — قسم کھائی ہے جس کے نطق کی معجز بیانوں نے

وہ جس نے اپنے نغموں سے وطن کی آبرو رکھ لی — چمن کی خوش نوایانِ چمن کی آبرو رکھ لی

وہ جس کے ساز سے بیداریاں بکھریں فضاؤں میں — وہ جس کے دم سے طوفاں جاگ اٹھے ٹھنڈی ہواؤں میں

وہ جس نے خاکیوں میں عرشیوں کی عظمتیں بھر دیں — وہ جس نے خلوتوں میں محفلیں آراستہ کر دیں

وہ جس کی چشم روشن محرمِ اسرارِ فطرت تھی — وہ جس کی فکر رنگیں طرۂ دستارِ فطرت تھی

وہ جس کی خوش نوائی سے چمن میں پھول کھلتے تھے — وہ جس کی شعلہ افشانی سے دل سینوں میں ہلتے تھے

ہر اک ساحل کو ہم آغوشِ طوفاں کر دیا جس نے — بیابانوں کو رشکِ صد گلستاں کر دیا جس نے

وہ جس نے شاعری میں زندگی کا عکس دکھلایا — ہماری زشت سوئی کے لئے جو آئینہ لایا

فضائے لامکاں تک رخصتِ پرواز تھی جس کی — نوائے قدس سے ملتی ہوئی آواز تھی جس کی

وہ جس نے آشیاں کی خاک میں چنگاریاں بھر دیں — رگوں میں خون کے بدلے تڑپتی بجلیاں بھر دیں

وہ ساقی جس کی مینائے سخن میں تیغ کی تیزی — وہ واعظ پند میں جس کی جوانی کی دلآویزی

بہارِ رنگ و بو میں، بجلیاں کھولے ہوئے پرچم — کبھی طوفاں، کبھی ساحل، کبھی شعلہ کبھی شبنم

فقیرِ بے نوا تھا عظمتِ شاہانہ رکھتا تھا — وہ عاشق تھا مگر انداز معشوقانہ رکھتا تھا

وہ جس کا دل نہ تھا عشقِ الٰہی کا خزانہ تھا — تکلم عالمانہ تھا تخیل شاعرانہ تھا

وہ جس کی موت کا ہندوستاں میں آج ماتم ہے — مگر عظمت سے جس کی مسلم ہندی معظم ہے

اٹھے گا فخر سے سر عالم اسلام کے آگے — حجاز و مصر کے آگے، عراق و شام کے آگے

وہ جس نے ڈوبتی نبضوں میں دوڑایا لہو اپنا
بیابانوں کے دل میں بھر دیا ذوقِ نمو اپنا

وہ جس نے حریت کے راز بتلائے غلاموں کو
وہ جس نے سجدے کے آداب سکھلائے اماموں کو

دلِ یخ بستہ کو ذوقِ عمل کی آنچ دی جس نے
ہجومِ یاس میں چمکائی اپنی روشنی جس نے

حریمِ حسن کے پردے اٹھائے، رازِ حق کھولے
فرشتوں کے عمل انسان کی میزان پر تولے

وہ شاعر جس نے اسرارِ خودی کا راگ گایا تھا
وہ غازی موت کا منہ دیکھ کر جو مسکرایا تھا

وہ مے کش دے گواہی حور جس کی پارسائی کی
وہ مومن بندگی میں شان تھی جسکی خدائی کی

زعیمِ ملک و ملت رہبرِ دیں، رندِ بے پروا
کلیمِ طورِ معنی، علم کا بہتا ہوا دریا

وہ جس نے زندگی میں پھونک دی تابندگی ایسی
جسے خود موت کی ظلمت بھی مدھم کر نہیں سکتی

شفق ہر شام کو اسکی لحد پر پھول لاتی ہے
نسیم جانفزا ہر صبح یہ نغمہ سناتی ہے

یہاں ملتا رہیگا سوز و سازِ آرزو برسوں
کیا ہے خونِ ل سے ایک قلندر نے وضو برسوں

تنقید و تبصرہ

وفاق ہند | از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری۔ سائز ۲۲×۱۸/۱۶ صفحات ۱۶۰۔ قیمت عہ
ملنے کا پتہ:۔ اُردو لٹریچر کمپنی، دہلی۔

وفاق ہند "سلسلہ آئین عالم" کی پہلی کڑی ہے لیکن کتاب سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سلسلہ کی آئندہ کڑیاں کون کون سی ہونگی اور دنیا کے کس کس ملک کے دستور کو اسی انداز پر پیش کیا جائے گا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض مصالح کی بنا پر کسی کتاب کو ایک خاص سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسکی آئندہ کڑیاں شایع کرنا مقصود بھی نہیں ہوتا۔ کاش اس مفید سلسلہ کا یہ حشر نہو۔

بہر حال یہ کتاب ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس زمانے میں جبکہ وفاق ہند کے دستور نے مختلف مدارج طے کئے حکومت ہند کے پبلک انفرمیشن بیورو کے ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس دستور کے رموز و نکات پر آپ کو جتنا عبور حاصل ہو سکتا ہے اُتنا کسی دوسرے کو ہونا مشکل ہے۔ یقیناً آپ نے یہ کتاب تصنیف کر کے اہل سیاست کی مفید خدمت انجام دی ہے جس کے لئے آپ داد کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے کہ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اُردو داں حضرات حوالہ جات کے سلسلہ میں اسے کارآمد پائیں گے۔

گذارش کے ذیل میں ناشرین لکھتے ہیں کہ "قانون ہند ۳۵ء یا جدید دستور پر موافق یا مخالف رائے ظاہر کرنے سے جان بوجھ کر پہلو بچایا گیا ہے۔۔۔ اس سے غرض یہ ہے کہ۔۔۔ اس پر کسی ایسے شبہ کی پرچھائیں بھی نہ پڑ سکے کہ یہ کتاب کسی خاص سیاسی مسلک یا عقیدے کا پروپگنڈا ہے"

اور پیش لفظ کے تحت میں ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ تحریر فرماتے ہیں کہ "وفاق ہند گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس میں قیام وفاق اور اصول وفاق کو ایک مستقل موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے"

کتاب کے شروع میں قابل مصنف نے سیاسیات ہند کا تاریخی پس منظر بھی دیا ہے یعنی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی اہم آئینی تبدیلیوں پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے - اس کے بعد وفاق کی اسکیم اس کی تمام و کمال جزئیات کے ساتھ پیش کی ہے موضوع کی " خشکی " کے باوجود کتاب کی زبان اتنی سادہ اور انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ سر سلیمان کی دونوں رائیں اپنی اپنی جگہ پر غالباً صحیح ہوسکتی ہیں یعنی ایک طرف تو " یہ کتاب ایک تاریخی کہانی معلوم ہوتی ہے " اور دوسری طرف " لائق مصنف نے جس قابلیت سے اس کا پس منظر تیار کیا ہے اس نے وفاق ہند کو ایک عالمانہ سیاسی تصنیف کی شان بخش دی ہے "

بہر حال ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے سلسلہ میں ڈاکٹر جعفری اپنے مقاصد میں کامیاب ہیں -

(م - ع - خ)

زر تاج | یعنی سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی کے افسانوں کا مجموعہ - سائز ۲۲×۱۸/۱۶ ضخامت ۱۳۶ قیمت فی جلد عہ ، عہدہ داران اور ذی ثروت حضرات سے عہ - ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن -

یہ کتاب جناب قیس حیدرآبادی کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے تین افسانے (زر تاج - ماں اور کنول) غالباً طبعزاد ہیں - تین افسانے (جبکہ دنیا بچہ تھی - ہنگامہ چشمک اور محب وطن) دوسری زبان کے افسانوں سے ماخوذ ہیں اور باقی پانچ ترجمہ ہیں -

دنیا میں کوئی زبان جب ترقی کی طرف رخ کرتی ہے تو شروع شروع میں اس زبان کے اہل قلم افسانوں کی طرف جھک پڑتے ہیں اس لئے ہم اردو زبان میں افسانہ نویسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر نہ مایوس ہوتے ہیں اور نہ اسے شگون بد سمجھتے ہیں - بہر حال اس وقت ہندوستان میں بہت سے افسانہ نویس موجود ہیں لیکن ان میں ایسے لوگ کم ہیں جو ان کی اشاعت کے لئے سرمایہ بھی رکھتے ہوں - خوش قسمتی سے جناب قیس کو یہ دونوں چیزیں میسر ہیں اس لئے انکا یہ مجموعہ پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ گیا -

(م - ع - ش)

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

رفتار زمانہ کا مضمون برتنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ زمانے کی کوئی ایک رفتار نہیں ہوتی کبھی تو وہ ایسی تیزی سے بھاگنے لگتا ہے کہ اس کی تصویر بہ جاتی ہے، چاہے جتنی جلدی بھی اتاری جائے کبھی وہ ایسا سست ہو جاتا ہے کہ قلم ہاتھ میں لئے ہفتوں سوتے رہیئے اور پھر آنکھ کھولئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ وہ چھلانگ مارنے کے لئے اپنا بدن سمیٹ رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی تصویر اتارنے کا سامان کر چکے ویسے ہی یہ بھید کھل جاتا ہے کہ یہ اپا ہج کی انگڑائی تھی اس سے حرکت کرنا نہیں حرکت سے بچنا مقصود ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک کرتب دیکھنے میں آیا۔ مئی کے آخر میں جب چیکوسلوواکیا کی میونسپلٹیوں اور مقامی حکومت کے دوسرے اداروں کے انتخاب ہو رہے تھے تو کچھ ایسا لگتا تھا کہ ہر طرف الٹیمیٹم بھیجے جائیں گے اور انھیں کے پیچھے پیچھے بم اور توپ کے گولے پہنچیں گے۔ لیکن پھر معاملہ کچھ ایسا دب گیا کہ جیسے کچھ ہوا نہ تھا اور ہونے والا نہ تھا۔ چیکوسلوواکیا کے جرمن ابھی تک جرمنی سے وصل کے لئے اس طرح بیتاب ہیں جیسے کہ انتخاب کے زمانے میں اور ہر ہٹلر کی تدبیریں بھی سازگار ہے۔ لیکن اِن کی پہلی کوشش منہ میں ناکامیابی کی کڑواہٹ چھوڑ گئی ہے آپ کو یاد ہوگا کہ وسط مارچ میں انھیں دنوں میں جب کہ آسٹریا پر ہر ہٹلر کا قبضہ ہوگیا تھا پولینڈ اور لتھوئنیا کے درمیان ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پولینڈ نے لتھوئنیا کو یہ الٹیمیٹم دیا تھا کہ آمد و رفت کے لئے سرحد کو کھول دے، جو کہ سترہ اٹھارہ سال سے بند تھی اور وہ تمام تعلقات، جو دو ریاستوں میں جس کے درمیان لڑائی نہیں ہے' ہونے چاہیئے۔ قائم کرے۔ ورنہ اس کا نتیجہ برا ہوگا۔ پولینڈ کے اس الٹیمیٹم کا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ سرحد پر لتھوئنیا کے چند سپاہیوں نے پولینڈ کے سپاہیوں پر یا پولینڈ کے سپاہیوں نے لتھوئنیا کے سپاہیوں پر گولی چلا دی تھی اصل سبب یہ تھا کہ لتھوئنیا کا روس سے معاہدہ

ہے جس کے مطابق روس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی فوج کو جنگ کی حالت میں لتھوئنیا کی زمین پر سے گذارے اور اس کے بدلے میں روس نے لتھوئنیا کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا ہے اب اگر آپ حساب لگائیں تو معلوم ہوگا کہ روس سرحد، برلن سے اتنی دور ہے کہ روسی ہوائی جہاز اس پر بمباری نہیں کرسکتے، لیکن اگر لتھوئنیا کے مغربی حصے میں کہیں قدم رکھنے کا موقع مل جائے تو یہ آسانی سے ممکن ہے اس لئے جب چکوسلوواکیا کے وزیر اعظم نے اس کی خبر پاکر ہر ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، اعلان کیا کہ ان کی قوم اپنی آزادی اور ملک کو سلامت رکھنے کے لئے خون بہانے میں تامل نہ کرے گی اور اسی کے ساتھ روسی حکومت نے چکوسلوواکیا کی مدد کو پہنچنے کا وعدہ کیا تو ہر ہٹلر نے اپنے دوست پولینڈ کے وزیر خارجہ کرنل بک کو بلایا اور باہمی مشوروں کے بعد یہ طے پایا کہ لتھوئنیا کے گھونسا مار کر دیکھا جائے کہ روس پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ سٹالن نے چوں بھی نہیں کی اور ہٹلر کو اس طرف سے اطمینان ہوگیا پھر انگلستان اور فرانس کے تیور دیکھنا تھے کہ چکوسلوواکیا سے جنگ کا قصہ چھڑنے پر کیا ہوں گے۔ برطانوی مدبروں کی گول گول باتوں سے پہلے تو اندازہ ہوا تھا کہ انھیں چکوسلوواکیا سے کوئی خاص ہمدردی نہیں وہ اندرون یورپ کے کسی معاملے میں الجھنا نہیں چاہتے، لیکن جب چکوسلوواکیا کی سرحد کے قریب جرمن فوجوں کے پہنچنے کی خبر ملی اور فرانس نے ہمت کرکے چکوسلوواکیا کی مدد کرنے کا غیر مشروط وعدہ کرلیا تو برطانوی سفیر کو بھی ہدایت دی گئی کہ وہ جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فون ربن ٹروپ سے فوجوں کی نقل و حرکت کے معنی پوچھے، اور اس طرح پوچھے کہ وہ سمجھ جائیں کہ ٹھیک ٹھیک جواب دئے بغیر کام نہ چلے گا اس نے چکوسلوواکیا کو بچالیا، اور کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر برطانوی حکومت سے آخری وقت تک فیصلہ نہ کرتا، اور دنیا پر اپنا ارادہ ظاہر نہ کرتا اپنا خاص مشرب نہ بنالیا ہوتا تو اس وقت یورپی سیاست کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔

ہٹلر کا یہ پہلا وار ہے جو کہ خالی گیا ہے، اور اس کے بعد اس کی جو چالیں ہوں گی ان میں اسے خیال رکھنا ہوگا کہ برطانیہ کا شیر بالکل شیر قالین نہیں، وہ بھرے پیٹ کی نیند سو رہا ہے تو کیا کبھی کبھی چونک بھی پڑتا ہے۔ اب ہٹلر کی چالیں زیادہ گہری ہوں گی جس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ زیادہ

احتیاط برتے گا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کی چالوں کا توڑ جنگ کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ اس کا تو ہمیں یقین ہے کہ اس کے لئے چین سے رہنا ممکن نہیں۔ اس کی سیاست اور شخصیت کی بنیاد ہی بے چینی پر ہے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی گرو کھلاتے رہنے پر ہے۔ اب آئیے ذرا سوچیں کہ وہ کرے گا تو کیا کرے گا۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جنوبی ڈنمارک پر، ڈانٹزگ کے آزاد شہر اور مغربی پولینڈ کے اس علاقے پر جو جرمنی اور مشرقی پرشا کو الگ کئے ہوئے ہے اور چیکوسلوواکیا کے ان حصوں پر جہاں جرمن آباد ہیں ہٹلر کے دانت لگے ہوئے ہیں۔ انگلستان اور فرانس نے چیکوسلوواکیا کا نوالہ اس کے منہ سے نکال لیا ہے اور اس نے اس کی بھوک اور غصے کو بڑھا دیا ہوگا۔ اس کی کسر نکالنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ جنوب مشرقی یورپ میں تجارت کو سیاست کا اور سیاسیات کو تجارت کا سہارا دے کہ اپنا اثر بڑھائے۔ آسٹریا پر قبضہ ہو جانے سے دریائے ڈینیوب کی تجارتی شاہ راہ، جو بہت اہمیت رکھتی ہے بڑی حد تک اس کے اختیار میں آ گئی ہے اور یہ تو اب سے بارہ چودہ برس پہلے کی بات ہے کہ جرمنی نے ان طرف کے تمام ملکوں کے کاروبار کو اپنے کاروبار سے اس طرح الجھا دیا ہے کہ وہ کسی اور سے تجارت کر ہی نہیں سکتے۔ ہنگری اس کی طرف مائل ہے، پولینڈ کی سیاست اس کی گرویدہ، رومانیہ کو اس سے بڑا گاہک نہیں مل سکتا، اور باقی سارے ملک، جو چاہتے ہیں کہ زبردست کا ساتھ ہو کہ کمزور کا نہ ہو اس کی طاقت سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ اب ہٹلر کو جنوب مشرقی یورپ پر حاوی ہو جانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ادھر وہ چپکے چپکے ویانا سے سیدھا لگا کر بحر ایڈریاٹک تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہوا تو بحر روم کا ایک رستہ نکل آئے گا جو جنوب مشرقی یورپ پر اس کی گرفت کو اور مضبوط کر دے گا۔

لیکن یہ کام خاموشی سے کرنے کا ہے۔ اس میں نہ ہنگامہ ہے نہ تماشا اسی سبب سے خیال ہوتا ہے کہ اس کام میں حرج کئے بغیر ہٹلر کی سیاست اور میدان بھی تلاش کرتی رہے گی جہاں کام کے ساتھ نام پیدا کرنے کا بھی موقع ہو گا۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ تسدوگ یعنی ڈنمارک کے جنوبی حصے پر قبضہ کرے جہاں اس وقت بھی بے ضابطہ طور پر نازیوں نے ہر طرح کا اختیار حاصل

کر رہا ہے۔ مگر ڈنمارک کا رُخ مغرب کی طرف ہے، اور شلسوگ پر قبضہ ہو جانے سے جرمنی کو اِدھر بحری قوت کے مرکز بننے کا ایسا موقع مل جائے گا۔ جو برطانیہ کے لئے بہت خطرناک ہے۔ ہٹلر ابھی ایک مرتبہ برطانوی سیاست کو چھیڑ چکا ہے اس لئے وہ اتنا انتظار تو ضرور کرے گا کہ دل کا غبار بیٹھ جائے۔ اب تیسری یہ کہ ڈانسزگ پر وار کیا جائے۔ اس کے لئے وقت بہت مناسب ہے۔ ڈانسزگ کی حکومت لیگ کے سپرد ہے اور لیگ کی آپ جانتے ہیں کہ اب آبرو کیا ہے۔ ڈانسزگ کو جرمنی سے الگ رکھنے پر پولینڈ کے سوا کسی کو اصرار نہ ہوگا، اور پولینڈ کی سیاست خواہ آپ حکومت کے رنگ کو دیکھئے یا خارجی تعلقات کو، جرمنی کا منہ تکتی رہتی ہے۔ غالباً پولینڈ کے وزیر خارجہ کرنل بک سے ہٹلر نے ذاتی طور پر یہ معاملہ کر لیا ہے کہ وہ علاقہ جو جرمنی اور مشرقی پرشا کے درمیان ہے اور پولش کوریڈور کہلاتا ہے جرمنی کو دے دیا جائے۔ اور پولینڈ اس کے بدلے شمال مشرق کی طرف ہٹ کر سمندر تک پہنچنے کا رستہ نکالے۔ یہ رستہ لتھونیا سے ہو کر گذرے گا اور اسی لئے پولینڈ نے اپنے پڑوسی سے جھگڑا بھی شروع کر دیا ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے تو پھر انتظار کاہے کا ہے کرنل بک کو ایک نازی انقلاب کا انتظار ہے جو کسی روز بھی ہو جائے تو تعجب نہیں یہ انقلاب پولینڈ کی عام آبادی اور ملک کی پارلیمنٹ کی مرضی کے خلاف ہوگا اسی وجہ سے وہ ایک معمولی اور باضابطہ قانونی کارروائی کی صورت اختیار نہیں کر سکتا کرنل بک اور اُن کے فاشسٹ ساتھی حکومت پر بے شک حاوی ہیں لیکن اس قدر نہیں کہ جو چاہیں کر سکیں۔ پھر دوسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہٹلر میں کون سی کشش ہے کہ پولینڈ کے فاشسٹ اس پر فدا ہو رہے ہیں جب وہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہٹلر کو زمین کی اور شہرت کی ہوس ہے اور اُن کا ایک اور پڑوسی موجود ہے جس کی دوستی شاید بالکل بے غرض ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ روسی پولینڈ پر اتنے دنوں تک ظلم کر چکے ہیں کہ روس اور پولینڈ کا اتحاد ہو نہیں سکتا، اور اس کے علاوہ معاشرتی تنظیم کے جو اصول روس میں رائج ہیں انھیں پولینڈ کا حاکم طبقہ اپنے لئے زہر سمجھتا ہے ان دونوں باتوں کے علاوہ ایک تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ جرمنی کی طاقت دیکھنے میں روس سے

کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے اور اس طاقت کو استعمال کرنے پر وہ ہر وقت آمادگی بھی ظاہر کیا کرتا ہے
پولینڈ کو لتھونیا سے کد ہے، چکوسلوواکیا سے عداوت ہے اور اگر کبھی وہ ان دونوں پر اپنا غصہ
اتارنا چاہے تو اُسے جرمنی سے مدد ملے گی اور روس سے ہرگز نہ ملے گی۔ پھر وہ جرمنی کا کیوں دامن
نہ پکڑے۔ خصوصاً جب انگلستان اور فرانس، جس کا اس پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے اسے ملک
کی حیثیت سے دوبارہ زندہ کیا۔ اس احسان کا کوئی بدلہ نہیں۔ اس کی غرض کو اپنی غرض نہیں سمجھتے
اور اس کی بھوسے سے بھی ہمت افزائی نہیں کرتے۔

اب تک ہٹلر کی خاص بول چال یہ تھی کہ ورسائی کے صلح نامے کی بے شمار زیادتیاں جتا کر
اور مغربی قوموں کو بولشوزم کے بھوت سے ڈرا کر جرمنی کے لئے وہ تمام حقوق مانگے جو ایک آزاد اور
غیرت دار قوم کو حاصل ہونا چاہئیں۔ اب اس راگ میں کوئی تاثیر نہیں رہی اور قومی عظمت کے جو ترانے
جرمن سیاست گا رہی ہے انھوں نے اس پرانے راگ کو دبا بھی دیا ہے۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے ختم
ہونے سے پہلے ہی وہ اس کا اندازہ کرنے کی ترکیبیں سوچے گا کہ تین طرف سے فاشسٹ حکومتوں
سے گھر جانے کا فرانس پر کیا اثر ہوگا۔ اور وہ رجحان کو فرانس کے اندر جو گمنام ہوائی جہاز ہسپانیہ کی
طرف سے گھس آئے تھے اس کا مقصد سمجھئے سوئی چبھو کر یہ معلوم کرنا تھا کہ فرانس کی جلد کتنی موٹی ہے
اور زندہ گوشت میں سوئی چبھ جائے تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ اگر اس تجربے نے یہ ثابت کیا کہ وہ سست
یا اندرونی اختلافات میں مبتلا ہیں جن کا کہ فرانس میں خاص طور پر اندیشہ ہے تو ہٹلر چکوسلوواکیا یا
ڈانزگ پر ضرور وار کرے گا اور شاید اس مرتبہ اس کا وار خالی نہ جائے گا۔

لیکن اگر ہٹلر نے انگریزی اور فرانسیسی اتحاد کو چست اور ان کی سیاست کو چوکنا ہی نہ پایا
بلکہ ہر طرف اپنے رستے میں حائل دیکھا تو؟

اس سوال کا ایک ہی جواب ہے جو سیاست کے ماہر پہلے سے دے چکے ہیں پہلے یقین نہ
آتا تھا کہ ان کا جواب صحیح ہو سکتا ہے لیکن اب جو یہ بھید کھل گیا ہے کہ فاشزم کا دیو بولشزم کے بھوت
سے کچھ کم ڈراؤنا نہیں اور جمہوری ریاستوں میں عام رائے مدبروں پر زور ڈال رہی ہے کہ دونوں

کی یکساں مخالفت کی جائے تو کیا عجب ہے کہ بھوت اور دیو مل کر ایک شکل بن جائیں ان کے جسم میں
بھی ہوا تاریکی اور تخیل کے بنائے ہوئے اور دیکھنے والے کی اندرونی کیفیت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں

ابھی دو چار روز پہلے کی خبر ہے کہ روس اور چین کا ایک معاہدہ ہوا ہے جس میں چین کی
حکومت نے جاپان کی مخالفت پر قائم رہنے اور حکومت کے کاروبار میں روسی ماہروں سے مدد
لینے کا وعدہ کیا ہے اور روس نے سامانِ جنگ مہیا کرنے کا ذمہ لیا ہے یہ خبر ٹوکیو سے شائع ہوئی
ہے اور بہت ممکن ہے اس کا مقصد چین کو بدنام کرنا ہو۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ خبر صحیح ہو۔ کیونکہ چینیوں
کے ہاتھ سے لنگھائی ریلوے نکل گئی ہے۔ کانٹون اور ہانکاؤ پر بمباری ہو رہی ہے اور جاپانی حکومت
نے معلوم ہوتا ہے طے کر لیا ہے کہ چینیوں کو کہیں بھی آپ اپنے اوپر حکومت کرنے کا موقع نہ دے گی
ٹوکیو سے ماسکو بہر حال زیادہ دور ہے، اور کھنڈر سے جھونپڑا بہتر، اس لئے اگر چینیوں نے
اپنے آپ کو روس کے حوالے کر دیا تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ دوسری طرف جاپان کو بھی معلوم ہوتا
ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر مسلسل جنگ کرنے کی ذمہ داری بٹھائے دیتی ہے۔ وہاں کی وزارت میں
جو تبدیلیاں حال میں ہوئی تھیں اُن سے لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اب جاپان غیر قوموں اور خصوصاً
انگلستان اور امریکہ سے بہت بہتر برتاؤ کرے گا اور اگر یہ خبر صحیح ہے کہ چین نے روس کا دامن
پکڑا ہے تو جاپان کو چاہئے بھی کہ یورپ اور امریکہ والوں کا سہارا ڈھونڈھے۔

روس کو جاپان کی طرف سے بڑے اندیشے تھے، اور جرمنی اور جاپان کے اتحاد نے خطرے
کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اب جاپان ایک طرف الجھا ہوا ہے، اگر دوسری طرف جرمنی سے صلح ہو جائے
اور ہٹلر کو وسطی یورپ میں منہ مانگے دام دے کر اوکرائین ([illegible]) کو محفوظ کر لیا جائے
تو اس میں روس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ لیکن انگلستان اور فرانس کا اس میں بڑا نقصان ہے
کیونکہ انھیں ہٹلر کا مطالبہ کہ اسے وہ تمام نوآبادیاں جو جنگ سے پہلے جرمنی کے پاس تھیں واپس کر دی
جائیں پورا کرنا ہوگا اور ممکن ہے کہ یہ مطالبہ پورا کر کے بھی وہ ایسے الجھاؤ میں پڑ جائیں کہ جس سے جنگ کے
سوا چھٹکارا پانے کی اور کوئی صورت نہ ہوگی اس میں دنیا کا بھی بڑا نقصان ہوگا۔ کیونکہ ترقی یافتہ قوموں

کی خبگ، علم و ہنر اور صنعت کو بڑا سخت صدمہ پہنچائے گی اور اس سے اِن مشکلوں میں سے ایک مشکل بھی حل نہ ہوگی جو اس وقت دنیا کو بے چین کئے ہیں۔

(باجازت اے آئی آر)

تعلیمی دنیا

مسٹر اڈلف مائر نے بیسک انگلش (BASIC ENGLISH) کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی
پنڈت جواہر لال نہرو اس جلسے کے صدر تھے۔ پنڈت جی نے اس کی اہمیت کو ہندوستان کے مخصوص
حالات میں اس طرح واضح کیا۔

"مجھے (BASIC ENGLISH) کی ترویج میں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ اس ترکیب سے
ہندوستانی نوجوانوں کا بہت سا قیمتی وقت بچ سکے گا جو بے معنی اور لغو ادبی موشگافیوں میں ضائع
ہو جاتا ہے (BASIC HINDUSTANI) بیسک ہندوستانی کو کل ہندوستان کی عام زبان بنانے
کے سلسلے میں بھی بیسک انگریزی سے مدد مل سکتی ہے۔ تمام عملی ضروریات کے لئے بیسک انگریزی ادبی
اور رواجی انگریزی کی جگہ بہت آسانی سے لے سکتی ہے۔"

بنیادی انگریزی لغت سے مراد وہ چند سو انگریزی الفاظ ہیں جو بالعموم تحریر و تقریر کے
سلسلے میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور جن سے معمولی ضروریات کے لئے بخوبی کام چلایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر میگھ ناتھ سہا جو ایک مدت سے الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر طبیعات تھے کلکتہ یونیورسٹی
کے سائنس کالج میں معلم پالٹ پروفیسر آف فزکس مقرر ہوئے ہیں۔ پروفیسر موصوف تیسرے ہندوستانی
ہیں جنھیں قابل قدر علمی تحقیقات کی بدولت رائل سوسائٹی نے اعزازی فیلوشپ سے نوازا۔ آپ نے
زیادہ تحقیقات ASTRO PHYSICS یعنی فلکی طبیعات پر کی ہے۔

ریاست حیدر آباد کے محکمہ تعلیم کی طرف سے مسٹر دت صدر تحریک برتاچاری بنگال کو دعوت
دی گئی ہے کہ وہ اہل حیدر آباد کو اس نئی تحریک کے اصول اور فوائد سے روشناس کرائیں۔ ریاست

میں حکومت کی طرف سے براتا چاری تحریک کی شاخ قائم کردی گئی ہو اور نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیم اس کے صدر ہیں۔ مسٹر دت نے جو انڈین سول سروس کے ممبر ہیں چند سال سے براتا چاری کی مفید تحریک بنگال میں جاری کی ہو اس کے لغوی معنی عہد و پیمان کرنے والے کے ہیں۔ تحریک کا مقصد مدارس اور کالجوں کے طلبار میں ضبط کی مشق اور ریاضت جسمانی کا شوق پیدا کرنا ہی۔

حکومت کشمیر نے پچیس ہزار کی رقم نئے میزانیہ میں ان طلبار کو قرض دینے کے لئے مخصوص کی ہی جو ہندوستان یا غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم یا کسی فن یا پیشے میں اعلیٰ درجہ کی تربیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قرضے کی شرطیں بہت آسان رکھی گئی ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مقروض اپنی آمدنی میں سے تمام رقم قسطوں کی صورت میں ادا کرسکتا ہی اصل رقم پر تین فیصدی سود لیا جائے گا۔ اگر قرضہ سات سال کے اندر ادا کردیا جائے تو سود کا پچیس فیصدی حصہ معاف کردیا جائیگا اور اگر قرضہ کی ادائگی دس سال کی مدت میں ہوئی تو پندرہ فیصدی سود معاف کیا جائے گا۔

سینور مسولینی نے اطالوی انسٹیٹوٹ برائے مشرق بعید و وسطےٰ قائم کیا ہی جس کا مقصد اٹلی اور ایشیا کے مابین تمدنی اور ادبی رشتوں کو استوار کرنا ہی۔ اس ادارے کی طرف سے سر۔ ٹی۔ وجیا راگھو چاریہ سابق زراعتی تحقیقاتی کونسل اور ممبر پبلک سروس کمیشن کو دعوت دی گئی ہی کہ وہ روم میں "تمدن زراعت اور زندگی کے موضوع" پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کریں سروجیا پہلے ہندوستانی ہیں جن کو یہ اعزاز دیا گیا ہی۔

حکومت مدراس نے اعلان کیا ہی کہ فی الحال ایک سو چار ثانوی مدارس میں ہندستانی پڑھائی جاتی ہی۔ یہ انتظام بورڈ کے ثانوی اسکولوں میں ہی رائج ہی۔ اور اب تک حکومت نے اس سلسلے میں کبھی کوئی خاص زرِامدادی منظور نہیں کیا۔ اب حکومت نے فیصلہ کیا ہی

کہ ثانوی مدارس کی پہلی تین جماعتوں میں ہندوستانی کی تدریس کا باقاعدہ انتظام کیا جائے آئندہ سال کم از کم ایک سو پچیس اداروں کی پہلی تین جماعتوں میں ہندوستانی کی لازمی تعلیم جاری ہو جائیگی سال رواں کے میزانیہ میں اساتذہ کی تنخواہوں کی مد میں بیس ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

پچھلے دنوں حکومت بمبئی نے تعلیمی اصلاحات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی اس کا مقصد ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ پر مقامی حالات کی روشنی میں تبصرہ کرنا اور بمبئی کے مخصوص تعلیمی مسائل کے لئے مشورہ دینا تھا کمیٹی نے خارجی امتحانات کے متعلق بہت دلچسپ اور مفید مشورہ دیا ہے اُن کے خیال میں ثانوی درجے کے تمام خارجی امتحانات حتیٰ کہ میٹرکیولیشن امتحان بھی بند کر دینے چاہئیں۔ ہر ایک کالج داخلے کے لئے الگ امتحان کا بندوبست کرے۔ دستکاری وصنعت کی تعلیم کے لئے منتخب اساتذہ کو خاص تربیت دی جائے اور طلباء اور اساتذہ کے لئے مفید مطلب کتابیں اور تعلیمی اشیاء کی تیاری کے لئے ایک مرکزی اشاعتی دفتر قائم کیا جائے۔

مئی کے شروع میں کارل خاں اوسی اٹزکی Ossietzky کا انتقال ہوگیا انھیں اسی سال امن کا نوبل انعام ملا تھا۔ اُن کی زندگی امن اور صلح جوئی کے حق میں ایک طویل مجاہدہ ہے۔ حال ہی میں نوبل انعام ملنے کے سلسلے میں ان سے حکومت کی ناراضگی کا معاملہ عوام میں آچکا ہے اوسی اٹزکی ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے آپ پول نژاد تھے اگرچہ جنگ عظیم کے دنوں میں آپ نے چار سال تک جرمنی افواج میں کام کیا تاہم جنگ ختم ہوتے ہی آپ پورے امن پسند بن گئے اور اخبارات اور جرائد کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ اس سرفروشانہ مجاہدے میں آپ کو اکثر قتل کی دھمکی دی گئی۔ قید بھی ہوئے نظر بند کئے گئے مگر آپ اپنے عقائد پر ہمیشہ سختی سے قائم رہے آپ کو ۱۹۳۲ء میں ایک مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں جس کا موضوع "سپاہی قاتل سے کم نہیں ہے" تھا سزائے قید دی گئی۔ جب ہٹلر صدر منتخب ہوا تو اس خوشی میں

انھیں رہا کر دیا گیا تاہم جلد ہی جرمن پارلیمنٹ میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد انھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک مدت تک نازی حکومت کے گرگے انھیں ایک مرکزی کیمپ سے دوسرے میں تبدیل کرتے رہے گرفتاری کے وقت ان سے انتہائی بربریت کا سلوک کیا گیا حتیٰ کہ ان کو قتل کی دھمکی دی گئی اوسی اٹزکی نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی تھی ۱۹۳۳ء میں ان کی بیٹی نے انھیں انگلستان سے خط لکھا جس میں بچی نے اس امر پر خوشی ظاہر کی تھی کہ وہ جرمنی سے باہر عافیت میں ہے۔ نازیوں کے محکمۂ جاسوسی نے اس چٹھی کی ٹوہ پالی اور اس جرم کی پاداش میں کہ اوسی اٹزکی نے اپنی لڑکی کی تربیت کس بُرے طریق پر کی ہے ان کو بہت وحشیانہ طریق پر پیٹا گیا۔

ان مظالم اور مصائب کے ہوتے ہوئے بھی، انھوں نے بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار کیا تاہم ان پیہم سختیوں اور جفاکوشی سے ان کی صحت بہت خراب ہو گئی اور آخر کار اس شکستہ دل مجاہد نے موت کے آغوش میں پناہ لے لی۔

گاندھی جی نے نیشنل ایجوکیشن بورڈ کی پچھلی نشست میں یہ تقریر کی: "اس وار دھا ٹریننگ اسکول کے قیام سے ہمارا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے اور قومی بیماریوں کا مداوا تلاش کرنا آج ہمارے قومی امراض میں سب سے شدید و مہلک چیز مذہبی تعصب ہے اس کے خلاف ہمیں عدم تشدد کا حربہ چلانا ہوگا۔ ہمیں اپنے سب مسائل کا حل اہمسا کے اصول پر کرنا ہوگا۔ ہمارے اسکولوں میں ریاضی، سائنس اور تاریخ کی تدریس عدم تشدد کے نقطۂ نگاہ سے کی جائے گی۔

جب خالدہ ادیب خانم نے جامعہ ملیہ دہلی میں ترکی جدیدہ خطبات دئے تو میں نے کہا تھا کہ پرانا فن تاریخ بادشاہوں کے نام اور ان کی جنگجویانہ کارناموں کے سوا کچھ نہیں ہے آئندہ تاریخ سے مراد انسان کی تاریخ ہوگی نہ کہ چند حکمرانوں اور خونخوار فاتحوں کی۔ انسانی تمدن کی تاریخ عدم تشدد کے اصول کا مجلی آئینہ ہے۔ اگر تاریخ کو نئے سرے سے لکھا گیا تو ہمیں شہری دستکاریوں کی بجائے دیہی صنعتوں کا تذکرہ کرنا ہوگا۔ اگر ہمارا منشا دیہات کو آباد اور خوشحال رکھنا ہے تو ہمیں

لازماً دیہی دستکاریوں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیئے اور اس بات کا یقین کر لیجئے کہ اگر ہم ان صنعتوں کے ذریعہ کتابی تعلیم دے سکے تو ہم ملک میں انقلاب عظیم پیدا کر سکیں گے۔ ہماری نصاب کی کتابیں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھ کر تیار کی جائیں گی۔

اگر میرے مسلمان بھائیوں کو میری باتیں معقول نظر نہیں آتیں تو وہ شوق سے انھیں مسترد کر سکتے ہیں عدم تشدد سے میری مراد وہ ہتھیار نہیں جو محض انگریز کے خلاف چلایا جا سکتا ہی بلکہ وہ اصول ہی جو ہمارے تمام داخلی مسائل کا حل پیش کر سکے گا۔ وہ حقیقی لحاظ سے زندہ اور محرک قوت ہے جو ہندو مسلم اتحاد کو زندہ حقیقت بنا کر دکھا دے گی۔ ایسا اتحاد جو مسولینی ہٹلر کے عہدنامہ کی طرح ڈر اور خوف پر مبنی نہیں۔ بلکہ محبت واخوت اور باہمی رواداری کی بنیادوں پر استوار ہوگا۔

پچھلے دنوں بہار کے بورڈ اسکولوں میں دعا کے وقت بندے ماترم گانے پر سخت جھگڑا ہوا تھا مسلمان طلبا نے اس گیت کے خلاف سخت احتجاج کیا اب متفقہ طور پر یہ سمجھوتا ہوا ہی کہ بندے ماترم کی بجائے اقبال کا مشہور و معروف ترانہ ۔ ’ہندوستان ہمارا‘ گایا جائے۔

امسال اگست میں بین الاقوامی یوتھ کانفرنس کا اجلاس نیویارک میں ہو رہا ہی۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن بھی اس مرتبہ طلبا کا ایک وفد شرکت کی غرض سے بھیج رہی ہی۔ مختلف صوبوں کی شاخوں سے مندوبین کے نام بھیجے جا چکے ہیں اور فیڈریشن کی مجلس عاملہ آخری انتخاب کے لئے غور و خوض کر رہی ہی علیگڑھ سے انصار ہروانی سکریٹری فیڈریشن کا نام تجویز کیا گیا ہی۔

۱۳۔ مئی کو ساتوں کانگرس صوبوں کے وزیر اعظم۔ ہندستانی تعلیمی سنگھ کے نمائندے اور واردھا تعلیمی کمیٹی کے افراد بمبئی میں ایک کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس کی صدارت

مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی نے فرمائی اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہر صوبہ کی طرف سے واردھا ٹرینگ اسکول میں تربیت پانے کے لئے اساتذہ بھیجے جائیں اور یہ اصحاب واپسی پر اپنے اپنے صوبوں میں اساتذہ کی تربیت کا کام سنبھالیں۔ یہ تعلیمی اسکیم سب سے پہلے دیہی حلقوں میں رائج کی جائے گی بالخصوص ان علاقوں میں جہاں پہلے سے کوئی اسکول نہیں ہے۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے وفد نے مختلف صوبوں کے وزیر اعظموں سے ملاقات کی اور اس امر کے دریافت کرنے کی کوشش کی کہ ان صوبوں میں ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ کے نصاب کو اسکولوں میں رواج دینے کی کہاں تک کوشش کی گئی ہے معلوم ہوا کہ سی پی میں ذاکر حسین رپورٹ کا تجویز کردہ نصاب خفیف تبدیلی کے بعد من وعن جاری کر دیا گیا ہے دوسرے صوبے بھی اس غرض کے لئے ٹرینگ اسکول کھولنے کا انتظام کر رہے ہیں۔

پچھلے دنوں پونا میں پروفیسر دھونڈو کیشپ کاروے کی اسیویں سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی گئی پروفیسر موصوف نے اپنی زندگی ہندوستان کے طبقۂ نسواں کی سماجی بہبودی اور تعلیمی ترقی کے لئے وقف کر دی ہے تعلیمی دنیا میں ان کا نام انڈین ومن یونیورسٹی کے قیام کی وجہ سے مشہور ہے یہ یونیورسٹی ہندوستان میں خواتین کے لئے پہلا ادارہ ہے جو حکومت کی امداد کے بغیر چلایا گیا اس میں ذریعۂ تعلیم شروع سے مادری زبان رہا ہے اور نصاب تعلیم میں مردانہ اسکول کی غلامانہ نقالی نہیں کی گئی بلکہ طبقۂ نسواں کی مخصوص ضروریات اور امور خانہ داری کی تعلیم کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے اس کے علاوہ پونا کا ہند و بیواؤں کا آشرم ہے جس کی بنیاد پروفیسر کاروے کے ہاتھوں پڑی اور ان کی مخلصانہ کوششوں سے یہ یہ نازک پودا اب بڑھ کر ایک عظیم الشان درخت ہو گیا۔ اس ادارے میں ہند و بیواؤں کو معلمی۔ دایہ گری وغیرہ جیسے مفید پیشوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔

پروفیسر کاروے ان چند عظیم العزم ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے باوجود ناقابل بیان مشکلات اور مصائب کے تعلیم حاصل کی اور اپنی زندگی کو ان مشکلات اور رکاوٹوں کے دور کرنے کے لئے وقف کر دیا ان مشکلات کا صحیح اندازہ ان کی اوائل عمر کے ایک چھوٹے سے واقعہ سے ہوسکتا ہے آپ نے سترہ سال کی عمر میں اپنے وطن سے ایک سو دس میل کا سفر پیدل طے کیا اور چار دن کی طویل مسافت کے بعد ستارا میں ایک سرکاری امتحان میں شامل ہوئے سفر کی تیسری رات انھوں نے تاروں کی چھاؤں میں ایک پتھریلی وادی میں گزاری جہاں درندے اور وحوش کی بھیانک آوازیں بھی ان کے ارادوں کو متزلزل نہ کرسکیں طرفہ یہ کہ ممتحن نے ان کو کم سنی کے عذر پر امتحان میں فیل کر دیا تاہم آپ نے ہمت نہ ہاری اور سرفروشانہ مجاہدے سے علم کے اعلیٰ درجات طے کر کے فائز المرام ہوئے۔

آپ ۱۸۹۲ء میں فرگوسن کالج پونا میں معلم ریاضی مقرر ہوئے اور ایک سال کے اندر دکن تعلیمی سوسائٹی کے لائف ممبر بن گئے۔ پروفیسر گوکھلے پہلے ہی سے اِس انجمن کے ممبر تھے اس انجمن کے ہر فرد کو بیس سال کی طویل مدت کے لئے تہتر (۷۳) روپے کے قلیل مشاہرے پر کام کرنا ہوتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے پورے بیس سال اس خدمت کو انجام دیا اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں اس سے سبکدوش ہوگئے۔ مگر آپ کے ایثار اور قربانی کی درخشاں مثال پونا کا بیوہ آشرم ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک انجمن کا قیام ۱۸۹۶ء میں عمل میں آیا۔ شروع میں روپیہ بالکل نہیں تھا تو پروفیسر کاروے نے اپنی زندگی بھر کی کمائی جو محض ایک ہزار روپیہ تھی آشرم کے لئے وقف کر دی اور گرمیوں کی تعطیلات کو اس مقصد کے پرچار اور چندے کی فراہمی کے لئے استعمال کرنے لگے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب ہنگن بدروک کو جہاں آشرم واقع ہے کوئی پختہ سڑک نہ جاتی تھی۔ پختہ سڑک کیا پگڈنڈی تک نہ تھی اور نہ آشرم کی اپنی گاڑی یا اور کوئی وسائل آمد و رفت تھے۔ پروفیسر موصوف دن بھر پونا شہر میں کالج کے کام میں مصروف رہتے تھے اور

شام کو چار میل پیدل چل کر رات کو آشرم میں سوتے اور صبح کو چھ بجے واپس پہنچ جاتے اس زمانہ میں کھانے پینے کا سامان اور ضروری اشیاء بازار سے سر پر اٹھا کر آشرم میں لے جانا ہوتی تھیں اور پروفیسر موصوف اکثر ان چیزوں کا گٹھر سر پر اٹھا کر سر شام آشرم میں پہنچ جاتے تھے آج یہ ادارہ ۱۵۰ ایکڑ کی کھلی جگہ میں واقع ہے اس میں ۳۰۰ طالبات ہیں ایک ہائی اسکول اور ایک ٹریننگ کالج ہے۔

پروفیسر موصوف مذہبی عقائد میں فراخدل واقع ہوئے ہیں وہ اوتاروں کے قائل نہیں ہیں اور نہ انھیں مسئلہ تناسخ پر کوئی گہرا یقین ہے۔ ان کے لئے زندگی کا اعلیٰ مقصد خدمت خلق ہے۔ مسئلہ تناسخ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر مسئلہ تناسخ کی کوئی حقیقت ہے تو میں یہی دعا مانگوں گا کہ خدا مجھے بار بار ہندوستان ہی میں پیدا کرتا رہے تاکہ میں اپنا کام جاری رکھ سکوں" آپ نے Man is Becoming کے عنوان سے اپنی سرگزشت حیات لکھی ہے جس میں انھوں نے مختلف تحریکوں اپنی تعلیمی سرگرمیوں، کل دنیا کے سفر اور مذہب و اخلاق پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

ہندوستان میں مسئلہ تعلیم بالغان ابھی تک سماجی کارکنوں کی توجہ کا محتاج ہے۔ ملک بھر میں انگلستان کی طرح کوئی مرکزی انجمن نہیں جو چھوٹے چھوٹے منتشر اور غیر منظم اداروں کو ایک سلسلہ میں منسلک کردے نہ تعلیمی محکموں کی طرف سے ابھی تک اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے کوئی خاص قدم اٹھایا گیا ہے۔ ان صوبوں میں جہاں کانگرس کی حکومت ہے وزرائے تعلیم کے دلوں میں تعلیم بالغان کی اہمیت کا ہلکا سا احساس موجود ہے۔ وزارت بمبئی نے برسر اقتدار آنے کے چند روز بعد ہی میزانیہ میں دس ہزار روپیہ کی رقم اس مقصد کے لئے منظور کردی۔ تجویز یہ ہے کہ تعلیمی رضاکاروں کو دعوت دی جائے کہ وہ صوبے کے مختلف حصوں میں حکومت کی امداد کے بغیر تعلیم بالغان کے مرکز قائم کردیں یہ مرکز ڈویژنل انسپکٹروں کی نگرانی میں ہوں گے اور انھیں منظور شدہ رقم سے زر امدادی ملا کرے گا۔ اب تک صوبہ بھر میں بہت سے ایسے مراکز قائم ہو چکے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ تعلیم بالغان کا یہ چھوٹا سا تجربہ

کامیاب رہے گا۔

سی۔پی میں (Local Boards) لوکل بورڈز کی طرف سے ۱۵۵ ادارے تعلیم بالغان کے لئے کھولے گئے ہیں جن میں پچاس دیہاتی حلقوں میں اور ۵ ناگپور میں ہیں۔ حکومت دیہاتی علاقوں کے مدارس کا پورا بار اور شہری مدارس کا نصف خرچ اٹھا رہی ہے۔

ہندوستانی ریاستوں میں میسور اور ٹراونکور تعلیم بالغان کے معاملے میں برطانوی ہند سے بھی پیش پیش ہیں ٹراونکور کے میزانیہ میں ۲۱,۳۰۰ روپے ابتدائی مدارس میں کتب خانے اور دارالمطالعہ قائم کرنے کے لئے منظور کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے فی الحال ساٹھ ابتدائی مدارس منتخب کئے گئے ہیں جن میں ہر ادارے کے لئے ایک سو روپے کا سامان کتب خانہ کے لئے وقف کیا گیا ہے اور ہر کتب خانہ میں دو سو کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔ ان کتب خانوں سے عام دیہاتی آبادی فائدہ اٹھا سکے گی۔

تعلیم بالغان کے سلسلے میں یونیورسٹی مراکز میں توسیعی خطبات دئے جاتے ہیں مگر ہندوستان میں بالعموم ان تقریروں سے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہی مستفید ہو سکتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ علم کے مرکز عام شہریوں کے لئے بھی کسی حد تک مشعل ہدایت ہو سکیں۔ اسی سال دہلی میں انجمن تعلیم بالغان ہندوستان کی بنیاد ڈالی گئی۔ اسی سلسلے میں مسز ویم۔ کن نیشنل ایڈلٹ اسکولز یونین انگلستان نے پچھلے موسم سرما میں ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر فرانک لابیک جنھوں نے جزائر فلپائنز میں بالغ ان پڑھوں کے لئے پڑھنا سکھانے کا نیا طریقہ ایجاد کیا۔ ہندوستانی زبانوں کی تدریس پر تحقیقات کر رہے ہیں گجرات میں ان کے طریق کے مطابق کتاب تیار کر لی گئی ہے۔

انگلستان میں ہندوستانی طلباء کی دوسری سالانہ کانفرنس۔ ہندوستانی طلباء کی انجمنوں کے فیڈریشن کا دوسرا سالانہ اجلاس مسٹر کاس سکر کی صدارت میں پچھلے اپریل میں منعقد ہوا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے مبارکبادی پیام میں ہندوستانی طلبا کو نصیحت کی ہے کہ وہ اپنے اندر فولادی قوت ارادی پیدا کریں تاکہ آیندہ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں ۔ آج دنیا ہنگامہ خیز زمانے سے گذر رہی ہے اور اس ابتلا میں وہی نوجوان مرد اور عورتیں تاریخ کو پلٹ سکتے ہیں جن کا تخیل بھلے ۔ جن کی نگاہ بلند اور جن کے دل و دماغ تربیت یافتہ ہیں ۔ آج ہندوستانیوں کو بہت اہم اور پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے اور ان مشکلات کو سلجھانے کی ذمہ داری نئی نسل پر عاید ہوتی ہے ۔
اس کے علاوہ وزرائے تعلیم مدراس ، سی پی ، بمبئی وغیرہ سے بھی پیغامات موصول ہوئے پروفیسر ہالڈین نے دنیائے جدید میں 'طالب علم کا فرض' کے موضوع پر خطبۂ افتتاحیہ پڑھا اور ان کے بعد لارڈ لوتھین اور مسٹر گرنفل ممبر پارلیمنٹ نے ہندوستان میں نئی اصلاحات کے عنوان پر تقریریں کیں ۔ طعام شب پر سفیر حبش اور چینی اور ہسپانوی سفارت خانوں کے نمائندے موجود تھے ۔ کانفرنس کے سلسلے میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ اس کا مالی بار طلبا نے خود اُٹھایا ۔ باہر سے محض دس پونڈ چندہ لیا گیا ۔

صوبہ بہار اور فوجی تربیت ۔ پچھلے دنوں بہار لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک تجویز منظور کی ہے جس میں حکومت سے سفارش کی ہے کہ بہار میں عساکر ملی کی تنظیم کا فوری بندوبست کیا جائے ۔ اور اس سلسلے میں ایک رضاکار فوج مرتب کی جائے جو فوری ضروریات کے لئے ریزرو کا کام دے سکے ۔ نیز مدارس اور کالجوں میں بھی فوجی تربیت کا انتظام کیا جائے اور صوبے میں فوجی تعلیم کی ترقی کے لئے ایک ملٹری اسکول قائم کیا جائے ۔ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے فوجی تربیت پر ایک مختصر سا رسالہ تیار کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گا ۔

پچھلے مہینے شانتی نکیتن میں ڈاکٹر ٹیگور کی سال گرہ منائی گئی ۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر ٹیگور نے خود کی ۔ انھوں نے کہا کہ انسان کو ایسے تہواروں کی اس لئے ضرورت ہے کہ وہ روزمرہ کے

مشاغل اور ایام کی بھول بھلیاں میں رازِ حیات کو نہ بھلادے ۔ اپنی علالت کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس بیماری کے دوران میں ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ موت زندگی کی نفی یا اختتام نہیں پھول پتیاں گرا کر پھل، اور پھل خشک ہو کر بیج اور بیج اک لہلہاتی ہوئی نئی زندگی کا پیام لاتا ہے۔ اس طرح روح مادی جسم کو چھوڑ کر اس عالمگیر زندگی میں مل جاتی ہے جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے ۔

عبادت کے بعد ادارے کے سب طلبار اُن آموں کے جھنڈ میں اکٹھے ہو گئے جو مدرسے کی چار دیواری میں واقع ہیں ۔ متبرک منتروں کے پڑھنے کے بعد شانتی نکیتن اور سری نکیتن کے طلبا نے شاعر کی خدمت میں تحائف پیش کئے جن میں اکثر مصوری کے اچھے نمونے اور دستکاری اور صناعی کی چیزیں تھیں ۔ آخر میں چینی پروفیسر، طلبا اور چینا بھون کے تبتی سادھو سب نے مل کر شاعر کے حق میں دعائے خیر مانگی ۔

مسٹر جیمز کلگ مین جنرل سکریٹری اولڈ اسٹوڈنٹ فیڈریشن اس موسم گرما میں ہندوستان کا دورہ کر رہے ہیں ۔ آپ نے لکھنؤ میں مقامی طلبار اور مسٹر سمپورنا نند وزیر تعلیم صوبجات متحدہ سے ملاقات کی ۔

ڈاکٹر سر اقبال کی وفات پر سر رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ تعزیتی پیغام بھیجا ہے "ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے جس کا گھاؤ مدت مدید میں کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کا رتبہ آج دنیا کی نگاہ میں اتنا کم مایہ ہے کہ ہم کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے جن کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی تھی "

پچھلے اپریل میں آل انڈیا ایجوکیشن بورڈ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی جی نے بھی شرکت کی ۔ جامعہ ملیہ سے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب

اور علی گڑھ سے خواجہ غلام السیدین تھے اس نشست میں واردھا اسکیم کے مدارس کے اساتذہ کے لئے ایک ہینڈ بک اور اساتذہ کی تربیت کے لئے مختصر کتابیں اور رسالے تیار کرنے کی تجاویز منظور ہوئیں۔ اساتذہ کی ہینڈ بک کا کام سیدین صاحب کو تفویض کیا گیا ہے۔

انگلستان اور نوآبادیات میں ہر جگہ محکمہ تعلیم کے قواعد کی رو سے ہر امدادی اسکول کو حکومت کے منظور شدہ گریڈ اور تنخواہیں دینا ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں اگرچہ دفتری لحاظ سے بعض صوبوں میں ایسے قوانین ہیں مگر عملاً ہر امدادی اسکول کا استاد انتظامیہ کمیٹی یا منیجر کی سیماب صفت طبیعت کے رحم پر ہوتا ہے مسٹر کھیر نے ایک حد تک ارباب اختیار کی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ نتیجہ غیر معلوم۔

مکتبہ جامعہ کی ایک نئی شاخ

ہم کتاب نما کے ذریعہ پہلے اعلان کر چکے ہیں کہ انشاءاللہ مکتبہ جامعہ کی ایک شاخ لکھنؤ میں بھی قائم کی جائے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہمارا یہ ارادہ عملی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اور جس طرح ہم نے دہلی میں شہر والوں کی سہولت کے لئے شاخ کھولی اور لاہور میں اہلِ پنجاب کی آسانی کی خاطر ایک مستقل انتظام کیا اسی طرح صوبجات متحدہ کے پایۂ تخت لکھنؤ کے لئے بھی ایک مستقل شاخ کے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ یہ شاخ ۱۵ ر جولائی سے کھل جائے گی لیکن اس کا باقاعدہ افتتاح یکم اگست سے ہوگا۔ امید ہے کہ اودھ اور خصوصاً لکھنؤ کے ارباب ذوق اس سے فائدہ اٹھا کر ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اُردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم

دہلی

زیر ادارت شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے۔ اِس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے اگر آپ کو اس مقصدِ عظیم سے ہمدردی ہے تو کلیم کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے۔ عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے (دستی)، ششماہی تین روپے آٹھ آنے (دستی)

نمونے کے پرچے کے لئے ۸ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

منیجر "کلیم" ۱۰ہم چاندنی نواس دریا گنج دہلی

دی

اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

مرتبہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)

جس قدر انگلش اُردو ڈکشنریاں ابتک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ چند ایک خصوصیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) یہ مکمل جدید ترین لغت ہے۔ انگریزی زبان میں ابتک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں۔

(۲) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تمام تعلق علوم و فنون کی اصلاحات سے ہے۔ اس طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں شامل ہوتے ہیں۔

(۳) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کیلئے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دیدیا گیا ہے۔

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور انکے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا انکی وضاحت کیلئے مثالیں دیکر کی گئی ہے

(۵) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لئے ایسا اُردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کرسکے اور اس غرض کے لئے تمام اُردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصلاحات کی پوری چھان بین کی گئی ہے، یہ بات دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی۔

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اُردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں جو اُردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں۔

(۷) اس لغت کے لئے کاغذ خاص طور پر تیار کرایا گیا تھا جو بائیبل پیپر کے نام سے موسوم ہے، طباعت کیلئے انگریزی اُردو ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں۔ جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے۔

(ڈمائی سائز صفحات ۱۵۱۴ + ۲۴) قیمت سولہ روپے کلدار (ع۱۶) دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)



سب رس

کا

اقبال نمبر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

مشہور شعرا کی بلند پایہ نظمیں۔ اقبال کی نایاب تصاویر۔ اقبال کے کلام اور حیات کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز مضامین عالمی شہرت رکھنے والے اصحاب کے پیامات۔ اقبال کے خطوط کا عکس "حیدرآباد اور اقبال" سے متعلق معلومات آفریں اقتباسات

سب رس کے محرم نمبر نے تمام ہندوستان میں مقبولیت حاصل کی۔ اقبال نمبر بھی شاعر مشرق کے شایانِ شان شائع کیا گیا ہے۔ اقبال کے ہر پرستار کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ اس نمبر کا مطالعہ کرے اور اس کے حیات افروز پیام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دے۔

سالانہ خریداروں کو بلا قیمت دیا جائے گا

ماہنامہ سب رس کا سالانہ چندہ
للعہ

بچوں کے سب رس کا سالانہ چندہ
عصہ

پتہ

خواجہ حمید الدین شاہد
مہتمم سب رس رفعت منزل
خیریت آباد حیدرآباد دکن

رسالہ "زمانہ" کانپور

اُردو کا بہترین ماہوار رسالہ

جو

منشی دیا نراین نگم کی ایڈیٹری میں

سنہ ۱۹۰۳ء سے اب تک ہندستانی ادب کی مسلسل خدمت کر رہا ہے

قیمت سالانہ پانچ روپیہ　　　　　فی پرچہ سات آنہ

زمانہ کسی قوم، فرقہ یا مذہب کا طرفدار نہیں ہے، اس کو ملک کی بہبودی، مذاق سلیم کی ترقی، خیالات کی اصلاح اور معلومات کی توسیع مدنظر ہے۔

زمانہ کو ہندوستان کے مشہور و معروف انشا پردازوں، نامی گرامی مصنفوں، اور ملکی پیشواؤں کی علمی امداد حاصل ہے۔

زمانہ کے ہر نمبر میں مختلف مباحث پر مفید و قابل دید مضامین خاص قابلیت اور مسلمہ شہرت یافتہ اصحاب کے لکھے ہوئے شائع ہوتے ہیں۔

زمانہ کو فن تنقید میں ایک خاص شہرت و اعتبار حاصل ہے اس میں اردو کتابوں پر باقاعدہ ریویو شائع ہوتے ہیں۔

زمانہ میں وقتاً فوقتاً تاریخی مناظر اور فن مصوری کے نمونے اور مشاہیر ملک کی ہاف ٹون تصویریں اور سوانحی حالات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

منیجر "زمانہ" کانپور

مئی ۳۸ء کی مطبوعات جامعہ

خدا کا شکر ہے کہ مکتبہ جامعہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اور اس کی مطبوعات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مکتبہ جامعہ ہر سال اپنا پروگرام تیار کر کے اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی اس نے اپنا پروگرام مرتب کر لیا ہے جس میں سے ہم یہاں صرف ان کتابوں کے نام درج کرتے ہیں جو مئی ۳۸ء میں شائع ہوئی ہیں۔

بنی اسرائیل کا چاند	عبدالمجید حیرت بی اے (علیگ)	ناول	عـ ر
بیوہ	منشی پریم چند	"	عہ ر
حیات جامی (نقش ثانی)	مولانا اسلم جیراجپوری	تذکرہ	۸ر
ضرب الامثال	خواجہ عبدالمجید دہلوی	ادب	۸ر
دلی کی دو سو برس کی تاریخ	سید حسن برنی	مقالہ اردو اکادمی	۵ر
چنبیلی	مولوی حسین حسان	بچوں کیلئے کہانی	۲ر
عقاب	رقیہ ریحانہ	" "	۴ر
شہزادی گلنار (نقش ثانی)	پروفیسر عطاء اللہ	" "	۴ر
نیت کا پھل	مرزا مظفر حسن بیگ سیفی	"	۲ر

مکتبہ جامعہ دہلی

سلسلہ منتخباتِ نظم اُردو

۱- معارف ملت ۲- جذبات فطرت ۳- مناظر قدرت

مرتبہ

پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے ۔ ال ال بی (علیگ)

وہ حضرات جنھوں نے اردو شاعری کی ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی داستان سمجھ رکھی ہے اس سلسلہ انتخاب کو ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل نظموں پر وہ سر دھنتے ہیں ان کی ہم پلہ نظمیں خود ان کی زبان میں موجود ہیں شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے۔

معارف ملت (چار حصے)

جلد اول - حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں قیمت عمر

جلد دوم - مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل کی تصویریں۔ قیمت عہ

جلد سوم - ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق شعراء کا دلپذیر کلام قیمت عمر

جلد چہارم - اخلاق و حکمت کے انمول موتی۔ قیمت عمر

جذبات فطرت (چار حصے)

جلد اول - میر و سودا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد دوم - غالب، ذوق، ظفر اور حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد سوم - تقریباً تیس قدیم، مستند اور باکمال شعراء کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد چہارم - تقریباً ساٹھ جدید شعراء کے کلام کا دلکش انتخاب قیمت عمر

مناظر قدرت (چار حصے)

جلد اول - متعلق اوقات یعنی صبح شام، دن رات برسات اور بہار کے دلکش مناظر۔ قیمت صر

جلد دوم - متعلق مقامات یعنی آسمان زمین پہاڑ جنگل اور عمارات کی صاف ستھری تصویریں قیمت عمر

جلد سوم - متعلق نباتات و حیوانات یعنی پھول پھل کیڑے پتنگے اور چرندوں پرندوں کا مطالعہ و مشاہدہ۔ قیمت عہ

جلد چہارم - متعلق عمرانیات یعنی ہندوستان کا تمدن، رسم و رواج وغیرہ، تیوہار اور میلے ٹھیلوں کے دلچسپ حالات۔ قیمت عہ

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہو گئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون کریں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت :- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۹ | جون سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱ -	ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم	جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)	۵۲۳
۲ -	اقبالؒ کی لوحِ تربت	جناب کریم الرضا خانصاحب ایم ایل سی	۵۳۴
۳ -	حکیم ٹالسٹائی کے اعترافات		۵۳۶
۴ -	جگر پارے	حضرت جگر مرادآبادی	۵۶۴
۵ -	اسلامی نظام	جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۵۶۶
۶ -	روزِ جزا (ڈراما)	جناب سید نصیر احمد صاحب جامعی لاہور	۵۷۱
۷ -	غزل	حضرت جگر مرادآبادی	۵۹۱
۸ -	ہندوستانی کاشتکار کی مالی ضروریات	جناب احسن صاحب ایم اے	۵۹۲
۹ -	ماتمِ اقبال	جناب یحییٰ اعظمی	۵۹۸
۱۰ -	قطعۂ تاریخ وفات ڈاکٹر اقبالؒ	مدیر	۶۰۵
۱۱ -	تنقید و تبصرہ	-	۶۰۶
۱۲ -	رفتار عالم (ممالک غیر)	م - م	۶۱۰

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم

دن ڈوبے اور اندھیرا چھا جائے تو سب اپنے گھروں میں روشنی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو تاریکی کی زحمتوں سے بچاتے ہیں جب کسی کی زندگی کا دن ڈوبتا ہے تو رسم ہے کہ جس کسی کا مرنے والے سے تعلق ہو وہ محبت اور ذکرِ خیر کا دیا جلا کر غم کا اندھیرا دور کرے اور زندگی کا اعتبار قائم کرے لیکن بعض برگزیدہ مرنے والے ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے غم اور کسی کے یاد کرنے کا سہارا نہیں چاہتے، جنہیں یقین ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک طرف شام ہو تو دوسری طرف دن کی رونق پھیلی ہوتی ہے اور زندگی کا کاروبار جاری ہوتا ہے، اور وہ ایک میدانِ عمل سے دوسرے کو اس اطمینان سے جاتے ہیں جیسے کوئی ایک کام ختم کر کے دوسری جگہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی آخری سانس میں فرمایا تھا کہ مسلمان کی نشانی یہ ہے کہ موت آئے تو اسے مسکراتا دیکھے، اور موت نے ان کے ایمان کو اتنا ہی پختہ پایا جتنا کہ زندگی نے۔ ہم موت سے ڈرنے اور بھاگنے والے بھلا ماتم کا اتنا سلیقہ کہاں سے لائیں گے کہ ایسے مرنے والے کا حق ادا کر سکیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے عمر بھر ہمیں جینے کے گُر سکھائے اور ان کے دن پورے ہو گئے تو مرنے کا ایک طریقہ بھی بتا گئے کہ ہزار زندگی سے بہتر ہے۔ خدا کرے جینے کی یہ مثال زندہ رہے اور مرنے کی یہ مثال!

ڈاکٹر اقبال کے رخصت ہو جانے سے شعر و شاعری اور فلسفے، بلکہ ملی زندگی کی محفل ایسی اُجڑ گئی ہے کہ ہم اپنی قسمت کو جتنا بھی روتے اور مرحوم کا جتنا بھی ماتم کرتے کم ہوتا، اگر آنسو بہانے میں خطرہ نہ ہوتا کہ اپنی شخصیت اور کلام کی یادگار وہ شمعِ ہدایت جو مرحوم چھوڑ گئے ہیں بجھ جائے گی۔ ہمارا غم چاہے جتنا شدید ہو، یہ شمع ہمارے سامنے جل رہی ہے، اور ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ اس کی بصیرت افروز روشنی آہستہ آہستہ پروانوں اور آدمیوں کو اپنے گرد جمع کر لیگی، محفل میں رونق، آب و تاب اور ہنگامہ پیدا کر دیگی، اور کیا تعجب ہے کہ مرحوم کی آواز ہمارے کانوں میں گونجنے لگے، ہم ایک دوسرے کے دلوں میں اور آنکھوں میں ان کی شخصیت کے نقش دیکھیں اور ان سے ایک تعلق پیدا کریں جو جسمانی رشتوں

سے زیادہ نازک مگر کہیں زیادہ لطیف اور پائدار ہو، جو ہمیں اُمید اور مرحوم کی رُوح کو کامیابی کا مژدہ سنا رہا ہو۔

دراصل اس وقت جب محبت اور عقیدت، جوش پر ہیں اور مرحوم کی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہی ہے ہمیں چاہیے کہ ان کی صورت اور شخصیت کا ایک ایسا خاکہ بنا کر محفوظ کرلیں جسے برسوں بعد دیکھنے پر بھی ہم پہچان سکیں اور یہ بھی مان لے کہ اس کا ہر نقش اصل سے ملتا ہے۔ یہ کام محبت اور عقیدت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا لیکن اس کے لیے محبت اور عقیدت ہی کافی نہیں ہیں محبت اپنی ہی آنکھ سے دیکھتی ہے، دوسرے کے نقطۂ نظر کی پروا نہیں کرتی اور عقیدت کو ہیرے پہنانے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ وہ اکثر آدمی کی صورت ہی چھپا دیتی ہے۔ اسی طرح تعریف اگر دو چار خصوصیتوں کو ابھارتی ہے تو بہتیری مٹا بھی دیتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شخصیت کا صحیح خاکہ بنانے کے لیے تنقید کا ضبط بھی درکار ہے۔ کیونکہ اس وقت اگر عقیدت اور تعریف صورت گری کی ہر مشکل آسان کرسکتی ہیں تو آگے چل کر یہی آرائیں ہزار مشکلیں بھی پیدا کر دیں گی۔

میں نے تنقید اور اس کے ضبط کا ذکر اس وجہ سے کیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شخصیت عام معیار پر جانچی نہیں جاسکتی، اور اپنے کلام میں اُنھوں نے پُرانی ادبی رسموں کو اس طرح توڑا ہے کہ ادیب کبھی نہ کبھی اس کا بدلہ ضرور لینگے۔ یورپ میں اٹھارویں صدی اور ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلنے کے بعد سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ناک اور کان کی طرح مذہب بھی ہر شخص کی اپنی چیز ہے، اس کو دوسروں سے مطلب ہونا چاہیے نہ دوسروں کو اس سے۔ یوں اگر ایک طرف رواداری کچھ بڑھ گئی ہے تو دوسری طرف مذہب زندگی اور ادب سے بے دخل کر دیا گیا ہے جذبۂ دینی کی قدر کرنے والے اب بھی ملتے ہیں لیکن کسی ایک مذہب کی پابندی کو وہ بھی کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے۔ اب اگر ادیب عقیدے رکھتے ہیں تو انہیں بیان کرتے شرماتے ہیں، علم کے دعوے سے یا آزاد خیالی کے بہانے سے جو جی چاہے کہیے لیکن دنیا کو دین کے پیمانے سے ناپیے، اپنے دین اور دینی آئین سے محبت اور عقیدت ظاہر کیجیے تو مہذب لوگوں میں آبرو جاتی رہتی ہے اور تعصب و تنگ نظری کا داغ پیشانی پر لگ جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بھی انگریزی تعلیم کے ساتھ یہ ذہنیت پھیلی اور شاید بہت زیادہ پھیلتی اگر مولوی نذیر احمد،

حالی اور اکبر جیسے ادیب اس کا توڑ نہ کرتے۔ اقبال مرحوم ان بزرگوں سے بھی آگے بڑھ گئے، انہوں نے ادب کو دین کی پرچھائیں بنا دیا، جذبے کی رنگین پوشاک اٹھا کر عقیدے کو پہنا دی، اور اُسے ایسا حسین بنا دیا کہ جذبے کو بھی رشک آجائے۔

پھر کیا تعجب ہے اگر آگے چل کر ادیب اور شاعر چاہیں کہ اقبال مرحوم کی یادگاروں کو چُپ چُپاتے ادب سے نکال کر دینیات میں شامل کر دیں، ان کی بزرگی تسلیم کریں لیکن اپنی محفل اپنے ہی لیے رکھیں، دینداری کے تقدس کو اقبال کی نذر کریں، جذبات کی دنیا اور اس کی ہنگامہ آرائیوں کو اپنی جائداد سمجھ کر اس پر قبضہ کرلیں۔ اقبال کو اس انجام سے محبت اور تعریف نہیں بچا سکتی بلکہ وہ سچی تنقید جو دین سے قوت اور خود اعتمادی حاصل کرے، ادب سے طاقت بیان لے اور حق پرستی کی مضراب سے دل کے تار چھیڑتی رہے۔

غور کیجیے تو واعظ اور شاعر دونوں اسی ایک انسانیت کے خادم اور بہی خواہ ہیں لیکن ان کے راستے الگ ہیں اور ان کے درمیان غلط فہمی اور جھگڑے کی گنجائش بہت ہے واعظ انسان کو تسلی اور بقا کا وعدہ کرکے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ شاعر اسے آزادی اور شگفتگی کا لالچ دلاتا ہے، واعظ شاعر پر بے اصولی اور ناعاقبت اندیش ہونے کا الزام لگاتا ہے، شاعر واعظ پر خدا کے نام سے منطق کو چوپڑ اور عاقبت اندیشی کے بہانے سے تنگ دلی اور کٹرپن پھیلانے کا۔ تنقید کو چاہیے تھا کہ ان کی عداوتوں اور شکایتوں کو دور کرتی اور ان میں میل کراتی رہے، اور یہ ثابت کرکے کہ وہ انسانیت کے ایک دل کے دو قدرتی پہلو ہیں اور ایک کا مقصد دوسرے کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا ایک کو دوسرے کے اوصاف کی قدر کرنا سکھاتی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں ہے اور اس لیے تنقید کی جو کسوٹی عام طور سے استعمال ہوتی ہے اس سے ڈاکٹر اقبال کے سے مکمل ذہن اور ہمہ گیر دل کے اوصاف پرکھے نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر اقبال کا کلام ایمان کی لازوال قوتوں کا ایک مظہر ہے، انہوں نے تخیل کو عقیدے کا، آرزو کو دین کا پابند کیا، انسانی شخصیت کے ہزاروں جُدا جُدا رنگ نہیں دکھائے بلکہ اُسے مذہب ملت، آدمیت کے ایک خاص رنگ میں ڈبو دیا، اور ان کا کمال یہ ہے کہ اس ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہونے پر بھی ان کے کلام میں وہ سارا

جادو ہے جو کسی سرمست عاشق کی غزلوں میں ہو سکتا ہے ان کے تخیل نے جذبۂ دینی کی روشنی میں بلند پروازی کی مشق کی تھی۔ مذہب، تہذیب، تاریخ، سیاست کی حقیقتیں ان کے دل سے لطیف اور موثر شخصی کیفیتیں بن کر نکلتی تھیں۔ ان کے لیے حسن وہی تھا جس میں کامل شخصیت کا جلوہ نظر آئے، عشق وہی جو اس کامل شخصیت کا تصور دل میں بٹھا دے، نغمہ وہی جو شعلے کی طرح لگن کی آگ دلوں میں لگاتا پھرے۔ ان کی مستی میں مصلح کی ہشیاری تھی، ان کی نصیحت میں جذبات کی گرہ کھُلنے کا مزہ ان کا کلام عشق اور علم کی دو آنکھوں کا ایک نور تھا، ادیب اور آرٹسٹ کی حیثیت سے ان کی شخصیت مکمل تھی، وہ مختلف صلاحیتیں جن کو ہم ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں ان کی طبیعت میں اس طرح آکر مل گئی تھیں جیسے چشمے کی روانی اور چٹان کا سکوت، پارات کا اندھیرا اور تاروں کی جگمگاہٹ یعنی تنقید اگر ان کا حق ادا کرنا چاہتی ہے تو اسے ان کا کلام کو جانچنا ہی نہ چاہیے بلکہ یہ بھی دکھانا چاہیے کہ وہ مکمل ہے اور اس لیے آئندہ کے واسطے ایک معیار ہے۔

ڈاکٹر اقبال کا کلام تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن میں سے پہلا وہ ہے جس میں اُنہوں نے پُرانے مذاق کی تقلید کے ساتھ ایک نئی وضع کی بنیاد بھی رکھی، دوسرے حصے میں ان کی اصل طبیعت اور مذاق کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں، اور تیسرے میں ان کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ ان تینوں حصوں کی حد بندی نہیں کی جا سکتی، شروع کے کلام میں ہم کو بعض رجحانات ملتے ہیں جو آخر تک رہے، اور بعد کو خصوصیات ملتی ہیں جن کا قیاس شروع کا کلام پڑھ کر نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلا دور مشق کا تھا جب ان کا تخیل پر تول رہا تھا، زبان صاف ہو رہی تھی اور وہ مختلف میدانوں میں طبع آزمائی کر رہے تھے یہی زمانہ ہے جب ہندوستان کی حالت دیکھ کر شاعر کے دل میں درد اُٹھا، جب "ترانۂ ہندی" لکھا گیا اور برہمن کو دیس کے دوسرے بسنے والوں کے ساتھ مل کر ایک نیا شوالہ بنانے کی دعوت دی گئی۔ "تصویر درد" اس دور کی سب سے موثر نظم ہے، اور اس میں پہلی بار وہ تڑپ نظر آتی ہے جو بعد کو "شکوہ" میں شباب پر آئی اور جس نے ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو تڑپا دیا لیکن ادبی نقطۂ نظر سے شاید اس دور

کی بہترین نظمیں "حقیقت حسن" اور "اختر صبح" ہیں نظم کا یہ طرز تخیل کی یہ نازک گلکاریاں اقبال کا خاص حصّہ تھیں، اور اس وقت بھی جب ان کا دل و دماغ مذہب اور فلسفہ میں ڈوبا ہوا تھا، ان کا تخیل اکثر اس طرز کے کرشمے دکھاتا رہا۔

اقبال کے کلام کا دوسرا دور ان کے جذبہ دینی کی بیداری سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ تعلیم کے سلسلہ میں یورپ گئے اور تاریخ اور فلسفے کے مطالعے اور دنیا کے مشاہدے نے ان کو شخصی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کے وہ طریقے بتائے جنہیں معلوم کرنے کی انہیں پہلے آرزو تو تھی مگر شاید اتنی شدید نہ تھی کہ اپنا مطلب حاصل کرلے۔ اسی زمانہ میں ان کے سیاسی خیالات بھی بدلے، قومیت کی چارہ سازی کے ساتھ انہوں نے اس کی ستم شعاری بھی دیکھی، اور اس کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے اس سے بالکل مُنہ پھیر لیا۔ تاریخ کے مطالعہ نے ملت اسلامی کی عظمت کا جو نقشہ ان کے سامنے پیش کیا اُس نے اس محبت کو دوبالا کردیا جو انہیں قدرتی طور پر اسلام اور مسلمانوں سے تھی، اور اسلامی دنیا کی پستی اور بیچارگی دیکھ کر ان کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ وہ اپنے درد کی شکایت بارگاہِ الٰہی تک پہنچائے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ "شکوہ" اور اس کا جواب "شمع اور شاعر"، "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" ان کی اُس وقت کی بےچینی کا عکس ہیں، مگر اپنے دین کو انہوں نے ایسا مضبوط پکڑ لیا تھا کہ ان کا درد اپنی دوا بھی کرتا رہا، اندھیرے میں انہیں نور کی دو چار کرنیں منزل مقصود کا رستہ دکھاتی رہیں۔ شخصیت کی تعمیر کا وہ فلسفہ جو "مثنوی اسرار و رموز" میں پیش کیا گیا اس وقت تک ان کے ذہن اور تخیل کو گرویدہ نہ کرسکا تھا، مگر اس کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی یعنی اس دور میں اقبال کا جذبۂ دینی چڑھاؤ پر تھا، موجیں مار رہا تھا، لیکن ابھی اُس نے وہ شکل نہیں پائی تھی جس کے بغیر وہ ہدایت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دوسرے دور میں بھی اگرچہ ایک نظم "وطنیت" میں اقبال نے قومیت سے قطع تعلق کا اعلان کردیا تھا اور اپنے کلام کو اسلام کے رنگ میں رنگ رہے تھے، ان کی خصوصیت ان کا یہ رجحان نہیں تھا بلکہ وہ خوبیاں جو "ستارہ"، "شاعر" جیسی نظموں میں نظر آتی ہیں

جیسے جیسے اقبال کا ذہن خودی اور بیخودی کے فلسفے میں ڈوبتا گیا اقبال کو ایک نئی زبان کی ضرورت محسوس ہوتی گئی اور آخرکار انہوں نے فارسی میں لکھنا شروع کردیا۔ اردو کا ان پر بے شک اور تمام زبانوں سے زیادہ

حق تھا لیکن فارسی میں ایک تو یہ آسانی تھی کہ وہ اسلامی تصوف کی زبان ہے اور اس لیے ان خیالات کو بیان کرنے کے لیے خاص طور پر موزوں تھی جنہیں ڈاکٹر اقبال پیش کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ افغانستان، ترکستان، ایران اور ترکی کے مسلمان بھی مخاطب کیے جا سکتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ فارسی میں لکھنے کی بدولت ڈاکٹر اقبال اور اُن کے فلسفے کا اسلامی دنیا میں بڑا چرچا ہو گیا اور ہندستان میں ان کی قدر کرنے والے کم نہیں ہوئے۔ ہندستانی مسلمان ان سے فارسی زبان اختیار کرنے کی شکایت نہیں کر سکتے، اس لیے کہ فارسی جاننا ان کا ایک تہذیبی فرض ہے۔ باقی ہندوستانی جو اُردو کو چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑنا چاہتے ہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

فارسی میں ڈاکٹر اقبال نے "مثنوی اسرار و رموز"، "پیام مشرق"، "زبور عجم"، "جاوید نامہ" اور بالکل آخر میں نظموں کا چھوٹا سا مجموعہ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" لکھا۔ بیچ میں اُردو نظموں کے دو اور مجموعے "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" شائع ہوئے۔

"مثنوی اسرار و رموز" میں ڈاکٹر اقبال نے شخصیت کی تعمیر کے تمام گُر بتائے ہیں اور حکایتوں اور مکالموں اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسان کا دل جس فلاح اور نجات کا آرزومند ہے وہ صرف جسمانی اور روحانی قوت سے حاصل ہو سکتی ہے، اور اپنے اندر یہ قوت پیدا کرنا خودی ہے لیکن انسان کامل اُسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ خودی سے بھی گزر کر انسانیت کے اعلیٰ اخلاقی مقاصد میں اپنی ذات اور اپنے ارادے کو کھپا دے، اپنی خودی کو بیخودی میں ڈبو دے اور اسی کو اپنا کمال، اپنی نجات اور اپنے وجود کا اصل مقصد جانے۔ خودی کے لیے شخصی ارادے کی ضرورت ہے۔ بیخودی کے لیے ایسی ملت، ایسے اخلاقی مقاصد اور ایسا دین چاہیے جو افراد میں خودی کا حوصلہ پیدا کرے اور ایک بڑا میدان فراہم کرے کہ اس میں وہ اپنی صلاحیتیں استعمال کر کے بیخودی کا جام پئیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام خودی اور بیخودی کی اس تعلیم کا دوسرا نام ہے، اور ملتِ اسلامی کی بڑی شخصیتوں نے جو مرتبہ حاصل کیا اور انسانیت کی جو خدمت کی اس کا راز بھی یہی ہے۔ اس تعلیم میں اقبال کا حصہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے مذہب، تصوف اور تاریخ سے رس کی طرح نکال کر ایک رنگین اور مدبھری شراب بنا دیا کہ اسے دیکھتے ہی چکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے اور جس نے ایک بار بھی پیالہ منہ

سے لگالیا وہ پھر اُسے مست ہو کر ہی چھوڑتا ہے۔

"مثنوی اسرار و رموز" میں علم، اخلاق اور دین کے مسئلے بیان کیے گئے ہیں، لیکن ایسے شاعرانہ انداز، ایسی محبت اور ایسے درد کے ساتھ کہ پڑھنے والا خیالات کی گہرائی دیکھ کر جھجکتا نہیں بلکہ اس میں شوق سے غوطے لگاتا ہے۔ "پیام مشرق" سراسر شاعری ہے، اور اس میں اقبال نے خودی کی تعلیم کو پس منظر بنا کر نظمیں لکھی ہیں، مختلف مسئلوں پر بحث کی ہے اور مستانہ غزلیں گائی ہیں۔ یہ کتاب جرمن حکیم گوئٹے کے ایک دیوان کے جواب میں لکھی گئی۔ اور انسانی فطرت اور تقدیر کے ایک بڑے رازداں کے سامنے مشرق کے علم اور عشق کا خزانہ کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ تمہید میں اقبال نے قسمت کی شکایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ گوئٹے چمن میں پیدا ہوا اور چمن میں اُس نے پرورش پائی، اور میں ایک مردہ زمین کا پودا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایشیا کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے، اور اس کی دو چار نظمیں ایسی ہیں کہ جن کا دنیا کے کسی ادب میں جواب نہ ملیگا۔

"زبور عجم" میں ڈاکٹر اقبال نے غزل سرائی کا سلسلہ جاری رکھا، مگر اس کے آخر میں تصوف کے چند مسائل بیان کیے ہیں اور ایک "بندگی نامہ" میں غلاموں کے فنون لطیفہ اور مذہب کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ اس مجموعے کی زبان پختہ اور منجھی ہوئی ہے، بعض نظمیں بے مثل ہیں، لیکن مضامین کی وہ رنگا رنگی نہیں جو "پیام مشرق" میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اقبال نے اپنی نظر دوسری طرف ڈالی، ابن عربی کی طرح آسمان کی سیر کر آئے جس کا سارا حال "جاوید نامہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی موضوع اور تعلیم کے لحاظ سے بہت ہی بصیرت افروز ہے اور اقبال کے سیاسی خیالات پر نئی روشنی ڈالتی ہے۔

"بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کی "بانگ درا" کے مقابلے میں قریب قریب وہی حیثیت ہے جو پیام مشرق کے مقابلہ میں "زبور عجم" کی، فرق یہ ہے کہ "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں سیاسی اور معاشرتی مسئلوں پر زیادہ بحث کی گئی ہے، اور کئی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری اور ملوکیت کو مٹانے کی خواہش اور کسان اور مزدور کو ظلم سے بچانے کی تمنا میں اقبال اپنے زمانے کے جوشیلے نوجوانوں سے بھی دس قدم آگے تھے، لیکن ان کی انقلاب پسندی اپنے دین کی تعلیم اور دیس والوں کی محبت کا نتیجہ تھی،

کتاب کی پیدا کی ہوئی یا غیروں کی سکھائی ہوئی نہ تھی۔

ڈاکٹر اقبال کے مطالعے اور علمی ذوق کی یادگار ان کی انگریزی کی ایک تصنیف

"The Reconstruction of Religious Thought in Islam."

ہے۔ اس میں اقبال نے تمہید کے طور پر ثابت کیا ہے کہ عقیدہ جسے موجودہ زمانے کے فلسفے نے اپنی بحث سے خارج کر دیا ہے، علم کا نتیجہ ہے، مگر یہ علم اس طرح سے حاصل نہیں ہوتا جیسے کہ تاریخ یا کیمیا، بلکہ دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو تو خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس طرح سے حاصل کیے ہوئے علم کو فلسفیانہ معیار پر جانچ سکتے ہیں، اور اگر علم کو اس وقت مذہب سے تعصب نہ ہوتا تو وہ عقیدوں کی بیخ کنی کے بجائے ان کو ثابت اور مضبوط کرنا اپنا فرض سمجھتا۔ پھر ڈاکٹر اقبال نے خدا کے تصور کی تشریح کی ہے، عبادت کا مقصد واضح کیا ہے اور انسان، اس کی بقا اور اخلاقی آزادی کے معنی بتائے ہیں۔ آخری دو بابوں میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور اس کے اندر ارتقا کا جو مادّہ اور ترقی کے جو میلانات تھے وہ ظاہر کیے گئے ہیں۔ اگر اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہو جائے اور مسلمان اس کا عام طور پر مطالعہ کرنے لگیں تو ناواقفیت اور جہالت نے ایک طرف اور اوچھے علم کے گھمنڈ نے دوسری طرف جو غبار اُڑایا ہے وہ چھنٹ جائیگا، اور مسلمان جو اب یا تو مغربی علم سے مرعوب ہیں یا اپنی قدیم تہذیب کی بے جانے بوجھے تعریف کرتے ہیں اپنی تاریخ کو سمجھینگے، اس کی سچّی قدر کر سکینگے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق آئندہ اسلام اور انسانیت کی بہت بہتر خدمت کر سکینگے۔

ڈاکٹر اقبال کا اپنی شاعری کو غزلوں، ترجموں اور قومی نظموں سے شروع کرنا اور آخر میں اسلام کا دل و دماغ بن جانا قدرتی نشو و نما کا ایک سلسلہ تھا۔ ان کی طبیعت یا خیالات نے کسی اتفاقی واقعہ سے اثر لے کر کوئی پلٹا نہیں کھایا، ان کے جذبات اتنے گہرے اور سچّے تھے کہ زندگی کا کوئی طوفان ان میں تلاطم پیدا نہ کر سکا۔ نئی معاشرت اور نئی سیاست کے وہ شیدائی جو اس پر افسوس کرتے ہیں کہ اقبال مرحوم نے قوم کو چھوڑ کر ملت کو مخاطب کیا، شاعر کی بے قید انسانیت سے منہ موڑ کر مومن اور مسلم کے گُن گانے

لگے شاید اتنا اعتراض نہ کرتے اگر اقبال نے نظم کی جگہ نثر میں اپنے خیالات پیش کیے ہوتے۔ ان لوگوں کا اور ان کے ساتھ شعروشاعری سے اکثر ذوق رکھنے والوں کا عام طور پر یہ کہنا ہے کہ نثر کا میدان اپنا اپنا ہو سکتا ہے، اس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی جن خیالات کا چاہیں پرچار کریں، نظم میں سب کو بھائی بھائی بن کر ان تمام خصوصیات کو بھلا دینا چاہیے جو ان کا اختلاف ظاہر کرتی ہیں اور انسان کی ان کیفیتوں کو موضوع بنانا چاہیے جو مزاج اور حس، آنکھ اور دل، دکھ اور سکھ کی طرح انسانیت کی عام صفت ہوں۔

نظم کی اس حیثیت پر زور وہ لوگ بھی دیتے ہیں جنہیں قوم کا درد ہے اور جو دینی اختلافات اور آئے دن کے جھگڑوں سے بیزار ہیں، اور اردو شاعری کے عام رجحان کو دیکھیے تو وہ کوئی نیا یا انوکھا مطالبہ نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ آج کل بہت سے ایسے نوجوان شاعری اور مذہب کو الگ رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں جو مذہب کے مخالف ہیں اور لوگوں کی توجہ ادھر سے ہٹا کر انہیں معاشرتی اصلاح کی کوششوں اور منصوبوں میں لگا دینا چاہتے ہیں۔ ان سب کو اس کا دکھ ہے کہ اقبال نے اپنی نایاب صلاحیتیں اپنے دین کے نکتے سمجھانے اور خاص مسلمانوں کے حوصلے بڑھانے میں صرف کیں، اور قومیت کا خیال مسلمانوں کے دل سے نکال کر انہیں ملی زندگی کی تعمیر کا سبق پڑھاتے رہے، حالانکہ آزادی اور ملی اور قومی زندگی دونوں کی تعمیر کے لیے اس وقت اتحاد کی ضرورت ہے۔

یہ اعتراض صحیح ہوتے اگر اقبال نے اپنی نظموں میں کبھی بھولے سے کوئی بات ایسی کہی ہوتی جس سے مسلمانوں میں ضد یا ہندستان کے دوسرے رہنے والوں سے عداوت پیدا ہوتی۔ اقبال کو ہندستان کی آزادی اور آبرو کا اتنا ہی خیال تھا جتنا کہ اتحاد کے بڑے سے بڑے علم برداروں کو۔ مسلمانوں کو بیدار کرنے، انہیں غیرت دلانے اور خودی کا جام پلانے میں اقبال کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی اور اپنے دیس والوں کی فکر میں، ہندستان کو آزاد کریں اور اُسے افلاس اور اپنوں کے ظلم سے نجات دلائیں۔ اقبال نے مخالفت کی تو قومیت کے فلسفے کی، اور یہ فلسفہ ہے بھی ایسا تنگ اور اوچھا کہ اُس سے اقبال کیا دنیا کے سب سچے شاعر پناہ مانگتے ہیں۔ قومیت کے گن گانے والوں کے دل ٹٹولیے تو آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ وہ اس رنگا رنگی سے ڈرتے ہیں جس کے بغیر آدمی انسان نہیں ہو سکتے، وہ قومی کامیابی کے لیے لازمی سمجھتے ہیں کہ سب کے بدن پہ

ایک وردی، سب کی زبان پر ایک سکھایا ہوا نعرہ، سب کے ذہن میں لیڈروں کے پھیلائے ہوئے خیالات ہوں، وہ اُس شخص کو اپنا ہمدرد اور دیس کا سچا خادم سمجھتے ہیں جو اُن کی وردی اس لیے پہنتا ہے کہ اُسے لباس کی کوئی تمیز نہیں، ان کے نعروں کو دہراتا اور اُن کے خیالات سے عقیدت ظاہر کرتا ہے اس لیے کہ اس کی زبان میں بولنے اور دماغ میں سوچنے کی طاقت نہیں، اور اس شخص کو اپنی راہ میں روڑا سمجھتے ہیں جو لباس میں اپنا الگ مذاق رکھتا ہے، ہر بات کو اپنی بات بنا کر کہتا ہے اور ایک زندہ دل اور چارہ ساز صلاحیتوں سے قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔

جو یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ قومیت کے فلسفے سے شاعر کی طبیعت کس طرح الجھتی ہے وہ ڈاکٹر ٹیگور کی کتاب "Nationalism" (قومیت) پڑھ لے۔ پھر اسے کم از کم یہ شبہ تو نہ رہے گا کہ اقبال نے اپنے مذہب یا اپنی ملت کی خاطر ہی قومیت کی مخالفت کی۔ اور ہم اپنی چھوٹی سی دنیا اور اُس کے مسائل سے آگے نظر دوڑائیں تو ہم دیکھینگے کہ قومیت کا فلسفہ ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ جس میں شاعری کیا انسانیت بھی پنپ نہیں سکتی۔ تاریخ اور واقعات پر ذرا غور کیا جائے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ قومیت کے موجودہ فلسفے اور قومی زندگی کی تعمیر کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں۔ قومیں بنتی ہیں ایک طرف خدمت کے شوق اور دوسری طرف رہبری کی صلاحیت سے، ڈسپلن اور ایثار کے مادے سے، عاقبت اندیشی اور انسانیت کی قدر پہچاننے سے۔ اس کے لیے نہ وردی کی ضرورت ہے نہ خیالات کو سرکاری سانچے میں ڈھالنے کی۔ اسے خود رنگی چاہیے نہ کہ یک رنگی، صلاحیتوں کی افراط چاہیے نہ کہ ایک ہی چال چلنے اور ایک ہی بات کہنے کا قانون۔ اقبال نے قومیت کے فلسفے اور قواعد کو تسلیم نہیں کیا لیکن جو مسلمان ان کے معیار پر پورے اترنے کا حوصلہ کریں انہیں قوم کی خدمت کے لیے تن من دھن اس طرح وقف کرنا اور تمام دیس والوں کے ساتھ ایسے اخلاق برتنا ہونگے جن کا کہ قومیت اب تک کوئی دھندلا سا خاکہ بھی نہیں بنا سکی ہے۔

دنیا میں اقبال نے اپنے کلام کی بدولت شہرت پائی، لیکن ان کی شخصیت کا بھروسا ایک شعر کہنے کی صلاحیت پر نہ تھا۔ وہ بڑے عالم تھے، اور مشرق و مغرب میں چند ہی لوگ ایسے ہونگے جن کا مطالعہ اتنا وسیع اور گہرا ہے جتنا کہ مرحوم کا تھا۔ مگر شاعری اور علم دونوں مل کر بھی ان کا حوصلہ پورا نہ کر سکے، ان کی نظر آفتاب کی طرح

دنیا کے ہر ذرے پر تھی، اور ان کی نظر ہر ذرے کو چمکا دیتی تھی۔ اپنے کلام میں اُنھوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کیا تو کیا اُنہیں دنیا کی ہر قوم، سیاست اور تہذیب کے ہر پہلو، زندگی کے ہر مسئلے سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی لاہور کے ایک مکان کے ایک کونے میں گذاری، اور یہ کونا اور اس کا سکون انہیں اتنا عزیز تھا کہ وہ اسے کبھی خوشی سے نہ چھوڑتے تھے لیکن ان کا تخیل ساری دنیا پر چھایا رہتا تھا۔ علم کا ذوق دور دور سے ہر طرح کا مال ان کے پاس پہنچایا کرتا تھا، وہ معلوم ہوتے تھے غافل اور بے پروا مگر اُنہیں ساری دنیا کے چھوٹے بڑے واقعات کی خبر رہتی تھی۔ قدرت نے اُنہیں دل و دماغ کی جو دولت دی تھی اُسے اُنھوں نے جی بھر کر لٹایا، لیکن اُن کا خزانہ اتنا بڑا تھا کہ وہ برسوں اور لٹاتے رہتے تب بھی دنیا تک اس کا دسواں بیسواں حصہ بھی نہ پہنچ پاتا۔ اب دنیا کے مالک نے اس خزانے کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے۔ مگر ہمیں جو کچھ مل چکا ہے اس کو ہم محفوظ رکھیں اور سلیقے سے صرف کریں تو دنیا میں مالدار کہلائینگے اور ہماری سیکڑوں پشتیں اس پونجی پر فراغت سے بسر کرینگی۔

اقبال کی لوحِ تربت

جناب کریم الرضا خاں صاحب ایم ایل سی (شاہجہانپور)

بلبلِ گلزارِ مشرق افتخارِ ایشیا — تھا حیات افروزِ ملت نغمۂ دلکش ترا

اِس جہانِ رنگ و بو میں کیا ہے تکمیلِ حیات — یہ حدودِ زندگی اور وسعتِ صد ممکنات

فطرتِ عالم کی فیاضی کا ہر ذرّہ ثبوت — بخل کی یہ حد کہ ہر اک لب پہ اک مہرِ سکوت

عقلِ انساں کا تحیّر پردہ دارِ کائنات — فلسفی کی انتہائے فکر اسرارِ حیات

اِس قیودِ حکمت و مغرب سے تو آزاد تھا

اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد تھا

مغربی تہذیب کی یہ منزلِ وحشت اثر — نوعِ انساں کی تباہی رات دِن پیشِ نظر

جبر و استبداد کی دنیا میں طوفاں خیزیاں — اور کمزوروں پہ مغرب کی یہ آتش ریزیاں

دعوئ حق پروری حق کی پامالی کا دور — رحم اور انصاف کے پردہ میں کمزوروں پہ جور

بیکسوں کے نالہ و شیون سے اک شورِ نشور — "مجلسِ اقوام میں باہم وہ تقسیمِ قبور" از حضرت اقبال

اس فریبِ عصرِ نو کو آشکارا کر دیا

پردۂ تزویر تو نے پارا پارا کر دیا

مست صہبائے حجازی واہ رے مستی تری — اک عطائے ایزدی دنیا کو تھی ہستی تری

تھا حیاتِ تازہ اک عالم کو پیغامِ کہن — اک نئے انداز سے گردش میں تھا جامِ کہن

وہ تری تعلیم خودداری ترا درسِ فنا — ملتِ بیضا کو پھر دنیا میں زندہ کر دیا

مسلمِ جانباز کو تلوار کے سایہ میں عید
غازۂ رخسارِ ملت قطرۂ خونِ شہید

مشرقِ خوابیدہ کو پیغامِ بیداری تھا تو
مسلمِ ناکام کو اک رحمتِ باری تھا تو

ملتِ بیضا کا غم کھانا تری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا تری قسمت میں تھا

حامیِ تہذیبِ مشرق شاعرِ فطرت پرست
بادۂ حبِّ وطن سے ساقیِ ساغر پرست

آہ اے اقبال اے ملت پرستوں کے امام
اے فدائے حریت اے عاشقِ خیر الانام

تیری خاموشی بیانِ آرزو کی موت ہے
موت تیری اک جہانِ آرزو کی موت ہے

رو لے اب دل کھول کر اے مسلمِ حرماں نصیب
چل دیا رہبر ترا پہنچا کے منزل کے قریب

ترجمانِ مشرقِ مظلوم رخصت ہو گیا
نوحہ خوانِ ملتِ مرحوم رخصت ہو گیا

حکیم ٹالسٹائی کے اعترافات

پانچ سال کا عرصہ گذرا مجھ میں ایک حیرت انگیز تغیر رونما ہو چلا تھا پہلے پہل تو مجھ کو الجھن سی محسوس ہوتی تھی اور دل پکڑا پکڑا سا معلوم ہوتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھ کو کیا کرنا ہے اور زندگی کس طرح بسر کرنا ہے مجھے ہر سمت ناچاری و مجبوری ہی نظر آتی تھی۔ اس لیے میں افسردہ اور غمگین رہتا تھا لیکن یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا اور میں پھر حسب معمول زندگی کے دن پورے کرنے لگا مگر یہ "لمحات اضطراب" آئے دن اسی شکل میں رونما ہوتے لگے کہ زندگی کا مصرف کیا ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟

اول تو مجھ کو یہ سوالات مہمل اور لایعنی معلوم ہوئے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ چیزیں سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور جب کبھی مجھے ان کے حل کرنے کی حاجت محسوس ہوگی تو مجھ کو زیادہ دماغ سوزی سے کام نہ لینا پڑیگا۔ اس وقت تو میرے پاس ان کے لیے فالتو وقت نہیں ہے لیکن جب میں چاہونگا ان کے جوابات معلوم کرلونگا۔ سوالات اکثر و بیشتر نہایت تیزی سے دل و دماغ کو کریدتے رہتے تھے تاکہ میں فوراً ان کے جوابات معلوم کرلوں لیکن وہ مثل سیاہی کے قطروں کے ایک ہی جگہ پر گرگر کر ایک بڑا سا بدنما سیاہ دھبّہ بن کر رہ گئے۔

مجھ پر وہی گذری جو ہر اس شخص پر گذرتی ہے جو باطنی مرض الموت میں گرفتار ہو۔ اول بیماری کے معمولی علامات ظاہر ہوتے ہیں جن کی طرف مریض زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ پھر یہی علامات برابر ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور ایک مسلسل بیماری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بیماری بڑھتی جاتی ہے اور قبل اس کے کہ مریض اس کو اچھی طرح معلوم کر سکے کہ جن باتوں کو اس نے محض وقتی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا وہی اب اس کے لیے دنیا کی دوسری چیزوں سے زیادہ اہم ہیں۔ موت اُسے آلیتی ہے۔

یہی مجھ پر گذری۔ میں نے پہلے ہی سمجھ لیا کہ یہ کوئی وقتی شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے اور اگر یہ سوالات برابر پیدا ہوتے رہے تو انہیں حل کرنے کی سخت ضرورت ہوگی۔ چنانچہ میں نے

اس کی کوشش شروع کردی۔ سوالات معمولی، اور طفلانہ معلوم ہوتے تھے لیکن جیسے ہی میں نے ان کو ہاتھ لگایا اور حل کرنے کی کوشش کی مجھے فوراً یقین ہوگیا کہ (۱) یہ سوالات معمولی اور طفلانہ نہیں بلکہ یہ نہایت اہم ہیں اور زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے (۲) لیکن باوجود کوشش کرنے کے میں ان کو حل نہ کرسکونگا۔ قبل اس کے کہ میں اپنی ریاست سمارا کا انتظام اپنے ہاتھ میں لوں، یا اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کروں یا پھر کوئی کتاب تصنیف کروں، مجھ کو یہ معلوم ہوجانا چاہیے۔ کہ آخر یہ سب میں کس لیے کرونگا۔ جب تک میں اس کا سبب نہ سمجھ سکا میں نہ تو کچھ کرسکا اور نہ اچھی طرح زندگی ہی بسر کرسکا۔ جس زمانہ میں ریاست کے انتظام کے سوالات ذہن میں چکر لگارہے تھے یکایک یہ سوال پیدا ہوا کہ "اچھا مانا کہ مجھ کو ۱۶۰۰۰ ایکڑ زمین سمارا میں مل گئی اور تین سو گھوڑے مل گئے۔ پھر کیا ہوگا؟" میں بالکل بے بس تھا میں قطعی نہیں جانتا تھا کہ کیا سمجھنا چاہیے۔ یا پھر جب میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے منصوبے باندھا کرتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ آخر یہ کس لیے؟ یا پھر جب میں اپنی شہرت کا خیال کرتا جو کہ مجھ کو میری تصانیف سے حاصل ہوتی۔ میں دل میں سوچتا کہ "اچھا میں گوگول، پشکن، شیکسپیر اور مولیر سے زیادہ بلکہ دنیا کے سارے مصنفوں سے زیادہ مشہور ہو جاؤنگا لیکن اس سے حاصل کیا ہوگا؟" لیکن مجھے ان سب باتوں کا کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ سوالات زیادہ مہلت نہیں دیتے تھے۔ ان کے جواب فوراً دینے تھے۔ یہ میرے لیے وبال جان ہو جاتے تھے لیکن ان کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ جس چیز پر میں کھڑا تھا وہ ٹوٹ کر نیچے گر گئی ہے اور اب میرے پیر دل کے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں۔ جس چیز پر مجھے بھروسا تھا۔ اس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میری زندگی کے لیے کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔

میری حیات جامد ہو کر رہ گئی۔ میں صرف سانس لے سکتا تھا، کھا سکتا تھا، پی سکتا تھا اور سو سکتا تھا اور میں اپنے کو ان کاموں سے باز بھی نہ رکھ سکتا تھا لیکن اب زندگی کے کوئی معنی نہ تھے کیونکہ یہ کچھ ایسی خواہشیں نہ تھیں جن کی تکمیل کو میں کوئی معقول کام تصور کرتا۔ اگر کوئی فرشتہ آکر میری

خواہشات پوری کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تو میری سمجھ میں نہ آتا کہ آخر اس سے کس بات کی تمنا کروں۔ اگر میں کبھی بے خودی کی حالت میں کوئی بات محسوس کرتا جس کو خواہش تو نہیں البتہ خواہشات کی عادت کہا جا سکتا ہے تو ہوش و حواس اور سنجیدگی کے عالم میں اس کو محض "خیالِ خام" تصور کرتا تھا۔ اور سمجھتا تھا حقیقۃً یہ کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کی تمنا یا جستجو کی جائے۔ میں نے کبھی حقیقت کے معلوم کرنے کی تمنا نہیں کی کیونکہ میں اس کی اصلیت سے واقف تھا۔ میرے نزدیک حقیقت یہ تھی کہ زندگی ایک مہمل شے ہے۔ زندگی گذرتی رہی اور میں اسی ڈھرے پر چلتا رہا یہاں تک کہ ایک خندق کے پاس پہنچ گیا اور مجھے اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ اب میرے سامنے سوائے تباہی و بربادی کے کوئی دوسری شے نہیں ہے۔ رُکنا ناممکن اور واپس ہونا بھی ناممکن تھا۔ آنکھیں بند کرنا بھی امکان سے باہر تھا۔ میں یہ دیکھنے پر مجبور تھا کہ آگے مصیبت اور حقیقی موت ہے — مکمل فنا۔ نیستی —

نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں ایک تندرست و دولتمند شخص ہونے کے باوجود یہ محسوس کرنے لگا کہ اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک زبردست قوت مجھے اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ میں زندگی کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کو چھوڑ دوں۔ یہ نہیں کہ میں واقعی اپنے کو ہلاک کرنا چاہتا تھا کیونکہ جو قوت مجھ کو زندگی سے بھاگنے پر مجبور کر رہی تھی وہ خواہش سے کہیں زیادہ زبردست، مکمل اور وسیع تھی۔ اپنی ہلاکت کا خیال دل میں بالکل اسی طرح از خود پیدا ہوا جس طرح پہلے زندگی کو بہتر بنانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ یہ خیال کچھ اتنا دلفریب تھا کہ اس خوف سے کہ مبادا میں اس کام کو عجلت میں کر ڈالوں مجھے طرح طرح کی تدبیریں کرنی پڑتی تھیں۔ میں نے رسی کو محض اس لیے چھپا کر رکھ دیا تھا کہ کہیں میں اپنے آپ کو پھانسی لگا کر ہلاک نہ کر ڈالوں۔ میں نے بندوق لے کر شکار کو جانا ترک کر دیا تھا کہ کہیں میں جان دیدینے پر تیار نہ ہو جاؤں۔ یہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ آخر میں چاہتا کیا ہوں۔ میں زندگی سے خائف تھا۔ میں اُس سے دور بھاگنا چاہتا تھا لیکن پھر بھی اس کی تمنا تھی۔

یہ مصیبت مجھ پر اُس وقت پڑی جبکہ مجھ کو مکمل خوشحالی نصیب تھی۔ میں ابھی پچاس برس کا بھی نہ ہوا تھا۔ میری بیوی نہایت اچھی تھی جو مجھ کو پیار کرتی تھی اور جس سے مجھ کو محبت تھی۔ بچے بھی

گئی تھے اور ایک بڑی سی ریاست تھی جو کہ بلا میری کوشش و توجہ کے ترقی کرتی جاتی تھی بہ نسبت پہلے
کے اب میرے احباب و رشتہ دار میری عزت و وقعت زیادہ کرتے تھے۔ دوسرے لوگ میری تعریف
کیا کرتے تھے اور میں بلا خود فریبی کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا نام مشہور ہو گیا تھا۔ بیمار اور دیوانہ ہونے
کے بجائے میں جسمانی اور دماغی حیثیت سے تندرست و توانا تھا اور یہ بات اپنی قسم کے لوگوں میں
بہت کم پاتا ہوں۔ جسمانی طاقت کے لحاظ سے میں کاشتکاروں کے ساتھ کھیت نرا سکتا تھا۔
اور دماغی قوت کے اعتبار سے آٹھ سے دس گھنٹے تک مسلسل آسانی سے اتنا کام کر سکتا تھا
جس سے عام لوگ تھکن اور گرانی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

میرا دماغی ہیجان اس شکل میں رونما ہوا کہ میری زندگی سراسر مہمل اور ایک ستم ظریفی ہے جو کسی نے
میرے ساتھ کی ہے۔ حالانکہ مجھے "کسی ہستی" پر اعتقاد نہ تھا جس نے مجھے پیدا کیا ہو۔ پھر بھی یہ احساس
کہ "کسی ہستی" نے میرے ساتھ یہ ظلم اور مذاق کیا ہے کہ مجھ کو اس دنیا میں پیدا کر دیا خود اس فطری
شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔

از خود میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی جگہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو میری تیس چالیس
سال کی گذشتہ سوانح حیات کو معلوم کر کے خوش ہوتی ہے ۔ یعنی میری تعلیم و تربیت، نشو و نما،
دماغی و جسمانی بلوغ میں نے کس طرح دماغی قوتوں کی تکمیل کر کے زندگی کا بلند و اعلیٰ مقام حاصل
کر لیا۔ یہاں اب ساری چیزیں میری نظروں کے سامنے ہیں۔ میں اس بلندی پر کھڑا ہوتا ہوں۔
مثل ایک کامل احمق کے۔۔۔ اس بات کو اچھی طرح سے دیکھتا ہوں کہ زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے اور
نہ اس سے قبل تھا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اس سے "وہ ہستی" لطف اندوز ہوتی ہے۔

لیکن آیا وہ ہستی جو مجھ پر ہنس رہی ہے وہ کبھی تھی بھی یا نہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو
اپنے کسی فعل کا سبب بیان کر سکتا تھا اور نہ اپنی پوری زندگی کا۔ میں صرف اس لیے پریشان تھا کہ
آخر میں نے پہلے ہی اس مصیبت کو کیوں نہ ٹال دیا۔ اب اس کو سب پر ظاہر ہوئے عرصہ ہو گیا ہے
آج کل میں اُن لوگوں کو موت آنے والی ہے جن سے میں محبت کرتا ہوں۔ ان کا یہی حشر ہوگا۔ سوائے

ہڈی اور کپڑوں کے کچھ نہ ہوگا۔ دیر سویر میرے کارہائے نمایاں خواہ وہ کچھ بھی ہوں لوگوں کے ذہن سے اُتر جائینگے اور میرا کہیں وجود نہ ہوگا۔ تب پھر کس لیے جد وجہد کی جائے؟ انسان یہ انجام دیکھے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ یہی چیزیں باعث حیرت ہیں۔ جو شخص شرابِ حیات میں مخمور ہو وہی اس دنیا میں رہ سکتا ہے لیکن جیسے ہی خمار اُتریگا اور آدمی ہوش میں آئیگا اُس وقت وہ ضرور دیکھیگا کہ یہ ساری کائنات محض "فریب خیال" اور "بے معنی" ہے۔ دنیا میں کوئی چیز دلچسپ اور اچھی نہیں ہے سب کچھ سراسر "ظلم" و "حماقت" ہے

ایک مشرقی کہانی میں ایک مسافر کا ذکر ہے جس کو راہ میں ایک خوفناک درندہ ملتا ہے اس سے جان بچانے کے لیے وہ ایک اندھے کنویں میں کود پڑنا چاہتا ہے لیکن کنویں کے اندر اس کو ایک دیو نظر آتا ہے جو منہ پھاڑے ہوئے اس کو نگل جانے کے لیے تیار ہے۔ اس بیچارے کو کنویں کے اوپر رہنے کی ہمت اس وجہ سے نہیں ہے کہ کہیں وہ خوفناک درندہ اس کو چیر پھاڑ نہ ڈالے اور کنویں کے اندر اس لیے نہیں کود سکتا کہ کہیں وہ دیو اس کو ہضم نہ کر جائے اسی شش و پنج میں وہ ایک شاخ کو پکڑ کر لٹک جاتا ہے جو کہ کنویں کی دراز میں اندر کی جانب نکلی ہوئی تھی۔ وہ نہایت کمزور ہے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوتی جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ بہت جلد اُس کو اپنے آپ کو ان تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا پڑیگا جو اوپر اور نیچے اس کا انتظار کر رہے ہیں لیکن پھر بھی وہ لٹکا ہی رہتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ دو چوہیاں ایک کالی اور دوسری سفید رنگ کی اُسی شاخ کو جسے وہ پکڑے ہوئے ہے برابر کتر رہی ہیں۔ شاخ خود تھوڑی دیر میں ٹوٹ جائیگی اور یہ اس دیو کا لقمہ بن جائیگا۔ مسافر یہ سب دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انجام کار فنا ہے لیکن ابھی وہ لٹکا ہی ہوا تھا کہ اُس کو پتیوں پر شہد کے دو قطرے نظر آئے اور اُس نے کوشش کر کے اپنی زبان سے ان کو چاٹ ہی لیا۔ بالکل اسی طرح میں بھی اپنی شاخ زندگی سے لٹکا ہوا تھا یہ میں جانتا تھا کہ موت کا دیو میری بوٹی بوٹی کر ڈالنے کے لیے تیار ہے لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر میں نے اپنے کو اس مصیبت میں کیوں پھنسایا تھا۔ میں نے کوشش کر کے شہد کو چاٹا جس سے اول تو مجھ کو کچھ تسکین ہوئی

لیکن پھر کچھ فائدہ نہ ہوا اور روز و شب کی کالی اور سفید چوہیاں میری شاخ حیات کو برابر کترتی رہیں میں دیو کو صاف دیکھ رہا تھا اور شہد میں بھی وہ لطف و ذائقہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ محض ایک کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے جس کا کوئی جواب نہیں اور جو ہر شخص کی سمجھ میں آتی ہے۔

زندگی کی خوشیوں کا فریب جو پہلے میرے خوف کو کم کر دیا کرتا تھا اب مجھ کو دھوکا نہیں دیتا کہ "تم میں زندگی کے معنی سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے اس لیے اس بات کا خیال ہی نہ کرو اور زندگی پوری کرتے رہو"۔ یہ بات چاہے کتنی ہی بار مجھ سے کہی جائے لیکن نہ تو اس کا مجھ پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ میں اس پر عمل کر سکتا ہوں کیونکہ بہت عرصہ تک میں یہی کر چکا ہوں۔ اب میں یہ بغیر محسوس کیے نہیں رہ سکتا کہ دن اور رات گزرتے جاتے ہیں اور مجھ کو موت سے نزدیک کرتے جاتے ہیں۔ بس یہی میں دیکھتا ہوں اور یہی حقیقت بھی ہے باقی سب فریب و باطل ہے۔

شہد کے دو قطرے جنہوں نے میری نظر کو تلخ حقیقت سے ہٹا کر اپنی طرف کچھ عرصہ کے لیے متوجہ کر لیا تھا۔ میرے اہل و عیال کی محبت تھی اور تصنیف کی دلچسپی۔ تصنیف کو میں ایک آرٹ کہا کرتا تھا۔ لیکن اب ان میں بھی کوئی کشش باقی نہ تھی۔

خاندان — میں اپنے دل میں کہتا لیکن میرا خاندان یعنی بیوی اور بچے بھی تو آخر انسان ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے جو میری ہے۔ ان کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟ میں کیوں ان سے محبت کرتا ہوں؟ میں کیوں ان کی حفاظت، نگرانی اور پرورش کروں؟ کہیں ان کو بھی میری جیسی مایوسی نہ ہو یا پھر وہ احمق نہ بن جائیں۔ محبت کر کے میں اس حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا علم کا ہر قدم اس حقیقت سے قریب کر دیتا ہے۔ اور حقیقت — موت ہے۔

"آرٹ، شاعری" کامیابی اور لوگوں کی تعریف سے مجھے کامل یقین ہو گیا تھا کہ باوجود موت کے نزدیک ہونے کے یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان کر سکتا ہے۔ موت جو کہ ہر شے کو فنا کر دیتی ہے میرے کارناموں اور ان کی یاد کو بھی لوگوں کے دلوں سے فراموش کر دیگی۔ لیکن میں نے بہت ہی جلد معلوم کر لیا کہ یہ بھی ایک "فریب" ہے۔ یہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ہنر زندگی کی زیب و زینت ہے،

اور اُسے دلچسپ بناتا ہے لیکن خود میرے لیے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر میں کس طرح دوسروں کے لیے دلچسپی پیدا کرسکتا تھا جب تک کہ میں نے اپنی زندگی کی حقیقت کو نہیں پہچانا تھا اور دوسروں کی زندگی نقل کیا کرتا تھا۔ اس وقت تک مجھ کو یقین تھا کہ زندگی کے کچھ معنی ہیں حالانکہ میں ان کو بیان نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت تک ہر قسم کی شاعری اور آرٹ سے مجھ کو دلچسپی تھی اور ان سے حظ حاصل ہوتا تھا۔ زندگی کا عکس آرٹ کے آئینے میں نہایت ہی دلکش معلوم ہوتا تھا لیکن جب میں نے زندگی کے معنی معلوم کرنے کی فکر کی اور خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہا تو وہ آئینہ مجھے غیر ضروری، بیکار، مضحکہ خیز اور تکلیف دہ معلوم ہونے لگا۔ جو کچھ میں آئینہ میں دیکھتا تھا اس سے اب میں اپنے دل کو تسکین نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ جو مجھ کو نظر آتا تھا وہ خود میری حماقت و مایوسی تھی۔ یہ نظارہ اس وقت بھلا معلوم ہوتا تھا جب کہ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتا کہ واقعی زندگی کے کچھ معنی ضرور ہیں۔ تب زندگی کے تفریحی مزاحیہ، سنجیدہ، دلسوز، خوبصورت اور بھیانک کھیل مجھ کو محظوظ کرتے تھے۔ لیکن جب میں زندگی کو ایک بے معنی، ایک خطرناک شے تصور کرنے لگا تو آئینہ کے عکس مجھ کو خوش نہ کرسکتے تھے۔ جب میں نے دیو پر نظر ڈالی اور چوہیوں کو اپنی زندگی کے سہارے کو کترتے دیکھا تو شہد کی شیرینی و حلاوت بھی میری زبان کو میٹھا نہ کرسکی۔

اسی پر خاتمہ نہ تھا۔ اگر میں صرف یہی سمجھتا کہ زندگی کے کچھ معنی نہیں ہیں تو میں اس کو متانت سے برداشت کرلیتا یہ جان کر کہ میری قسمت ہی میں یہ تھا لیکن اس سے مجھے کو اطمینان نہ ہوسکتا تھا۔ اگر میری حالت اس شخص کی طرح ہوتی جو کسی جنگل میں رہتا ہو اور اس کو نکلنے کا راستہ نہ ملتا ہو تو میں وہیں زندگی بسر کرلیتا۔ لیکن میری حالت تو اُس شخص کی مانند ہے جو جنگل میں بھٹک گیا ہے، راستہ بھول جانے کی وجہ سے ہراساں اور خوفزدہ ہے اور راستہ معلوم کرنے کے لیے ادھر اُدھر بھاگتا پھرتا ہے لیکن یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر قدم اس کے لیے اور مصیبت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ پھر بھی وہ چاروں طرف بھٹکنے اور بھاگنے سے باز نہیں آتا۔

حقیقتاً یہ ایک خوفناک واقعہ تھا اور میں اپنے کو خوف سے بچانے کے لیے خودکشی کرنا چاہتا تھا میں نے اس خوف کا بھی اندازہ کرلیا تھا جو آنے والا تھا اور میں یہ جان گیا کہ وہ خوف موجودہ حالت سے

کہیں زیادہ ہیبتناک ہے۔ پھر بھی میں خاموشی سے اپنے انجام کا انتظار نہ کر سکتا تھا۔ تاریکی اور بھی زیادہ وحشتناک تھی جس سے میں جتنی جلد ممکن ہو خلاصی پانا چاہتا تھا۔ ایک رسّی کے پھندے یا پھر بندوق کی گولی سے۔ یہی خیالات مجھ کو نہایت ہی استقلال کے ساتھ خودکشی کی جانب لیے جا رہے تھے۔

لیکن شاید میں نے کسی چیز کو نظرانداز کر دیا یا پھر کسی بات کو اُلٹا سمجھا۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مایوسی انسانی فطرت کا تقاضا ہے سچ پوچھیے تو میں اب بھی موت سے بچ کر نکل جانے کا ذریعہ تلاش کرتا تھا۔

وہ سوال جو کہ مجھ کو پچاس برس کی عمر میں خودکشی پر مجبور کر رہا تھا، وہ ایک ایسا معمولی و آسان سوال تھا جو چھوٹے سے بچے سے لے کر بڑے سے بڑے فلسفی کے دل میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب دیے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا جیسا کہ مجھ کو تجربے سے معلوم ہوا۔ وہ سوال یہ تھا کہ جو کچھ کہ میں آج یا کل کرونگا اس سے کیا حاصل ہوگا؟ میری تمام زندگی سے کیا حاصل ہوگا؟ بہ الفاظ دیگر میں کیوں زندہ رہوں؟ میں کسی چیز کی تمنا کس لیے کروں؟ اور کسی کام کے کرنے کی کوشش کیوں کروں؟ دوسری طرح اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کیا زندگی میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کو موت برباد نہ کر سکے؟ کل انسانی معلومات دو قسم کی ہیں اوّل قسم میں تو علم کیمیا، حساب اور سائنس ہیں جن کو میرے سوال سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ دلچسپ و دلکش اور حیرت انگیز تو ضرور ہیں لیکن اُنھوں نے میرے سوال کو حل کرنے کی کوشش نہ کی۔ دوسری طرف تخئیلی علم ہیں جن میں مابعد الطبعیات بھی شامل ہے اور جس نے میرے سوال کو حل کرنے میں کچھ مدد بھی دی لیکن اس سے بھی خاطرخواہ جواب نہ ملا۔

جہاں فلسفہ کسی خاص سوال کو نظرانداز نہیں کرتا وہاں وہ ہر سوال کا ایک ہی جواب دیتا ہے۔ سقراط، شوپنہار، سلیمان اور گوتم بدھ سب کا ایک ہی جواب ہے۔

"جس قدر ہم زندگی سے دور ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ہم حقیقت سے نزدیک تر ہوتے جاتے ہیں" یہ سقراط نے اُس وقت کہا تھا جب کہ وہ مرنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ "وہ لوگ زندگی کے لیے کیوں بیتاب ہیں۔ جن کو حقیقت سے ذرا بھی لگاؤ ہے؟ ہم کو چاہیے کہ اپنے آپ کو جسمانیت سے

آزاد کرلیں تاکہ اُن تمام بُرائیوں سے بچ جائیں جو کہ جسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ہمیں موت سے خوشی حاصل نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

"عقلمند انسان تمام عمر موت کی تمنا کرتا ہے اور موت سے ہرگز نہیں ڈرتا" شوپنہار بھی کہتا ہے کہ زندگی ایک عذاب ہے اور سلیمان نے یا پھر جس کسی نے بھی ان کے نام سے کتابیں لکھی ہیں کہا ہے:۔

" یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے۔ انسان کو اپنی محنت و جانفشانی کا کیا ثمر ملتا ہے۔ نہ تو گذشتہ واقعات کی یاد باقی رہتی ہے اور نہ آئندہ واقعات کے ساتھ موجودہ واقعات کی یاد تازہ رہ سکتی ہے"

"اس لیے مجھے زندگی سے نفرت ہے یہ محنت و جانفشانی میرے لیے باعث تکلیف ہے کیونکہ یہ سب روح کا دھوکا اور انتشار ہے"

جب سکیامنی کو عمر، مرض اور موت کی اصلیت معلوم ہوئی تو اُس کو زندگی میں کچھ لطف حاصل نہ ہو سکا اور اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ زندگی بدترین عذاب ہے اور اس سے خود خلاصی پانے کے لیے اور دوسروں کو آزاد کرنے کے لیے اس نے اپنی ساری روحانی قوت صرف کی اِس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ زندگی کا جڑ سے خاتمہ کر دے تاکہ ہم موت کے بعد کہیں پھر نہ زندہ کر دیے جائیں یہی اعتقاد اور ہندوستانی عارفوں کا بھی ہے۔

زندگی کے مسئلہ کے متعلق انسانی عقل براہ راست یہی جواب دیتی ہے۔ سقراط کا قول ہے کہ "حیات جسمانی سراسر عذاب اور فریب ہے۔ اس لیے جسمانی زندگی کا خاتمہ کر دینا عین ثواب ہے اور ہم کو ایسا ہی کرنا چاہیے"

" حیات ایک ایسی شے ہے جس کو کبھی عذاب نہ ہونا چاہیے۔ عدم کا راستہ زندگی کی بہترین چیز ہے" یہ فلسفہ شوپنہار کا ہے۔

سلیمان کا قول ہے کہ " دنیا کی ہر شے، عقل و حماقت، دولت و غربت اور دُکھ سکھ سب حقیقت سے خالی اور فانی چیزیں ہیں۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اس لیے یہ سب کچھ حماقت ہے"

گوتم بدھ کا قول ہے کہ "اس بات سے آگاہ ہوتے ہوئے کہ آزار، کمزوری، بڑھاپا اور موت لازمی و یقینی ہیں زندہ رہنا نہایت دشوار امر ہے اس لیے ہم کو چاہیے کہ اپنے آپ کو ہر ممکن حیات سے آزاد کرلیں"۔
ان زبردست دماغوں کے اقوال کو لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے سوچا اور سمجھا اور یہی میں نے بھی سوچا اور سمجھا ہے۔
کوئی شخص خود اپنے کو فریب نہیں دے سکتا۔ یہ سب تکبر ہے۔ اس لیے جو پیدا نہیں ہوا وہی خوش قسمت ہے۔ زندگی سے موت بہتر ہے اور ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے کو زندگی سے پاک کرلے۔
پھر میں نے اپنے ہم مشرب لوگوں کی حیات کا جائزہ لینا شروع کیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ذیل کی چار حالتوں میں سے کسی ایک سے ضرور اُن کو بھی سابقہ پڑا ہوگا۔
پہلی حالت نادانی کی ہے۔ کچھ لوگ جن میں بیشتر حصہ عورتوں یا بہت چھوٹے بچوں یا پھر بہت ہی کودن لوگوں کا ہے جنھوں نے ابھی تک زندگی کے اہم مسئلہ کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں ہے لیکن میں اس کو سمجھتے ہوئے دوبارہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔
دوسرا طریقہ شکم پروروں کا ہے جس کو سلیمان نے یہ کہتے ہوئے واضح کیا ہے کہ "تب میں نے خوشی شادمانی کی اجازت دی کیونکہ اس دنیا میں کسی شخص کے لئے کھانے پینے اور خوش ہونے سے زیادہ بہتر دوسری چیز نہیں ہے"
یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہمارے بہت سے ساتھی زندگی کو اپنے لائق بنا لیتے ہیں۔ ان کے اطوار اور واقعات ان کے لیے بجائے مصیبت و محنت کے آرام و آسائش مہیا کردیتے ہیں۔ اور ان کی اخلاقی کمزوریاں ان کے لیے یہ ممکن کردیتی ہیں کہ وہ اس بات کو فراموش کردیں کہ اُن کی موجودہ بہتری اتفاقیہ امر ہے۔ ان لوگوں کی دماغی کمزوریاں ان کے دلوں سے ان تمام باتوں کو فراموش کرادیتی ہیں جن کی وجہ سے گوتم بدھ تمام عمر روحانی ہیجان و اضطراب میں مبتلا رہے۔ وہ چیزیں مرض، بڑھاپا اور موت تھیں جو ایک نہ ایک دن ان تمام عیش و آرام کا ایکدم خاتمہ کردینگی لیکن میں اُن لوگوں کی طرح نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میرے پاس ان کی جیسی دماغی کمزوری نہ تھی اور نہ میں خود مصنوعی طور سے پیدا کرسکتا تھا۔
تیسرا ذریعہ جوش و قوت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ زندگی ایک عذاب اور جہالت ہے،

اور اس کا برباد ہو جانا ہی اچھا ہے یہ صرف وہی چند لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں استحکام اور قوت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ یہی طریقہ میں بھی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

چوتھا چھٹکارا پانے کا ذریعہ کمزوری ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ حقیقت و اصلیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی زندگی ہی کو پسند کرنا۔ گویا کسی کو اب بھی اس سے کچھ اُمید ہے اور میں اپنے کو اسی ذیل میں پاتا ہوں۔ سلیمان و شوپنہار کی طرح زندگی بسر کرنا، یہ جانتے ہوئے کہ زندگی ایک تلخ مذاق ہے جو کہ ہم سے کیا گیا ہے اس پر زندگی ہی کو ترجیح دینا، غسل کرنا، کپڑے بدلنا، کھانا، باتیں کرنا اور یہاں تک کہ کتابیں بھی لکھنا میرے لیے ایک نفرت انگیز اور تکلیف دہ چیز تھی لیکن میں اسی حالت پہ قائم رہا۔

اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنے کو ہلاک نہیں کیا تو اس کی وجہ میرے تخیل کی انفرادیت کا ہلکا سا احساس تھا اور اب میں دلیل کرنے کے بجائے یہ محسوس کرنے لگا کہ " میں اور میری دلیل نے زندگی کو غیر مدلل تسلیم کر لیا ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ دلیل نہیں ہے (جو کہ حقیقۃً نہیں ہے اور نہ کوئی چیز یہ ثابت کر سکتی ہے کہ کوئی ایسی دلیل ہے) تب تو دلیل ہی نے میرے لیے زندگی پیدا کر دی ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ دلیل نہیں ہے تو پھر میری زندگی بھی نہ ہوگی۔ دلائل زندگی سے کس طرح منکر ہو سکتے ہیں جبکہ وہی زندگی پیدا کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر زندگی نہ ہوتی تو میرے دلائل کا وجود بھی نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ دلیل زندگی کی اولاد ہے۔ بس پھر زندگی ہی زندگی ہے۔ دلیل اس کا پھل ہے پھر بھی دلیل خود زندگی سے منکر ہے میں نے محسوس کیا تھا کہ یہیں پر کوئی غلطی ہے

خودکشی سے زندگی کا خاتمہ کرنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی بس پھر اپنے کو ہلاک کر کے اس بحث کا خاتمہ ہی کر دینا چاہیے۔ اگر زندگی تکلیف دہ معلوم ہو تو اپنے کو ہلاک کر دو۔ جب تم زندہ رہ کر بھی زندگی کا راز نہیں سمجھ سکتے تو اس کا خاتمہ ہی کر دینا اچھا ہے اور جو تم نہیں سمجھتے لکھ کر یا پرچار کر کے اس زندگی میں اپنے کو بیوقوف مت بناؤ۔ تم کو اچھی جماعت مل گئی جہاں ہر شخص قانع ہے اور اپنے فعل کو بہتر سمجھتا ہے۔ اگر تم کو یہ غیر دلچسپ اور نفرت انگیز معلوم ہوتا ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔

حقیقۃً ہماری کیا حیثیت ہو جو اس بات کو تو مانتے ہیں کہ خودکشی لازمی ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے لیکن سب سے کمزور، سب سے زیادہ نالائق، واضح الفاظ میں سب سے زیادہ احمق انسان خود اپنی

حماقت کا ڈھنڈورا اسی طرح پیٹتا پھرتا ہے جس طرح ایک بیوقوف ایک بیہودہ مسخرہ لے ساتھ شور مچاتا پھرتا ہے۔
میں نے اپنے دل میں سوچا کہ "کچھ گڑبڑ ضرور ہے" لیکن یہ گڑبڑ کیا تھی میں کسی طرح سے بھی معلوم نہ کرسکتا تھا۔ میں نے اس دھند کے صاف ہونے سے پہلے ہی اپنی حالت کو درست کرنا شروع کردیا تھا۔
مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم یافتہ اور آرام طلب لوگوں کا جن میں میرا بھی شمار تھا ایک مختصر سا دائرہ ہے جس نے "انسانیت" میں ایک "خلا" پیدا کر رکھا ہے اور لاکھوں انسان جو گذر چکے ہیں یا موجود ہیں وہ اصل میں انسان نہیں بلکہ حیوان ہیں۔ یہ حالت اُس وقت تھی جب کہ میرے دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوا تھا کہ "وہ لاکھوں انسان جن کو ہم "عوام الناس" کہتے ہیں ان موجودہ اور گذشتہ لوگوں کے بارے میں کیا خیال کرتے ہونگے؟"
ایک عرصہ تک میں اسی جنون کی حالت میں رہا جو کہ صرف الفاظ میں نہیں بلکہ حقیقت میں خصوصاً ہم ہی جیسے آزادمنش اور تعلیمیافتہ لوگوں کا تمغۂ امتیاز ہے لیکن پھر یا تو وہ میرا مزدوروں کے لیے ذاتی خلوص تھا جس نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ وہ لوگ اتنے بے وقوف اور احمق نہیں ہیں جتنا کہ ہم انہیں تصور کرتے ہیں یا پھر اس کی وجہ میرا وہ سچا اعتقاد تھا کہ میں سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں جان سکتا کہ اپنے کو رسی میں لٹکا کر ہلاک کر ڈالوں۔ بہرحال میں نے ازخود یہ محسوس کیا کہ اگر میں زندہ رہ کر زندگی کا مقصد و راز سمجھنا چاہتا ہوں تو مجھے اس کو ان لوگوں میں نہ تلاش کرنا چاہیے جو اس کو کھو چکے ہیں اور اب اپنے کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ماضی و حال کے ان لاکھوں انسانوں میں تلاش کرنا چاہیے جو اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور جو کہ اپنی اور ہماری زندگی کا بار اپنے شانوں پر خندہ پیشانی سے اُٹھاتے ہیں۔
تجربہ کر بھی ثابت ہوا کہ عام مخلوق جو کہ کروڑوں کی تعداد میں ہے ان کو ہمیشہ زندگی کی حقیقت کا علم رہا ہے اور اب بھی اچھی طرح اس سے واقف ہیں لیکن یہ علم خود اُن کا اعتقاد ہے جس کو میں سوائے رد کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "یہ خدا ہے، ایک اور تین، چھ دن میں دنیا کی آفرینش، شیطان اور فرشتے، اور تمام وہ لغویات جن کو میں اس وقت تک جب کہ ہوں، مان نہیں سکتا جب تک کہ مجھ میں دلائل و براہین موجود ہیں۔"

میری حالت نہایت خطرناک تھی میں سمجھتا تھا کہ مدلل علم کی راہ میں سوائے زندگی کے انکار کے اور کوئی دوسری شے حائل نہیں ہو سکتی۔ اور اعتقاد کے لیے صرف دلائل اور براہین کا منکر ہونا ضروری ہے یہ میرے لیے زندگی سے منکر ہونے سے زیادہ دشوار اور ناممکنات میں سے تھا۔

آخر کار مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ میری غلطی ہے کہ زندگی کا مقصد واضح کرنے کے لیے میں ہمیشہ کسی خاص محدود چیز کی جستجو میں رہتا ہوں خاص چیز کے بھی عام چیز کے علاوہ اور کوئی دوسرے معنی نہیں ہوتے قبل اس کے کہ مسئلہ حیات کا حل معلوم کیا جائے۔ ان دونوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دینا چاہیے۔

اس مسئلہ کے متعلق شوپنہار کا جواب ہے کہ زندگی کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ یہ تو سراسر عذاب ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ جواب اثبات میں نہیں ہے لیکن اس جواب کی جس کو برہمن شوپنہار اور سلیمان نے بیان کیا ہے۔ اس کے سوائے ایک مہمل، لامحدود اور بحر سی بات کے اور کچھ بھی حقیقت نہیں ہے پھر تو میں سمجھ گیا کہ اعتقاد کے جوابات چاہے کتنے ہی غیر مدلل اور بحر کیوں نہ ہوں لیکن اُن سے یہ فائدہ تو ضرور رہوتا ہے کہ وہ ہر جواب میں محدود اور لامحدود کا رشتہ یا تعلق ضرور قائم کر دیتے ہیں جس نسبت کے بغیر جواب دینا ناممکن ہے۔

سوال کو چاہے میں کسی صورت میں پیش کرتا لیکن وہ تعلق ضرور رونما ہوتا تھا۔ مجھے کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے؟ فطری اصول کے مطابق میری زندگی سے کون سا اہم نتیجہ برآمد ہوگا۔۔۔ دائمی ثواب یا دائمی عذاب اس حیات کی کیا حقیقت ہے جس کو موت بھی برباد نہیں کر سکتی؟۔۔۔ اس خدا کا وصال (دیدار) جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا یعنی بہشت کی اصلیت۔۔۔

اعتقاد مجھ کو ہمیشہ اسی طرح غیر ناطق معلوم دیا جیسے پہلے معلوم ہوتا تھا لیکن میرے لیے سوائے یہ تسلیم کرنے کے چارہ نہ تھا کہ صرف یہی ایک چیز ہے جو کہ مسئلہ حیات کا انسان کو تھوڑا بہت جواب دیسکتی ہے۔ اور اسی سے زندگی ممکن معلوم ہوتی ہے۔

جہاں کہیں بھی حیات و زندگی ہے وہاں جب سے انسان رہنے لگا ہے اعتقاد نے اس کے لیے

زندگی کو آسان و ممکن بنا دیا ہے اور اس اعتقاد کا خاکہ ہمیشہ ہر جگہ وہی اور ایک ہی سا ہوتا ہے جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے اعتقاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کسی نے کہا ہے اُس کو مان لیا جائے۔ اعتقاد انسانی زندگی کے راز کے اس علم کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان اپنے کو ہلاک کرنے کے بجائے زندہ رہنا پسند کرتا ہے! اعتقاد زندگی کا "قوت بازو" ہے۔ اگر کوئی شخص زندہ رہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اُس کو کسی بات کا یقین ہے۔ اگر وہ فانی شے کو نہ دیکھتا ہے اور نہ پہچانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ اس پر ضرور یقین رکھتا ہے اگر وہ فانی شے کی تخیلی نطرت کو پہچانتا ہے تب تو اس کو غیر فانی پر اعتقاد رکھنا چاہیے۔ بغیر اعتقاد کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

میں کیا ہوں؟ اسی غیر فانی شے کا جز۔ ان ہی چند الفاظ میں زندگی کا راز مضمر ہے۔

میں تھوڑا تھوڑا یہ محسوس کرنے لگا کہ اعتقاد کے دیے ہوئے جوابوں میں انسانی عقل کا زبردست خزانہ پوشیدہ ہے۔

یہ تو میں سمجھ گیا لیکن اس نے میرے لیے کوئی بہتر صورت پیدا نہ کی۔

اب میں ہر اس اعتقاد کو قبول کرنے پر تیار ہو گیا تھا جس میں براہ راست دلائل سے انکار نہ کرنا پڑے، جو کہ سراسر غلطی ہے اور میں نے کتابوں سے بدھ مذہب اور اسلام کا مطالعہ کیا اور خصوصاً میں نے مذہب مسیحی کی کتابوں سے اور لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔

فطرۃً اوّل میں اپنے ہی گروہ کا ایک ایماندار شخص بن گیا تھا میں علماء کا معتقد تھا۔ گرجا گھر کے پادریوں کا، درویشوں کا، اور جدید خیالات کے پادریوں کا اور میں ان انجیلی اصحاب کا بھی معتقد تھا جو اپنی تعاریف انجیل کے مطابق کرتے تھے اور جنہیں حضرت مسیح کے کفارہ پر اعتقاد رکھنے سے نجات کا یقین ہوتا ہے میں ایسے ہی معتقد اصحاب کے پاس پہنچ کر ان کے اعتقادات کے متعلق، اور یہ کہ وہ زندگی کا ماحصل کیا سمجھتے ہیں سوالات کیا کرتا تھا۔

لیکن باوجود اس کے کہ میں ہر قسم کی رعایت و لحاظ کرنے کے لیے تیار تھا پھر بھی میں نے یہ دیکھا کہ جو کچھ بھی اُنہوں نے اپنے اعتقاد کے متعلق بتایا اس نے زندگی کے مسئلہ کو واضح کرنے کے بجائے

اور دقیق و نافہم کر دیا۔

اس اُمید کے بعد جو کہ مجھ کو ان لوگوں سے تھی اپنی سابق مایوسانہ حالت میں جانے کا روح فرسا خوف پھر میرے دل و دماغ میں چکر لگانے لگا۔

جتنے واضح طور سے اُنہوں نے مجھ سے اپنے اصول بتلائے اتنے ہی صاف طریقہ سے میں ان کی غلطیاں محسوس کرنے لگا۔ جن باتوں نے مجھ کو متنفر کیا وہ یہ نہ تھیں کہ اُنہوں نے بہت سی لایعنی اور غیر ضروری باتیں ان سچی صداقتوں میں ٹھونس دی تھیں جن کا میں ہمیشہ سے معتقد تھا۔ اس حقیقت نے مجھ کو متنفر بنا دیا کہ ان کی زندگیاں بھی میری ہی زندگی کی مانند ہیں جس میں صرف یہ فرق ہے کہ ان کی زندگی کا ان کے ان اصولوں سے کوئی تعلق نہ تھا جن کا وہ اپنی تعلیم کی طرح پرچار کیا کرتے تھے۔

ان کے معتقدات کی صداقت کی کوئی دلیل مجھے قائل نہ کر سکی۔ صرف ان کے افعال سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے ماحصل کو سمجھتے ہیں جس میں وہی ساری باتیں تھیں جن سے میں اس قدر خائف تھا یعنی غربت، آزار اور موت جو کہ ان کے لیے کوئی خوف کی بات نہ تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے قائل نہ کر سکیں ہمارے ہی گروہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن میں ایسے افعال نہ پاتا تھا۔ اس کے برخلاف ایسے افعال میں نے اپنے گروہ کے ان لوگوں کو کرتے ہوئے دیکھا جو کہ قطعی منکر اور غیر معتقد تھے لیکن جو ہمارے گروہ کے معتقد ہیں اُنہوں نے کبھی ایسے کام نہیں کیے۔

میں یہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں کا یقین وہ اعتقاد نہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ ان کا اعتقاد کوئی حقیقی اعتقاد نہیں ہے بلکہ یہ صرف ایک ڈھونگ ہے۔

تب پھر میں ان معتقد لوگوں کی طرف رجوع ہونے لگا جو غریب، سادہ لوح اور جاہل تھے جو کہ یاترا کرنے والے، درویش، زاہد اور کاشتکار تھے ان میں بھی میں نے یہ دیکھا کہ ہمچو مذہب کی صداقتوں میں بہت سے باطل خیالات و اعتقادات شامل ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باطل ان کی زندگی کا ایک لازمی اور فطری جزو ہے.... اور میں ان لوگوں کی زندگی اور اعتقاد کو اچھا سمجھنے لگا اور جتنا ہی میں نے اس پر غور کیا اتنا ہی میں اس بات کا قائل ہوا کہ ان کا اعتقاد درست ہے جو اُن کے لیے

ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ اور جو اُن کی زندگی کو کارآمد اور رہنے کے قابل بناتا ہے برخلاف اپنے
گروہ کے جس کی ساری زندگی سستی و کاہلی، عیش و عشرت، شراب و کباب، حرص و ہوس اور بے
اطمینانی میں گذرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُن لوگوں کی تمام زندگی محنت و مشقت، دُکھ اور تکلیف اور رنج
وغم میں گذرتی تھی پھر بھی وہ لوگ مطمئن اور قانع تھے جب کہ ہم اس بات سے خائف ہیں کہ ہم کو بھی دکھ
اور تکلیف برداشت کرنا ہے اور مرنا ہے یہ لوگ زندہ رہتے ہیں تکلیفیں جھیلتے ہیں مصیبتیں اُٹھاتے
ہیں لیکن پھر بھی نہایت اطمینان اور خاموشی سے مر بھی جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایسے ہوتے ہیں جو خوشی
سے جان دیتے ہیں۔

مجھے ان لوگوں سے اُنس ہو گیا۔ جتنا زیادہ میں ان کی زندگی سے واقف ہوتا گیا اُسی قدر
زیادہ میں اُن کو چاہنے لگا اور اتنا ہی میرے لیے زندگی بسر کرنا آسان ہو گیا۔ اسی طرح میرے دو برس گذر
گئے۔ اور مجھ میں ایک تغیر رونما ہوا جو کہ پہلے ہی سے تیار رکھا تھا اور جس کی میں ہمیشہ اُمید کرتا تھا۔

ہمارے گروہ یعنی دولتمند اور تعلیمیافتہ جماعت کی زندگی میرے نزدیک صرف بے لطف ہی نہیں
بلکہ بے معنی اور بیکار بھی تھی۔ جب کہ ان تمام مزدور پیشہ لوگوں کی زندگی یعنی ان تمام انسانوں کی زندگی
جنہوں نے زندگی کو واقعی زندگی بنایا اپنی حقیقت و اصلیت کے ساتھ مجھ پر ظاہر ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہی
اصلی زندگی ہے اور اس زندگی کے جو معنی بتلائے جاتے ہیں وہ درست و بجا ہیں اور میں نے بھی قبول
کر لیا۔

تب میں یہ سمجھ گیا کہ جس وقت میں زندگی کو محض "عذاب" خیال کرتا تھا اس وقت میرا یہ سوال کہ
"زندگی کیا ہے؟" بجا و درست تھا۔ صرف غلطی اس میں یہ تھی کہ اس کا جواب میری خود اپنی زندگی تھی نہ کہ
عام لوگوں کی زندگی۔ میری زندگی جو کہ محض عیش پرستی، اور خواہشات کی زندگی کے مرادف تھی حقیقۃً لایعنی
اور عذاب تھی۔ اور میں اس حقیقت سے واقف ہو گیا جو میں نے بعد میں انجیلی تعلیم میں پائی یعنی انسان بہ
نسبت روشنی کے تاریکی اس لیے پسند کرتا ہے کہ اس کے افعال سراسر جرم و گناہ ہوتے ہیں اور یہ کہ حسب
معمول چیزوں اور واقعات کو دیکھ کر ہر شخص کو چاہیے کہ وہ انسانی زندگی کے متعلق سوچے اور رکھے۔ بجائے

اس کے کہ وہ اُن لوگوں کا ذکر کرے جن کی زندگی کا دارومدار خود دوسروں کی زندگی پر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک چڑیا اس طرح زندگی بسر کرتی ہے کہ وہ خود ہی اُڑتی ہے، گھونسلا بناتی ہے اور غذا مہیا کرتی ہے اور جب میں اس چڑیا کو ایسا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس کی خوشی سے مجھے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح بکری، خرگوش اور بھیڑیا اپنی ضروریات زندگی خود مہیا کرتے ہیں اور اپنی نسل بڑھاتے ہیں اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ جب میں ان کو ایسا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے کامل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بہت خوش ہیں اور اُن کی حیات ایک مدلل بامعنی زندگی ہے اور ہاں! میں نے اپنی گذشتہ تیس سال کی باہوش زندگی میں کیا کیا؟ میں نے صرف سب کے ہی لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے بھی ضروریات مہیا کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ میں نے اپنی زندگی ان لوگوں کی طرح بسر کی تھی جن کی زندگی کا بار دوسروں کے شانوں پر ہوتا ہے اور جب میرے دل میں خود یہ سوال پیدا ہوا کہ میری زندگی کس کام کی ہے یعنی میری زندگی کا مصرف کیا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی بیکار رہے۔ اگر انسانی زندگی کے یہ معنی ہیں کہ اس کو ترقی دیا جائے تو بھلا میری زندگی کس کام کی ہو سکتی تھی جبکہ میں نے تیس سال کی عمر میں اس کو ترقی دینے کے بجائے میں خود اپنی ہی نہیں بلکہ دوسروں کی بھی زندگی برباد کرتا رہا تو پھر میں اپنی زندگی کو حماقت و عذاب کے سوا دوسری چیز کس طرح سمجھ سکتا تھا۔ وہ بالکل حماقت و عذاب تھی۔

اس پر اعتقاد کیسے ہو سکتا تھا کہ زندگی کا علم زندہ رہنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ خود مجھے اپنی ہی زندگی کی خوبیوں پہ شبہ ہونے لگا تھا۔ اس سال جب کہ میں ہر وقت اپنے دل میں یہی خیال کرتا تھا کہ آیا مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ رسی کے پھندے سے یا بندوق کی گولی سے کر دینا چاہیے۔ اس زمانہ میں ہمیشہ میرے خیالات اور تجربات جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے میرے دل میں ایک درد کی طرح محسوس ہوتے تھے اور میرا دل کچھ اکڑا اکڑا سا معلوم ہوتا تھا جس کو میں اب صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ خدا کے معلوم کرنے کا جذبہ تھا۔

میرے ذہن میں شوپنہار اور کانٹ کے دلائل چکر لگاتے تھے جن سے خدا کا وجود ثابت کرنا ممکن تھا اور میں ان کو رد کرتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ "سبب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جیسی کہ "وقت" اور "فاصلہ" (وسعت)۔ اگر میرا وجود ہے تو اس کا کچھ سبب ضرور ہونا چاہیے اور "سببوں" کا بھی ایک "سبب" لازم ہے اور سارے

اسباب کا ایک سبب وہی ہو سکتا ہے جس کو انسان "خدا" کہتا ہے۔ اور جونہی یہ میں نے تسلیم کر لیا کہ میں ایک زبردست قوت کے قبضہ میں ہوں۔ مجھ کو فوراً ایسا معلوم ہوا کہ اب میں زندہ رہ سکتا ہوں لیکن میں نے دل میں سوال کیا کہ وہ سبب اور قوت کیا ہے؟ میں اس کا کس طرح خیال کر سکتا ہوں؟ میرے اس ہستی سے کیا تعلقات ہیں جس کو کہ میں "خدا" کہتا ہوں؟ صرف مجھے یہ معمولی و آسان سا جواب ملا کہ "وہ خالق و محافظ ہے" اس جواب سے مجھے تشفی نہیں ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ سے وہ شئے نکلی جا رہی ہے جس کی میری زندگی کو سخت ضرورت ہے۔ میں خوفزدہ اور ہراساں ہو کر جس کی مجھے تلاش تھی اس سے دعا کرنے لگا کہ ایسی حالت میں اُس کو چاہیے کہ میری مدد کرے۔ لیکن جتنی زیادہ میں نے دعائیں کیں اتنا ہی مجھ پر یہ روشن ہوتا گیا کہ وہ میری ایک بھی نہیں سنتا اور کوئی بھی ایسی ہستی نہیں ہے جس کو میں خود مخاطب کروں۔ دل میں۔ دل میں اس بات سے مایوس ہوتے ہوئے کہ خدا کا وجود بالکل ہی نہیں ہے، میں نے کہا "اے مالک رحم کر، مجھے بچا، آقا مجھ کو کچھ بتلا"۔ لیکن مجھ پر کسی نے بھی رحم نہ کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

لیکن بار بار میں پھر اسی بات کی طرف رجوع کرتا کہ بلا سبب، وجہ یا مطلب کے میں ہرگز اس دنیا میں نہیں آسکتا تھا۔ میں ہرگز اس آشیانہ میں ایسا بے بال و پر نہیں ہو سکتا جیسا کہ میں خیال کرتا تھا۔ یا پھر گھاس پر لیٹ کر میں نے یہ فرض کر لیا کہ میں ایسا ہی تھا (چونکہ میں اس بات سے واقف ہوں اس لیے میں نے کہا) کہ ماں نے مجھ کو اپنے بطن سے پیدا کیا ہے، میری حفاظت کی ہے آرام پہنچایا ہے، مجھے کھانے کو دیا اور مجھ سے محبت کی ہے۔ اب وہ میری ماں کہاں ہے۔ اگر مجھ کو میری ماں نے چھوڑ دیا ہے تو پھر کس نے ایسا کیا ہے میں اپنے سے اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا کہ میں کسی کے زیر پرورش تھا جو مجھ سے محبت بھی کرتا تھا وہ کونسی ہستی تھی پھر وہی جواب ملا کہ "خدا"

میں نے اپنے دل میں کہا "اس کا وجود ہے"، اک آن واحد کے لیے میں نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ یکبارگی زندگی کی لہر مجھ میں دوڑ گئی اور مجھے زندہ رہنے کے امکانات اور خوشی محسوس ہوئی خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد میں پھر اس کے اور اپنے تعلقات معلوم کرنے لگا، اور پھر میں نے خیال کیا کہ وہ خدا — ہمارا خالق ہے جس نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو نجات دہندہ ہے۔ اور پھر وہی خدا جو مجھ سے اور ساری دنیا سے الگ تھا

برف کے ایک تودے کی طرح پگھل جاتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے ہی پگھل جاتا ہے اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور پھر میرا چشمۂ حیات خشک ہو جاتا ہے اور میں مایوس ہو جاتا ہوں اور اپنے کو ہلاک کرنے کے علاوہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا لیکن سب سے بدترین بات یہ تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔

دو یا تین مرتبہ ہی نہیں بلکہ صدہا دفعہ ایسا ہوا کہ میں ان حالتوں تک پہنچا اول خوشی و زندگی کی اُمید بھرلو ہی اور زندگی کے ناممکنات کا احساس۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ موسم بہار کا آغاز تھا جب کہ میں جنگل میں تن تنہا اُس کے نغمات سے محظوظ ہو رہا تھا جس کے لیے میں مسلسل تین سال ضائع کر چکا تھا۔ میں پھر خدا کو تلاش کر رہا تھا۔

میں نے اپنے دل میں کہا "اچھا تو خدا نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو میرے تخیل میں نہ ہو بلکہ اس کی حقیقت میری زندگی کی طرح ہو۔ اس کا وجود نہیں اور معجزے بھی اس کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ معجزے غیر ناطق ہونے کے علاوہ خود میری سمجھ کے نتیجے ہونگے۔ میں نے خود اپنے ذہن سے دریافت کیا کہ "لیکن میرا خدا کا ادراک، میرا اس ہستی کا ادراک جس کی مجھے جستجو ہے، آخر یہ ادراک کہاں سے آیا" اسی خیال پر میری رگ رگ میں زندگی و مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ میرے آس پاس کی سب چیزوں میں جان آگئی اور وہ بامعنی اور کارآمد نظر آنے لگیں۔ لیکن میری مسرت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ میرے دماغ نے پھر اپنا کام شروع کر دیا

میں نے دل میں سوچا کہ "خدا کا ادراک تو خدا نہیں ہو سکتا اور مجھے تو صرف ادراک ہی ہوتا ہے خدا کے ادراک کا ظاہر کرنا یا ظاہر کرنے سے باز رہنا میرے اختیار میں ہے لیکن مجھے اس کی تلاش نہیں ہے۔ مجھے تو اس شے یا ہستی کی تلاش ہے جس کے بغیر زندگی بیکار بلکہ ناممکن ہے۔ اور پھر میرے آس پاس کی چیزیں فنا ہونے لگیں اور پھر میں نے اپنے کو ہلاک کرنا چاہا۔

لیکن اب میں نے خود اپنے اوپر توجہ کی اور جو میرے دل میں ہو رہا تھا اس پر غور کیا اور میں نے یاد کیا کہ میری زندگی صرف انہی اوقات میں تھی جب کہ مجھے خدا کا یقین تھا۔ جیسی حالت پیشتر تھی وہی حالت اب بھی تھی زندہ رہنے کے لیے مجھے صرف خدا کی معرفت درکار تھی اور مجھے اپنی ہلاکت کے لیے اس کی فراموشی اور بداعتقادی کی ضرورت تھی۔ کسی نے میرے دل میں یہ سوال پیدا کیا کہ "تم اور کیا تلاش کرتے ہو! یہی تو اس کا

دبود ہے۔ اس کی ایسی ہستی ہے جس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا زندہ رہنا۔ خدا کو ماننا ایک ہی بات ہے۔ خدا زندگی ہے۔ تمام زندگی بھر خدا کو تلاش کرتے رہو تب بھی تم کبھی بغیر خدا کے نہیں رہو گے"۔ میرے اردگرد کی تمام چیزیں پیشتر سے زیادہ منور و تاباں ہو گئیں اور پھر یہ روشنی کبھی ضائع نہیں ہوئی۔

میں ہلاکت سے بچ گیا اور مجھے یہ کہتے ہوئے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ قوت حیات جو مجھ کو اب ملی تھی وہ کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ بہت ہی پرانی و فرسودہ میرے بچپن کی چیز تھی جو کہ میرے ایام طفلی میں موجود تھی

میں اسی حالت پر واپس آ گیا جس کا تعلق میری طفلی و شباب سے ہے۔ مجھے اس قوت کا احساس ہو گیا جس نے مجھے پیدا کیا تھا اور جو مجھ سے کسی بات کی طالب تھی۔ اب میرا یہی اعتقاد تھا کہ میرا مقصد حیات صرف یہ ہے کہ اپنے کو بہتر بناؤں یعنی اس ہستی کے منشاء کے مطابق زندگی بسر کروں۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں اس قوت کے احساس کو الفاظ میں ادا کر سکتا ہوں یعنی مجھے خدا پر، اخلاقی تکمیل پر اور ان احادیث اور روایات پر اعتقاد ہے جن سے زندگی کا مطلب و مقصد واضح ہوتا ہے۔

میں اپنے گروہ کی زندگی سے منحرف ہو گیا، میں نے یہ تسلیم کر لیا کہ کوئی زندگی نہیں بلکہ "فریب زندگی" ہے اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ جس افراط و تفریط میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں وہ ہم کو زندگی کے سمجھنے سے باز رکھتے ہیں۔ میرے چاروں طرف بیچارے روس کے مزدور تھے میں نے ان کی جانب توجہ کی اور جو زندگی کو معنی وہ پہناتے تھے میں نے اس پر غور کیا۔ اگر اس معنی کو کوئی الفاظ میں ادا کر سکتا تھا تو وہ یہ ہے:

"ہر شخص اس دنیا میں خدا کی مرضی سے پیدا ہوا ہے اور خدا نے ہر ایک کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ یا تو اپنی روح کو برباد کر دے یا پھر اس کو محفوظ رکھے۔ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی روح کو بچائے۔ اور روح کو محفوظ رکھنے کے لیے لازم ہے کہ وہ "اچھی طرح" زندگی بسر کرے اور "اچھی طرح" رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عیش و عشرت کو لات مار کر محنت و مشقت اختیار کرے، عجز و انکسار سے کام لے۔ تکالیف جھیلے، مصیبتیں اٹھائے اور رحم دل رہے"۔ یہ معنی بہت صاف تھے اور میرے دل کو پسند بھی تھے۔ ہمارے فرقہ سے الگ جن میں میرا بھی شمار تھا۔ لوگوں کے عام اعتقاد کے اس مقصد کے

ساتھ ہی کچھ چیزیں ایسی شامل تھیں جو علیحدہ نہ کی جاسکتی تھیں اور جنہوں نے مجھ کو باغی بنا دیا تھا اور جو میری سمجھ میں خاک بھی نہ آتی تھیں۔ زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت، روزہ و زیارت اور بتوں کی تعظیم و احترام نہ تو لوگ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرسکتے تھے اور نہ خود میں ہی کرسکتا تھا۔ اور جتنی ہی مجھ کو ان سے حیرت تھی اتنا ہی میں ان کو مانتا تھا۔ صبح و شام عبادت کے لیے سر جھکاتا، روزہ رکھتا اور "مقدس عشائے ربانی" حاصل کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ پہلے پہل میری دلیل نے کسی بات کو رد نہیں کیا جو مجھ کو بیشتر ناممکن نظر آتا تھا اب اس نے میرے لیے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ دویم میں نے یہ سمجھ لیا کہ ہر اعتقاد کا جوہر یہ ہے کہ زندگی کو ایسے معنی پہنانے چاہئیں جو موت سے بھی مٹائے نہ جاسکیں فطرتاً اعتقاد کو ان سوالات کا جواب دینے کے لیے عیش و عشرت میں بادشاہ کا مرنا، کام کی زیادتی سے ایک ضعیف و ناتواں غلام کا دکھ سہنا اور ہر قسم کے لوگوں کے بارے میں خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان، دانا ہوں یا نادان اس کے جواب لازمی طور سے مختلف پیرایہ کے ہونے چاہئیں لیکن یہ دلیل جو کہ میری نظروں میں مذہب کے شرعی پہلو کی اجنبیت کو دور کررہی ہے۔ زندگی کے ایک بڑے معرکہ۔ مذہب ۔ میں مجھ سے وہ افعال کرانے کے لیے جن کو میں قابل اعتراض سمجھتا ہوں تیار کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ میری یہ دلی تمنا تھی کہ سب لوگوں سے مل جل کر رہوں ان کے مذہب کے شرعی پہلو کی تعمیل کرتا رہوں لیکن میں یہ نہ کرسکا میں نے محسوس کیا کہ اگر مجھے ایسا کرنا ہی ہے تو مجھے اپنے کو فریب دینا ہوگا اور مجھے ان باتوں کا مضحکہ اڑانا پڑیگا۔ جن کو میں قابل احترام سمجھتا تھا۔ بہرحال اس موقع پر ہمارے نئے مذہبی روسی مصنفوں نے میری بڑی مدد کی۔

ان علماء کی تشریح کے بموجب ہمارے اعتقاد کی اصلی تعلیم یہ ہے کہ "چرچ" (جماعت) بے عیب ہے اس اصول کو تسلیم کرتے ہی ان تمام عقائد کو ماننا پڑتا ہے جن کا کہ "چرچ" (جماعت) پرچار کرتا ہے اب میرا یہ اعتقاد ہوگا کہ جماعت اور سچے معتقدوں کا ایک گروہ ہے جو کہ رشتۂ محبت میں منسلک ہیں اس لیے جو وہ فرماتے ہیں بجا و درست ہے۔ میں نے سوچا کہ اصلی حقیقت کسی خاص شخص کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ یہ اس پورے گروہ پر روشن ہے کہ وہ سب محبت میں منسلک ہیں۔ اصلیت معلوم کرنے کے لیے کسی کو جدا

نہیں ہونا چاہیے اور جُدا نہ ہونے کے لیے یہ لازمی ہے کہ محبت کی جائے اور وہ باتیں برداشت کی جائیں جن کو کہ وہ ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔

حقیقت خود محبت میں ظاہر ہوتی ہے اگر تم جماعت کے اصولوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ تم محبت کی حد سے باہر ہو جاتے ہو اور محبت کی حد سے باہر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تم خود اپنے کو حقیقت کے پہچاننے سے قاصر رکھتے ہو۔ تب ہی نے اس دلیل میں کوئی کج بحثی تصور نہیں کی میں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ محبت ہیں وصال سب سے زیادہ محبت پیدا کر سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیسین کریڈ (Nicene Creed) کے الفاظ میں اصلی حقیقت کا انکشاف نہیں ہو سکتا میں یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ محبت خود کوئی ایسا اظہار نہیں کر سکتی جس میں احسانمندانہ وصال کی کیفیت ہو۔ میں نے اس دلیل میں یہ غلطیاں نہیں دیکھی تھیں اور شکر ہے کہ میں بلا سمجھے بوجھے پکی ایماندار جماعت کے اصول ماننے لگا تھا اور اُن پر عمل بھی کرنے لگا تھا۔

جب جماعت کے اصولوں کی تعمیل کرنے میں میں نے اپنی دلیلوں کو اہمیت نہ دی، اور احادیث وروایات کا معتقد ہو گیا اور اپنے آبا و اجداد کی پیروی کرنے لگا تو مجھ کو ماں، باپ، دادا، دادی اور نانا و نانی سے محبت ہو گئی اور میں ان لاکھوں آدمیوں سے بھی محبت کرنے لگا، جن کی میں عزت و وقعت کرتا تھا جب میں علی الصباح عبادت کے لیے اٹھتا تھا تو میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں بڑا ہی نیک کام کر رہا ہوں کیونکہ میں اپنے دماغی تکبر کو مٹانے کے لیے جسمانی آسائش کا ایثار کرتا تھا اور یہ سب اس لیے کہ میں زندگی کا مفہوم سمجھنے کے لیے بیقرار تھا۔ چاہے یہ ایثار کتنے ہی معمولی ہوں لیکن میں ان کو بہتری کے حاصل کرنے کے لیے کرتا تھا میں روزہ رکھتا، جماعت کے لیے تیار ہوتا، اور مکان و گرجا گھر دونوں جگہوں کی عبادت کے اوقات کا بہت ہی لحاظ رکھتا تھا۔ گرجا گھر کی عبادت کے درمیان میں ہر لفظ پر اچھی طرح توجہ دیتا اور جہاں کہیں ہو سکتا تھا میں اُن کو معنی پہناتا۔

لیکن ان اصولوں سے بھی معنی کے اخذ کرنے کی حد تھی۔ اگر میں نے طسار اور اس کے عزیز و اقارب کے بار بار اعادہ کی خود اپنے لیے اس طرح تشریح کی کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے آزمائش کے جلد شکار ہو جانیوالوں

میں سے تھے اس لیے وہ لوگ دعا کے زیادہ مستحق تھے اور دعا یہ تھی کہ "اس کے مخالف و دشمن سب کو شکست ہو" (حالانکہ کسی نے یہ کبھی کی بھی جرأت کی ہے کہ وہ دشمن جس کی شکست کی دعا کی جاتی ہے وہ گناہ ہے)۔ اور ایسی ہی بہت سی نافہم دعائیں تھیں تقریباً تمام عبادت کا دو تہائی حصہ ایسا ہی تھا۔ یا تو یہ بالکل میری سمجھ سے باہر تھا یا پھر جب میں ان کی تشریح کرنے کی کوشش کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور اس طرح سے میں اپنے سارے تعلقات کو جو کہ خدا سے تھے برباد کر رہا تھا اور اپنے اعتقاد کو کمزور کر رہا تھا

میں اس تکلیف دہ احساس کا تجربہ جو مجھے اس دن ہوا جبکہ میں نے سالہا سال کے بعد پہلی مرتبہ عشائے ربانی اپنے ہاتھوں میں لیا تھا کبھی نہیں بھول سکتا۔ عبادت، اقوال اور دعائیں بالکل قابل فہم تھیں اور مجھ میں ایک زبردست خوشی کا یہ احساس پیدا کر دیا کہ مجھ پر آج زندگی کے مفہوم کا انکشاف ہو رہا ہے۔ اتحاد و یکجہتی کو میں حضرت مسیحؑ کی یاد میں ایک کام سمجھتا تھا اور وہ اس بات کی سند تھی کہ تزکیہ نفس اور گناہوں سے رستگاری ہو گئی ہے اور حضرت مسیح کی مکمل تعلیم کا اقرار بھی یہی ہے۔ اگر یہ تشریح مصنوعی تھی تو میں نے اس کی مصنوعیت پہ توجہ نہیں دی۔ گرجا گھر کے پادری کے سامنے عاجزی اور انکساری کرنے میں مجھ کو بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی وہ نہ بہت ہی سیدھا سادہ اور کمزور طبیعت کا دیہاتی پادری تھا اپنے گناہوں کا اقرار کر کے تمام آلائشوں سے روح کو پاک کرنے میں اور دعائیں لکھنے والے "باپوں" کی انکساری کے خیال میں محو ہو جانے میں مجھ کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ جو ایمان لا چکے تھے اور جو اب ایمان لا رہے تھے ان سب سے مل کر اتنی خوشی حاصل ہوتی تھی کہ میں اپنی تشریح کی بناوٹ پر غور نہ کر سکا لیکن جب میں "قربان گاہ" کے پھاٹک پر پہنچتا تھا اور پادری مجھ سے یہ کہلاتا تھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نگلنے والا تھا وہ حقیقۃً گوشت اور خون تھا اور اس وقت میرے دل کو سخت کوفت ہوتی کیونکہ وہ صرف غلط ہی نہ تھا بلکہ یہ ان لوگوں سے سخت مطالبہ تھا جو کہ ظاہراً اعتقاد سے قطعی ناواقف تھے۔

میں اب اپنے کو یہ کہنے کی اجازت دیتا ہوں کہ وہ ایک سخت مطالبہ تھا لیکن اس وقت میں نے ایسا خیال نہ کیا تھا مگر وہ ایک غیر مرئی شے کی طرح میرے لیے سوہان روح تھا۔ اس وقت میں نے اپنی روح میں ایک احساس پایا جس نے یہ برداشت کرنے میں مجھے مدد دی۔ یہ ذاتی عاجزی و انکساری

تھی۔ میں اپنے کو کمتر حقیر سمجھتا تھا اور بلا کلمہ کفر بکے ہوئے "گوشت و خون" کھا جاتا تھا۔ اور یہ کام بڑے ہی حسن اعتقاد سے کرتا تھا لیکن وہ مرحلہ پہنچ چکا تھا اور یہ جانتے ہوئے کہ میرا کیا انجام ہونے والا ہے میں ایسی حرکت دوبارہ نہ کر سکا۔

میں برابر مذہبی اصولوں کی تعمیل کرتا رہا اور اب تک یہی یقین کرتا رہا کہ جن حقائق پر میں عمل پیرا ہوں اُن ہی میں صداقت ہے، جب مجھ پر یہ واقعہ گذرا جس کو میں اب خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں لیکن اس وقت صرف حیرت انگیز اور باعث تعجب معلوم ہوتا تھا۔

میں ایک جاہل کاشتکار و حاجی کی گفتگو سن رہا تھا جس کے موضوع خدا، اعتقاد، زندگی اور نجات تھے۔ اسی وقت خود مجھ پر علم عقیدہ کا انکشاف ہوا۔ میں ان لوگوں کے نزدیک آگیا۔ زندگی اور عقیدہ کے متعلق ان کی گفتگو سن کر میں حقیقت کو سمجھ گیا یہی حال اُس وقت ہوا جبکہ میں نے ایماندار لوگوں کی سوانح عمریاں پڑھیں۔ ان ہی کتابوں سے مجھ کو دلچسپی بھی تھی معجزات کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اُن کو محض خیالات ظاہر کرنے والی کہانیوں سے زیادہ وقعت نہ دیتے ہوئے بھی اس مطالعہ سے زندگی کا مفہوم صاف ظاہر ہو گیا۔ اس میں مکاریس اعظم، [illegible] جو [illegible] کی سوانح حیات تھیں۔ گوتم بدھ کی سوانح اور اس کنویں والے مسافر اور [illegible] فقیر کی بھی کہانیاں تھیں جس نے سونا پایا تھا۔ اس میں شہیدوں کے قصے تھے ان سب سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ موت سے زندگی الگ نہیں ہے اور ان ہی جاہلوں و ناداں لوگوں کی بھی کہانیاں تھیں اور کچھ ایسے لوگوں کے بھی قصے تھے جو کلیسا کی مذہبی تعلیم سے [illegible] تھے لیکن پھر بھی بچ گئے تھے۔

لیکن جیسے ہی میں پڑھے لکھے قابل معتقدوں سے ملا اور میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو میں خود شبہ، بے اطمینانی اور پریشان کن بحث میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جتنی زیادہ میں ان لوگوں کی تقاریر کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی میں حقیقت سے دور ہوتا جاتا تھا۔ اور ایک عمیق غار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ مجھ کو اکثر کسانوں پر اور اُن کی جہالت اور لاعلمی پر رشک ہوتا تھا۔ مذہب کے وہ اصول جو میرے نزدیک فضول و بیکار تھے ان کے لیے اس میں شک و شبہ کی بھی گنجائش نہ تھی میں جو کہ ایک افسردہ انسان تھا

یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کذب و صداقت نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور یہ کہ میں اس حالت کو کسی صورت سے بھی ماننے کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا۔

اسی کشمکش و پیچ میں میرے تین سال گذر گئے۔ پہلے پہل جب کہ میں کچھ بھی نہ سمجھتا تھا میں یہ کہا کرتا تھا کہ "یہ میرا ہی قصور ہے، میں خود گنہگار ہوں" لیکن میں نے حقیقت کی جتنی تحقیق کی اتنی ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ میں بہت سی باتیں محض اس لیے نہ سمجھ سکا کہ میں اُن کے سمجھنے کے قابل نہ تھا اور جو بغیر خود سے جھوٹ بولے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

شکوک اور مصیبتیں ہونے کے باوجود میں پکا ایماندار ہی بنا رہا لیکن زندگی کے متعلق سوالات برابر پیدا ہوتے رہے جن کو طے کرنا ضروری تھا اور ان سوالات کے جواب جو مذہب سے ملتے تھے وہ میرے ان اعتقادات کے بالکل برعکس تھے جن پر میرا دارومدار تھا۔ انہوں نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ میں اس بات کا قائل ہو جاؤں کہ پکی ایمانداری قطعی ناممکن ہے۔ یہ سوالات یوں تھے۔ پہلا سوال مشرقی کٹر جماعت کا تعلق دوسری جماعتوں سے اور کیتھولک کا تعلق فرقہ وارانہ جماعت سے۔ اس وقت مذہبی دلچسپی کی وجہ سے مجھے مختلف قسم کے معتقد لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا مثلاً کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور پرانے معتقد وغیرہ دوسرے لوگ، اور میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملا جن کا اخلاق نہایت ہی اعلیٰ و وسیع تھا اور وہ صحیح معنوں میں مذہبی تھے۔ میں اُن کا بھائی بن کر رہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ تعلیم جس نے اس بات کا وعدہ بلکہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ سب کو ایک اعتقاد کا پیرو اور محبت کا شیدا بنا دیگی اس کے بہترین پیروکاروں کی وہی تعلیم مجھے یہ تبلاتی تھی کہ یہ سب ایک بے معنی اور بے لطف زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ ایک شیطانی وسوسہ ہے اور ہم میں خود اصلی صداقت موجود ہے۔ اور میں نے معلوم کیا کہ جن لوگوں کے اعتقاد اس قسم کے نہ تھے ان کو کٹر مذہبی لوگ کافر و مرتد تصور کرتے تھے بالکل اسی طرح جس طرح کیتھولک مذہب والے کٹر ایمانداروں کو کافر و گمراہ خیال کرتے ہیں۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ کٹر مذہبی لوگ (جو اس بات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں) ان لوگوں کو بُری بلکہ مخالفانہ نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے اعتقاد ان کی طرح ظاہری الفاظ و استعاروں میں ظاہر نہ کرتے ہوں اور یہ فطری بات ہے کہ سب سے پہلے اس بات کا یقین

ہی کہ دوسرا غلطی پر ہے، میں صحیح راستہ پر ہوں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات ہے جو کہ ایک شخص کسی دوسرے کے بارے میں کہہ سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ شخص جو اپنے بچوں اور بھائیوں سے محبت کرتا ہے وہ ان لوگوں کا مخالف ہو جائیگا جو کہ اس کے بچوں اور بھائیوں کے اعتقاد کو متزلزل کرینگے۔ اور میرے نزدیک جس کا نظریہ یہ تھا کہ حقیقت محبت ہی میں ہے اعتقاد خود اسی چیز کو ضائع و برباد کر رہا ہے جو کہ اس کو پیدا کرنا چاہیے۔

جس طرح مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی نفرت انگیز اور خود اعتمادی کی طرح کا برتاؤ کرتے ہیں اس قسم کے طور طریق کی غلطی صاف ظاہر تھی میں نے اس مسئلہ پر بڑا ہی غور کیا اور اس کے متعلق جو کچھ مجھے مل سکا میں نے سب پڑھا اور جس جس سے ہو سکا میں نے اُس سے مشورہ بھی کیا اور اس کی رائے بھی لی لیکن کسی نے بھی اس کو واضح نہ کیا۔ اور نہ کسی کے جواب سے مجھے تسکین ہوئی۔ میں ان بزرگوں اور درویشوں کے پاس جو کہ سخت قسم کے دستوروں کے پابند تھے گیا، اور ان سے دریافت کیا لیکن کسی نے بھی اس مسئلہ کو مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کی سوائے ایک شخص کے جس نے اس کو اچھی طرح واضح کر دیا اور اس کو اس طرح واضح کیا کہ پھر مجھے کبھی کسی سے اس کے متعلق اور زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ ہم کو ان خاص اصولوں پر کیوں نہ متحد ہونا چاہیے۔ جن کو ہم سب تسلیم کر سکتے ہیں اور باقی کو ہر ایک کے لیے چھوڑ دیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے طے کرے۔ میرا معلم روحانی میرا ہم خیال ہو گیا لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ ایسے مراعات روحانی حاکموں کے لیے باعث بدنامی ہونگے کہ وہ آباواجداد کے اصولوں کو ترک کر دیں اور اس سے تفرقہ پڑ جانے کا خوف ہے اس لیے روحانی حاکم کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی اصلیت یعنی روسی و یونانی پکے مذہبی عقیدہ کی حفاظت کریں جس کو ہم نے اپنے آباواجداد سے حاصل کیا ہے۔

میں یہ بھی سمجھ گیا کہ مجھے اعتقاد یعنی قوت حیات کی جستجو ہے اور ان کو ایسے اعلیٰ و بہترین طریقہ کی تلاش ہے جس سے وہ لوگوں کے سامنے انسانی احسانات کو پورا کر سکیں اور میں دیکھتا تھا کہ مذہب کے پردہ میں کیا کیا کیا جا رہا ہے اور اس سے خائف تھا اور میں پکی ایمانداری سے تقریباً بالکل منحرف ہو گیا۔

مذہبی جماعت کا زندگی کے سوال سے دوسرا تعلق جنگ و قتل کے متعلق تھا۔

اس وقت روس میں جنگ ہو رہی تھی اور روسی مذہبی محبت کے جوش میں اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرنے لگے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اس کا خیال نہ کیا جاتا اور یہ نہ سمجھا جاتا کہ جان لینا برا ہے کیونکہ یہ ہر اعتقاد کے اولین اصولوں ہی کے خلاف ہے اس پر بھی گرجا گھروں میں فتح و کامرانی کی دعائیں مانگتے تھے مذہب کے اصولوں کا پرچار کرنے والے اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ جان لینا بھی اعتقاد ہی کا نتیجہ ہے میں نے جنگ کے دوران کے علاوہ جنگ کے بعد کی گڑبڑی کے دوران میں بھی قتل و خون دیکھا اور میں نے یہ دیکھا کہ مذہب کی ارفع و اعلیٰ ہستیاں معلم اور معمولی و اعلیٰ اصولوں پر عمل کرنے والے درویش مجبور اور بے قصور و بیگناہ نوجوانوں کے قتل کو بہتر تصور کرتے تھے اور میں نے ان تمام باتوں پر غور کیا جو مسیحی مذہب کے شیدائیوں نے کی تھیں اور میں اُن سے خائف تھا۔

میرے شکوک رفع ہو گئے اور مجھے کامل یقین ہو گیا کہ جس مذہب میں میں داخل ہوا ہوں اُس کی ہر ایک بات درست نہ تھی۔ پہلے تو مجھ کو یہی کہنا چاہیے کہ وہ سب جھوٹ تھا لیکن ابھی میں ایسا نہ کہہ سکتا تھا کیونکہ مجھے ان حقائق کا احساس تھا جن کی وجہ سے میں اب تک زندہ رہا لیکن میرے لیے اس میں تو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ اس کا بیشتر حصہ غلط ہے۔ حالانکہ کسانوں میں ان لغویات کی کمی تھی جن سے مجھے نفرت تھی پھر بھی میں دیکھتا تھا کہ ان کے اعتقاد میں بھی کذب و صداقت ملے ہوئے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کذب و صداقت آئے کہاں سے؟ جھوٹ اور سچ دونوں احادیث اور صحیح روایات انجیل میں پائے جاتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ دونوں ہم کو مذہب سے ملے ہیں۔

چاہے مجھ کو یہ پسند ہو یا ناپسند لیکن میں ان روایات اور کتابوں کے مطالعہ اور تحقیق کرنے پر مجبور تھا۔ جن کی جانچ کرنے سے میں ابھی تک ڈرتا تھا۔

اب میں اس علم الٰہی کی جانچ کرنے پر تلا ہوا تھا جس کو میں نے کبھی نفرت سے رد کر دیا تھا جس پر مذہبی اصولوں کی بنیاد ہے یا کم از کم زندگی کے مفہوم کا وہ علم جو میں نے معلوم کیا تھا اسی سے وابستہ ہے مجھے ہر بات کی تشریح و تفسیر نہیں معلوم کرنا چاہیے میں جانتا ہوں کہ ہر ایک چیز کی تشریح اس کے آغاز کی طرح بے پایانی میں مضمر ہے لیکن میں یہاں تک معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر کار مجھ کو ایسی شے معلوم ہو جس کی تشریح

ہی نہ ہو سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ اس لیے نہیں کہ میرے دلائل کے مطالبے غلط ہیں (وہ ٹھیک ہیں اور ان کے علاوہ میں کوئی دوسری بات سمجھ ہی نہ سکتا تھا) بلکہ اس لیے کہ میں اپنے ذہن کی رسائی جانتا ہوں میں اس طرح سمجھنا چاہتا ہوں کہ جو بات غیر مشرح ہو وہ میرے سامنے بالکل صاف ہو جائے کہ واقعی وہ غیر مشرح ہے وہ اس طرح طاہر نہ ہو کہ میں ظاہری تکلف میں اس پر یقین کرنے لگوں۔ مجھے حقیقت و مجاز میں تمیز ہونی چاہیے تاکہ میں ان کو ایک دوسرے سے الگ کر سکوں میں یہ کام شروع کرنے والا ہوں کہ یہ معلوم کروں کہ اس تعلیم میں کتنا کذب اور کتنی صداقت ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ میں کن نتائج پر پہنچتا ہوں۔ یہ سب اس کام کے جز ہونگے اگر ان کی کوئی قدر و قیمت ہے اور اگر کوئی شخص ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے تو کسی نہ کسی دن ان کی ضرور اشاعت کی جائیگی"۔

جگر پارے

(از حضرتِ جگر مرادآبادی)

پھرتے ہیں دور دور بہت شادماں سو کیا
واقف نہیں ابھی وہ غمِ ناگہاں سو کیا

جب تم نہیں تو فائدہ آہ و فغاں سو کیا
روئیں لپٹ لپٹ کے دلِ ناتواں سو کیا

پردہ نہیں تو لطفِ غمِ جاوداں سو کیا
پردہ اٹھائے دستِ طلب درمیاں سو کیا

دل ہی نہیں تو کامِ غمِ جاوداں سو کیا
غم ہی نہیں تو واسطہ عمرِ رواں سو کیا

غم کیا ملا کہ دولتِ کونین مل گئی
ہٹتے ہیں اب یہ ہاتھ دل ناتواں سو کیا

بجاؤ فرق تا بقدم اپنی خود صدا
شرح و بیانِ عشق نگاہ و زباں سے کیا

چہرہ بھی زرد زرد نظر بھی اُداس اُداس
یہ حال ہو تو فائدہ ضبطِ فغاں سو کیا

سر دادگانِ عشق کہاں دردِ سر کہاں
سر ہی نہیں تو کام سرِ آستاں سو کیا

صیاد و برق ہی کی توجہ نہیں تو پھر
مجھ کو حصول خار و خس آشیاں سو کیا

پیشِ نگاہِ شوق ہے خود حسن بے جہت
اب جی لگائیں جلوۂ حسنِ بتاں سو کیا

جان و جہاں نثار کرا زاول قدم
اے بوالہوس معاملہ جان و جہاں سو کیا

مانا غرورِ حسن بھی اک چیز ہے مگر
اتنے بھی دور دور ترے آستاں سے کیا

غم شاد شاد حسن سراپا حزیں حزیں
اب یہ نظر ملے نظرِ عاشقاں سو کیا

سُن سُن کے طعن بے اثری ہر نفس کے ساتھ
کھائیں فریب لذتِ دردِ نہاں سے کیا

یہ کوچۂ حبیب ہے۔ دیر و حرم نہیں
لیجائے کوئی جان سلامت یہاں سے کیا

جس سے ہے جو معاملہ وہ خود ہی جان لے
مجھ کو غرض حسابِ دلِ دوستاں سے کیا

لذت کشِ جفائے ستم ہائے دوست ہوں
دل سیر ہو سکے ستمِ دو جہاں سے کیا

خود حُسن کی زبان ہو اور داستانِ عشق
اپنا بیانِ درد، خود اپنی زباں سے کیا

پوچھے یہ کوئی اُس بُتِ ظاہر فریب سے
مجھ سے نہیں تو اُنس مری داستاں سے کیا

پابندگانِ عشق ہیں آزادگانِ عشق
نسبت ہی اُن کو واسطۂ درمیاں سے کیا

مُطربِ مزاج دانِ محبت نہیں جگر
نغمہ یہ اُس نے چھیڑ دیا درمیاں سے کیا

(غیر مطبوعہ)

اسلامی نظام

(۲)

اپریل کے رسالہ جامعہ میں عنوان بالا سے میرا جو مضمون شائع ہوا ہے اُس کے متعلق بعض لوگوں نے زبانی اور بعض لوگوں نے بذریعہ تحریر.. مختلف قسم کے سوالات کیے۔ جن سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ توضیح طلب ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اُن میں سے معقول سوالات کو چُن کر ترتیب کے ساتھ مع اُن کے جوابات کے لکھوں تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(۱)

س۔ تم کہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک پیغمبری جس کے ذریعے سے قرآن ملا۔ دوسری امامت یعنی ملّت کی مرکزیت جو آپ کی ذات سے قائم ہوئی اتباع قرآن کی شرعی حیثیت مسلم ہے مگر مرکز تو ایک دنیاوی ادارہ ہے۔ اگر نہ ہو جیسا کہ آج کل ہے تو اس سے مسلمانوں کے اسلام میں کیا خرابی آتی ہے۔

ج۔ بلا مرکز کے ملّت کے مقاصد متعین نہیں ہوتے اور نہ اس میں اجتماعی عمل صالح کی حرکت پیدا ہوتی بلکہ وہ بیابان کے ریگ کے ذروں کی طرح منتشر رہتی ہے جو ہر ہوا اور آندھی کے ساتھ جدھر کی بھی ہوا اُڑتی رہتی ہے۔ قرآن امت کا ایمان ہے اور مرکز اس کا اجتماعی عمل۔

قرآن میں اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت کے احکام جو مسلمانوں کو دیے گیے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مرکز کی حیثیت بھی شرعی ہے اور وہ محض دنیاوی ادارہ نہیں ہے۔ ملّت امام کے بغیر ایسی ہی ہے جیسے جسم سر کے بغیر جس کا انجام ہلاکت ہے۔

(۲)

س۔ اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت بلا مرکز کے بھی اس طرح ہو سکتی ہے کہ قرآن و سنت و علماء کی اطاعت کی جائے جیسی کہ آج کل ہم کر رہے ہیں۔

ج۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں کہ باوجود اپنی کثرت تعداد کے اور باوجود عالم میں اپنی زبردست جغرافی حیثیت کے اور باوجود اس کے کہ اسلام میں تمامتر بہادر اور جنگ آور قومیں داخل ہیں جن کے پس پشت عظیم الشان تاریخیں ہیں پھر بھی دوسروں سے کمزور اور ذلیل وخوار ہیں بلکہ اُمت کا بیشتر حصہ شرک اور کفر کا محکوم اور غلام ہے جو اسلام کا جزو صالح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے زندہ مرکز نہ ہونے کا۔ اللہ ورسول کی اطاعت کے لیے قرآن وحدیث کو لے لیا کہ جس طرح چاہیں اُن پر عمل کریں یا نہ بھی عمل کریں تو اطاعت کا مطالبہ کرنے والا کون ہے۔ رہے علما تو اُن کا حلقۂ اثر محدود ہوتا ہے جس سے مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ علاوہ بریں وہ خود اکثر آپس کی مخالفتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق میں مبتلا رہتے ہیں اور اُمت میں اور زیادہ تفریق وانتشار کا موجب ہوتے ہیں۔ اللہ ورسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جو ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اُمت کو اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔

(۳)

س۔ تم نے اللہ ورسول کا مفہوم امام وقت ثابت کیا ہے لیکن علما راس کے معنے کتاب وسنت کے سمجھتے ہیں۔ کیا اللہ کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ان دو لفظوں کے بجائے صرف ایک لفظ امام کہہ دیتا تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

ج۔ قرآنی الفاظ مقصود کے مطابق ہوتے ہیں۔ صرف امام کا لفظ کہنے سے اسلامی مرکز کا صحیح مفہوم نہیں ادا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ امام کہتے ہیں پیشرو اور راہبر کو خواہ کسی قسم کا ہو۔ لغوی معنی کے لحاظ سے آج ہٹلر بھی جرمن قوم کا امام ہے لیکن اللہ کو بیان کرنا مقصود ہے اس امام کا جو قرآنی احکام کو نافذ کرنے والا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امامت کا چلانے والا ہو۔ یہ مفہوم صرف اللہ ورسول ہی کے لفظ سے ادا ہو سکتا تھا جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسی کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔

(۴)

س۔ پھر بھی یہ بات حل طلب رہی کہ علمانے اللہ ورسول سے مرکز ملت کیوں نہ سمجھا۔

ج۔ میں نے اپنے مضمون میں ایسے مفسروں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے اللہ و رسول سے امام وقت ہی سمجھا ہے بے شک عرصۂ دراز سے استبداد کے تسلط اور جامد تقلید نے علماء کے زاویہائے نگاہ بدل دیے ہیں۔ وہ دین اسی کو سمجھتے ہیں کہ کتاب و سنت بلکہ ائمہ کی فقہ پر عمل کرتے رہیں۔ حالانکہ اس سے اجتماعی زندگی نہیں پیدا ہو سکتی۔ حیات ملی کے لیے قرآن کے ساتھ زندہ امام کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

(۵)

ایک سُنّی مولانا نے کہا کہ کیا ضمانت ہے کہ امام وقت غلطی نہ کریگا۔

ج۔ کیا آپ کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما معصوم تھے؟ اگر نہیں تھے تو ان کو خلیفۂ رسول بناتے وقت یہ سوال اُمت نے کیوں نہیں اُٹھایا؟

گو یہ جواب الزامی ہے تحقیقی جواب یہ ہے کہ غلط اور صحیح کے جو معنی عرف عام میں ہیں کہ جو حقیقت کے خلاف ہو وہ غلط ہے اور جو حقیقت کے مطابق ہو وہ صحیح ہے وہ نظام حکومت اور قانون عدالت میں نہیں ہیں۔ یہاں غلط وہ ہے جو بے ضابطہ ہو اور صحیح وہ ہے جو باضابطہ ہو۔ ہمارے اصولیین نے بھی یہی لکھا ہے کہ قاضی اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ اسلامی قوانین و ضوابط کے مطابق کر دے تو چاہے وہ حقیقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ ہوگا۔ بلکہ بعض نے تو کہا ہے کہ "القضاء نافذ شرعاً و دیانۃً" یعنی نہ صرف شرعاً بلکہ اللہ کے نزدیک بھی۔

ظاہر ہے کہ امام امت کا قابل ترین فرد یا بہترین شخصوں میں سے ایک ہوگا جس کے ساتھ قرآن کی روشنی اور مشورہ کے لیے منتخب جماعت بھی ہوگی۔ پھر ساری اُمت کے ارباب علم و عقل بھی اصلاح کا خیال رکھینگے۔ ان سب کے بعد بے ضابطگی تو ہو ہی نہیں سکتی اور عرفی غلطی کا بھی خطرہ کم رہ جاتا ہے۔

علاوہ بریں غلطی سے اس قدر خوف کیوں ہے۔ فطرت نے اس کو انسان کی سرشت میں اس واسطے رکھا ہے کہ وہ زیادہ چوکنا ہوشیار اور خبردار رہے۔ اس لیے وہ انسان کی ترقی میں معاون ہے اور قصداً نہ ہو تو اس سے جس قدر نقصان ہو جاتا ہے بعض حالتوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچتا ہے۔ اور غلطیاں کر کر کے ہی لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

(۶)

یک شیعہ بزرگ نے فرمایا کہ مسئلہ امامت میں تم اسی نقطہ پر آگئے جو ہماری جماعت کا ہے مگر یہ واضح نہیں ہوا کہ امام منصوص ہونا چاہیے جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے یا جمہوری جیسا کہ سُنی کہتے ہیں۔

ج۔ میں کسی فرقہ بندی کا قائل نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے بلا خیال شیعہ یا سُنی کے خالص قرآنی تعلیم کو لکھا ہے۔ میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ قرآن جو تمام مسلمانوں کی دینی کتاب ہے اور سب کے سب بلا استثنا اس پر ایمان رکھتے ہیں اس کی روشنی میں حسب اقتضائے زمانہ و ضرورت ملت کو چلائے اور ان سے اطاعت لینے کے لیے زندہ امام ناگزیر ہے۔ اور بلا اس کے امت کی اجتماعی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔

رہا امام منصوص کا عقیدہ تو اس کا ثبوت قرآن سے نہیں ملتا۔ اس لیے میں امام متفق علیہ کا قائل ہوں یعنی جس پر جمہور امت اتفاق کرلے۔ شرط یہی ہے کہ وہ قرآن کا تابع ہو اور شوریٰ سے کام کرے۔

(۷)

اُنہوں نے پھر سوال کیا کہ متغلب بھی امام ہو سکتا ہے؟ اور خلفاء بنی اُمیہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ج۔ میں کہہ چکا ہوں کہ امام وہ ہے کہ جو قرآن اور اُمت کے شوریٰ کے مطابق کام کرے۔ تغلب بھی اُمت کی شرکت ہی سے ہوتا ہے۔ اس لیے متغلب بھی امام ہو سکتا ہے بشرطیکہ ملت کا اس پر اتفاق ہو جائے۔

خلفاء بنی اُمیہ میں استبداد تھا اور وہ مسلمانوں کے بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے اس لیے وہ دنیاوی بادشاہ تھے نہ کہ امام بجز حضرتِ عمر بن عبد العزیز کے۔

(۸)

س۔ کیا ایک زمانہ میں کئی امام ہو سکتے ہیں؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے نیز اس سے ملت کی وحدت فنا ہو جائیگی۔ ہاں امام وقت کے ماتحت مختلف اقوام و ممالک میں ہزاروں امام بیک وقت ہو سکتے ہیں۔ یہ قرآنی اصطلاح کے مطابق اولوا الامر کہے جائینگے۔

(۹)

س۔ موجودہ زمانہ میں امامت نصب کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ج - آج کل ملت کا صرف ۱/۱۰ حصہ آزاد ہے اور ۹/۱۰ غیروں کا محکوم۔ نصب امام آزاد مسلم قوموں کا فریضہ ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ان کا رُخ بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرکز قائم کریں۔

(۱۰)

س - ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس صیغہ میں کیا کرنا چاہیے۔ اور امام نہ رکھنے کی وجہ سے تم ہم کو مسلمان بھی سمجھتے ہو یا نہیں ؟

ج - یہ تو ظاہر ہے کہ ہم محکوم ہیں اور ہمارے اوپر وہ قوانین نافذ ہیں جو حکمراں قوم نے بنائے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم یہی کرسکتے ہیں کہ باہمی اختلافات کو چھوڑ کر قرآن کی طرف آئیں اور وحدت عمل پیدا کریں۔ اور چاہے ہم میں کتنی ہی جماعتیں اور جمعیتیں ہوں لیکن ایک مرکزی انجمن جو آئین کے ماتحت ہو متفقہ طور پر تمام ملت کے لیے ضروری ہے جس کا رکن ہر ہندی مسلم کو ہونا چاہیے۔ ملت کے اس باہمی ربط سے آئندہ کے لیے راستے کھلینگے۔

باقی رہا ہندوستان کے مسلمانوں کے اسلام یا کفر کا سوال تو میں اس قسم کے فتوؤں کو ناروا جرأت سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہاں جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے وہ مسلمان ہے اور جو نہ کہے وہ نہیں ہے میں خود بھی ہندوستان ہی کی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والی جماعت کا فرد ہوں۔ جو سب کا حال ہو وہی میرا حال ہے۔

وَمَا أَنَا إِلَّا مِنْ غَزِيَّةَ - إِنْ غَوَتْ
غَوَيْتُ - وَإِنْ تَرْشُدْ غَزِيَّةُ أَرْشُدِ

روزِ جزا

(ایک ڈرامہ)

پہلا ایکٹ

[عدالتِ عالیہ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ڈائس پر پانچوں جج ہیں۔ بیچ میں ولورا ہے۔ اس کے دائیں طرف سانکو اور ترزادا ہیں اور بائیں طرف مورسی اور سلاترسکی۔ ڈائس کے دائیں جانب، سرکاری وکیل ولف گینگ ہتھوری اور اس کے نائب مالینو اور ایک کلرک ہے۔ بائیں جانب ملزم اور ان کے وکیل ہیں۔ پہلی قطار میں ستامبلو، منج اور رشاطی ہیں۔ دوسری قطار میں جارج خیتو، لاڈیا کمان۔ ان کے دونوں طرف سنتری کھڑے ہیں تیسری قطار میں دو سنتریوں کے درمیان کرٹ شنڈر ہے۔ کمرہ کے ہر دروازہ پر ایک مسلح سپاہی کھڑا ہے۔ کرسیوں پر گواہ اور تماشائی بیٹھے ہیں۔

پردہ اُٹھنے پر عدالت میں ہلچل سی دکھائی دیتی ہے جارج کھڑا چلا رہا ہے اس کا وکیل ستامبلو کھڑے ہو کر اس کو بٹھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ رشمیر اور کھیریا دونوں سنتری بھی اسے خاموش کرا رہے ہیں۔ جج ولورا کھڑا ہو کر بار بار گھنٹی بجا رہا ہے ادھر سرکاری وکیل مطالبہ کر رہا ہے کہ جارج کو چپ کرایا جائے۔ باقی لوگ جج، گواہ اور تماشائی ـــ حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں صرف شنڈر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور گردن نیچی کیے خاموش بیٹھا ہے]

جارج :- میں مطالبہ کرتا ہوں کہ میری بات سُنی جائے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں اپنی بات سُنانے پر مجھے اصرار ہے۔ یہ میرا حق ہے اور میں اس کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر میرے اس حق کو تسلیم نہ کیا گیا تو بھی اپنی بات بہر حال سُنا کر رہونگا۔ تم مجھے خاموش نہیں کر سکتے۔ سُنتے ہو خاموش نہیں کر سکتے۔ میں خاموش رہنے سے انکار کرتا ہوں۔

ستاملبو:۔ (ایک ساتھ) ضیتو چپ رہو۔ خدا کے لیے چپ رہو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ تم اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہو اور کچھ نہیں۔ اچھا اب ایک عقلمند آدمی کی طرح بیٹھ جاؤ خدا کے لیے میری نصیحت پر عمل کرو۔

رشمیر:۔ (ایک ساتھ) چپ رہو، سُنتے ہو، چُپ رہو اور بیٹھ جاؤ، خاموش۔

گھیرا:۔ (ایک ساتھ) اب بیٹھ بھی جاؤ۔ بیٹھو بھی تم رخنہ اندازی پیدا کر رہے ہو۔

سرکاری وکیل:۔ (ایک ساتھ) یہ ناقابل برداشت ہے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اُسے یہاں سے ہٹا دیا جائے یہ عدالت کی توہین ہے۔

جج ولورا:۔ (ایک ساتھ اور گھنٹی بجا کر) میں حکم دیتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔ ہم اس قسم کی حرکت کو برداشت نہیں کر سکتے سمجھتے ہو، اگر تم فوراً ان حرکات سے باز نہیں آؤ گے تو تمہیں عدالت سے باہر جانا پڑیگا۔ بٹھاؤ اس کو

(مگر شور وغل کے علاوہ کوئی لفظ ٹھیک سنائی نہیں دیتا۔ آخر جج ولورا اشاروں میں سنتریوں سے کہتا ہے کہ وہ قوت استعمال کریں۔ جارج کی کشمکش کے باوجود وہ اُسے بٹھا دیتے ہیں۔

جارج:۔ (ہانپتے ہوئے) کیا سمجھتے ہو تم نے مجھے خاموش کر دیا ہے۔ صرف بندوق مجھے خاموش کرا سکتی ہے یا وکورا سکی کے پستول کی گولی۔

سرکاری وکیل۔ (چلا کر) یور لارڈشپس۔ یہ ایک حملہ ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس کو تمیز سکھائی جائے

(اس وقت جج سلونزسکی، جج ولورا سے جواب بیٹھ گیا ہے آہستہ آہستہ کچھ کہتا ہے۔

ستاملبو بھی جارج کے کان میں کچھ کہہ رہا ہے)

جج ولورا:۔ (سرکاری وکیل سے) ایک منٹ براہ مہربانی

(وہ دوسرے ججوں سے جلدی جلدی کچھ باتیں کرتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپس میں کچھ اختلاف ہے۔ آخر کار جج ولورا کسی فیصلہ پر پہنچ کر گھنٹی بجاتا ہے۔ تماشائی خاموش ہو جاتے ہیں)

جج ولورا:۔ (جارج سے) ضیتو اگر تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو تو عدالت سننے کے لیے تیار ہے۔

سرکاری وکیل :- یور لارڈشپ! میں اس کے خلاف احتجاج ــــــ

(جج ولورا گھنٹی بجاتا ہے سرکاری وکیل خاموش ہو جاتا ہے)

جج ولورا :- (جارج سے) مگر یاد رکھو کہ تمیز سے بیان دینا ہوگا۔ اپنی ہر حرکت میں ادب اور تہذیب ملحوظ رکھو۔

جارج :- میں ایسا ہی کرونگا، یور لارڈشپ۔

جج ولورا :- اچھا شروع کرو

جارج :- یور آنریبل لارڈشپس۔ ایک مرتبہ میں پھر کہتا ہوں کہ اس تمام کارروائی کو ختم کیجیے۔

جج ولورا :- یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ تم پر ایک بڑا خطرناک الزام ہے۔ عدالت عالیہ کا فرض ہے کہ شہادت سُننے کے بعد فیصلہ کرے کہ تم مجرم ہو یا نہیں۔

جارج :- شہادت کوئی نہیں۔ سوائے اس کے ــــــ

جج ولورا :- (جلدی سے) بس۔ کیا تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو۔

جارج :- جی ہاں یور لارڈشپ۔ مجھے اس عدالت کی ہیئت ترکیبی پر اعتراض ہے۔

جج ولورا :- اس بات کی بھی اجازت نہیں ہے۔ یہ کہیں قاعدہ نہیں کہ ملزم اپنے مقدمہ میں خود ججوں کا انتخاب کریں۔

جارج :- مگر ملزم کو یہ حق ہے کہ وہ جج اس کا انصاف کریں جو بے تعصب ہوں۔

جج ولورا :- کیا تم اس عدالت کی بے تعصبی کو معرض بحث میں لانے کی جرأت کرتے ہو۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو سوچ سمجھ کے کہو۔

جارج :- مجھے ڈاکٹر سانکو پر اعتراض ہے۔

جج سانکو :- (غصہ سے) میں اس قسم کی۔

جج ولورا :- (اس کا ہاتھ پکڑ کر) براہ مہربانی (جارج سے) ڈاکٹر سانکو کو سپریم کونسل نے عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا ہے۔ ان پر اعتراض کرنے میں تمہارے کیا وجوہ ہیں۔

جج سانکو:۔ نہیں میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جج ولورا:۔ اس کو بولنے دیجیے۔

جارج:۔ کیا یہ کافی نہیں کہ یہ وہی آدمی ہے جس نے الگزنڈر کمان کو موت کی سزا دی تھی۔

جج ولورا:۔ اس مقدمہ اور الگزنڈر کمان کے مقدمہ میں کوئی تعلق نہیں۔

جارج:۔ معاف کیجیے یور لارڈ شپ۔ وہی قوتیں جنہوں نے الگزنڈر کمان کو تباہ کیا ہے مجھے بھی برباد کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اسی لیے ڈاکٹر سانکو کو جج مقرر کیا گیا ہے۔ وہ قومی حکومت کا آلۂ کار ہے۔ جلاد ہے جج نہیں۔

(لوگ تعجب سے بڑبڑاتے ہیں)

جج سانکو:۔ (اُٹھتے ہوئے) یہ ہے، لے جاؤ اس کو۔

سرکاری وکیل:۔ (غصہ سے) یور لارڈ شپ اب اس سے زیادہ ۔۔۔

جج ولورا:۔ (جارج سے) یہ ناقابل برداشت ہے۔ یا تو اپنے الفاظ واپس لے لو ورنہ میں تمہارے یہاں سے لیجانے کا حکم دیتا ہوں۔

جارج:۔ میں نے سچی بات کہہ دی ہے۔ میں الفاظ واپس نہیں لیتا۔

جج ولورا:۔ لے جاؤ اس کو۔

(رشمیرا اور گھیرا جارج کو اس کی جگہ سے کھینچتے ہیں اور بائیں طرف سے بزور باہر لے جاتے ہیں)

جارج۔ (دروازہ کے پاس سے چلّا کر) خونی سانکو۔ لوگ اسی نام سے تمہیں پکارتے ہیں۔ سانکو جلاد تم جلاد ہو جج نہیں۔

ستالبو:۔ (کھڑے ہو کر) یور لارڈ شپ ۔۔۔

(جج ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے ہیں اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتے)

ستالبو:۔ اگر یور لارڈ شپ ۔۔۔

جج ولورا:۔ ڈاکٹر ستاملبو آپ بھی کوئی بیان دینا چاہتے ہیں۔ میں یہ تنبیہ کردوں کہ ہم اس قسم کے اعتراضات سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں

ستاملبو:۔ نہیں نہیں یور لارڈشپ بلکہ بالکل اس کے برعکس اگر مجھے کہنے کی اجازت ہو تو اس عدالت کی بے تعصبی اور انصاف مسلم ہے۔ میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یور لارڈشپس خیتو کی اس بیہودہ حرکت کو نظر انداز کرکے ـــــ

لاڈیا:۔ (نفرت سے) کیا آپ اس کی طرف سے معافی مانگتے ہیں۔

ستاملبو:۔ ذرا ـــــ

لاڈیا:۔ اگر یور لارڈشپ مجھے اجازت دیں۔

جج ولورا:۔ بہت اچھا میڈم کمان لیکن یاد رکھو کہ ایسی باتیں۔

لاڈیا:۔ جی ہاں میں سمجھتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ ہم ججوں کا انتخاب نہیں کرسکتے لیکن ہمیں اپنے وکیل منتخب کرنے کا تو حق ہے۔

جج ولورا:۔ تو کیا تمہیں ڈاکٹر ستاملبو پر اعتراض ہے وہ ایک قابل ترین قانون داں ہیں۔

شاملبو:۔ شکریہ یور لارڈشپ

لاڈیا:۔ میں اس سے انکار نہیں کرتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہم نے انہیں انتخاب نہیں۔

جج مورسی:۔ تمہیں اجازت دی گئی تھی کہ اپنا وکیل مقرر کرلو لیکن کوئی تمہاری پیروی کرنے پر راضی نہ ہوا۔

لاڈیا:۔ یور لارڈشپ، اس کے بہت سے سبب ہیں

جج مورسی: سبب۔ ہاں ہر چیز کے سبب ہوتے ہیں۔

(داد کے لیے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ بہت سے لوگ ہنستے ہیں۔ گھبرایا واپس آکر شنڈر کے پاس کھڑا ہوجاتا ہے)

لاڈیا:۔ ہم نے یور لارڈشپ کی خدمت میں درخواست دی تھی کہ ـــــ

جج ولورا:۔ ہاں میں اسی طرف آرہا تھا۔ درخواست میرے سامنے ہے۔ تم چاہتی ہو تمہارے بھائی

کو اجازت دی جائے کہ ـــــ

لاڈیا :- جی ہاں یور لارڈشپ

جج ولورا :- کیا وہ یہاں موجود ہے

کنارڈ :- (کھڑے ہوکر) جی ہاں یور لارڈشپ -

جج ولورا :- آگے آؤ -

(کنارڈ آگے جاتا ہے)

جج ولورا : تمہارا نام ہے -

کنارڈ :- کنارڈ نولی

جج ولورا :- تم لاڈیا کمان کے بھائی ہو -

کنارڈ :- جی ہاں یور لارڈشپ -

جج ولورا :- تم کہاں رہتے ہو -

کنارڈ : سپرنگ فیلڈ

جج ولورا : کیا یہ امریکہ میں ہے -

کنارڈ : جی ہاں یور لارڈشپ -

جج ترزاوا : شمالی یا جنوبی امریکہ میں -

کنارڈ : شمالی امریکہ میں، ریاستہائے متحدہ میں - یور لارڈشپ -

جج ترزاوا : تمہیں صحیح اور مکمل جواب دینا چاہیے -

کنارڈ : میں یور لارڈشپ سے معافی مانگتا ہوں -

جج ولورا : تمہیں امریکہ میں رہتے کتنا عرصہ ہوگیا ہے -

کنارڈ :- بارہ سال یور لارڈشپ - سولہ برس کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا -

جج ولورا : کیا تمہیں ریاستہائے متحدہ کے شہری حقوق حاصل ہیں -

کنارڈ: (پروانہ راہداری دکھاتے ہوئے) جی ہاں یور لارڈ شپ

جج سانکو: کیا تم نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا ہے۔

کنارڈ: چھوڑ نہیں دیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وکالت کرنے کے لیے۔

جج ولورا: تم وکیل ہو۔

کنارڈ: جی ہاں یور لارڈ شپ۔ یونیورسٹی آف الی نوس اسکول کا گریجویٹ اور وہاں کے بار کا رکن

جج ترزاوا: کیا وہاں لوگوں کو درختوں کی شاخوں سے لٹکا دیتے ہیں جیسے کہ نیویارک کی گلیوں میں ہوتا ہے

کنارڈ۔ نیویارک میں نہیں یور لارڈ شپ، صرف ——

جج ترزاوا: تردید مت کرو۔ میں تصویریں دیکھ چکا ہوں۔

جج ولورا:۔ کیا آپ اپنی بہن کی درخواست پر آئے ہیں۔

کنارڈ:۔ نہیں یور لارڈ شپ، میں ——

لاڈیا:۔ ہمیں ایک دوسرے سے خط و کتابت کی اجازت ہی نہیں تھی۔

جج ولورا: ہماری گفتگو میں مداخلت نہ کرو۔

کنارڈ: دو ہفتے ہوئے میں نے شکاگو ٹریبون میں یہ خبر پڑھی تھی کہ اُسے گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس پر مقدمہ چلیگا۔ مجھ سے جتنی جلدی ہو سکتا تھا یہاں پہنچا۔ میں کل رات آیا ہوں

جج مورسی: کیا آپ سمجھتے ہیں ہمارے یہاں وکیلوں کا قحط ہے؟

(قہقہہ)

کنارڈ:۔ جی نہیں یور لارڈ شپ۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں ایسے وکیل نہیں جو مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہیں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ اپنی بہن کے قریب رہنا چاہتا تھا۔

جج ولورا: اور کیا آپ اس کی طرف سے پیروی بھی کرنا چاہتے ہیں۔

کنارڈ: جی ہاں اگر یور لارڈ شپ اس کی اجازت دیں۔

جج ولورا: ڈاکٹر ستا بو آپ کو کچھ اعتراض تو نہیں۔

ستاملبو: بالکل نہیں یور لارڈ شپ مجھے بڑی مسرت ہے کہ اس نازک ذمہ داری میں میرا کوئی ساتھی بھی ہے۔

سرکاری وکیل:۔ یور لارڈ شپ مجھے اعتراض ہے۔

جج ولورا: اور اس اعتراض کی وجہ کیا ہے ڈاکٹر تجوری؟

سرکاری وکیل: یہ حضرت غیر ملکی ہیں۔ ان کی یہاں کوئی حیثیت نہیں اس لیے کوئی حق نہیں کہ ان کی بات سُنی جائے۔

جج ولورا: ہم اس مسئلہ پر اچھی طرح سے بحث کر چکے ہیں اور فیصلہ کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر نولی کو ملزموں کی طرف سے پیش ہونے کی اجازت دی جائے۔ ہم ملزموں کو پورا موقع دینا چاہتے ہیں کہ اس جرم سے اپنے آپ کو بری ثابت کر دیں۔ کوئی بدگمانی، تعصب اور ناانصافی نہیں ہونی چاہیے۔

کنارڈ: شکریہ یور لارڈ شپ

جج سانکو: آپ نے ابھی کہا تھا کہ آپ نے اس مقدمہ کا حال امریکہ کے کسی اخبار میں پڑھا تھا۔

کنارڈ: جی ہاں یور لارڈ شپ۔ اس مقدمہ کا امریکہ کے اخباروں میں بڑا چرچا ہے

جج سلوترسکی: ہاں ہمیں یہ بات معلوم ہے۔

جج سانکو: ہمارے معاملات میں بیرونی مداخلت پہلے ہی کافی ہو چکی ہے۔ کیا آپ جمہوری جماعت یا ایسی ہی کسی ترقی یافتہ جماعت کے رکن ہیں۔

کنارڈ:۔ جی نہیں یور لارڈ شپ۔ میں کسی سیاسی جماعت کا رکن نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی سیاسی مقصد کے لیے ——

جج سانکو: یہ بات بھول نہ جائیگا کہ ہم خوش قسمتی سے اور خدا کے فضل و کرم سے اپنے عظیم قائد گریگوری ومینک کے ماتحت ہیں۔

(سنتری دائیں ہاتھ آگے بڑھا کر فوجی سلامی دیتے ہیں، حاضرین زندہ باد کہتے ہیں)

جج ولورا:۔ آپ کو اس امر میں محدود رہنا پڑیگا کہ ملزم واقعی اس جرم کے مرتکب ہیں یا نہیں جو ان پر

لگایا گیا ہے۔

کنارڈ: یورلارڈشپ میں سمجھتا ہوں

جج ولورا:۔ بہت اچھا

(کنارڈ ڈاکٹر ستاملبو کے قریب کرسی پر بیٹھنے کو ہے جو اس کے کلرک بشاطی نے خالی کی ہے)

سرکاری وکیل:۔ میں ان صاحب کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری پر ان قاتلوں کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ ہمارے یہاں کے لوگ بیرونی مداخلت کو گوارا نہیں کرتے۔ قومی حکومت قدرتاً ان صاحب کی حفاظت کریگی لیکن عوام کے غم و غصہ پر البتہ اسے کوئی اختیار نہیں۔

لاڈیا: اگر انہوں نے بھائی کو نقصان پہنچانے کی جرأت کی تو۔

کنارڈ:۔ (بہن کو اشارہ سے خاموش کرتے ہوئے، بھوری سے) جی ہاں میں نے اپنی ذمہ داری پر اس کام کو ہاتھ میں لیا ہے آج صبح ہی امریکہ کے سفیر نے مجھے شرف ملاقات بخشا ہے اور یقین دلایا ہے کہ امریکن شہری ہونے کی حیثیت سے میں اپنے ملکی جھنڈے کی حفاظت میں ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ دو بڑے ملکوں کی زیر حفاظت ہوتے ہوئے مجھے کوئی خطرہ نہیں

جج موسی۔ آپ یہاں شکاگو کی گلیوں سے زیادہ محفوظ ہیں۔

(داد کے لیے ادھر اُدھر دیکھتا ہے لوگ مسکراتے ہیں کنارڈ ستاملبو کے قریب بیٹھ جاتا ہے)

ستاملبو ۔۔ (کھڑے ہوکر) یورلارڈشپ۔

جج ولورا:۔ ہاں

ستاملبو: ہم درخواست کرتے ہیں کہ جارج کو یہاں آنے کی اجازت دی جائے اسے اپنے خلاف شہادت سُننے کا حق ہے۔

سرکاری وکیل۔ قاتل کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

کنارڈ:۔ امریکہ میں قیدی اُس وقت بے گناہ سمجھا جاتا ہے جب تک اس پر جرم ثابت نہیں ہو جاتا۔
جج سانکو:۔ جمہوری فلسفہ کے جذبات تک سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔
سرکاری وکیل: یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں کہ امریکہ کے لوگ حکومت کے فن سے ناواقف ہیں
(کچھ لوگ تائیداً سر ہلاتے ہیں)
جج ولورا: ہم نہیں چاہتے کہ عدالت کی منظم کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت ——
تاملبو: یور لارڈ شپ۔ اگر جارج کو آنے کی اجازت دی جائے تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ وہ ہرگز ——
جج ولورا:۔ بہت اچھا اس شرط پر (سنتریوں سے) اس کو اندر لے آؤ۔
گھیرا: (سلام کرتے ہوئے) بہت خوب یور لارڈ شپ۔ (باہر چلا جاتا ہے)
جج ولورا: کیا شنڈر اُس وکیل سے مطمئن ہے جو اُس کی طرف سے پیروی کریگا۔
(معلوم ہوتا ہے شنڈر نے سُنا نہیں۔ سنتری گلو کا اُس کو ہلاتا ہے اور کھڑا کر دیتا ہے)
شنڈر کیا تم اپنے وکیل ڈاکٹر مینج سے مطمئن ہو۔
شنڈر:۔ (دیوانہ پن سے) کیا؟
(اس کا لب ولہجہ جرمنوں جیسا ہے۔ مینج اُٹھ کر اس کے پاس جاتا ہے)
مینج:۔ کرٹ کیا تمہاری طرف سے پیروی کرنے میں مجھ پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔
شنڈر:۔ اعتراض نہیں۔ کوئی اعتراض نہیں۔ (یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
جج ولورا:۔ اس کو کیا تکلیف ہے۔ کیا بیمار ہے۔
مینج: میرا خیال ہے کہ نشہ آور چیز کا اثر ہے۔ یور لارڈ شپ مجھے خوف ہے کہ —— (اپنا ماتھا کھجلاتا ہے)
جج ولورا:۔ کیا ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا ہے۔
مینج:۔ جی ہاں یور لارڈ شپ۔ طبی لحاظ سے تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔ یہ کوئی نفسیاتی بات ہے۔
(رشمیرا اور گھیرا جارج کو عدالت میں لاتے ہیں اور مینج بیٹھ جاتا ہے)
جج ولورا:۔ خیتو کیا تم اس شرط سے واقف ہو جس کی بنا پر تمہیں عدالت میں آنے کی اجازت دی گئی ہے۔

جارج :۔ جی ہاں لارڈ شپ جس طریقہ سے میں نے باتیں کی تھیں وہ درست نہیں تھا۔ آدمی کو قوانین کے مطابق کھیل کھیلنا چاہیے۔

جج موسی ۔ کیا تم اس کارروائی کو کھیل سمجھتے ہو۔

جارج :۔ میں نے مثالاً عرض کیا ہے، یور لارڈ شپ۔

جج ولورا :۔ تم کسی کھیل میں مصروف نہیں ہو خیتو۔ تم پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے یہ بڑا نازک معاملہ ہے اور ہم تمہیں پیروی کا پورا موقع دے رہے ہیں۔ مگر اس کارروائی کا احترام اور عزت ضروری ہے۔

جارج :۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں یور لارڈ شپ۔

جج ولورا :۔ ملزم کو اس کی جگہ پر بٹھا دو۔ اب ڈاکٹر تجوری آپ شروع کر سکتے ہیں۔

(جارج اور سنتری بیٹھ جاتے ہیں۔ کنارڈ اپنا تعارف جارج سے کراتا ہے۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں ۔)

سرکاری وکیل :۔ یور لارڈ شپس۔ ہم یہاں اس وقت ملزمین جارج خیتو، لاڈیا کمان اور کرٹ شنڈ کی موت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کا جرم ہر ایک کو معلوم ہے۔ اوّل تو یہ لوگ جمہوری جماعت کے سرگرم رکن ہیں جسے دو سال ہوئے ہمارے قائد مسٹر پریزیڈنٹ گریگوری ومینک کے ایک حکم سے خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ جمہوری جماعت جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہمارے وطن عزیز کے دشمنوں پر مشتمل ہے۔

کنارڈ : میرا خیال تھا کہ سیاسی سوالات ---

جج ولورا :۔ براہ کرم خاموش رہیے۔ اچھا

سرکاری وکیل :۔ جناب امریکن شہری صاحب ہم یہاں مناظرہ کے لیے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ ہم یہاں انصاف کا مطالبہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ملزموں نے خوفناک سیاسی جرائم کا ارتکاب کیا ہے یہ عورت کمان بدمعاش الگزنڈر کمان کی بیوی ہے جس کو بغاوت اور غداری کے الزام میں موت کی سزا ہو چکی ہے۔ الگزنڈر کمان کی خوفناک تجویزوں میں خیتو اس کا ساتھی رہا ہے اور اس کی بجائے جمہوری

جماعت کا سرغنہ مقرر ہوا ہے۔ شنڈر کرایہ کا ٹٹو اور ان کا آلۂ کار ہے۔ اِن تینوں نے ہمارے نیک دل قائد گریگوری ومینک کے قتل کی سازش کی۔ انہیں کوئی ذاتی انتقام نہیں لینا تھا۔ بلکہ قومی حکومت کو کمزور اور بغاوت کا اشارہ کرنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ اگر ان کی یہ سازش ناکام رہی ہے تو اس کی وجہ رعایا کی وفاداری اور اطاعت اور خدائے تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جس نے قاتلوں کی گولی کا رُخ پھیر دیا اور ہمارے قائد کی جان بچالی۔ مہینوں تک مسٹر پریزیڈنٹ موت وحیات کے درمیان رہے ہیں۔ ان کے ڈاکٹر کا تازہ ترین بلیٹن یہ ہے :۔ (پڑھتا ہے)

"اگرچہ مسٹر پریزیڈنٹ کی حالت رو بہ اصلاح ہے لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خطرہ سے باہر ہیں۔ مگر خدا کے فضل سے ہمیں اُمید ہے کہ ہم اُنہیں وفا شعار اور متحدہ قوم کی سرپرستی کے لیے بچا سکیں گے" نامراد قاتلوں کے لیے جن پر یہ ساری ذمہ داری ہے مدت کے علاوہ اور کوئی فیصلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ان پر مقدمہ چلانا ایک ایسی رعایت ہے جس کی اس فعل کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ضرورت ہی نہ تھی لیکن ہماری مہذب اور منصف مزاج قومی حکومت بغیر مقدمہ کے ان کو کوئی سزا نہیں دیگی۔ اب ہم گواہوں کو پیش کرتے ہیں اور ہمیں کامل اعتماد ہے کہ اس خوفناک جرم کا انتقام لیا جائیگا۔ اور انصاف کا تقاضا جلد از جلد اور قلیل عرصہ میں پورا ہوگا۔

(پرجوش نعرہ ہائے تحسین)

جج ولورا:۔ کیا وکیل صفائی جواب دینا چاہتے ہیں۔

ستا ملبو:۔ یور لارڈشپ ہم جواب کا حق کسی آئندہ موقع کے لیے محفوظ رکھتے ہیں۔

جج ولورا:۔ (سرکاری وکیل سے) گواہوں کو بلائیے۔

سرکاری وکیل:۔ ڈاکٹر کانسٹنٹائن پروان۔

(پروان پستہ قد، عمر چالیس سے زائد، صبح کے لباس میں ملبوس گواہوں کے کٹہرے میں داخل ہوتا ہے)

جج ولورا:۔ کیا تم حلف اُٹھانا چاہتے ہو۔

پروان :- جی ہاں یور لارڈ شپ ۔

کلرک :- (اس کو صلیب دیتے ہوئے) کیا تم

پروان :- آمین - (صلیب کا نشان بناتا ہے)

سرکاری وکیل :- براہِ کرم بتائیے آپ کون ہیں

پروان :- میں ڈاکٹر کانسٹنٹائن پروان ہوں - مسٹر پریزیڈنٹ گرگوری دینک کا پرائیویٹ سکرٹری

سرکاری وکیل :- کیا قاتلانہ حملہ آپ کا چشم دید واقعہ ہے ۔

پروان : جی ہاں ۔

سرکاری وکیل : واقعات بیان کیجیے ۔

پروان :- جمعرات کے دن ۷ - مارچ کو ــــــ

سرکاری وکیل :- یعنی جرم سے چار دن قبل ؟

پروان :- جی - جمعرات کو یہ عورت میرے دفتر میں آئی اور کہا کہ وہ باغی الگزنڈر کمان کی بیوی لاڈیا کمان ہے ۔

لاڈیا :- وہ ہرگز باغی نہیں ہیں ۔

جج ولورا :- اچھا پھر ۔

پروان :- اُس نے کہا کہ اُسے مسٹر پریزیڈنٹ سے ملاقات کی اجازت دی جائے اس لیے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے جس کی موت پر سپریم کونسل نے بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے رحم کی درخواست کرنا چاہتی ہے ۔ میں نے جواب دیا کہ وہ کل آئے اور میں دیکھونگا کہ ملاقات کا وقت مقرر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ دوسری صبح ــــــ

لاڈیا :- اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ ملاقات کا انتظام زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے اگر میں وہ رات اس کے ساتھ بسر کروں ۔

پروان : (اطمینان سے) یہ تجویز خود میڈم کمان نے پیش کی تھی ، یور لارڈ شپ ۔

لاڈیا:۔ اچھا!

پروان:۔ میں نے محض مسئلہ کی نزاکت کے سبب اس طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔

لاڈیا:۔ سنو اس مکار کی بات۔

جج مورسی: یہ سب ذاتی معاملات ہیں جو ہم سے متعلق نہیں اگرچہ وہ کسی قدر دلچسپ ہی کیوں نہ ہوں

(اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ لوگ مسکراتے ہیں)

جج ولورا:۔ (پروان سے) اپنا بیان جاری رکھو۔

پروان:۔ دوسرے دن یعنی جمعہ کی صبح کو وہ پھر آئی اور میں نے اُسے مطلع کیا کہ مسٹر پریزیڈنٹ نے ازراہِ عنایت ۱۱ تاریخ کو پیر کے دن گیارہ بجے اُسے ملنے کا اعزاز بخشا ہے۔

جج ترزاوا:۔ اور کیا تم — یعنی — تم اور وہ۔

پروان:۔ جی نہیں یور لارڈشپ۔ میں کبھی اپنی ذاتی دلچسپیوں کو اپنے فرائض کے ساتھ نہیں ملاتا۔

جج ترزاوا:۔ خوب یہ بہت اچھا اصول ہے۔

جج ولورا:۔ جاری رکھو۔

پروان:۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اپنی درخواست کی حمایت کرنے کے لیے وہ اپنے ساتھ کسی اور کو لا سکتی ہے۔ میں نے کہا ہاں لیکن ایک آدمی سے زائد نہیں۔

لاڈیا:۔ مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

جج ولورا:۔ خاموش تمہیں بعد میں موقع دیا جائیگا۔ بیان جاری رکھو۔

پروان:۔ ۱۱ تاریخ کو پیر کے دن میں وقت مقررہ پر مسٹر پریزیڈنٹ کے ساتھ ان کے ذاتی کمرہ میں تھا۔ کلرک نے آکر مجھ سے کہا کہ کمان کی بیوی آئی ہے۔ ایک ساتھی کو لے کر۔

لاڈیا:۔ میں تنہا آئی تھی۔

پروان:۔ مسٹر پریزیڈنٹ نے حکم دیا کہ انہیں اندر لایا جائے۔ اور ایک لمحہ کے بعد وہ اس آدمی شنڈر کے ساتھ داخل ہوئی۔

لاڈیا :۔ جھوٹ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

جج ولورا :۔ خاموش ۔ (پروان سے) کیا تم ملزم شنڈر کو جو میڈم کمان کے ساتھ آیا تھا پہچانتے ہو۔

پروان :۔ جی ہاں، اچھی طرح

جج ولورا :۔ اچھا پھر۔

پروان ۔ کمان نے کہا کہ اس کے شوہر کی زندگی ـــــ

جج سلوترسکی :۔ کیا کوئی اور بھی موجود تھا۔

پروان :۔ جی نہیں یور لارڈشپ ۔ صرف مسٹر پریزیڈنٹ ہیں اور دونوں قاتل۔

جج سلوترسکی :۔ جاری رکھو۔

پروان :۔ اس نے سکون سے گفتگو شروع کی مگر جلد ہی غیظ و غضب نے اس پر قابو پالیا اور اس کے اشارے زیادہ سخت ـــــ

سرکاری وکیل :۔ اور ہمارے قائد نے کس طرح جواب دیا۔

پروان :۔ ہمیشہ کی طرح وہ اٹل تھے منطقی اور فصیح و بلیغ ۔ انہوں نے الگزنڈر کمان کے جرائم کا حال بیان کیا۔ انہوں نے جمہوری جماعت کو باغیوں اور غداروں کی جماعت ٹھہرایا جو ہماری پُر عظمت قومی حکومت کی جڑیں اکھاڑنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو تباہی و بربادی کے راستہ پر لیجانے کے خواہشمند ہیں۔

(تماشائی خوشی کا اظہار کرتے ہیں)

الغرض انہوں نے کمان کی سزائے موت پر نظر ثانی سے انکار کردیا اور تنبیہ کی کہ اس کے سب ساتھیوں کا بھی حشر ہوگا۔ (زندہ باد اور تحسین کے نعرے)

جارج :۔ چلاؤ گیدڑو چلاؤ ۔ ابھی ہم مرے نہیں ہیں۔

سرکاری وکیل :۔ (غصہ سے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے) ابھی نہیں ۔ مگر تلوار تیز کی جا رہی ہے۔

جارج : بعض اوقات تلوار کی دو دھاریں ہوتی ہیں۔

جج ولورا:۔ (گھنٹی بجا کر) نیتو میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں (پروان سے) تم بیان جاری رکھو۔

پروان:۔ مسٹر پریزیڈنٹ کے پُرجذبات الفاظ کے خاتمہ پر اُس کی آنکھیں قاتلانہ آگ سے چمکنے لگیں وہ شنڈر کی طرف مڑی اور کہا ــــ

لاڈیا:۔ نہیں۔

(کنارڈ اور ستالمبو اسے خاموش رہنے کو کہتے ہیں)

پروان:۔ ان الفاظ پر شنڈر نے جیب میں سے پستول نکالا میں چلّایا مگر وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اُس نے دو گولیاں چلائیں اور وہ ہمارے قائد کے سینے اور کندھے میں لگیں۔ ان میں سے ایک ان کے جسم میں سے گزر کر اُس آئینہ پر جا لگی جو پیچھے دیوار میں لگا تھا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ میں نے شنڈر کا ہاتھ پکڑ کر اُس سے پستول چھین لیا۔ لوگ کمرہ میں دوڑے ہوئے آئے اور قاتلوں کو گرفتار کر لیا بس یہ تھا سارا واقعہ۔

سرکاری وکیل:۔ ڈاکٹر پروان اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بہت سی چیزوں کی شناخت کریں۔

پروان: یقیناً۔

سرکاری وکیل:۔ (اپنے نائب مالینو سے) سب سے پہلے قمیص۔

(مالینو ایک بڑے ڈبہ میں سے ایک سبز قمیص نکال کر سرکاری وکیل کو دیتا ہے)

(قمیص کو ہاتھ میں لے کر) ڈاکٹر پروان کیا آپ اس قمیص کو پہچانتے ہیں جس کے سینہ میں دائیں طرف اور دائیں کاندھے میں گولیوں کے نشان ہیں۔ کیا مسٹر پریزیڈنٹ نے اس حادثہ کے وقت یہی قمیص پہن رکھی تھی۔

پروان:۔ جی ہاں۔

سرکاری وکیل:۔ آئینہ لاؤ۔ (سرکاری وکیل کا کلرک ایک چھوٹا سا دیواری آئینہ سامنے لاتا ہے جس کا شیشہ چور چور ہے) اور کیا یہ وہی آئینہ ہے جو گولی سے چکنا چور ہو گیا تھا جو مسٹر پریزیڈنٹ کے جسم سے

ہو کر اس میں جا لگی تھی۔

پروان :- جی ہاں۔

سرکاری وکیل :- میرے پاس مسٹر پریزیڈنٹ کے ذاتی ڈاکٹر پروفیسر گلامچی کی تحریری رپورٹ بھی ہے جس میں زخموں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز کے بلیٹن بھی موجود ہیں۔

(جارج کنارڈ اور ستاملبو کے کان میں کچھ کہتا ہے)

جج ولورا :- ہم ان کو دیکھ چکے ہیں۔

ستاملبو :- ملزموں کا مطالبہ ہے کہ ڈاکٹر گلامچی کو تصدیق کے لیے عدالت میں بلایا جائے۔

جج مورسی :- کس مقصد کے لئے؟

سرکاری وکیل :- پیچیدگی پیدا کرنے اور وقت ضائع کرنے کے لیے یور لارڈشپس آپ یقین فرمائیے۔

جج ولورا : ہمارے پاس مفصل تحریری رپورٹ موجود ہے۔

کنارڈ :- ہم اُن سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔

سرکاری وکیل :- (طنزاً) کیا آپ علمِ طب سے بھی واقف ہیں۔

ستاملبو :- پروفیسر گلامچی کی قابلیت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یور لارڈشپس۔

جارج :- اور نہ اس امر کا کہ وہ وینک کا بہنوئی ہے۔

جج سانکو :- کیا تم اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہو۔

کنارڈ :- (پیشتر اس کے کہ جارج جواب دے سکے) ہم ڈاکٹر موصوف سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں

جج ولورا :- ہم اس درخواست پر غور کریںگے۔ اس کے بعد؟

سرکاری وکیل :- (مالینو سے) پستول۔ (مالینو پستول نکال کر دیتا ہے) کیا یہ وہی پستول ہے جس سے شنڈر نے گولی چلائی تھی اور آپ نے اس سے چھین لیا تھا۔

پروان :- جی ہاں۔

جج ترزاوا :- (اپنا ہاتھ بڑھا کر) ذرا مجھے دکھائیے۔

سرکاری وکیل: ضرور یور لارڈ شپ (دیتا ہے) اور جج باری باری اُسے دیکھتے ہیں، بہت سے گواہ ایسے ہیں جو اس امر کو ثابت کریں گے کہ اس پستول کا مالک جارج خیتو ہے۔

جارج: اپنے نکمے گواہوں کو بلا کر اس تماشہ کو طوالت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ پستول میرا ہے۔

جج سانکو: تم تسلیم کرتے ہو؟

جارج: یقیناً۔ یہ میرے کمرہ سے چرایا گیا تھا۔

جج موسی: چوری کس نے کی تھی؟

جارج: یور لارڈ شپ۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ چور نے جو یقیناً کوئی ہشیار آدمی ہے میری موجودگی میں اسے نہیں چرایا۔

جج سلوترسکی: کیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ یہ چوری گیا تھا۔

جارج: صرف یہ کہ جب میں اتوار کی صبح کو یعنی اس واقعہ سے ایک دن قبل کمرہ سے روانہ ہوا تو یہ پستول میز پر موجود تھا۔ جب میں رات کو واپس آیا تو اُس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

جج موسی: چوری کا یہ کوئی ثبوت نہیں

سرکاری وکیل: ہم ثابت کر دینگے کہ یہی پستول اُسی اتوار کی شام کو خیتو نے شنڈر کو دیا تھا۔

جارج: اگر تم اس کو ثابت کر دو تو ہر بات کو ثابت کر سکتے ہو۔

جج ولورا: (جارج سے) بیٹھ جاؤ۔ (پروان سے) کیا شنڈر نے بھی الگزنڈر کمان کے لیے رحم کی التجا کی تھی۔

پروان: جی نہیں اُس نے کچھ نہیں کیا۔

سرکاری وکیل: وہ بولنے کے لیے نہیں بلکہ عمل کرنے کے لیے آیا تھا۔

نتا ملبو: کیا آپ کو معلوم تھا، شنڈر کون ہے؟ کیا آپ نے اِسے پہلے بھی دیکھا تھا۔

پروان: کبھی نہیں۔

ستاملبو:۔ کیا میڈم کمان نے اس کا تعارف مسٹر پریزیڈنٹ سے کرایا تھا؟

پروان:۔ نہیں اُس نے رحم و کرم کے لیے تقریر شروع کر دی جو معلوم ہوتا تھا خوب رٹی ہوئی ہے۔

لاڈیا:۔ بالکل نہیں، مجھے جو کچھ کہنا تھا برجستہ اور فی البدیہہ کہا تھا۔

کنارڈ:۔ نہ آپ نے اور نہ مسٹر پریزیڈنٹ نے پوچھا کہ شنڈر کون ہے اور وہاں کیوں آیا ہے۔

پروان:۔ نہیں اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ قدرتاً ہم سمجھے کہ یہ کمان کا کوئی رشتہ دار یا دوست ہے۔ اس نے ایک ساتھی کو لانے کی اجازت حاصل کر لی تھی

ستاملبو: کیا کمرہ میں اور کوئی موجود نہیں تھا؟ کوئی سکرٹری، کوئی سنتری۔

پروان:۔ کوئی نہیں۔ صرف مسٹر پریزیڈنٹ اور میں۔

شاملبو:۔ لیکن کیا مسٹر پریزیڈنٹ اس طریقہ سے ملاقات کیا کرتے ہیں۔

پروان:۔ کیوں نہیں۔ انہیں اپنی رعایا کی اطاعت اور فرمانبرداری پر فخر و ناز ہے۔

(تحسین و مرحبا کی آوازیں)

کیا انہیں معلوم تھا کہ اس عورت سے مہربانی کا جو سلوک کیا گیا ہے اس کا بدلہ قاتلانہ حملہ سے دیا جائیگا۔

سرکاری وکیل:۔ ڈاکٹر ستاملبو کا خیال یہ ہے کہ ہمارے قائد کو اس طرح آزاد اور بے خوف ملاقاتوں پر بُرا بھلا کہا جائے۔

ستاملبو:۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ براہ کرم غلط فہمی نہ پیدا کیجیے۔ میں تو یہ مشورہ دینے والا تھا کہ ان کی ذات کی حفاظت کے لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے

پروان:۔ جی ہاں، ہمیں سبق مل گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ آئندہ ایسے دشمنوں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔

جارج: کیا اس کے لیے تمہارے پاس کافی فوجی دستے ہیں؟

جج سانکو:۔ بس ان غدارانہ حملوں کو ختم کرو۔

سرکاری وکیل:۔ یور لارڈشپ کیا ان دھمکیوں کی اجازت ہے۔

جج ولورا:۔ ہمیں ان دھمکیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم یہاں شہادت سننے کے لیے جمع ہیں (جارج کی

تم اپنا مقدمہ خود خراب کر رہے ہو۔ کیا اور سوالات باقی ہیں؛

سرکاری وکیل: نہیں یور لارڈشپ۔

جج ولورا:۔ کیا وکیل صفائی کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں ؟

ستا لبو:۔ نہیں یور لارڈشپ۔

جج ولورا:۔ تم جا سکتے ہو ڈاکٹر پروان۔

پروان: شکریہ یور لارڈشپ۔ میں اپنی شہادت اس اُمید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ ہمارے محترم قائد کی زندگی پر جو قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور جس نے قوم میں رنج وغم اور غیظ وغضب کی ایک لہر دوڑا دی ہے اس کا بدلہ جلد سے جلد لیا جائیگا۔

(داد و مرحبا کے ساتھ عدالت کے سامنے جُھک کر وہ اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے)

مالینو:۔ (ارد گرد دیکھ کر) دوسرا گواہ باسربا ہے۔

باسربا:۔ (کھڑے ہو کر) حاضر ہوں جناب، یہاں

مالینو:۔ آگے آؤ۔

باسربا:۔ جی ہاں آرہا ہوں۔

(آگے بڑھتا ہے، گھبرا کر اور ڈر کر)

سرکاری وکیل:۔ کیا اس سے بھی حلف لیا جائیگا، یور لارڈشپس

جج سانکو: کیا تم قومی جماعت کے رکن ہو ؟

باسربا:۔ جی ہاں یور لارڈشپس۔ جی ہاں۔ یقیناً، سات برس سے ہوں۔ اور ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص سلاوک۔ یور لارڈشپس۔ مجھ میں لاطینی، صہوانی، رومن کتھولک، نیگرو اور جرمن خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

(باقی)

غزل

شعر و الہام تو کیا عرش بھی نازل ہو جائے
دل جو اک شے ہے حقیقت میں اگر دل ہو جائے

جس طرف آنکھ اٹھے حُسن مقابل ہو جائے
عشق خود ہی نہ اگر پردۂ حائل ہو جائے

اُف رے تقدیرِ چمن ہائے رے بیدادِ فلک
غنچہ کھلنے بھی نہ پائے کہ مرا دل ہو جائے

اپنی ہستی کے سوا مجھ سے بھی غافل ہو جائے
دل بہر حال مرا دل ہے مگر دل ہو جائے

حُسن کامل ہے ترا اور بھی کامل ہو جائے
میری گستاخ نگاہی بھی جو شامل ہو جائے

دونوں عالم سے فراغت مجھے حاصل ہو جائے
عشق اگر حُسن بنے، حُسن مرا دل ہو جائے

حُسن سے عشق کچھ اس طرح مماثل ہو جائے
جیسے تصویر سے تصویر مقابل ہو جائے

عشق ہی اے کاش مرے عشق کا حاصل ہو جائے
یہی رہبر، یہی جادہ، یہی منزل ہو جائے

مجھ کو منظور دو عالم سے رقابت لیکن
وہ نگاہِ متبسم طرفِ دل ہو جائے

میں رُخِ عشق سے پردہ تو اُٹھا دوں لیکن
ڈر یہ ہے تو نہ کہیں عشق پہ مائل ہو جائے

غیر تو غیر ہے۔ اے عشق گوارا نہ کروں
میرے عالم میں اگر خود بھی وہ شامل ہو جائے

ارتباط اب نہ بڑھا اور زیادہ اے دوست
مجھ کو ڈر ہے کہ ترا دل نہ مرا دل ہو جائے

حیف وہ حُسن کا پندار جو کھا جائے شکست
ہائے وہ زعمِ محبت کہ جو باطل ہو جائے

دل کے آثار ابھی تک تو بہت اچھے ہیں
کہیں اقرارِ محبت پہ نہ مائل ہو جائے

رنگِ چہرہ نہ اُڑے اور محبت برسے
لب کو جنبش نہ ہو اور شرحِ غمِ دل ہو جائے

میں تو مر جاؤں مرا عشق کہیں کا نہ رہے
ایک نفس بھی جو فراغت مجھے حاصل ہو جائے

مجھ کو دینا تھا غمِ عشق نہ اس طرح۔ مگر
کہ مرا عقدۂ دل ہی مجھے مشکل ہو جائے

ہر ستم مجھ کو گوارا مگر اس شرط کے ساتھ
ہر ستم کے لیے مخصوص مرا دل ہو جائے

غیرتِ حسن کا پھر کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا
درد بن کر نہ اگر عشق مرا دل ہو جائے

کیا بگڑ جائے ترا اے مہِ خوبیِ جمال
گر یہاں بھی کوئی دم، رونقِ محفل ہو جائے

عشق ہر رنگ میں ہے اپنی حقیقت کی دلیل
یہ وہ دعویٰ ہی نہیں ہے کہ جو باطل ہو جائے

"ہندوستانی کاشتکار کی مالی ضروریات"

زراعتی قرضہ | ایک اہم پیشہ ہونے کے باوجود زراعت کو ہندوستان میں حسب خاطر ترقی نہیں۔ گو
یہ گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی توجہ کا محتاج ہے۔ اور یہاں کے کسان بھی کافی محنتی اور سمجھدار ہیں تاہم
ملک کی زراعت پورے طور پر لہلہاتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ ترقی کی اس کمی کی بہت سی وجوہ ہیں، سو ایک
وجہ روپیہ کی کمی اور گرانی ہے۔ دوسرے ملکوں میں زراعت کی ترقی کے لیے علاوہ کاشتکاروں کے وہاں
کی پبلک اور گورنمنٹ کافی مدد پہنچاتی ہے خصوصاً موجودہ زمانہ میں زراعتی قرضہ پر ہر ملک کافی توجہ دے رہا ہے
اور ہر ترقی یافتہ ملک کی گورنمنٹ کا اہم فرض زراعتی قرضہ کی فراہمی اور اس میں آسانی پیدا کرنا ہے اور جن ملکوں
میں زراعت پیشہ لوگ زیادہ ہیں وہاں کی حکومتوں نے خاص قانون زراعت کی ترقی کے لیے تیار کیے ہیں
اور بہت سی سوسائٹیاں اس کی مدد کے لیے کھول دی ہیں۔

انگلستان میں زراعت کا بہت ہی کم حصہ ہے لیکن وہاں بھی اس معاملہ میں کافی دلچسپی کا اظہار
کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں وہاں ایک قانون زراعتی قرضہ کے متعلق پاس ہوا تھا جس سے اس پیشہ کو بہت فائدہ
پہنچ رہا ہے۔ اور ترقی کے بہت آثار نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس قانون کی رو سے ایک زراعتی کارپوریشن قائم
ہوا جو زراعتی مقاصد کے لیے دوسرے نیم سرکاری بنکوں سے روپیہ حاصل کر کے آسان شرائط پر کاشتکاروں
کو قرض دیتا ہے۔ اس کارپوریشن کا کام جنوری ۱۹۲۹ء میں شروع ہو گیا تھا اور اس وقت تک بہت کافی سرمایہ
اس مد میں لگایا جا چکا ہے۔ فرانس بھی اپنے ملک کی زراعتی ترقی کے لیے بہت کوشاں ہے۔ بنک آف
فرانس کو کچھ عرصہ قبل وہاں کی گورنمنٹ نے اس بات پر مجبور کیا تھا کہ وہ ۴۰ ملین فرینک بغیر سود کی زراعتی
قرضہ کے لیے مہیا کرے اور اپنے سالانہ منافع میں سے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ ملک کے سرکاری زراعتی
ادارے (Credit Agricole) کو ادا کیا کرے۔ اس طریقہ سے وہاں کے کاشتکاروں کو اپنی مدد کے لیے بڑی
آسانی سے روپیہ مہیا ہو جاتا ہے۔ ریزرو بنک آف انڈیا میں بھی ایک محکمہ زراعتی قرضہ کے لیے قائم ہوا ہے۔ لیکن

ابھی اس کے متعلق کچھ رائے قائم کرنا قبل از وقت ہے

ہندوستان کے موجودہ بنکوں کی توجہ زیادہ تر تجارت پر ہے اور زراعت پر کوئی خاص نظر نہیں۔ اگرچہ زراعت ملک کی ۷۰ فیصدی آبادی یعنی ۲۲ کروڑ انسانوں کی زندگی کی ذمہ دار ہے اور تجارت سے فائدہ اُٹھانے والی صرف ۸ فیصدی آبادی ہے۔

یہاں کاشتکاروں کو روپیہ قرض ملنے کے بہت کم ذرائع ہیں۔ یعنی ہندوستانی ساہوکار یا دیسی بنک کواپریٹو سوسائٹیز، گورنمنٹ اور کسی حد تک چند تجارتی بنک ہیں۔ مضمون ہذا میں ہندوستانی ساہوکار اور دیسی بنکوں کے متعلق کچھ ذکر کیا جائیگا۔ کیونکہ یہی وہ ذریعہ ہے جن پر ہندوستان کے غریب کاشتکاروں کو مصیبت کے وقت میں بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ گو اس بھروسہ کی سزا بھی ان کو کافی بھگتنا پڑتی ہے۔

ساہوکار تقریباً ایک ارب روپیہ کا کاروبار ان ساہوکاروں کے ذریعہ ہندوستان میں انجام پاتا ہے۔ ملک کے کسانوں اور دوسرے پیشہ وروں کی پہنچ کسی بنک تک تو ممکن نہیں۔ یہی ساہوکاران کے لیے بنک ہیں۔ لین دین کے کاروبار میں ساہوکار اصراف زیادہ تر اپنا ذاتی روپیہ لگاتے ہیں۔ سرمایہ کے لیے دوسروں کا روپیہ یہ لوگ بہت ہی کم لیتے ہیں۔ اگر کبھی ضرورت آپڑی تو امپیریل بنک یا کسی دوسرے بنک سے ہنڈی بھنالی ورنہ عموماً ان کا ذاتی سرمایہ اس قدر ہوتا ہے کہ اس سے ان کا کام بخوبی چلتا رہتا ہے۔ کاشتکار کو روپیہ دیتے وقت بنکوں کی طرح یہ لوگ ضمانت لی زیادہ فکر نہیں کرتے۔ ان کی ضمانت صرف ذاتی جان پہچان یا کسی دوسرے شخص کا اثر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے موجودہ بنک قرض دیتے وقت تی ضمانت طلب کرتے ہیں کہ نادہندگی کی صورت میں اس ضمانت سے ان کا دیا ہوا پورا روپیہ وصول ہوجائے اور ضمانت کے فروخت میں بھی مشکل نہ ہو اگر ہندوستان کے کسان کسی ضمانت دینے کے قابل ہوتے تو ان غریبوں کو قرضہ لینے کی ہی کیا ضرورت تھی۔ بنکوں کی خواہش کے مطابق نہ تو وہ گورنمنٹ پرامیسری نوٹ کی ضمانت دے سکتے ہیں نہ کسی کمپنی کے حصے رہن رکھ سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسری ضمانت اسی قسم کی داخل کرسکتے ہیں اسی لیے ان کو بنکوں سے روپیہ نہیں مل سکتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوڑے ہوئے اپنے گاؤں کے مہاجن کے پاس جاتے ہیں جو اُن کا خون چوسنے کو پہلے ہی سے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ جس طرح ہندوستانی کسان

بارش کے بغیر اپنا کھیت نہیں بو سکتا اسی طرح روپیہ کی ضرورت کے وقت ان مہاجنوں کی مدد کے بغیر اس کا کام چلنا آسان نہیں اس زمانہ میں ان مہاجنوں پہ لائسنس اور زیادہ ٹیکس لگانے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ لائسنس ہونے کی صورت میں یہ لوگ اپنا کاروبار ختم کر دینگے اور ان کے اس عمل کا اثر کسانوں پر بہت برا پڑیگا۔ بہتر صورت یہ ہوگی کہ ان پر اس بات کی تاکید کی جائے کہ وہ اپنے بہی کھاتہ میں اندراج صحیح کیا کریں اور سرکاری افسر وقتاً فوقتاً ان کی جانچ کرتے رہیں کتابوں کے اس طرح ٹھیک ہو جانے پر کاشتکار کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد بے ایمانی کی گنجائش کم رہیگی علاوہ اس کے خود مہاجن کے وقار میں بھی اضافہ ہو جائیگا اور اس کی ساکھ زیادہ قائم ہو جائیگی اور یہ بات صرف بنکوں کے طریقہ پر حساب کتاب رکھنے سے حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ زبردستی لائسنس عائد کرنے سے۔

مہاجن کی زیادتی سود کے اسباب جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے مہاجن اور ساہوکار اپنے قرضہ پر سوائے شخصی ضمانت کے دوسری کسی قسم کی ضمانت بہت ہی کم لیتے ہیں (خانگی ضروریات کے لیے جو قرض لیا جاتا ہے اس کے لیے زیور رہن کا عام رواج ہے۔ مگر اس وقت زراعتی قرضہ سے بحث ہے) لیکن اس کے بجائے وہ شرح سود بہت بڑی لگا دیتے ہیں جس سے ایک معمولی کاشتکار کا چھٹکارا آسان نہیں۔ ضمانت کی غیر موجودگی کی صورت میں وہ اپنی اس شرح سود کو جائز خیال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کسی حد تک ان کا یہ خیال ٹھیک ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے جو شرح سود طے ہوگئی اس سے کم بھی وصول کر لیجائے لیکن روپیہ دیتے وقت یقینی طور پر ایک بڑی شرح لگائی جاتی ہے تاکہ اس کے خوف سے کاشتکار روپیہ کی واپسی کی جلد فکر کرے۔ جو ساہوکار روپیہ خود جمع کرنے کی غرض سے لیتے ہیں وہ اس پر بھی بنکوں کے مقابلہ میں زیادہ سود دیتے ہیں۔ دوسری چیز جو مہاجنوں کو زیادہ سود لینے پر مجبور کرتی ہے وہ موجودہ کساد بازاری ہے جس سے زراعت پر بہت اثر پڑا ہے اس کے علاوہ مشترکہ سرمایہ سے جاری شدہ بنک اور کوآپریٹو سوسائٹیز میں مقابلہ کی وجہ سے بھی وہ اپنی شرح سود بڑھا دیتے ہیں۔ بنکوں نے بھی اب ان مہاجنوں کی ہنڈیاں بھنانے میں سخت شرطیں لگا دی ہیں بنگال بنکنگ انکوائری کمیٹی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مشترکہ سرمایہ کے بہت سے بنکوں نے ہندوستان کی پرانی فرموں پر بھی یہ پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

ان حالات کی صورت میں مہاجنوں کی زیادتی شرح سود دوسرے بنکوں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں معلوم ہوتی لیکن اس سے یہ نہ تصور کر لیا جائے کہ مہاجنوں اور ساہوکاروں کی خواہ مخواہ طرفداری کی جا رہی ہے۔ بہت سے بنک بھی اکثر اوقات اور خصوصاً مالی مشکلات کے زمانہ میں اپنی شرح سود بڑھا دیتے ہیں یعنی اگر مہاجن ۱۰ یا ۱۲ فیصدی سود لیتا ہے تو بنک بھی ۸ اور ۱۰ فیصدی سے کم نہیں لیتے۔
ذیل میں مختلف صوبوں کی شرح سود درج کی جاتی ہے جس سے وہاں کے ساہوکاروں کی شرح کا اندازہ ہوگا:۔

آسام:۔ شرح سود ۱۲ فیصدی سے ۷۵ فیصدی تک پہنچ جاتی ہے۔
گجرات:۔ ۹ تا ۱۵ فیصدی۔
بمبئی:۔ ۱۲ تا ۲۵ فیصدی۔ سندھ میں یہ شرح اکثر اوقات ۵۰ فیصدی تک پہنچ جاتی ہے۔
بنگال:۔ کم از کم ۱۰ تا ۳۷ فیصدی۔ غیر ضمانتی قرض کی صورت میں اکثر ۳۰۰ فیصدی تک یہ شرح پہنچ جاتی ہے۔
بہار و اڑیسہ:۔ نقد قرضہ پر ۱۸ تا ۲۷ فیصدی اور جنسی قرضہ پر ۲۵ تا ۵۰ فیصدی
برما:۔ ۱۲ تا ۲۴ فیصدی۔ چھوٹے چھوٹے قرضوں پر ۴۰ تا ۶۰ فیصدی۔
صوبجات متوسط:۔ ۱۲ تا ۳۷ فیصدی۔ جنسی قرضہ پر ۲۵ تا ۱۰۰ فیصدی۔
وسطی ہند (اجمیر۔ مارواڑ) ضمانتی قرضہ پر ۶ تا ۱۲ فیصدی۔ غیر ضمانتی قرضہ پر ۱۲ تا ۱۸ فیصدی
دہلی:۔ ۱۲ تا ۲۴ فیصدی۔
سرحدی صوبہ:۔ ۱۲ تا ۳۰ فیصدی
مدراس:۔ ۱۲ تا ۲۴ فیصدی۔

مذکورۂ بالا اعداد سے پتہ چلیگا کہ قرضہ دونوں صورتوں میں دیا جاتا ہے یعنی روپیہ کی صورت میں بھی اور غلہ کی شکل میں بھی اور سود بھی دونوں طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ قرض دیتے وقت جو شرح ہوتی ہے وہ کچھ اور ہوتی ہے اور وصولیابی کے وقت کچھ اور شرح لگائی جاتی ہے تعجب کی

بات یہ ہے کہ شرح سود کی اس زیادتی پر بھی ملک کی اندرونی تجارت کا تقریباً ۷۰ یا ۸۰ فیصدی حصہ انہی مہاجنوں کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔

دیہاتی قرضہ کا بار | مہاجنوں کی ان سخت گیریوں کا جو اثر کسانوں پر پڑتا ہے وہ بھی انتہائی تکلیف دہ ہے التزاوفات قرض کی رقم دینے سے پہلے ہی سود کی طلب شروع ہو جاتی ہے یا کبھی کسی سادے کاغذ پر انگوٹھا لگوالیا اور جو رقم چاہی اس پر لکھ لی۔ اور یہی کھاتوں میں گڑبڑ کرنا تو مہاجنوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ غربت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کاشتکاروں کی جہالت بھی ان کی بہت سی مشکلوں کا باعث ہوتی ہے۔

بعض اوقات کاشتکار کو اپنی غیر ذمہ دارانہ احساس کی وجہ سے بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے جس میں سب سے بڑا دخل نادہندگی کو ہے لیکن زیادہ تر یہ غیر ذمہ داری ان کے انتہائی افلاس و غربت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ غربت سے زیادہ اُن پر اس قرضہ کا بار بھی ہوتا ہے جو ان کے والدین ان کی ادائیگی کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ اپنی مصیبت، پچھلے قرضہ کا بار اور بہت سی دوسری اسی قسم کی باتوں سے مجبور رہ کر کسان قرض لیتا ہے اور لیتے وقت وہ یہ خوب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ چاہے قرضہ لے یا نہ لے وہ ہمیشہ مقروض ہی رہیگا۔ اور اس مجبوری کی حالت میں اس کو مہاجن کا ہر حکم ماننا پڑتا ہے یہاں تک کہ سادے کاغذ پر انگوٹھا لگا دینا پڑتا ہے اور بعد میں جو رقم چاہے لکھ لے۔ نا اُمیدی کی حالت میں اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا اور اپنی موجودہ مشکلات کو حل کرنے کے لیے اکثر اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ مستقبل کی بالکل فکر نہیں رہتی۔ ثبوت کے لیے دیسی کسانوں کی مالی حالت کا اندازہ کافی ہے۔

ممکن ہے کہ ذاتی قرضہ کا بار کسی پر زیادہ ہو کسی پر کم لیکن ہندوستان کی دیہاتی آبادی پر اس وقت مشترکہ بار ۹ ارب سے کم نہیں۔ اس بار کی ادائیگی ممکن ہو یا نہ ہو بہرحال ان کے سروں پر یہ بوجھ ہے جو ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے کسانوں کی حالت بجائے سدھرنے کے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت کوئی سوسائٹی یا ادارہ خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری ایسا

نہیں ہے جو اس مسئلہ پر غور کرے کہ اس بار کو ہلکا کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ مختلف قانون اکثر صوبوں میں ضرور موجود ہیں مثلاً دکن Deccan Agricultural Relief Act وغیرہ جن سے کاشتکاروں کی تھوڑی بہت حفاظت ہوتی ہے۔ لیکن ان قوانین کا نفاذ بہت ہی محدود دائرہ تک ہے اور اتنے زیادہ اثر پذیر بھی نہیں جس سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ دوسرے ان قوانین کی مدیں بھی اتنی سخت اور مشکل ہیں کہ ہندوستان کے جاہل کاشتکار ان کو آسانی سے سمجھ بھی نہیں سکتے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ زراعت کے لیے ابھی ہندوستان میں مالی آسانیاں پیدا نہیں ہیں۔ اس موقعہ پر سر ڈینیل ہملٹن کے الفاظ دہرانا مناسب ہوگا جو انہوں نے جیمبرلین کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہے تھے۔

" ہندوستان کے موجودہ بنکنگ سسٹم میں یہ ایک زبردست کمی یا خرابی ہے کہ وہ ملک کے سب سے بڑے کاروبار یعنی زراعت کے لیے زیادہ آسانیاں بہم نہیں پہنچا سکتا جس پر ڈھائی کروڑ انسانوں کی زندگی کا دارومدار ہو اور اتنی بڑی چیز صرف چھوٹے چھوٹے مہاجنوں اور ساہوکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہو۔۔۔۔"

مشترکہ سرمایہ سے جاری شدہ بنک انگلستان میں زراعت کے سب بہت مفید ثابت ہوئے ہیں لیکن ہندوستان میں ان کو زراعت سے کچھ غرض نہیں وہ صرف تجارت کے فائدہ کے لیے ہیں جب تک اس پر توجہ نہ کی جائیگی سر ڈینیل ہملٹن کے مذکورہ بالا الفاظ ہمیشہ صحیح رہینگے۔

ماتمِ اقبال

ہیں کس کے غم میں سیہ پوش مشرق و مغرب
بچھی ہے کس کے لیے دہر میں صفِ ماتم

عطا ہوئی تھی جو صدیوں کی آرزوؤں سے
فغاں کہ لٹ گئی وہ بے بہا متاعِ عجم

تھی جس میں روم کی شمع کہن فروغ انگیز
ہزار حیف کہ وہ بزم ہو گئی برہم

اُٹھا نہ کوئی بھی تجھ سا دیارِ مشرق سے
صدائے ساز و نوا ہائے راز کا محرم

ترا ضمیر تھا اسرار کا وہ آئینہ
کہ جس میں عکس فگن تھا رخِ وجود و عدم

تری نظر کو نمایاں تھا آب و گِل کا جمال
تری نگاہ پہ روشن تھی فطرتِ آدم

پیامبر تھا تو دنیا میں اوج و رفعت کا
کہ تھا تو واقفِ پروازِ قطرۂ شبنم

ہر ایک حرف میں تھا تیرے نغمۂ الہام
سروش کی تھی صدا یا تری نوائے قلم

ہنوز عظمتِ رفتہ کی یاد باقی تھی
تمام عمر رہا نوحہ خوانِ "خیرِ اُمم"

تجھے سناتی تھی نغمے نسیمِ خاکِ حجاز
کہ تھا غلامِ غلامانِ سرورِ عالمؐ

زبسکہ خلد سے خوشتر تھی تجھ کو منزلِ دوست
اسی کے شوق میں کرتا تھا نالۂ پیہم

وہی تھی غایتِ آہ و فغانِ نیم شبی
اُسی کی خاک تھی مقصودِ دیدۂ پرنم

اُٹھا جہاں سے وہ سرشارِ دینِ پیغمبر
کہ جس کے شورِ نوا پر فدا تھی خاکِ حرم

دنیا

شب تار ہے اور ہر طرف تاریکی، روشنی کا نام و نشان تک نہیں کالی رات بادلوں کے کالے کمبل اوڑھے دنیا پر چھائی ہے، کبھی کبھی بجلی چمک جاتی ہے اور راہ گیر دو قدم راستہ دیکھ لیتے ہیں۔ اس وقت چند مسافر وادیوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، برق کی چشمک زنی پر چشم اُمید لگائے چلے جا رہے ہیں۔ چشم زدن کو اُجالا ہوا۔ راستہ نظر آیا اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ راستہ ٹٹولتے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے راہ بھولتے پھر ڈگر پر آتے اٹکل کے تیر تکے لگاتے چلے جاتے ہیں۔ جو بھاگ چلتا ہے پھسل پڑتا ہے، آہستہ خرام چند گام آگے نکل جاتا ہے۔ منزلِ مقصود سب کی ایک ہے پھر راہیں الگ الگ۔

کہیں پیش رفتگاں کے نقش پا پر نظر پڑی دل کو ڈھارس بندھی۔ قدم پر قدم رکھنا تھا کہ پاؤں پھنس کر رہ گئے۔ صراطِ مستقیم سے پیر ڈگمگایا اور دلدل میں گیا۔ صراطِ مستقیم لاپتہ و ناپیدا۔ دلدل کچھ اس قیامت کی ہے کہ اُس سے رہائی معلوم۔ پر اللہ رے ہمت اس کیچڑ میں بھی گوہرِ مقصود کی تلاش ہاتھ سے نہیں دیتے اور ہاتھ پیر مارے جاتے ہیں۔

بوادیِ کہ دراں خضر را عصا خفتست | بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است

سب کی منزل ایک ہے پر راہیں الگ الگ، طریق جُدا جُدا۔ دل میں تجسس، دماغوں پر ایک کیف طاری۔ آنکھیں روشنی کی متلاشی۔ دل اندھیرے سے گھبراتا ہے دماغ شمع ہدایت روشن کرتا ہے ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے شمع بجھا جاتا ہے اور پھر وہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔

سنو کچھ آواز آ رہی ہے۔

آواز:۔ نہ ہستی تھی نہ غیر ہستی۔ نہ فضا تھی نہ اُس پر آسمان۔ کیا چیز سب کو محیط کیے تھی۔ وہ کہاں تھی۔ کیا صرف پانی کی نامعلوم تاریک گہرائیاں اور ناپیدا کنار وسعت تھی۔

کس کو معلوم، کون بتا سکتا ہے۔ یہ دنیا کس چیز سے اور کیونکر پیدا ہوئی۔ ہستی حقیقی اس سے پہلے

تھی یا نہیں کون جانے یہ دنیا کس چیز سے اور کیونکر عالم وجود میں آئی۔

کس شے سے دنیا پیدا ہوئی مخلوق ہے یا اس کا کوئی خالق نہیں وہ ہی جانتا ہو جو آسمان پر سے حکومت کرتا ہے سب کچھ دیکھنے والا مالک حقیقی، یا وہ بھی نہیں جانتا۔ (رگوید)

اس آواز نے مسافروں کو چونکا دیا پست ہمت کمربستہ ہو گئے ہوا سرسرائی بادل پھٹے آسمان پہ ایک تارا نمودار ہوا چشم تلاش اس پر جم کر رہ گئی دل نے کہا یہ ہی ہے۔ اتنے میں ماہتاب بآب و تاب نمودار ہوا، آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ستاروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور کچھ نظروں سے غائب ہو گئے، دل نے کہا چھپ جانے والا ہمارا خدا نہیں ہو سکتا اور قلب پرستار ستاروں کا دامن چھوڑ ماہ کامل کے سامنے سر بسجود ہوا تاجدار مشرق نکلا اور چاند ماند پڑ گیا۔ لوں نے کہا یہ سب سے بڑا ہے بیشک یہ ہمارا رب ہے۔ رات نے سورج کو مات دی اور پھر بساط انجم آسمان پر بچھی ٹیم غمگین زچ ہو گئی اور کہا اگر نہ ہدایت کرے مجھ کو میرا رب میں ہو جاؤں گا بھٹکے ہوئے گروہ میں (قرآن مجید)

قلب خدا پرست نے کہا میں کس کو سجدہ کروں۔ من بولا کس کے چرن لوں، ہردے نے کہا کس کے مندر پر بھینٹ چڑھاؤں

اوّل اوّل سنہری روشنی *Hiranyagarbha* پیدا ہوئی اور وہ موجودات کا واحد خالق تھا۔ اس نے آسمان و زمین پیدا کیا۔ میں کس مندر پہ بھینٹ پڑھاؤں

وہ جو زندگی بخشتا ہے، جو قدرت عطا فرماتا ہے۔ چاند اور سورج جس کے مطیع ہیں جو فانی اور غیر فانی ہر شے میں ساری و جاری ہے۔ میں کس کے آگے سر ٹیکوں۔

دل کے اس استفسار پر عقل سلیم نے جواب دیا۔

او پرجاپتی تو ہی اس کا، خانہ عالم کے بندھن کو باندھے ہوئے ہے۔

عقلا اس واحد ہستی کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ اگنی۔ یاما ماتاریسوں (رگوید)

وہ نفس واحد غیر متنفس طریقہ پر موجود تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ (رگ وید)

اندریں خانہ چراغیست کہ زیر تو او ہر کس می نگری اتجتے ساختہ اند

یہ تمام مسافر اس سوال و جواب سے گورکھ دھندے میں غلطاں و پیچاں ایک دریا کے کنارے جا نکلے ۔ سردی کی آگ سلگا کنڈل بنا اس کے گرد ہو بیٹھے ۔

کچھ دیر نہ گذری تھی کہ ایک آواز آئی ۔

آواز : یہ سارا سنسار کیونکر بنا ؟

کنڈل میں سے ایک شخص اٹھا اور بولا : ایشور نے جب چاہا پانی، آگ اور ہوا سے یہ سنسار بنا کھڑا کیا اور جب چاہتا ہے اس کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور پھر تمام چیزیں آگ، پانی اور ہوا میں تبدیل ہو جاتی ہیں ۔

دوسرا بولا :۔ ایشور بنا کر بگاڑتا کیوں ہے ۔

پہلا سادھو جس نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا بولا : ایشور جب دنیا والوں کو چین دینا چاہتا ہے تو اس کشمکش کے کارخانے کو مٹا دیتا ہے

اس گروہ میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا : کام سب بے خواہش ضروری ہے اور خواہش انسان سے متعلق ہے ، ایشور اس سے بالاتر ہے ۔

دوسرے نے جواب دیا :۔ بیشک اچھا (خواہش) ایشور کا کام نہیں یہ سنسار ایشور نے اچھا سے نہیں بنایا یہ تو اس کی لیلا ہے ۔ ایشور ایک سرور کے عالم میں ناچ رہے تھے اس کیفیت میں کوئی حرکت ایسی ہوئی کہ یہ دنیا بن گئی ، پھر کسی وقت یک جنبش ابرو یہ سب درہم برہم ہو جائیگی اور پھر اسی طرح بن جائیگی ۔ یہ سب ان کی لیلا ہے ۔

اس محفل میں ایک اور عقلمند کھڑا ہوا اور بولا سب وہی مادہ ہے جو شکل چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے ۔ ایشور کو اس میں کچھ دخل نہیں ۔

دوسرے نے جواب دیا :۔ اس نظام عالم کو چلانے کے واسطے کوئی منتظم ہونا چاہیے ۔

ایک بولا :۔ ایشور عناصر میں تشکیل کی خواہش پیدا کر الگ ہو جاتا ہے اور باقی تمام کام برہمو

کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایشور نے سنسار کسی ذاتی مطلب سے نہیں پیدا کیا بلکہ سب کی بہتری کے لیے بنایا ہے۔ حتیٰ کہ غم و رنج بھی مکتی کا راستہ دکھاتے ہیں۔

ایک مست مادہ پرست کھڑا ہوا اور کہا:۔ دنیا سے کیا لیجانا۔ کھانا پینا مرجانا، دنیا ہی دنیا ہے نہ اس سے پہلے کچھ تھا نہ اس کے بعد کچھ ہے، مادہ ہے جو شکلیں بدل رہا ہے۔ کھاؤ پیو اور مزے کرو، نہ عقبیٰ ہے نہ عقوبت ایشور اور سارے دیوتا برہمنوں کے من گھڑت ہیں جو دنیا کو بیوقوف بنا کر اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں ہیں۔ حقیقت میں چار عناصر لافانی ہیں۔ دھرتی، پانی، اگنی اور پون اور انہی کے ارتباط سے عقل پیدا ہوتی ہے۔ روح اور جسم ایک ہی ہیں الگ الگ نہیں۔

جب تک دم میں دم ہے مزے اڑاؤ۔ موت کے چنگل سے رستگاری نہیں۔ جب ہمارا جسم نذرِ آتش کر دینگے تو واپس کہاں سے آئیگا۔

لذات ترک کر دیں کہ ان میں رنج کی آمیزش ہے یہ بے وقوفوں کا مسلک ہے۔ کونسا دانا چاول پھینک دیگا کہ اس کے ساتھ بھس بھی ہے۔

نہ سُرگ ہے نہ مکتی نہ دوسری دنیا نہ اعمال کی جزا و سزا۔ اگنی ہترا اور تینوں وید جاہلوں اور نامردوں کا سہارا ہیں۔

اگر جوتش ٹوم پر جو جانور بھینٹ چڑھایا جائے وہ سیدھا بیکنٹھ کو چلا جاتا ہے تو اپنے باپوں کو کیوں نہیں قربان کرتے اُنکی مکتی ہو جائیگی۔

جب تک سانس ہے عیش و عشرت میں بسر کرو۔ گھی کھاؤ چاہے قرض لے کر ہی کھاؤ۔

اب یونان کے فلاسفہ کی باری آئی۔ ان کا نمائندہ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: دنیا آگ پانی اور ہوا سے بنی ہے۔

اس کا ایک اور ہم وطن اُٹھا اور بولا:۔ دنیا ایٹمز سے بنی ہے اور ایٹمز تمام و کمال ایک قسم کے ہوتے ہیں۔

دوسرا بولا:۔ دنیا ایٹمز سے ضرور بنی ہے، پر وہ سب ایک قسم کے نہیں ہوتے۔

یونان کے تمام فلاسفہ اس پر متفق تھے کہ دنیا خود بنی ہے اس کا بنانے والا کوئی نہیں۔

اب افلاطون نے جلسہ کو مخاطب کیا اور کہا۔ ایک دنیائے مجاز ہے ایک عالمِ حقیقت۔ آخر الذکر کون ومکاں سے مستغنی ہے۔ دنیائے مجاز کا عرفان تجربہ اور احساسات سے ہوتا ہے۔ عالمِ حقیقت میں ہر شے بحد کمال موجود ہے۔ عالمِ مجاز اس حقیقت کا پرتو ہے نامکمل اور ناقص۔

ایک بزرگ کھڑے ہوئے اور کہا وہ ذاتِ واحد اول و آخر ہے جس نے کن کہا (ہوجا) اور ایک روح دوڑ گئی اور اس عالم اسباب کی تشکیل شروع ہوئی۔

وہ خالق مطلق اپنی مخلوق کی طرف سے بے خبر نہیں۔

سزا و جزا مقرر ہے اور ہدایت کرنے والے من جانب اللہ وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔

وہ ذاتِ لایزال بعلم ہر شے میں پرتو فگن ہے۔ کوئی چیز اُس سے خالی نہیں دیکھنے کو چشم بصیرت اور عرفان سلیم درکار ہے۔

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ورنہ یہاں جو پردہ ہے پردہ ہے ساز کا

ان بزرگ نے اپنی تقریر ختم کی تھی کہ ایک صوفی صافی کھڑے ہوئے اور کہا۔ ہمہ اوست

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیران ہوں پر مشاہدہ ہے کس حساب میں

حقیقت وہی ہے اس کے ماسوا سب دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

اب ایک مادہ پرست کھڑا ہوا اور بولا:۔ دنیا ایک کرۂ آتش تھی، آگ کا دہکتا ہوا الاؤ۔ یہ الاؤ برسوں سلگتا رہا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ ذرا آنچ دھیمی پڑی اور دوسری طرف سے شعلے دوڑ پڑے۔ آتش افسردہ کو پھر بھڑکا دیا۔ اگنی کا راج تھا۔ آتش کا دور دورہ۔ ایک عرصہ تک یہ جلاجل کا بازار گرم رہا اور پھر ابر اُٹھنے شروع ہوئے۔ بادل برسے اور دل کھول کر برسے۔ پہلے تو آگ چھینٹا پاکر بھڑک اُٹھی۔ سمندِ ناز پر اک اور تازیانہ ہوا۔ پھر آخر کار ابر بہار نے آتش سوزاں کو افسردہ کر دیا آسمان پر سے دڑیڑے پڑے، موسلا دھار بارش ہوئی۔ ایک ابر جاتا تھا ایک آتا تھا۔ آگ پر پانی پڑ گیا شعلوں کی گرما گرمی سرد مہری سے بدل گئی۔ زبانِ آتش سرد ہو گئی، آگ بجھ کر رہ گئی۔ مینہ برسے اور برسوں برسے

زمینِ تشنہ کام نے پانی پیا اور سیر ہو کر پیا۔

اب ابر کھلا اور سورج کی کرن نمودار ہوئی۔ عالم روشن ہو گیا چشم بینا نے دیکھا تو کہیں بستیاں تھیں کہیں بلندیاں۔ سر بفلک پہاڑوں کے پہلو میں وادیاں پانی سے بھری تھیں جن میں سرافراز خاکی اپنا عکس رُخ دیکھ رہے تھے، کہ اچانک

موت میں حیات پیدا ہوئی اور سکون میں حرکت۔ بے جان میں جان پڑی۔ پہلا ذرّۂ حیات سطحِ آب پر تیرتا نظر آیا۔ لاکھوں برس آغوش فنا میں یہ ذرّۂ حیات پرورش پاتا رہا۔ اسی دور میں کچھ عادتیں پیدا کرلیں جو جنگ حیات میں اس کے کام آنے والی تھیں۔ کبھی چشموں اور نہروں کی تاریک گہرائیوں میں روپوش ہو گیا۔ جائے امن پائی جڑ پکڑلی اور نباتِ آبی بن گیا۔ گاہے یہ خانہ بدوش دوشِ امواج فنا پر نظر آیا کہ (جلی فش) بن گیا تھا۔

نباتِ آبی نے جب تہِ آب جگہ نہ پائی تو دامن کوہ کی دلدلیں آباد کیں۔ دن میں دو دفعہ ہم آغوشیِ آب انہیں سیراب کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ پانی کی مفارقت میں زندگی گزارنے کی عادت پڑ گئی۔ یہ پودے بڑھے اور گلہائے خوش رنگ و خوشبو سے بارور ہوئے۔ بڑی بڑی مکھیوں اور پرندوں نے بیج جہاں تہاں پھیلا دیئے۔ دنیا سرسبز ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد حیات آبی خشکی کی طرف متوجہ ہوئی اور آہستہ آہستہ پانی اور خشکی دونوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرلی اس قسم کی مخلوق کا نام Amphi bious ہے۔ خشکی کی آب و ہوا کچھ ایسی راس آئی کہ اکثر نے پر پُرزے نکالے پرند بن گئے اور زمین کی لاانتہا پیداوار کھا کھا کر موٹے ہونے شروع ہوئے۔ آخرکار ایک ایسی ہوا چلی کہ یہ سب فنا ہو گئے۔ خیال ہے کہ اکثر مُٹاپے سے پھٹ گئے اور باقی فاقوں مر گئے۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے پیٹ پلنا ناممکن اور مُٹاپا ہلنے نہ دیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مخلوق نیست و نابود ہو گئی۔

اب حیات ایک اور جانور کی جون میں آئی اور اس کا نام Mam mals تھا Mam mals اپنے بچوں کی حفاظت اور پرورش کرتے اور دودھ پلا کر پالتے تھے۔ یہ صنف مفقود نہ ہوئی اور اب تک ہماری شریک حیات ہے۔

(باقی)

قطعۂ تاریخ وفات علامہ اقبال مرحوم

لطفِ مجلس کیا رہا جب میر مجلس اُٹھ گیا
وائے ناکامی کہ بزمِ اہلِ دل برہم ہے آج

تھا جہاں کل نغمۂ مستانہ کا جوش و خروش
ہے وہاں آہ مسلسل۔ نالۂ پیہم ہے آج

سینۂ مُسلِم کہ تھا گنجینۂ شوق و اُمید
ہے وفورِ یاس اس میں اور ہجومِ غم ہے آج

فکر کی جب سال رحلت کی تو دل نے دی صدا
ملت اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج

۱۳۵۷ ھ

تنقید و تبصرہ

الکتاب الوحید ترجمہ مفتاح التجوید۔ اصل کتاب شیخ عبداللہ بن ابراہیم حمدوہ ملی کی ہے جو فن قرأت و تجوید میں مبتدیوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی مدنی نے جو ریاست رامپور کے مدرسۂ عالیہ میں قرأت کے استاد ہیں کیا ہے۔ آخر میں چند فصلوں میں اس فن کے متعلق بعض فوائد کا اضافہ بھی کیا ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ ضخامت $\frac{20 \times 26}{8}$ کی تقطیع پر، ۷ جز اور قیمت ۸ر ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی۔ خانقاہ معصومی متصل بازار نصر اللہ خاں ریاست رامپور

شمس معنوی۔ مصنفہ غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ضخامت ۱۰۸ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ معارف پریس اعظم گڈھ

اہل ادب میں یہ امر تحقیق طلب ہے کہ شمس تبریزی کے نام سے غزلیات کا جو دیوان چھپا ہے وہ خود حضرت شمس تبریزی کا ہے یا مولانا روم کا۔ مصنف نے اس پر تاریخی دلائل سے روشنی ڈالتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ دراصل یہ دیوان خود مولانا روم علیہ الرحمہ کا ہے۔ بیرونی شہادتوں سے بھی اور اندرونی شہادتوں سے بھی۔ پھر مولانائے موصوف کی شاعری پر تنقیدی بحث کی ہے جو نہایت طویل الذیل ہے۔ یہ بحث جس قدر دلچسپ ہونی چاہیے تھی اُس قدر دلچسپ نہیں ہے۔ کیونکہ تنقید کسی اصول کے ماتحت نہیں کی گئی ہے بلکہ طالب علمانہ طریقہ سے جس قسم کے محاسن یا معائب سمجھ میں آئے اُن کو لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ عموماً ہر شاعر کے کلام میں دکھائی جا سکتی ہیں۔ بے شک بعض خصوصیات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ کاش انہی خصوصیات ممیزہ کو اچھی طرح دکھانے کی کوشش کی جاتی اور عام باتیں نظر انداز کر دی جاتیں تو کتاب میں کچھ جان پیدا ہو جاتی۔ جہاں تک تاریخی معلومات فراہم کرنے کا تعلق ہے مؤلف کی کوشش قابل داد ہے۔

صحیفۃ التکوین۔ مصنفہ ہز ہائینس محمد ناصر الملک والی چترال۔ کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ درجہ کا۔

ضخامت تقریباً ، اجز و مجلد قیمت ستے، ملنے کا پتہ۔ محمد نصیر ہمایوں۔ بی لے قومی کتب خانہ۔ ریلوے روڈ لاہور

یہ کتاب فارسی نظم میں ہے۔ سر ہائینس نے اس میں عالم کی تکوین اور تخلیق کی داستان بیان کی ہے۔ پہلے حصہ میں علم ہیأۃ جدیدہ کے مطابق آسمانوں اور اجرام سماوی کا بیان ہے۔ اس میں سیاروں کے بُعد مکانی اور فاصلوں کو بھی اشعار ہی میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں مسئلہ ارتقا اور تخلیق انسان کے متعلق مفصل بحث ہے۔ اور یہ بھی نظم ہی میں ہے۔ ہر چند کہ یہ مسائل نظم میں نہیں سما سکتے مگر ہز ہائینس نے نہایت سادگی اور خوبی کے ساتھ ان کو بیان کر لیا ہے۔ مسئلہ ارتقا کے متعلق ان کے سامنے علامہ مشرقی کا تذکرہ تھا جنہوں نے پہلی بار اُردو میں قرآن کی روشنی میں اس مسئلہ کی تفصیل کی ہے۔ وہی رنگ اس نظم میں بھی ہے۔ یہ کتاب اپنے انداز اور اسلوب میں بہت انوکھی ہے۔ شاعرانہ خوبیاں ان علمی اہم مسائل کے بیان میں تلاش کرنا عبث ہے۔ مگر اسی کے ساتھ کلام کی سادگی پر حرف گیری بھی نہیں کی جا سکتی۔

تفسیر سورۂ والعصر ۔ مولفۂ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی۔

دائرۂ حمیدیہ، قرآن کی خدمت اور ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر کے غیر مطبوعہ اجزاء کو اردو میں منتقل کرنے کی غرض سے قائم ہوا ہے۔ اس نے اب تک متعدد مفید اور اہم کتابیں شائع کی ہیں یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک کتاب ہے۔

یہ مختصر رسالہ بھی مولانا کی اُنہی خصوصیات کا حامل ہے جو اور رسالوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں زمانہ کی قسم کھانے کی وجہ بیان کی گئی ہے، لفظ "تواصوا" سے خلافت کا وجوب ثابت کیا گیا ہے اور "حق" و "صبر" کی تشریح اور ان کا باہمی تعلق دکھایا گیا ہے۔ غرض اس چھوٹی سی سورہ کی تفسیر اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ترجمہ نہایت شستہ اور سلیس ہے۔ کاغذ اور طباعت و کتابت عمدہ ضخامت قیمت ۶ر۔ منیجر دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڈھ کے پتہ سے منگائی جا سکتی ہے۔

محبوب خدا ۔ از چودھری افضل حق صاحب تقطیع درمیانی ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط جلد خوشنا قیمت عہ ملنے کا پتہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔

آں حضرتؐ کی سیرت پر اُردو میں لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بڑوں کے لیے بھی بچوں کے لیے بھی اور کیوں

نہ ہو عہ ہو للمسک ما کررتہ یتضوع ۔ خاکہ ایک ہی ہے مگر رنگ بھرنے والے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس میں رنگ بھرتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب چودھری افضل حق صاحب کے زمانہ اسیری کا کارنامہ ہے۔ شروع میں اُنھوں نے عرب کے جغرافیہ، تاریخ، ادب و انشا اور عربوں کے عادات و خصائل پر مختصر سی نظر ڈالی ہے۔ پھر آنحضرتؐ کی سیرت ہے۔ پیدائش سے لے کر وفات تک۔ اندازِ بیان دلکش ہے لفظ لفظ سے والہانہ عقیدت ٹپکتی ہے کہیں کہیں زبان و بیان کی خامیاں ہیں لیکن نظر انداز کر دینے کے قابل۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں بہت مقبول ہوگی۔ ظاہری خوشنمائی کا بھی خاصا اہتمام کیا گیا ہے۔

ایمانِ سخن ۔ یعنی شیر محمد خاں ایمان دکنی کے کلام کا انتخاب ۔ مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ایم اے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۰۔ قیمت ۱۲ ؍ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اُردو شاعری یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُردو زبان کی ابتدا دکن سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب اورنگ زیب کے حملے کے بعد دکن کے شعرا دہلی اور دہلی کے شعرا دکن آنے جانے لگے تو شعرائے دہلی نے بھی فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی کہنا شروع کیا۔ اس وقت تک دکن کے شعرا، دکنی ماحول سے متاثر تھے اور دکنی زبان میں شعر کہتے تھے۔ لیکن شعرائے دہلی سے اختلاط کے بعد وہ بھی دلی کی زبان اور محاورات کے پیرو ہو گئے۔ ولی کا تعلق اس عبوری دور سے اور ایمان کا تعلق ارتقائی دور سے ہے۔

دکن نے اُردو زبان اور اُردو شاعری کی جو خدمات انجام دیں اور اُس کی تخلیق و ارتقا میں اس کا جو حصہ ہے اُسے اُجاگر کرنے کے لیے دکن کے بعض اہلِ ذوق حضرات نے یہ طے کیا ہے کہ "دورِ آصفیہ کے بارہ شاعروں کے ایسے انتخابات شائع کیے جائیں جو اُردو ادب میں اضافہ کا باعث ہوں اور جن کے مطالعے سے اُردو کا ذوق رکھنے والے نوجوان اپنے ذوقِ سخن میں ترقی کر سکیں" اس سلسلہ میں اب تک عزیز، مائل، کیفی سراج اورنگ آبادی اور فیض کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں اور زیرِ نظر انتخاب اس کی چھٹی کڑی ہے جسے سید محمد صاحب ایم اے نے ایک مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس مقدمہ میں دکن کی اُردو شاعری پر عموماً

اور ایمان کی شاعری پر خصوصاً مفصل نظر ڈالی گئی ہے۔

"ایمان بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں"۔ غزلوں کے علاوہ ان کے زیرِ نظر انتخاب میں دس قصیدے، تین مثنویاں، بیس رباعیاں، سات مخمس، ایک ایک قطعہ، مثلث اور مسدس شامل ہیں۔ ایمان۔ میر و سودا کے ہم عصر تھے اور اسی دور کی زبان سے متاثر۔ ان کے کلام کی خصوصیات "الفاظ کی دروبست اور بندش کی چستی کے ساتھ محاکات۔ روانی و سلاست اور سادگی و صفائی ہیں" نمونہ ملاحظہ ہو۔

میں وہ غمزدہ ہوں کہ مانندِ شمع   طرب کی بھی مجلس میں روتا رہوں

سیرِ گلشن کی نہ دو تکلیف مجھ کو دوستو   گردِ باد آسا مجھے صحرانوردی چاہیے

سنتے ہی ایک خلق کے آنسو ٹپک پڑے   لیکن کیا نہ آہ نے اپنے اثر تجھے

بلبل کے قید کرنے سے فصلِ بہار میں   صیاد کیا ملیگا بجز زشتی پر تجھے

زندگی شکل خواب کی سی ہے   موج گویا سراب کی سی ہے

کبھو حرم میں کبھو دیر میں مجھے پیارے   کہاں کہاں نہ لیے تیری چاہ پھرتی ہے

ہم جب آئے ہیں تری بزم میں اے رشکِ چمن   نہ کیا غور کسو نے کہ کدھر بیٹھ گئے ہم

بہر حال اُردو شاعری کے ارتقائی مدارج کا مطالعہ کرنے والے حضرات کے لیے ایمان کا یہ انتخاب دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ اُمید کہ اہلِ ذوق اس سے استفادہ کرینگے اور قابل مرتب کی کوششوں کی داد دینگے۔

رفتار عالم

ممالک غیر

مثل مشہور ہے، نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ برطانیہ کی حکومت نے سولینی کو اپنے خلوص کا یقین دلانے کے لیے ایک بے گناہ وزیر خارجہ کو برطرف کیا، تقریر اور تحریر میں ۱۹۳۵ء سے اب تک اٹلی کے ظلم زیادتی اور غاصبانہ رویے کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا اُسے جھٹلا کر لیگ کے دربار عام میں بکری کو مجرم اور بھیڑیے کو حق بجانب ثابت کرنے کا بیڑا اُٹھایا، تجارتی نقصان فلسطین اور عرب میں دخل در معقولات اور باری ریڈیو اسٹیشن کی دروغ گوئیاں معاف کر دیں۔ اور اس کا اجر کیا ملا؟ مسولینی کی ایک تقریر کہ جس میں اُس نے کہا کہ انگلستان کو اب اٹلی کی طاقت کا اندازہ ہو گیا ہے، اطالوی حکومت معاہدے کا پورا لحاظ تو بے شک کرے گی مگر وہ اس زمانے کو نہیں بھولی ہے جب کہ برطانیہ اور فرانس کی تحریک سے اٹلی پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں، اور اصول کے معاملہ میں فاشسٹ قومیں ایک دوسرے کے آڑے آئینگی۔ برطانیہ کے جھکنے اور دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے جواب میں آخر اس طرح اکڑنے، ملاقات کے بعد اس طرح پیچھے سے لات مارنے کے کیا معنی؟ کیا ہٹلر مسولینی کے کان میں کچھ پھونک گیا ہے؟ کیا مسولینی کو خیال ہے برطانیہ کا صبر ابھی اور آزمایا جا سکتا ہے، نیک نیتی اور شرافت سے ابھی اور فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے؟

ویسے دیکھئے تو برطانیہ نے حبش پر اٹلی کا قبضہ تسلیم ہی نہیں کرایا بلکہ ایک کمزور دعوے کو دوستی کی خاطر حق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حبش کا شہنشاہ بے شک سلطنت چھوڑ کر یورپ میں راست بازی اور حق پرستی کے گُر سیکھ رہا ہے، لیکن حبش پر اٹلی کا قبضہ نہیں ہوا ہے۔ پیرس کے شیطانوں نے ایک راز کے خط کو جو حبش کے وائسرائے ڈیوک اوستا (Aosta) نے مسولینی کو حال ہی میں لکھا تھا بیچ میں کہیں اُڑا لیا اور حبش پر اطالوی حکومت کی قلعی کھول دی، وائسرائے لکھتا ہے:

ہماری حالت واقعی بہت خراب ہے۔ اٹلی کا اثر وہیں تک ہے جہاں تک بندوق کی گولیاں پہنچتی ہیں، اس کے آگے کچھ نہیں۔ یہاں کی ساٹھ لاکھ آبادی ساری کی ساری ہماری کٹر دشمن ہے۔ سر اطالوی چھاؤنی

کے گرد کوئی ساٹھ میل کا حلقہ چھوڑ کر باہر ہر جگہ حبشی سردار جنگ سے پہلے کی طرح حکومت کر رہے ہیں..... ہمارے پاس ہر چیز کی کمی ہے۔ حبشی ہمارے ہاتھ کچھ بیچتے نہیں۔ اس لیے کہ انہیں ہمارے کاغذی سکے پر اب اعتبار نہیں رہا ہے.... نتیجہ یہ ہے کہ حبشی ان بازاروں اور منڈیوں میں آتے ہی نہیں جہاں اطالوی ہوتے ہیں، اور ان کو پولیس بھیج کر پکڑ بلوانے میں خرچ بھی ہے اور خطرہ بھی۔ اٹلی کے سرمایہ داروں نے اِل دوچے یعنی مسولینی کے دباؤ ڈالنے پر بھی یہاں صرف پندرہ کروڑ فرینک لگائے ہیں، جو کہ بالکل ناکافی ہے۔ اس سے بہت زیادہ چاہیے اور فوراً چاہیے۔ اس حالت کو دیکھ کر بہت سے سیاہ قمیص والے، یعنی فاشسٹ جنہوں نے یہاں آباد ہو جانے کا ارادہ کیا تھا طے کر چکے ہیں کہ اٹلی واپس چلے جائیںگے، اور وہاں وہ ابھی سے اپنے والدین اور دوستوں میں اشتعال انگیز افواہیں پھیلاتے ہیں.... اگر یورپ میں جنگ شروع ہوئی تو ہم حبش سے چند ہفتوں کے اندر نکال باہر کیے جائیںگے۔

مسولینی کی احسان فراموشی کا یہ عالم ہے کہ ایسے ملک پر جہاں ابھی تک اٹلی والوں کی جان مال آبرو سبھی کچھ خطرے میں ہے اُسے سچ مچ قبضہ کرنے اور قبضے سے تجارتی فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جا رہا ہے مگر وہ ہے کہ پچھاڑیں کھا رہا ہے دوسری طرف جو کچھ طے ہوا تھا اُسے بھی وہ شبہے میں ڈال رہا ہے۔ حبش مل جانے سے اس کی ہوس پوری ہوتی نہیں معلوم ہوتی، وہ چاہتا ہے کہ ہسپانیہ پر بھی قبضہ جمائے، اور سب طرف یہ خیال پھیل گیا ہے کہ انگلستان اور اٹلی کے معاہدہ کا امتحان اسی وقت ہوگا جب کہ فرینکو ہسپانیہ میں بالکل کامیاب ہو جائے، یہ بھی ایک دوست اور خیر خواہ کو دھوکا دینا ہے، کیونکہ جب فرینکو اور جرمنی اور ساری دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ انگلستان اور اٹلی کی دوستی پر اعتبار نہیں تو اس وقت اٹلی سے جو معاہدہ ہوا ہے اس سے انگلستان کو بھلا کیوں کوئی فائدہ پہنچ سکیگا۔ برطانوی مدبروں کو شاید سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہوگی کہ مسولینی نے تقریر کے لیے خاص وہ موقع منتخب کیا جب لیگ کے اجلاس میں برطانوی اور فرانسیسی نمائندوں کی تقریریں ہو چکی تھیں اور وہ دکھا چکے تھے کہ حبش کے معاملے میں وہ اٹلی کی خاطر اور سب کو خفا کرنے اور حق کو مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب اٹلی کے یہ دونوں خیر خواہ پیچھے ہٹیں تو کس منہ سے اور آگے بڑھیں تو کدھر۔

اٹلی سے دوستی ہو جاتی اور مسولینی اس کا احسان مانتا تو اس کی اُمید کی جا سکتی تھی کہ اٹلی اور جرمنی کی سازباز اور ہٹلر کے رویے سے یورپ بھر میں جو بے چینی ہے وہ دور ہو جائیگی، ہٹلر یہ دیکھ کر کہ مسولینی کی راہ رسم اور لوگوں سے بھی ہے بالکل بے باک نہ ہو جائیگا۔ اور جو دباؤ اس پر لیگ اور انگلستان اور فرانس کی قوت نہیں ڈال سکی تھی وہ شاید ایک چوکھا اتحاد ڈال سکتا۔ چار برس ہوئے مسولینی نے اٹلی، فرانس اور انگلستان کے ایک اتحاد کے ذریعہ جو سٹریزا (stresa) کا محاذ کہلاتا ہے ہٹلر کے لنگڑی لگائی تھی، لیکن انسانی طبیعت کی خباثت دیکھیے کہ اس وقت وہی مسولینی انگلستان سے دوستانہ معاہدہ کرنے کے باوجود کہہ رہا ہے کہ وہ دن گئے جب سٹریزا میں ہم، برطانیہ اور فرانس ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے تھے۔ یہ شوخ اگر کسی طرح ہتھے چڑھتا تو بہتیروں کا کام بن جاتا، لیکن اس کا تو مزاج نہیں ملتا اور بیمار یورپ کی حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے۔

مسولینی نہ مانا تو ہٹلر کو کون منا سکتا ہے اور وسطی یورپ کو اس کے چنگل سے کون بچا سکتا ہے؟ چکوسلوواکیا کے جرمن دو تین مہینے سے بگڑتے چلے جا رہے ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کے سمجھائے سمجھینگے نہیں۔ ان کے لیڈر ہر ہنلائن نے ابھی پراگ میں ایک تقریر کی تھی اور اپنی قوم کے مطالبے پیش کیے تھے وہ چاہتے ہیں کہ چکوسلوواکیا کا جرمن علاقہ الگ کر دیا جائے، اس کی حد بندی کر دی جائے، اور اُس کو سوراج کے پورے اختیارات دیدیے جائیں۔ دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ چکوسلوواکیا اپنی خارجی پالیسی بدلے یعنی لیگ سے قطع تعلق کر لے، رومانیہ اور یوگوسلاویہ سے اس کا جو اتحاد ہے اُسے توڑ دے، روس کا ساتھ چھوڑ دے اور انگلستان اور فرانس سے جو دوستی ہے اُسے بھی بھلا دے۔ اس کے معنی جو ہیں وہ ظاہر ہیں۔ چکوسلوواکیا کی حکومت اپنی جرمن آبادی کو کسی طرح راضی نہیں کر سکتی، سوا اس کے کہ خودکشی کر لے۔ اور خودکشی پر نہ اس کے دشمن اسے راضی کر سکینگے نہ اس کے دوست، اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ دوست اسے جان کے سوا سب کچھ جرمنی کے حوالے کر دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

ہٹلر نے جیسا کہ چاہیے خاموشی اختیار کی ہے۔ ہر ہنلائن کچھ دن ہوئے برلن گئے تھے، جہاں سے وہ شاید یہ نیا مطالبہ لے کر آئے کہ چکوسلوواکیا کو اپنی خارجی پالیسی بدلنا چاہیے حال ہی میں وہ انگلستان بھی ہو آئے

اور اس سفر کا مقصد سوا اس کے کیا ہوگا کہ انگلستان کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی طاقت اور اندرونی کیفیت کا اندازہ کریں۔ غالباً انہوں نے یہ رائے قائم کی ہو گی کہ ہمت والے کے لیے میدان صاف ہے، کیونکہ انگلستان کی آزاد جمہوری حکومت، جہاں اعتراض اور تنقید کی پوری آزادی ہے، اکثر لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے۔ اگر ہر ہٹلر انگلستان کے کمزور یا چکوسلوواکیا کے انجام سے بے پروا ہونے کا خیال اپنے دل میں لے کر گئے ہیں تو حال میں ہوائی قوت کے محکمے پر پریس اور پارلیمنٹ میں جو اعتراض کیے گئے ہیں اور ہوائی جہازوں کے بنانے اور خریدنے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان سے ان کی غلط فہمی اور بڑھیگی اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ ایسی آتشبازی چھوڑیں جس سے وسطی یورپ کے بارود خانے میں آگ لگ جائے۔

لیکن چکوسلوواکیا ہی ایک ملک نہیں ہے جس میں جرمن سیاست خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے جنوب مشرقی یورپ میں وہ برسوں سے اپنا اثر بڑھانے کے لیے طرح طرح کی چالیں چل رہی ہے، لیکن اب آسٹریا مل جانے سے اس کے کاروبار کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ وہ ملکوں سے تجارتی معاملات ہی نہیں کرتی بلکہ قبضہ جمانے کی تدبیریں بھی کر رہی ہے۔ مثلاً وئینا سے بحر ایڈریاٹک کی بندرگاہ ٹریئسٹ (Trieste) تک جو سڑکیں ہیں ان کے گرد زمین نازی روپیے سے خریدی جا رہی ہے۔ یہ علاقہ یوگوسلاویہ میں شامل ہے، لیکن یہاں کے کسان بہت غریب ہیں اور روپیے کی صورت دیکھ کر ان کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ یہاں تھوڑی سی جرمن آبادی بھی ہے جو نازیوں کی طرح سے مدد کر رہی ہے اور اب تک یوگوسلاویہ کی حکومت کوئی ایسی قانونی تدبیر نہیں کر سکی ہے جو اس زمین کی خریداری کو بند کر سکے۔

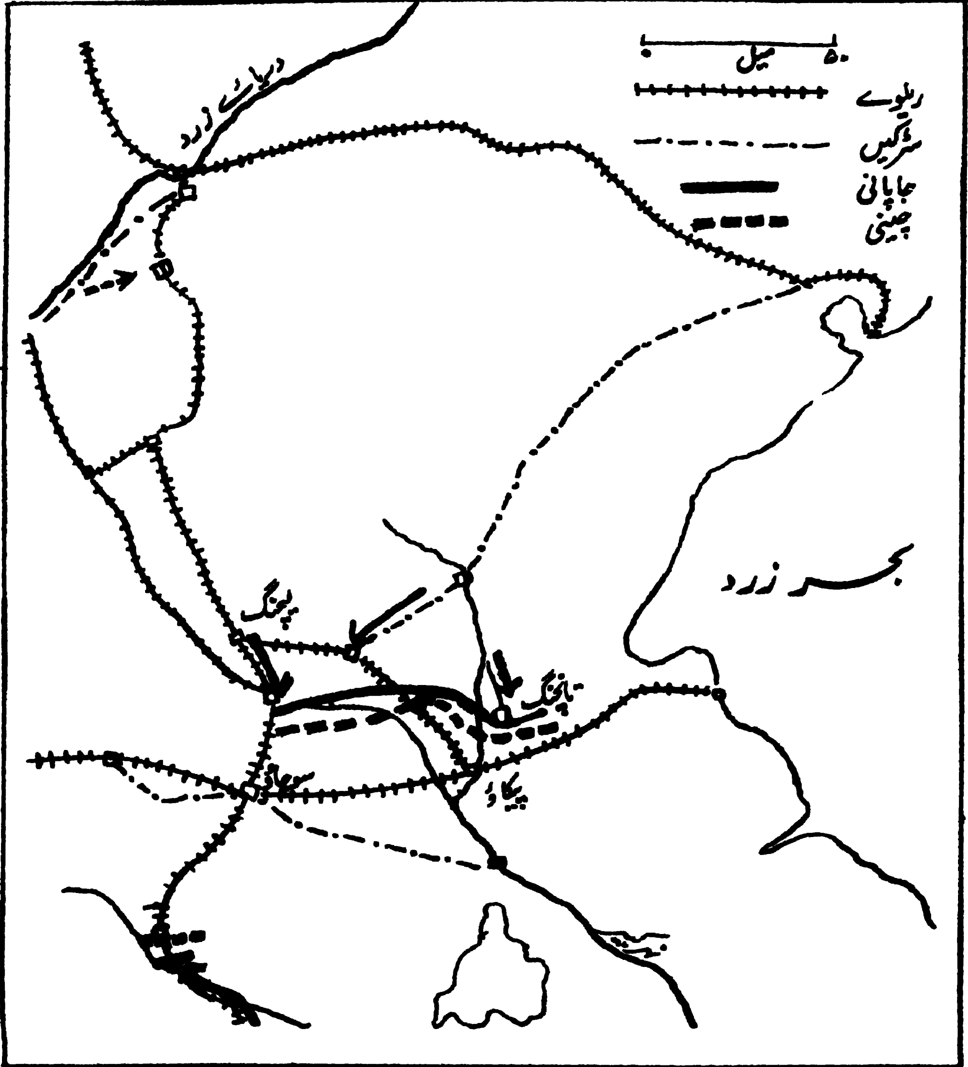
یہ سب کچھ تو ہے، لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یورپی سیاست جرمنی کی پیش قدمیوں کے سبب سے نہیں بلکہ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے ختم ہونے پر پلٹا کھائیگی۔ اس وقت جو قومیں امن کی محافظ ہیں وہ وسطی اور جنوب مشرقی یورپ پر جرمنی کے تسلط کو گوارا کر لینگی لیکن ہسپانیہ اور بحر روم کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینگی۔ اٹلی نے دوستانہ برتاؤ کیا اور ہٹلر کی سمجھ میں یہ نکتہ آگیا کہ مغربی یورپ کے بدلے وسطی اور جنوب مشرقی یورپ حاصل کیا جا سکتا ہے تو خیر، ورنہ جنگ کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہیگا۔

مشرق بعید میں البتہ جو طوفان اٹھا تھا وہ چاہے چینیوں پر آگ برسا رہا ہو لیکن اس سے مغربی قوموں

کو اب کوئی خاص اندیشہ نہیں رہا ہے۔ جاپان نے اپنی سیاست اور فوج کی ساری کمائی ایک داؤں پر لگادی ہے۔ اگر یہ داؤں چل گیا، یعنی لنگھائی ریلوے پر اس کا قبضہ ہوگیا تو اس کی آبرو بچ جائیگی اور قوم سے یہ کہنے کو ہو جائیگا کہ چین میں فتوحات کا سلسلہ شہنشاہ کے اقبال سے برابر جاری ہے۔ لیکن یہ داؤں نہ چلا تو چینی جاپانی فوجوں کو کچا کھا جائینگے۔ انہوں نے ابھی سے قزاقانہ جنگ کرکے جاپانیوں کو جان سے بیزار کردیا ہے، جنوب میں شانگھائی کو اس طرح گھیرے ہوئے ہیں کہ وہاں کی جاپانی فوج ہٹا کر کہیں اور نہیں بھیجی جاسکتی، پائی پنگ اور ٹی ان ٹسن (Tientsin) میں بھی قریب قریب یہی حال ہے اور ان دو مرکزوں سے جو شہر ذرا دور ہیں وہاں چینی جاپانی فوجوں کا پورا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ جاپان نے جن ریلوے لائنوں پر قبضہ کیا ہے وہ آمدورفت اور فوجی سامان پہنچانے کے لیے بیکار ہیں، کیونکہ چینی قزاق انہیں جگہ جگہ سے توڑتے رہتے ہیں اور ان کی محافظ فوجوں پر موقع ملا تو حملہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ چینیوں نے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ سپاہی سپاہی کا مقابلہ ہو تو وہ جاپانیوں سے کسی طرح ہیٹے نہیں، اور پہلے جو خیال تھا کہ چینی حکومت قلیوں اور مزدوروں کو وردی پہنا کر جاپانی فوجوں کو دیکھ کر بھاگنے کے لیے بھیجدیگی وہ غلط اور اس قدر غلط ثابت ہوا ہے کہ جاپانی خود پچھتا رہے ہیں۔

یورپی قوموں کو اسی لیے اور اطمینان ہے کہ جاپانی مدتوں تک چین میں اُلجھے رہینگے۔ اگر اُنہوں نے سوچاؤ پر قبضہ کرلیا، جس پر اس وقت ان کی فوجیں تین طرف سے بڑھ رہی ہیں تو لنگھائی ریلوے چینیوں کے ہاتھ سے نکل جائیگی اور پھر ان کا کسی بڑی فوج کو ایک جگہ جمع کرنا اور اس کے لیے جنگ کا سامان فراہم کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائیگا، لیکن میدان میں تو چینی صرف اپنی ضد پوری کرنے کے لیے مقابلہ کرتے ہیں، ان کا اصل بھروسا قزاقانہ جنگ پر ہے، اور وہ جاری رہیگی۔ جب تک چینیوں کے جسم میں جان ہے جاپان کی شکست اسی قزاقانہ جنگ کے جاری رہنے میں ہے، کیونکہ یہ اس کی نوبت نہیں آنے دیگی کہ وہ ملک کو اپنا کہہ سکیں، یہ قومیت کے جذبے کو اس طرح بھڑکاتی رہیگی کہ بڑے شہروں میں بھی جو چینی جاپانی حکومت کی مدد کریں گے وہ اپنی جان پر کھیل کر کرینگے اور حکومت کو اتنا اطمینان نہ ہوگا کہ قبضے سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ملک میں سرمایہ لگا سکے۔ اگر جاپانی اس کو اس کوشش میں تمام خطروں اور رکاوٹوں کے

باوجود لگے رہے تو وہ اور کسی طرف توجہ نہ کر سکیں گے، اور اگر وہ ناکامیاب ہوئے تو اس سے ان کی سیاست
اور تجارت کو ایسا صدمہ پہنچیگا کہ وہ تمام منڈیاں جہاں سے انہوں نے یورپی تجارت کو بیدخل کیا ہے پھر



یورپی سرمایہ داروں کے ہاتھ آجائینگی اور شاید یہ کساد بازاری اور ان مداوتوں کو جو منڈیوں کی کمی سے پیدا
ہوئی ہیں ایک عرصہ کے لیے مٹادے لیکن جب امکانات سے بحث ہے تو ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے
بہت سے بھوکوں کے سامنے بہت سا کھانا رکھ دیا جائے تو وہ چپکے سے اس کو کھا نہیں لیتے آپس

میں لڑنے بھی لگتے ہیں۔ بیچارہ پیٹ تو ذرا میں بھر جاتا ہے، یہ تو آدمی کی نیت ہے کہ جس نے اپنے اوپر سیری حرام کرلی ہے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

سالانہ پانچ روپیہ فی پرچہ ۸ر

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد، دکن

سررشتہ تالیف و ترجمہ کے زیر اہتمام قدیم و جدید علوم و فنون میں تقریباً ڈھائی سو (۲۵۰) اردو کتابیں بہ شکل تالیفات و تراجم شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے سوا بھی کتابیں تیار ہو رہی ہیں۔

فہرست مطبوعات فرمائش پر ارسال ہوتی ہے۔

محمد الیاس برنی

ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ

سلسلۂ منتخباتِ نظمِ اُردو

۱- معارفِ ملت ۲- جذباتِ فطرت ۳- مناظرِ قدرت

مرتبہ

پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم۔اے۔ ال ال بی (علیگ)

وہ حضرات جنھوں نے اردو شاعری کی ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی
ستان سمجھ رکھی ہے اس سلسلۂ انتخاب کو ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل
موں پر وہ سر دھنتے ہیں اُن کی ہم پلہ نظمیں خود اُن کی زبان میں موجود ہیں شعر و سخن کے چمن کھلے
ئے ہیں جن کے رنگ و بو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے۔

معارفِ ملت (چار حصے)

جلد اول۔ حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں قیمت عہ

جلد دوم۔ مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل کی تصویریں۔ قیمت عہ

جلد سوم۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق شعرا کا دلپذیر کلام قیمت عہ

جلد چہارم۔ اخلاق و حکمت کے انمول موتی۔ قیمت عہ

جذباتِ فطرت (چار حصے)

جلد اول۔ میر و سودا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد دوم۔ غالب، ذوق، ظفر اور حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد سوم۔ تقریباً تیس قدیم، مستند اور باکمال شعرا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد چہارم۔ تقریباً ساٹھ جدید شعرا کے کلام کا دلکش انتخاب قیمت عہ

مناظرِ قدرت (چار حصے)

جلد اول۔ متعلق اوقات یعنی صبح شام، دن رات، برسات، اور بہار کے دلکش مناظر۔ قیمت عہ

جلد دوم۔ متعلق مقامات یعنی آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل اور عمارات کی صاف ستھری تصویریں قیمت عہ

جلد سوم۔ متعلق نباتات و حیوانات یعنی پھول پھل، کیڑے پتنگے اور چرندوں پرندوں کا
طالعہ و مشاہدہ۔ قیمت عہ

جلد چہارم۔ متعلق عمرانیات یعنی ہندوستان کا تمدن، رسم و رواج، عید، تیوہار اور
میلے ٹھیلوں کے دلچسپ حالات۔ قیمت عہ

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

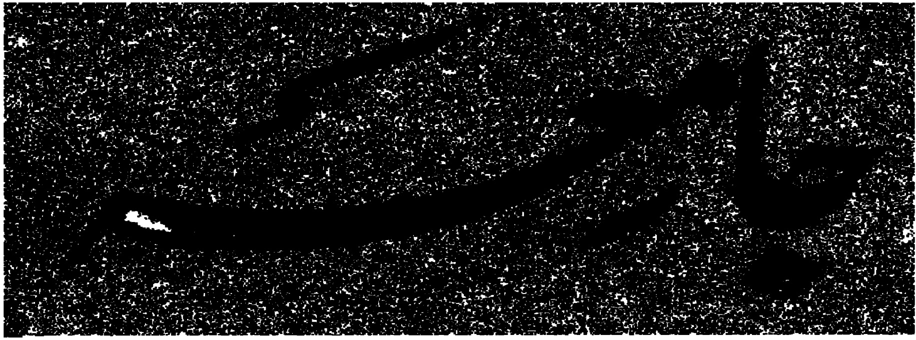
مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہو گئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون کریں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور



مکتبہ جامعہ دہلی

پیامِ تعلیم (ماہنامہ)

سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع ہوگئیں ابکی یہ خاص نمبر ہر اعتبار سے بچوں کے لئے عجیب ایک نئی چیز ہوگی۔

اس میں صرف وہی چیزیں نہ ہوں گی جنھیں بچے چند دن میں پڑھ کر الماری میں رکھ دیں بلکہ وہ سال بھر تک ان کے ہاتھوں میں رہے گا۔ وہ انھیں بتائے گا کہ پڑھنے کے علاوہ کون کون سے مشغلے ان کے لئے مفید ہیں اور وہ اپنے ہاتھ اور دماغ کی کوشش سے کیسی کیسی اچھی مفید اور دلچسپ چیزیں بنا سکتے ہیں۔

کتاب نما

اردو ادب کے شائقین کے لئے مکتبہ جامعہ کا یہ رسالہ بہت ضروری ہے۔ تمام جدید کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے سے ہمیشہ مل سکتی ہے کسی قابل ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم لوگ کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں۔ کتاب نما پڑھ کر اردو ادب کی رفتار ترقی سے واقف رہیں گے۔ چندہ سالانہ صرف ۸ر

مکتبہ جامعہ

دہلی، لاہور، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۶	دسمبر ۱۹۲۸ء	جلد ۳

فہرست مضامین

۱ -	سالگرہ نمبر	———	۴۷۷
۲ -	جامعہ ملیہ کیا ہے ؟	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ	۴۷۹
۳ -	انقلاب تاسیس	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)	۴۸۵
۴ -	ادارۂ تعلیم و ترقی	———	۴۹۲
۵ -	آزادی، اسلامی اور قومی تعلیم	شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم	۴۹۳
۶ -	خدا پرستی، ملت پروری، نفس کشی	مولانا محمد علی مرحوم	۴۹۵
۷ -	دین، حرفہ، سادگی اور اردو زبان	حکیم اجمل خاں مرحوم	۵۰۲
۸ -	وقار الملک اور جامعہ اسلامیہ	نواب وقار الملک مرحوم	۵۰۶
۹	علی گڑھ، ندوہ اور جامعہ عثمانیہ	جناب عبداللطیف صاحب اعظمی متعلم جامعہ	۵۱۷
۱۰ -	استقامت اور صلح پسندی	جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری بی۔ اے (علیگ)	۵۲۵
۱۱ -	دار العلوم دیوبند	جناب نفیس احمد صاحب متعلم جامعہ	۵۲۹

سالگرہ نمبر

تاسیس کی تقریب کے سلسلہ میں ہر سال جامعہ میں ایک جلسہ ۲۹ اکتوبر کو ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی جب یہ جلسہ حسب معمول منعقد کیا گیا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس موقع پر رسالہ جامعہ کا سالگرہ نمبر بھی نکلا کرے تو اچھا ہو اور ارادہ کیا گیا کہ اس کام کو اسی سال سے شروع بھی کر دیا جائے تاکہ روایت قائم ہو جائے اور آئندہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

اس ارادہ کو اچھی طرح پورا کرنے کے لئے جس بڑے پیمانہ کی تیاری کی ضرورت تھی وہ تو اس تھوڑے سے وقت میں ممکن نہیں تھی۔ بہر حال کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں گذشتہ پون سو سال کے عرصہ میں جو مختلف تعلیمی تحریکیں چلتی رہی ہیں ان کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ اس مجموعی تعلیمی تحریک میں جامعہ کی جو حیثیت یا اس کا جو درجہ ہے اس پر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

اس قسم کا جائزہ اگر ہر سال سالگرہ کے موقع پر لیا جائے گا تو نہ صرف ان حضرات کو جنھیں ملک کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی ہے اور جو جامعہ کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں موقع ملے گا کہ وہ زیادہ بہتر طریقہ پر اس کی کارگذاریوں اور خامیوں کا اندازہ کر سکیں بلکہ خود وہ لوگ بھی جو جامعہ کے تعلیمی کاموں میں پوری طرح منہمک ہیں اور اپنے محدود دائرہ عمل کو اپنی کائنات سمجھتے ہیں اپنے موجودہ کام کو زیادہ وسیع پس منظر میں دیکھ سکیں گے اور تناسب کے احساس کو قائم رکھ سکیں گے۔

اس سال کے تاسیسی جلسہ کی یہ ایک امتیازی خصوصیت تھی کہ جامعہ کے ہر شعبہ کے نگراں اور منتظم کو سال بھر کی کارگذاری کی روداد جلسہ کے سامنے پیش کرنا پڑی تھی۔ ان رپورٹوں کے ضروری اقتباسات غالباً "حلقہ ہمدردان جامعہ" کی طرف سے رسالہ "ہمدرد جامعہ" میں شائع کئے جائیں گے۔ ہمارے ناظرین کو

ان تفصیلات سے زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔ لیکن پروفیسر محمد مجیب صاحب نے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی عدم موجودگی میں جو افتتاحی خطبہ پڑھ کر سنایا تھا وہ البتہ ہم اس رسالہ میں شائع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے "جامعہ ملیہ کیا ہے" کے عنوان سے جامعہ کے مقاصد اور کارناموں کی جو توضیح کی ہے وہ بھی اس میں شامل کر دی گئی ہے۔

دوسری تعلیمی تحریکوں کے سلسلہ میں دیوبند، علی گڑھ، ندوہ اور جامعہ عثمانیہ کے مقاصد اور علمی سرگرمیوں کا بھی کچھ حال درج کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس رسالہ کے مجموعی مطالعہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی جدید تعلیمی تحریکوں کا ایک مختصر خاکہ ذہن میں قائم ہو سکے گا۔ آئندہ سال خدا نے چاہا تو زیادہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیمی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

جامعہ ملیہ کیا ہے؟

(از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ)

جامعہ ملیہ اسلامیہ | یورپ اور امریکہ میں جہاں تعلیم کا ایک بندھا ٹکا نظام موجود ہے وہاں یہ بھی ہے کہ بعض لوگ نئے نئے تعلیمی تجربے کرتے ہیں۔ پرانے نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کی چھان بین کرتے ہیں اور ان کے سدھارنے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ سوسائٹی اور اس کی نائب یعنی حکومت ان لوگوں کی مدد کرتی ہے اور ان کی بتائی ہوئی تجویزوں پر غور کرتی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ پرانی تعلیم کے سربراہ کار ان تجویزوں کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ سب کہیں انسان کا قاعدہ ہے کہ اپنی غلطی کو بڑی مشکل سے مانتا ہے اور ایک ڈگر کو چھوڑ کر دوسری راہ پر بڑی دیر میں چلتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی پہلے تو لوگ نئے مدرسوں پر ہنستے ہیں مگر جب عام رائے انھیں پسند کرنے لگتی ہے تو پھر پرانے مدرسوں کو بھی آہستہ آہستہ اپنا طریقہ بدلنا پڑتا ہے۔ اب رہا ہمارا ہندوستان سو یہ تو یورپ سے کہیں بڑھ کر لکیر کا فقیر ہے۔ یہاں تو ہر نئی چیز کفر اور بغاوت سمجھی جاتی ہے۔ اب سے سوا سو سال پہلے جب انگریزی تعلیم رائج کی گئی تو ایک مدت تک اس کی مخالفت ہوتی رہی مگر اب وہی تعلیم دھرم بن گئی ہے اور اس سے ایک قدم ہٹنا بھی مہا پاپ ہو گیا ہے اسی لئے یہاں لوگوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ نئے تعلیمی تجربے کریں۔ پھر بھی تھوڑے دنوں سے کچھ سر پھرے لوگوں نے اس قسم کے تجربے شروع کئے ہیں جن میں سے ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ہے۔ آج میں آپ کو جامعہ ملیہ کا کچھ حال بتانا چاہتا ہوں۔ پہلے یہ سن لیجئے کہ ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم میں وہ کونسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اس نئے مدرسہ کی ضرورت سمجھی گئی۔ پھر یہ سنئے گا کہ یہ مدرسہ کیا ہے، کیا کرنا چاہتا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

یہ مشہور اور سچی بات ہے کہ موجودہ انگریزی تعلیم حکومت نے اپنی انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شروع کی تھی۔ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ دفتروں میں کام کرنے کے لئے انگریزی پڑھے

ہوئے لوگ مل جائیں۔ آگے چل کر اس تعلیم کا معیار بڑھ گیا۔ اور ہر قسم کے مفید علوم پڑھائے جانے لگے مگر کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ ملکی اور قومی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر تعلیم کا ایسا نصاب بنایا جائے جو ہماری زندگی اور ہماری تہذیب کے لئے مناسب ہو۔ قومی تعلیم کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں انسانی تہذیب کی بہترین صفات اپنے خاص قومی رنگ میں پیدا کرے اور دوسرا کام یہ ہے کہ انھیں سوسائٹی کی خدمت کے لئے ہر قسم کے مفید پیشے سکھائے اور روزی کمانے کے قابل بنائے۔ پہلے کام کی طرف تو کبھی توجہ کی ہی نہیں گئی اور دوسرے کی طرف بھی بس اتنی کہ طالب علم نوکری کے لئے تیار کئے جائیں۔ غرض ہماری تعلیم تہذیبی تعلیم نہیں بلکہ صرف پیشے کی تعلیم ہے اور وہ بھی صرف ایک پیشے یعنی نوکری کی اس لئے ظاہر ہے کہ ادھوری اور چھچھوری تعلیم ہے۔ تعلیم اور تربیت کے طریقہ کو دیکھئے تو وہ بھی پرانا نکما طریقہ ہے جس میں استاد شاگردوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں سکھاتا بلکہ انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔ تعلیم اس طرح ہوتی ہے کہ استاد کتاب کا سبق پڑھوا کر خود عبارت کا مطلب سمجھا دیتا ہے اور تربیت اس طرح کہ سزا یا تنبیہ کے ڈر سے بچہ شرارت سے باز رکھا جاتا ہے یعنی اسے یقین دلایا جاتا ہے کہ استاد اس سے زیادہ شریر اور طاقتور ہے اور شرارت کرنے کا حق صرف اسی کا ہے جو طاقتور ہو۔ تعلیم کا سارا بوجھ حافظے پر پڑتا ہے جس سے ذہن میں سوچنے کی قوت نہیں پیدا ہوتی اور تربیت کا دارومدار خوف پر ہے جس سے بچے ڈرپوک اور دلو بن جاتے ہیں اور سزا سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں۔ آزادی اور ذمہ داری کا احساس ان میں پیدا نہیں ہونے پاتا۔ سب سے بڑی خرابی موجودہ تعلیم کی یہ ہے کہ تعلیم کا ذریعہ اپنی زبان نہیں بلکہ غیر زبان ہے۔ اس ذہنی غلامی کی مثال انسانوں کی دنیا میں صرف ہندوستان میں اور حیوانوں کی دنیا میں صرف طوطے میں نظر آتی ہے۔

اس تعلیم نے سو سال میں ملک کی جو حالت کر دی ہے اس سے ممکن ہے کہ کچھ لوگ مطمئن ہوں مگر ملک کے چند بڑے رہنما اس قدر مایوس ہوئے کہ انھوں نے ایک نیا تجربہ مسلمانوں کو قومی تعلیم دینے کا شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی ۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم جامعہ کو علی گڈھ سے دلی لے آئے۔

جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال معلوم ہوتا ہے مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت، خلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں یہ نقشہ ابھی دھندلا ہے اور اسے واضح اور معین کرنے کے لئے وہ دوسروں کے مشورے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے مدد لے رہے ہیں۔ راہ طلب میں بھٹکنا، ٹھوکریں کھانا اور سنبھلنا، غلطی کرنا اور سیکھنا یہی انسانی ترقی کا راز ہے۔

جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں، تعلیم دے۔ علم محض روزی کے خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم کو زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لئے مفید ہو۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں اس وقت روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ

ہر ... جامعہ ... یہ اگر نا چاہتی ہے کہ ... جائز طریقہ سے روزی کما سکیں گے اس کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا ... اجرت کو خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا مفید رکن بنے یعنی سوسائٹی میں اپنے لئے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈھ لے جہاں وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے سکتا ہو اور مفید خدمت کر سکتا ہو۔ اور اسی کے ساتھ اتنا کما سکتا ہو کہ اس کی اور اس کے خاندان کی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

جامعہ کی عام تعلیم کی تین منزلیں ہیں۔ ابتدائی منزل پانچ سال کی، ثانوی منزل چھ سال کی اور اعلیٰ تعلیمی منزل دو سال کی۔ چار سال کی ثانوی تعلیم کے بعد پانچ جو نہ کا اور چھ دو سال کے بعد جامعہ ملیہ کا امتحان ہوتا ہے۔ پہلا میٹرکولیشن کے اور دوسرا انٹرمیڈیٹ کے مساوی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد بی۔ اے کا امتحان ہوتا ہے اور کامیاب امیدواروں کو سند دی جاتی ہے۔ ابتدائی منزل کا نصاب جو ... سال کے تجربے کے بعد بنایا گیا ہے شائع ہو چکا ہے اور ثانوی اور اعلیٰ منزل کا اب شائع ہونے ... نصاب ... کی گنجائش ... مگر اس کے دیکھنے سے آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کے اہم اجزا تین ہیں۔ مذہب کی تعلیم، فطرت کا مطالعہ اور انسانی زندگی کا مطالعہ۔ ایمان اور عقیدے، عقل و فہم کی تربیت کے ساتھ ادب اور مصوری کے ذریعہ سے تخیل اور جذبات کی تربیت اور دستکاری کے ذریعہ سے اعتماد نفس کی تربیت کی کوشش کی جاتی ہے۔ عملی، اخلاقی تربیت اور جسمانی تربیت میں مدرسہ کے استاد، بورڈنگ ہاؤس کے اتالیق اور لڑکوں کے سرپرست مل کر کام کرتے ہیں۔ مدرسہ کی طرف سے لڑکوں کی تعلیم، صحت اور اخلاقی حالت کی رپورٹ ہر مہینے لڑکوں کے سرپرستوں کو بھیجی جاتی ہے اور خط و کتابت کے ذریعہ ان سے مشورہ ہوتا رہتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کنڈرگارٹن کلاس سے شروع ہوتی ہے جس میں مفید کھیلوں، مشغلوں کو حواس اور ذہن کی تربیت بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پروجکٹ میتھڈ یعنی منصوبی طریقے سے کام لیا جاتا ہے اور ثانوی منزل میں ڈالٹن میتھڈ یعنی انفرادی طریقہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اس مختصر تحریر میں تعلیم کے ان طریقوں کو سمجھانے کی گنجائش نہیں ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ تعلیم کے جدید

ترین طریقے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ نہ تو استاد علم کو زبردستی شاگردوں کے حلق میں ٹھونسے اور نہ گھول کر پلائے بلکہ ان کے دل میں علم کی سچی بھوک پیدا کردے اور ان کے لئے غذا مہیا رکھے تاکہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ استاد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طالب علم کو جاننے کا، جانے ہوئے کو سمجھنے کا اور سمجھے ہوئے کو برتنے کا شوق ہو جائے۔ اسی طرح جامعہ کی تربیت کا اصول یہ ہے کہ لڑکوں میں اخلاقی آزادی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک برادری کا رکن سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس کی خدمت کا بوجھ اٹھائیں تاکہ انھیں خود ہی قانون اور قاعدے کی ضرورت اور اس کی پابندی کی مصلحت محسوس ہو۔ اور استاد کو جبر کرنا یا سزا دینا نہ پڑے چنانچہ بورڈنگ ہاؤس کا سارا انتظام متعدد مانیٹروں کے سپرد ہے جنھیں طلبہ اپنی جماعت میں سے منتخب کرتے ہیں۔ یہ مانیٹر تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد بدلے جاتے ہیں اور قریب قریب سب لڑکوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ رہنے سہنے کے طرز میں انتہائی سادگی اور کفایت جو صحت، صفائی اور سلیقے کے ساتھ نبھ سکے برتی جاتی ہے۔ جو لوگ جامعہ کے بورڈروں کی صاف ستھری زندگی دیکھتے ہیں اور پھر انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خرچ اور مدرسوں کے مقابلہ میں کتنا کم ہے تو حیران رہ جاتے ہیں۔ غریب ہندوستانیوں کو کم خرچ میں اچھی تعلیم دینے کا سوال ہمارے ملک کے تعلیمی مسئلے کا نچوڑ ہے مگر افسوس ہے کہ نہ ہمارا محکمہ تعلیم اس کی طرف توجہ کرتا ہے اور نہ وہ لال بجھکڑ جو ہماری تعلیم کی پہیلی کو بوجھنے کے لئے باہر سے بلائے جاتے ہیں۔ جامعہ ملیہ نے اپنے طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

جامعہ ملیہ میں اول سے آخر تک تعلیم کا ذریعہ سوائے انگریزی کے اور سب مضامین میں اُردو زبان ہے۔ غیر زبان میں تعلیم دینا طلبہ کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے ان کی دماغی قوتوں کا اور ان کے وقت کا اتنا خون ہوتا ہے کہ کم سے کم دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں سب حامیان تعلیم اور محبان وطن کو جامعہ ملیہ کا ساتھ دینا چاہیئے۔

علم کی عام اشاعت کے لئے جامعہ نے اُردو اکاڈمی اور دارالاشاعت مکتبہ جامعہ کے نام سے

قائم کیا ہے جس نے ملک میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہے اور ایک مطبع بھی بڑے پیمانے پر کھولا ہے جس کا کام بہت پسند کیا جاتا ہے۔

عام تعلیم کے بعد جامعہ نے طلبہ کے لئے مفید پیشوں کی تربیت کا انتظام کرنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے صرف اسکول کی تعلیم پائی ہے۔ نجاری، جلد سازی، ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعتوں یعنی صابن سازی وغیرہ سکھائی جاتی گی اور کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے تجارت اور اخبار نویسی کے مدرسے ہوں گے مگر جو خاص کام جامعہ اپنے سند یافتہ طالبعلموں سے لینا چاہتی ہے یہ ہے کہ وہ معلمی کی تربیت حاصل کرکے تعلیمی نیا ... وں کی حیثیت سے ملک میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور اشاعت کی کوشش کریں۔ ان سب کاموں کو شروع کرنے کے لیے دو چیزوں کا انتظار ہے۔ ایک تو سرمائے کی فراہمی کا اور دوسرے جامعہ کی عمارت کی تیاری کا جو نئی دہلی کے قریب جامعہ نگر اوکھلے میں بن رہی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ بن کر تیار ہو گیا ہے۔ اور جامعہ کا اقامتی ابتدائی مدرسہ اس میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ باقی عمارت بھی خدا نے چاہا تو بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔

جامعہ کے تخیل اور اسکی موجودہ حالت کا یہ مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا خرچ کیوں کر چلتا ہے۔ کئی سال سے جامعہ کو بھوپال اور حیدرآباد سے معقول امداد ملتی ہے اور حال میں دلی کی میونسپلٹی نے بھی پانسو روپیہ ماہوار کی گرانٹ منظور کی ہے۔ مگر جامعہ کے اخراجات کا بہت بڑا حصہ ان چندوں سے پورا ہوتا ہے۔ جو حلقہ ہمدردان جامعہ کے ممبر عطا کرتے ہیں۔ اس حلقہ میں اب تک پانچ ہزار حامیان تعلیم شریک ہو چکے ہیں اور اس کے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہی حضرات جو اپنی گاڑھی کمائی کا ایک حصہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے دیتے ہیں، جامعہ کے حقیقی سرپرست ہیں مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی عام ہمدردی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ ملک و قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانون قدرت اسے زندہ رکھے گا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکے گی۔

تقریب تاسیس

(ذیل میں وہ تقریر درج کی جاتی ہے جو پروفیسر محمد مجیب صاحب نے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے تاسیس کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی تھی۔)

جامعہ نے جہاں کئی اور باتوں میں عام روش اور عام وضع کو چھوڑا ہے وہاں تاسیس کی تقریب منانے میں بھی انوکھا پن اختیار کیا ہے، ایسا پن کہ اس پر رعب اور شان کا فریب کھائے ہوئے لوگ مسکراتے ہیں، قاعدے اور ضابطے کے سیدھے رستے پر چلنے والے حیران ہوتے ہیں یا الجھتے ہیں، مگر سادگی اور خلوص، ایمانداری اور انکسار کے قدرداں کو اس میں کچھ نہ کچھ دل میں رکھنے اور ساتھ لیجانے کو ضرور نظر آ جاتا ہے۔ میں اُن دنوں میں جامعہ میں نہ تھا جب اُسے سرکاری یونیورسٹیوں کے ڈھرے پر چلانے اور عام رواج کو برتنے کی کسی قدر کوشش کی جاتی تھی، جب اس کی فکر ہوتی تھی کہ تاسیس کے دن ملک کا کوئی آبرودار شخص آکر تقریر کرے۔ سندیں تقسیم کرے اور سند کے ساتھ طالب علموں کو ایسی نصیحتیں بھی کرے جس پر عمل کئے بغیر تعلیم کی سند ایک ڈھکوسلا سمجھی جاتی ہے۔ جس سال میں آیا، تاسیس کے دن شکایت اور تنقید نے جشن منایا تھا۔ پھر کچھ دنوں یہ خیال رہا کہ اس تقریب کو جامعہ کی دولت اور اثر کا نہیں تو جامعہ کی ملنساری، مہماں نوازی اور ادبی ذوق کے اظہار کا ایک موقع بنانا چاہئے۔ لیکن تقریب کی صورت ہنگامے کی ہوتی یا خاموشی کی، محفل عام ہوتی یا خاص جامعہ والوں کی، ہم نے خدمت کا جو ارادہ کیا تھا اسے ہم کسی نئے پہلو سے دیکھتے اور تازہ شوق کے ساتھ دل سے لگاتے ضرور تھے۔ ہم نے اس دنیا کو جو خرچ اور آمدنی کو برابر رکھنا چاہتی ہے، اور حوصلے کو مالی استطاعت کی قینچی سے کترتی رہتی ہے کامیابی کا راز سمجھتی ہے کبھی خوش کرنے کی فکر نہیں کی، ہم نے اپنی کارگزاری کو کبھی اعداد و شمار کے چوکھٹے میں بند نہیں کیا، ہم کبھی خود ایسے مطمئن نہ تھے کہ دوسروں کو مطمئن کریں، ہم نے اپنا کام خود ہی اپنے سر لیا تھا، ہم کس سے کہتے کہ دیکھئے جو کام ہمارے سپرد ہے وہ انجام پا رہا ہے،

جو روپیہ ہمیں ملتا ہے وہ حسب تخمینہ خرچ ہوا ہے۔ ہم تو بس یہ کرتے رہے کہ جو رستہ ہم نے طے کر لیا تھا اس کی لمبائی کو ناپیں، ہم نے جو ترقی کی تھی اس کا اندازہ کریں، اور دیکھیں صرف اس لئے کہ زیادہ امید اور حوصلے کے ساتھ آگے قدم بڑھائیں۔ ہمارے لیے مناسب بھی یہی تھا۔ ہماری زندگی کے معنی یہ تھے کہ جو مقصد ہم نے اپنے سامنے رکھا تھا اسے خود زیادہ صاف دیکھ سکیں، جو دوست اپنے ہوں، جب دیکھنے آئیں انھیں زیادہ مضبوط پائیں، جو کام ہم کر رہے تھے اس سے اپنے آئندہ کاموں کو زیادہ ممکن اور قریب ہوتے دیکھیں۔ ہماری کارگزاری کا اگر ایک پہلو یہ تھا کہ ہم نے ایک معمول کی استقلال کے ساتھ پابندی کی اور دوسرا اور ہمارے دلوں کو زیادہ عزیز پہلو یہ تھا کہ ہم نے ایک نئے اور بہتر معمول کی طرح ڈالی، ہم نے اگر کچھ بنایا تھا تو اسے مٹا کر بہتر چیز بنانے کی دھن میں بھی لگے تھے۔ اور سب سے بڑی بات جس میں سمجھیے کہ جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے، یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی بنتے رہے۔ جامعہ کی کارگزاری ہمارے دلوں کی کیفیت، ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کی جا سکتی، جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے، ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے۔ کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے، بہتے چشموں کا ایک جال سا ہے کہ جس سے زمین سیراب اور بستی شاداب ہوتی ہے۔

چشموں کو بہنے کے لیے ایک بڑا چشمہ بھی چاہیے کہ جس کی روانی زمین کی ناہمواری کو اپنے بلوں میں لیتی ہزار کاوشوں میں سے رستہ نکالتی چلی جائے۔ چشموں کا بہاؤ اسی کے زور سے ہوتا ہے، ان کے نغمے اسی کی برکت سے بنتے ہیں۔ یہ روانی، یہ زور، یہ نغمہ سرائی اسی کو نصیب ہوتی ہے کہ جسے خدا دے۔ اپنا کام وہی کر سکتا ہے، اپنی بات وہی کہہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کئی سال سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جامعہ کی تاسیس کے دن جامعہ کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہمارے شیخ الجامعہ کی زبانی بیان ہوا اور انھوں نے وہی کہا جو ان کے دل میں تھا۔ ان کی شخصیت نے ان کی باتوں کو ایک آئینہ بنا دیا کہ جس میں ہم اپنی اور جامعہ کی صورت دیکھتے تھے۔ مگر وہ صورت نہیں کہ جس کی تصویر کاغذ پر اتاری جا سکے، بلکہ وہ صورت جس کے رنگ تاریخ، مذہب، انسانی شخصیت کے رنگوں سے مل کر زندگی

یہ اسی طرح پھر جلتے ہیں جیسے آسمان پر [illegible] جامعہ کی تاسیس کی تقریب سچ پوچھئے تو ہمارے
ارمانوں کا پھوٹنا اور پھیلنا اور ہمارے [illegible] کا ان کی روشنی میں ایک اٹھنا تھا۔

اس سال ہم اپنی تاسیس اس شان سے منا نہیں سکتے۔ لیکن ہم اپنے بہاؤ کو اپنے کام کے پھیلاؤ کو دیکھ سکتے ہیں، ہمارے جو مختلف ادارے ہیں ان کے مقاصد کو جوڑ کر جامعہ کے بڑے مقصد کو آنکھوں کے سامنے لانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ہمارے شعبوں کا مختصر حال آپ ان کارکنوں کی زبانی سنیں گے جن کے وہ اس وقت سپرد ہیں۔ میں آپ کو صرف اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ کام جسے ہم مشق اور تجربہ کہتے تھے اب آہستہ آہستہ نظیر اور سند بن رہا ہے، ہم کو اب یہ ذمہ داری پوری کرنا ہوگی کہ تعلیم کے جن طریقوں کو ہم آزما چکے ہیں ان میں مہارت پیدا کریں، تاکہ آئندہ ترقی کی بنیاد مضبوط رہے، ہمارا ہر کام اب اس سہولت اور صفائی سے ہونا چاہئے جو پختہ ارادے اور کامیاب شوق کی سچی علامت ہے۔ اب ہمارے لئے لازمی ہو گیا ہے کہ تفصیلی کاموں میں آپ اپنے چارہ ساز بنیں، ایک مرکزی قوت حاصل کرنے کے بجائے اپنے جوش اور شوق سے مرکز کو تقویت پہنچائیں اور اس اشتراک عمل کو قائم رکھتے ہوئے جو ہماری چھوٹی سی جماعت کا مایۂ ناز ہے اپنے مخصوص کام کو جامعہ کے مجموعی کام اور مجموعی مقصد سے اس طرح ہم آہنگ کر دیں کہ جو کچھ ہونا چاہئے وہ آپ ہی ہوتا رہے۔ ہمارا کام اب تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس وسعت سے نہیں کہ افراد کے ذمہ زیادہ کام ہو گیا ہے یا شعبوں کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے بلکہ اس سبب سے کہ ہندوستان کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی سے وہ تعلق جو پہلے ہمارے دل اور ارادے تک محدود تھا اب ایک نیا روپ لے رہا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنے اندرونی کام کی طرف سے پورا اطمینان ہو، تاکہ ہم وہ مطالبے پورے کر سکیں جو ہماری قوم اس وقت ہم سے کر رہی ہے، اور جنھیں پورا کئے بغیر جامعہ اپنے اصل مقصد تک پہنچ نہیں سکتی۔

آپ جانتے ہیں کہ عام جبری تعلیم کی ایک تجویز جامعہ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے جسے ہمارے شیخ الجامعہ نے تیار کیا اور جسے کئی صوبوں کی حکومتیں ان کے مشورے سے مگر اپنی ضرورت اور ذہنیت کے مطابق عمل میں لانے والی ہیں۔ عام جبری تعلیم کے لئے اصول اور نصاب تجویز کرنا ایسا کام نہ تھا کہ سب سے

انکار کیا جائے، خصوصاً جب اس کی امید تھی کہ اس تجویز میں تعلیم کے بہترین طریقے پیش کئے جائیں گے
اور گاندھی جی اپنی شخصیت کے پورے زور اور اثر کو اسے مقبول اور رائج کرنے میں صرف کریں گے۔ یہ تجویز
بنیادی تعلیم کی ہے، اور خالص تعلیمی ہے، لیکن ایک طرف تشخص اور مقام کی پرستش کے ایک پرانے میلان
نے اسے وردھا اسکیم کا نام دیدیا ہے، دوسری طرف جائز بدگمانیوں اور ناز یبا خوف نے اسے اسلامی
تہذیب اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ایک گہری تدبیر ٹھہرا کر اس کی اصل تعلیمی حیثیت کو بالکل مٹادیا ہے۔
ایک صوبے کے وزیر تعلیم نے موقع کو غنیمت جان کر بنیادی تعلیم کی اس تجویز کو جو ہمارے شیخ الجامعہ نے
مرتب کی تھی ودیا مندر کے نام سے دیہاتی اسکول قائم کرنے کی ایک تجویز سے ملادیا جو انھوں نے پہلے سے
سوچ رکھی تھی، جسے تعلیم اور طریق تعلیم سے کوئی سروکار نہ تھا اور جس کا مقصد ہندوؤں کی مذہبیت سے فایدہ
اٹھا کر اسکولوں کے لئے زمین اور عمارت حاصل کرنا تھا۔ ان تمام باتوں نے ایسی غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں کہ
جنھیں دور کرنے میں ایک عرصہ لگے گا، جو شاید اسی وقت دور ہوسکیں جب اس سیاسی کشمکش اور معاشرتی
اور اخلاقی مقابلے کی شدت کچھ کم ہو جو ایک مدت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جاری ہے اور نہ جانے
کب تک جاری رہے گا۔ جب تک کہ ہندو مسلمان کی کشمکش زیادہ تر سیاسی تھی، جامعہ والے یہ کہ کر اس سے
الگ رہ سکتے تھے کہ جامعہ کوئی سیاسی ادارہ نہیں، مسلمانوں کی ایک آزاد تعلیم گاہ ہے، اسے سیاسی جھگڑوں
سے مطلب نہیں لیکن اس فریق سے اسے ہمدردی ضرور ہوگی جو ہندوستان کو برطانیہ کے قبضے سے چھڑانے
کی جدوجہد کرے اور قوم میں آزادی اور خودداری کا چرچا کرے۔ اب مگر یہ کشمکش تہذیبی اور دینی ہوگئی ہے،
یعنی اس کا میدان وہ خاص سرزمین ہے کہ جس میں جامعہ نے اپنا گھر بنایا ہے اور کاروبار کرتی ہے اور ہم بنیادی
تعلیم کی تجویز اور اسے آزمانے اور رائج کرنے کی کوششوں کی بدولت اس ضد اور تعصب کی لپیٹ میں آجاتے
ہیں جو مسلمانوں کو ہندوؤں اور کانگریس سے پہلے بھی تھا مگر اب بہت بڑھ رہا ہے۔ ضد اور تعصب کی اس
آگ کو بھڑکانے اور پھیلانے کے لئے اتنا ایندھن فراہم ہوتا رہتا ہے کہ وہ ہمارے بجھائے بجھ نہیں سکتی،
اور اس کی لپیٹ سے بچنے کے لئے کوئی گوشۂ عافیت تلاش کرلینا جامعہ کے بنیادی مقاصد سے منہ پھیرنا
ہوگا۔ لیکن اگر ہم ان غلط فہمیوں کو دور نہ کرسکے جو اس وقت پھیل رہی ہیں تو اس کا اندیشہ ہے کہ ملت اسلامی

سے ہمارا جو تعلق ہے وہ کمزور پڑ جائے گا اور جس خدمت کے لئے ہم نے جامعہ کو قائم رکھا ہے اسی کو ہم انجام نہ دے سکیں گے۔

اس وقت ہم پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا کانگرس اور گاندھی جی سے جو اشتراک عمل ہے وہ وقت کی مصلحت اور مسلمانوں کی عام ذہنیت کو دیکھتے ہوئے ایک اسلامی ادارے کے لئے مناسب نہیں لیکن تعلیمی اور تعمیری کاموں میں بھی اشتراک عمل سے پرہیز کرنا غلط اور خود ہمارے لئے مہلک ہوگا جب تک مسلمان ہندستان کی عام زندگی اور کاروبار سے اپنا سلسلہ کاٹ کر الگ نہ کرلیں، اور اس ربط ضبط کی گنجائش ہی نہ رہے جو پڑوس اور خدمت کا فرض اور سچے اسلامی اخلاق برتنے کا حوصلہ ہمارے لئے لازمی کر دیتا ہے۔ دوسری قسم کے اعتراضات یہ ہیں کہ واردھا اسکیم کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ تعلیم دینا لازمی ہوگا، انھیں ناچ گانا سکھایا جائے گا، اسلام کے صحیح اور سچے، مکمل اور بہترین مذہب ہونے کا عقیدہ چھوڑ کر ایسی رواداری برتنا سکھایا جائے گا جو ہر طرح کے عقیدوں کو ایک سطح پر لا کر ان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہنے دیگا۔ یہ تمام اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جنھوں نے بنیادی تعلیم کے نصاب پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے اور جن کا تخیل کچھ ایسا بھٹک گیا ہے کہ اب وہ ہر چیز کو دیکھ کر بدکتا ہے۔ تیسرا اعتراض جو ہم پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے جامعہ میں تو دین کو تعلیم کا سنگ بنیاد بنایا ہے اور عام جبری تعلیم کی تجویز میں مذہب کو بالکل ہی نظر انداز کیا ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے کہ جس کی طرف میں آپ کو خاص طور سے توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اصولاً یہ اعتراض غلط ہے۔ عام جبری تعلیم میں جس کا انتظام کسی حکومت کے ہاتھ میں ہو دینی تعلیم ہوتا ہی نہ چاہئے، ورنہ سیاسی مصلحت مذہبی عقیدوں کی صورت بگاڑ کر رکھ دے گی۔ اس زمانے سے جب کہ ریاستیں تعلیم کا انتظام کرنے لگیں آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ مذہبی جماعتوں نے سرکاری اور دینی تعلیم کو الگ رکھا، اور اقلیتوں نے ہر جگہ اپنی بقا اور سلامتی کے لئے اصرار کیا کہ ان کے دین کی تعلیم خود ان کے ہاتھوں میں رہے اور ریاست کو اس کے انتظام میں ذرا بھی دخل نہ ہو۔ ہندستان کے مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ ان کی ملت کا الگ وجود قائم رہے، اور اس میں ایک اتحاد

موجودہ سیاسی تقسیم اور فرقہ بندی پر غالب آسکے، اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی دینی اور اخلاقی روایات، ان کی معاشرت اور ان کی تہذیب، جس میں اردو، فارسی اور عربی زبانیں بھی شامل ہیں، مخالف اثرات سے محفوظ رہ سکیں، تو انھیں اپنی دینی تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا اور بالکل اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ حکومت سے کسی طرح کی رعایت یا سہولت کی درخواست کرنا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

لیکن اس طرح نصیحت کرنے سے کام نہیں بنتا۔ بنیادی تعلیم کے لئے جو عمر تجویز کی گئی ہے اسے دیکھیے تو شروع میں پورے دو سال ایسے ملتے ہیں کہ جن میں دین اور زبان کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ بنیادی تعلیم کے دوران میں بھی ہم یہ سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں، اور ہمیں اس کا بھی انتظام کرنا چاہیے کہ بنیادی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہمارا طالب علموں سے مستقل تعلق رہے۔ عمر اور تعلیمی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے دینیات کا ایک مکمل نصاب بنانا اب خاص طور سے جامعہ والوں کا فرض ہو گیا ہے، اور ہم کو جلد سے جلد ایسا نصاب تیار کر کے اور تجربے سے اسے آزما کر ملت کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ بالغوں کی تعلیم بھی ایک ایسی خدمت ہے کہ جسے انجام دینے کی فکر کرنا ہمارے ذمے ہے، اور یہ کام بھی ہمیں پورے ذوق اور شوق سے شروع کر دینا چاہیے۔

جامعہ کی ابتدائی اور ثانوی مدرسے مجوزہ بنیادی تعلیم کے ادارے نہیں ہیں، ان کا نصاب بنیادی تعلیم کے نصاب سے الگ ہے اور رہے گا۔ ہمارے ذمہ اب جو کام ہے وہ یہ نہیں کہ نئی تجویز کے مطابق طریق تعلیم کو بدلیں، بلکہ نئے تعلیمی فرائض کو انجام دینے کا ارادہ کریں اور اس کی تدبیریں سوچیں۔ اس میں ہم اس تجربے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ہمیں جامعہ میں حاصل ہوا ہے، اور نئے کام کو پرانے کی توسیع کا سلسلہ سمجھ سکتے ہیں، جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے بھی، لیکن یہ نیا کام ہمارے پرانے کام سے بہت بڑا ہے، ان دونوں کی نسبت وہی ہے جو مدرسے اور زندگی کے بے پایاں میدان عمل کی۔ ہمیں جتنی مشق اور جتنے تجربے کی ضرورت تھی وہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں حاصل ہو گیا ہے، خدا کے فضل سے جامعہ کی اب ملک میں وہ حیثیت ہو گئی ہے کہ لوگ اب ہم سے پیش قدمی اور رہنمائی کی امید رکھتے ہیں،

اور اب ہمیں بے خبری جھجک اور خوف کے اس میدان میں قدم رکھنا چاہیئے جو ہماری ہمت اور ہمارے حوصلے کو للکار رہا ہے۔ میں نے اس وقت جو کچھ عرض کیا ہے وہ کچھ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ یہ تمام باتیں جامعہ کے کارکنوں کے عام خیالات ہیں، اور میں نے یہ جانی بوجھی باتیں دہرائیں اس غرض سے ہیں کہ آج وہ خاص موقع ہے جب کہ جامعہ والوں کو اپنے خیالات کا سرمایہ جمع کرکے سوچنا چاہیئے کہ وہ اس میں سے کتنا کس کام میں لگائیں گے۔ زمانے نے جو نئی ذمہ داری ہم پر ڈالی ہے اس کی بابت میں اشارہ کرچکا ہوں، اس کے بعد اب ہماری برادری کے ہر فرد کو یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ اس میں کس طرح زیادہ سے زیادہ شرکت اور مدد کرسکتا ہے۔ ہماری پرانی ذمہ داری، کہ جامعہ کا ہر کام دیانت اور خدمت کا نمونہ ہو، ہم پر اس وقت بھی ہے اور خدا کرے ہم اس سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اب آیئے اپنے اپنے دل میں خدا کا نام لیں، اس کی قدرت کے سامنے اپنی مجبوری اور بے بسی کا اعتراف کریں اور ہمیں جو استعداد عطا ہوئی ہے اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کا تہیہ کرلیں۔

ادارۂ تعلیم و ترقی

جامعہ کے کارکن ایک عرصہ سے تعلیم بالغاں کے کام کو شروع کرنا چاہتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سال یکم اکتوبر سے اس کام کو شروع کر دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جو تعلیم بالغاں کے متعلق جملہ امور میں ان لوگوں کی رہنمائی اور مدد کرے گا جو کسی طور پر تعلیم بالغاں کا کام کرتے ہیں یا جن کو آئندہ اس کام کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ادارہ کا ناظم جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی کو بنایا گیا ہے جو اپنی انتظامی اہلیت کا نہایت اچھا ثبوت "حلقہ ہمدردان جامعہ" کی تنظیم اور توسیع کے سلسلہ میں فراہم کر چکے ہیں۔ اس ادارہ کے مجوزہ مقاصد حسب ذیل ہیں۔ ابھی تک آخری طور پر منظور نہیں ہوئے ہیں اور ان میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش ہے۔

۱۔ تعلیم بالغاں کے متعلق مواد فراہم کیا جائے اور مطالعہ و تحقیق کے بعد ضروری اور مفید معلومات کی اشاعت کی جائے۔

۲۔ بالغوں کی تعلیم کیلئے نصاب تعلیم تیار کیا جائے، مفید مطبوعات شائع کی جائیں اور ضروری تعلیمی سامان عام تعلیم کیلئے مہیا کیا جائے۔

۳۔ کارکن تیار کئے جائیں جو اپنے اپنے علاقوں میں تعلیم بالغاں کی تنظیم کریں۔

۴۔ قرول باغ اور اوکھلے میں تعلیم و ترقی کا تجربہ ادارہ کے زیر انتظام و نگرانی کیا جائے جو دوسری اسی طرح کی شہروں اور دیہی بستیوں کے لئے نمونہ ہو۔

ان مقاصد کے پیش نظر کام کا ایک مفصل خاکہ تیار کیا گیا ہے جس پر غور و خوض اور ابتدائی کارروائی ہو رہی ہے۔ فی الحال مجوزہ اسکیم یہ ہے کہ کچھ مقامی اعزازی کارکنوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے علاقہ کے ناخواندہ اور کم علم بالغوں کی ایک مقررہ کم ترین تعداد کو خواندہ اور تعلیم یافتہ بنانے کا عہد کریں۔ ان کو آمادہ کرنے اور ان کو صحیح راہ بتانے کیلئے کچھ مہتمم مقرر کئے جائیں جن کے ذمہ تعلیم و ترقی کا ایک ایک حلقہ سپرد کر دیا جائے۔ ان مختلف حلقوں کے کام کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کیلئے تعلیم و ترقی کے مراکز اور ان کے نگراں مقرر کئے جائیں۔ ان تمام مرکزوں کی ہدایت اور رہنمائی کا آخری کام ادارہ کے صدر مقام سے ہوتا رہے۔ اس کے علاوہ ادارہ کی طرف سے مقررہ نصاب کی تکمیل کے لئے رسالے، کتابیں، پوسٹر، چارٹ، سلائیڈ وغیرہ شائع کئے جائیں اور کارکنوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا جائے جنھیں عملی تعلیم قرول باغ اور اوکھلے کے ان مدرسوں میں مل سکے گی جو ادارہ کے زیر انتظام ہوں گے۔

امید ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں اس کام کا کچھ ابتدائی نتیجہ ٹھوس شکل میں نظر آنے لگے گا۔

آزاد اسلامی اور قومی تعلیم

(شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم)

(ذیل میں ہم شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم و مغفور کے اس خطبہ صدارت سے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ افتتاح منعقدہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں پڑھا گیا تھا)

اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھکو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اُس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے ؎

شکر ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد　　　حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں رہی۔ کیونکہ زمانہ نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی، اور تدبر، اور ہوشمندی، کے پودے نشو و نما پاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں آدمی نجاح و فلاح کے رستہ پر چل سکتا ہے۔

ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو، اور اغیار کے اثر سے کلیتہ آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں، ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلاموں کو پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج

نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے۔ اور ان عظیم الشان مدارس کے حقیقیوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم ان کو اپنا استاد بناتے آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسہ سلطانیہ کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی تو اس دن علمائے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لئے پڑھا جانے لگا۔ تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں جس کی امداد اور انتظام میں بڑا قوی ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔

ہماری قوم کی سربرآوردہ ہستیوں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بےخبر ہوں اور اپنے قومی خصوصیات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے۔ تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائیگا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جس کا تمامتر نظام عمل اسلامی خصائص اور قومی خصوصیات پر مبنی ہو۔

خداپرستی، ملت پروری، وطن دوستی

(ذیل میں ہم مولانا محمد علی کا ایک مضمون جو ہمدرد مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء سے نقل کرتے ہیں
مولانا محمد علی جامعہ کے بانیوں میں سے تھے اور اس درسگاہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ وہ
اس کے اول شیخ الجامعہ تھے۔ اس لئے جامعہ کے نصب العین کی جو وضاحت انہوں نے
فرمائی ہے اس کی یاد کو تازہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم اس انتخاب کے لئے جناب
محمد سرور صاحب ریڈر شعبہ جامعہ کے ممنون ہیں ۔ ایڈیٹر)۔

کل کے ہمدرد میں شعیب قریشی صاحب کا ایک مضمون "جامعہ ملیہ کی پانچویں سالگرہ"
کے عنوان سے نکلا ہے گو لکھنے والے کی نیت نیک ہے، لیکن ان کے انداز بیان سے پڑھنے
والوں میں بعض غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ جامعہ ملیہ کے مقصد کے متعلق مضمون نگار صاحب
لکھتے ہیں کہ ارکان جامعہ میں ہمیشہ اختلاف و تناقض رہا جس کی وجہ سے جامعہ کا مقصد ایک "خواب
پریشان" ہوگیا۔ یہ غلط ہے جامعہ کا ہمیشہ سے ایک خاص متعین مقصد ہے۔ اور وہ خود اس قدر
جامع اور صاف ہے کہ اس کی تشریح و تاویل کی ضرورت نہیں۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو
مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خدا پرست مسلمان، اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں
اور اس کا تعلیمی پروگرام اور اسکیم، وہ بھی بالکل متعین اور ایسی ہے جو اس مقصد کے لئے ممد اور معاون
ثابت ہو۔ نباتات اور انسان و حیوانات کی [illegible] نہیں ہے جن کا نشو و نما خارجی ہوتا ہے۔ یعنی
ترقی نہیں ہوتی محض زوائد کی بدولت ہی ممکن ہے۔ اور وہ اس طرح سے ایک پتھر پر دوسرا پتھر رکھ دیا
جائے یا دیوار کے ایک [illegible] جاتا ہے۔ بلکہ خالق عالم نے نباتات و حیوانات
میں خود نمو کا انتظام فرما دیا ہے۔ اور داخلی ترقی کا سامان خود ان میں فراہم کر دیا ہے۔ انسان کی ترقی گو
تعلیم کے ذریعہ سے ہوتی ہے مگر یہ بھی خارجی چیز نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ بہت سے استادوں کا

عمل اسی طرح ہوتا ہے گویا وہ اسکول کے بچوں کو غیرذی روح سمجھتے ہیں اور ان کو فقط سبق دینا اپنا فرض جانتے ہیں اس طرح تو یہی ہو سکتا ہے کہ مدرسوں سے نکل کر ایک طالب علم کی مثال وہی ہو کہ۔

چار پائے برو کتابے چند　　　　نہ محقق شود نہ دانشمند

یہ محض دنیوی تعلیم ہی کا حال نہیں ہے، بلکہ اخلاقی اور دینی تعلیم کا بھی بعینہ یہی حال ہے۔ جہاں اتباع ارباب من دون اللہ کیا جائیگا، وہاں تقلید جامد کے سوا کچھ ممکن نہیں اور اسی لئے قرآن کریم نے شیخ سعدی سے بہت پہلے اسلام کی تعلیم کو جس کے معلم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور جس کا کورس کتاب اللہ تھی اور جس کا مدرسہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تھا اور جہاں تلامذہ کے عمل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ موجود تھا یہود کے احبار کی تعلیم سے ممیز کردیا تھا اور صاف بتا دیا کہ تعلیم مذہبی خارجی ازدیاد نہیں ہے، بلکہ داخلی ارتقا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝ ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۝ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ ۝ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ۝ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ۝ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قائم کیا اور اپنے تلامذہ کے قوائے داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا کہ خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی، اس کی مثال مثل الحمار ہو جائے اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ انکو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جاوے۔ مسلمانوں کے مذہب کی مختصر اور جامع تعریف یہ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تعلیم کے دینے کی غرض سے مبعوث ہوئے تھے۔

جس نے عقل　　　　از کلید دین در دنیا کشاد۔

اس لئے اسلام انسانوں کی اس تفریق کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ انکا صرف ایک حصہ دیندار ہو اور باقی دنیادار ہوں ایک حصہ تو سوائے مسجد کے پیش امام اور مدرسہ کے مولوی ہونے کے دوسرا کوئی کام نکر سکے' اور دوسرا دنیا کے دھندوں میں اس قدر مشغول ہو جائے کہ دین سے بے بہرہ رہے اور یہ سمجھنے لگے کہ دین کو اس دنیا سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ وہ ایک دوسری دنیا سے علاقہ رکھتا ہے اور صرف اس دنیا کے ماہرین کے لئے مخصوص ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی تباہی اسی تفریق کے باعث ہوئی ہے اور مسلمانوں ہی پر کیا موقوف ہے ہر قوم کی تباہی اس طرح ہوئی ہے اور ہوتی رہیگی حقیقتاً اسلام ہی وہ مذہب ہے جس میں کوئی "پروہت" نہیں یعنی جس میں ماہرین دین کا ایک محدود اور متعین فرقہ جو اپنے متبعین سے بالکل ممیز اور الگ تھلگ رہنے والا ہو بالکل نہیں ہے۔ اس میں نہ کوئی "پریسٹ" یا پادری ہے' نہ مہنت اور برہمن ہے۔ اس میں نہ احبار ہیں نہ رہبان بلکہ سبھی ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور وہ رنگ "صبغۃ اللہ" ہے، ومن احسن من اللہ صبغۃ یہ تو اسلام کا نظریہ یا تھیوری ہے۔ لیکن آج کی صورت حال یا پریکٹس کو دیکھا جائے تو دنیا داروں کا امتیاز صاف نظر آتا ہے۔ علمار علوم دنیوی سے اکثر بے بہرہ ہیں اور دنیا دار حقیقت دین سے ناواقف اور غافل۔ ایک جماعت سوائے مدارس میں درس دینے اور مسجد وں میں پیش امامی کرنے کے دوسرا پیشہ نہیں رکھتی اور دوسری جماعت قرآن کریم کے موٹے موٹے اصولوں سے بھی ناواقف ہے مگر روٹی کمانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ پہلے تو "جامعہ" اور "ملیہ" ہے یعنی اس میں علوم دین و دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں اور وہ نہ تو دیوبند اور مدرسہ نظامیہ وغیرہ کے طرز پر صرف علوم دینی کی تعلیم دیتی ہے نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پر اکتفا کرتی ہے پھر یہ جامعہ' جامعہ اسلامیہ ہے' یعنی اس کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے۔ گو دیگر مذاہب کے پیرووں کے لئے اس کا دروازہ بند نہیں ہے۔ وہ اسلام کو صحیح تفسیر حیات سمجھتی ہے' اور اسلام کے اصولوں کی اس لئے تعلیم دیتی ہے کہ وہ اسرار زندگی سے انسان کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی لئے نصاب جامعہ میں سب سے خاص بات جو رکھی گئی ہے وہ یہ کہ عربی لازمی ہو اور نثر کا تمام تر کورس

قرآن کریم ہو۔ تاکہ طالب علم اس قدر عربی سیکھ لے کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی کو کم از کم اس طرح سمجھ سکے
جیسا کہ ایک بدوی عرب رسول کریم کے زمانہ میں سمجھ سکتا تھا۔ تاکہ اسے اپنی مذہبی ضروریات کے
لئے دوسروں کا دست نگر نہ ہونا پڑے اگر علماء سلف اور محدثین کی مدد سے مستفید تو بہرحال ہونا
چاہیئے۔ علامہ ابن تیمیہ سے اگر کسی چیز میں غلو رکھتا ہے تو وہ مسئلہ توحید ہے اور اربابِ من دون اللہ
کی اتباع سے ہر انسان کو بچانا چاہتے لیکن اس اتباع سے بچنا اسی وقت آسان ہو سکتا ہے
جبکہ کسی مذہب کے متبع اس "کتاب" یا "صحیفۂ آسمانی" کی زبان سے واقف ہوں اور اسکو
سمجھ کر پڑھنے کے لئے کسی مخصوص جماعت کی دست نگر نہ ہوں۔ وہ شودر اپنے مذہب سے کیا واقف
ہو سکتے جن کے کان میں اگر وید کے ایک اشلوک کی آواز بھی آ گئی تو سیسہ پگھلا کر کانوں میں ڈال دینے کا
حکم ہے۔ وہ نصرانی نصرانیت کو کس طرح سمجھ سکتے تھے جن کی مادری زبان لاطینی نہ تھی اور انکے پاس
بائیبل صرف لاطینی ترجمہ میں تھی۔ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے۔ وہ بھی "ارباب من دون اللہ"
کے اتباع سے بہت کچھ بچ سکنے میں کامیاب۔ ہندوستان، ترکی، افغانستان وغیرہ کے مسلمان جو عربی
زبان سے ناآشنا ہیں ان کے لئے تقلید جامد سے چھٹکارا مشکل ہے تاوقتیکہ کم از کم تعلیم یافتہ
جماعت (ذکور ہوں یا اناث) اور بالخصوص ہر مسلمان کو "تعلیم یافتہ" ہونا چاہیئے عربی زبان اسی طرح جان لے
جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان عرب بدوؤں اور بدوی قبائل کو آتی تھی جو دو چار دن
آنحضرت کی خدمت میں رہ کر سچے اور پکے مسلمان بن کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

اس غرض سے ہر ہندوستانی تعلیم یافتہ مسلمان قرآن و حدیث خود سمجھنے کے قابل ہو جائے
عربی زبان شروع ہی سے جامعہ ملیہ میں لازمی قرار دی گئی ہے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مسلمان علماء سے
بے نیاز ہو جائیں بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ نہ اس تقلید جامد کے پابند رہیں جو اب تک ہوتی آئی
ہے نہ یہ سمجھتے رہیں کہ مذہب صرف چند فقہی مسائل کا نام ہے۔ باقی رہا علم دین میں کمال حاصل کرنا وہ
یقیناً ایک جماعت مخصوص طور پر حاصل کرے گی اور اس لحاظ سے دقیق اور باریک مسائل کے لئے علماء کی ضرورت
ہر صورت میں باقی رہے گی۔ غرض اس طرح جامعہ مسلمان طلباء کو ان کے دین سے آگاہ کرتی ہے تاکہ وہ دنیا کو

صحیح طور سے برت سکیں۔ پھر دوسری طرف مسلمان کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے ملا ہوتے تھے یا سرکاری دفاتر کے کلرک۔ جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہ ہو۔ ادب اور تاریخ فلسفہ اور سائنس کے ذریعہ سے وہ سارے عالم کو اپنی جولانگاہ بنا سکیں۔ لیکن اگر اجانب اور کفار کی حکومت ان کے لئے دنیا کے اور راستے بھی بند کر دے یا وہ ان راستوں میں ایسی حکومت کے دست اندازی کے باعث اکل حلال اور باعزت طریقوں سے حصول رزق سے مایوس ہو جائیں تو تب بھی "اکل من عمل یدہ" سے محروم نہ رہ سکیں اور "قوت لایموت" کے لئے دست سوال دراز نہ کریں۔ حکومت کے طرز عمل نے سنہ ۱۹۲۰ء میں جبکہ جامعہ کا آغاز ہوا مسلمانوں [illegible] ہندوستانیوں کو پنشن پر مجبور کر دیا تھا اور اس طرح حکومت کے مناصب اور [illegible] میں روزی حاصل کرنے سے انہیں محروم ہونا پڑا تھا لیکن اس وقت بھی ایک بہت بڑی تعداد نے نان کوآپریشن پر [illegible] تھا کہ نان کوآپریشن کی قائل اس سے بہت بڑی جماعت تھی جو نان کوآپریشن پر عمل نہیں کرتے تھے۔ مگر ویسے اس کے قائل تھے وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

سمجھے یہ مانا رہیں دلی میں پر کھائیں گے کیا؟ ([illegible])

اکتیسویں دن جو تنخواہ ملتی ہے اس کے بغیر گذر نہیں۔ اس طرح مسلمان حکومت کے دست نگر ہو گئے تھے اور بظاہر "اکل سحت" پر مجبور تھے اس تلخ تجربہ نے جامعہ کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے تہیہ کیا کہ طلباء کو اکل حلال اور باعزت طریقوں سے حصول رزق کے لئے کوئی نہ کوئی دستکاری ایسی سکھائی جائے جس سے وہ خود روزی پیدا کر سکیں طلباء نے مذہبی تعلیم حاصل کر لی۔ ذہنی اور دماغی نشوونما بھی ہو گیا ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی رکھا گیا تھا کہ [illegible] ذہنی و دماغی کام کے ذریعہ ہی سے کمانے پر مجبور نہ ہوں کوئی پیشہ اپنا اختیار کر سکیں جس سے محض جسمانی محنت سے روزی کمائی جا سکے اور جس میں بڑے سرمایہ کی بھی حاجت نہ ہو۔ مثلاً نجاری، [illegible] سازی، [illegible] بافی وغیرہ ان پیشوں کے کرنے والے عام طور پر جاہل ہوتے ہیں جو اپنے کاموں میں سالہا سال کی مشق کے بعد بھی

کوئی جدت یا تنوع نہیں پیدا کر سکتے۔ جامعہ کے طلبا کو ایسا بنانا مقصود نہ تھا بلکہ تعلیم یافتہ نجار اور قفل ساز پیدا کرنا مقصود تھا تاکہ وہ اپنے فن میں اجتہاد اور کمال بھی پیدا کر سکیں اور اگر ضرورت پیش آجائے تو اس ذریعہ سے کافی روزی حاصل کریں۔ یورپ کے نجار اور اسی طرح کے دوسرے پیشہ ور ہندوستان کے دماغی پیشہ وروں سے کہیں زیادہ پیدا کرتے ہیں مگر جامعہ میں فقط نجاری وغیرہ کی تعلیم اصلی مقصد نہ تھا۔ بلکہ دماغی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس قسم کی دستکاری سے بھی آشنا اور واقف کرانا مقصود تھا چنانچہ جامعہ میں جدید علوم و فنون اور سائنس کا رواج دینا بھی ضروری تھا ہم نے دیکھا کہ ہمارے عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء دنیا سے ناواقف محض ہوتے ہیں ان میں سے اکثر تو ایک زمانہ میں یہ بھی نہ جانتے تھے کہ رنگیف کہاں ہے؟ ایک زمانہ میں مسلمان فرانس میں کہاں تک وراتے ہوئے چلے گئے تھے۔ موصل میں کون قوم آباد ہے۔ روشنی۔ گرمی وغیرہ کے کیا خواص ہیں؟ ان وجوہ کی بناء پر ہم نے جامعہ میں جدید علوم کا زیادہ سے زیادہ رواج دیا تاکہ یہاں کے فارغ شدہ طلباء دنیا کے جغرافیائی معاشی اور سیاسی حالات سے بخوبی واقف ہوں اور سائنس کا علم بھی حاصل کریں۔

یہ تعلیم کا وہ خاکہ تھا جو ایک جامعہ اور جامعہ اسلامیہ کے شایان شان تھا۔ لیکن ابھی لفظ نیشنل کا ذکر نہیں آیا ہے حالانکہ یاد رکھنا چاہئے کہ جامعہ اسلامیہ ایک نیشنل یونیورسٹی ہونیکا بھی دعوی کرتی ہے ہم ہندوستان کے مسلمان۔ مسلمان ضرور ہیں مگر ہندوستانی بھی ہیں اس میں صرف مسلمان ہی آباد نہیں ہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ان کے ساتھ ساتھ اس ملک میں آباد ہیں اور ان کے ہمسایہ اور پڑوسی ہیں اور انہیں کی کثرت ہے جامعہ کے بانیوں پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ اس ملک کی آزادی کے لئے (اور ایک مسلمان کے لئے آزاد ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ وہ سوائے خدا کے کسی کا عبد و غلام نہیں ہو سکتا) مسلمانان ہندوستان کا اپنے ہمسایہ بھائیوں کے ساتھ اتحاد و ارتباط قائم کرنا اور قائم رکھنا لازمی و لابدی ہے اس لئے ایک طرف تو جامعہ نے اپنا دروازہ ہر اس ہندوستانی کے لئے کھول دیا جس کو جامعہ کی فضا میں رہنے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تعصب نہ ہو۔ دوسرے جامعہ کے ہر طالب علم کو دل میں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ملک کی محبت اور اغیار و اجانب کی غلامی سے نفرت

پیدا کرنا جامعہ نے پہلے ہی دن سے اپنا وظیفہ سمجھا اور جامعہ کی فضا کو غلو اور تعصب سے پاک وصاف رکھا اس لئے حقیقی معنوں میں جامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور نیشنل مسلم یونیورسٹی ہے۔ امید ہے کہ اس طول طویل اور واضح تحریر کے بعد جامعہ کے مقاصد کے متعلق کسی کو کوئی شبہ باقی نہ رہیگا اور کم از کم جامعہ کے کسی طالب علم یا استاد کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے گا کہ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔ جامعہ ابتک بھی ایک خواب ہے مگر یہ وہ خواب ہے جس کی تعبیر خود تفسیر حیات ہے اور اس خواب کو عالم خواب و خیال سے نکالکر عالم عمل میں لانا اور اس خواب کی تعبیر کرنا کارکنان جامعہ کا اور مسلمانان ہندوستان کا فرض ہے دیکھنا یہ ہے کہ یہ خواب صحیح معنوں میں تفسیر حیات ہے یا نہیں۔ اگر یہ واقعی تفسیر حیات ہے تو پھر ملک و قوم کا فرض ہے کہ وہ اس کو عملی جامہ پہنائیں۔ اس لئے کہ اس کے تفسیر حیات ثابت ہو جانے کے بعد جو تعلیم کسی اور نوعیت کی ملک و قوم میں جاری ہے اس نے لاکھ عملی جامہ پہن لیا ہو پھر بھی وہ اضغاث احلام میں داخل ہے۔ اور دماغی سوء ہضم کے نتیجہ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

مضمون نگار نے اپنے مضمون میں جامعہ کی تبلیغی جماعت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جامعہ نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ اس کے بعد جامعہ بجائے ایک سیاسی جماعت کے ایک خاص تعلیمی درسگاہ ہو گئی مضمون نگار کو یہ سمجھنے میں ہی غلطی ہوئی۔ جامعہ نے اپنی پالیسی کبھی نہیں بدلی البتہ وقت کے تقاضے سے اپنے پروگرام میں تھوڑے عرصہ کے لئے ضرور تبدیلی کی تھی۔ اسلام عملی زندگی کا سبق دینے کے لئے آیا ہے اس لئے اسلامی درسگاہیں دنیا سے الگ تھلگ علمی راہبوں کی گوشہ نشین جماعتیں نہیں ہیں۔ جنگ بدر میں پندرہ پندرہ برس کے لڑکے شریک کر لئے گئے تھے اور بعض نے جو کوتاہ قد تھے اس خوف سے کہ کہیں ان کو چھوڑ نہ دیا جائے ایک جنگ کر اور اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر اپنے کو ۳۱۳ قسمت آزماؤں کی فوج میں شریک کرایا تھا۔ یہ تو اسلام کی جنگ کا حال تھا جنگ عمومی نے کفار کی جنگ کا حال سب پر آشکارا کر دیا تھا۔ درسگاہیں آج کہیں تھیں بالیوں کہئے کہ حربی کی فوجی بارکیں بن گئی تھیں اور بجائے اس کے کہ نوجوان جمعیت خاطر اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے معمولی درس میں مشغول رہیں، اہل قلم سے اہل سیف

[illegible] یہ ان لوگوں کا طریقہ عمل تھا جو جوع الارض کے مرض میں مبتلا ہو کر دوسروں کی آزادی سلب کرنے کا بیڑہ اٹھا چکے تھے یا زیادہ سے زیادہ اپنے ملک کی آزادی کو خطرہ میں دیکھ کر لڑائی کی آگ میں کود پڑے تھے جب کفار کا یہ حال ہو تو مسلمانوں کی درسگاہ ایسے موقع پر بھی الصلح خیر کہکر جنگ سے گریز کر سکتی تھی یہاں تو غالب کے گذرے زمانہ میں بھی اہل قلم کا یہ حال تھا کہ وہ میدان شعر گوئی میں اپنی تگ وتاز کے متعلق لکھتے تھے کہ ؎

چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

جس قوم کا مذہب اور آزادی دونوں خطرہ میں ہو اس کے نوجوان کیوں کر مدرسوں میں بیٹھ کر فعل فعلا فعلوا فعلت کے صیغے گردانتے۔ اس وقت کی یہ حالت تھی کہ ع

آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں

جس طرح جنگ عمومی میں یہی نہیں کہ ہر ملک کے حربی مدارس کے طلبہ بلکہ تمام طلبہ معمولی درس کو چھوڑ کر تین تین چار چار مہینے فوجی تعلیم پا کر یلغاریں کر کے منزل میدان جنگ میں پہنچ گئے اسی طرح ہم نے بھی ہفتہ دو ہفتہ تبلیغی درس دیکر جامعہ کے طلبہ کو میدان جنگ میں بھیجدیا تھا۔ اور امید تھی کہ ایک دو برس میں سوراج لے کر انھیں انکی چھوڑی ہوئی کتابوں کی طرف بھیجدیا جائے گا تاکہ قول و فعل دونوں کا درس حاصل کرنے کے بعد وہ پہلے سے کہیں بہتر طریقہ پر فعل فعلا فعلوا فعلت کے صیغے گردانیں۔

امید ہے کہ اس کے بعد جامعہ کی پالیسی کے متعلق کسی کو غلط فہمی نہوگی۔ آج بھی اگر میدان بدر کی فوج درکار ہوئی تو ہمیں یقین ہے کہ جامعہ کے طلبہ اچک اچک کر اور پنجوں پر کھڑے ہو کر ۳۱۳ نبرد آزماؤں کی فہرست میں داخل ہونے کے لئے سنہ ۱۹۲۱ء کی طرح بے چین و بیقرار ہوں گے۔ یاد رہے کہ یہ جبری بھرتی نہیں بلکہ متطوعین کی مانگ تھی ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم (اور جو خوش دلی سے نیک کام کرے تو اللہ قدردان ہے اور اسکی نیت کو جانتا ہے) مضمون نگار کے مضمون میں ایک اور بات ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ آخر زمانہ میں جامعہ کے ضعف کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "سب سے بڑی جو مصیبت آئی وہ اسکی مالی حالت کا سقیم ہونا تھا۔ خلافت کمیٹی جو اسکی سب سے

بڑی معاون ومددگار تھی ۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ روکنا شروع کیا ۔ حقیقت یہ ہے خلافت کمیٹی نے کبھی بھی اپنا ہاتھ نہ روکا ۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اب خلافت کمیٹی کے ہاتھ ہی میں کچھ نہ تھا ۔ مولنٰا شوکت علی اور میں دونوں جامعہ کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے مارچ ۱۹۲۴ء میں برہما جا رہے تھے لیکن قضائے الٰہی سے چھٹکارا نہیں ۔ آمنہ کا ۱۱ مارچ کو انتقال ہو گیا اس پر بھی میں اور نیز میری اہلیہ ایک ہفتہ کے اندر ہی برہما جانے کیلئے تیار ہو گئے ۔ مگر جس دن آمنہ کا انتقال ہوا اسی دن مولنٰا شوکت علی خود ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گئے اور والدہ تو دو دن پہلے سے مرض الموت میں مبتلا ہو چکی تھیں ۔ برہما کے سفر کو ملتوی کرنا پڑا اور جامعہ کے لئے روپیہ فراہم نہ ہو سکا البتہ مولنٰا شوکت علی اب پھر برہما جا رہے ہیں اور ہمیں اپنے برہما کے مسلمانوں سے پوری امید ہے کہ وہ دور افتادہ بھائی ہماری مدد کریں گے اور ہماری اس خواب کو جس کی تعبیر مسلمانوں کے لئے تغیر حیات ہے عملی جامہ پہنائیں گے

دین، حرفہ، سادگی اور مادری زبان

(ذیل میں ہم مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کی اس تحریر کو بجنسہٖ پیش کرتے ہیں جسے ایک سپاسنامہ کی شکل میں مرحوم نے غازی امان اللہ خاں کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعارف کرنے کے لئے پیش فرمایا تھا۔ اڈیٹر)۔

ہفت سال می گزرد کہ ملت ایں بُنیاد جامعہ را نہادہ تا غایت امروزہ تعلیم را کہ در ہندوستان رواج دارد و از سر بگرداند و پیش ملت چیزے بر نہد کہ اورا دریں راہ بمنزل مقصود برساند بر ضمیر اعلیحضرت پوشیدہ نیست کہ ما مسلماناں دریں دور حاضر احتیاج داریم کہ دستے را بدامن تعلیم عصری و دستے دیگر را بدامن تعلیم مذہبی بر زنیم تا نوجواناں ما کہ تعلیم را بتکمیل رسانیدہ از مدارس بیروں برآئیند حظے از دنیا۔ و نصیبے از دین داشتہ باشند و نیز می بینیم کہ مقصد نوجوانانِ ما کہ پیرامون تعلیم می گردند بجز چاکری کہ در سلک آں محدودے چند از ایشاں منسلک می شوند چیزے دیگر نمی باشد پس کسانیکہ از حلقہ خدمت بیروں می باشند کارے از دست ایشاں بر نمی آید کہ چیزے دیگر را در مدارس یاد نگرفتہ و بہمیں سبب می بینیم کہ بقیہ عمر ایشاں رائیگاں می رود و نیز دائرہ اقتصادیات ما مسلماناں بہر کجا کہ می بینیم بسیار تنگ است۔ ازیں جہت ما یاں احتیاج داریم کہ نوجوانانِ ما تا آنکہ در تعلیم گاہ باشند چیزے در آنجا بیاموزند کہ کفایت شعاری و میانہ روی از دست خود گاہے نہ دہند و ہم کل اختلاف نیست کہ علوم را در غیر زبان مادری خویش یاد گرفتن کارے است کہ آسائش تواں ثمر و پس برائے ما ناگزیر آمد کہ وسیلہ تعلیم اُردو را قرار دہیم ہمیں امور را پیش نظر خود ہا نہادہ ما مسلمانان یک درسگاہ ملی را بنا نہادہ ایم کہ از یک جہت تعلیم حاضرہ و از جہت دیگر تعلیم مذہب دادن شیوہ و شعار خود قرار دادہ است و ہم ایں تعلیم گاہ کسے را نمی گزارد کہ صنعتے از صنعتہا را یاد نہ گیرد تا چوں قدم ازاں بیروں نہد با صنعتے از صنائع آشنا باشد و بتواند کہ بر دست و بازوئے خویش اعتماد کردہ چیزے برائے خود و خانہ خود مہیا ساز و نیز ما متعلمین را نمی گزاریم کہ خود گرفتہ

اسراف باشند بلکہ سعی می کنیم کہ سادگی و جفاکشی عادت و خصلت ایشاں باشد و ہم آنچہ از علوم عصریہ در جامعہ درس دادہ می شود ما ہمہ اینہارا در زبان اُردو درس میدہیم تا بر دماغ متعلمین ما در راہ افہام و تفہیم بارسے نباشد کہ نتوانش تحمل کرد۔

(ترجمہ) سات سال ہوئے مسلم قوم نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ موجودہ رائج الوقت تعلیم کو بدل کر ایک ایسی تعلیم کو قوم کے سامنے پیش کیا جائے جس سے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ اعلحضرت پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آج کل ہم مسلمانان کے لئے علوم دین کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی بھی ضرورت ہے تاکہ جب ہمارے نوجوان تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسہ سے نکلیں تو دنیا کا بھی لطف اٹھا سکیں اور دین کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ اس کے علاوہ چونکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر نوجوان محض نوکری حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور چونکہ ان میں سے تھوڑے ہی اشخاص نوکری کے سلسلہ سے لگ سکتے ہیں اور جو ملازمت کے حلقہ سے باہر رہ جاتے ہیں ان میں کسی دوسرے کام کی قابلیت نہیں ہوتی اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی باقی زندگی رائیگاں جاتی ہے۔ مزید برآں چونکہ مسلمانوں کی معاشی حالت بھی خراب ہے اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارے طلبہ جب تک درسگاہ ہوں میں رہیں اس قسم کی تعلیم حاصل کرتے رہیں جس سے کفایت شعاری اور میانہ روی ان کی عادت بن جائے۔ نیز چونکہ اس بارے میں بھی کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ علوم کو سوائے مادری زبان کے کسی اور دوسری زبان میں سکھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے واسطے یہ ناگزیر ہوا کہ زبان اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ ان امور کو سامنے رکھ کر ہم مسلمانوں نے اس درسگاہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ جہاں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اس کے علاوہ طلبہ کو کوئی نہ کوئی صنعت بھی سکھائی جاتی ہے تاکہ تعلیم سے فراغت کے وقت وہ کسی نہ کسی صنعت سے بھی آشنا ہوں اور اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے کچھ کما سکیں۔ اس درسگاہ میں یہ بات بھی خاص طور پر ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ طلبہ میں اسراف کی عادت پیدا نہ ہو اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان میں جفاکشی اور سادگی کی خصلتیں پیدا ہو جائیں اور علوم جدیدہ کی جتنی کچھ تعلیم بھی جامعہ میں دی جاتی ہے وہ سب اُردو زبان میں دی جاتی ہے تاکہ ہمارے طلبہ کے ذہن پر مطالب کے سمجھنے میں کوئی ایسا بوجھ نہ پڑے جسے وہ اٹھا نہ سکیں۔"

وقار الملک اور جامعہ اسلامیہ

(نواب وقار الملک مرحوم)

(ذیل میں ہم نواب وقار الملک مرحوم کے ایک مضمون سے کچھ اقتباسات درج کر رہے ہیں
یہ مضمون انہوں نے دہرہ دون میں یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء کو اس وقت تحریر فرمایا تھا جب
سکریٹری آف اسٹیٹ نے الحاق وغیرہ کی ان شرائط کے خلاف جس کے ساتھ مسلمان
مسلم یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے قطعی فیصلہ دے دیا تھا)

چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے یونیورسٹی ملنے میں دقت پیش آ رہی ہے لہذا میری رائے یہ ہے کہ اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہیے یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علیگڈھ کالج ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی بن جائے گا اور اس یونیورسٹی کے ذریعہ سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کر سکیں گے۔ اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہیے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے ایک علیحدہ جامعہ اسلامیہ (قومی دار العلوم) خود قائم کریں۔

جامعہ اسلامیہ کو تمام مسلمانان ہند کے دوسرے گروہوں کے واسطے جو سرکاری ملازمتوں کے خواستگار نہیں ہیں ان کی تعلیمی ضروریات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے جس کے ذریعہ سے تمام ضروری علوم و فنون کی تعلیم قوم میں شائع ہو سکے۔ امیدواران ملازمت کے علاوہ دوسرے گروہ جنکو سرکاری ملازمت کی ضرورت نہیں اور جن کی تعلیم کا اہتمام اس طرح پر درکار ہوگا حسب ذیل ہیں:—

(الف) مسلمان لڑکیوں کی تعلیم جن کو سرکاری ملازمت سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے بڑے بڑے مسلمان امرا۔ زمینداران تعلقہ داران جو اپنی اولاد کو سرکاری ملازمت کے واسطے تعلیم دلانا نہیں چاہتے بلکہ اپنا ایک لائق تعلیم یافتہ اور پابند مذہب جانشین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

(ج) بڑے بڑے تاجر، دوکاندار اور کارخانہ دار جو اپنی اولاد کی تعلیم اس غرض سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنے کارخانوں کو عمدہ قابلیت کے ساتھ چلا سکیں اور اپنے اخلاق و پابندی مذہب کے ذریعہ سے قوم میں ہر دلعزیزی پیدا کریں اور قوم کی ہمدردی ان کے دل میں ہو۔

(د) علماء و مشائخ جو اپنے بیٹوں کو عمدہ تعلیم کے ساتھ اپنی ہی صفات سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں۔

(ہ) یونانی اطباء جو اپنے بیٹوں کو اس وقت کی بہ نسبت آئندہ اپنی جگہ زیادہ ممتاز حیثیت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور جن کی خواہش ہے کہ زمانہ حال کی تعلیم سے مستفید ہو کر وہ اپنے فن کو ترقی دیں اور وہ بیدار جانشین ثابت ہوں اور جو رونق اور برکت پشتہا پشت سے ان کے گھر میں چلی آتی ہے وہ بدستور قائم رہے۔

(و) وہ لاکھوں غریب نادار طلبا جو زمانہ حال کی سرکاری تعلیم کے سخت گراں مصارف برداشت نہیں کر سکتے اور جن کو اس بات کی ضرورت ہے کہ بقدر ضرورت دینی تعلیم کے علاوہ ان کو اور کوئی ارزاں تعلیم دی جائے جس سے وہ اپنی روزی عزت اور آزادی کے ساتھ پیدا کر سکیں۔

(ز) باقی تمام وہ لوگ جو خانقاہ نشینوں اور بزرگوں اور خانگی ملازمتوں کے ذریعہ سے اپنی روزی پیدا کرتے ہیں مقصود یہ ہے کہ کوئی مسلمان بغیر اس قدر تعلیم کے باقی نہ رہے جو اپنے نماز روزہ وغیرہ ارکان اسلام کی واقفیت کے علاوہ اپنی مادری زبان میں کسی قدر نوشت و خواند اور بہت معمولی قسم کا حساب اور مختصر سا جغرافیہ نہ جانتا ہو۔

ان سب گروہوں کے واسطے علی قدر مدارج و ضرورت انگریزی زبان کی تعلیم کا اہتمام درکار ہوگا اور مشرقی علوم و فنون کی تعلیم کا شعبہ علیحدہ قائم کرنا ہوگا جس میں یونانی طب کو بھی داخل سمجھنا چاہئے۔

دینیات کے اعتبار سے جامعہ اسلامیہ میں ہر قسم کی تعلیم کا انتظام موجود ہو جس سے ایسے روشن ضمیر مفسر، محدث، فقیہ، ادیب اور متکلمین پیدا ہو سکیں جو ایک طرف علوم جدیدہ کے حملوں سے اسلام کی پوری حفاظت کریں اور دوسری طرف اسلام کی خوبیوں اور صداقتوں کا سکہ غیر

مذاہب کے لوگوں کے دلوں پر بٹھائیں اور اشاعتِ اسلام کا کام دیں اور فیضانِ صحبت سے طلباء کے دلوں میں نور ایمان و اسلام کو پیدا کریں اور ترقی دیں۔

آج جس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اس سے قوم میں وہ زندگی عود نہیں کر سکتی جس کی ضرورت ہے وہ زندگی اگر عود کر سکتی ہے تو جامعہ اسلامیہ کے اس دینی تنظیم ہی کے ذریعہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ عود کرے گی۔ الغرض سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ لٹریچر کے سوا باقی جن علوم کی تعلیم اس وقت انگریزی میں ہوتی ہے وہ سب ہماری اپنی مادری زبان اُردو کے ذریعہ سے دی جائے۔ یاد رکھیے کہ کسی ملک نے غیر زبان میں تعلیم پاکر ترقی نہیں کی اور نہ ہوگی۔ نہ کبھی آئندہ صرف کسی غیر زبان کے ذریعہ سے علوم میں ترقی کر سکے گا۔

میرے دوست محمد عبد الرحمٰن صاحب بجنوری بی اے کی طرف سے جو ہمارے ایم اے او کالج کے ایک قابلِ فخر اور کامیاب اولڈ بوائے ہیں اور جو اب تکمیل تعلیم کی غرض سے یورپ گئے ہوئے ہیں اور یہ سطری کی سندلے کر اب جرمنی میں علوم کی تکمیل کر رہے ہیں مُسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن پر ایک نہایت قابلِ قدر اور مبسوط رائے ۱۱ و ۱۲ اگست گذشتہ کے اجلاس کانسٹی ٹیوشن کمیٹی منعقدہ لکھنؤ میں پیش ہوئی تھی۔ اس میں وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ایک سفر کے اثنا میں ایک جرمن عالم اُن کے ہمسفر تھے انہوں نے ہندوستان کے تعلیمی ترقی کا ذکر بجنوری صاحب سے دریافت کیا کہ یہ تعلیم کس زبان میں دی جاتی ہے۔ جواب میں یہ معلوم کر کے کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے انہوں نے بہت زور کے ساتھ کہا کہ "یاد رکھو ہزار برس میں بھی ہندوستان تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا اور کبھی عام طور پر تعلیم نہیں پا سکتا جب تک کہ خاص اپنی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام نہ کیا جائے گا"۔ یہ سچ ہے کہ آج ہمارے پاس نہ تمام علوم کی اپنی زبان میں کتابیں ہیں نہ ایسے پروفیسر ہیں جو اردو میں ان میں سے اکثر علوم کی تعلیم دے سکیں لیکن دُنیا کا یہ مسلم مقولہ ہے کہ جہاں جس کی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ چیز ضرور بہم پہونچ جاتی ہے۔ کتابوں اور استادوں کے بہم پہونچنے میں دیر ہوگی لیکن رفتہ رفتہ ضرور اس میں کامیابی ہوگی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے آج بھی کتابیں اور اُستاد موجود ہیں۔ اور اشتہارات دینے سے غالباً ہم ایسے لوگوں

کی خدمات حاصل کر سکیں گے جو ہمارے لئے مطلوب کتابیں اُردو زبان میں مرتب کر سکیں نیز جب ہم اتنا بڑا کام اختیار کرنے کو ہوں گے تو ہمارے لئے لازم ہوگا کہ اپنے نوجوانوں کو مالی مدد دے کر انگلستان۔ فرانس۔ جرمن اور دیگر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجیں جن کا کام یہ ہوگا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی مادری زبان میں کتابیں لکھیں اور اس زبان میں قوم کے بچوں کو تعلیم دیں۔

ہمارے وہ بچے جو آیندہ ملازمت کا طوق اپنی گردن میں ڈالنے والے نہیں ہیں وہ کیوں ریاضیات انگریزی میں پڑھیں۔ کیوں جغرافیہ انگریزی میں حفظ یاد کریں۔ کیوں تاریخ انگریزی میں پڑھنے کی زحمت برداشت کریں۔ سائنس کے غریب آلات ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ان کا استعمال صرف یوروپ ہی کی زبانوں کے ذریعے سے سکھایا جا سکتا ہے۔ وہ بسروچشم موجود ہیں کہ مسلمان ان کا استعمال اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے سیکھیں اور طلبہ کی عمریں جو غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے ان علوم کے حاصل کرنے میں برباد اور تندرستیاں قربان ہوتی ہیں اُن کو اس سے بچایا جاوے۔

ضروریات زمانہ کے لحاظ سے جس قسم کی ورزشیں اور حفظ صحت کے اصول انگریزی درسگاہوں میں اس وقت ضروری سمجھے گئے ہیں وہ ان جدید درسگاہوں میں بھی جہاں اپنی مادری زبان میں تعلیم ہوگی داخل ہونے چاہیں اعلیٰ تربیت، عمدہ سے عمدہ ڈسپلین دونوں قسم کی درسگاہوں سے یکساں متعلق ہوں گے اور کفایت شعاری کی تعلیم کے لئے دونوں قسم کے طالب علموں میں کوشش ہونی چاہئے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابھی ایک عرصہ تک عملاً زیادہ اثر اس کوشش کا دوسری اسکیم کے طلباء پر پڑے گا۔ وہ جہاں تک ممکن ہے بہت زیادہ کفایت شعاری کے خوگر بنائے جا سکیں گے جن کی تعلیم بہت ارزاں ہوگی۔ کفایت شعاری سے میری مراد یہ ہے کہ اپنی تندرستی اور اپنی عزت (نہ کہ فرضی عزت) محفوظ رکھنے کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کیا جائے۔

میں اوپر ہی کہہ چکا ہوں کہ تعلیم السنہ کے لحاظ سے کم از کم انگریزی زبان کی تعلیم اپنے

جدید مدارس میں بھی ہم کو لازمی طور سے داخل کرنی ہوگی۔ چھوٹے مدارس میں کم مقدار میں اور اس کے بعد جیسے جیسے مدارج تعلیم ترقی کرتے جاتے ہیں انگلش زبان کی تعلیم بھی ان درسگاہوں میں ترقی کرتی رہے گی۔ یہاں تک کہ علیگڈھ کالج کے طلباء جہاں تک انگریزی تعلیم حاصل کرسکتے ہوں اردو زبان کے طلبا کے واسطے بھی سکنڈ لینگ وچ کے طور پر اسی قدر انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام درکار ہوگا اور خصوصاً دولتمند لوگوں کے واسطے اس کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔ اس کے بعد پھر ان طلباء کے ذاتی شوق پر منحصر ہوگا کہ اگر ان میں سے کوئی چاہتا ہے کہ کسی اور ملک کی زبان کی تعلیم بھی حاصل کرے تو جامعہ اسلامیہ کا کام ہوگا کہ اپنے ہونہار طلباء کے اس کام میں مدد کرے اور ان کو موقعہ دے کہ وہ دوسرے ملکوں میں جاکر اس ملک کی زبان اور دیگر علوم وفنون کو جہاں تک ان سے ممکن ہو حاصل کریں اور ہندوستان واپس آکر جو کچھ انہوں نے وہاں حاصل کیا ہے اس کی مدد سے اپنی مادری زبان میں اپنی قوم کے واسطے مواد بہم پہونچائیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی جامعہ اسلامیہ کی خاص توجہ کا مستحق ہوگا ہم نے لڑکوں کے واسطے اگرچہ ابھی بہت کچھ نہیں کیا لیکن کچھ تو کیا ہے لڑکیوں کے واسطے اس کا سوواں حصہ بھی ہم نہیں کرسکے اور یہ ہم ایک ایسے فرض کے ادا کرنے سے غفلت کررہے ہیں جس کے بدون قوم ہرگز ترقی نہیں کرسکتی ہمارے مذہب نے تو ہمیں سب کچھ بتادیا تھا اس نے صاف کہا کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ اس نے حصول علم کی کوششوں کے متعلق مرد اور عورت میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا مگر افسوس ہے کہ ہم اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں بہت کچھ قاصر رہے ہیں خدا ان چند افراد قوم پر اپنی رحمت نازل کرے جنہوں نے اس فرض کفایہ کو اب تک تھوڑا بہت انجام دیا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ جامعہ اسلامیہ کی توجہ سے آئندہ لڑکیوں کی تعلیم کا نظام ہم کو بہت کچھ درست کرنا ہوگا۔

مذکورہ بالا مقاصد اور ان کی قیمتی اغراض کے لحاظ سے جامعہ اسلامیہ کو اپنا سلسلہ انتظام تمام ہندوستان میں قائم کرنا ہوگا۔ بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مدارس چھوٹے قصبوں میں چھوٹے مدارس اور ان کے ساتھ جہاں جیسی ضرورت ہے بورڈنگ ہاؤس قائم کئے جائیں اور ایک تعداد قرار دیجائے

کہ جس آبادی میں فلاں تعداد تک مسلمان آباد ہوں وہاں ضرور کوئی نہ کوئی اس قسم کی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا جائے یا جہاں اس تعداد سے بھی کم مسلمان رہتے ہوں لیکن وہ اپنے مدرسہ کے واسطے مناسب مالی مدد دینے پر تیار ہوں وہاں انکو بھی محروم نہ رکھا جاوے بلکہ آگے چلکر ہم کو ایک گاؤں میں جہاں کوئی مسلمان آباد ہو یہ دیکھنا ہوگا کہ ارکانِ اسلام کی تعلیم کا انتظام وہاں موجود ہو مُردوں کے تجہیز تکفین میں وہاں کے رہنے والوں کو کوئی تکلیف باقی نہ رہے اور غیر مذہب منادیوں سے بھی ان کی حفاظت کا ضروری انتظام کرنا ہوگا۔

جامعہ اسلامیہ میں ہر صوبہ اور ہر ضلع سے ان لوگوں کو ممبری کے لئے منتخب کرنا چاہئے جو اِن کاموں میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہم اپنے انتظامات میں بالکل آزاد ہوں گے نصابِ تعلیم ہمارا ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ پروفیسروں اور ممتحنوں کے تقرر میں ہم پوری طرح آزاد ہوں گے جس کو چاہیں مقرر کریں جسکو چاہیں نہ کریں۔ تنخواہوں کی تعداد۔ اخراجات کے اقسام۔ خلاصہ یہ کہ تمام بجٹ اور تمام انتظام پر خود ہمارا قابو ہوگا۔

یہ خیال کہ جو لوگ گورنمنٹ وغیرہ کی ملازمت کے امیدوار نہیں ہیں انکی تعلیم کا انتظام یونیورسٹیوں اور سررشتہ ہائے تعلیم کے دائروں سے باہر ہونا چاہئے محض اسی مایوسی کیوجہ سے پیدا نہیں ہوا ہے جو ہم کو حال میں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ہوئی ہے بلکہ لکھنؤ کے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۳ء میں بھی میری ہی تحریک سے ایک کافی مباحثہ کے بعد یہ ریزولیوشن پاس ہوا تھا اس کے بعد رزولیوشن کیلئے جگہ خالی نہ رہی ایک مختلف مانع اور خاصکر مالی دشواریوں کیوجہ سے اس رزولیوشن کی تعمیل نہ ہو سکی کل امر مرھون باوقاتہا خدا کے علم میں اُس کے لئے شاید یہی وقت موزوں تھا۔ وہی مسبب الاسباب ہے اور یہ شاید اسی کا کرشمہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے جب ہم کو ایسی یونیورسٹی حاصل کرنے میں مایوسی ہوئی جس کی تمنا میں ہم چالیس برس سے کوشش کرتے چلے آتے تھے تو اُس نے یہ مصداق عسیٰ اللہ ان یحدث بعد ذالک امرا ہمارے دل میں ایک ایسی جامعہ اسلامیہ کا خیال پیدا کیا جسکو ہم اپنے ہر ایک درد کی دوا کہہ سکتے ہیں۔

اب رہا ایسی مکمل اسکیم کا مرتب کرنا جو اس جدید تجویز کے کلیات اور جزئیات پر حاوی ہو اور یہ کہ کام شروع کیونکر کیا جائے اور ابتداء امر میں کہاں کہاں اور کس کس قسم کی درسگاہیں قائم کی جائیں اور ان کی

ضروریات کا بہم پہونچانا اور مداخل و مخارج کا انتظام وغیرہ وغیرہ یہ سب وہ امور ہیں جن کے تصفیہ کی غرض سے اوّل ایک بڑی مجلس مشورت کی ضرورت ہوگی جس میں علاوہ کل موجودہ ٹرسٹیاں علیگڈھ کالج اور دیگر قومی درسگاہوں کی تعلیمی جماعتوں کے منظم ممبروں کے ہر ایک صوبہ کے قائم مقام کافی تعداد میں شامل ہوں اور وہ طے کریں کہ کارروائی کا طریقہ کیا ہوگا۔ جامعہ اسلامیہ کا یہ پہلا اجلاس بمقام علی گڈھ منعقد ہونا چاہیئے جو جامعہ اسلامیہ کا بھی ہیڈکوارٹر ہو اور وہی مرکز ہوگا جامعہ اسلامیہ کے مرکزی جماعت انتظامیہ کا اور یہی اجلاس تجویز کرے گا کہ جامعہ اسلامیہ کا قانون کیونکر بنایا جائے اور یہ بھی محتاجِ بیان نہیں ہے کہ جامعہ اسلامیہ کی سنٹرل کمیٹی (مرکزی جماعتِ انتظامیہ) کے تحت لامحالہ ہر ایک صوبہ میں ایک جداگانہ کمیٹی انھیں اغراض کی تکمیل کے واسطے قائم کرنی ہوگی جو اپنی ماتحت اور بہت سی کمیٹیاں اضلاع اور مقامات میں پیدا کرے گی

یہ میں کسی دوسری جگہ کہہ چکا ہوں کہ کام کرنے والے اگر آنریری طور سے نہ مل سکیں تو ضرور لائق آدمیوں کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کرنی چاہئیں اور ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ جو فیلنگ اس جدید اسکیم کے شروع ہونے سے قوم میں پھیلے گی اُس سے نوجوانانِ قوم میں ایثار کا بھی مادّہ خاص طور پر پیدا ہوگا اور اگر ہم کو تنخواہ ہی کے ذریعہ سے کام کرنے والوں کو بہم پہنچانا ہوگا تو اُمید ہے کہ قوم میں سے جابجا اکثر نوجوان آگے بڑھیں گے اور وہ تھوڑے سے معاوضہ میں ایسی خدمات انجام دینے کیلئے تیار ہوں گے جن کا معاوضہ دوسری صورت میں بہت زیادہ دینا پڑتا۔ میں اس کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں کہ جو لوگ روپیہ سے کسی کام میں مدد کرسکتے ہیں وہ تو اپنی جیب میں ہاتھ نہ ڈالیں اور صرف نوجوان تعلیم یافتوں کو یہ وعظ سنا دیا جاوے کہ ان کو ایثار سے کام لینا چاہیئے نوجوان یا تو مفت کام انجام دیں یا بہت قلیل معاوضہ قبول کریں اور اب بھی میں یہی کہوں گا کہ تعلیم یافتہ نوجوان میں ایثار کا مادہ پیدا کرنے کی غرض سے اول ذی مقدور لوگوں کو اس کام میں مالی مدد دینی چاہیئے اس سلسلہ تو جوان تعلیم یافتوں پر ایثار کے وعظ کا اثر ہو سکتا ہے ایسے موقعہ پر میں یہ بھی صاف کہوں گا کہ علیگڈھ کالج سے اگر ایثار کا مادہ کم پیدا ہوا ہے تو اس کے خاص وجوہ ہیں۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ علی گڈھ کالج میں ایسی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے محض اپنی قومی کالج

کی خاطر اُس قدر تنخواہ پر جو اُن کو کالج سے مل سکتی تھی قناعت کی اور گورنمنٹ کی بڑی بڑی تنخواہوں کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ بعض دفعہ اُن سے انکار کیا اور جبکہ ہماری یہ جدید تجویز جس کا نشو و نما تمام قومی رُوح کی بنیاد پر ہوگا اور جہاں صبح شام اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ایثار ہی کی آوازیں کان میں پہونچیں گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم میں ایثار کا مادّہ پیدا ہو۔ اسلام کی وہ تاریخیں جو مسلمانوں کی قلم کی لکھی ہوئی ہوں گی اپنی مادری زبان میں جب طلبا پڑھیں گے اور اس میں پیشوایانِ اسلام کی مثالیں ان کی نظر سے گذریں گی تو ہم کو اپنی قوم میں ایثار کا مادہ پیدا کرنے کی غرض سے کسی بیرونی مثال اور نمونہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اسلام کی تاریخ سے بہتر مسلمانوں کے دل پر اثر کرنے والا کوئی مضمون یا لکچر ایثار کفایت شعاری اخوت ہمدردی اخلاص صداقت، شجاعت اور دوسرے بہادرانہ اوصاف پیدا کرنے کی غرض سے نہیں ہو سکتا۔ مگر ساتھ ہی اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ جو لوگ ایثار سے کام لیں قوم کی طرف سے اُن کی قدر اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ آج میرے سامنے ایسی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص نے دنیاوی دولت پر نہایت بہادری کے ساتھ لات ماردی ہے اور اپنی زندگی کا مقصد اس نے یہی قرار دیا ہے کہ اپنی تعلیم کو ترقی دے اور اس سے قوم کو نفع پہونچائے لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ کہ جن کا فرض تھا کہ اس کی قدر کرتے وہ باتیں کرتے ہیں جن سے ان نوجوان بہادروں کا حوصلہ پست ہو۔ بایں ہمہ کس قدر قابلِ قدر ہیں وہ بہادر کہ تمام ناقدریوں کی برداشت کرتے ہیں اور وہ بہادر اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہیں۔ برخلاف اس کے جامعہ اسلامیہ کے زمانہ میں جب ایسے قومی بہادروں کی قوم اور ہر ایسے شخص کی طرف سے جس کا یہ فرض ہو کہ وہ اپنے نوجوانوں کی قدر کرے ان کی حوصلہ افزائی کی جاوے گی تو یہ امر آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ان کے ایثار کا مادّہ پھر ایک دفعہ مسلمانوں کے سامنے سلف صالح کا نمونہ پیش کردے گا مسلمانوں میں سے ابھی تک یہ مادہ فنا نہیں ہوا ہے۔ بازار میں جنس موجود ہے مگر افسوس کہ خریدار موجود نہیں ہیں۔

لیکن یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ شیخ چلی کے منصوبوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا اگر اس پر عمل کرنے کی غرض سے جامعہ اسلامیہ کے ہاتھ میں کافی روپیہ نہ ہو۔ یہ ۲۵ ۔ ۳۰ لاکھ روپیہ جو اس وقت

جمع ہوئے ہیں وہ اتنے بڑے انتظام کے واسطے ناکافی ہیں بلکہ حقیقت میں یہ موجودہ رقم اس یونیورسٹی کو ترقی دینے کی غرض سے بھی کافی نہ تھی جس کی حصول کے لئے ہم اب تک ناکام کوشش کرتے رہے ہیں۔ یقیناً اس کے واسطے بھی ملک کو اور بہت زیادہ ایثار سے کام لینا پڑے گا پھر ایک ایسی کم استطاعت قوم سے جیسے کہ ہماری قوم ہے ظاہرا موجودہ رقم کا جمع ہونا بھی بدون ہمارے بڑے بڑے لوگوں کی فیاضی اور کوشش کے ممکن نہیں تھا لیکن تعلیم کا جو پروگرام اوپر بیان کیا گیا ہے اگر وہ شروع کردیا گیا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے اثر سے ایک عام جوش قوم میں پیدا ہوگا اور دنیا دیکھ لے گی کہ اس مفلس قوم کی جیبوں سے آئندہ کس قدر روپیہ میسر ہو سکے گا۔ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جو چندہ مانگا گیا اس کے مانگنے والوں کی آواز میں اس کے دسویں حصہ کی بھی قوت نہیں تھی جتنا کہ اس جدید اسکیم کے واسطے روپیہ مانگنے والوں کی آواز میں ہوگی۔ یونیورسٹی کے مقاصد قوم کو سمجھانے میں بہت سی مشکلیں پیش آتی تھیں مگر یہ جدید اسکیم اس قدر عام فہم اور ہر دلعزیز ہوگی کہ اس کے واسطے دو لفظ کہنے اور دامن پھیلا دینا بالکل کفایت کرے گا بجائے اس کے کہ لمبی لمبی اسپیچیں کی جائیں اور رسالے شائع کئے جائیں صرف یہی ایک آواز کہ ہماری تعلیم آئندہ ہماری مادری زبان میں ہوگی اور ابتدا سے لیکر انتہا تک اس کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک اور عالم سے لیکر جاہل تک کے دل میں بجلی کی طرح اثر کرے گی اور اگر خدا کو منظور ہے تو جو ناکامی آل انڈیا مسلم یونیورسٹی کے حاصل کرنے میں ہم کو اس وقت ہوئی ہے یہی ناکامی اصل کامیابی کا ذریعہ ہو جائے گی۔

۵ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا ہے اور اس وقت ہم خدا کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے ہم کو ایک غلط راستہ سے نجات دے کر صراط مستقیم پر قائم کر دیا۔

حضور سکریٹری آف سٹیٹ کی طرف سے اس پر بہت زور دیا جا رہا ہے کہ ابتدا سے کالج کا منشا مسلم یونیورسٹی سے ایک ایسی یونیورسٹی تھا جو کیمبرج اور آکسفورڈ کے نمونہ پر ہو (اس سے وہ اسکیم مراد ہے جس کو سید محمود صاحب مرحوم نے ۱۸۷۳ء میں مرتب کیا تھا اور اسی کو سر سید صاحب کی اسکیم کہا جاتا ہے) اور اس سے حضور ممدوح یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس طرح کیمبرج اور آکسفورڈ

مقامی یونیورسٹیاں ہیں نہ کہ الحاقی اسی طرح مجوزہ یونیورسٹی کو بھی ہونا چاہئے لیکن حقیقت یہ ہے اور جب اس مسئلہ پر غائر نگاہ سے توجہ کی جاوے گی تو صاف معلوم ہوگا کہ بانی کالج کا منشا جو کیمبرج یا آکسفورڈ کے نمونہ پر ایسی یونیورسٹی قائم کرنے سے تھا اس سے خاص مقصد یہ تھا کہ اسمیں ریزیڈنشل سسٹم ہو اور وہ اپنے اندرونی انتظامات میں گورنمنٹ کی مداخلت سے بالکل آزاد ہو جسکو بانی کالج نے صاف صاف لفظوں میں ظاہر کر دیا ہے

ذیل میں جناب سید محمود صاحب کی اسکیم ۱۸۷۳ء کی نسبت بجنسہ درج کر دینا مناسب سمجھتا ہوں

دفعہ ۔ بیان مدعا اول ۔ بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانی کرے اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ اس دار العلوم میں نہ ہونی چاہئے۔

جب تک اس قدر روپیہ اور جائداد جس کی آمدنی ضروری اخراجات دار العلوم کو کافی ہو جمع نہ ہو جاوے اس وقت تک اس قسم کی شے کے قائم کرنے کا خیال دل سے کمیٹی کو نکال ڈالنا چاہئے۔ جب تک کہ ہم اپنی حاجتوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں (جیسی کہ تعلیم) گورنمنٹ پر بھروسہ کریں گے تو درحقیقت اس شے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے سب سے عمدہ مدارس تعلیم علوم کے یوروپ میں بھی بالکلیہ یا قریب قریب اس کے گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے علیحدہ ہیں اور یہ بات اُن ملکوں میں ہے جہاں کی گورنمنٹ اسی قوم کی ہے جس کی تعلیم منظور ہے۔ پس یہ دلیل ہندوستان میں کس قدر زیادہ قوی ہو جاتی ہے یہاں کی گورنمنٹ قریباً کل کی کل مرکب ہے ان لوگوں سے جن کی زبان اور مذہب اور خیالات ہم سے مختلف ہیں۔ اس بیان سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ میں ان تینوں چیزوں کے کچھ برخلاف کہنا چاہتا ہوں یا ان میں اور اپنے میں مجھکو کچھ مقابلہ کرنا منظور رہے بلکہ صرف دلیل کے قوی کرنے کے لئے کہتا ہوں کہ یہ بات قریباً غیر ممکن ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہماری حاجتوں کو جو تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے اور ان کا کامل طور سے بندوبست کر سکے حد سے حد جو ایک تربیت یافتہ اور روشن ضمیر گورنمنٹ سے ہو سکتا ہے وہ اس شے کا حاصل کرنا ہے جو اب بھی ہم کو حاصل ہے یعنی دل بڑھانا اور مربی ہونا اگر ہمارے دار العلوم سے عمدہ تعلیم پانی مقصود ہے تو انگریزی گورنمنٹ خود بخود ہمارے دار العلوم کے مربی ہوگی اور اگر کچھ روپیہ کی مدد گورنمنٹ ہم کو دے گی تو ہم کو گورنمنٹ کی نگرانی کرنے پر کچھ عذر نہ ہوگا بشرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہ ہو۔ گورنمنٹ کے مربیانہ اور فیاضانہ رویے سے ہم

اپنی تدبیر کو بہ نسبت اس کے جو گورنمنٹ موجودہ حالات میں کر سکتی ہے بہت زیادہ آسانی اور کامیابی سے انجام کو پہنچا سکتے ہیں اس لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ کمیٹی اس امر کے منظور کرنے میں کچھ بھی تامل نہ کرے گی جس کو میں سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔"

علی گڑھ - ندوۃ العلما - جامعہ عثمانیہ

(جناب عبداللطیف صاحب اعظمی متعلم جامعہ)

اصلاح تعلیم کی تحریک، اپنے ادبار و انحطاط کے احساس اور دوسری قوموں کے عروج و ترقی کے انفعالی اثر کا نتیجہ ہے۔ جب لوگوں نے اپنی پستی کو محسوس کیا، اور دوسروں کی ترقی کو دیکھا، تو ابھرنے اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ترقی کی جب فکر ہوئی تو اپنے نقائص پر نظر پڑی، انہوں نے سوچا کہ نقائص کا دور کرنا ہی، درحقیقت ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے، اس لئے اسی کی اصلاح مقدم قرار پائی۔ اس طرح اصلاح تعلیم کی تحریک کی بنیاد پڑی۔

ہندوستان میں اصلاح تعلیم کی تحریک کو شروع ہوئے، کچھ زائد نصف صدی ہوتی ہے، مگر عالم اسلامی کے دوسرے حصوں میں اس کی بنیاد اٹھارویں صدی کے اوائل میں پڑ چکی تھی، نامناسب نہ ہوگا، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے، ہندوستان سے نکل کر، عالم اسلام کے بعض حصوں کی تعلیمی تحریکوں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل کا زمانہ وہ زمانہ تھا، جبکہ صرف ہندوستان ہی نہیں، بلکہ پورا عالم اسلام خواب غفلت میں سرشار اور صید ادبار و تنزل میں اسیر تھا، غرض وہ تمام علامات جو کسی قوم کے مٹنے اور فنا ہونے کی ہو سکتی ہیں، طاری تھیں۔ لوگ اسی حالت میں تھے کہ مغرب کا سیاسی و تمدنی عروج و اقتدار کا سیلاب آیا اور اس نے تمام عالم اسلامی کو اپنی رو میں لے لیا۔ عوام سوتے رہے مگر چند ذکی الحس اور صاحب فکر اٹھے، دوسروں کو جگایا، اور خطرات سے آگاہ کیا۔

ان اطبا نے امت مرحومہ کے امراض کی تشخیص کی اور ان کے علاج کے لئے نسخے لکھے، ان نسخوں میں عادت، ماحول اور تشخیص کے لحاظ سے فرق تھا، مگر سب کا مقصد ایک تھا وہ یہ کہ کھویا ہوا عروج و عزت حاصل کی جائے اور ذہنی و مادی ترقیوں کے لئے وسائل پیدا کئے جائیں۔ ان

نسخوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ان میں سے ایک نسخہ وہ ہے جس کی بنیاد مغربی تہذیب و تمدن کے اختیار و تقلید پر ہے یعنی یہ کہ ادبار تنزل سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ ترقی یافتہ قوم کی تہذیب و تمدن کو اختیار کیا جائے، ان کے علوم و فنون کو سیکھا جائے اور اس راہ میں جو مشکلات و موانع پیش آئیں، انھیں دور کیا جائے۔ اس نسخہ کے طبیب حاذق ٹیونس کے مشہور مفکر شیخ محمد بیرم تھے، انھوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں اسی تخیل کے مطابق متعدد مدارس قائم کئے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جامع زیتونی میں جو ازہر کے بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے، فرانسیسی زبان اور جدید علوم داخل کئے۔ آجکل مصر و ترکی کے تمام رہنما اسی نسخہ پر عمل کر رہے ہیں۔

۲۔ دوسرا نسخہ وہ تھا جس کی بنیاد مذہب پر تھی، اس میں اصلاح مذہب کو ترقی کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا اور اصلاح مذہب کے لئے تعلیم کی اصلاح ہی کامیابی کا ذریعہ تھی، اس نسخہ کے لکھنے والے سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ (رحمہما اللہ) تھے۔ اس تحریک کو مولانا ابوالکلام آزاد نے "اصلاح دینی" کا لقب دیا ہے۔ اس کے لکھنے والوں نے دیکھا کہ بظاہر امراض بہت سے نظر آتے ہیں مگر یہ شاخیں ہیں کسی اور جڑ کی، یہ جڑ کیا ہے؟ دین کا اپنی اصلی شکل و صورت میں باقی نہ رہنا۔ تشخیص کے بعد سوال تھا طریق علاج کا۔ ان لوگوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ دین میں اسوقت رخنہ پیدا ہوا، جب صحیح علما باقی نہ رہے، علما کا زوال، دین کے زوال کا سبب بنا، اس لئے سب سے پہلے صحیح علما پیدا کرنے کی فکر ہوئی، جو قوم کی اصلاح و تجدید کے فرائض کو باحسن انجام دے سکیں۔ صحیح معنی میں علما پیدا کرنے کے لئے صحیح اور حقیقی تعلیم کی ضرورت تھی، اس لئے اس وقت کے تمام مصلحین نے طریق اور نصاب تعلیم کی اصلاح پر زور دیا۔

شیخ محمد عبدہ، جو گذشتہ صدی کے مجددین و مصلحین میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، چاہتے تھے کہ ایک ایسا دار العلوم قائم کیا جائے، جس کا نصاب تعلیم فضول کتابوں اور غیر مفید مباحث سے یکسر پاک ہو اور جدید حالات و جدید ضروریات کے مطابق ہو۔ انھوں نے ۱۳۰۴ھ میں لائحۃ الاصلاح والتعلیم الدینی کے نام سے ایک مبسوط اور مفصل اسکیم لکھکر بذریعہ شیخ الاسلام سلطان عبدالحمید کی خدمت میں پیش کی تھی، اس میں

نہایت تفصیل سے س حقیقت کو واضح کیا گیا تھا کہ دولت عثمانیہ آخری اسلامی حکومت ہے اس لئے وہ تمام مسلمانان عالم کی اصلاح حالت کے لئے ذمہ دار ہے اس اصلاح کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کی صحیح و حقیقی دعوت و اصلاح کے وسائل پیدا کئے جائیں اور وہ ممکن نہیں، جب تک تعلیم دینی کی اصلاح و تجدید نہ ہو۔

تمہید کے بعد اس میں تعلیم کے تین درجے قرار دئے تھے۔ ابتدائی، اوسط، اعلیٰ۔

ابتدائی تعلیم عامۂ مسلمین کے لئے ہونی چاہئے اور اس کے لئے ایک جامع و سہل الفہم نصاب عقائد و فقہ اور تاریخ اسلام و سیرت نبوی و صحابہ کا ہونا چاہئے، جو مکمیر تعلیم قرآنی سے ماخوذ اور لا حاصل مباحث خلاف و جدال سے معرا ہو۔

تعلیم درمیانی اس طبقہ خواص و متوسطین کے لئے ہونی چاہئے جو مختلف ملکی و اجنبی زبانوں اور علوم و فنون جدیدہ کو حاصل کر کے مختلف مشاغل معاش و ملازمت میں مشغول ہوں۔ ان کے لئے ایک دوسرا نصاب ہونا چاہئے جو پہلے سے وسیع تر ہو مگر تمام کتاب و سنت سے ماخوذ، اور صرف عقائد، فقہ سادہ و سہل اور تاریخ دینی و مدنی اسلام پر مشتمل ہو، البتہ ایک کتاب اس میں ایسی بھی ہونی چاہئے جو علوم اسلامیہ و مذاہب اسلام کی تاریخ سے پوری واقفیت پیدا کرائے۔

آخری درجہ عالی، ان لوگوں کے لئے ہو جو قوم کے لئے مرشد و معلم اور داعی و رہبر ہوں۔ ان کے لئے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے جامع و اصلاح یافتہ نصاب تعلیم کی ضرورت ہے۔

نیز انھوں نے لکھا تھا کہ "مشکلات شدید اور کام اہم ورنہ زک سہے لیکن سا تدی نتیجہ، فوز و فدح ہے اس کے سوا تمام ابواب عمل مسدود ہیں۔ پس ناگزیر ہے کہ تعلیم دینی کے نظام میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جائے طریق تعلیم بھی ہمارا بہت کچھ محتاج اصلاح ہے، اساتذہ کو کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے ہمارا قدیم املا جو ٹھیک ٹھیک آج کل کی یونیورسٹیوں کا طریق تدریس ہے، پھر جاری کیا جائے " آخر میں انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ سب سے پہلے ایک مرکزی اسلامی یونیورسٹی، قسطنطنیہ میں قائم کی جائے اور شیخ الاسلام کے زیر اہتمام ہو اور تمام ممالک عثمانیہ اور دوسرے اسلامی ممالک مثلاً ہندوستان، جاوا اور چین میں

اس کی شاخیں قائم کی جائیں اور تمام مدارس اور یونیورسٹیاں اپنے مرکز سے ملحق ہوں[۱]۔

ٹھیک یہی دونوں تحریکیں ہندوستان میں بھی شروع ہوئیں۔ معلوم نہیں عالم اسلامی کی گونج تھی یا اسباب وعلل کی یکسانیت کی وجہ سے نتیجہ ومعلول میں بھی یکسانیت تھی بہر حال دونوں بالکل یکساں۔ (۱) پہلی تحریک علی گڑھ کی ہے، جس کے بانی ومبانی سرسید ہیں (۲) اور دوسری ندوۃ العلماء کی۔ پہلے تحریک علی گڑھ کو لیجئے۔

تحریک علی گڑھ سرسید ہمارے تعلیمی ہراول کے پہلے جنرل ہیں۔ انھوں نے ہماری تعلیمی کشتی کی اس وقت ناخدائی کی، جب وہ ساحل سے کوسوں دور اور سخت طوفانوں میں گھری ہوئی تھی۔ لوگوں کے قلم و دل آزاد ہیں، وہ سرسید کے متعلق جو چاہیں لکھیں، لیکن ان حالات میں، جن میں سرسید نے قوم کی بقا و حیات کے لئے انگریزی تعلیم و تمدن کو ضروری سمجھا اور انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کو، ہندوستان کی دوسری تعلیموں پر ترجیح دی، اگر ہمارے نقادوں کو اس زمانہ کے مسئلہ تعلیم کو حل کرنا ہو تو یقین ہے کہ ان کے قلم کی سیاہی خشک اور زبان میں لکنت پیدا ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید نے جس تعلیم اور طریق تعلیم کو مسلمانوں میں سرواج دیا اور ان کی حیات و بقا کے لئے ضروری سمجھا، وہ نہ تو ہندوستان کی تمدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور نہ قومی زندگی کی اصل ضرورتوں اور روزمرہ کی احتیاجوں کو پورا کرتا ہے لیکن اگر اس زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نظام تعلیم کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، سرسید کو جس وادی سے گذرنا پڑا ہے، وہ چاروں طرف سے، کانٹوں سے گھری ہوئی تھی، اس لئے یہ کہنا کہ ان کا دامن کہیں الجھا نہیں، بہت بڑی جسارت ہوگی مگر اسے طے کر لینے پر تحسین نہ کرنا بھی بہت بڑی زیادتی ہے۔

سرسید کی تعلیمی خدمات کی ابتدا مرادآباد میں ایک فارسی مدرسہ کے قیام سے ہوتی ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۹ء میں قائم کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی فارسی اور اردو وغیرہ کی تعلیم کے متعلق ان کی رائے بدل گئی اور انھوں نے حکومت سے سفارش کی کہ "گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے

---

[۱] شیخ محمد عبدہ کی پوری اسکیم الہلال ۱۱ رفروری ۱۹۱۳ء سے ماخوذ ہے البتہ کہیں کہیں مشکل عربی الفاظ کو آسان الفاظ میں بدل دیا گیا ہے۔

اورصرف انگریزی اسکول جاری رکھے "۔ مگر مشکل یہ تھی کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا، عیسائی ہو جانے کے مرادف ہے چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جب حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو جاری کرنا چاہا تو مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی اور اس کے حاصل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان حالات کو دیکھ کر، سرسید نے ضروری سمجھا کہ انگریزی اسکول اور کالج قائم کرنے سے قبل، مسلمانوں کے دل میں انگریزی زبان وعلوم کی اہمیت اور اس کی علمیت جاگزیں کی جائے۔ اور انگریزی سے علمی اور تاریخی کتابیں اردو میں منتقل کر کے، ان کے دل میں مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت بٹھائی جائے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے، انھوں نے متعدد مقامات پر سوسائیٹیاں قائم کیں۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ایک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا اور اس میں انگریزی کے علاوہ، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ سرسید نے بنیاد رکھتے وقت ایک مبسوط تقریر کی تھی۔ تقریر نہایت موثر اور ان کے جذبات کی پوری پوری آئینہ دار ہے انھوں نے آخر میں فرمایا تھا کہ

> "اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے۔ بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں، جس طرف تو چاہتا ہے، پھیر لیتا ہے۔ ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دل کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا، جو صرف ہمارے ہی لئے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد بھی بہت سی نسلیں آنے والی ہیں، ان کے لئے ایک روشنی ہے، تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام نگناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا۔ اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے، تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے۔ تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اسکو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے، اسی طرح بخیر اسکا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اس تحریر سے تعلیم کے متعلق سرسید کے خیالات کا اندازہ نہیں ہوتا مگر ان کی نیت کا خلوص اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی خواہش ہر ہر لفظ سے ٹپک رہی ہے۔

سرسید انگریزی تعلیم اور جدید طریق تربیت پر بہت زور دیتے تھے مگر خود ان کے ذہن میں اس کا کوئی واضح خاکہ موجود نہیں تھا، ابھی تک انھوں نے جو اسکول قائم کئے تھے، ان میں انگریزی محض برائے نام تھی جو ان کے عزائم کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ انھوں نے سوچا کہ کسی دارالعلوم یا یونیورسٹی قائم کرنے سے قبل، یورپ جاکر بچشم خود، وہاں کے نظام تعلیم اور طریق تربیت کو دیکھا جائے اور اس کے مطابق ہندوستان میں کوئی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں اس غرض سے یورپ روانہ ہوئے۔ جب انگلستان پہنچے تو وہاں کی دنیا ہی الگ نظر آئی۔ گئے تھے محض نظام تعلیم اور طریق تربیت کے مطالعہ کے لئے مگر وہاں کی ترقی اور ہماہمی کو دیکھ کر حریص طبیعت بے چین ہو گئی۔ دل نے چاہا کہ اگر یہ جنت ہندوستان میں منتقل نہیں ہو سکتی تو ایسی ہی وہاں کیوں نہ قائم کی جائے۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں۔ پوچھا کہ کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا، سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوئی۔"

قیام کے طول کے ساتھ دل کی بےچینی بڑھتی گئی، جب یہ جذبات پر قابو نہ رہا تو تحریر کی صورت میں بہہ نکلے مگر سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ لوگوں کا غم و غصہ اور مشتعل ہو گیا۔

۱۷ ماہ کے بعد انگلستان سے واپس آئے، آتے ہی کالج کے قائم کرنے کی فکر میں لگ گئے، مشکلات پہاڑ کی طرح سدراہ ہوئیں، مگر سرسید کی طبیعت کوہ کنی میں، فرہاد سے بھی بازی لے گئی۔ بالآخر انھوں نے تمام ناساز گار حالات پر قابو حاصل کر لیا اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڈھ میں کالج کی بنیاد رکھی۔

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

اب سرسید کی ذمہ داریاں اور ان کے مشاغل بہت زیادہ ہوگئے تھے، ملازمت کے ساتھ انھیں انجام دینا مشکل تھا، اس لئے ملازمت سے پنشن لے لی اور کلی طور پر کالج کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے کالج کو ترقی دینے اور مسلمانوں میں انگریزی کی اشاعت کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کیں۔ ایک منٹ بھی تو نفت اور غفلت میں ضائع نہیں کیا اور کرتے بھی تو کیونکر

اں رہ عشق ست و کج گشتن مدارد بازگشت

جرم را این جا عقوبت ہست و استغفار نیست

گو سرسید یورپ سے بہت زیادہ مرعوب تھے، اس کی ہر چیز کی تقلید کو ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ مغربی علوم و فنون میں پوری دستگاہ رکھیں بلکہ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ مغربی معاشرت اختیار کرلی جائے۔ اس پر انھوں نے اپنی متعدد تقریروں اور تحریروں میں زور دیا اور اس کی مخالفت پر بہت تاسف ظاہر کیا۔ لیکن اس غلو کے باوجود وہ مذہبی اور اسلامی تعلیم کو نصاب تعلیم کا ضروری جز سمجھتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اگر ایک طرف اسلامی علوم و معارف میں بہترین دستگاہ رکھتے ہوں تو دوسری طرف مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ اگر ایک طرف قرآن و حدیث کے عالم ہوں، اور مسلمانوں کی امامت و قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں تو دوسری طرف بیرسٹری اور ججی وغیرہ کی بھی صلاحیت ہو، غرض وہ ایک ایسا دارالعلوم یا یونیورسٹی چاہتے تھے جس کے گریجویٹس

درکف جام شریعت، درکف سندان عشق

کی مکمل تفسیر ہوں۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں مدرستہ العلوم کے طالب علموں کو خطاب کرکے کہا تھا:-

"یاد رکھو، سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم، ہماری قوم ہے اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (دینی علم و اسلام)

کے نمونے ہونگے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہوگی۔"

۱۸۸۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی تو اس کے منجملہ اور مقاصد کے یہ مقاصد بھی بہت اہمیت رکھتے تھے۔

۱۔ انگریزی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں، ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تابمقدور مستعدی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۲۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام بطور خود دیتے ہیں، اس کو تقویت دینا اور اسکو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔ وغیرہ

۱۸۹۴ء میں اہل پنجاب نے، جالندھر میں سرسید کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا تھا، اس کے جواب میں سرسید نے ایک تقریر کی تھی، جس سے ان کے نظریہ تعلیم کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، اس تقریر کا قدرے طویل ٹکڑا کسی اور مناسب جگہ آئیگا، اس کے چند فقرے یہاں ملاحظہ ہوں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ :-

" فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔"

سرسید مغربی تعلیم کے نتائج و اثرات سے بے خبر نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ اس کی اشاعت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات جگہ لے لیں گے۔ مذہبی عقائد کی دیواریں متزلزل ہو جائیں گی، لوگوں میں دہریت، نیچریت اور لامذہبیت کا رجحان ترقی کر جائیگا۔ اس کے انسداد کے لئے ان کی سمجھ میں، اس کے سوا کچھ بھی نہ آیا کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں، جن میں نقلاً نہیں بلکہ عقلاً اس قسم کے شبہات اور اعتراضات کو رفع کیا جائے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق، انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی جو امت میں ایک جدید فتنہ کی باعث ہوئی، مگر ان کی نیت قطعی صاف تھی، اسلام اور مسلمانوں کو اس سیلاب سے بچانے کے لئے جو مغرب سے آرہا تھا اور جس کے لانے میں خود بھی معاون تھے، اس کے علاوہ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی کہ اس قسم کی ایک تفسیر لکھی جائے۔ اس کے متعلق ان کی ایک طویل تقریر کی

چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں گا، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے نہ صرف بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائیگی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصل مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر رنگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی گئی ہیں۔

میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ سے ان سیاہ دھبوں کو چھڑانے کا وعدہ کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں۔ یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس، باعلم لوگوں کا ہے مگر جبکہ میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جنکی نسبت میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک ہو سکے، صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اس حالت اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس کہتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار رہوں گا۔"

سرسید نے مذہبی تعلیم کی حمایت کی اور اسے نصاب تعلیم میں داخل کیا مگر عربی زبان کو نصاب میں قطعی جگہ نہیں دی گئی۔ غالباً ۱۸۹۵ء میں "احیاء علوم عربیہ" کے نام سے علی گڑھ کالج میں ایک تحریک شروع کی گئی، یہ ایک انگریزی پروفیسر کی مرہون منت تھی اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ایما سے شروع کی گئی ہے۔ نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لئے بھی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دی جائے۔ مگر کسی صاحب نے اسکی مخالفت میں "ریڈیکل" کے فرضی نام سے علی گڑھ منتھلی میں ایک مضمون لکھا اور ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ عربی علوم و فنون اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے۔ ان مخالفتوں کی وجہ سے یہ تحریک سرسبز و شاداب نہ ہو سکی۔

بہر حال سرسید نے مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی معارف کی تعلیم کو بھی ضروری جز قرار دیا تھا مگر لوگوں کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ سرسید بھی معمولی دل و دماغ کے آدمی نہیں تھے۔ ان کے ارادوں میں ذرا بھی تزلزل پیدا نہیں ہوا، مایوسیاں گھیر لیتی تھیں مگر کوشش برابر جاری تھی۔

ہیچ در مبدم عنایت توفیق ممکن ست
در تنگ نائے نزع نہ کوشد کسے چرا؟

سرسید کو حکومت کے بڑے بہی خواہ اور خیر خواہ تھے مگر یونیورسٹی میں اسکی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ ہماری تعلیم بیرونی اثرات سے بالکل آزاد ہو، جالندھر کی جس تقریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اس میں انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ۔

"یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کیسی ہے، ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں، جو ٹکڑا علم کا وہ دیتی ہے اسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی، جبکہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستو! میں بھی انھیں میں سے ہوں کیونکہ مجھکو بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم تعلیمی کمیٹی میں پیش کی تھی، اس میں بھی تصریح تھی کہ "بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانِ حال رہے، اسکی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیئے۔" مگر ظاہر ہے، اس زمانہ میں اس قسم کے خواب کی تعبیر مشکل بلکہ ناممکن تھی۔ وہ تو وہ زمانہ تھا کہ جس سے حکومت کی

نگاہ پھر گئی' اس سے ساری خدائی پھر جاتی تھی۔ ندوہ جب قائم ہوا تھا تو علما، اور امرا، دونوں کی طرف سے اس کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا تھا' مگر بعض وجوہ سے یکایک صوبہ کے حاکم اعلیٰ (سر انٹونی میگڈانل) کو سیاسی بدگمانیاں ہوگئیں' اس کی نظر بدلی تھی کہ' مولانا ابوالکلام کے الفاظ میں" یکایک ندوہ کا عروج محاق میں آگیا' بربادی دنیا کے تمام سامان ایک ایک کرکے فراہم ہوگئے جس قدر امرا، رؤسا، باب دل ندوہ کے ساتھ تھے اور دارالعلوم کے لئے روپیہ دینا چاہتے تھے' ان کے لئے صرف اس قدر علم بس کافی تھا کہ صوبہ کا حاکم اعلیٰ ندوہ کو اچھا نہیں سمجھتا' انھوں نے معاً انکار و تبرا شروع کردیا۔"

جس سے اس نے پھیری آنکھیں' رنگ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی آنکھیں ویراں' دل کی حالت کیا کہئے

اور بالآخر اس کی حالت اسوقت سنبھلی' جبکہ حکومت کے شکوک اور سوء ظن کو دور کیا گیا اور نہ صرف دور کیا گیا بلکہ حکومت کی اعانت بھی قبول کی گئی اور اس کی عمارت کا سنگ بنیاد' لفٹنٹ گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا۔ وہ زمانہ' در تھا کہ مرو' ہرات' نیشاپور' بخارا' فارس' بغداد' مصر' شام' اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج رہا تھا اور عام تعلیم کے لئے ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں مگر حکومت سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ آج کے حالات اس زمانہ سے بالکل مختلف ہیں' آج کل خیالات کی آزادی میں بہت ترقی ہوگئی ہے' اور حکومت کے نفوذ و اثر میں بہت کچھ کمی ہوگئی ہے تاہم کسی آزاد ادارہ کا چلانا' مشکلات و موانع کی بہت وسیع خلیج کو عبور کرنا ہے' سرسید نے جس تعلیم کی خواہش ظاہر کی تھی' اپنی ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو' اسی کے مطابق جامعہ کی تاسیس عمل میں آئی ہے مگر اسے کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اس کا اندازہ اس تعلیم گاہ کے چلانے والے ہی کرسکتے ہیں۔

سرسید اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سخت مخالف تھے' وہ کچھ اس لئے مخالف نہیں تھے' کہ انھیں خدانخواستہ اُردو سے کوئی بغض تھا یا وہ اُردو کی ترقی کو پسند نہیں کرتے تھے' وہ اُردو کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں تھے' اس کے لئے انھوں نے بہت سی کوششیں بھی کی تھیں مگر اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے اس لئے مخالف تھے کہ اسے وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مانع سمجھتے تھے' وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے جیسا کہ

بہت سے لوگ سرسید پر اعتراض کرتے وقت کہتے ہیں کہ تھوڑی بہت انگریزی پڑھ کر کسی دفتر میں چند روپوں کی ملازمت کر لی جائے۔ اسے وہ بہت حقیر چیز سمجھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ، بیرسٹری، انجنیری اور ڈاکٹری کی سندیں حاصل کریں، ہائی کورٹ کے جج ہوں، کونسل قانونی کے ممبر ہوں، یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے فراغت کے بعد، انگلستان جائیں، اور آکسفورڈ اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کریں۔ جو لوگ تجارت وغیرہ کی لائن اختیار کرنا چاہیں، وہ ہندوستان ہی میں محدود نہ رہیں بلکہ ہندوستان سے نکل کر دوسرے ممالک میں جائیں اور بڑی بڑی کمپنیاں قائم کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ذریعہ تعلیم اردو ہو گی تو نہ تو ہم ان صیغوں اور محکموں میں جا سکیں گے اور نہ فاتح قوم کی سی ترقی کر سکیں گے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ۱۸۶۸ء میں جس وقت پنجاب یونیورسٹی میں اور پھر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کو ترقی دینے اور اردو میں مغربی علوم کی تعلیم دینے کی تجویز ہوئی تو سرسید نے سخت مخالفت کی اور اس کی مخالفت میں متعدد مضامین لکھے۔

سرسید نے اپنے مضامین میں ذیل کی چیزوں پر خاص طور پر زور دیا تھا۔

"قومی ترقی اور حکومت دو نواں جائی بہنیں ہیں، پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتحمند قوم کے علوم و زبان حاصل کرے اپنے فتحمندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی ان شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں ان فتحمندوں نے کاملیت حاصل کی ہے، سوشل عادات اور علمی و ملکی خیالات، اس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں ....."

گورنمنٹ نے ہمارے لئے سول سروس میں داخل ہونے کا رستہ، گو اس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں، ابھی تک کھلا رکھا ہے، بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلوما اور انجنیری کا سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت

کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہے[51] جانے دو ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں، ہندوستان کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے ہم کو سمجھنا چاہئے کہ ان حقوق کو واجبی طور پر حاصل کرنے کے لیے ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی ۔ ۔ ۔ ۔ معمولی معمولی عہدے بھی جیسے وکالت و منصفی، سب ججی سب[52] بغیر انگریزی کی کافی لیاقت کے ہم کو میسر نہیں آسکتے۔

ہم کو یہ لازمی ہونا چاہئے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں، ہم بساطی کی سی دوکانداری سے نکلیں، ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی "محمدن اینڈ سنز کمپنی" کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، ابنرا میں، ڈبلن میں، بروزلز میں، سینٹ پیٹرز برگ میں، برلن میں، وائینا میں، قسطنطنیہ میں، پیکن میں، واشنگٹن میں اور دنیا اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بری و بحری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں، جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو پھر کیا ہمارے مردہ علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرتا ہے کہ جہاں تک ہوسکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جاسکے۔"

ان تحریروں کا کیا اثر ہوا؟ اسے علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں سنئیے:۔

"پنجاب یونیورسٹی پر ان کے (سر سید) تین پرزور آرٹیکل، قدح شکن نویس تھیں جن کے

---

٥١ یہ غالباً اشارہ ہے اس کی طرف کہ انڈین سول سروس میں یونیورسٹی کی کسی ڈگری کی شرط نہیں تھی جسے سر سید پسند نہیں کرتے تھے۔

٥٢ آج جن عہدوں کو قابل فخر اور مطمح زندگی سمجھا جاتا ہے، وہ سر سید کے نزدیک معمولی عہدے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی یہ الزام صحیح ہوگا کہ سر سید انگریزی تعلیم سے محض دفتروں کے لیے کلرک چاہتے تھے؟

صدمہ نے مشرقی تعلیم کو چکنا چور کر دیا، الہ آباد یونیورسٹی جب بن رہی تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ
اس میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائے گی، تو سر سید نے متعدد آرٹیکل اس زور کے
لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اڑ گئے"

سر سید نے اس کی مخالفت میں نہ صرف پرزور مضامین لکھے بلکہ انگریزی حکومت کی پروانہ کر کے بتلا دیا
کہ وہ اپنی راہ کے روڑے کے ہٹانے میں دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ انھوں نے کہا کہ "اگر
ایسا ہوا (یعنی ان یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کو روکا گیا) تو ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب
صاف ہے، استقلال، استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، ہمت، کوشش، کوشش، کوشش،
ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے، اور خود اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے
کی کوشش کرنی چاہیئے، اور اگر ہم میں سلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دیا جائے کہ بلاشبہ
گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے، مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں"۔ خط کشیدہ عبارت کو پھر پڑھئے
اور دیکھئے کہ اس میں حکومت وقت کو کس قدر دھمکی دی گئی ہے۔

معلوم نہیں سر سید کی یہی رائے آخر وقت تک باقی رہی یا مرور ایام کے بعد کچھ تبدیلی ہوئی یا کم از کم
شدت میں تخفیف ہوئی؟ مولانا حالی اس پر صرف اس قدر روشنی ڈالتے ہیں کہ

"۴۰ برس کے تجربے سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی
تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو"

سر سید، اعلیٰ تعلیم کی راہ میں مڈل کلاس ایجوکیشن کو بھی مانع سمجھتے تھے، اس لئے اس کے بھی مخالف تھے،
انھوں نے اپنے زمانہ میں اس کی مخالفت کی اور لکھا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے لحاظ سے ابھی ٹکنکل
ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ دماغی اور تہذیبی تعلیم سب پر مقدم ہے، جب اس کی ضرورت نہ رہیگی
تو کسی اور تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

سر سید تعلیم سے زیادہ تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ انسان چاہے کتنی ہی اعلیٰ ڈگری
حاصل کرلے لیکن جب تک تربیت نہ ہو محض بیکار ہے، وہ کہتے تھے کہ میں بہت سے ایسے لوگوں سے

واقف ہوں کہ جنہوں نے انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کی ہے مگر نامناسب جگہوں میں ملازمتیں کر رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھیں اچھی تربیت اور عمدہ سوسائٹی میسر نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ہوسٹل سسٹم (اقامتی زندگی) کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

یہ ہے سرسید کی تحریک اصلاحِ تعلیم کی تاریخ جسے ہم نے اعتراض کرنے کے بجائے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ ان سے بہت سی لغزشیں ہوئیں مگر اسے بھولنا نہ چاہئے کہ انھوں نے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت بھی انجام دی ہے۔ محض برائیوں کو گننا اور اچھائیوں کو نظرانداز کر دینا انصاف نہیں ہے۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اچھائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور برائیوں سے اغماض کرتے ہیں کیا یہی طریقہ ہمارے لئے مناسب نہیں؟

تحریک ندوۃ العلماء | سرسید کی تحریک کی اہمیت اور اسکی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید کے غیر معمولی دل و دماغ اور ان کا بے پایاں صبر و استقلال، مسلمانوں کے بہت آڑے وقت میں کام آیا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تحریک قوم کے مرض کا پورا علاج نہ تھی اس سے صرف قوم کا معاشی مسئلہ یا بعض دوسرے معمولی مسائل حل ہو سکتے تھے جو جدید تمدن نے پیدا کر دیے تھے لیکن ظاہر ہے کہ قوم کے حل طلب مسائل اس سے کہیں زیادہ تھے۔

اس تحریک میں سب سے بڑا نقص یا کمی یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کا انتظام بہت کم تھا، ضرورت تھی ایسے لوگوں کی جو جدید علوم کے ساتھ مذہبی اور اسلامی علوم سے بھی پوری طرح واقف ہوں اور علی گڑھ کالج یا کوئی انگریزی کالج ایسے تعلیم یافتہ کو پیدا کرنے سے بالکل قاصر تھا، چنانچہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

> "شاید کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے، کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے؟

کیا اس قدر تعلیم پاکر یہ لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے؟

اس سے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلما کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی، اس کے قیام میں مولانا شبلیؒ نعمانی اور دوسرے علمار اکابر شریک تھے۔ مولانا حالیؒ کا بیان ہے کہ ندوہ کی تحریک بھی سرسید کی تحریر و تقریر کا انفعالی اثر ہے، علما نے طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے اصلاح کے سلسلہ میں جو تقریریں کیں، وہ درحقیقت سرسید کی تقریروں کی گونج ہے۔ ان کی اصل تحریر ملاحظہ ہو:۔

"اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوتے ہیں، ان میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر اب تک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے ہرگز مناسب نہیں لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا رفارمر ہے، ان کی اصلاح کئے بغیر نہ رہیگا، چنانچہ ندوۃ العلما اسی غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلۂ درس کی زمانۂ حال کی ضرورت کے موافق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلمار کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شاخ ہے جس کے لئے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔
پہلے جو ہمارے علما علوم جدیدہ کے پڑھنے سے اس لئے منع کرتے تھے، کہ ان سے اصول اسلام میں شبہات پیدا ہوں گے اور الحاد و دہریت پھیلے گی، اب برخلاف اس کے وہ بھی وہی کہنے لگے ہیں جو بیس برس سے برابر سرسید کہتے چلے آتے ہیں"

ممکن ہے بخیال مولانا حالی، ندوہ کی تاسیس و قیام میں سرسید کی جدوجہد کا انفعالی اثر ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ گزشتہ صدی کے انقلابی رجحان اور اصلاح کا نتیجہ ہو جسے ہم ابتدار میں بیان کر چکے ہیں مگر اس کے منصۂ شہود پر آنے میں سب سے زیادہ دخل زمانہ کو ہے، جس کی طرف مولاناؒ نے بھی اپنی تحریر میں اشارہ کیا ہے۔ ندوۃ العلمار کے قیام کا خیال ابتدائے ۱۳۱۰ھ میں اس وقت ہوا جب مدرسہ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے وقت بہت سے مشہور علمار جمع تھے۔ اس وقت علمار کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔

تکفیر بازی اور مناظروں سے متجاوز ہو کر، مقدمہ بازی کی نوبت آگئی تھی، اس لئے علما نے ایک ایسی انجمن کے قیام کی ضرورت محسوس کی جو علما کو ان چیزوں سے روکے۔ چنانچہ اس وقت قیام انجمن پر جو تقریریں کی گئیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے زیادہ ہوتے جاتے ہیں، مذہبی مقدمات کے عدالتوں میں دائر ہونے سے توہین اسلام ہوتی ہے، علما میں مخالفت کو روز افزوں ترقی ہے اور سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ جیسے مفسر، محدث، فقیہ، فلسفی متکلم، ادیب، شاعر اور مورخ پہلے زمانہ کے علما تھے، اب اس پایہ اور قابلیت کے علما کے وجود سے زمانہ خالی ہوتا جاتا ہے اور ان سب خرابیوں کا انسداد اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک باضابطہ مجلس ہو۔

شوال ۱۳۱۱ھ مطابق اپریل ۱۸۹۴ء میں ندوہ کا پہلا اجلاس کانپور میں ہوا۔ اس میں ندوہ کے مقاصد اور طریق کار کی تعیین ہوئی۔ اہم مقاصد صرف دو قرار پائے۔ (۱) اصلاح طریق تعلیم (۲) رفع نزاع باہمی۔ ان مقاصد کی ان الفاظ میں تشریح کی گئی تھی۔

غرض اول۔ چونکہ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ جو طلب علوم عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں، وہ امور انتظامی دنیا اور معیشت سے محض ناواقف ہوتے ہیں اور بوجہ زیادہ عمر صرف ہو جانے کے کچھ اور کر بھی نہیں سکتے اس لئے

وہ بے موقع طور سے اہل دنیا کے محتاج ہوتے ہیں اور عام کی نظروں میں بے وقعت اور بیکار ٹھہرتے ہیں۔ اور علوم دینیہ سے بھی جیسی کہ واقفیت ہونی چاہیے نہیں رکھتے جو علوم دینی اس وقت کے مناسب اور دین کے معین ہیں، ان سے وہ ناواقف رہتے ہیں۔ یہ انجمن سب باتوں پر غور کر کے اولاً سلسلہ تعلیم کو درست کرے اور بالاتفاق تمام مدارس اسلامیہ میں جاری ہونے کی کوشش کرے اور جو امور ان طلبا کی تہذیب و اخلاق اور ترقی علم میں مفید سمجھے، حتی الوسع ان کے اجرا میں سعی کرے۔

غرض دوم۔ اس وقت ہمارے علما کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہنچا رہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا بڑا فساد برپا ہوتا ہے جس سے علمائے اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کی مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے۔ یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی نزاع نہ ہونے پائے۔ اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعہ طے ہو جایا کرے۔" (روداد ندوہ بابت سال اول صفحہ ۲۳)

غرض اول میں خط کشیدہ عبارت سے، اس زمانہ کے فارغ التحصیل طلبہ پر ایک خفیف سی روشنی پڑتی ہے۔ گنجائش کم ہے اس لئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، بالغ نظر اس سے پوری کیفیت و حالت کا اندازہ کرلیں گی۔ البتہ اس وقت کے نصاب تعلیم پر ہم قدرے تفصیل سے گفتگو کرنی چاہتے ہیں۔ اس وقت جو نصاب تعلیم عربی مدارس میں رائج تھا اسے درس نظامیہ کہا جاتا ہے۔ یہ نصاب اب بھی بہت سے عربی مدارس میں رائج ہے، مگر اس میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوگئی ہیں، لیکن اسے بھی درس نظامیہ ہی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی اصل روح کو باقی رکھا گیا ہے۔ درس نظامیہ ملا نظام الدینؒ کی طرف منسوب ہے جو لکھنؤ سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے، اور جنھوں نے بعد میں زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر فرنگی محل میں مستقل سکونت اختیار کی۔ درس نظامیہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی اور ہے، بقول علامہ شبلیؒ "کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم، عالم نہیں مانا جاسکتا جب تک ثابت نہ ہو جائے کہ اس نے اسی طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے" اس لئے اس پر تبصرہ کرنے کے لئے بہت زیادہ علم اور تعلیمی مہارت کی ضرورت ہے۔ راقم کو اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے، اس کے علاوہ بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے، معلوم نہیں کہاں قلم پھسل پڑے اور معلوم نہیں کس جگہ دامن الجھ جائے، اس لئے محفوظ راہ یہی ہے کہ اس کام کو ضرور کیا جائے۔ البتہ علامہ شبلیؒ علوم اسلامیہ کے بہت بڑے واقف کار تھے، خدا نے جہاں انھیں اور بہت سی صلاحتیں عطا کی تھیں وہاں تعلیمی مہارت سے بھی بہرہ مند کیا تھا، اس لئے اس کے متعلق ان کی رائے بہت زیادہ وقیع اور قابل قدر ہوگی۔

مرحوم نے اپنے رسالہ الندوہ میں تعلیمی اصلاح کے متعلق کئی مضامین لکھے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مضمون درس نظامیہ کے متعلق بھی تھا۔ اس سے ہم ذیل میں اقتباس پیش کرتے ہیں۔ پہلے درس نظامیہ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہے کیا؟

"درس نظامیہ میں اصول ذیل ملحوظ رکھے گئے:

۱۔ اختصار یعنی ہر فن کی ایک دو مختصر کتابیں لے لی گئیں۔

۲۔ اختصار کے اصول پر اکثر کتابیں، ناتمام درس میں رکھی گئیں یعنی صرف اس قدر حصہ لیا گیا جو ضروری

خیال کیا گیا مثلاً میرزاہد، ملاجلال، صدرا شمس بازغہ، مسلم، توضیح، ان سب کتابوں کے کچھ کچھ حصے درس میں داخل ہیں۔

۳۔ ہر فن میں وہی کتاب رکھی گئی ہے جو اس فن کی سب سے مشکل کتاب ہے اس سے مقصد یہ تھا کہ غور کی قوت پیدا ہو جائے کہ پھر جس کتاب کو چاہے دیکھ کر سمجھ سکے۔

۴۔ منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی یعنی اس میں کسی اور فن کی آمیزش نہ تھی۔ ملا محب اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملا دئیے اور اس کا عام انداز بدل دیا، یہ کتاب ملا نظام الدین صاحب نے درس میں داخل کی، پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں اور ان میں فلسفہ کا اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوتی گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج منطق کی بہت سی کتابیں پڑھ کر بھی منطق نہیں آتی کیونکہ جس کو منطق سمجھتے ہیں وہ منطق نہیں بلکہ فلسفہ ہے ۔۔۔۔ اصول فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا ملا محب اللہ نے اس میں بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا اور اب اصول بھی گویا فلسفہ ہے۔"

اب آئیے اس پر علامہ شبلی کی تنقید ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں، جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے، یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جاتیں۔ مثلاً شمسیہ میں یہ عبارت تھی کہ العلم اما تصور فقط وهو الخ قطبی میں اس کے متعلق ایک بڑی بحث اس بنا پر چھیڑ دی گئی کہ "ھو" کی ضمیر "تصور" کی طرف پھرتی ہے یا تصور فقط کی طرف۔ اس بحث میں قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہو گئے لیکن اگر مصنف، ضمیر کے بجائے خود مرجع کا ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثیں رائگاں جاتیں، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے مصنف کے ایک خاص لفظ اور اس کے منشا پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

نصاب موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں، ان کے

قریب بلکہ ان سے زیادہ فضول لفظی مسائل ہیں۔

اس موقع پر یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قدما کے زمانہ میں شرح اور حاشیہ کا طریقہ نہ تھا، بوعلی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا، لیکن اس وقت تک شرح میں بھی مصنف کی خاص عبارت اور الفاظ سے بحث نہیں کرتے تھے، بلکہ اصل مسئلہ کی توضیح و تشریح کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چنداں غرض نہیں رہی بلکہ تمام تر توجہ اس پر صرف ہوتی تھی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے؟ کس لفظ سے کیا خاص فائدہ ہے؟ کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے؟ مصنف کی عبارت کا اوروں نے جو مطلب سمجھا ہے غلط ہے، فلاں جگہ مصنف نے وضع غلط مقدر کیا ہے، مصنف کی عبارت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ جس وقت سے یہ طریقہ جاری ہوا وہ علمی تنزل کا پہلا دن تھا۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں ایک مضمون لکھا ہے ۔۔۔۔۔۔ اس مضمون کا ماحصل یہی ہے چنانچہ وہ مثالاً فن فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لکھ کر لکھتے ہیں "یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں اور مطلب ایک ہے اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے، اور عمر ایک ہی کے محفوظ رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے، اس لئے اگر مدرسین صرف مسائل مذہبی پر اکتفا کرتے تو تعلیم نہایت سہل ہوتی اور بہت کم زمانہ صرف ہوتا۔"

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے زمانہ میں بھی وہی حالت تھی جو اب ہے یعنی باوجود اس طریقے کی خرابی کے لوگ اس کو ترک نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ یہ طریقہ لوگوں کے لئے بجائے طبیعت ثانیہ کے ہوگیا تھا، چنانچہ علامہ موصوف عبارت مذکورہ کے بعد لکھتے ہیں "لیکن یہ ایک مرض بن گیا ہے جو دفع نہیں ہوسکتا کیونکہ معمولِ عام ہو جانے کی وجہ سے وہ بجائے طبیعت کے ہوگیا ہے۔"

۲۔ سب سے بڑی خرابی نصاب موجودہ کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں داخل ہیں، جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب علم کا ذہن پریشان ہوتا ہے،

یہاں تک کہ اسکو فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے۔ ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک منطق کی کتابیں ہیں لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور مابعد الطبیعہ کے ہیں مثلاً علم باری جعل بسیط، جعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج، وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ ملا جلال فن منطق میں بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن جس قدر درس میں ہے اس کا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح میں ہے، جو صرف اس عبارت سے متعلق ہے، جو مصنف نے حمد و نعت میں لکھی ہے' ان کتابوں کے درس کا جو زمانہ رکھا گیا ہے اس وقت تک میبذی کے سوا فلسفہ کی اور کوئی کتاب پڑھائی نہیں جاتی اس لئے الٰہیات کے مباحث طالب العلم کو بالکل اجنبی اور بحث نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔

۴۔ بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ انہیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہے مثلاً نحو، صرف، منطق، مقصود بالعرض ہیں لیکن کتب درس زیادہ تر انہی فنون کے متعلق ہیں، منطق کا مقصود یہ ہے کہ فلسفہ میں کام آئے لیکن منطق کی درسی کتابیں فلسفہ کے تناسب سے اضعاف مضاعفہ ہیں، صغریٰ کبریٰ، میزان، منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد، حمد اللہ، قاضی مبارک یہ انبار کا انبار منطق میں ہے اور درس میں داخل ہے لیکن فلسفہ کی صرف تین کتابیں درس میں داخل ہیں، جن میں سے میبذی پوری پڑھائی جاتی ہے، باقی کتب جستہ جستہ مقامات۔

اس طرح نحو و صرف میں برسوں اوقات صرف کی جاتی ہے اور جو اس کی غرض و غایت ہے یعنی علم ادب اس میں بہت کم زمانہ صرف ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں طلبہ میں سے ایک بھی صاحب فن نہیں پیدا ہوتا۔[91]

اس وقت کے نصاب تعلیم کی یہ خرابیاں تھیں جنھیں مولانا شبلیؒ جیسے نقاد کے الفاظ میں آپ نے سنا۔ اب غور فرمائیے کہ ندوۃ العلما کو کتنا کٹھن کام انجام دینا تھا۔ بالآخر دو سال کے تجربہ نے بتلا دیا کہ

---

۹۱ مقالات شبلی حصہ سوم صـ۱۲۶

ندوہ کو اپنے مقاصد میں اس وقت کامیابی ہوسکتی ہے کہ اس کے ماتحت ایک دارالعلوم قائم کیا جائے اور مجوزہ نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اس طرح اس کے فارغ التحصیل طلبہ سے یہ خدمت دی جاسکے گی۔

چنانچہ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں دارالعلوم قائم کیا گیا۔ علما نے پذیرائی کی اور اپنی خدمات سے نوازا مگر ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اس کے مقاصد سے قطعی ناواقف تھے۔ محض خوان یغما سمجھ کر اکٹھا ہوگئے تھے۔

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے حقیقت نگار قلم نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے'

"ندوہ (یعنی دارالعلوم) کی بنیاد کچھ عجیب طرح سے پڑی' ایک عمارت بن گئی مگر اس طرح کہ معماروں کی نیت اور ارادے کو اس میں بہت کم دخل تھا اور بہت سے تو سمجھتے ہی نہ تھے کہ یہ جو کچھ بن رہا ہے اس سے کیا کام لیا جائے گا۔"

ندوہ کا اولین اور مقدم ترین مقصد' نصاب کی اصلاح تھا جب اس کے ماتحت دارالعلوم قائم ہوا تو خود اس کا نصاب درست نہیں کیا گیا۔ صرف سالانہ جلسے ہو جایا کرتے تھے اور بس۔

مولانا شبلیؒ اصلاح نصاب کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھے' جس وقت دارالعلوم کے مسئلہ قیام پر غور ہو رہا تھا تو اس وقت وہ علی گڑھ میں تھے' وہاں سے جلسہ میں شریک ہوئے اور دارالعلوم کے قیام پر زور دیا۔ قائم ہونے کے بعد' جب اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تو مولانا محمد علی مرحوم کو ایک اسکیم بنا کر دی جو ابتدا سے ندوہ کے ناظم تھے۔ مگر اس کے بعد ہی خزاں کا دور شروع ہو گیا اور جو لوگ چمن میں محض تفریح کے لئے آئے تھے چلے گئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر گورنمنٹ ندوہ کو مشتبہ نگاہ سے دیکھنے لگی اور اس کی سختی سے نگرانی شروع کر دی' گورنمنٹ کی نگاہ پھرتی تھی کہ لوگ ایک ایک کر کے اس سے علیحدہ ہونے لگے۔

اس زمانہ میں علامہ شبلیؒ حیدرآباد میں تھے' وہ عرصہ سے مستقل طور پر ندوہ کو اپنا وقت دینا چاہتے تھے' مگر حالات اجازت نہ دیتے تھے' مگر جب ندوہ کی حالت اس حد تک پہنچ گئی تو ان سے نہ رہا گیا اور لکھنؤ چلے آئے۔ تاکہ ندوہ کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکیں یہ ۱۹۰۶ء کا واقعہ ہے۔

صفر ۱۳۲۳ھ کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا شبلی کو معتمد تعلیم دارالعلوم بنایا گیا' مولانا نے جس وقت

اپنے عہدہ کا چارج لیا تو اسوقت ندوہ کی حالت نہایت زبوں تھی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔" دارالعلوم کی اس وقت کی حالت کا اگر اندازہ کرنا چاہتے ہو تو ایک مریض جاں بلب کے بستر مرگ کو دیکھو یا کسی لٹے ہوئے اور برباد قافلے کو اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر پرانی دلی کے ان کھنڈروں کی سیر کرو، جن کی بہت سی دیواریں گر چکی ہیں اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب گرنے والا ہے۔ افلاس و فقر، بے نوائی و شکستہ حالی، کس مپرسی و محتاجی، خرابۂ کار اور بربادی محنت کا ایک ویرانہ تھا، جس کے اندر تباہی و ہلاکت کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، ایک ظاہر صورت ضرور قائم تھی، مدرسہ تھا، مدرس تھے، طالب علم تھے، لیکن نہ تو روپیہ تھا، جس سے تمام کام زندہ رہتے ہیں اور نہ کوئی تعلیمی روح تھی، جو بہت سے مادی نقصانوں کی بھی تلافی کر دیا کرتی ہے"

علامہ شبلیؒ نے چارج لینے کے بعد نہ صرف وہاں کی مالی حالت کو درست کیا بلکہ اس کے نصاب تعلیم کو درست کیا جو ندوہ کا اولین مقصد تھا۔ لیکن اس راہ میں بہت سی مشکلات تھیں، ان مشکلات کے متعلق علامہ شبلی نے الندوہ میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اصلاح نصاب کا خیال صرف چند علما کے دل میں پیدا ہوا تھا، باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چونکہ فیصلہ عموماً کثرت رائے پر ہوتا ہے اس لئے انھیں بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں، اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے وہ جدید نصاب (جس میں قدما کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی ہیں، ان کے بیسیوں حاشیے موجود ہیں، اس لئے ان کا پڑھا لینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے لیکن جدید نصاب میں ان کے بجائے دلائل الاعجاز عبدالقادر جرجانی رکھی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ فن بلاغت کی جان ہے اور مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چیں ہیں لیکن نہ ہمارے مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا، نہ اس پر شرحیں اور حاشیے موجود ہیں، اس لئے یہ لوگ اس کے پڑھانے سے عاجز ہیں۔ اور چونکہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے اس لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی استعداد

پیدا نہیں ہوتی بہرحال سال حال میں یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے اجرا کے ساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفا دیدیا اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شائع کئے جارہے ہیں کہ جدید نصاب درس کے قابل نہیں۔
بے شبہہ اس نئے راستہ کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں گی لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے تو اسکو سرے سے اصلاحِ نصاب کا نام لینا نہ چاہئے۔ یہ سخت بدنامی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔"
دارالعلوم کے جدید نصاب میں حسب ذیل چیزیں پیش نظر تھیں۔
۱۔ ایک ایسا نصاب تعلیم، جس میں جدید ضرورتوں کے مطابق صحیح علوم اسلامیہ پر مشتمل ہو، غیر ضروری کتابوں اور قدیم طریق حواشی و شروح سے پاک ہو اور علوم شرعیہ میں اچھی استعداد پیدا کرے۔
۲۔ بعض جدید علوم کو شامل کیا جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ انگریزی داں علماء پیدا ہو سکیں۔
صرف نصاب ہی کی اصلاح پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تعلیم میں بعض امور پر خاص طور پر زور دیا گیا مثلاً ادب پر، قدیم نصاب میں زبان کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے جو قرآن و حدیث کے سمجھنے کی کنجی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ادب کی مشہور کتابوں کو نصاب میں جگہ دی گئی بلکہ تحریر و تقریر کے ذریعہ عربی میں بولنے اور لکھنے کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا علماء پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ ان کی عمریں پڑھتے پڑھتے ختم ہو جاتی ہیں مگر نہ تو عربی کے دو جملے بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ ندوہ نے اس الزام کو دور کرنے کی کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، انھی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ ندوہ کو ادب میں دوسرے تمام عربی مدارس میں امتیاز حاصل ہے۔ عرصہ ہوا مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ندوی کی ادارت میں کلکتہ سے غالباً الجامعہ کے نام سے عربی میں ایک اخبار نکلتا تھا اس کے مضمون نگاروں میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم بھی تھے غالباً ندویوں کی عربی ادب کا یہ پہلا مظہر تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ندوہ سے ایک عربی رسالہ الضیاء جاری ہوا تھا، مگر

عدم اشاعت کی وجہ سے بند ہوگیا، اس کے مدیر مضمون نگار سب ندوی اور ندوہ کے طالب علم تھے، اس نے نہ صرف ہندوستان کے علمائے ادب سے خراج تحسین حاصل کیا بلکہ مصر اور دوسرے عربی ممالک سے بھی۔ طلبائے ندوہ کے عربی ذوق کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہاں اردو میں بہت سے قلمی رسالے نکالتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، وہاں عربی میں بھی نکالتے ہیں اور تقریریں بھی کرتے ہیں۔ چند سال ہوتے ہیں فلسطین سے ایک وفد آیا تھا جس میں مفتی اعظم اور علوبہ پاشا بھی شامل تھے، وفد کے یہ ارکان ندوہ بھی تشریف لے گئے تھے، اس وقت راقم وہاں موجود تھا، انھوں نے بچوں کی جب تقریریں سنیں اور ان سے گفتگو کی تو بہت متعجب ہوئے اور کہا کہ ہمارے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ ہندوستان میں اس قسم کی کوئی درسگاہ ہوگی جس کے اتنے نو عمر طلبہ اس قدر فصیح اور عمدہ عربی بولتے ہوں گے۔

ادب کے بعد سب سے زیادہ زور فن تفسیر پر دیا گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسلامی تعلیم کا تمام تر مقصود قرآن اور حدیث کا سمجھنا ہے مگر عربی مدارس پر نگاہ ڈالئے تو نصابوں کی جدولیں منطق و فلسفہ اور علم کلام کی کتابوں سے بھری ملیں گی مگر اصل سرچشمۂ علم، کتاب اللہ کے متعلق جلالین جو قرآن سے بھی مختصر ہے اور بخاری شریف کے چند پارے نظر آئیں گے اور بس۔

ندوہ میں درجۂ تکمیل (ایم۔ اے) بھی قائم کیا گیا ہے تاکہ طلبا فراغت کے بعد اپنے ذوق اور مناسبت کے مطابق تفسیر، حدیث، فقہ، ادب وغیرہ جس فن میں چاہیں، مہارت حاصل کرسکیں۔ مگر اس میں ایک بہت بڑا نقص ہے جو معلوم نہیں ابتدا سے ہے یا بعد کی پیداوار ہے، وہ یہ کہ اس درجہ میں صرف مخصوص اور محدود لڑکے لئے جاتے ہیں، ہر شخص داخل نہیں ہوسکتا، حالانکہ اسے بالکل یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے اور آنرز کی طرح ہونا چاہیے۔

ندوہ کی یہ تمام خصوصیات اس وقت تک باقی رہیں، جب تک علامہ شبلیؒ وہاں موجود تھے، مگر ان کے علیحدہ ہوجانے کے بعد اس کی بہت سی خصوصیات باقی نہ رہ سکیں، نصاب تعلیم میں بہت سی ایسی کتابیں داخل کردی گئیں جنھیں بیکار سمجھ کر اس وقت داخل نہیں کیا گیا تھا، مگر اس کے باوجود، علامہ شبلیؒ ندوہ کی در و دیوار کی ایک ایک اینٹ میں وہ روح پھونک دی تھی کہ آج بھی باوجود تنزل و انحطاط کے اس کے طلبہ میں ندوہ کی

خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح | نامناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں کچھ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڈھ) کے متعلق بھی عرض کر دیا جائے۔ کیونکہ مدارس اسلامیہ کی اصلاح کے سلسلہ میں یہ بھی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اواخر ۱۹۱۳ء میں جب علامہ شبلیؒ ندوہ سے علیحدہ ہوئے تو اپنے وطن اعظم گڈھ چلے آئے اور اپنی پرانی تجویز یعنی دارالمصنفین کی طرف توجہ کی۔ گو وہ علمی کاموں میں بہت مصروف تھے، مگر اس کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کی بھی انہیں فکر تھی، چنانچہ مولانا فراہیؒ کو ایک نامہ میں لکھتے ہیں:۔

"کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے۔ اس کو "گروکل" کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔"

(مکاتیب شبلی حصہ دوم صفحہ ۴۴)

مولانا شبلی نے ندوہ میں خدام الدین کے نام سے ایک تحریک شروع کی تھی، اس تحریک کو یہاں بھی جاری کرنا چاہتے تھے، چنانچہ علامہ فراہی کو لکھتے ہیں:۔

"ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں کی تعلیم کا مرکز بنایا جائے یہیں خدام الدین بھی تیار ہوں، مذہبی عملی تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو .... پرنسپل اور ہیڈ قرار تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔"

(مکاتیب شبلی حصہ دوم صفحہ ۷۸)

اس کے تقریباً ایک سال کے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا، اس لئے سوائے مدرسہ کے چند جلسوں کی شرکت کے کچھ زیادہ توجہ نہ کر سکے۔

مدرسۃ الاصلاح کی اصلاح۔ ترقی میں سب سے زیادہ دخل مولانا حمیدالدین فراہیؒ کو ہے ۱۹۱۹ء میں مولانا فراہیؒ دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کو چھوڑ کر مدرسۃ الاصلاح میں آئے اور آخر دم تک اس کی خدمت کرتے رہے۔ اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت کتاب الٰہی کی تعلیم ہے۔

مدرسہ کی خصوصیات جو اس کے دستور العمل سے ماخوذ ہیں، حسب ذیل ہیں:-

الف۔ قرآن و حدیث و فقہ و ادب کی طرف شدت اعتنا

ب۔ اعلیٰ علم و قابلیت کو مطمح نظر رکھنا نہ کسی محدود نصاب کو۔ الا قرآن مجید و متون حدیث۔

ج۔ درستی اخلاق یعنی پابندی شریعت و روحانیت اسلام

د۔ آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت

ہ۔ کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ

شرح:- خصوصیات الف، ب بنیادی ہیں ج ان کا عملی ثمرہ ہے اور د، ہ ان کے ذرائع ہیں، ان کی اہمیت میں باہمی فرق مراتب، ان کی ترتیب سے سمجھنا چاہئے۔

ذیل کی چیزیں مدرسہ کے لئے اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ مدرسہ کے اساتذہ و طلبہ غریبانہ اور مذہبی زندگی بسر کریں، اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں، کفاف پر قناعت کریں۔

۲۔ اس مدرسہ کو غربائے مسلمین کی اعانت سے دیا جائے، سرکاری اثر سے آزاد رکھا جائے۔

۳۔ قرآن کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا نصب العین ہو، اس کے بعد حدیث و فقہ پر زور دیا جائے، منطق و فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں، ان کی جگہ پر ادب عربی کی تعلیم دی جائے، حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو، فقہ میں فقہ اسلامی کی تعلیم دی جائے، تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو، تکفیر و تفسیق کا دروازہ بند ہو۔ صرف نحو کی تعلیم عملی ہو، متون کی تعلیم میں اسباق فن پیش نظر رہیں اور یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دی جائے، حصول معاش کے لئے صنعت کی تعلیم دی جائے۔ مدت تعلیم کم سے کم ہو۔ اور شرح تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔

۴۔ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہب (اسکولز) کا سنگم ہو، یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ہیں، ندوی، دیوبندی، صلاحی سب تعلیم دیں، جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر آپس میں شیر و شکر رہیں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹادیں (الاصلاح، اگست ۱۹۳۶[?]ء)

جامعہ عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کی تحریک، ہماری تعلیمی تحریکوں کی تیسری کڑی ہے اس کے قیام و تاسیس میں، اشخاص کے علاوہ، سب سے بڑا حصہ لڑکوں کی تعلیمی ترقی کا ہے، اس لئے بہتر ہوگا کہ حیدرآباد کے تعلیمی ارتقا پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

حیدرآباد میں، تعلیم و تنظیم کی ابتدا، مدرسہ دارالعلوم کے قیام سے ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ اس سے پندرہ بیس برس پہلے، ریاست کو تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہوگیا تھا، مگر یہ خیال عملاً صرف چند فنی مدارس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور تہذیبی تعلیم کا اگر کچھ انتظام تھا تو اس کے فوائد صرف مخصوص طبقہ تک محدود تھے، عام تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۸ مارچ ۱۸۵۶ء کو دارالعلوم کا باقاعدہ افتتاح ہوا، ۱۸۵۹ء تک اس کی حیثیت محض ایک معمولی مدرسہ کی رہی، اس کے بعد آہستہ آہستہ ترقی کرکے کالج کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ دارالعلوم کا کوئی اپنا نصاب نہیں تھا، بلکہ یہاں کے طلبہ، پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات مثلاً منشی کامل، منشی فاضل، مولوی عالم، مولوی فاضل وغیرہ کے لئے تیار کئے جاتے تھے اور وہاں کے امتحانات میں بیٹھتے تھے۔ تاآنکہ، غالباً ۱۹۰۷ء میں، انڈین یونیورسٹیز ایکٹ کی وجہ سے یہ الحاق ٹوٹ گیا تعلق کے منقطع ہوجانے کی وجہ سے چھ سات سو لڑکے بالکل بیکار ہوگئے، انگریزی اسکول قائم تھے، مگر یہ انگریزی سے نابلد تھے، یا معمولی شدبد رکھتے تھے، اس لئے ان میں داخل نہیں ہوسکتے تھے، اس اچانک آفت سے، ریاست اور مفکرین کو دارالعلوم کے لئے ایک نصاب تیار کرنے کی فکر ہوئی، جو زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہو۔ چنانچہ مولانا شبلیؒ اور مسٹر مے ہیو کو جو عرصہ سے سررشتہ تعلیمات میں ملازم تھے اور تعلیمی تجربہ رکھتے تھے، یہ خدمت سپرد کی گئی۔

اس دارالعلوم کی ترقی و اصلاح میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ کو بڑا دخل رہا ہے، نصاب میں بہت سی اصلاحیں کیں، علوم جدیدہ کو درس میں داخل کرکے، زمانہ کے مطابق بنایا۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھائے جائیں۔ سرراس مسعود مرحوم اور سر نواز جنگ حیدری نے یہ تو منظور کیا کہ علوم اردو میں پڑھائے جائیں مگر دینیات کی تعلیم کو عربی ہی میں باقی رکھا۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب کے لئے تیاری کتب اور وضع اصطلاحات میں بھی مولانا شریک تھے۔ جامعہ کے تخیل و نصب العین اور اس کی تشکیل میں بھی مولانا کے مشوروں اور رایوں کو

بہت دخل رہا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جو اس وقت صدر الصدور تھے اور جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے چانسلر مقرر ہوئے تھے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔ "جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کے ہاتھ بھی تھے۔"

دارالعلوم میں انگریزی تھی، مگر بہت کم۔ انگریزی کی تعلیم کے لئے، مشنری کے چند مدارس تھے، مگر عام طور پر مسلمان بلکہ ہندو بھی، اپنے لڑکوں کو ان میں تعلیم دلانے سے احتراز کرتے تھے، اس لئے اگر کہا جائے کہ اس وقت پوری ریاست میں انگریزی کی تعلیم نہ تھی، تو بیجا نہ ہوگا، حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کا انتظام ۱۸۸۰ء میں ہوا جبکہ حیدرآباد کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ دارالعلوم اور حیدرآباد کالج نے، اپنے اپنے طور پر ریاست کی تعلیم کو بہت ترقی دی اور زمانہ کی طلب کو پوری کرتے رہے۔ مگر زمانہ ان سے تیز تھا، اس نے چند ہی سال میں، انھیں ناکافی ثابت کردیا، اب زمانہ کی طلب کو پورا کرنے کے لئے ایک یونیورسٹی کی ضرورت تھی جوں جوں زمانہ ترقی کی طرف بڑھتا گیا، ضرورت کا احساس، شدید ہوتا گیا اور بالآخر ترقی کرکے، دلوں سے زبانوں پر آیا اور زبانوں سے عام جلسوں میں۔ بعض اشخاص نے یونیورسٹی کے قیام کے لئے تجویزیں بھی پیش کیں مگر اسکا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا، البتہ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم اور انجمن ترقی تعلیم حیدرآباد یا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں نے، اس تخیل کو عمل سے بہت زیادہ قریب کردیا۔ انھیں دونوں انجمنوں کی بار بار یاددہانی کی وجہ سے، ذمہ دار حضرات نے اس کی طرف توجہ مبذول کی۔ نواب سر حیدر جنگ بہادر اسوقت معتمد تعلیمات تھے، انھوں نے ایک عرضداشت مرتب کرکے، اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا حسب ذیل جواب دیا:۔

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی معروضہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام کے نقائص دور ہوکر جسمی اور دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہوسکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی ہوسکے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہئیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازم گردانی جائے۔ لہٰذا میں خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکورہ اصول محولہ عرضداشت کے مطابق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد" ہوگا۔

قیام یونیورسٹی کی منظوری اور ابتدائی امور کی انجام دہی کے بعد، اگست ۱۹۱۹ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ چونکہ مجوزہ یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اردو قرار پایا تھا اور ظاہر ہے اُردو میں نصاب کے لئے کتابیں تھیں نہیں، اس لئے مغربی کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنے کے لئے دار التصنیف والترجمہ قائم کیا گیا۔ اور وضع اصطلاحات کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ اس طرح تقریباً بارہ سال صرف ہوگئے اور ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی اس قابل ہوئی کہ بی۔ اے کی تعلیم کا انتظام کر سکے۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد دار العلوم کو اس میں ضم کر دیا گیا اور اسے شعبۂ دینیات کے کالج کی حیثیت دیدی گئی۔ یونیورسٹی کے ماتحت ایک میڈیکل کالج، ایک انجینیرنگ کالج، ایک مدرسۂ تعلیم المعلمین جس میں بی۔ ٹی کی تعلیم ہوتی ہے اور ایک سائنس کا معمل (لیبرٹری) ہے۔

یونیورسٹی کا نصاب تعلیم دستیاب نہ ہوسکا، اس لئے اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا مشکل ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی کتاب "حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی" میں اس کے متعلق مختصراً لکھا ہے جو بالکل ناکافی ہے مگر اسی پر اکتفا کرتے ہیں:۔

"جامعہ عثمانیہ کے نصاب تعلیم کی بڑی خصوصیات یہ ہیں کہ میٹرکیولیشن میں مضامین دو گروپوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، تاکہ طلبہ جو مضامین کالج میں لینا چاہیں، ان میں ان کی ابتدائی تعلیم اچھی ہو۔ انٹرمیڈیٹ میں انتخاب مضامین میں بہ نسبت اور یونیورسٹیوں کے زیادہ وسعت رکھی گئی ہے اور مضامین کو اس طرح سے مرتب کیا گیا ہے کہ ایک طالب علم اپنے لئے ایک ایسا مجموعہ اختیار کر سکتا ہے، جس کے مضامین ایک دوسرے سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف مجموعوں میں مضامین کی تقسیم سے یہ فائدہ ہے کہ بی۔ اے کی جماعتوں میں

ایک طالب علم کسی خاص مضمون اور اس کے متعلقات کی تعلیم مکمل طریقے پر حاصل کر سکتا ہے۔
انگریزی زبان اور دینیات یا اخلاقیات کے علاوہ جو لازمی مضامین ہیں، طالب علم کوئی دوسرا
مضمون بھی لے سکتا ہے۔ جس میں یہ خصوصیت کے ساتھ وہ تمام و کمال عبور حاصل کرے
اور پھر اسی مضمون پر تحقیق و تلاش کے کام میں مصروف ہو جائے .... دینیات یا
اخلاقیات کالج کی تمام جماعتوں کے لئے لازمی ہے ... .. انگریزی زبان کی تعلیم لازمی
قرار دی گئی ہے اس کا معیار وہی رکھا گیا ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کا ہے، اس کی وجہ
سے جامعہ عثمانیہ کے طلبہ انگریزی بولنے والی دنیا کے خیالات سے آشنا رہ سکتے ہیں۔"
ان کا دائرہ عمل جامعہ کی مطبوعہ یا نشر طلب کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے مضامین
میں انگریزی کتابوں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں"۔ یہی امتیازی خصوصیات ہیں
جن کی بدولت جامعہ عثمانیہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر میں مقبول ہوئی، اس کی
بنیاد مشرق اور مغرب کا بہترین آمیزہ ہے" (صفحہ ۸۸)

استقامت اور صلح پسندی

(از سید طفیل احمد صاحب منگلوری۔ بی۔ اے (علیگ))

مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں جو درسگاہ ۱۹۲۰ء میں کھولی گئی تھی اوّل تو اس کا رویہ کچھ مخالفانہ رہا، پھر وہ دہلی میں منتقل ہو گئی۔ چونکہ نصاب تعلیم اس کا اپنا تجویز کردہ تھا۔ اور اسے سرکاری امداد حاصل نہ تھی۔ مدتوں اُسے سخت مالی مشکلات کا سامنا رہا۔ بالآخر اُس کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے استقلال اور حکیم اجمل خاں صاحب اور خواجہ عبدالمجید صاحب کی امداد اور سرپرستی سے اس میں استقلال پیدا ہو گیا۔ تعلیم و تربیت کے متعلق اُس میں جدید تجربے کئے گئے۔ ان میں کامیابی ہوئی اور کارکنان کی صداقت۔ اور استقامت کی کی وجہ سے اب اس نے قوم کے دل میں جگہ پیدا کر لی ہے اور آثار ایسے ہیں کہ مستقبل قریب میں وہ اپنے پروگرام کے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گی۔ پچھلے پچاس سال کے زمانہ میں مسلمانوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ باہمی نقیض کے لئے مشہور تھے۔ مگر اب حالات بدلنے کی ایک بدیہی علامت یہ ہے کہ جو درسگاہ، مسلم یونیورسٹی کی مخالفت میں قائم ہوئی تھی اب اس کے پرنسپل، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی انتظامیہ جماعت کے ممبر ہیں اور دونوں درسگاہوں کے کارکن ایک دوسرے کے معین و مددگار اور باہم شیر و شکر ہیں۔

بلاشبہ ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ کالج کے دو ٹکڑے ہو جانے سے اُس زمانہ میں مسلمانوں میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی مگر اب جبکہ جامعہ ملیہ علی گڈھ کالج کے جسم سے علیحدہ ہو کر مثل چاند کے روشن و تاباں ہے تو وہ ہر طرح مادر درسگاہ کے لئے باعث فخر و مباہات ہے۔

(اقتباس از "مسلمانوں کا روشن مستقبل")

دارالعلوم دیوبند

(جناب طفیل احمد صاحب متعلم جامعہ)

دارالعلوم دیوبند کے متعلق راقم الحروف کی رائے ہے کہ حالات موجودہ میں اگر دارالعلوم جیسا ادارہ ہندوستان میں موجود نہ ہوتا تو ہندوستان سے اسلام کبھی کا رخصت ہو چکا ہوتا۔

عہد مغلیہ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اشاعت اسلام کی خدمات شاہی مشنون کے ذریعہ انجام نہیں دی گئیں۔ بلکہ اس مقدس خدمت کا سہرا حضرات اولیاء اللہ۔ علمائے باخدا اور صوفیائے کرام کے سر ہے۔ جنھوں نے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ، فوجی اور شاہی طاقتوں سے مستغنی ہو کر اخلاق فاضلہ، اعمال صادقہ اور علم صحیح کی روشنی میں اس فریضہ کو انجام دیا۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عہد عالمگیرؒ تک اشاعت علم کا کافی انتظام حکومت کی جانب سے ہوتا رہا۔ جس کا اندازہ اسلامی مورخ علامہ مقریزی کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ "شاہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دلی شہر میں ایک ہزار مدارس تھے۔ اور بقول کپتان الگزنڈر ہملٹن خاص عالمگیرؒ کے مبارک عہد میں" پایۂ تخت سے بہت دور یعنی شہر سندھ میں چار سو مدارس مختلف علوم و فنون کے تھے" اور غالباً اسی زمانہ کو میکس مولر برطانوی حکومت کے عہد ماقبل سے تعبیر کرتا ہوا کہتا ہے" برطانوی حکومت سے قبل صرف صوبۂ بنگال میں اسی ہزار مدارس تھے، یعنی ہر چار سو نفر کے لئے ایک مدرسہ۔ مسٹر آرنلڈ کی رپورٹ ۱۸۵۸ء کے بموجب "پنجاب میں تعلیمی میدان صرف مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، وہ ہر دلعزیز تھے۔ ہندو لڑکوں کو ان ہی پر اعتماد تھا مسلمانوں کے مدارس میں ہی وہ لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے" اسی قسم کی بہت سی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان اسلام کے زمانہ میں اشاعت اسلام کا سلسلہ اس وسیع پیمانہ پر تھا کہ اگر انگریزی رپورٹیں تصدیق نہ کرتیں تو اس عظیم الشان سلسلہ کی روایات کو مبالغہ آمیز افسانہ سمجھا جاتا۔ ان مدارس میں اگرچہ علوم شرعیت اور علوم عربیہ کی تعلیم نہ ہوتی تھی لیکن بلاشبہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد

میمنت عہد تک حکومت کی جانب سے ایک خاص سرپرستی علمائے اسلام کی ہوتی رہی۔ علیٰ ہذا قوانین شریعت کی ایک خاص قدر اور منزلت تھی حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے زمانہ میں علماء کی ایک کمیٹی بنا کر ضوابط کے طور پر اسلام کے فقہی احکام کی تدوین کرائی جس پر بقول علامہ شبلیؒ دو لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اور اس دستوری فتاویٰ کا نام فتاویٰ عالمگیری رکھا گیا۔ جو تقریباً پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور جس کو آج تک اسلامی دنیا میں فتاویٰ کا ایک مستند مجموعہ بتایا جاتا ہے، لیکن مسلمانان ہند کی بدقسمتی سے عالمگیرؒ کی حکومت کے بعد وہ زمانہ آنیوالا تھا جو بموجب آیۂ کریمہ **واذا اردنا ان نھلک قریۃ الخ** قانون قدرت ہے کہ تباہ ہونیوالی قوم کی تباہی کا آغاز اس کے امراء اور ارباب حکومت و اصحاب دولت کے فسق و فجور سے ہوتا ہے، (جن کا اقتدار کچھ عرصہ کے بعد تمام قوم کے قصر معلّی کو منہدم اور مسمار کر دیتا ہے)

عہد مغلیہ کا زوال اور تحفظ علم کی غیبی تدبیر علمائے ہند کے مورث اول

عہد عالمگیرؒ کے بعد ایک طرف قانون قدرت امراء کے فسق و فجور کی پاداش پر تلا ہوا تھا۔ بڑے بڑے قدیم شاہی خاندان "تلک الایام نداولہا بین الناس" کا مظہر بن کر اپنے عالیشان محلات اور ہزار ہا قسم کی نعمتوں کی بجائے تیغ و تفنگ کے ہدف بن کر مکافات عمل کا نظارہ دنیا کو دکھا رہے تھے، اور تاریخ کے سبق آموز اوراق کو آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے پُر کر رہے تھے تو دوسری طرف قضا و قدر کے کارکن دین متین کی حفاظت کے لیے سرزمین ہند کے جنگلوں میں ایک مقدس سلسلے کی ایسی بنیاد ڈال رہے تھے کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ تک گڑی ہوئی تھیں، اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی تھیں۔

قدرت کا کس قدر عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ جس طرح عالمگیری عہد حکومت کے دامن میں سلطنت مغلیہ کے زوال کا پھندنا لٹکتا ہوا نظر آتا ہے اسی طرح اس دامن کا آخری کنارہ اس مقدس مجدد ملت و وارث الانبیا علیہم السلام کو بھی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، جو آئندہ تمام لازوال شاخوں کے لئے اصل اصول ہے۔

یہی مجدد ملت ہے جو علمائے ہند کے سلسلۂ حدیث و تفسیر کا مدار ہے۔

یہ وہ مقدس مجدد ہے کہ جس کی ام محترم نے پیدائش سے پیشتر بذریعہ خواب قطب الدین کے نام سے پہچانا تھا۔ لیکن پیدائش کے بعد دنیا نے اس کو ولی اللہ کے اسم با مسمّٰی سے پہچانا یعنی عالم بالا میں اس کو

دائرہ دین کا قطب اور مرکز قرار دیا گیا تھا جس کی تصدیق اہل دنیا سے ولی اللہ کہکر کرائی گئی۔

بہر حال عالمگیری عہد حکومت کے اختتام کے بعد دولت مغلیہ نے تو اختتام اختیار کیا۔ مگر حضرت شاہ صاحب رح کے ذریعہ سے جو دولت ملت اسلامیہ ہند کو عنایت فرمائی گئی وہ آج تک بحمداللہ روبترقی ہے۔ یہی وہ دولت ہے جو کچھ بعد دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

لہذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ طیبہ کے طبقات شمار کرائے جائیں تاکہ بآسانی مقصود کی تشریح ہو سکے، اور آشکارا ہو جائے کہ جس چیز کو آج دارالعلوم دیوبند کہا جاتا ہے درحقیقت یہ وہی درخت ہے جس کا تخم قدرت نے بذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (محدث دہلوی) دہلی کی سرزمین میں لگایا تھا۔

خاندان ولی اللہی کے طبقات | یہ شرف بھی دنیا کے عجائبات میں سے ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کو مرحمت فرمایا گیا۔ یعنی آپ کی اولاد میں جو بھی ہوا وہ ولی اللہ اور قطب وقت، علوم دین کا بہترین حامل۔ دنیا کے لئے نمونہ زہد و تقویٰ۔ معیار رشد و ہدیٰ۔

یہاں پر سلسلہ کو قلمبند کرنا مضمون کو طول کرنے کے علاوہ خارج از بحث بھی ہوتا ہے لیکن چونکہ دارالعلوم دیوبند کی کڑی کا سلسلہ باندھنا ضروری ہے اس واسطے اس سلسلہ کو بطور طبقات تقسیم کر کے ممتاز حضرات کے اسمائے گرامی پیش کر دینے کافی ہیں۔

(۱) طبقہ اولیٰ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب پیدائش ۱۱۱۴ھ یعنی چار سال قبل وفات عالمگیر (۱۱۱۸ھ) وفات ۱۱۷۶ھ بزمانہ کوہ عالی عرف شاہ عالم

(۲) طبقہ ثانیہ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادگان یعنی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رح حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رح حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رح حضرت شاہ مولانا عبدالغنی صاحب رح (والد ماجد حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رح۔)

ان سب بھائیوں میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح سب سے بڑے تھے اور عجیب اتفاق ہے اور آپ کی وفات سب سے بعد ۱۲۳۹ھ میں ہوئی۔

(۳) طبقہ ثالثہ۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رح۔

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحبؒ ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالحیٰ صاحبؒ ۔حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بعد سلسلۂ درس میں حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کو جانشین مانا گیا۔آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے ہیں اور تمام تلامذہ میں ارشد ترین تلمیذ ہیں ۔ قریباً ۱۲۶۰ھ میں آپ نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی۔

(۲) حضرت شاہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے ۔حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو اپنے اس بھتیجے سے بہت زیادہ انس تھا۔

(۳) حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے بھائی ہیں اور آپ نے بھی سنہ ۱۲۶۰ھ میں بڑے بھائی کے ساتھ ہجرت فرمائی ۔

(۴) حضرت مولانا شاہ عبدالحیٰ صاحبؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے داماد تھے ۔ اور حضرت مولانا سید احمد صاحبؒ کی معیت میں ایک عرصہ تک کوہستان اور اس کے اطراف میں رہے ۔ اور پھر مرض بواسیر کی شدت سے سفر ناگزیر اختیار کیا۔ (حیات ولی ص ۳۴۳)

(۵) حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ۔ ایام جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں آپ نے بروایت تذکرۃ الرشید غدر کے قضیئے میں ہجرت فرمائی ۔حرم پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجاور ہو کر ۶ محرم ۱۲۹۵ھ کو بعمر ۷۰ سال وفات پائی ۔ اس خاندان کے آپ نواسے ہیں ۔

دہلی سے دیوبند کو علمی مرکزیت کا انتقال | یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ جس طرح حکمۂ قضا و قدر کی طرف سے یہ طے کیا جا چکا تھا کہ دہلی شہر اسلامی حکومت کا مرکز نہ رہے اسی طرح گویا اس کی علمی مرکزیت کا انتقال کا بھی فیصلہ ہو چکا تھا ۔چنانچہ حضرت سیدنا و مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ اور حضرت شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے سلطنت مغلیہ کے زوال یعنی ۱۸۵۷ء سے تقریباً دس سال پیشتر اور خاندان ولی اللہ کے آخری چشم و چراغ یعنی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے اسی جہاد حریت کے سلسلہ میں دہلی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد

کیونکہ حرم پاک کی ہجرت فرمائی اور اس طرح اس خاندان کے فیوض سے ہندوستان محروم ہوگیا۔
لیکن قدرت نے جن مقدس نفوس کو خاندان ولی اللہی کی جانشینی کے لئے ازل سے منتخب فرمایا تھا وہ حضرات مندرجہ ذیل تھے۔

حجۃ الاسلام سیدنا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح منبع العلوم سیدنا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ان حضرات نے دیگر فنون حضرت مولانا مملوک العلی صاحب حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب نانوتوی سے حاصل کئے اور اس کے بعد حدیث شریف سیدنا مولانا حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے حاصل کیا۔

حضرت مولانا مملوک العلی صاحب حضرت مولانا رشیدالدین خانصاحب کے شاگرد رشید تھے۔ اور حضرت مولانا رشیدالدین خانصاحب حضرت سیدنا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد رشید اور شہرہ آفاق شاگرد تھے۔ جو ہر فن میں یکتائے روزگار تھے خصوصاً ردّ شیعہ سے بہت زیادہ شغف تھا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ محدث اول دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے فرزند سعید تھے اسی طرح حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحبؒ بھی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رح کے مشہور و معروف شاگرد تھے۔

بہرحال علوم حدیث و نیز دیگر علوم میں ایک یا دو واسطے سے یہ تینوں حضرات بانیان دارالعلوم حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان تینوں حضرات میں سے دیوبند کا اصل باشندہ کوئی بھی نہ تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا وطن مالوف قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور تھا۔ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہ کے باشندے تھے۔

اس زمانہ میں دیوبند میں کوئی مدرسہ بھی نہ تھا۔ کوئی عالم مرجع خلائق بھی نہ تھا۔ اور دہلی کی طرح کبھی علوم اسلامیہ کا چھوٹا یا بڑا مرکز ہی رہا تھا۔ بہرحال مقام حیرت ہے کہ دہلی کے ولی اللہی چشمہ کے لیے دیوبند ہی کی زمین کو کیوں منتخب کیا گیا۔

قیام دارالعلوم دیوبند (۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق (تقریباً) ۱۸۶۶ء)

۱۸۵۷ء نے بدترین نتائج چھوڑ کر رخصت ہوا۔ سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ سحری ہمیشہ کیلئے
گل ہو گیا ایک تاریکی ہے ایک ابر ظلمت ہے۔ ان کہیں کہیں کوئی تارا نظر آتا ہے۔ لیکن خطرہ ہے
کہ بادل کی حرکت اس کو بھی چھپا لیگی۔ ہندوستانی چاہتے ہیں کہ انگریزی کی اشاعت بالکل نہیں
ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸۳۹ء میں مسلمانان کلکتہ نے آٹھ ہزار دستخطوں کے ساتھ اس مضمون کی شکایتی
درخواست پیش کی تھی کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے حکومت کا منشا عیسائی بنانا ہے۔ (جو حضرات
روشن خیال مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا الزام آج حضرات علماء کرام پر لگاتے ہیں ان کو اس
طرف توجہ کرنی چاہیئے) اور پھر ۱۸۵۲ء میں مدراس کے ہندوؤں نے پارلیمنٹ میں درخواست دی
کہ سرکاری یا امدادی سکولوں میں انجیل کی تعلیم نہ ہونی چاہیئے۔ مگر اس کے باوجود مسٹر منگلس کی مندرجہ
ذیل تقریر ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ میں ہوئی "خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھلایا ہے کہ سلطنت ہندوستان
انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے
سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کی عظیم الشان کام
کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہ کرنا چاہیئے۔ (حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۷)

بہرحال ہندوستان کی یہ کیفیت رہی۔ کہ اس کے طول و عرض میں اسلامی پرچم کی بجائے
صلیبی پرچم لہرایا۔ اور ہندوستان کے ہندو اور مسلمان حریت و استخلاص وطن کی جدوجہد میں ناکام رہے
اور سبز رنگ کا قومی نشان صلیبی نشان کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

• دور الم اور شدت عتاب نے مسلمانوں کو پست ہمت کر دیا کہ عمل تو درکنار سیاست کے نام سے
لرزنے لگے۔ خفیہ پولیس کی برکت سے اوقات سحر میں برطانیہ کو بددعا دینا بھی بغاوت کے مرادف سمجھا
جانے لگا۔ نظام تعلیم کی تباہی نے ایک جہالت کی چادر تمام ہندوستان پر تان دی۔ مزید برآں شاہ عالم
کے معاہدہ کے برخلاف حکومت نے فارسی کی بجائے انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دے کر
معائب کے زوال اور فنا کا پیغام سنا دیا جو جا بجا فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے انگریزی سکولوں یا مڈل

سکولوں کا نصاب تعلیم وہ رکھا گیا جو مسلمانوں کی راستے میں ایسی تبدیلی پیدا کردے کہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں یعنی اسلام کا دشمن عیسائیوں کی تبلیغ اور ہندو مقاصد پر مشتمل۔ حیرانی تھی ان تیز و تند بادِ سموم کے جھونکوں میں اسلام کے نخل نو کی بقا کس طرح ہوگی۔

ہمدردانِ ہند کی پیشانیاں سربسجود ہوئیں انتہائی تضرع اور انکسار سے دعا مانگی جانے لگی۔

لطف الٰہی کی ایک کرن ارضِ ہند پر چمکی اور خاندان ولی اللٰہی کے جانشینوں کی توجہ ارضِ دیوبند (سہارنپور اور پھر مرادآباد) کی طرف متوجہ ہوئی۔

دیوبند میں دارالعلوم دیوبند سہارنپور میں مظاہر العلوم۔ اور مرادآباد میں مدرسہ شاہی قائم کیا گیا لیکن یہ عجیب کرشمہ قدرت ہے کہ ان مدرسوں میں دارالعلوم دیوبند نے مرکزیت کی شان حاصل کرلی۔

قیام دارالعلوم دیوبند کے وقت ایک بزرگ جناب ملا محمود صاحب کو مدرس کی حیثیت سے اور جناب محترم مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحبؒ کو شاگرد کی حیثیت سے (استاد و شاگرد دونوں محمود) مقام چھتہ والی مسجد جو دارالعلوم کی جنوبی جانب ہے ایک انار کے درخت کے نیچے (جو ابتک اپنی پہلی سی ہیئت میں موجود ہے) مدرسہ کے نام کو منتخب کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کے اصول ہشتگانہ | حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے قلم مبارک سے تحریر کردہ اصول رسالہ القاسم (دیوبند) کے دارالعلوم نمبر (محرم ۱۳۴۷ھ) میں شائع ہوئے تھے۔ اس میں چند یہ نمبر ہیں۔

الف۔ مدرسہ کی آمدنی کی ضمیر کے ساتھ سرمونت پر کلمۃ الحق کا اعلان اور دین متین کی اشاعت ہو۔ کوئی شہرتی جمع، مربیانہ یا سرمایہ درانہ دباؤ درس میں حائل نہ ہوسکے۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہ ہو یہ مدرسہ انشاء اللہ تعالیٰ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور اگر کوئی آمدنی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی حاکم محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا۔ اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی۔ کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہوجائیگا القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

ب۔ کارکنان خدام اور مستفیضین کی جماعت جملہ اثرات سے محفوظ اور مامون ہوکر ولی اللٰہی مسلک پر شدت سے عمل پیرا رہے۔ جس کے متعلق تمام عالم اسلامی کا اتفاق ہے۔ کہ وہ سنت قدیمہ اور مسلک اسلاف کے عین مطابق تھا۔ افراط تفریط کے اثار چڑھاؤ میں جادۂ مستقیم تھا اور معیار صحیح تھا۔
یہ بات ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں۔ اور مثل علما روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

ج۔ خودرائی۔ انفرادی رائے اور استبداد (جو شرعی اور نیز تاریخی حیثیت سے بربادی مسلم کا واحد ذمہ دار ہے) کے برخلاف باہمی مشاورت کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

چند ضمنی چیزیں

(۱) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی۔ کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بقا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے ہر وقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ ہو۔ سخن پروری نہو۔

(۲) اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہوں۔

(۳) سامعین اس کو بہ نیت نیک سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہو بدل و جان قبول کریں گے۔

(۴) اور نیز اس وجہ سے اپنی اپنی رائے کی پچ نہو۔ بلکہ مفاد مدرسہ پیش نظر ہو ضرورت ہے کہ مہتمم مشورہ طلب امور میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ مشورہ میں خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی اور جو علم و عقل رکھتا ہو۔ اس نوع کے مدرسوں اور کا خیر اندیش ہو۔

(۵) اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو۔ تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل شورہ معترض ہو سکتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ | چونکہ دارالعلوم دیوبند کا مدار توکل، اعتماد علی اللہ، باہمی تعاون اور مشاورت پر تھا۔ اسواسطے ابتدا ہی سے اس کے لئے ایک مجلس شوریٰ مرتب کی گئی جس کے ارکین حسب ذیل تھے:-

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح ۔ حضرت حاجی حافظ سید عابد حسین صاحب دیوبندی۔ مولانا مہتاب علی صاحب دیوبندی (حضرت شیخ الہند رح کے عم اکبر) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (حضرت شیخ الہند کے والد ماجد) مولانا فضل الرحمن صاحب۔ (والد ماجد مولانا حبیب الرحمن صاحب و مولانا عزیز الرحمن صاحب و مولانا شبیر احمد صاحب) منشی فضل حق صاحب دیوبندی شیخ نہال احمد صاحب رئیس دیوبند۔

سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی عابد حسین رح تھے جن کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ آپ ہی محرک اول اور سب سے پہلے چندہ دینے والے تھے۔

لیکن ماہ شعبان ۱۲۸۴ھ کو حضرت حاجی صاحب عازم حج بیت اللہ ہوئے تو فرائض اہتمام جناب مولانا رفیع الدین صاحب رح دیوبندی کے سپرد ہوئے۔ آپ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب رح کے خلیفہ ارشد تھے اور خود بھی ولی کامل اور شیخ وقت تھے۔

دارالعلوم کا دوسرا سانحہ ۱۲۹۷ھ | ۱۲۹۷ھ میں حجۃ الاسلام سیدنا و مولانا محمد قاسم صاحب رح کی وفات ہوئی۔ آپ کی وفات پر امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح نے فرمایا تھا سالار قافلہ چل بسا۔ جو کبھی خود بھی شہید ہوتا اور کبھی اپنے سامنے دوسرے کو شہید کرتا۔

حجۃ الاسلام اگرچہ دارالعلوم دیوبند کی روح رواں اور بانی مدرسہ تھے لیکن صدارت یا اہتمام کبھی آپ سے منسوب نہیں فرمایا۔ وفات کے وقت اور وفات کے بعد بھی صدارت پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح اور اہتمام پر حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس اللہ سرہما العزیز قائم رہے۔

حضرت امام ربانی جناب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی بدرجۂ سرپرست اور مربی مدرسہ رہے۔ ارباب حل وعقد موجود ہی تھے۔ لیکن اہم امور میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کی رائے بھی لی جاتی تھی۔ مگر باوجود اس عظمت وتقدس کے حضرت محترم کے ارشاد عالی پر اراکین شوریٰ رائے زنی بھی کرتے تھے۔

حضرت موصوف کی سرپرستی یوم وفات (یعنی روز جمعہ بتاریخ ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء) تک برابر جاری رہی، آپ اسی اثنا میں بسا اوقات دیوبند تشریف لاکر بچشم خود حالات کا معائنہ بھی فرماتے۔ وفات سے چند سال پیشتر تک آپ کا سلسلۂ درس گنگوہ شریف میں جاری رہا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد طلبہ حاضر خدمت ہوتے تھے اور اکتساب فیوض کرتے تھے۔

سیاسی ماحول | ۱۸۵۷ء نے جس طرح ہندوستانی کو ہر ایک اقتدار سے محروم کردیا تھا اسی طرح اسکو قوت مدافعت سے بھی محروم کردیا اسلحہ ضبط کرکے شجاعان ہند کو عورتوں کی صف میں کھڑا کردیا۔ حتیٰ کہ بندوق کی شکلیں بھیانک معلوم ہونے لگی اس کی آواز سے دل کانپنے لگا۔ بلاشبہ احساسات حریت پامال کردئے گئے۔ مگر تاہم یہ ایک فطری جذبہ ہے اس کا اثر یقیناً باقی رہ گیا۔ اگرچہ اس کے اظہار سے بالخصوص مسلمان بہت زیادہ خائف تھے۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ۱۸۵۷ء کی عبرتناک دار وگیر نے ان کو اس درجہ تباہ کردیا تھا کہ اپنی اولاد کو بھی وفاداری کی وصیت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ مسٹر رسل کا بیان ہے:۔

"مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا۔ اور قتل کرنے سے قبل خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی۔ اور پھر انہیں جلا دیا گیا۔" (تمغہ کا دوسرا رخ مصنفہ ایڈورڈ ٹامسن ص ۳۸)

۱۸۵۸ء میں جبکہ ہندوستان براہ راست برطانیہ سے وابستہ ہوا تو اگرچہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت نے تمام مذاہب کی آزادی کا اعلان کردیا تھا۔ مگر سیاسی امور کے متعلق جو خوف جاگزیں ہوچکا تھا۔ وہ بدستور ترقی پذیر رہا بہر حال فطری جذبہ کبھی محو نہیں ہوسکتا اگرچہ مغلوب ہوسکتا ہے۔

لیکن اب اسلحہ کی جھنکار کے ساتھ اس جذبۂ فطری کے اظہار کا موقعہ نہ تھا۔ لامحالہ آئینی طریقوں کو

اختیار کیا گیا اور اس مقصد کے پیش نظر آئینی طریقوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ اور باشندہ حقوق کا تحفظ کیا جائے ۱۸۸۵ء میں اہلِ ہند کی باشتراک جملہ اقوام ہند ایک انجمن قائم کی گئی جس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔

اُسی خوفزدگی کی بنا پر جس میں مسلمان تقریباً تیس سال سے مبتلا تھے اور اب ان کا ایک حد تک وراثتی حصہ ہو گیا تھا مسلمان اس میں شریک ہونے سے مجتنب ہوئے۔ اور اس خوئے بد کو چھپانے کے لئے مختلف قسم کے حیلے کرنے شروع کئے۔ مثلاً ایک حیلہ یہ تراشا گیا کہ آیا ایک غیر مسلم قوم سے مل کر کسی انجمن کے ماتحت کام کرنا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے زمانہ میں مندرجہ ذیل فتویٰ دریافت کیا گیا۔

ایک جماعت قومی مسمّیٰ بہ انڈین نیشنل کانگریس جو ہندو مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کی واسطے رفع تکالیف اور جلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی ہے۔ اور اس کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انھیں امور میں ہو جو کل جماعتہائے ہند پر مشتمل ہوں۔ اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کے لئے مضر ہو یا خلاف سرکار ہو۔ تو ایسی جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں۔ (نصرت الابرار ص۱۳ بلفظہٖ)

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان مل کر معاملہ کریں بشرط عدم نقصان دین جائز ہے۔ نصرت الابرار ص۱۵

جس طرح ارباب سیاست انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی اور ان کے مقابلہ پر سرکار پرست مسلم ایسوسی ایشن قائم کر رہے تھے۔ حضرات علمائے کرام بھی تنظیم ملت، حریت و ترقی کے صحیح اور مستحکم اصول کے قائم کرنے میں نہایت خاموشی کے ساتھ سرگرم جدوجہد تھے۔

بلاشبہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جو جماعت خوگر شہادت رہی ہو جس کی انتہائی تمنا صدیوں سے موت احمر ہو وہ خود کو بے دست و پا دیکھ کر جس قدر حیران اور مایوس ہو کم ہے۔ لیکن ساٹھ برس بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد علمائے کرام ایک لمحہ کے لئے بھی مصروف تن آسانی یا مبتلائے غفلت نہیں ہوئے خود دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک عمیق ترین کامیاب سیاست تھی۔

جس زمانہ میں سرسید احمد صاحب مرحوم گورنمنٹ برطانیہ کو مسلمانوں کا قبلہ مقصود بناتے ہوئے

سرنگوں ہونے کی فرمائش کر رہے ہوں۔ اور اس جدید قبلہ کی طرف ادائے نماز کی تلقین کے لئے علی گڈھ کالج قائم کر رہے ہوں تو دار العلوم دیوبند کے متعلق حضرت بانی رحمہ اللہ کا یہ اصول کہ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔ ایک عظیم الشان روشن مستقبل اور ایک ایسے گہرے تدبر کا پتہ دے رہا تھا کہ غیر کے دماغ اس کے وہم و گمان سے بھی خالی تھے۔

آج سے زائد اس زمانہ میں (بزعم خود) روشن خیال طبقہ نے علماء کرام کے طرز کو امت اسلامیہ کے لئے تباہ کن ظاہر کیا اس پر بہت کچھ مذاق اڑایا گیا۔ اس کے برخلاف غلط پروپیگنڈہ کیا کہ علمائے کرام انگریزی زبان سیکھنے سے منع کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ساٹھ سال بعد دنیا نے خود دیکھ لیا کہ کون طبقہ دور رس تھا۔ زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے آنیوالی حقیقت سے کون زیادہ آشنا تھا۔ مدعیان پالٹیکس کا شور ہے کہ انگریز کو اب پہچانا لیکن ان بوریہ نشینوں کی ذکاوت پر جس قدر تشکر و امتنان کے نذرانے نثار کئے جائیں کم ہے۔ کہ انھوں نے اول ملاقات ہی میں سر سے پاؤں تک انگریز کو پہچان کر حفاظتی تدبیریں شروع کر دیں۔ جس کی بدولت آج ہم بحمد اللہ محسوس کر رہے ہیں کہ ابھی مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔

طبقہ ثالثہ از ۱۳۲۳ تا ۱۳۴۶ھ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند | امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ گنگوہی کی وفات ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو ہوئی۔

جملہ متوسلین دیوبند کا اتفاق ہے کہ ان دونوں (حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ) کے سب سے زیادہ محبوب اور روحانی فرزند اور ارشد ترین تلمیذ و عقیدتمند وہ مقدس بزرگ تھے جن کا اسم با مسمیٰ محمود الحسن تھا۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔

آپ کی پیدائش سنہ ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی رحمہ اللہ رکن اول مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند تھے۔ ابتدا ہی سے آپ کو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ یعنی کامل آفتاب کی خدمت میں ایسا صاف و شفاف اور باکمال آئینہ پیش کیا جو اس کے ساتھ حرارت اور جملہ خصوصیات بھی اپنے اندر جذب کرلے۔ چنانچہ اس آئینہ نے اولاً مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کے پرتو فیض سے مکمل طور پر اپنے سینہ کو معمور کر لیا اور پھر ارباب رشیدی کا بہترین ہیرو بن کر جملہ خصوصیات سے دامن پُر کیا۔ اور اس طرح

قاسمی اور رشیدی آفتابوں کا پرتو نور بن کر عالم میں چمکا۔

مولانا مرحوم کے مجمل اور مختصر حالات | جن حضرات نے مولانا مرحوم کو دیکھا ہے اور ان کی اخلاقی لائف پر نظر ڈالی ہے حقیقت حال یہ ہے کہ وہی حضرات آپ کے کمالات سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ البتہ کچھ کیفیت جو بطور نمونہ از خروارے ہوگی پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ حالات جو شیخ محترم حضرت مولانا امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ کی تحریر سے حاصل کر سکا۔

مولانا مرحوم کو قدرت کی فیاضیوں نے ایک ایسا دل دیا تھا جس کی وسعت سات سمندروں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا۔ وہ سب کچھ حضرت مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہما ہی کا فیض تھا۔ مگر حسن قابلیت اور مبدأ فیاض کے کرم نے نہایت ہی عجیب و عدیم النظیر شگوفہ بنا دیا تھا۔

آپ ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم کے شیخ الحدیث بنائے گئے۔ حلقۂ درس کے ساتھ سلسلۂ تصانیف بھی بہت قوت کے ساتھ رہا جس کی آخری اور بہترین کڑی قرآن پاک کا وہ الہامی ترجمہ ہے جس کو باتفاق علمائے دیوبند بے نظیر تسلیم کیا جاتا ہے جس کو مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ بجنور نے طبع کرایا ہے۔

مولانا کا ماحول | بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کو حد سے زیادہ بے چین کر دیا تھا چنانچہ اس وقت حسب طریقہ استاد اکبر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا مرحوم نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی۔ فتوے چھپوائے۔ مدرسہ کو بند کرایا۔ طلبہ کے وفود بھجوائے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔ چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سیاست کی طرف آنکھ اٹھانا شجرۂ ممنوعہ کا سا حال باندھتی تھی۔ آزادی کا خواب بھی اگر کسی کو دکھائی دیتا تھا۔ تو اس کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ خود مختار حکومت کی خواہش زبان پر لانا برق جہانسوز سے زیادہ تباہ کن شمار ہوتا تھا۔ برطانی ہتھوڑے نے علم کے دل و دماغ پر اپنا سکہ جما رکھا تھا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جس قدر موجودہ حکومت کا خوف تھا خدائے قہار کے خوف کا تو دسواں بلکہ سوواں حصہ بھی اثر نہ تھا۔ جیسا کہ اب بھی بہت سی ہستیاں اسی خیال میں ہیں۔ اس ماحول کو دیکھتے ہوئے ایک شخص کو بھی ہم خیال بنا لینا

بڑی کامیابی تھی۔

آپ کا سب سے پہلا اور سب سے اہم کام یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی متفرق جماعتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ ان میں امتیاز، اخلاص اور فدائیت کے جذبات پیدا کئے جائیں اور اجتماعی کارناموں کی پرانی تاریخ ان کو یاد دلائی جائے۔

انجمن موتمرالانصار | مذکورہ بالا اصول خدمت کے پیش نظر عموماً اور مختلف مدارس عربیہ کو ایک سلسلہ میں منسلک کرنے کے لئے خصوصاً ایک انجمن مسمّٰی بہ موتمرالانصار قائم کی گئی۔ چنانچہ اس انجمن کے زرین مقاصد میں اہم مقصد یہ تھا کہ جدید مدارس اسلامیہ کو ایک سلسلہ میں منسلک کر لیا جائے۔ جس کا مرکز دارالعلوم دیوبند کو قرار دیا گیا شعبۂ نظام تعلیم کے سلسلہ میں علی گڈھ کالج سے یہ معاہدہ بھی ہوا تھا کہ انگریزی خواندہ طلبہ جو تبلیغ اسلام کا شوق رکھیں وہ دارالعلوم دیوبند میں جا کر علوم اسلامیہ حاصل کریں دارالعلوم دیوبند اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڈھ کالج ان طلبہ کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دیگا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڈھ کالج جائیں گے۔

جمعیۃ الانصار ۱۳۲۷ھ میں دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کا مشہور و معروف جلسہ دستاربندی منعقدہ ۱۳۲۸ھ جو تقریباً تیس ہزار کے مجمع پر مشتمل تھا۔ اور جس کو عجیب و غریب خصوصیات کے باعث علمائے ربانیین کی کرامات کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس جمعیۃ الانصار کی نشاۃ ثانیہ کی عمومی شکل تھی۔ جمعیۃ الانصار کے روح رواں اور بانی مبانی حضرت شیخ الہندؒ تھے۔

اس تحریک کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کی نقل ہے لیکن یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جمعیۃ الانصار کی بنیاد دراصل مولانا شیخ الہندؒ کے طالب علمی کے زمانہ ہی میں پڑچکی تھی لیکن چونکہ یہ تحریک اس وقت ضروریات زمانہ سے متعلق نہ تھی اس واسطے رک گئی۔ اور اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کر لیتی ہے ۱۳۲۷ھ میں اس انجمن کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ یہ انجمن ہرگز کسی دوسری انجمن کی نقل نہیں تھی۔ اور نہ کسی قسم کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق تھا۔ بلکہ اس کے مقاصد وہ مقاصد تھے جن کی اس وقت بہت زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا

جسمیں کہ مسلمانوں کے سیاسی احساسات مفقود ہو چکے تھے۔ بعد میں جو اہل ہنود اور مسلمان سیاسی لیڈر جو تحریک خلافت اور تحریک کانگریس کے زمانہ میں ہندوستان کے زعیم و قائد قرار دیئے گئے اس وقت سیاسی پلیٹ فارموں سے بہت دور تھے۔ بہت سے بلکہ عموماً سب ہی وہ تھے جو مختلف اغراض پر ٹکٹکی لگائے ہوئے کوئے برطانیہ کا طواف کر رہے تھے۔ یقیناً اس وقت جمعیۃ الانصار کا وجود مسلمانوں میں سیاسی احساس کے لئے بانگ درا تھا۔ جس نے اس وقت حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مسلمانوں میں احساس اور ان کے پژمردہ جذبات میں اشتعال پیدا کر دیا۔

شوال ۱۳۲۸ھ میں موتمر الانصار کا پہلا اجلاس مرادآباد میں منعقد ہوا۔ لیکن یہ پہلا اجلاس اپنی حیرت انگیز مقبولیت اور شاندار عظمت سے بتا رہا تھا کہ تنظیم ملت کے لئے یہ شاندار اقدام انڈین نیشنل کانگریس سے بھی زیادہ باوقعت ہو کر قوم مسلم کی تمام نکبت کو دور کر دیگا۔ اور ملکی فلاح کے لئے بہترین شاہکار ہوگا۔ بظاہر اس کے مقاصد سیاسیات سے بالکل غیر متعلق تھے اسی کے اغراض و مقاصد کی تشریح کے ساتھ یہ جملہ بھی تھا "ملکی معاملات سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے"!

مگر یہ حقیقت نہایت حیرت انگیز ہے کہ اس کے قیام کے صرف دو سال بعد ہی اس کے سرگرم کارکن حضرات کو ہندوستان سے جلاوطن کر دیا گیا۔

اس کے ناظم اعلیٰ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی براہ کابل کسی دوسرے ملک میں چلے گئے۔ جو آجکل حجاز مقدس میں مقیم ہیں۔

مولانا محمد میاں صاحب عرف منصور خاص نے افغانستان کی جانب ہجرت کی۔ مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی وغیرہ ہندوستان میں گرفتار کر لئے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ۔ مولانا عزیر گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں سے یہ سب حضرات نیز جناب استاد محترم مولانا سید حسین احمد صاحب۔ مولانا وحید احمد صاحب۔ پانچوں حضرات کو باعانت شریف مکہ گرفتار کرا کر مصر بھیجا گیا اور وہاں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کے ضمن میں جو سوالات حضرت شیخ الہندؒ سے کئے گئے ان کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ نیز مولانا شیخ الہندؒ کے جوابات بھی درج ہیں۔ جو درحقیقت حضرت شیخ الہندؒ کی ذکاوت طبع کا مرقع ہیں۔

ج ۔ آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا ؟ مولانا ۔ اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر
ج ۔ آپ نے اس پر کیوں نہ دستخط کئے ؟ م ۔ مخالف شریعت تھا۔
ج ۔ آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ ہندوستان میں پیش کیا گیا تھا۔ م ۔ ہاں
ج ۔ پھر آپ نے کیا کیا ؟ م :۔ رد کر دیا
ج ۔ کیوں ؟ م :۔ مخالف شریعت تھا
ج ۔ آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں ؟ م :۔ ہاں
ج ۔ کہاں سے جانتے ہیں ؟ م :۔ انھوں نے مجھ سے عرصہ دراز تک پڑھا ہے
ج ۔ وہ اب کہاں ہیں ؟
م ۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں ہوں۔
ج ۔ ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے ؟ م :۔ مجھ کو کچھ علم نہیں نہ میں نے دیکھا
ج ۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں شریک ہیں۔ اور آپ فوجی کمانڈار ہیں۔
م ۔ وہ اگر لکھتا ہے تو آپ لکھنے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا ۔ بھلا میں اور فوجی کمانداری میری جیسی حالت ملاحظہ فرماسئے، اور ہتھیار کا انداز کیجیے ۔ میں نے تمام عمر مدرسہ کی مدرسی میں گذرانی ۔ مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا مناسبت ۔
ج ۔ اس نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی ؟ م :۔ محض مدرسہ کے مفاد کے لئے۔
ج ۔ غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے ؟ م :۔ غالب نامہ کیا ؟
ج ۔ غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا ہے اور آپ نے غالب پاشاہ سے اس کو حاصل کیا ہے۔
م ۔ مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں ۔ وہ میرا رفیق سفر تھا مدینہ منورہ سے مجھ سے جدا ہوا ہے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مکہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھیرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے ؟ جس کو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں ؟

ج - محمد میاں کے پاس ہے۔ م - مولوی محمد میاں کہاں ہیں

ج - وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا۔ م - پھر آپ کو خط کا پتہ کیونکر چلا ؟

ج - لوگوں نے دیکھا۔

م - آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشاہ گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی - میرا وہاں تک کہاں گذر ہو سکتا ہے پھر میں ناواقف شخص نہ زبان ترکی جانوں نہ پہلے سے ترکی حکام سے ربط ضبط - حج سے چند دن پہلے مکہ معظمہ پہنچا - اپنے امور دینیہ میں مشغول ہو گیا - غالب پاشا حجاز کا اگرچہ گورنر تھا مگر طائف میں رہتا تھا - میری وہاں تک رسائی نہ حج کے پہلے ہو سکتی تھی نہ بعد از حج - یہ بالکل غیر معقول بات ہے - کسی نے یوں ہی اڑائی ہے۔

ج - ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ٹرکی، اور ایران، افغانستان میں اتحاد پیدا کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے ہندوستان میں اسلامی حکومت کرانا چاہتے ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔

م - میں تعجب کرتا ہوں آپ کو بھی حکومت کرتے ہوئے اتنے دن گذر چکے ہیں کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اور پھر کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرا جیسا شخص زائل کر سکتا ہے - اور پھر اگر زائل بھی ہو جائے تو کیا ان میں ایسی قوت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندوستان کے حدود پر فوجیں پہنچا دیں۔ اور اگر پہنچا بھی دیں تو آیا ان میں آپ سے طاقت جنگ ہوگی۔

ج - فرماتے تو آپ سچ ہیں مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہے۔

م - اس سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی باتیں کس قدر پایہ اعتبار رکھ سکتی ہیں (سفرنامہ شیخ الہندؒ مصنفہ مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ)۔

غرضکہ اسی قسم کے بہت سے سوالات وہ کرتا رہا۔ حدود افغانستان و نیز کابل وغیرہ کی نسبت بھی اس نے سوالات کئے - مولانا محترم بھی مختصر مختصر جملوں میں مگر نہایت بے رخی کے ساتھ جواب دیتے رہے۔

وہ سب کو انگریزی میں لکھتا رہا۔ اور پھر مولانا کو جیل میں واپس کر دیا۔

جمعیتہ علمائے ہند دہلی | جمعیتہ علمائے ہند دہلی جو نکہ مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کی وہ کڑی ہے جو کسی میدان میں کسی وقت پیچھے نہیں رہی اور آپ کا قیام بزمانہ شیخ الہندؒ کے زمانہ میں عمل میں آیا اس واسطے یہاں پر اس کو چھوڑنا حقیقتاً دارالعلوم دیوبند کے اہم ترین کارنامہ پر پانی پھیرنا ہے۔

علمائے کرام کا فرض تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد حضرت شیخؒ کے مسلک پر زیادہ از زیادہ قربانیاں پیش کرتے۔ مگر ایسا نہ ہوا بالآخر اسلامی دنیا کے لئے شموم دور آیا خلافت اسلامیہ کا زوال۔ ترکان احرار کے ملک کے حصے بخرے دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس نے گورنمنٹ برطانیہ سے ان وعدوں کا ایفا چاہا جو جنگ کے زمانہ میں ہندوستان سے کیے گئے۔ یعنی آزاد حکومت خود اختیاری۔ یا ہوم رول

مقامات مقدسہ کی توہین نے مسلم خوابیدہ کو چونکا دیا۔ وہ دیوانہ وار میدان کی طرف دوڑا۔ لیکن اس لئے جھجک کر رہ گیا کہ جماعت علماء وہاں موجود نہ تھی جو اس کی راہنمائی کرتی۔

جمعیتہ علما حضرت مولانا عبدالباری صاحبؒ (فرنگی محل لکھنؤ) کے اس احسان کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کہ اس زمانہ کے علما ہند میں بیدار ہو کر دوڑنے والے آپ ہی تھے۔ آپ نے اپنی پوری کوشش احیائے ملت میں صرف کر دی۔

اس سلسلہ کے متعلق تحقیق کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اپنی جیب خاص سے بعض ریل کے کرایہ وغیرہ میں جو حضرت مولانا موصوف نے خرچ کیا اس کی مقدار ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ ۱۲۰۰۰۰

لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ تردد تھا یا سستی کہ علمائے کرام نے عملی اثر قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ سیدنا مولانا شیخ الہندؒ کو مالٹا سے رہا کر دیا گیا۔ ساحل ہند پر حضرت شیخؒ کے قافلہ کا ورود ہوا کہ ایک روح مشرق سے مغرب تک دوڑ گئی۔ اور ترتیب قریب جملہ عناصر ہند بلا تفریق عقائد و خیالات میدان عمل میں ظہور فرما ہو گئے اور نہ معلوم کس غیبی قوت نے حضرت مولانا محمود الحسنؒ کو متفقہ شیخ الہند بنا کر تمام علمائے ہند کا قائد اعظم بنا دیا۔ اور ایک بے نظیر اتحاد کا روح پرور نظارہ ہندوستان کے طول و عرض میں جلوہ فرما ہوا جس کی نظیر سے تاریخ ہند خالی ہے۔

اس وقت دیگر اقوام ہند کے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا یعنی آزادی وطن لیکن مسلمانوں کے سامنے دو مسئلے پیش تھے آزادی وطن اور آزادی خلافت۔

گذشتہ واقعات صاف بتا رہے ہیں کہ جس طرح مسلمانوں کے فرائض دو چند تھے اسی طرح ان کی جدوجہد بھی جملہ اقوام ہند سے زیادہ تھی۔

آزادی خلافت کے لئے انھوں نے مجلس خلافت قائم کی اور آزادی وطن کیواسطے کانگریس میں شرکت کر کے اس کو چار چاند لگا دئے۔

لیکن اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام مسلمانوں میں جس نے جدوجہد کی روح پھونکی۔ وہ سیدنا شیخ الہندؒ کی مخلصانہ صدا تھی جس کی پشت پر حضرت شیخ کی پچاس سالہ خفیہ جدوجہد۔ ایثار و خلوص تھا۔ درحقیقت یہ تحویل اور ممتد جذبۂ ایثار تمام ہندوستان میں تحریک کا باعث ہوا اور اسی نے اس وقت تمام علما کو بے چین کر کے ایک مرکز پر جمع کر دیا۔

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کی تشریف آوری شوال ۱۳۳۸ھ میں ہوئی ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں دہلی میں جمعیۃ العلما کا دوسرا اجلاس ہوا جس میں علمائے ہند نے بے نظیر جذبات کے ساتھ شرکت کر کے ترک موالات۔ جہاد حریت کو مسلمانوں پر لازم قرار دیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات حضرت کا مزاج عرصہ سے علیل تھا۔ آپ پر مالٹا کی رفیع اسیری۔ پیرانہ سالی قید و بند کے تمام مصائب مگر استقلال و ہمت جوانوں سے بھی زیادہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی علالت سلسلہ واپسی ہند سے پیشتر ہی شروع ہو گیا۔ یہاں مرض روز بروز ترقی کرتا رہا۔ اس کے باوجود تحریک میں بے پناہ شرکت سے کبھی بھی نہیں رکے۔ آپ کی آخری سعی جب نقل و حرکت مشکل ہے مگر اسی حالت میں مشوروں میں شرکت۔ تحریک کی قیادت اور ہندوستان کے لیے پروگرام کی تعیین اور پھر جمعیۃ علمائے ہند اور علی گڈھ یونیورسٹی کے طلبہ کے جلسوں کی صدارت نہ کرنا تھا جو اسی علالت میں جامعہ ملیہ کا (۱۳۳۹ھ) قیام فرمایا جا رہا ہے۔

افسوس میرے سامنے حضرت محترم مولانا شیخ الہندؒ کا خطبہ صدارت نہیں ہے۔ جو غالباً ضبط کر لیا گیا ہے۔

ورنہ آپ تک سامنے موصوف کی الوداعی تقریر یا آخری وصیت پیش کرکے ان حضرات سے جو خدام جمعیۃ کو ہندو پرست یا معاذاللہ گاندھی پرست کہتے ہیں سوال کرتا کہ آج جمعیۃ العلماء کے حسب ہدایت تحریک کانگریس میں شرکت کرنے والے حضرات اگر ہندو پرست یا گاندھی پرست ہیں تو شیخ الہندؒ کے متعلق آپ کا کیا فتویٰ ہے۔

بہرحال مسلمانان ہند کے قلوب میں جذبات حریت اور احساس آزادی وطن کی ایک لہر پھیلاتے ہوئے ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو حضرت موصوف نے عالم آخرت کی طرف داعی کو لبیک کہا۔ اور اپنی مقدس زندگی کے بے پناہ مخلصانہ مساعی اور پھر دور ابتلا اور امتحان کو آئندہ اسلامی نسلوں کے لئے بہترین درس عبرت چھوڑا۔

مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ آپ نے مولانا شیخ الہندؒ کے زمانہ اسارت ہی میں دارالعلوم کی صدر مدرسی کے فرائض انجام دیے ... آپ نے ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۳۷ھ تک نائب کے فرائض انجام دیے۔ اور ۱۳۳۸ھ میں مستقل صدر مدرس ہوگئے۔ یہ سلسلہ ۱۳۴۴ھ تک جاری رہا اس کے بعد آپ کو اختلافات کی بنا پر ۱۳۴۴ھ میں مدرسہ چھوڑنا پڑا اور مدرسہ ڈابھیل کی بنا ڈالی۔

مولانا سید حسین احمد صاحب مولانا محمد انور شاہ صاحب کے مدرسہ چھوڑنے کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے اس مسند کو سنبھالا اور اس وقت تک آپ ہی اس عہدے کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا سیاسی ماحول آپ کی پرائیویٹ زندگی کے حالات کسی سے پوشیدہ نہیں اس واسطے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اب مدرسہ کی موجودہ حالت کی طرف متوجہ ہوں۔

سب سے پہلے ضروری ہے کہ مدرسہ کے ذمہ داران عہدہ کا تذکرہ ابتدا وقت سے آپ کے سامنے ذکر کروں اور اس کے بعد مدرسہ کی موجودہ حالت۔ اور دیگر شعبوں کا تذکرہ با تفصیل ذکر کروں۔

دارالعلوم کے سب سے بڑے عہدے تین تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ سرپرست[۱]۔ مہتمم[۲]۔ صدر مدرس[۳] چوتھا عہدہ نائب مہتمم کا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ عہدہ ابتدا میں نہیں تھا۔ بعد میں اس کی ابتدا ہوئی اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

سرپرست دارالعلوم دیوبند

(۱) دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہیں۔

(۲) آپ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ۔

(۳) آپ کی وفات کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ جو ۱۲۹۷ھ میں مقرر ہوئے۔

(۴) آپ کی وفات کے بعد چوتھے سرپرست مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہندؒ ۱۳۲۳ھ میں سرپرست ہوئے۔

(۵) آپ کے بعد پانچویں سرپرست مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی ہوئے۔

(۶) آپ کے بعد موجودہ سرپرست جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی کو سمجھنا چاہئے جو اس وقت دارالعلوم میں یہ عہدہ صدر مہتمم بھی فائز ہیں اور مدرسہ ڈابھیل میں صدر مدرس بھی۔

مہتممین دارالعلوم دیوبند

(۱) سب سے پہلے ناظم و مہتمم جناب حاجی مولانا محمد عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ از ۱۲۸۳ھ تا ۱۲۸۴ھ

(۲) دوسرے مہتمم جناب مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی ہیں۔ از [illegible] تا ۱۳۰۹ھ

(۳) تیسرے مہتمم جناب مولانا حاجی محمد فضل حق صاحب دیوبندی تھے۔ از ۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۱ھ صرف یک سال۔

(۴) چوتھے مہتمم جناب مولانا مولوی محمد منیر صاحب نانوتویؒ از ۱۳۱۱ھ تا ۱۳۱۲ھ۔ " "

(۵) پانچویں مہتمم جناب مولانا مولوی حافظ محمد احمد صاحب۔ ابن مولانا محمد قاسم صاحب از ۱۳۱۲ھ تا ۱۳۴۷ھ

(۶) چھٹے مہتمم جناب مولانا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب از ۱۳۴۷ھ تا ۱۳۴۸ھ (صرف ۱½ سال)

(۷) ساتویں مہتمم جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب از ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۵ھ

(۸) آٹھویں مہتمم جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی (صدر مدرس مدرسہ ڈابھیل) موجودہ مہتمم

نوٹ:۔ جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب قدس سرہ کا عہد اہتمام تمام دوروں سے زیادہ ممتاز اور پُر شوکت و ہیبت گذرا ہے یہ دور مسلسل ۳۵ برس رہا۔ اس مدت میں دارالعلوم نے کمال ترقی کی۔ حضرت ممدوح کی آبائی وجاہت نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا دیا۔ دارالعلوم کے مختلف شعبے قائم ہوئے۔ مالی امداد میں کثیر تعداد میں بڑھیں بڑی بڑی عمارتیں مثل دارالطلبہ قدیم، دارالطلبہ جدید (جو ابھی زیر تعمیر ہے) دارالحدیث، مسجد مدرسہ کتب خانہ، دارالمشورہ اور مختلف وسیع احاطے وغیرہ اضافہ دارالعلوم پر نمایاں ہوئے۔ کارکنوں میں اضافہ ہوا۔ اور حاصل یہ کہ اس درسگاہ نے مدرسہ سے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ (یونیورسٹی) کی حیثیت اختیار کر لی۔

نائب مہتممین | نیابت کا سلسلہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب رح کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے چنانچہ آپ کے بعد

(۱) سب سے پہلے نائب مولانا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ہوئے۔ از ۱۳۲۵ھ تا ۱۳۴۷ھ

(۲) دوسرے نائب مہتمم جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب رح از ۱۳۴۴ھ تا ۱۳۴۸ھ (اس کے بعد مہتمم ہوگئے)

(۳) تیسرے نائب جناب مولانا مبارک علی صاحب نگینوی

(۴) چوتھے نائب مہتمم جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب } موجودہ نائب مہتممین حضرات

نوٹ:۔ چونکہ اس وقت صدر مہتمم جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی ہیں اور وہ ڈابھیل میں مدرسی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اس واسطے اس وقت دو نائبوں کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ مولانا مولوی محمد طیب صاحب آپ کی غیبوبت میں صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور آپ کی موجودگی میں نیابت کے۔ بہرحال موجودہ زمانہ میں نائب مہتممین حضرات دو صاحبان ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرسین حضرات

(۱) دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس جناب مولانا محمد یعقوب صاحب رح تھے۔ از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۰۲ھ

(۲) دوسرے صدر مدرس جناب مولانا سید احمد صاحب بریلوی تھے از ۱۳۰۳ھ تا ۱۳۰۷ھ

(۳) تیسرے صدر مدرس جناب مولانا مولوی محمود الحسن صاحب شیخ الہند رح تھے۔ از ۱۳۰۸ھ تا ۱۳۳۳ھ

(۴) چوتھے صدر مدرس جناب مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری تھے از ۱۳۳۳ھ تا ۱۳۴۴ھ

(۵) پانچویں صدر مدرس جناب مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ہیں۔ موجودہ صدر مدرس ۱۳۴۵ھ

نوٹ جناب مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری ۱۳۳۴ھ میں نائب صدر مدرس کی حیثیت سے کام انجام دیتے تھے چونکہ مولانا شیخ الہند رح اسیر مالٹا تھے۔ لیکن ۱۳۳۸ھ میں مستقل صدر مدرس ہوگئے۔

دارالعلوم کے مفتی | افتا کا عہدہ بھی دارالعلوم میں اپنے کارکنوں کے لحاظ سے شروع ہی سے ممتاز رہا ہے جس کے ذریعہ عامۃ المسلمین کی عظیم الشان خدمت انجام پاتی رہی ہے۔

(۱) سب سے پہلے مفتی حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب تھے دیوبندی

(۲) آپ کے بعد حضرت مولانا مولوی ریاض الدین صاحب، بجنوری

(۳) آپ کے بعد جناب مولانا مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی

(۴) آپ کے بعد جناب مولانا سہول صاحب (بہت تھوڑے عرصہ کے لئے)

(۵) پانچویں اور موجودہ مفتی جناب مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب سہارنپوری۔

نوٹ:۔ دارالافتاء میں استفتوں کا سالانہ اوسط آٹھ دس ہزار ہے۔

دارالعلوم کا حصہ تصانیف میں | علماء دیوبند کا حصہ تصانیف میں کسی صورت میں کسی اور ادارہ سے کم نہیں بلکہ حقیقت کوئی اور دوسرا ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

حضرت بانی دارالعلوم دیوبند کی کتنی ہی متکلمانہ تصنیفیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی محدثانہ تصانیف حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی مورخانہ وادیبانہ تصانیف حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کی نصیحانہ نیز مورخانہ تصانیف۔ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب بجنوری کی مناظرانہ تصانیف اس کی شاہد عدل ہیں۔

بعد کے دور میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی فلسفیانہ تصانیف حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب کی محشیانہ فقہی وادبی تصانیف۔

نئی پود کو اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو دارالعلوم کے چند جدید فضلا نے مجلس قاسم المعارف کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے جس نے تعلیمی ہند کو سب سے پہلے پبلک کے سامنے پیش کیا۔ جس کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ صوبہ یوپی کے محکمہ تعلیم نے اس کو منظور کرلیا ہے۔ نیز وہاں سے ایک اخبار استقلال کے نام سے بھی شائع ہوتا ہے۔

قرول باغ نئی دہلی میں ایک مجلس ندوۃ المصنفین کے نام سے قائم ہوئی ہے جس کا اصل کام تصنیف و تالیف ہے۔ اور یہ کام جاری ہوگیا ہے اس سال غالباً چار کتابیں پبلک کے سامنے پیش کرنے والے ہیں۔ رسالہ برہان ماہانہ تو جاری ہوچکا ہے۔

اسی طرح دارالعلوم کے اور دوسرے اہل درس حضرات کی متعدد تصانیف جو انھوں نے تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیفی حیثیت کے ساتھ انجام دیں ملک کے دینی حلقوں میں آجتک قدر کی نگاہوں سے دیکھی جارہی ہے۔

دارالعلوم کے امتحانات | چونکہ دارالعلوم کی علمی حالت کا بیان ہو رہا ہے اس واسطے بیجا نہ ہوگا اگر اس کے طریقہ ہائے امتحان پر بھی روشنی ڈالدی جاست۔

علمائے کرام کی تعداد کا اندازہ تو آپ نے راقم الحروف کی اس مرقوم عبارت سے لگا لیا ہوگا جب ان آپ کو بتایا گیا ہے کہ صرف دورۂ حدیث کی جماعت دو سو سے زاید پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کثرت تعداد پر نظر ڈالتے ہوئے یہ حقیقت مزید تعجب کا باعث ہوگی کہ امتحانات کے متعلق دارالعلوم دیوبند میں وہ شدت ہے جو کسی اور مدرسہ میں عموماً نہیں۔

امتحانات دو قسم کے ہوتے ہیں - ایک امتحان داخلہ یہ ان طلبہ کا ہوتا ہے جو کسی دوسرے مدرسے سے آکر امسال دارالعلوم میں داخل ہونا چاہیں۔ اس میں عموماً شوال کا پورا مہینہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس میں وہ شدت استعمال کی جاتی ہے جو دیگر مدرسوں میں نہیں - اسی وجہ سے بسا اوقات نصف سے زاید طلبہ وہ ہوتے ہیں جو امتحان داخلہ میں ناکامیاب ہونے کی وجہ سے واپس چلے جاتے ہیں اور دوسرے مدرسوں میں داخلہ لیتے ہیں - دوسرے امتحانات زیر تعلیم طلبہ کے ہوتے ہیں یہ سال میں تین ہوتے ہیں - سہ ماہی - ماہ صفر المظفر میں۔ ششماہی ماہ جمادی الاول میں۔ تیسرا سالانہ ہوتا ہے عموماً ۲۵ رجب سے شروع ہوکر ۱۰ شعبان تک رہتا ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ جس قدر سختی سالانہ امتحان میں خاص طور سے کی جاتی ہے وہ اصولی طور پر دوسرے کالجوں میں بھی نہیں ہوتی داخلہ امتحان کے خاص خاص ضوابط ہوتے ہیں نگرانی پوری شدت سے کی جاتی ہے اور اصولی سختی یہ ہے کہ ۸۰ فیصدی نمبر ہر کتاب میں حاصل کرنے پڑتے ہیں - حالانکہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف ۳۳ فیصدی حاصل کرنے پڑتے ہیں اس کے علاوہ دو سختیاں اور ہیں۔

(۱) کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عموماً کتابوں کے گروپ مقرر کر دئے جاتے ہیں۔ مثلاً دو کتابیں ساتھ ساتھ ایک گروپ میں شامل کی گئیں اب ان دونوں کتابوں میں مجموعی طور سے ۳۳ نمبر حاصل کرنے چاہئیں۔ خواہ ہر ایک میں ۱۷، ۱۷ یا ایک میں مثلاً ۲۰ دوسری میں ۱۳ - لیکن دارالعلوم میں کوئی گروپ نہیں ہوتا۔ اس کے ہر کتاب کے نمبر علیحدہ ہوتے ہیں - نمبروں کے چار درجے ہیں - ۵۰ سے زائد اعلیٰ - ۴۹ سے ۴۰ تک اول۔

۴۰ سے ۵۰ تک دوم ، ۵۰ سے ۴۰ تک سوم۔ اگر کسی ایک کتاب میں ۲۰ نمبر حاصل کئے تو اس کو کمپارٹمنٹ میں سمجھا جاتا ہے اس کو اگلی کتاب پڑھنے کی اجازت مل سکتی ہے لیکن اس میں سالانہ امتحان دینا ہوگا۔

(۲) عموماً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے امتحانات میں ایک ایک کتاب کے متعلق سات سات آٹھ آٹھ سوالات ہوتے ہیں۔ ہر سوال کے نمبر متعین ہوتے ہیں۔ طالب علم کا حق ہوتا ہے کہ جونسے سوالات چاہے انتخاب کرکے حل کرسکتا ہے البتہ اس کا فرض ہوتا ہے کہ ۱۰۰ نمبری کتاب یا گروپ میں ۳۳ نمبر حاصل کرے۔ خواہ وہ ایک سے ہوں یا دونوں سے لیکن دارالعلوم کے امتحان میں ایک پرچہ میں (وہ بھی صرف ایک ہی کتاب کا) ۴ سوالات ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک چھوڑ دیا تو عموماً فیل ہی ہوجاتا ہے۔

شدت کے ساتھ ان تمام قیود کی پابندی کا لحاظ فرماتے ہوئے آپ کو طلبہ کی اس غیر معمولی کثرت پر تعجب ضرور ہوگا۔

دارالعلوم کی تعطیلات | امتحان کا ایک لازمی جزو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے بعد عموماً تعطیلات ہوتی ہیں اسواسطے امتحانات کی تفصیل کے بعد ضروری ہے کہ یہاں کی تعطیلات کا بھی ذکر کردیا جائے۔

یہاں پر جمعہ کے علاوہ سال بھر میں ۴ چھٹیاں ہوتی ہیں۔ رمضان شریف میں سالانہ امتحان کے بعد۔ اس میں عیدالفطر امتحان سالانہ کی چھٹیاں بھی آجاتی ہیں۔ جو عموماً ۱۵ ر شعبان سے شروع ہوکر ۷ ر شوال کو ختم ہوتی ہیں۔

دوسرے عیدالضحیٰ کی تعطیل جو عموماً ۹ ذی الحجہ سے ۱۵ ر تک ہوتی ہے۔

تیسری اور چوتھی تعطیل امتحان سہ ماہی اور ششماہی کی ۴ یوم کی جس کی صورت مجلس شوریٰ یہ پیش کرتی ہے کہ امتحان کو ہفتہ کے پہلے دن ہفتہ سے شروع کرکے ۴ دن امتحان کے اور ہفتہ کے آخری چار دن تعطیل کے ہوتے ہیں۔

دارالعلوم کی موجودہ حالت اور مختلف شعبے | آج بحمداللہ اس کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ کئی لاکھ کی سربفلک عمارتیں کھڑی ہیں ۲۲ بڑی بڑی درسگاہیں ہیں۔ ۸ چھوٹے بڑے دارالطلبہ میں مجموعی حیثیت سے تقریباً ۱۰۰ حجرے ہیں۔ جن کے نمبروار حلقے اور سکان رجسٹروں میں درج ہیں بہت کافی تعداد میں طلبہ ہیں۔ جن میں سے

اکثر کے مصارف طعام ۔ پارچہ ہائے سرما و گرما و بوٹ، فرش و روشنی ۔ دھلائی پارچہ و معالجہ اور ان کی رہائش وغیرہ تیا ۔ و دیگر ضروریات کا بار بذمہ دارالعلوم ہے ۔ اور ۲۷ قابل و بے نظیر مدرس ہیں جو ۲۱ علوم و فنون کی ۴۰ کتابوں کا تلامذہ کو درس دے رہے ہیں ۔

تبلیغ | تبلیغ بھی درحقیقت تعلیم ہی کا ایک شعبہ ہے فرق یہ ہے کہ تعلیم میں خطاب خاص ہے اور تبلیغ میں خطاب عام ۔ یا تعلیم میں سبق دیا جاتا ہے ۔ اور تبلیغ کے ذریعہ اس سبق کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے ۔ بہر حال نوعیت کے لحاظ سے یہ بھی تعلیم ہی ہے تعلیم کے سلسلہ میں لوگ باہر سے آکر داخل مدرسہ ہوتے ہیں اور تبلیغی سلسلہ میں داخلی لوگ باہر جا کر مسلمانوں کو وعظ و پند کرتے ہیں جو ملک کے مختلف اجتماعات اور جلسوں میں منجانب دارالعلوم شرکت کرتے ہیں ۔ اور دارالعلوم کی تعلیمات اور اس کے معتدل مسلک کو لوگوں میں رائج کرتے ہیں ۔ ان کی کارگذاری کی پندرہ روزہ ڈائریاں دفتر اہتمام میں موصول ہوتی ہیں جن سے تبلیغ کے سلسلہ میں مبلغین کی مساعی مستقل فائل میں محفوظ رہتی ہیں ۔ مقامات سفر، ایام سفر، عام پروگرام کی سب تفصیلات ڈائریوں میں مفصل مذکور ہوتی ہیں سال گذشتہ کی بھی شعبہ کی کارگذاری کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے پانچ مبلغین حضرات نے ایام کردگی میں اطراف ملک میں ۴۴۰ تقریریں مختلف علمی و عملی موضوعوں پر کیں ۔ اور اصلاح عامہ کا حق ادا کیا ۔

افتا | اس کا خاکہ گو آپ کے ذہن نشین ہو چکا ہے لیکن یہاں پر چند باتیں اور قابل تذکرہ ہیں ۔

یہ شعبہ تعلیم کا ایک ایسا جزو ہے جس سے عامۃ المسلمین کی خدمت انجام دی جاتی ہے ۔ سوالات پہنچنے پر شرعی جوابات ارسال کئے جاتے ہیں ۔ پچھلے سال کے اعداد و شمار کے لحاظ سے جو عدد درج رجسٹر ہے وہ یہ ہے کہ ۱۸۰۴ فتاوی دارالعلوم سے باہر بھیجے گئے ۔

دائرہ افتا میں ایک مفتی نائب مفتی دو معین مفتی اور ایک فتاوی نویس کام کر رہے ہیں ۔

طب | یہ بھی ایک علمی شعبہ ہے جس میں خواہشمند طلبہ کو فن طب کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس شعبہ میں ایک ماہر طبیب جناب حکیم محمد عمر صاحب کی خدمات حاصل کی گئی ہیں ۔ طبیب صاحب دارالعلوم طب کی تعلیم بھی دیتے ہیں ۔ اور احاطہ مدرسہ میں مطب بھی کرتے ہیں ۔ مریض طلبہ انھیں کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔

معالجات طلبہ کا ایک مستقل مصرف ہے جس میں ماہانہ ایک معتد بہ رقم خرچ کی جاتی ہے نسخہ جات میں رعایت رکھی جاتی ہے کہ حتی الامکان کم قیمت اور کثیر المنفعت ہوں۔ سال گذشتہ ۲۶۹۶ مریضوں کا علاج کیا گیا۔ جن کی سالانہ حاضری کا شمار ۱۰۳۹۶ ہوتا ہے۔ گویا ہر ماہ میں ۲۲۴ مریضوں کا اوسط اور ماہانہ نسخوں کا اوسط ۸۶۶ ہوتا ہے۔ ان نسخہ جات کی قیمت جو خزانہ سے ادا کی گئی اس کا ماہوار اوسط ۲۵ ہوتا ہے۔ اگر ان ماہانہ مصارف کو مریضوں اور نسخہ جات کی مذکورہ تعداد پر تقسیم کیا جائے تو ایک مریض کا اوسط خرچ صرف دس پیسے اور ایک نسخہ کی اوسط قیمت ۸ پائی سے بھی کم آتی ہے۔ اس سے شہر کی کفایت اور طبیب صاحب دارالعلوم کی حسن قابلیت اور حسن کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن مریض، طلبہ یا ملازمین مدرسہ کو طبیب صاحب ان کے قیامگاہوں پر جاکر دیکھتے ہیں ان کا ماہانہ اوسط چالیس مریض ہوتا ہے۔

کتبخانہ | کتبخانہ دارالعلوم کا ایک جوہری جزو' اور سامان علم ہے اس لئے مالی خزانہ سے زیادہ ہی اس علمی خزانہ کی اہمیت ہے دارالعلوم کا کتبخانہ بحیثیت عدد و نوعیتِ کتب بحمداللہ امتیازی شان رکھتا ہے جس کی شاندار عمارت چار بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ہے' بڑے ہال میں گیلری کے ذریعہ اوپر سے کتابیں اٹھائی جاتی ہیں۔ چالیس ہزار وقفی جلدیں ہر وقت زیر درس و مطالعہ رہتی ہیں اور غیر وقفی ملاکر ایک لاکھ جلدیں ہو جاتی ہیں قلمی کتب کا ذخیرہ جداگانہ الماریوں میں استفادہ کے لئے محفوظ ہے۔ اندراج کتب اور جمع و تقسیم کے باقاعدہ رجسٹر ہیں جن کے ذریعہ ہر وقت تمام کتابوں' تمام فنون اور کتب فنون کے مجموعی اعداد و شمار بآسانی معلوم کئے جاسکتے ہیں' کتب خانہ کے ذمہ دار ناظم جناب مولانا مولوی سلطان الحق صاحب ہیں جو مستقلاً ایک مختصر سے تین چار آدمیوں کے عملہ کے ساتھ اس کام کو بخیر و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ کتبخانہ کا انتظام بہترین نظم و نسق کے ساتھ انجام دیں خدا کرے کہ وہ کامیاب ہوں۔ (آمین)

مطبخ | اسی طرح شعبہ مطبخ جس سے طلبائے مستحقین کو کھانا دیا جاتا ہے اپنے معمولات میں سرگرم ہے۔ سال گذشتہ مطبخ سے کھانا پانے والوں کی تعداد (۴۵۰) سے اوپر رہی (نقد وظیفہ پانے والے طلبہ کا شمار ان کے علاوہ ہے) اس کا ماہانہ اوسط گذشتہ سال [illegible] روپیہ رہا ہے۔ اس شعبہ میں تقریباً ۱۴، ۱۵ ملازمین کا عملہ کام کر رہا ہے کھانا ہمیشہ ٹھیک وقت پر تیار رہتا ہے۔ نگران کار جناب مہتمم صاحب اور ...

گاہے جناب صدر مدرس صاحب کھانے کا معائنہ فرماتے رہتے ہیں۔ خریداجناس کا کام ہمیشہ مختلف نرخ معلوم کرنے کے بعد کفایت کے ساتھ ناظم مطبخ خود کرتے رہتے ہیں۔ جنس حتی المقدور عمدہ خریدی جاتی ہے۔ گوشت گاؤ قصاب مطبخ میں آکر بناتا ہے۔ گاہ گاہ دارالعلوم کے بعض ذمہ دار اشخاص بھی گوشت کی نگرانی کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔

تعمیرات | یہ شعبہ اپنے کاروبار کے لحاظ سے کافی وسعت رکھتا ہے۔ تعمیرات کا دفتر بھی مستقل ہے۔ اور اس کے گودام جس میں مختلف تعمیری سامان رہتا ہے بالکل جداگانہ ہیں مختلف رجسٹروں کے ذریعہ تعمیرات کی کارگذاریاں دفتر میں مدون رہتی ہیں، اس شعبہ میں تقریباً چار کارکن مصروف کار رہتے ہیں ایک ان میں سے ناظم ہیں جو رڑکی انجینیرنگ کالج کے پاس شدہ ہیں، اور اپنی دیانت و امانت داری کے لحاظ سے جماعت میں معروف ہیں تمام تعمیری کام مثلاً پیمائش سامان تعمیر مصالحہ جات وغیرہ خود ہی انجام دیتے ہیں۔

اس شعبہ نے چار سال کے اندر بہت کافی ترقی کی ہے کیونکہ راقم الحروف ۱۳۵۳ھ کا سند یافتہ ہے جس کو چار سال گذر گئے، جدید فارسی خانہ بنایا ہے۔ محافظ خانہ کی دو منزلہ عمارت بنائی۔ دارالطلبہ جدید کے سلسلہ میں پانچ وسیع کمرے تیار کئے۔ کمرہ ۱۳ کی بنیادیں بھریں۔ گیارہ کمروں کی جو پہلے سے تیار تھے پختہ منڈیریں، فرش زمین اور فرش سنگ پختہ اور پلاستر کرائے۔ نیز ان کمروں میں بانیان کمرہ کے ناموں کے کتبے لگوائے۔

دارالحدیث کے اوپر منڈیر لگوائی جس میں کئی ہزار روپیہ صرف ہوا۔ دارالحدیث کا شمالی برآمدہ تیار کیا دارالحدیث کے شمالی اور جنوبی برج تیار کئے۔ دارالحدیث اور گیلری کی جوڑیوں پر سبز رنگ کرایا مسجد دارالعلوم کی بالائی منزل کے سامنے سائبان بنوایا۔ احاطوں کا پانی باہر جانے کے لئے ایک طویل و عریض پختہ نالی تیار کرائی۔ زینہ دارالاہتمام جو مسجد کی جانب سے آتا ہے اور زینہ متصل فارسی خانہ پتھر کا بنایا۔ دارالحدیث کمرہ ۹ سے ۱۲ تک جو اندرون تالاب واقع ہیں بھرائی کرائی۔ بہرحال یہ شعبہ ضرورت کے لحاظ سے خاصی ترقی کر رہا ہے۔

ورزش | راقم الحروف کے دارالعلوم چھوڑنے کے بعد دارالعلوم میں شعبہ ورزش بھی کھول دیا گیا ہے جس میں طلبہ کو کود پھاند، لکڑی چلانا۔ اور مخصوص ورزشیں کرائی جاتی ہیں۔ یہ شعبہ ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ سرپرست اس میں ایک استاد ورزش محنت و مستعدی سے کام کر رہے ہیں مختلف عمر کے طلبہ اُن سے فنونی ورزش و سپہ گری سیکھتے ہیں۔ مختلف قسم کے سامان ورزش مونگریاں، ہنہ اسے ڈنڈ، چرمی دستانے، لاٹھی وغیرہ شعبہ کے اسٹاک میں موجود ہیں جو طلبہ کیں مستعمل ہیں۔ یہ شعبہ حصول تندرستی کے ساتھ مسلمانوں کو ان کا اصلی مگر بھولا ہوا سبق یاد دلانے اور ان میں جرأت و حوصلہ پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا مختلف شعبوں کے متعلق مختصر سی تحریر سے آپ نے بخوبی دارالعلوم کے حالات کا اندازہ لگایا ہوگا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ختم کردوں ورنہ ابھی صرف اجمالی بیان کے لئے بھی بہت سے شعبے باقی ہیں۔ مثلاً شعبۂ احتساب، حفظ، دفتر، فصل خصومات، شعبۂ صفائی، شعبہ اوقاف، مجلس منتظمہ وغیرہ وغیرہ۔

دارالعلوم کا نظم و نسق | البتہ آخر میں ضروری ہے کہ زائرین کرام (دارالعلوم) کے خیالات سے بھی مستفید ہوں۔ کہ وہ کس قسم کا اثر دارالعلوم کے نظم و نسق سے لے کر جاتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کا نظم و نسق بھی آپ کے سامنے ہوگا۔

نظم دارالعلوم کی تقویت نہ کسی حکومت کی اعانت سے ہے نہ پولیس اور فوج سے بلکہ محض باہمی محبت و عقیدت اور رواداری سے قائم ہے اس پختگی نظام اور استواری نظم کو دیکھ کر (جو محض اخلاقی ہے) ایک موقعہ پر صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب مرحوم وائس چانسلر علی گڈھ یونیورسٹی نے دارالعلوم کے احاطہ میں فرمایا تھا کہ "کاش یہ ڈسپلن (نظم) علی گڈھ کو بھی نصیب ہو۔"

۱۳۴۷ھ میں وفد حیدرآباد کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن صاحب شروانی نے دارالحدیث دارالعلوم کے بڑے ہال میں تقریر فرماتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے اس مجموعی نظام میں ایک نور محسوس ہوتا ہے۔

اور علامہ رشید رضا مدیر رسالہ المنار مصر نے دارالعلوم کی اس ساکن فضا کو دیکھکر اپنی عربی تقریر میں فرمایا تھا:-

ولم اسمعها رجعت من الهند حزیناً۔ اگر میں دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین جاتا۔

دارالعلوم کے سرسٹھ سالہ تعلیمی مصارف اور اس کی کفایت شعاری کالج اور یونیورسٹیاں کے بدنام ہونے کے ذرائع جہاں اور بھی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ کالجوں میں طالبعلم بجز اس کے کہ اپنے عزیز والدین کی کمائی کو فضول اور لغو باتوں میں ختم کرنا سیکھتا ہے نیز اسی چیز کے پیش نظر موجودہ لیڈران قوم اور محکمہائے تعلیم کے ماہروں نے اس طرف قدم بھی بڑھانا شروع کر دیا ہے لیکن یہ لاٹھی جاری ہوئی ہے اس وقت تک جبکہ سانپ گذر چکا ہے مگر دارالعلوم دیوبند کو دیکھئے کہ اس نے اپنے اس معاملہ میں بھی ایسا رویہ اختیار کیا ہے جس کو شروع سے برابر تنہا سے چلا جارہا ہے۔

اس وقت میرے سامنے ایک رپورٹ ہے مرتبہ جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب نائب مہتمم حال دارالعلوم دیوبند جس میں انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی سرسٹھ سالہ زندگی پر ایک مجمل نظر ڈالی ہے اس میں انھوں نے مذکورہ بالاعنوان کے ماتحت دارالعلوم نے کم از کم اخراجات سے کتنا فائدہ عظیم اٹھایا ہے چنانچہ میں اس کو یہاں بالفاظ مذکورہ بالاعنوان کے نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ مذکورہ بالا عنوان کے ماتحت رقمطراز ہیں

”پھر اس مرکزی کاروبار کی اس ہمہ گیری وسعت اور پھیلاؤ کے باوجود کارکنوں کی دیانت و اخلاص کا یہ کس قدر حیرت انگیز کارنامہ ہے کہ دارالعلوم نے اس سرسٹھ سالہ زندگی میں صرف طلبہ تقریباً پانچ لاکھ پانچ ہزار تین سو تینتیس روپیہ صرف کرکے تین ہزار عالم تیار کئے۔ اگر اس رقم کو صرف ان تکمیل یافتہ علماء ہی پر صرف کیا جائے اور ان آٹھ ہزار طلبہ کے عدد کو بالکلیہ نظر انداز کر دیا جائے جن پر کو صرف کیا گیا مگر وہ سند تکمیل نہ پا سکے تو فی عالم تقریباً ۱۶۹ روپیہ بیٹھتا ہے جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دارالعلوم نے صرف ایک سو انہتر روپیہ کی حقیر رقم میں ایک ایک عالم ایسا مکمل تیار کر دیا جو قوم کی تمام دینی ضروریات تدریس، تبلیغ، وعظ، مناظرہ، تصنیف اور افتاء وغیرہ کا کفیل ہو۔ اور ہر ایک دینی خدمت بآسانی کر سکے۔ درآں حال کہ ان تین ہزار میں کتنی ہی ہستیاں ہم ایسی بھی شمار کرا چکے ہیں کہ اگر یہ لاکھوں کی کل صرف شدہ رقم ان میں سے صرف ایک ہی پر نچھاور کر دی جاتی تو برمحل ہی نہیں بلکہ ع ”نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز“ کا مصداق ہوتا۔ بہر حال اس کا فیض باران رحمت

کی طرح عام رہا اور یہاں سے بھی اس کے پیاسے پہنچے اس نے ظرف و ہمت کے موافق انھیں سیراب کیا۔ اور اس لیے ہندوستان کا کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہ ملے گا جہاں دارالعلوم کے سرچشمہ کی کوئی نہر اور کوئی ندی مسلمانوں کو سیراب نہ کر رہی ہو۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں — ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

موجودہ حضرات مدرسین کا ایثار | مناسب ہوگا کہ اس وقت حضرات مدرسین کے زہد و ایثار کا دارالعلوم پر تذکرہ کیا جائے۔ آپ نے مختصراً ہر زمانہ کے مدرسوں کا دل دیکھا۔ لیکن یہ حال دارالعلوم کے موجودہ مدرسین حضرات کا ہے۔ ان حضرات کی کیفیت اس طرح بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم دوسرے کالجوں کے مدرسین کا نقشہ سامنے رکھیں چنانچہ کالجوں یا یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو عموماً پورے ہفتے صرف ۲۴ گھنٹے پڑھاتے ہیں ان کی تنخواہ دو سو ڈھائی سو روپیہ ماہوار ہوتی ہے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کا باکمال پروفیسر جو یومیہ کم از کم چھ گھنٹے درس دیتا ہے اس کی اوسط تنخواہ صرف ساٹھ روپیہ ماہانہ ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ بھی عربی مدرسہ ہے جو گورنمنٹ کے زیر کفالت ہے اس کے پرنسپل کو پورے مہینہ میں صرف ۲۴ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے اور ایک ہزار یا گیارہ سو روپیہ کی تنخواہ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ لیکن دارالعلوم کے پرنسپل کو صرف ایک سو پچھتر روپے ماہوار ملتے ہیں جو اوسطاً ۹ گھنٹے یومیہ مدرسہ میں کام کرتا ہے۔

ایک نظم اور خاتمہ | غالباً سنہ ۱۳۵۵ھ میں مولانا ظفر علی خاں صاحب کا ورود مسعود دارالعلوم دیوبند میں ہوا آپ پر وہاں کے حالات کا بہت کچھ اثر ہوا فی البدیہہ آپ نے اپنے خیالات کو منظوم فرمایا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل ہے:۔

شاد باش و شاد زی اے سرزمین ہند — ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ملت بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند — حکمت بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دوچند

اسم تیرا باسمیٰ، ضرب تیری بے پناہ — دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند

تیری رجعت پر ہزار اقدام ہوجاں سے نثار — قرن اول کی خبر لائی تیری اولٹی زقند

تو مسلم بہ وارثِ حق ہے، حق نگہباں ہے تیرا — خیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند

ناز کر اپنے مقدر پہ کہ تیری خاک کو — کر لیا ان عالمانِ دینِ قیم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموسِ محمدؐ پر فدا — حق کے رستہ میں کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ ! — جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اس میں قاسمؒ ہوں کہ انور شاہؒ کہ محمود الحسن — سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمیِ ہنگامہ تیری آج حسین احمدؒ سے ہے

جن سے ہے پرچم روایاتِ سلف کا سر بلند

مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند)

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد	نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عا ر	عہ	تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے ر	عہ ر
القول الاظہر	عہ	۸	״ ״ ״ دوم	عہ ر	عا ر
رہنمایان ہند	عا ر	عہ	تاریخ یونان قدیم	عا ر	۰
امرائے ہنود	سے ر	سے ر	نکات الشعراء	عہ ر	عہ ر
القمر	عہ	۱۰ ر	وضع اصطلاحات	سے ر	سے ر
تاریخ تمدن حصہ اول	عا ر	عہ ر	بجلی کے کرشمے	عہ ر	عہ ر
״ ״ ״ دوم	عا ر	عہ ر	تاریخ ملل قدیمہ	عہ	۰
فلسفۂ جذبات	عہ ر	عا ر	محاسن کلام غالب	عہ ر	۱۰ ر
البیرونی	عا	عہ ر	قواعد اردو	عہ ر	عا ر
دریائے لطافت	سے ر	عہ ر	تذکرۂ شعرائے اردو	عہ ر	عہ ر
طبقات الارض	عہ ر	عا ر	جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق	سے ر	عہ ر
مشاہیر یونان و روما حصہ اول	للعہ ر	سے	تاریخ ہند ہاشمی	۰	عہ ر
״ ״ دوم	سے ر	عہ ر	مثنوی خواب و خیال	عہ ر	عہ ر
اسباق النحو حصہ اول	۰	۶ ر	کلیات ولی	صہ ر	للعہ ر
״ ״ دوم	۰	۶ ر	چمنستان شعراء	عہ ر	للعہ ر
علم المعیشت	عہ ر	صہ	ذکر میر	۰	عا ر

اردو زبان کا ارزاں ترین و بلند پایہ ماہوار رسالہ

ایشیا لاہور

ماہ اگست کے پرچہ میں مندرجہ ذیل مضامین تھے

(۱) پرائیویٹ سکریٹری (ایک دلچسپ افسانہ) (۲) آہ اقبال - دلکش نظم ... مولانا ظفر علیخاں (۳) علامہ اقبال کی اردو شاعری (بلند پایہ مضمون) (۴) علم قیافہ - علم قیافہ کے دلچسپ اور مستند معلومات (۵) وجدانیات حفیظ - ابوالاثر حفیظ جالندھری کی تازہ نظم (۶) طبی معلومات جریان و احتلام کا مستند و صحیح علاج (۷) بمب بازی ایک نہایت خوشگوار فعل ہے - مسولینی کے تازہ مضمون کا اردو ترجمہ (۸) ضیغم ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے متعلق بلند پایہ مضمون (۹) قمیص - ایک دلچسپ مضمون (۱۰) کلام شہا (۱۱) سوشلیزم، بالشویزم - فسطائیت کی دلچسپ تعریف (۱۲) مشاہیر اسلام - اسلام کے مشہور بزرگوں کی سوانح حیات (۱۳) مختلف ملکوں کے مرد ایک انگریز عورت کی نظر میں (۱۴) دلچسپ معلومات (۱۵) راز زندگی - (۱۶) خودکشی - جنگ چین و جاپان کی ایک دردناک اور صحیح داستان (۱۷) کشتۂ غم - ایک دردناک افسانہ (۱۸) دوشیزہ مصر - ایک مسلسل افسانہ (۱۹) عجائبات طب (چند نایاب نسخے) (۲۰) کانٹے والی - جنگ چین کا حب الوطنی سے لبریز افسانہ

نمونہ مفت طلب کریں — چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ

(المشتہر) منیجر رسالہ ایشیا ڈاکخانہ وطن لاہور

مملکت دکن کا واحد اردو انگریزی نیم ماہانہ فلمی رسالہ

زیر نگرانی
محمد حسام الدین خانصاحب
غوری

زیر ادارت
ایم، سی بھلہ
بی اے

مووی لینڈ

صنعت فلم سازی کی اصلاح و ترقی کا علمبردار

صنعت فلم سازی کے ہر پہلو پہ گراں پایہ مضامین
فلموں پر لاجواب تعمیری و تنقیدی مقالات
نگارخانوں کی رنگین و رومان خیز کہانیاں،
دکھی زندگیوں کی اشک افشاں داستانیں
مغربی شاہکار مضامین کے تراجم،
تازہ ترین فلمی حالات و دلچسپ معلومات
روح پر وجد طاری کرنے والی نظمیں
اور دلکش و دل پذیر تصاویر''

سے مزین ہوکر

ہر ماہ عیسوی کی پہلی تاریخ کو اس کا اردو ایڈیشن اور ۱۵ تاریخ کو انگریزی ایڈیشن شائع ہوتا ہے

دونوں ایڈیشن کا سالانہ چندہ

(للعہ) مع محصولڈاک

کسی ایک ایڈیشن کا سالانہ چندہ

(تعہ) مع محصولڈاک

قیمت فی کاپی صرف ۔/۳/

مینجر مووی لینڈ متصل بنسی لال پیٹھ سکندرآباد دکن

جدید مطبوعاتِ جامعہ

مضامین محمد علی:- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ - یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان اُٹھے - قیمت مجلد دو روپیہ (عہ)

دنیا کی کہانی:- از پروفیسر محمد مجیب صاحب - اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائیوں اور تاریخوں کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر وہ سب سمجھ جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے - قیمت دو روپیہ (عہ)

شہری آزادی:- یہ ایک کتابچہ ہے جس میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندستان کے شہریوں کو ان کے ان حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے - قیمت چھ آنے (۶؍)

ہندوستان میں برطانی حکومت:- از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب - یہ تو آپ جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے - لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے - اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے جس میں برطانی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے - قیمت آٹھ آنے (۸؍)

ہندوستان میں دیہی قرض:- مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے - اس چھوٹی سی کتاب میں قرض کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسانوں کی کیا حالت ہے اور ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات درج کی گئی ہے - قیمت ۴؍

"بلاغ" امرتسر

اپنے معاصرین کی نظر میں

۱۔ بلاغ میں محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ (ایمان)

۲۔ قرآنی حقائق و معارف کی اشاعت اور صرف کلام اللہ کے جامع و مکمل اصول کی طرف فرزندان توحید کو مائل کرنا بلاغ کے مقاصد خصوصی ہیں (ترجمان سرحد)

۳۔ رسالہ اپنے موضوع میں بہت اچھا ہے اور متانت و سنجیدگی کا جو اعلیٰ معیار اس میں قائم رکھا گیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے (الجمعیۃ)

۴۔ وہ لوگ جو قرآنی علوم کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی علوم اسلامی کو سمجھنے اور ان میں تمیز کرنے کے اہل ہیں ان کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ (دور جدید)

۵۔ ہر ایک مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قرآن شریف کی روزانہ تلاوت کرنے والوں کے واسطے رسالہ "بلاغ" بیحد رہنمائی کرے گا۔ (کراچی نیوز)

۶۔ تمام کا تمام رسالہ قرآن کی تعلیم اور مذہبی احکام کا دلچسپ اور بہترین آرگن ہے (سالار)

۷۔ یہ رسالہ عرصہ سے قرآنی حقائق و معارف کی تشریح و اشاعت کا فرض نہایت عمدگی سے انجام دے رہا ہے (سالک)

لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ، قیمت سالانہ تین روپیہ، نمونہ کا پرچہ چار آنے کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں

پتہ:۔ منیجر "بلاغ" امرتسر

تفاسیر ثلاثہ ثنائیہ

از حضرت مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ

تفسیر ثنائی اردو۔ قرآن شریف کی بہت سے حضرات نے تفسیریں لکھیں مگر تفسیر ثنائی اردو ان سب پر سبقت لے گئی ہے۔ جسے زمانہ حاضرہ میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس تفسیر میں خاص خوبی (جو اس سے پہلے کسی تفسیر اردو یا عربی میں نہیں دیکھی گئی) یہ ہے کہ قرآنی مضمون مسلسل معلوم ہوتا ہے۔ ایک کالم میں آیات قرآنی ہیں جن کے نیچے اردو ترجمہ دیا گیا ہے، دوسرے کالم میں تفسیر مع ترجمہ ہے نیچے حواشی و شان نزول درج ہے۔ مخالفین اسلام اور مخالفین سنت نبی علیہ السلام کے خیالات کی اصلاح بھی موقع بموقع کی گئی ہے۔ کل تفسیر آٹھ جلدوں میں ہے۔ قیمت فی جلد عہ مکمل سٹ دس روپیہ دعہ، محصول علاوہ

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن (بزبان عربی) تفسیر ہذا عربی زبان میں مفسرین کے مسلمہ اصول القرآن یفسر بعضہ بعضاً پر لکھی گئی ہے جسے ظاہری و باطنی خوبیوں کے باعث اہل علم حضرات نے پسند فرمایا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی بیحد مقبول ہو چکی ہے۔ بعض مدارس میں بطور نصاب (جلالین کی طرح) پڑھائی جا رہی ہے۔ ہر آیت کی تفسیر میں قرآن کی دوسری آیت سے استشہاد کیا گیا ہے۔ مصری سائز اور رنگ کے کاغذ پر اعلیٰ کتابت و طباعت کے ساتھ طبع کرائی گئی ہے۔ سارے قرآن کی تفسیر ہے۔ قیمت صرف چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصولڈاک۔

بیان الفرقان علی علم البیان (بزبان عربی) قرآن مجید کی یہ سب سے بڑی پہلی تفسیر ہے جو علم معانی و بیان کی روشنی میں عربی لکھی گئی ہے شروع میں علم معانی و بیان کی اصطلاحات درج کر کے ان پر نمبر ڈالے گئے ہیں۔ دوران تفسیر جہاں کسی اصطلاح کا ذکر آیا ہے اس پر اس اصطلاح کا نمبر دیا گیا ہے۔ سردست صرف سورۃ فاتحہ و سورۃ بقر کی تفسیر چھپی ہے۔ جلد منگوا لیں ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ ہے۔ سرورق رنگین سفید آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ قیمت صرف ١ر محصولڈاک علاوہ ہوگا۔

ملنے کا پتہ: مینیجر دفتر اخبار "اہل حدیث" امرتسر

سلسلہ منتخباتِ نظمِ اُردو

۱۔ معارف ملت ۲۔ جذبات فطرت ۳۔ مناظرِ قدرت

مرتبہ

پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے۔ ال ال بی (علیگ)

وہ حضرات جنھوں نے اردو شاعری کی ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی داستان سمجھ رکھی ہے اس سلسلہ انتخاب کو ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل نظموں پر وہ سر دھنتے ہیں ان کی ہم پلہ نظمیں خود ان کی زبان میں موجود ہیں شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے۔

معارف ملت (چار حصے)

جلد اول۔ حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں قیمت عہ

جلد دوم۔ مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل کی تصویریں قیمت عہ

جلد سوم۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق شعرا کا دلپذیر کلام قیمت عہ

جلد چہارم۔ اخلاق و حکمت کے انمول موتی قیمت عہ

جذبات فطرت (چار حصے)

جلد اول۔ میر و سودا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد دوم۔ غالب، ذوق، ظفر اور حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد سوم۔ تقریباً تیس قدیم، مستند اور باکمال شعرا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد چہارم۔ تقریباً ساٹھ جدید شعرا کے کلام کا دلکش انتخاب قیمت عہ

مناظرِ قدرت (چار حصے)

جلد اول۔ متعلق اوقات یعنی صبح، شام، دن، رات، برسات اور بہار کے دلکش مناظر قیمت عہ

جلد دوم۔ متعلق مقامات یعنی آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل اور عمارات کی صاف ستھری تصویریں قیمت عہ

جلد سوم۔ متعلق نباتات و حیوانات یعنی پھول پھل، کیڑے پتنگے اور چرند و پرند کا مطالعہ و مشاہدہ۔ قیمت عہ

جلد چہارم۔ متعلق عمرانیات یعنی ہندوستان کا تمدن، رسم و رواج، عید، تیوہار اور میلے ٹھیلوں کے دلچسپ حالات قیمت عہ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

اُمید ہے کہ اربابِ ذوق اور تاجرانِ کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون کریں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی ، لاہور ، لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۳۰	نومبر ۱۹۳۸ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

۱-	اسلام آزادی اور خوش حالی	ــــــــــ	۳۸۱
۲-	ہندوستانی تمدن و تہذیب	ــــــــــ	۳۹۱
۳-	معاشی ترقی کی مختلف منزلیں	ــــــــــ	۳۹۶
۴-	اسلام میں ملکیت ذاتی پر پابندیاں	آنریبل مشیر حسین قدوائی	۴۱۵
۵-	نقشہ کے مطابق شہر بسانا	ــــــــــ	۴۲۹
۶-	سیاسی تعلیم	ــــــــــ	۴۳۶
۷-	تعلیم اور کھیل	سید عروج الحسن صاحب استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ	۴۴۴
۸-	اردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات پر ایک نظر	جناب احمد علی صاحب علوی متعلم جامعہ	۴۵۰
۹-	رفتار عالم	م - م	۴۶۶
۱۰-	تنقید و تبصرہ	ــــــــــ	۴۷۲

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو صدمہ جانکاہ!

۲۹ اکتوبر [illegible] صبح کو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے والد بزرگوار سید صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم مذہب، تاریخ اور ادب کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے بھی خوب دلچسپی تھی اور تاریخ نکالنے میں بڑا زبردست ملکہ تھا۔

[illegible] سال کی شکایت تقریباً بیس سال سے تھی لیکن گذشتہ تین مہینوں سے اس شکایت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مرحوم کی عمر ستر (۷۰) سال کی تھی۔ دہلی میں انتقال فرمایا وہیں تجہیز و تکفین کے مراسم ادا کئے گئے جس میں شہر کے عمائدین اساتذہ و طلبہ جامعہ نے شرکت کی۔

ہم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے اس صدمہ عظیم میں دلی شرکت کرتے ہیں اور خدا سے دست بدعا ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور ڈاکٹر صاحب موصوف اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

(آمین)

اسلام آزادی اور خوش حالی

(از محمد عاقل صاحب ایم۔اے۔ استاد معاشیات جامعہ)

چین کے مشہور رہنما ڈاکٹر سن یات سین نے چینیوں کے سیاسی نصب العین کو مختصر طور پر تین لفظوں میں بیان کیا تھا قومیت، جمہوریت اور روزی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کو بھی اسی طرح تین لفظوں میں مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اسلام، آزادی اور خوش حالی۔ میں اپنے مفہوم کو سمجھانے کے لئے ان تینوں اصطلاحوں پر الگ الگ [illegible] بیان کروں گا۔

اسلام اسلام کو میں نے قصداً سب سے اول رکھا ہے۔ کیونکہ اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے ہندوستان میں ابھی تک آبادی کے ایک بہت کثیر حصے کی زندگی پر مذہب کا کوئی نہ کوئی اثر قائم ہے۔ اس میں شک نہیں مذہب کا اعلیٰ تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ توہم پرستی اور تعصب نے مذہب کو ایک تعمیری اور اصلاحی قوت کی جگہ ایک تخریبی اور قدامت پسند قوت بنا دیا ہے۔ مذہب ترقی کی قوتوں کا ہر اول بننے کی جگہ رجعت اور استفاع ناجائز کی قوتوں کا آلہ کار بن گیا ہے۔ مذہب کے اعلیٰ جذبہ سے صحیح کام لینے کی جگہ غلط کام لیا جا رہا ہے۔ مارکس کے الفاظ میں مذہب کو ایک نشہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جس سے قوائے عمل یا تو مضمحل و بے کار ہو جاتے ہیں یا کجروی اور گمراہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات، مذہب کے نام پر انسانی جانوں کی قربانی اور آئے دن کی شر انگیزی اور فتنہ پروری یہ سب مذہبی گمراہی کے نتائج ہیں۔ جب میں مذہبی زندگی کی حمایت کرتا ہوں تو میرے پیش نظر مذہب کا یہ تصور ہرگز نہیں ہوتا۔ اس مذہب کی مخالفت میں تو میں کارل مارکس سے بھی دو قدم آگے بڑھنے کو تیار ہوں۔ میں دین کو اپنا نصب

مذہب کی روح کو چھوڑ کر اس کے الفاظ پر اصرار، اور لفظی اختلافات پر فرقہ بندی اور ہنگامہ خیزی اور قوم کی قوتوں کو بے کار اور مہمل مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر کے ضایع کرنا ان چیزوں کو میں مذہبی خدمت نہیں بلکہ مذہب کے ساتھ دشمنی سمجھتا ہوں۔

لیکن مذہب کا ایک دوسرا تصور بھی ہے جو ہر چند فی الحال مفقود اور معدوم ہے لیکن جسے ایک زندہ اور فعال قوت بنایا جاسکتا ہے۔ مذہب کا یہ تصور وہ ہے جو فتنہ کی جگہ امن پیدا کرتا ہے، زخموں پر مرہم رکھتا ہے، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتا ہے، محبت اور ایثار کے اعلےٰ ترین معیاروں کو قائم کرتا ہے۔ جس سے بنی نوع انسان کی یکجہتی، اتحاد اور باہمی انحصار کا احساس تیز ہوتا ہے۔ جو موجودہ محدود اور نامکمل زندگی کے مقابلہ میں ایک زیادہ مکمل اور وسیع تر زندگی کی اُمید قائم کراتا ہے۔ جو انسانی قوتوں کے پوشیدہ امکانات کی ترقی کے بارے میں ایک راسخ عقیدہ رکھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ جو فانی، گمراہ، جاہل اور مجبور انسان کو ایک ازلی اور ابدی، علیم و بصیر، مختار و مقتدر قوت سے وابستہ کر کے اس کے حوصلوں کو بلند، اس کے عزائم کو پختہ اور اُس کی کوششوں کو وسیع بنا دیتا ہے۔ مذہب کی یہ اور اسی طرح کی اور بہت سی دوسری خدمات ہیں جن کی وجہ سے میں مذہبی زندگی کی حمایت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مذہبی زندگی کو جو بنیادی اہمیت ابھی تک حاصل رہی ہے وہ آئندہ بھی اُسے حاصل رہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مذہب کا مفہوم وہ نہ لیا جائے جس کا اس وقت غلبہ ہے اور جو ہماری پستی اور بدنصیبی کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

مذہب کی اہمیت پر ایک عام تبصرہ کرنے کے بعد میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں اسلام کو کیوں بنیادی اہمیت حاصل رہنا چاہئے۔ اسلام، مسلمانوں کی کشتی کا بادبان، ان کے جہاز کا انجن اور ان کے تمام اجتماعی اعمال و افعال کا محرک ہے۔ اسلام کی تعلیمات، مسلمانوں کو پست خود غرضیوں، ذاتی فایدوں اور انفرادی لالچوں سے بلند کر کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے قربانیاں کرنا سکھاتی ہیں۔ اسلام کی تاریخ ان کے اندر اعتماد اور حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ دنیا میں اخلاقیات اور فلسفہ کے بہت سے نظام پیش کئے گئے ہیں لیکن اسلام

کی اخلاقی تعلیم اور فلسفہ نے جیسی قوت عمل اپنے ابتدائی پیروؤں میں پیدا کی تھی اس کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ پھر تاریخ اور روایات کی وابستگیاں زبان، ادب اور تمدن و معاشرت کے رشتے اتنے قریبی اور شدید ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کو ان سے جدا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ہر جماعت کی چند خصوصیات ہوتی ہیں جو اُسے دوسری جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں اور جو اس کی زندگی کے لئے بنیاد کا کام انجام دیتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی بنیاد ان کا مذہب ہے۔ اسلام کے بغیر ہندوستان کے مسلمانوں کا تصور قائم کرنا مشکل ہے۔ اسلام اُن کی زبان اُن کے ادب، اُن کی سیرت، ان کی اجتماعی اور تمدنی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور اس کا اس طرح حاوی ہونا ہندوستانی قومیت کے لئے مضر نہیں بلکہ بہت زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے۔ اسلام نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذاتی فایدوں اور انفرادی زندگی کے تحفظ کے مقابلہ میں نصب العین کے لئے جان و مال کی قربانی کرنا خوب اچھی طرح سکھلا دیا ہے۔ اسلام کی حفاظت اور عزت کے لئے جاہل اور غریب مسلمان بھی اپنی جان تک کی بازی لگانے میں تامل نہیں کرتے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی یہ قربانیاں اسلام کی لفظی حفاظت کے لئے صرف کی جاتی ہیں اسلام کی روح کی حفاظت کے کام سے وہ بیچارے ناواقف ہیں۔ لیکن اگر اسلام کی روح کی حفاظت کے لئے ان کی سرفروشی کو استعمال کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ جاہل اور غریب مسلمان جن پر آج مذہبی دیوانگی کا الزام لگایا جاتا ہے کل ہندوستان کی ترقی پسند قوتوں کے لئے ایک نہایت جاں نثار فوج بن سکتے ہیں۔ ضرورت اسلام کے صحیح تخیل کو عوام تک پہنچانے کی ہے۔ جب یہ تصور مسلمانوں میں عام طور پر پھیل جائے گا تو ان کی وہ پوشیدہ قوتیں جو اس وقت سوئی ہوئی ہیں یا غلط راہوں پر پڑ کر انتشار اور افتراق کا موجب بنی ہوئی ہیں، بیدار اور مجتمع ہو کر وہ زبردست کام انجام دیں گی جن کی مثال دنیا نے آج تک کبھی نہیں دیکھی ہے۔

جو لوگ اسلام کی جگہ اور دوسرے محرکات کو مثلاً قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو بیدار کر کے مسلمانوں سے کام لینا چاہتے ہیں ان کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ایک طاقت ور انجن کی جگہ

ایک کمزور انجن سے مشین کو چلانا چاہتے ہیں۔ وہ کم ہمت ہیں زیادہ طاقتور انجن کو چلانے سے ڈرتے ہیں، اس لئے ایک کمزور انجن سے فایدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ طاقتور انجن موجود ہے اور ان کی کوششوں سے آسانی کے ساتھ توڑا نہیں جا سکتا اس لئے اگر اس انجن سے وہ کام نہ لیں گے تو یہ انجن ترقی کی دشمن قوتوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا اور وہ اسے ان کے خلاف استعمال کر کے ان کی قوت کو کمزور کرتے رہیں گے۔

وہ لوگ اس کا جواب شاید یہ دیں کہ ایک ہی سمت میں چلنے والا ایک کمزور انجن مخالف سمتوں میں چلنے والے کئی طاقتور انجنوں سے زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ کمزور انجن تو بہر حال آگے کی طرف ہی بڑھے گا لیکن مخالف سمتوں میں چلنے والے کئی طاقتور انجن ایک دوسرے کی قوت کو کمزور کرتے رہیں گے اور ترقی یا تو بالکل نہیں ہوگی یا بہت آہستہ آہستہ ہوگی یا اگر ایک وقت میں باہمی اتحاد کی وجہ سے ترقی زیادہ ہو جائے گی تو دوسرے وقت میں باہمی نفاق کی وجہ سے دوبارہ بہت پیچھے ہٹنا پڑے گا یہ اعتراض صحیح ہو سکتا ہے اگر مذہب کا موجودہ تنگ نظری پر مبنی تصور قائم رہے لیکن اگر اس کی جگہ مذہب کے ایک زیادہ بلند اور وسیع تصور کے پھیلانے کی کوشش کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض باقی نہیں رہے گا اور اس صورت میں ہم ہندوستان کی آبادی کے اندرونی رجحانات اور بنیادی میلانات کو پوری طرح تکمیل کا موقع دیتے ہوئے انھیں اجتماعی ترقی کے مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں گے۔

پھر قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو دو طریقہ پر محرک بنایا جا سکتا ہے۔ یا تو اسے مذہبی جذبہ کا حریف اور بدل بنانے کی کوشش کی جا سکتی ہے یا اس کو ایک زاید محرک کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مجھے دوسری صورت پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ حقیقتاً میں نے اپنا یہ مضمون جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے اسی مقصد کی حمایت میں لکھنا شروع کیا ہے۔ میں اسلام، آزادی اور خوش حالی تینوں محرکات سے فایدہ اٹھانا اور ان تینوں نصب العینوں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو مذہب کا بدل یا حریف بنا کر پیش کیا گیا تو مشین کے چلنے میں وہی دقت پیدا ہو جائے گی جس کا ذکر ابھی اوپر کیا جا چکا ہے یعنی کئی طاقتور انجن مشین کو مختلف سمتوں میں کھینچنا

شروع کر دیں گے اور مشین آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

مندرجہ بالا تمام امور کے پیش نظر میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست میں اسلام کو ضرور بنیادی حیثیت حاصل ہونا چاہئیے اور ایسی تمام کوششیں جو متحدہ قومیت کا نام لے کر یا معاشی سوال کو نمایاں کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلام سے ہٹاتی ہیں بالآخر خود ہندوستان کی ترقی کے لئے سخت مہلک ثابت ہوسکتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس قسم کی کوششوں کا مقابلہ کرنا چاہئیے اور اس سلسلہ میں جن تحفظات کی وہ ضرورت محسوس کریں ان کے حصول کے لئے اپنی پوری جدوجہد کو جاری رکھنا چاہئیے۔

اس نصب العین کے حصول کے لئے انھیں کس قسم کی کوششیں کرنا چاہئیے۔ آیا مسلم لیگ کی طرح کا ایک ادارہ قائم رکھنا چاہئیے جو سیاسی اور معاشی مقاصد میں تو کانگریس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آزاد اور جداگانہ جماعتی وجود کو تسلیم کرانے پر مصر ہے یا مسلمانوں کو انفرادی طور پر کانگریس میں شامل ہو جانا چاہئیے اور جب کبھی اسلامی معاملات پیش ہوں کانگریس کے اندر ایک متحدہ محاذ بنا لینا چاہئیے اور ایسی ضمانتوں کو کانگریس سے تسلیم کرانا چاہئیے جس سے اسلامی معاملات میں یہ لوگ اپنی اقلیت کی وجہ سے بالکل مجبور اور بے بس نہ ہوں۔ ان سوالات کے جواب میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ میں یہاں اس بحث میں بڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے تحفظات کا جہاں تک سوال ہے موجودہ حالات میں' میں ان کی ضرور تائید کرتا ہوں۔

آزادی | اسلام کے بعد دوسری چیز جسے مسلمانوں کو اپنے سیاسی نصب العین میں داخل کرنا چاہئیے وہ آزادی ہے۔ میں نے آزادی کو اسلام کے بعد اس لئے رکھا ہے کہ میرے نزدیک اسلام ایک کُل ہے جس کا ایک جزو سیاسی آزادی بھی ہے۔ اسلام تمام اعلیٰ محرکات کا سرچشمہ ہے جس کی ایک شاخ آزادی بھی ہے۔ آزادی میں' میں دونوں چیزوں کو شامل کرتا ہوں۔ غیر ملکی تسلط اور انتفاع ناجائز سے آزادی نیز جمہوری طرز حکومت۔

غیر ملکی تسلط ہندوستانیوں کے قومی وقار اور عزت نفس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ کسی

قوم کو دوسری قوم کا غلام رہ کر زندگی بسر نہیں کرنا چاہئے۔ ہندوستانی قوم کی محکومیت انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ ہم اسے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کرسکتے۔ ہمارے اخلاقی احساس اور روحانی جذبہ کا ایک ایک مظہر اس کے خلاف بغاوت کے لئے آمادہ ہے۔ خود مختاری ہمارا حق ہے۔ ہم غیر ملکی حکمرانوں کی اطاعت نہیں کرسکتے۔ اگر غیر ملکی حکمراں نہایت اچھے اور ان کی حکومت ہمارے لئے بہت فایدہ رساں بھی ہوتی تب بھی ان مادی فایدوں کے معاوضہ میں ہم اپنی آزادی کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ ہم کسی قیمت پر اپنی آزادی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پھر جب غیر ملکی حکومت ہم سے ناجایز فایدہ اٹھا رہی ہے اس کی پچھلی تاریخ مہذب لوٹ کھسوٹ کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ہماری صنعتوں کی تباہی، ہمارے محاصل کی زیادتی، ہماری عدیم المثال غریبی، ہماری جہالت ہمارے دیہاتوں کی ویرانی ہمارے شہروں کی بے رونقی، حکومت کی جانب سے ہمارے آرام و آسائش کی طرف سے لاپرواہی، ہمارے عوام کی بے بسی اور ہمارے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کی گمراہی اور بے روزگاری اور ان تمام حالات کی موجودگی میں غیر ملکی حکومت کی سخت دلی اور ہماری آزادی کی تحریکوں کو دبانے اور کچلنے کی کوششیں ——— یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے الزامات سے غیر ملکی حکومت کا اعمال نامہ بالکل سیاہ ہوچکا ہے ایسی صورت میں ہم غیر ملکی حکومت سے کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔

لیکن ہماری آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم سفید دفتری حکومت کی جگہ ایک بھورے رنگ کی دفتری حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوجائیں گے۔ ہمارا مقصد جمہور کی آزادی ہے۔ سیاسی زندگی میں کوئی ایک شخص دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ اقتدار کا مالک نہیں ہوسکتا۔ قانون کی نگاہ میں سب مساوی ہونے چاہئیں، قانون کے بنانے میں سب کو شرکت کرنی چاہئے۔ ایک کا بنایا ہوا قانون اگر دوسرے پر اس کی مرضی کے خلاف عاید کیا گیا تو اس کی آزادی ختم ہوجائے گی۔ اس میں شک نہیں جماعتی زندگی میں انفرادی آزادیاں ایک نسبتی اور اضافی مفہوم رکھتی ہیں۔ یہ ایک مفاہمت اور مصالحت کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں افراد کی متفرق اور مخالف آزادیوں میں ایک ہم آہنگی اور تناسب پیدا کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے۔ افراد کے انفرادی نفس اور جماعتی نفس، وقتی مفاد اور مستقل اور دیرپا مفاد میں توازن پیدا کیا جاتا ہے اور اسی توازن کی تنظیم کا نام ریاست یا مملکت ہوتا ہے۔

آج کل کے زمانہ میں جب کہ کلّی طرز کی حکومتوں نے جمہوریت کو ایک حسین فریب کے نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا ہے اور ان ملکوں میں جہاں اس کا تجربہ کئی صدیوں سے کیا جا رہا ہے اس کی خرابیاں اور بدعنوانیاں روز بروز ظاہر ہوتی جا رہی ہیں، جمہوریت کے نظام کو پسندیدہ قرار دینے کے لئے بھی دلیلیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بلاشبہ ان تمام خوش آیند امیدوں کو جو انقلاب فرانس کے بانیوں نے اس کے ساتھ وابستہ کی تھیں پاش پاش کر دیا ہے۔ سرمایہ کی طاقت ہمارے زمانہ میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہماری تمام قانونی آزادیوں کو اپنے مسموم اثرات سے برباد کر سکتا ہے۔ سرمایہ کا گھن اندر ہی اندر ہماری آزادیوں کو کھاتا رہتا ہے۔ جمہوریت کا ظاہری فریب قائم رہتا ہے اور پردہ کے پیچھے سے سرمایہ دار جس طرح چاہتے ہیں سیاسی کٹ پتلیوں کو نچاتے رہتے ہیں۔ تعلیم اور پروپگنڈا کی مشین پر پوری طرح ان کا قبضہ ہوتا ہے اپنی ہشیاری اور چالاکی سے یہ لوگ سب کام اپنے مطلب کے موافق کرا سکتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو تنظیم دیتے ہیں۔ انتخابات پر پورا اقتدار رکھتے ہیں۔ لالچ، دھمکی اور دھونس کے ذریعہ ذلیل اور ادنیٰ درجہ کے وقتی جذبات کو بھڑکا کر اپنے پٹھوؤں کو منتخب کرا لیتے ہیں اور اس طرح حکومت کی پوری مشین پر اپنا تسلط قائم کر لیتے ہیں۔ مغربی جمہوریتیں دراصل سرمایہ داروں کے اقتدار مطلق کا دوسرا نام ہیں۔ جمہوری نصب العین کی اس گمراہی اور خرابی کو دیکھ کر تو بلاشبہ جمہوریت کی طرف سے ایک تنفر اور حقارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن کلیت پسند ریاستوں کے کارناموں اور ان کے حکمرانوں کی کارگزاریوں سے بھی طبیعت میں کوئی اطمینان کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اقتدار کو اگر مطلق رکھا جائے تو اس کو غلط طریقہ پر استعمال کرنے کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کسی انسان کو غلطی اور خطا سے پاک نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہر ریاست میں حکمرانوں کو ان کی غلطی سے متنبہ کرنے والے لوگ موجود ہونے چاہئیں اور اپنی پالیسی کی ناکامی کی صورت میں حکمرانوں کو اقتدار کی جگہوں سے علیحدہ کرنے کے لئے صرف خونی

انقلاب کا ہی راستہ کھلا ہوا نہ ہونا چاہیئے بلکہ امن وامان کے ساتھ ایک حکمراں کی جگہ دوسرے حکمراں کو مقرر کرنے کا امکان ہونا چاہیئے۔ موجودہ آمروں کے جانشینوں کا مسئلہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ آج جو لوگ یورپ کے ڈکٹیٹر بنے ہوئے ہیں ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ کوئی شخص لے سکے گا یا نہیں اور ان کے زمانہ میں جو ملک کو ترقی ہوئی ہے اُسے جاری رکھا جا سکے گا یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ جمہوریت میں اس قسم کی کوئی مشکلات نہیں ہیں۔ اگر سرمایہ کے اقتدار کو کم کیا جا سکے اور تقسیم دولت میں زیادہ مساوات پیدا کی جا سکے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جمہوریت آمریت کے مقابلہ میں کیوں زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب جمہوریت کو اُن نئی تدبیروں کے ساتھ اختیار کیا جائے جن کے ذریعہ سے اقلیت کو اپنی آواز کو موثر بنانے کے لئے کافی مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔

<u>خوش حالی</u> آزادی کے بعد تیسری چیز جسے مسلمانوں کو اپنے سیاسی نصب العین میں داخل کرنا چاہیئے وہ خوش حالی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا آزادی کو معاشی مساوات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ . . . . . . اگر خوش حالی ایک خوش نصیب اقلیت تک محدود نہ ہوگی بلکہ آبادی کی کثیر اکثریت اس میں پورے طور پر شریک ہوگی تو جمہوریت کی وہ خرابیاں جو معاشی محکومیت اور مجبوری اور تعلیم و تہذیب کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پیدا نہ ہو سکیں گی۔

ہندوستان میں جس بھیانک قسم کی غریبی اس وقت پائی جاتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو غریبی کو دور کرنے کے مقصد کو مسلمانوں کے سیاسی نصب العین میں اول جگہ ملنا چاہیئے تھی۔ لیکن سوال انفرادی غریبی کے دور کرنے کا نہیں ہے۔ سوال نفع ذاتی اور خود غرضی کا نہیں ہے۔ سوال کل جماعت کی آیندہ خوش حالی کے لئے اجتماعی کوشش کرنے کا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ غریبی کا علاج صرف اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب نہایت بڑے پیمانہ پر ہماری آبادی ایثار اور قربانی کے لئے آمادہ ہو۔ یہ قربانی فوری اور ذاتی نفع کے لئے نہ کی جائے بلکہ مستقبل کے اجتماعی اور دائمی فایدہ کے لئے کی جائے۔ سب سے اول تو ہمیں آزادی کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں

کرنا پڑیں گی لیکن ہماری قربانیوں کا سلسلہ آزادی کے حصول کے بعد ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ پہلے سے
بھی زیادہ صبر آزما اور حوصلہ فرسا طریقہ پر شروع ہوگا۔ آزادی کے حصول کے بعد اس کا پورا امکان
پیدا ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندر جاہ و اقتدار کے حصول کے لئے رقابتیں پیدا ہو جائیں۔ ہم اپنی قربانیوں
کا فوری معاوضہ طلب کرنے لگیں۔ ہمارا احساس فرض اور ضبط و تنظیم کمزور ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ
ہندوستان کے لئے بڑی بدنصیبی کا دن ہوگا۔ کیونکہ ہماری تعمیر نو کا کام بہت سخت ہے۔ ہماری
جیسی غربی اور محرومی کی دنیا میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس کی کوئی تھاہ اور انتہا نہیں ہے۔ غربی اور
محرومی کے اس گہرے گڑھے کو پاٹ کر اپنی آبادی کو مہذب ملکوں کی خوش حالی کی سطح پر لانا آسان
کام نہیں ہے۔ ہمیں پہاڑوں کو توڑنا ہے۔ دریاؤں کو سدھانا ہے۔ جنگلوں میں اپنے مطلب کی
چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے مارا مارا پھرنا ہے۔ ہمیں مشینوں کو کھڑا کرنا ہے ہمیں بجلی کی طاقت
کو پیدا کرنا ہے۔ ہمیں کارگذار مزدوروں، صنعتی ماہروں، مالی رہنماؤں اور منتظموں کو پیدا کرنا ہے۔ ہمیں
اپنی تندرستی کو بہتر بنانا ہے، اپنے تعلیمی نظام میں اصلاح کرنی ہے۔ اپنی سیرت میں بنیادی تبدیلیاں
پیدا کرنا ہے۔ ہمیں عملی محرکات میں تیزی پیدا کرنا ہے۔ ہمیں کاموں کو ولولے، جوش، امنگ اور
ہما ہمی کے ساتھ ایک طویل مدت تک جاری رکھنا ہے۔ جب ہم یہ سب کام کریں گے تب ہی اپنی
آبادی کو خوش حال بنا سکیں گے۔ کم اجرت پر زیادہ عرصہ تک سخت محنت کے کام ایمانداری اور
احساس فرض کے ساتھ کرنے کے لئے ایک نہایت قوی محرک کی ضرورت ہے اور وہ قوی محرک
مذہب کا ہی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے خصوصاً اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ میں حوصلہ اور
امنگ کا ایک لازوال سرچشمہ موجود ہے۔ اسلام کے غازی اپنے نصب العین کی اشاعت کے
سلسلہ میں کوہ و بیابان، دریا اور سمندر پر مارے مارے پھرتے تھے۔ گھر بار، عزیز اقربا سب سے
بے نیاز ہو کر ان کا ہر قدم آگے کی سمت بڑھتا تھا۔ جان کی انھیں پروا نہیں تھی، ان کی متاع، اُن کا
اوڑھنا بچھونا صرف ان کا ایمان ہوتا تھا۔ وہ اسلام کے نام کو روشن کرنے اور توحید کی اشاعت کرنے
کے لئے زندہ رہتے تھے۔ اپنے نصب العین کے لیے جن کوششوں اور کامیابیوں کا نمونہ مسلمانوں نے

پیش کیا ہے تاریخ اس کی مثالیں کم پیش کر سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں میں مذہب کا صحیح جذبہ پھر بیدار ہو جائے اور وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے موجودہ زمانہ میں ان کے فرائض کیا ہیں انھیں ترقی کی کن راہوں پر سفر کرنا ہے، انھیں کس قسم کے دشمنوں کو زیر کرنا ہے، ان کے جہاد کی منزل مقصود اب کیا ہونا چاہیے۔ انھیں نئے حالات میں کس قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرنا چاہیے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ معاشی سیاسی اور تمدنی تعمیر نو کے کام میں مسلمان آج بھی اپنے ایمان کی برکت سے سب قوموں سے آگے رہ سکتے ہیں۔

غرض کہ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کو تین لفظوں میں مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے ہم اسلام کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ ہماری زندگی اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ البتہ اسلام پر قائم رہتے ہوئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے ملک کو غیروں کی محکومی سے آزاد کرائیں ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قائم کریں اور ملک کے افلاس اور غریبی کے مسئلہ کو حل کرنے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ کوشش کریں

ہندوستانی تمدن وتہذیب

(از محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ استاد معاشیات جامعہ)

موہنجوداڑو اور ہڑپا کے آثار قدیمہ کے انکشاف نے ہندوستان کی تمدنی زندگی کو دنیا کے قدیم ترین تمدنوں کے زمرے میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے تمدن کی جو خصوصیت اسے دنیا کے دوسرے تمدنوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا تسلسل ہے۔ اس خصوصیت میں چین کے علاوہ ہندوستان کا کوئی دوسرا سہیم و شریک نہیں ہے۔ آریوں کی آمد کے بعد سے تو یہاں کی تمدنی زندگی ایک ایسی زنجیر میں منسلک معلوم ہوتی ہے جس کی کوئی کڑی غائب نہیں ہے اس لئے ہندوستان کے عمرانی مسائل کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں پانچ ہزار[۵۱] یا کم از کم چار ہزار سال کی تاریخ کے پس منظر کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

مغرب کے ان ملکوں میں جو آج تہذیب جدید کے علمبردار ہیں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس کے تمدن کی تاریخ ہندوستان کے برابر قدیم ہو۔ تمدن کے وہ معیار[۵۲] جنھوں نے ہندوستان میں بودھ عہد

---

۵۱ مقابلہ کے لئے سر جان مارشل کی تصنیف Mohenjo-doro and the Indus civilisations کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔ "پانچ ہزار سال قبل جب کہ آریوں کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا، پنجاب اور سندھ میں ایک نہایت ترقی یافتہ اور نمایاں طور پر یکساں تمدن پایا جاتا تھا جو مصر اور بابل و نینوا کے ہم عصر تمدنوں سے بہت سی باتوں میں مشابہ بلکہ بعض اعتبارات سے اعلیٰ اور افضل تھا۔"

۵۲ مقابلہ کے لئے The Periplus of the Erythrean Sea. کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔ "پہلی صدی عیسوی میں جو مال ہندوستان سے دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا تھا اس میں گرم سالے (مثلاً سیاہ مرچ اور ادرک) مصنوعات (مثلاً مختلف قسم کے سوتی اور ریشمی

میں یعنی آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل ایک عام شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی اور جنھوں نے یہاں کی معاشی اور معاشرتی زندگی کو اس نہج پر ڈال دیا تھا جس پر خفیف رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کے بعد ہندوستان آج بھی بڑی حد تک قائم ہے، ان سے یورپ کے جدید ترقی یافتہ ملک نہایت قریبی زمانہ تک ناواقف تھے۔ مغربی تمدن کو عروج صنعتی انقلاب کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ لیکن صنعتی انقلاب کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زاید نہیں ہے اور اس کی وجہ سے مادی راحت و آسائش کے جو بلند معیار پیدا ہوئے ہیں ان کے رواج کی مدت زیادہ سے زیادہ اسی پچاسی سال متعین کی جا سکتی ہے اور وہ بھی مغرب کے سب ملکوں اور طبقوں کے لئے نہیں بلکہ صرف چند رہنما ملکوں اور ان کے اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے لئے وہاں کے غربا کی حالت، مادی اشیا کی کثرتِ پیداوار کے باوجود اب بھی کچھ بہت زیادہ قابل تعریف نہیں ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ گذشتہ نصف صدی سے بلند معیاروں کو روز افزوں وسعت اور ہمہ گیری حاصل ہو رہی ہے۔ اس جدید تہذیب کی وہ خصوصیات جو اسے اپنی تمام پیشرو تہذیبوں سے ممتاز کرتی ہیں ہندوستانی تمدن کی قدامت کے مقابلہ میں بہت زیادہ حال کی چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں ایک طرح کی حقارت سی پائی جاتی ہے۔

(بسلسلہ صفحہ سابق)

کپڑے، لوہے اور فولاد کی چیزیں) دوائیں، عطر و خوشبوئیں، موم روغن اور رنگ شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایسی چیزیں بھی برآمد کی جاتی تھیں جنھیں ہندوستانی کپڑے کے معاوضہ میں ابتداءً چین سے درآمد اور بعد میں دوبارہ مشرق کی طرف برآمد کیا جاتا تھا مثلاً ریشم، چینی مٹی کی چیزیں اور گرم مسالے۔ پھر اشیاء غذا بھی جن میں چاول شامل تھے تھوڑی تھوڑی مقداروں میں قرب و جوار کی بندرگاہوں کو برآمد کی جاتی تھیں اور اس تمام برآمد کے معاوضہ میں ایک طرف تو ہندوستان میں چاندی اور سکے درآمد کئے جاتے تھے اور دوسری طرف فوجی ضرورت اور آسائش کے لئے ایران سے گھوڑے، مختلف دھاتیں (مثلاً ٹین، سیسہ اور تانبا) اور عیش و عشرت کے سامان اور نادر چیزیں درآمد کی جاتی تھیں۔"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

تمدن وتہذیب کا جب نام لیا جاتا ہے تو اس کے سنتے ہی ہندوستانیوں کی نگاہ کے سامنے زندگی کی چند نہایت خوشگوار، فرحت بخش اور دلفریب تصویریں گردش کرنے لگتی ہیں۔ دودھ اور مکھن کی افراط، غلہ کے لہلہاتے ہوئے کھیت، پھلوں سے لدے ہوئے باغ، خوش نما ترکاریاں، خوش رنگ پھول، خوش الحان پرند، مور اور ہرن، شاداب اور سایہ دار درخت، دیہات کے سادہ اور خوش وضع مکانات، مندر اور پختہ تالاب، مسجدیں اور حوض، نہریں، کنوئیں اور باولیاں، ساون کی برسات کی لطف اندوزیاں جھولے اور گیت، دنگل اور کشتیاں، پوجا پاٹ بھجن اور کتھائیں، وعظ اور مولود، عید کی نمازیں، ہولی دیوالی، تہوار تقریب اور مہمانداری، عبیر و گلال، رنگ اور خوشبوئیں، پھول اور گجرے، حلوا پوری اور مٹھائیاں، بریانی، قورمہ اور شیرمال، یاترا تیرتھ اشنان اور عرس کے مقدس مقامات، دلکش وادیوں اور کہساروں، چشموں اور دریاؤں تک رسائی، بازاروں میلوں اور نمائشوں کی رنگینیاں اور دلچسپیاں، چہل پہل، مسرت اور شگفتگی، صحت اور زندہ دلی، مصنوعات کی گوناگوں بوقلمونی، ان کا حسن اور کمال، پتھر، مٹی، لکڑی، دھات، شیشہ اور بلور کی مورتیاں، ظروف اوزار ہتھیار اور سامان، ان کی موزوں اور مناسب شکلیں، ان پر پھول بوٹے، نقش و نگار، قسم قسم کے سوتی اونی ریشمی کپڑے، ساڑیاں اور

(بقیہ صفحہ سابقہ) اشیار تجارت کی مندرجہ بالا فہرست کا مقابلہ جب اس فہرست سے کیا جاتا ہے جو مورلینڈ نے اپنی کتاب India at the death of Akbar کے ص ۱۹۷ پر دی ہے تو دونوں میں بڑی حد تک بنیادی مشابہت نظر آتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں بھی ہندوستان کی معاشی زندگی کی تنظیم کم و بیش وہی تھی جو عہد قدیم میں پائی جاتی تھی۔

اسی سلسلہ میں رادھا کمد مکرجی کی کتاب A History of Indian Shipping کے ص ۹۲ و ص ۱۲۶ کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں انھوں نے ان اشیار کو بیان کیا ہے جو ہندوستانی جہازوں میں لاد کر قدیم زمانہ میں فنیشیوں، یہودیوں، اسیریوں، یونانیوں، مصریوں اور رومیوں کو روانہ کی جایا کرتی تھیں۔

دھوتیاں، قالین، جانمازیں، ان کی بناوٹ کی دلفریبیاں، ان کی رنگ برنگ چھپائیاں، ان پر سونے چاندی کے زرق برق کام، کشیدہ اور کارچوب کی دیدہ زیب کارفرمائیاں، لباس اور پوشاک کا تنوع، تخت، چھپرکھٹ، کھٹولے، صوفے، مسہریاں، گلاس، کٹورے اور صراحیاں، عطردان اور گلاب پاش، چھوٹے سینگ اور ہاتھی دانت کی خوش وضع چیزیں۔ سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی عالیشان مسجدیں، مقبرے، قلعے اور محلات، ان کے کتبے۔ ان کی جالیاں، ان کی مینا کاری اور پچی کاری کے کام، مندر اور ان کی مورتیاں، فوارے، حمام اور ساون بھادوں، چمن اور روشیں۔ کافوری شمعیں اور شمعدان، مشعلیں اور آتش بازیاں، طبلہ، سارنگی، ستار، نوبت نفیری، سنکھ، ہاتھی گھوڑے، رتھ، پالکیاں۔ راجہ مہاراجہ بادشاہ نواب، شہزادے راجکمار، بیگمیں اور شہزادیاں وزیر امیر سپہ سالار، پنڈت پروہت شاستری، گرو سنیاسی، عالم صوفی، پیر فقیر، ساہوکار، تاجر، سوار پیادے۔ تاج پوشی۔ سالگرہ بیاہ اور برات کی تقریبیں۔ امن اور چین۔ رواداری، محبت اور وفاداری۔ ایمانداری نیکی اور پاکبازی، مروت خلوص اور باہمی امداد، ایثار اور قربانی، مذہبی پابندی، روحانی ترقی، علم و فلسفہ کا عروج۔ شاعری ڈراما اور ادب کی دوسری اصناف کا کمال ——— غرض کیسی کیسی تصویریں ہیں جو سنما کے فلم کی طرح نگاہ کے سامنے متحرک نظر آنے لگتی ہیں۔ ہمارے شاعر، ہمارے ادیب، ہمارے فلسفی، ہمارے سائنس داں، ہمارے سیاسیات اور معاشیات کے ماہر ——— سب پر "ہندوستانی تمدن و تہذیب" کے نام سے ایک شعری اور رومانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس اصطلاح کی یہی وہ افسانہ خیزیاں ہیں جو ہمارے ذہن پر ایک نشہ کی طرح چھا جاتی ہیں اور اکثر ہمارے ذہنی توازن کو بگاڑ دیتی ہیں۔ ہم اپنی موجودہ حالت کو بھول جاتے ہیں۔ ہم ایک دوسری ہی دنیا میں ہوتے ہیں جسے ہماری موجودہ پستی اور ذلت سے کوئی دور کا تعلق نہیں ہوتا۔ اس خود فریبی اور مدہوشی کے عالم میں ہمیں اپنی خراب اور بدنما چیزیں بھی حسن و خوبی کا شاہکار نظر آنے لگتی ہیں۔ ہم ہر چیز کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ کسی چیز کو ذرا سی ٹھیس لگتی ہے تو ہمارا دل دکھنے لگتا ہے۔ اس کی مدافعت کے لئے ہم دل و جان لٹا دینا چاہتے ہیں۔ اگر اصلاح و ترمیم کے علاوہ کوئی چارۂ کار نظر ہی نہیں آتا تو ہم چاہتے ہیں کہ تبدیلی کم سے کم کی جائے۔ ہمی کی زندگی کا

ایک خیالی مکمل خاکہ ہمارے سامنے ہوتا ہے اور حال کو اسی ماضی کی طرف واپس لے جانے کی سعی کی جاتی ہے اس بات کی خاص طور پر احتیاط کی جاتی ہے کہ کوئی ایسی اصلاح اور ترقی نہ ہو جو ماضی کے اس مکمل معیار سے علیحدہ کرنے والی ہو اور جس سے روایتی نظام معاشرت میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہو جائے۔ اجازت صرف اس بات کی ہے کہ ادھر اُدھر جہاں جہاں ضرورت ہو سہارا اور ٹیک لگادی جائے تاکہ ہمارے یہ دلفریب آثار قدیمہ جوں کے توں باقی رہ سکیں۔ موجودہ عمارت کو گرا کر نئی عمارت کے تعمیر کرنے کے خیال سے، ہمارے دل میں جس قسم کی نفرت، بیزاری اور ہیبت طاری ہوتی ہے اس کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ اسے ہم گناہ عظیم، زبردست غداری اور دغا بازی، انتہائی ناعاقبت اندیشی اور کم ظرفی، نادانی اور جہل، چھچھورے پن، مغربی نقالی اور کورانہ تقلید سے تعبیر کرتے ہیں۔ مغرب اور مشرق کے خیالی مقابلہ میں مغرب کو ہمیشہ شکست اور مشرق کو ہمیشہ فتح حاصل ہوتی ہے۔ مغرب کی تمام چیزیں سطحی اور ملمع کاری معلوم ہوتی ہیں۔ مشرق کے گہرے اور بنیادی حقائق پر مبنی نظر آتی ہیں۔ مغرب کی چیزیں آنی اور فانی، متلوّن اور ناپائدار، بدنما اور غیر شعری، معصیت اور شیطنت سے لبریز، مشرق کی دائم و قائم، مستقل اور مستحکم، خوش نما اور دل آویز، معصوم اور ملکوتی معلوم ہوتی ہیں۔

یہ جذبات اور کیفیات ہیں جو "ہندوستانی تمدن و تہذیب" کے نام سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن محض جذبہ پرستی اور مرثیہ خوانی سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شعریت اور رومانیت سے علیحدہ ہٹ کر علمی تحقیقات کی روشنی میں "ہندوستانی تمدن و تہذیب" کے اس قدیم اور روایتی تخیل اور اس کی موجودہ عملی یادگاروں کا تجزیہ اور جن معاشی اور معاشرتی اداروں پر یہ قائم ہیں ان پر آزادانہ تنقید و تبصرہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کس حد تک یہ نظام اپنی موجودہ اصلاح شدہ حالت میں نئے زمانہ کی ضرورتوں یا مطالبوں کے پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

معاشی ترقی کی مختلف منزلیں

(از ایڈیٹر)

معاشی ارتقا کا علم ترقی کی چند منزلوں کو متعین کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان منزلوں میں سے ہر منزل کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہونا چاہیئے کہ اس میں انسان کی قوتوں میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اضافہ نظر آئے اور قوائے فطرت پر اس کا تسلط پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتا جائے اور اس کا اظہار اس طرح پر ہو کہ انسان کو دولت حاصل کرنے میں پہلے کے مقابلہ میں کم محنت کرنا پڑے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے معاشی ترقی کو یقینی طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔

معاشی زندگی کی ترقی کی راہیں بہت سی ہیں اس لئے اس کی منزلیں بھی مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان منزلوں کو متعین کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں تین قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں یا تو لوگوں نے ضمنی باتوں کو اصلی سمجھ لیا ہے یا ان کی توجیہات اس قدر ناقص و نامکمل ہیں کہ وہ بے کار ہو گئی ہیں یا اس قدر عام ہیں کہ بہت ناکافی اور مبہم بن گئی ہیں۔ مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائیگی۔

(۱) پہلی قسم کی غلطی کی مثال تو وہ ہے جس میں معاشی زندگی کی ترقی کو تین دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بارٹر کا دور۔ زر کا دور اور اعتبار کا دور۔ پہلے دور میں لوگ اپنی زاید اشیا کا مبادلہ زر کے ذریعہ کرتے تھے، دوسرے میں تجارت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے زر کی ایجاد ہوئی اور تیسرے میں زر کی رسد میں اعتبار کو رواج دے کر اضافہ کیا گیا۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں لیکن یہ سب ظاہری باتیں ہیں ان سے گہرائی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ علت کیا ہے اور معلول کیا ہے۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ تبدیلیاں کیوں واقع ہوئیں اور نہ ان سے صنعتی تنظیم کی ان بنیادی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے جن کی یہ تبدیلیاں ظاہری شکلیں ہیں۔ اسی ڈھنگ کی ایک اور دوسری تقسیم ہے جس میں معاشی زندگی کی ترقی کو حیوانی، نباتی اور معدنی منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دور کے بارے میں

بیان کیا جاتا ہے کہ انسان جانوروں کے تعاقب کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دوسرے دور میں زمین کے پھلوں پر اور تیسرے میں سائنس حیوانی اور نباتی غذا کی جگہ برابر کیمیاوی اشیا مہیا کر رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ بیان صحیح بھی ہو تو بھی اس سے معاشی تنظیم کے بنیادی حقائق کا اظہار نہیں ہوتا۔

(۲) دوسری قسم کی توجیہات میں وہ تمام ادھوری باتیں یا بیانات شامل ہیں جو ہر چند بذات خود صحیح ہیں لیکن نامکمل ہیں۔ مثلاً مین کا وہ مشہور قانون جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ دنیا نے رواج کی عملداری سے شروع کیا اور معاہدہ کی عملداری کی طرف ترقی کی یا اسپنسر کا قانون کہ دنیا نے عسکری معاشرت سے صنعتی معاشرت کی طرف ترقی کی۔ اسی نوعیت کا ایک اور بیان ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دنیا تین منزلوں سے گذری ہے ابتدائی منزل غلامی کی تھی دوسری سرف ڈم یعنی بیگاری کی اور تیسری آزاد مزدوروں کی۔ یا یہ کہ دنیا نے مشترکہ ملکیت سے ملکیت ذاتی کی طرف ترقی کی دو دامی نظام سے ایک داتی نظام کی طرف یا رسم و رواج سے مقابلہ کی طرف ترقی کی ہے۔ یہ سب بیانات صحیح ہو سکتے ہیں اور ایک محدود مقصد کے لئے مفید بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن معاشی ترقی کی اندرونی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ان کی اہمیت بہت کم ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی توجیہات کی نمایاں مثال وہ ہے جس میں معاشی زندگی کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی شکاری، گلہ بانی، زراعتی، تجارتی اور صنعتی ادوار۔ مگر یہ بیان غیر صحیح اور مبہم ہے۔ نہ صرف یہ کہ شکار کو پہلی منزل قرار دینا غلط ہے بلکہ منازل کی جو ترتیب قرار دی گئی ہے وہ لازمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بیان اس قدر وسیع ہے کہ اس سے موجودہ معاشی حالات کی توضیح نہیں ہوتی۔ روم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے تین منزلیں طے کر لی تھیں لیکن رومیوں کے آخری دور کی تہذیب بعض بنیادی اعتبارات کی بنا پر جدید تہذیب سے مختلف تھی۔ معاشی تاریخ کی ایسی توجیہ جو رومی سلطنت اور سلطنت برطانیہ کو ایک ہی قبیلہ کا سمجھے اس قدر وسیع النظری پر مبنی ہے کہ اس کا کوئی عملی فایدہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح کی ایک اور تقسیم وہ ہے جس میں دنیا کی تاریخ کو عہد حجر، عہد برونز (Bronze) اور عہد آہن و فولاد میں تقسیم کیا گیا ہے آہنی عہد میں اس قدر مختلف قسم کی تہذیبیں شامل ہیں کہ اس تقسیم کو محض آثاری مقاصد کے لئے مفید قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ تمام توجیہات غلط یا ناقص ہیں لیکن جدید توجیہات کو بیان کرنے سے پہلے یہ اچھا ہے کہ جو دو تقسیمیں سب سے آخر میں بیان کی گئی ہیں ان کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے کیونکہ جہاں تک معاشرت انسانی کی ابتدائی منازل کا تعلق ہے یہ تقسیمیں اگر ان کو صحیح طریقہ پر بیان کیا جائے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

ابتدائی اوزار یا صنعت کے طریقے | (۱) ابتدا میں ایک طویل زمانہ تک انسان بندروں کی طرح جنگلی پھلوں جڑوں اور بوٹیوں پر زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ بیس سے پچاس آدمیوں تک کے گروہ بنا کر ادھر ادھر گھوما کرتا تھا جیسا آج بھی آسٹریلیشیا کے بعض آدمی کرتے ہیں اور موسم اور فصلی حالات کے مطابق کبھی تو اسے کھانے کے لئے خوب مل جاتا تھا اور کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تھی۔ جہاں تک غذا کی رسد کا تعلق ہے ہر گروہ بالکل آزاد ہوتا تھا۔ مگر ابتدائی انسان کی غذا جیسا کہ اس کے دانتوں اور جبڑوں کی ساخت سے ظاہر ہوتا ہے صرف نباتی نہیں ہوتی تھی بلکہ حیوانی بھی ہوتی تھی۔ جب جغرافی حالات کی وجہ سے اس کا موقع ہوتا تھا تو وہ اپنی غذائی رسد میں ماہی گیری کے ذریعہ اضافہ کرتا تھا اور اکثر صورت میں وہ مردم خوری کو بھی جائز سمجھتا تھا اور یہ مردم خوری صرف دشمنوں تک محدود نہیں تھی بلکہ اپنے گروہ کے بڈھے اور بے کار آدمیوں کو بھی کھا لیا جایا کرتا تھا۔

(۲) جڑوں کی تلاش کے دور کے بعد تو نہیں کہنا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے بعض حصوں میں جہاں شکار کی کثرت تھی شکاری دور بھی شروع ہو گیا۔ لیکن اس کے لئے اوزاروں میں تھوڑی بہت ترقی لازمی ہے۔ انسان اور اس کے شکار میں امتیاز ہتھیاروں اور اوزاروں کی بنا پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ تہذیب کی تاریخ کو بڑی حد تک اوزاروں کی ترقی کی تاریخ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں اوزاروں اور ہتھیاروں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہتھیار ہی ایک اوزار تھا جس سے مدافعت اور حملہ دونوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ابتدائی اوزاروں میں ایسی چیزیں شامل تھیں جو نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھیں مثلاً لکڑی کے ڈنڈے، جانوروں کی ہڈیاں، ہاتھی دانت اور دانت، پتھر کے ٹکڑے۔

(۳) ان ابتدائی اوزاروں کے اجتماع سے ترقی کی راہ میں اور بھی بڑی سہولتیں پیدا ہونے لگیں۔

ان سے ابتدائی ڈنڈے اور پھینکنے والے اوزار ترقی پاکر زیادہ موثر ہتھیار بن گئے۔ مثلاً ڈنڈے میں چقماق کا پتھر لگانا۔ یا دندانے دار دانتوں کو گھاس یا چمڑے کے تسموں یا آنتوں کے ذریعہ لکڑی سے باندھنا۔ انسانی ایجاد و اختراع کی بڑی زبردست کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ ہڈی اور پتھر کا زمانہ بے شمار نسلوں تک چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ یہ اوزار صرف جنگ کے لئے ہی نہیں بلکہ محنت کے بچانے کے لئے بھی مفید نظر آنے لگے یا بالفاظ دیگر ہتھیار کے ساتھ اوزار بھی پیدا ہو گئے۔ اس تبدیلی میں غالباً سب سے زبردست حصہ آگ کے استعمال کو حاصل ہے۔ جس چیز سے وحشی مخلوق کو دہشت ہوتی تھی وہ انسان کی خادم بن گئی۔ ابتدا میں اتفاقی آگ لگ جانے سے آگ کو حاصل کیا گیا لیکن بعد میں اس کی نہایت احتیاط کے ساتھ حفاظت کی گئی اور اس کو تقدیس کا جامہ پہنا دیا گیا۔ بعض صورتوں میں تو آگ کو مذہب کی بنیاد بنا دیا گیا۔ اگرچہ آج بھی بہت سے ایسے وحشی لوگ ملتے ہیں جو رگڑ کر آگ پیدا کرتے ہیں لیکن زیادہ سہل طریقہ یہ تھا کہ ہمیشہ روشن شعلہ سے آگ کو جلایا جائے۔ آج بھی پارسیوں اور کیتھالک گرجے میں نہ بجھنے والی روشنی کی رسم میں اُس رواج کی جھلک نظر آتی ہے جسے کسی زمانہ میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

(۴) آگ کا استعمال صرف گرمی حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ غذا کے بہتر طریقہ پر پکانے اور محفوظ رکھنے کے لئے بھی کیا جاتا تھا اور اس طرح آدمی کا انحصار تمام تر اپنے قریبی ماحول پر باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد سے اگرچہ آدمیوں پر ماحول کا اثر ضرور پڑتا تھا لیکن انسان کو ماحول کے بدلنے کا موقع روز بروز زیادہ حاصل ہونے لگا۔ لیکن آگ کی سب سے زبردست خدمت یہ تھی کہ اس کی وجہ سے اوزاروں میں ترقی ہونے لگی۔ اور جب دھاتوں کا رواج شروع ہوا تو اس کے فایدے اور بھی نمایاں ہونے لگے۔ لیکن لکڑی اور پتھر کے اوزاروں میں بھی اس سے بڑی ترقی ہوئی۔ یہ ترقی اس قدر آہستہ آہستہ ہوئی کہ عہد حجر قدیم سے عہد حجر جدید تک پہنچنے کے لئے انسانوں کو بے شمار صدیوں کی مدت صرف کرنا پڑی۔ چقماق کے اوزار ہمیں ایک لاکھ سال پہلے تک کے ملتے ہیں۔ اس مدمیان میں انسان نے ہڈیوں اور پتھروں کو اس طرح تیز کرنا، سوراخ کرنا، کاٹنا

ہموار کرنا اور پالش کرنا سیکھ لیا تھا کہ ان سے وہ تیز چاقو، جیولین، ہتھوڑے، چکی کے پاٹ، بھرے اور آرے بنا سکتا تھا۔ ان سب کے بنانے میں وہ اپنے جسم کے مختلف حصوں کی نقل کیا کرتا تھا۔ آرے کو دانتوں کی ایک ترقی یافتہ شکل سمجھنا چاہئے۔ ہتھوڑے کو کلہ کی، تسلہ کو چلّو کی، کنٹوے کو مڑی ہوئی انگلی کی، جیولین کو پھیلے ہوئے بازو کی چاقو کو تیز ناخون کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابتدائی برتنوں کی ترقی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جانوروں کے سینگوں نے ترقی پاکر چوبچ وار گلاس کی شکل اختیار کر لی لکڑی کے کھوکھلے برتنوں نے آرام دہ ٹوکریوں کی اور تو مڑیوں سے صراحیاں بن گئیں۔ تاہم گل سازی کی ایجاد کو بعض لوگ اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب میں اس کی وجہ سے انقلاب پیدا ہوگیا۔ غرضکہ ہتھیار، اوزار اور برتن انسانی نسل کی ترقی کے مظاہر ہیں اور یہی انسان کی ذہنی ترقی کے ظاہری شواہد ہیں اور انہی پر معاشی ترقی کی بنیاد قایم ہے۔

د۵ اگر صرف اوزاروں کی ترقی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پتھر کے عہد کے بعد دھات کا غلبہ شروع ہوا۔ پگھلانے کے لئے آگ کی استعمال سے واقفیت ضروری تھی اس کے بغیر دھات کا عہد شروع نہیں ہو سکتا تھا۔ آثار قدیم کے ماہروں کا کچھ عرصہ پہلے یہ خیال تھا کہ دنیا میں ہر جگہ لوہے کے عہد سے پہلے تانبے اور برونز کے عہد کا دور دورہ رہا۔ لیکن یہ بات صرف مشروط طریقہ پر تسلیم کی جاسکتی ہے بعض ملکوں میں ہمیں برونز کا عہد بالکل نظر نہیں آتا۔ کیونکہ وہاں برونز کے بنانے کے لئے جو عناصر ضروری ہیں یعنی ٹین اور تانبا ان میں سے کوئی ایک غائب پایا جاتا ہے۔ مگر جن تہذیبوں نے بحر روم کے گرد ترقی پائی ان میں پہلے تانبے نے اور بعد میں برونز نے ابتدائی اور بھدے اوزاروں کی جگہ لینا شروع کر دی یہاں تک کہ کچھ صدیوں بعد دھات کے حاصل کرنے کے طریقوں کی ترقی سے لوہے کے زیادہ نفیس اوزار بنائے جاسکے اور لوہے کا عہد شروع ہوا۔ ان کے شروع ہونے کے بعد سے قدرت پر انسان کا تسلط یقینی طور پر قائم ہوگیا۔

تہذیب کے ابتدائی مدارج سے آہستہ آہستہ ترقی | یہ ظاہر ہے کہ دھات کے ہتھیار اور اوزار شکاریوں

اور باجی گیروں دونوں کے لئے بہت مفید ہو سکتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جن شکاری قوموں کی تہذیب زیادہ ترقی یافتہ تھی وہ ادنیٰ درجہ کے لوہے کے استعمال سے واقف تھیں۔ لیکن شکاری تہذیب کا جاری رہنا یا اس کا بعد کی منزل میں منتقل ہو جانا دراصل ہتھیاروں کی نوعیت پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کا فیصلہ طبعی حالات اور زمین اور آبادی کے باہمی تعلقات کی بنا پر ہوتا ہے بعض حالات میں جب شکار کی رسد گھٹنا شروع ہوئی تو یہ دریافت کیا گیا اور ابتدا میں یہ محض اتفاقی بات تھی کہ مختلف جانوروں کو شکار کے بعد فوراً کھا جانے کے مقابلہ میں ان کو محفوظ رکھنے اور ان کی غور و پرداخت کرنے سے غذا کی زیادہ یقینی رسد فراہم کی جا سکتی ہے۔ جانوروں کا پالتو بنانا ایک بڑا زبردست انکشاف تھا اور ان کی تعداد کے اضافہ سے جو پہلے غذا کے لئے، پھر نقل و حمل کے لئے اور اخیر میں کپڑوں کی حفاظت اور تفریح کے لئے کیا گیا گلہ بانی کی منزل کا آغاز ہوا۔ بہ چند لوگ اسے نئی چراگاہوں کی تلاش میں برابر منتقل ہونے کی وجہ سے خانہ بدوش منزل سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اس اصطلاح کا انتخاب صحیح نہیں ہے اس لئے کہ شکاری عہد کے مقابلہ میں گلہ بانی کے عہد میں خانہ بدوشی نسبتاً کم تھی۔ جانوروں کے پالتو بنانے کا خاص نتیجہ یہ ہوا کہ غذا کی رسد منتقل ہو گئی اگرچہ یہ رسد مصنوعی ہوا کرتی تھی یا کم از کم اس کا انحصار آدمی کی عاقبت اندیشی اور فکر و نگہداشت پر ہونے لگا تھا۔ مردم خوری غائب ہو گئی اور قحط سالیاں بھی کم ہو گئیں۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی رقبہ پر زیادہ آبادی کے گذر بسر کا امکان پیدا ہو گیا، پھر اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ مویشیوں پر قبضہ حاصل کرنا ایک پسندیدہ چیز بن گئی اور ملکیت ذاتی بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گئی اور اس کے ساتھ دولت کی تقسیم میں عدم مساوات اور معاشرتی طبقے بھی پیدا ہونے لگے۔

مگر یہ سمجھنا کہ ہر جگہ شکاریوں کے بعد گلہ بان پیدا ہوئے صحیح نہیں ہے۔ اس کی اول وجہ یہ ہے کہ جو جانور پالتو بنائے جا سکتے ہیں وہ ہر جگہ نہیں ملتے تھے۔ امریکہ کے براعظم میں جہاں صرف الاما.... .. پایا جاتا تھا گلہ بانی کی زندگی کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے بڑے وسیع قطعات زمین ایسے تھے جو چراگاہوں کے لئے

ناموزوں تھے۔ شکاری زندگی سے گلہ بانی کی زندگی میں انتقال ایشیا اور شمالی افریقہ کے انھی میدانوں میں نظر آتا ہے جہاں موسمی حالات اس کے لئے موافق تھے۔

اسی طرح یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ہر جگہ گلہ بانوں کے بعد کسان پیدا ہوئے۔ کیونکہ ایک قسم کی زراعت تو شکاری اور ماہی گیری کے عہد میں بھی ملی جلی نظر آتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جڑوں کے کھودنے اور ابتدائی زراعت میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔ جب غالباً محض اتفاقیہ طور پر یہ معلوم کیا گیا کہ بیج ازخود اپنی تعداد میں اضافہ کر لیتے ہیں اور نیز یہ کہ انگلی کے مقابلہ میں لکڑی کھودنے کے لئے زیادہ موزوں ہے تو سمجھئے اس وقت سے زمین کی کاشت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس طرح انسان نے عاقبت اندیشی کی بنا پر جانوروں کی تعداد بڑھانے کے لئے انھیں حفاظت کے ساتھ رکھنا شروع کیا اسی طرح اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس نے پودوں کی بھی حفاظت کرنا شروع کر دی۔ اگر گلہ بانی کو جنگلی جانوروں کے پالتو بنانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو زراعت کو بھی جنگلی پودوں کے گھریلو بنانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ابتدا میں شکاریوں کے خیمہ کے قریب محض عارضی طور پر زمین کے ایک مختصر ٹکڑے پر کاشت کی جاتی تھی اس لئے بعض لوگوں نے مثلاً مارگن نے اس نظام کو باغبانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ دوسرے لوگوں نے ابتدائی اوزاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے پھاوڑے کی کاشت سے نامزد کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں اصطلاحیں صحیح نہیں۔ باغبانی کی اصطلاح تو اس لئے صحیح نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس کا اشارہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی کاشت کی طرف کیا جاتا ہے اور دوسری اصطلاح اس لئے موزوں نہیں ہے کہ پھاوڑے کا استعمال زراعت کے کاموں کے لئے آج بھی ہر جگہ کیا جاتا ہے۔

لیکن ایک بات بہرحال یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ ابتدائی کاشت کا کام شکاریوں کی بیویاں اور بچیاں ایک ضمنی اور اضافی کام کی حیثیت سے کیا کرتی تھیں۔ زراعت کو اہمیت بہت بعد کے زمانہ میں حاصل ہوئی اور جب تک شکار کی رسد عملاً بالکل معدوم نہیں ہو گئی اس وقت

تک زراعت کو ایک ایسے پیشہ کی حیثیت سے جس پر بیش تر انحصار کیا جائے شروع نہیں کیا گیا اور شکاری عہد کی آوارہ گردی کسان کی اقامت گزینی کی جگہ نہیں لے سکی۔ پھر یہ بات صرف شکاری منزل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ گلہ بانی کی منزل کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جو جدید تحقیقاتیں حال میں ہوئی ہیں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جانوروں کو پالتو بنانے کا کام شکاریوں نے انجام نہیں دیا تھا بلکہ ابتدائی کسانوں نے انجام دیا تھا اس لئے گلہ بانی کی زندگی کو زراعت کی ہی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے۔ اور اس بنا پر تفصیلات کی عدم موجودگی میں تاریخی تقدم اور تاخر کا صحیح فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اور یہی بات بعد کی تجارتی اور صنعتی منزلوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تجارتی منزل لازمی طور پر زراعتی منزل کے بعد آئے بلکہ اکثر اس سے پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً ساحلی علاقوں کی بہت سی قوموں میں ماہی گیری اور تجارت کی منزلیں ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور درمیان میں زراعت کی منزل واقع نہیں ہوتی۔ زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں کی مثال کے طور پر ہم وینس کو پیش کر سکتے ہیں جہاں تجارتی منزل کا ارتقا گلہ بانی کی منزل سے ہوا اور یہاں درمیان میں صنعتی منزل واقع نہیں ہوئی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی ترقی کی یہ قدیم تقسیم نہ صرف بذات خود غیر صحیح ہے بلکہ زراعت کے اختیار کرنے کے بعد سے جو بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کی توضیح کے لئے بھی مفید نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایک دوسری قسم کی تفریق کو تلاش کرنا ہوگا۔

اگر ہم معاشی حالات کو پیدائش اور صرف دولت کے تعلقات کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں کیونکہ یہی بنیادی معاشی حقائق ہیں تو ہمیں دنیا کی تاریخ کو تین بڑی منزلوں میں تقسیم کرنا پڑے گا جن کی نام علی الترتیب کافی بالذات معیشت، تجارتی معیشت اور سرمایہ دارانہ یا صنعتی معیشت ہوں گے۔ ایک دوسرے نقطہ نگاہ سے ان کے نام عزلت گزیں معیشت، مقامی یا دیہی معیشت اور قومی معیشت بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ اب ہم انہی کے بارے میں بحث شروع کرتے ہیں۔

کافی بالذات یاعزلت گزیں معیشت | اس اصطلاح سے مراد ایک ایسا معاشی نظام ہے جہاں گھر کی تمام ضرورتیں گھر والوں کی محنت سے ہی پوری ہو جاتی ہوں اور گھر کے لوگوں کی محنت سے جو کچھ پیدا کیا جاتا ہو وہ سب کا سب گھر کے لوگوں کے ہی صرف میں آجاتا ہو مثلاً ایک اوسط درجہ کے گھر میں غذا اور لباس کے لئے جس کچے مال کی ضرورت ہوتی ہو اسے خود ہی پیدا کیا جائے۔ رہنے کے لئے خود ہی مکان بنا لیا جائے اور جس قدر مصنوعہ اشیاء کی گھر کے صرف کے لئے ضرورت ہو وہ بھی گھر کے اندر ہی بنائی جائیں جو تھوڑی بہت تقسیم عمل پائی جائے وہ گھر کے لوگوں تک محدود ہو اور یہ تقسیم عمل محض اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ گھر کے لوگوں کی ضرورتوں میں اضافہ ہو گیا ہو۔ گھر چاہے چھوٹا ہو یا بڑا اپنی جگہ پر ایک مستقل واحد حیثیت رکھتا ہو اور اپنے ہی جیسے کسی دوسرے واحد وجود سے اس کے کوئی تعلقات عام طور پر قائم نہ رہتے ہوں نہ صرف کہ کافی بالذات ہو، اس کی معاشی خصوصیت ہو اور اس میں عزلت گزینی یا دوسروں سے بے تعلقی کی صفت پائی جاتی ہو۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس طرح کی کافی بالذات معیشتوں کی مختلف مثالیں نظر آتی ہیں کہیں یہ تنظیم صرف ایک خاندان تک محدود ہوتی ہے کہیں خاندان سے نسبتاً بڑی جماعت پر یہ تنظیم حاوی ہوتی ہے۔ کہیں اس کی بنیاد غلاموں کی محنت پر قائم ہوتی ہے اور کہیں آزاد مزدوروں کی محنت پر۔ معاشرت کی ابتدا میں یعنی جڑوں کے کھودنے اور شکار پر گذر کرنے والے عہد میں تنظیم کی یہ شکل ہمہ گیر ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح گلہ بانی اور زراعتی منزلوں کی ابتدا میں بھی یہ تنظیم ہر جگہ ملتی تھی۔ زیادہ ترقی یافتہ جماعتوں میں جو لوگ سرحدی زندگی بسر کرتے ہیں ان میں بھی یہ تنظیم پائی جاتی ہے۔ سلطنت متحدہ امریکہ کے ایسے جنگلوں میں جو آبادی سے دور ہوتے ہیں جو خاندانی زندگی پائی جاتی ہے وہ اس اعتبار سے تاریخ کے ابتدائی گروہوں کی زندگی سے مشابہ ہے۔ یونان میں بھی یہ چیز پائی جاتی تھی کیونکہ وہاں زمینداری کا نام (oikos) تھا جس کے معنی خاندان کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح رومیوں کے **Familia** میں بھی اسی کا نمونہ نظر آتا ہے کیونکہ **Familia** کی اصطلاح روم کے شہریوں کی تمام املاک پر حاوی سمجھی جاتی تھی اور اس میں اُن کے بیوی بچے غلام زمین اور ان کی تمام دوسری املاک شامل ہوتی تھیں۔

اسی طرح عہد وسطےٰ کے Manor اور امریکہ کی پلانٹیشنس میں بھی جہاں غلاموں سے کام کرایا جاتا تھا یہی تنظیم نظر آتی تھی۔ روس کے میر Mir اور ہندوستان کے دیہاتوں میں بھی اسی چیز کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔

غرضکہ تاریخ میں اس تنظیم کی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں اور جہاں کہیں بھی انھیں دیکھا جاتا ہے وہاں ان کی نمایاں خصوصیت ہر جگہ یہی نظر آتی ہے کہ وہ کافی بالذات ہوتی ہیں یعنی اپنے گھر میں ہی ضرورت کی تمام چیزوں کو پیدا اور صرف کیا جاتا ہے۔ اس تنظیم کے لئے غلامی کا پایا جانا لازمی نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی تنظیم ایسی جگہوں میں بھی نظر آتی ہے جہاں غلامی کا رواج نہیں تھا مثلاً عہد وسطےٰ کے جاگیردارانہ نظام میں جہاں بیگار تو لی جاتی تھی لیکن غلامی موجود نہیں تھی یا ابتدائی عہد کے آزاد لوگوں میں یا موجودہ زمانہ کے ان آزاد لوگوں میں جن کی زندگی ابتدائی عہد کے آزاد لوگوں سے مشابہ ہے اسی قسم کی معاشی تنظیم پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے لئے مطلق العنان اقتدار کا قائم ہونا بھی لازمی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ چیز روس کی جمہوری Mir میں بھی نظر آتی ہے اور امریکہ کی امارتی پلانٹیشنس میں بھی۔ شکلیں اس کی چاہے جس قدر مختلف ہوں لیکن اصل اس کی ایک ہی ہے۔ زمیندار چاہے وہ ایک شخص واحد ہو یا کئی اشخاص یا جماعت بہر حال جائداد کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی ریاست میں ہر قسم کی ضرورت کی چیزیں مہیا ہو سکتی ہیں اور باہر کی دنیا کی وہ محتاج نہیں ہوتیں۔ پیدائش دولت کا تمام کام جماعت کے اندر ہی کیا جاتا ہے اور دولت کے پیدا کرنے اور صرف کرنے والوں میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ گروہ کے تمام افراد کی ضرورتیں گروہ کی محنت سے ہی پوری ہو جاتی ہیں اور وہ کسی دوسرے معاشی گروہ پر انحصار نہیں کرتے۔ جس طرح دولت کے پیدا کرنے میں آزاد ہوتے ہیں اسی طرح دولت کے صرف کرنے میں بھی آزاد ہوتے ہیں۔

لیکن کچھ عرصہ بعد وہ گھرانے جنھیں بعض خاص چیزوں کے پیدا کرنے میں کوئی طبعی یا اکتسابی سہولت حاصل ہوتی ہے ضرورت سے زاید چیزیں پیدا کرنے لگتے ہیں اور دوسرے گروہوں کے

ساتھ ان کی تجارت شروع کر دیتے ہیں۔ ابتدا میں چیزوں کا انتقال صرف یک طرفہ ہوتا ہے اور تعلقات میں شگفتگی اور خوشگواری پیدا کرنے کے لئے چیزوں کو باہم منتقل کیا جاتا ہے لیکن بعد میں چیزوں کے دینے کے بعد معاوضہ کی بھی توقع کی جانے لگتی ہے اور اس طرح بارٹر ترقی پانا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن ابتدا میں ایک طویل مدت تک بارٹر کا وجود نظر نہیں آتا کیونکہ جہاں معیشت کافی بالذات ہوگی وہاں بارٹر کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ ان لوگوں کو اشیا کا مبادلہ اس بنا پر کہ یہ ایک غیر طبعی فعل سے معیوب نظر آئے گا۔ آدم اسمتھ کا یہ خیال کہ انسان میں تجارت کا رجحان [illegible] To Truck: فطری ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ چیز انسانی معاشرت کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ معنوی اعتبار سے Truck کے معنی چالاکی سے کام لینے کے ہیں جیسے بارٹر کے اصلی معنی (Fr. Barater) دھوکہ دینے کے ہیں۔ جب مبادلہ میں ترقی ہو جاتی ہے تو پھر اس وقت سودے مقررہ قاعدوں اور رواجوں کے مطابق کئے جانے لگتے ہیں اور ان میں مذہبی تقدس کے عنصر کو شامل کیا جاتا ہے۔

لیکن گروہوں کے مابین محض مبادلہ کے پیدا ہو جانے سے معاشی زندگی کی تنظیم میں تبدیلی کا پیدا ہو جانا لازمی نہیں ہے کیونکہ جب تک اشیاء کی کثیر مقدار گھر پر ہی پیدا اور صرف کی جاتی رہے گی اس وقت تک کافی بالذات معیشت باقی رہے گی مثلاً یونانی تہذیب کی آخری صدیوں میں بہت سے زمینداروں کی ریاستوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ اشیا خام اور بعض وقت تعیشات کو شہروں میں فروخت کرنے کے لئے پیدا کرنے لگتے تھے اور شہروں میں تجارت کا خوب فروغ ہو گیا تھا۔ اسی طرح روم میں اس کی خوشحالی کے عروج کے زمانہ میں بڑی بڑی زمینداریوں میں صرف کوئی ایک قسم کی چیز برآمد کے لئے پیدا کی جاتی تھی مثلاً شراب یا تیل یا گیہوں اور اس برآمد کے کام کو بڑی بڑی کمپنیاں انجام دیا کرتی تھیں۔ اسی طرح امریکہ کی پلانٹیشن میں ایک واحد شے، مثلاً تنبا کو یا کپاس یا شکر کو برآمد کے لئے پیدا کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے شہروں میں اس کی تجارت ہوتی تھی اور یہی شے کسی خاص پلانٹیشن کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہوا

کرتی تھی۔ لیکن ان تمام صورتوں میں یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی کہ پیدا کی ہوئی اشیا کی بیشتر تعداد گھر پر ہی صرف ہو جاتی تھی۔ گروہوں کے درمیان تجارت ضرور پائی جاتی تھی لیکن خود ایک گروہ کے اندر تجارت بہت کم ہوتی تھی اور اگرچہ گروہوں کے مابین جو تجارت ہوتی تھی اس کی رقم خاصی کثیر ہوتی تھی لیکن اس سے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی متاثر نہیں ہوتی تھی۔ اور جس طرح امریکہ کے جنوبی علاقوں کی تہذیب کی نمایاں خصوصیات کا مطالعہ پلانٹیشنس میں ہی کیا جا سکتا ہے اور جس طرح روس کی معاشی زندگی کی نمایندگی میر Mir سے ہوتی تھی۔ اسی طرح روم کی جمہوریت کی تعمیر میں اہمیت تجارتی کمپنیوں کو حاصل نہیں تھی بلکہ زمینداروں کی ریاستوں کو حاصل تھی۔ اور ان میں کافی بالذات معیشت کا رواج تھا اس سے ثابت ہوا کہ اس حالت میں بھی جب بازار کے لئے زاید پیداوار پیدا کی جانے لگتی ہے یہ ہو سکتا ہے کہ گروہ کے اندر جو لوگ شامل ہوں وہ تقریباً تمامتر اپنے گروہ کی محنت سے ہی اپنی ضرورت کی تمام چیزیں حاصل کرتے ہوں۔

مگر داخلی اور خارجی تجارتی تعلقات کی ترقی سے معاشی گروہ کافی بالذات نہیں رہتے اور معاشی زندگی کی دوسری منزل آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگتی ہے۔

<u>تجارتی معیشت</u> | اس منزل کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ پیدائش کے بعد صرف دولت کا کام براہ راست شروع نہیں کیا جاتا بلکہ درمیان میں مبادلہ کی ایک کڑی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور صرف کرنے والوں کی ضرورتیں بیشتر تجارت کے وسیلہ سے پوری ہوتی ہیں۔ تجارت کی اہمیت کا یہ سبب نہیں ہوتا کہ مختلف کافی بالذات گروہوں میں مبادلہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ چیز تو جیسا ہم ابھی دیکھ چکے ہیں خانگی یا عزلت گزیں معیشت کے آخری دور میں بھی شروع ہو گئی تھی بلکہ اس کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ اس میں خود گروہ کے اندر تجارت شروع ہو جاتی ہے۔ خاندان کے افراد اب پہلے کی طرح اپنی ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ ان چیزوں کو پیدا کرتے ہیں جن کی ضرورت دوسروں کو ہوتی ہے۔ اب دولت کے پیدا کرنے والوں اور دولت کے صرف کرنے والوں کے گروہ الگ بن جاتے ہیں۔ اور لوگ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو صرف نہیں کرتے

بلکہ ان چیزوں کو صرف کرتے ہیں جو انھیں تجارت سے حاصل ہوتی ہیں یا بالفاظ دیگر کافی بالذات معیشت کی جگہ تجارتی معیشت پیدا ہو جاتی ہے۔

معاشی زندگی کا واحدہ گو پہلے سے بڑا ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے پہلے کی طرح مقامی ہی رہتا ہے اور تجارت وصنعت بیشتر دیہات کے اندر ہی محدود رہتی ہیں۔ اس منزل کا مشاہدہ نہایت صاف طور پر عہد وسطےٰ کی تاریخ کے مطالعہ کے دوران میں کیا جاسکتا ہے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں تجارت کو بہت ترقی ہوئی جس کا خاص سبب یہ تھا کہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے تجارت کی نئی راہیں کھل گئیں۔ اس سے پہلے کی صدیوں میں جن میلوں اور منڈیوں کی ابتدا چھوٹے پیمانہ پر ہوئی تھی انھوں نے ان صدیوں کے دوران میں مستقل قصبوں اور شہروں کی شکل اختیار کرلی۔ عہد وسطےٰ کے شہروں کو صرف پتھر اور چونے کی فصیلیں ہی ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی تھیں بلکہ تجارت کے اجارہ کی وجہ سے بھی تعلقات کے قائم ہونے میں سخت معاشی رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ صرف شہر کے رہنے والے جنھیں برگس کہا جاتا تھا آزادی کے ساتھ خرید فروخت کرسکتے تھے صرف انھی کو تجارت کی بہت سی مراعات حاصل ہوتی تھیں۔ اس معاشی تفریق سے وہ سیاسی آزادی پیدا ہوئی تھی جو ابتدائی جماعتی زندگی کی بہت نمایاں خصوصیت ہے۔ دیہی معیشت کے نام سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ معاشی واحدہ موضع گاؤں یا قصبہ ہوا کرتا تھا بلکہ اس میں گاؤں یا قصبہ کا ملحقہ علاقہ بھی شامل ہوتا ہے۔ ان ملحقہ زمینوں یا جایدادوں سے وہ خام اشیا ملتی تھیں جنھیں قصبوں میں مصنوعہ شکل دی جاتی تھی۔

پھر اس پرانے واحدہ کے ٹوٹ جانے سے صنعت کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کی منزل میں زراعت اور صنعت میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ کسان بڑھئی کا کام بھی خود ہی کرلیتا تھا کسان کی بیوی گھاس چارہ اکٹھا کرتی اور گھر کے کپڑے سلتے سیتی تھی۔ جب جایدادیں اتنی بڑی ہوگئیں کہ ان میں مختلف قسم کے صنعتی کام کرنے والوں کے طبقے الگ الگ بن گئے اس وقت بھی وہ سب کے سب زمیندار کی نگرانی میں رہتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں گاؤں کے کاریگر کی ایک آزاد اور مستقل حیثیت ہوگئی تھی

گو ابھی تک بہت سے دستکاروں کے پاس ایک چھوٹا سا باغ یا کیاری کا ٹکڑا ہوا کرتا تھا۔ اس میں خاص طور پر لائق توجہ بات یہ ہے کہ اب کاریگر اپنے پیشہ کی ضرورت کی چیزوں کو خود پیدا نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں خریدنے لگے تھے کسان خام اشیاء پیدا کرتے تھے اور دیہات کے دستکار اُن کی مصنوعہ چیزیں بناتے تھے اور دونوں طبقوں کے لئے تجارت ترقی و خوش حالی کا باعث تھی۔

پھر ایک اور مفہوم کی بنا پر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نئی صنعت تجارت پر مبنی تھی۔ دست کار اپنی خام اشیاء کو نہ صرف یہ کہ خود ہی چھوٹی مقدار میں خریدتا تھا بلکہ اپنی مصنوعہ اشیاء کو بھی اپنی مستقل دوکان یا میلہ کی عارضی دوکان میں خود ہی فروخت کیا کرتا تھا۔ کاریگر کا زیادہ اہم کام دراصل تجارت ہی تھا۔ اور اس کی کامیابی میں تجارت کو بھی اتنا ہی دخل تھا جتنا اس کی صنعتی مہارت کو۔ دستکاروں نے ایک مستقل طبقہ کی حیثیت آہستہ آہستہ اختیار کی اور اسی طرح بڑے تاجروں کے ہاتھ میں تجارت آہستہ آہستہ ہی پہنچی۔ ایک طویل زمانہ تک تجارت مقامی منڈیوں اور میلوں میں خوردہ فروشی تک محدود رہی اور اس وقت بھی جب چند اشیاء کی تجارت بڑے پیمانہ پر شروع کی گئی موجودہ عہد کی ترقی یافتہ تجارت کے طریقوں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا تھا۔

تجارت اور کاریگر کی اہمیت کے اضافہ کے ساتھ ساتھ آزادی اور مساوات کے احساس میں بھی ترقی ہوتی رہی اس اعتبار سے عہد وسطے کے شہروں اور قصبوں کو جمہوریت کی جائے پیدائش کہا جا سکتا ہے۔ لیکن تجارت و صنعت کو اقتدار حاصل کرنے میں بڑی مدت لگ گئی۔ ابتدا میں اٹلی میں کچھ عارضی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن بلجیم اور ہالینڈ میں سب سے پہلے انھیں مستقل اور پائدار فتح حاصل ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جدید جمہوریتوں کی ابتدائی مثالیں بلجیم اور ہالینڈ میں ہی ملتی ہیں۔

اس معاشی منزل کی ترقی کے آخری دور میں دولت بڑے پیمانہ پر اکٹھی کی جانے لگی۔ یا تو یہ دولت تجارت اور تھوک فروشی سے حاصل کی جاتی تھی یا زمین سے۔ جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ

سیٹھ اور جگت سیٹھ بھی ہوا کرتے تھے۔ اگر ہم دولت کے اس اجتماع کو سرمایہ کا اصطلاحی نام دیں تو ہمیں اس زمانہ میں زراعتی سرمایہ اور تجارتی سرمایہ تو ملے گا لیکن صنعتی سرمایہ نہیں ملے گا۔ جو دولت زمین سے حاصل کی جاتی تھی اسے دوبارہ زمین میں نہیں لگایا جاتا تھا بلکہ زمیندار اُسے اپنے صرف میں لے آتے تھے۔ اور جو دولت تجارت سے حاصل کی جاتی تھی اُس سے گاڑیاں اور جہاز اسی وقت تک لامحدود تعداد میں بنائے جا سکتے تھے جب تک منتقل کرنے کے لئے اشیاء بھی کثیر تعداد میں موجود ہوتیں۔ لیکن چونکہ یہ اشیاء ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں اس لئے ان کے اضافہ کی رفتار بہت سست تھی۔ اس لئے اس منزل کی معاشی تہذیب کا انحصار و بیاجت کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں پر ہی رہا اور تجارتی اور زراعتی دولت کی وابستگی چھوٹے کاریگروں اور دیہی معیشت کے ساتھ باقی رہی۔

یہ صحیح ہے کہ اس منزل کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلیں تھیں بعض جگہ زراعتی خوش حالی اور دولت کا اثر غالب تھا اور زمینداروں کا طبقہ باقتدار تھا۔ دوسری جگہوں میں مثلاً ہنسا کے شہروں میں تھوک تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں نظر آتی تھیں اور تجارتی خاندانوں کا طبقہ امرا میں شمار کیا جاتا تھا ان کے علاوہ اور دوسری جگہوں میں صنعت کے مرکز بھی ملتے ہیں اور کاریگروں کی پنچایت کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ مگر ان سب صورتوں میں چھوٹے تاجر، چھوٹے کاریگر اور مقامی معیشت یکساں طور پر ہر جگہ ملتے ہیں۔ بڑا زمیندار اپنی پیداوار ملحقہ گاؤں کی منڈی میں فروخت کرتا تھا اور غذا کے علاوہ باقی تمام صرف کی چیزیں وہیں سے حاصل کرتا تھا۔ ملک التجاروں کی تجارت دور دراز ملکوں سے بھی ہوتی تھی لیکن ان کی تجارت کا بھی بیشتر حصہ مقامی ہوا کرتا تھا۔ اور قومی اور بین الاقوامی میلوں کی تجارت صرف چند خاص اشیاء تک محدود ہوا کرتی تھی۔ کاریگر جو چیزیں بناتے تھے ان میں سے اکثر مقامی منڈی کے لئے اور لوگوں کی فرمائش پر بنائی جاتی تھیں دیہات یا قصبہ کو واحدہ کی حیثیت حاصل تھی اور پردیسی وہ شخص کہلاتا تھا جو دوسرے قصبہ سے آتا تھا اور اس کے لئے دوسرے ملک کا ہونا لازمی نہ تھا۔

معاشی زندگی کی یہ منزل یورپ میں کئی صدیوں تک چلتی رہی۔ لیکن بعد میں بہت سے اسباب کے مل جانے سے ابتدا میں اس میں ترمیم ہوئی اور بعد میں یہ بالکل ختم ہو گئی۔ ان میں سے خاص سبب

نئی دنیا کی دریافت اور مشرق کے سفر کے لئے نئے سمندری راستوں کا انکشاف تھا جس سے دولت کا ذخیرہ بہت بڑھ گیا۔ امریکہ میں بے انتہا قیمتی دھاتوں کا پتہ لگنے اور مشرقی اور مغربی تجارت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہونے سے دولت کا ذخیرہ خوب بڑھ گیا اور اسے صنعت کی پیداوار حاصل کرنے کے لئے بڑے پیمانہ پر لگایا جانے لگا جس سے آہستہ آہستہ معاشی زندگی کی تمام نوعیت ہی بدل گئی جب دولت کے اس ذخیرہ کو صنعت میں لگایا گیا تو اس سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے صنعتی سرمایہ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور اس صنعتی سرمایہ نے تیسری منزل کو پیدا کر دیا۔

صنعتی یا سرمایہ دارانہ معیشت | صنعت کے کاروبار میں بڑے پیمانہ پر سرمایہ کا لگایا جانا اس منزل کی امتیازی خصوصیت ہے۔ سرمایہ کے ساتھ سرمایہ دار یعنی سرمایہ کا مالک بھی پیدا ہوا جو مزدوروں کا آجر اور صنعتی کاروبار کا نگراں اور منتظم ہوتا ہے۔ عزلت پسند معیشت کی منزل میں ہم نے دیکھا تھا کہ تمام معاشی کاروبار میں ایک وحدت پائی جاتی تھی۔ مقامی اور دستکاری کی منزل میں یہ وحدت صرف دولت کی پیدائش کے کام میں باقی رہ گئی تھی سرمایہ داری کی منزل میں دولت کی پیدائش کا کام بھی منقسم ہو گیا۔ ابتدا میں یعنی سترھویں اور اٹھارویں صدی کے انگلستان میں سرمایہ دار پیدائش دولت کے صرف ابتدائی اور آخری کاموں پر قبضہ کرتا ہے اور باقی تمام کاموں کو آزاد کاریگروں کے ہاتھ میں رہنے دیتا ہے۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد سرمایہ دار کام کرنے کی جگہ پر بھی قبضہ کر لیتا ہے۔ اور سب سے آخر میں پیدائش دولت کے اوزار اور ذرایع پر بھی اس کی ملکیت قائم ہو جاتی ہے۔ کارگاہ فیکٹری میں بدل جاتی ہے، اوزار مشین کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور کاریگر فیکٹری کے دست و بازو یا پرزے بن جاتے ہیں۔ اس دوران میں پیدائش دولت کے مختلف کاموں کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہر جداگانہ منزل ایک مختلف سرمایہ دار کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کا انحصار فیکٹری کے مالکوں کے مختلف طبقوں پر ہونے لگتا ہے۔ غرضکہ خام اشیاء اور مشین اور فیکٹری کی قیمت نیز مصنوعہ اشیاء کو خریدار تک لیجانے کے کاموں کے لئے ہر قدم پر سرمایہ داروں کے مختلف طبقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخر میں سرمایہ کی قوت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بعض صنعتوں میں اشتراک کا

عمل شروع ہو جاتا ہے اور وہی سرمایہ دار ایک گروہ میں شامل ہو کر صنعت کے تمام کاموں کی از ابتدا تا انتہا، خام اشیار کے نکلنے سے لے کر مصرف کے پاس آخری طور پر پہنچانے تک نگرانی کرنے لگتے ہیں اور اس طرح صنعتی معاشرت اپنی موجودہ پیچیدہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اب دولت کو چھوٹی مقداروں میں فرمائش پر پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ بڑے بڑے ذخیرے اکٹھے کئے جاتے ہیں تاکہ انھیں اس وقت فروخت کیا جائے جب بازار تیز ہو یا بڑے بڑے کارخانے کھڑے کئے جاتے ہیں تاکہ ان بڑی فرمائشوں کو پورا کیا جا سکے جن کے پیدا ہونے کی توقع کی جاتی ہے پرانے نظام کی سست رفتاری کی جگہ جس میں رسم و رواج کو اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی سخت ترین مسابقت شروع ہو جاتی ہے جس کا اثر صنعتی معاشرت کے ہر کونہ اور گوشہ میں محسوس کیا جاتا ہے۔ بارٹر کا آخری نشان مٹ جاتا ہے اور تمام مبادلوں میں زر ہی ایک کڑی کا کام انجام دیتا ہے ابتدا میں اعتبار کے معنی یہ ہوا کرتے تھے کہ جس شخص پر اعتبار ہوا اس کی ضرورت کے وقت ذاتی تعلقات کی بنا پر مدد کر دی جائے۔ اب اعتبار پیدائش اور مبادلہ دولت کا ایک لازمی عنصر بن جاتا ہے۔ سرمایہ کو نفع بخش طریقہ پر لگانے کی خواہش محنت کی کفایت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے نئی مشینوں کی ایجاد ہوتی ہے۔ پیداوار کے بہت زیادہ سستے ہو جانے کی وجہ سے وہ چیزیں جن کا شمار تعیشات میں تھا ضروریات بن جاتی ہیں اور لوگوں کی قوت صرف میں اضافہ ہو جاتا ہے ضرورتوں کے اضافہ سے نئی صنعتیں پیدا ہوتی ہیں اور آخر میں مزدوروں کو زیادہ اجرت پر نئے کام ملنے لگتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سرمایہ کی طاقت بڑھنے کے اور جماعت کے مختلف صنعتی طبقوں میں جدا ہو جانے کی وجہ سے نئے اور مشکل مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ منزل کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی واحدہ کی جگہ قوم لے لیتی ہیں۔ اب پیدائش اور صرف دولت گاؤں اور شہر کے حدود کے اندر نہیں رہتی بلکہ جو چیز ایک ضلع میں پیدا کی جاتی ہے وہ دوسرے ضلع میں صرف کی جاتی ہے۔ مقامی دیہی اور شہری معیشت وسیع ہو کر قومی معیشت بن جاتی ہے۔ جو وسیع تر معاشی مفاد کے لئے وسیع تر اور مضبوط تر سیاسی واحدوں کے بنانے کی ضرورت پیش

آتی ہے ۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی جاگیردارانہ ریاستیں غائب ہو جاتی ہیں اور جدید قومی ریاستیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب ایک شہر کے مقابلہ کے لئے دوسرا شہر کھڑا نہیں ہوتا۔ شہریت کا احساس محض ایک شہر کے ساتھ وابستہ نہیں رہتا بلکہ پوری قومی ریاست کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے ۔ اور پردیسی دوسرے گاؤں کے آدمی کو نہیں کہتے ۔ بلکہ دوسری قوم کے آدمی کو کہتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ارتقا کے ابتدائی مدارج میں قومیں اسی طرح ایک دوسرے کی مخالفت کرتی تھیں جیسے پہلے شہر اور قصبات کیا کرتے تھے اور اس سخت قومی مقابلہ سے بہت کچھ بھلائی پیدا ہوتی ہے اگرچہ اس بھلائی میں برائی کی بھی خاصی آمیزش ہوتی ہے۔

حال کے زمانہ میں سرمایہ دارانہ طریقوں کی ترقی ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کی اصلاح اور جدید اسپیکولیشن یا تخمین کی نشوونما سے اکثر اشیاء کے لئے ایک عالمگیر منڈی پیدا ہو گئی ہے اور تجارت میں جو ذرا سا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے ۔ اس کا اثر فوراً ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچ جاتا ہے ۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب معیشت قومی نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی ہوتی جا رہی ہے ۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ہر چند اس کے آثار پائے جاتے ہیں کہ آخر میں ایک بین الاقوامی معیشت پیدا ہو جائے گی مگر جہاں تک موجودہ حقائق کا تعلق ہے یہ بات کسی طرح نہیں بھلانا چاہئے کہ معیشت ابھی تک قومی منزل پر ہی ہے ۔ اور ہمہ گیر اور بین الاقوامی معیشت کی طرف جو ترقی بھی ہو رہی ہے وہ بہت آہستہ آہستہ ہو رہی ہے۔

سرمایہ دارانہ منزل کو صنعتی منزل کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس منزل میں لوگوں کا خاص پیشہ صنعت وحرفت ہی ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں تقریباً پورے طور پر زراعت ہی لوگوں کا ذریعہ معاش ہوا کرتی تھی دوسری منزل میں خوش حالی کا انحصار تجارت پر ہوا کرتا تھا۔ لیکن صنعتی منزل میں زراعت اور تجارت دونوں غیر اہم ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ صحیح ہے کہ زمین ہی تمام پیداواروں کا منبع اور مخرج ہوتی ہے لیکن پیداوار کی بیشتر مقدار اب زمین کے کام سے کئی منزل دور ہوتی ہے ۔ دولت کی پیدائش کے معنی آج کل مصنوعہ اور تکمیل شدہ اشیاء کے ہو گئے ہیں ۔ اسی طرح تجارت کو اب بھی اہمیت حاصل ہے

لیکن تجارت اب زیادہ تر صنعت کی ملازمہ اور سہیلی ہے زراعت کی نہیں۔ بڑی بڑی جائدادیں اور دولت آج کل صنعت سے پیدا کی جاتی ہیں زراعت اور تجارت سے نہیں۔ ساہوکار زمینداروں اور جاگیرداروں کے رقیب کی حیثیت سے ہی نمودار نہیں ہوتے بلکہ اب وہ صنعت کے نہایت گہرے رفیق اور دمساز بن گئے ہیں۔ پہلی معاشی منزل میں عام طور پر امیر آدمی جاگیردار یا پلانٹیشن کے مالک ہوا کرتے تھے دوسری منزل میں ملک التجار ہوا کرتے تھے جیسے میڈیسی اور فگر۔ لیکن تیسری منزل میں کارنیگی اور راک فیلر ہونے لگے ہیں زراعت اور تجارت کی صورت بھی سرمایہ اور مشین کے استعمال کی وجہ سے بالکل بدل گئی ہے۔ خوش حالی اور دولت کی فراوانی، تمدن، تہذیب اور اقتدار کی وسعت اور ہمہ گیری آج کل صنعتی قوموں میں پائی جاتی ہے۔ زراعتی قوموں میں نہیں۔

بعض ملک مثلاً چین تجارتی عزلت نشینی کی وجہ سے اس تحریک سے الگ رہے چنانچہ چین ابھی تک معیشت دیہی کی منزل پر ہے۔ یہی حال ہندوستان کا ہے۔ لیکن دوسرے ملک مثلاً جاپان چالیس پچاس سال قبل اس نئی تحریک میں شامل ہوگئے اور ان میں آج بھی نہایت تیزی سے تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی طرح یورپ اور امریکہ کے پس ماندہ علاقے بھی اس تحریک سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ قدیم عہد میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ دوسری منزل عرصہ تک پیدا نہیں ہوئی۔ اور جہاں تجارت نے بڑے پیمانہ پر ترقی پائی اور شہری مرکزوں کو فروغ ہوا وہاں بھی صنعت چھوٹی دستکاری کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے علاوہ غلامی کے موجود ہونے اور تجارت میں کسی ایسے انقلاب نہ ہونے کی وجہ سے جو عہد وسطے کے ختم ہونے کے بعد واقع ہوا یونان اور روم میں سرمایہ دارانہ عہد شروع نہ ہو سکا۔ قدیم عہد میں سرمایہ زیادہ تر تجارتی سرمایہ ہوا کرتا تھا، برخلاف اس کے جدید عہد میں سرمایہ بیش تر صنعتی سرمایہ ہوتا ہے۔

اسلام میں ملکیت ذاتی پر پابندیاں

(از آنریبل مشیر حسین صاحب قدوائی مرحوم)

(مشیر حسین صاحب قدوائی مرحوم کی ایک تازہ تصنیف "پین اسلامزم اور بالشوزم" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام اور اشتراکیت میں مشابہت دکھلانے کی کوشش کی ہے اور ایک عام چیلنج دیا ہے کہ:

"جو تعلیم یافتہ اور سوچنے والا کمیونسٹ چاہے میرے پاس آئے اور مجھے بتائے کہ وہ کن وجوہ سے اپنے آپ کو پین اسلامسٹ نہیں سمجھتا میں انھیں وجوہ کو سامنے رکھ کر اُسے قائل کر دوں گا کہ اسی حد تک اُس کا کمیونزم ناقص اور ادنیٰ درجہ کا ہے اور سوسائٹی کے لئے بصورت مجموعی یا سوسائٹی کے اجزائے ترکیبی کے لئے نقصان کا موجب ہے۔

"اسی طرح جو مسلمان چاہے میرے پاس آئے اور مجھے بتائے کہ کن وجوہ سے وہ کمیونزم کے اصول یا اصولوں کو پسند نہیں کرتا (مجھے کمیونزم کے ان متعلقات سے بحث نہیں ہے جو اُس کے ساتھ غیر ضروری طور پر اور ناسمجھی کی بنا پر وابستہ کر دیئے گئے ہیں) اور میں اس کو اس بات کا یقین دلا دوں گا کہ اسی حد تک اس نے اسلام کو نہیں سمجھا یا اس کا علم اسلام اور اس کی روح کے بارے میں ناقص ہے"۔

قدوائی صاحب کے نزدیک پین اسلامزم اور بالشوزم میں خاص فرق صرف یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد خدا کے عقیدہ پر قائم ہے لیکن بالشویکوں نے کارل مارکس کے پیرو ہونے کی حیثیت سے غیر ضروری طور پر اور ناسمجھی کی بنا پر ایک خلاف خدا اور خلاف مذہب پالیسی کو اختیار کر لیا ہے اور یہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ ان بے چاروں کے سامنے ان کے کلیسا نے خدا کا صحیح تصور پیش نہیں کیا تھا۔

عام مشابہتوں کے علاوہ جن خاص مشابہتوں کا قدوائی صاحب نے تذکرہ فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اسلام اور بالشوزم دونوں کا مقصد عالمگیر انقلاب ہے۔

(۲) دونوں نے خاص حقوق اور مراعات کو تسلیم نہیں کیا۔

(۳) دونوں رنگ اور نسل پر ناز کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

(۴) دونوں سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔

(۵) دونوں نے محنت اور کام کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

(۶) دونوں نے زمینداری کی مخالفت کی ہے۔

(۷) دونوں نے انسانی مساوات کو قائم کیا ہے۔

(۸) دونوں نے بین الاقوامیت کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

(۹) دونوں نے افراد کو ترقی کے لئے مساوی مواقع دئے ہیں۔

(۱۰) دونوں نے علم و تعلیم کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

(۱۱) دونوں نے عورتوں کو آزاد کیا ہے اور

(۱۲) دونوں نے ملکیت ذاتی کی تنسیخ کی ہے۔

یوں تو قدوائی صاحب کی پوری بحث نہایت دلچسپ اور مطالعہ کی مستحق ہے لیکن گنجائش کی قلت کی وجہ سے یہاں صرف ان خیالات کا اقتباس پیش کیا جائے گا جن کا اظہار قدوائی صاحب نے "ملکیت ذاتی کی تنسیخ" کے عنوان کے ماتحت فرمایا ہے قدوائی صاحب کی تائید یا مخالفت میں اگر کوئی اور بزرگ اپنے خیالات کا اظہار فرمانا چاہیں گے تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ انھیں اپنے رسالہ میں شایع کریں گے (ایڈیٹر)

مختصر الفاظ میں مسلمانوں میں ملکیت ذاتی کی جو صورت ہے اُسے حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) اگر کوئی شخص سچا مسلمان ہے اور اس نصب العین کی لفظاً اور معناً پیروی کرنا چاہتا ہے جو اسلام نے مقرر کیا ہے اور جس کا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک میں اور دوسرے مسلمان اولیاء اللہ کی زندگی میں نظر آتا ہے تو ایسا شخص بہت زیادہ چیزیں اپنی ذاتی ملکیت میں نہیں رکھے گا حتیٰ کہ امین بننے کے لئے بھی وہ مال کو اپنے پاس رکھنا گوارا نہ کرے گا۔

رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کی ملکیت کی جو حد مقرر کی ہے وہ ایک حدیث میں موجود ہے یعنی رہنے کے لئے مکان، پہننے کے لئے کچھ کپڑے اور کھانے اور پانی کی ضروری مقدار۔ ملکیت ذاتی کی بس یہ حد ہے اس سے زیادہ نہیں۔

(۲) لیکن جو لوگ اس درجہ تک نہ پہنچ سکیں اور جن میں طبعی طور پر مال اور ملکیت کی محبت کا غلبہ ہو تو اسلام اس ملکیت سے تعرض نہیں کرے گا بشرطیکہ یہ اسلام کی روح کے خلاف نہ ہو یعنی اس دولت اور ملکیت کو صرف ذاتی آرام اور سکون کے لئے استعمال نہ کیا جائے بلکہ جماعت کے فایدہ کے لئے استعمال کیا جائے۔

ریاست اس پر زکوٰۃ اور دوسرے محاصل عاید کرے گی اور دولت کے مالک سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ چند مقررہ جماعتی خدمات کے لئے اپنی دولت اور ملکیت کو صرف کرے۔

(۳) اگر کوئی شخص مندرجہ بالا اسلامی احکامات کی پیروی کرتا ہے تو اس کے پاس ترکہ اور وراثت کے لئے بہت کم ملکیت باقی رہے گی۔ لیکن اگر باقی رہی تو پھر قانون وراثت کا عمل شروع ہو جائے گا اور اس کے ذریعہ سے ملکیت منصفانہ طریقہ پر منقسم ہو جائے گی اور بڑی بڑی جاگیریں، سود خوار سرمایہ دار اور کروڑپتی پیدا نہ ہو سکیں گے۔ اگر متوفی مخیر اور بنی نوع انسان کا بہی خواہ اور ہمدرد تھا تو وہ خود ہی خیراتی مقاصد کے لئے اپنی جایداد کو وقف کر جائے گا اور اگر وقف کے ساتھ اپنے خاندان کے تعلق کو بھی باقی رکھنا چاہے گا تو اُسے وقف علی الاولاد کر دے گا۔

غرضکہ اس طرح اسلام ملکیت ذاتی پر بغیر جبر یہ قبضہ کئے اور انسانوں کو ان کے قدرتی رجحانات سے روکے ہوئے اس مقصد کو حاصل کر لیتا ہے جسے بالشوک ملکیت ذاتی کو جماعتی ملکیت بنا کر

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اب مندرجہ بالا اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

اسلام نے نظری طور پر ملکیت کو جڑ سے اس طرح کاٹا کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا مالک خدا کو قرار دے دیا۔ قرآن کہتا ہے "جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے سب خدا کی ملکیت میں ہے" سورہ ۲ آیت ۲۵۵۔

"اللہ کی ملکیت" کے معنی اسلام کی اصطلاح میں ہیں" اجتماعی طور پر تمام بنی نوع انسان کی ملکیت"

اسلام کے اولین ایام میں ابوذر غفاریؓ نے کنز (یعنی دولت اور ملکیت) کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا اور آج بھی راسخ العقیدہ مسلمان صرف اس بنا پر کہ ہر چیز کا خدا مالک ہے وضو کے پانی کو بھی ضایع نہیں کرتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ چونکہ پانی ان کا نہیں ہے بلکہ خدا کا ہے اس لئے قیامت کے دن انھیں اس کا بھی حساب دینا پڑے گا۔ پانی ان کی امانت میں مناسب استعمال کے لئے رکھا گیا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کا مکان یا زمین یا کپڑے بھی دراصل اس کے نہیں ہیں یہ سب چیزیں خدا کی امانت ہیں اور ان کا صرف غلط طریقہ پر نہ ہونا چاہئے۔ انسان کو ہر چیز کا جو اس کے سپرد کی گئی ہے حساب دینا ہوگا اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ جب کسی آدمی کو کسی چیز کا امین یا متولی بنایا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری کتنی سخت ہو جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جو چیز وقتی طور پر کسی کو سپرد کی گئی ہے اُسے جہاں تک ہوسکے خدا کی راہ میں یعنی بنی نوع انسان کی بہبودی اور عام فایدہ کے لئے صرف کرنا چاہئے۔

لیکن رسول اللہؐ کے سامنے سب سے مشکل یہ کام تھا کہ اپنی قوم کے دل سے ملکیت کی اس محبت کو نکالیں جو ان کے اندر راسخ ہو چکی تھی تاکہ ہر شخص اس مال کو جو اس کے قبضہ میں خدا کی طرف سے امانت کے طور پر رکھا گیا تھا صحیح طور پر صرف کر سکے چنانچہ خداوند کریم نے ان کی رہنمائی قرآن کی مندرجہ ذیل آیتیں نازل کرکے فرمائی:۔

"دولت اور بچے اس دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور ہمیشہ باقی رہنے والے کام باقیات الصالحات

تیرے رب کے نزدیک ثواب اور امید کے لحاظ سے بہتر ہیں۔ (سورہ ۱۸ آیت ۴۶)

"بیویاں، بچے، سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور اچھی نسل کے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی یہ ہیں دنیاوی زندگی کا سامان اور اللہ کے پاس انجام کی خوبی ہے" (سورہ ۳ آیت ۱۴)

"اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھارے جوڑے اور تمھارے رشتہ دار اور تمھاری تجارت جس کے مندے پڑ جانے کا تمھیں ڈر رہتا ہے اور تمھارے مکانات جن سے تمھیں خوشی ہوتی ہے تمھیں تمھارے خدا سے اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ عزیز ہیں تو اس وقت کا انتظار کرو جب خدا اپنا حکم نازل کرے اور خدا حد و دسے تجاوز کر جانے والے لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ (سورہ ۹ آیت ۲۴)

اس پر امن تبلیغ اور ترغیب کا وہی نتیجہ تھا جو بالشوزم نے روس میں بہت زیادہ قوت کے استعمال کے بعد اور لوگوں کو بہت تکلیف اور مصیبت میں مبتلا کرکے حاصل کیا۔

ابتدائی مسلمانوں میں ملکیت اور دولت کا جادو ختم ہو گیا تھا اور لوگوں کے دلوں سے ملکیت ذاتی کی محبت کم ہو گئی تھی دولت سے نہ تو طاقت ملتی تھی نہ وقار اور نہ آرام کیونکہ سب لوگ سادہ اور سخت زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ مدینہ میں رسول اللہؐ کی زندگی میں ہی مسلمانوں کا ایک گروہ تھا جن کے پاس کسی قسم کی کوئی ملکیت نہیں تھی۔ یہ لوگ اصحاب صفہ کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے اور تعلیم یا دوسرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ یہ باری باری سے دوسرے مسلمانوں کے مہمان رہتے تھے اور لوگ ان کے لئے غذا اور لباس فراہم کرنا اپنی عزت اور سعادت سمجھتے تھے۔ ملک کے نہایت مغرور اور دولتمند لوگ ان کی توقیر اور عظمت کرتے تھے۔

مسلمانوں میں دولت پر قبضہ کرنے یا جمع کرنے سے نہ کسی کو عزت ملتی تھی نہ مرتبہ، نہ استحقاق بلکہ اس کے برعکس ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ:۔

"جو لوگ اپنے مال کو رات اور دن، کھلے طور پر اور پوشیدہ طور پر صرف کرتے ہیں انھیں ان کی خدا کی طرف سے اس کا انعام ملے گا اور انھیں کسی قسم کا خوف نہ ہوگا اور نہ انھیں کسی قسم کا رنج ہوگا" (سورہ ۲ آیت ۲۷۴)

جن لوگوں کے پاس مال تھا انھیں حکم دیا گیا تھا کہ " اپنا مال باوجود اس کی محبت کے اپنے رشتہ داروں کو، یتیموں کو، ضرورتمند لوگوں کو مسافروں کو اور ان لوگوں کو جو اُسے مانگیں اور قیدیوں کو رہا کرنے کے لئے دیدو۔ (سورہ ۲ آیت ۱۷۹)

رسول اللہ صلعم کی یہ تعلیمات بے اثر ثابت نہیں ہوئیں۔ ان کے پیروؤں کے دل پر ان کا پورا اثر ہوا اور وہ لوگ ان کی ہدایت اور احکامات کی لفظاً اور معناً پیروی کرتے تھے۔

رسول اللہ صلعم کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ نے اپنا سب مال عوام کے فایدہ کے لئے دے دیا۔ کچھ اور صحابی تھے جنھوں نے اپنا نصف مال اسی طرح دے دیا یہاں تک کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو دوسرے مسلمان کی خاطر طلاق دے دی۔

اور ایسے آدمی بہت کم تھے جو ایسی حالت میں جب ان کے ساتھیوں کی زندگی کی احتیاجات پوری نہ ہوتی ہوں دولت پر قبضہ کرنے سے نہ شرماتے ہوں۔ دولت اور ملکیت سے ذمہ داری اور بوجھ بڑھ جاتا تھا۔

قرآن نے نہایت شد و مد کے ساتھ ان لوگوں کی مذمت کی جو " دولت کو جمع کرتے ہیں اور اور مہر تالے میں بند کر کے رکھتے ہیں (سورہ ۷۰ آیت ۸)

اس نے ان لوگوں کو برکت دی جن کے مال کا ایک مناسب حصہ ان لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو سوال کرتے ہیں یا جو محروم ہوتے ہیں۔ (سورہ ۷۰ آیت ۲۴ اور ۲۵)

رسول اللہ صلعم نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ وہ خود اور ان کے قریبی اور عزیز ترین رشتہ دار سب سے پہلے ان باتوں کی پیروی کریں جن کی وہ تلقین کرتے تھے۔ جو احکامات ان کو جاری کرنا ہوتے تھے سب سے پہلے وہ ان سے اپنے خاندان کے افراد کو مطلع فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلعم جو کچھ ان کے پاس دن میں ہوتا تھا شام کو اُسے دے ڈالتے تھے یہاں تک کہ شام کے کھانے تک کے لئے ان کے پاس کچھ باقی نہیں بچتا تھا۔

اسلام میں ہر چیز خدا کی ملکیت ہے۔

آج سے تیرہ سو صدی قبل اس لاثانی مصلح نے یہ صاف اور واضح طور پر تبلا دیا تھا کہ :-

" انسان کی اولاد کو اس سے زیادہ کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اُسے رہنے کے لئے گھر اپنی برہنگی کو چھپانے کے لئے ایک کپڑے کا ٹکڑا ، اور کھانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا اور تھوڑا پانی مل جائے "

(ترمذی میں بروایت عثمانؓ)

تقسیم دولت کے بارے میں رسول اللہ صلعم نے مندرجہ ذیل قاعدہ بنا دیا :-

" جس شخص کے پاس لادنے والے جانور زیادہ ہوں اُسے انھیں ان لوگوں کو دے دینا چاہیئے جن کے پاس بالکل نہ ہوں اور جس کے پاس کھانے کا سامان زیادہ ہو اُسے اس کو دیدینا چاہیئے جس کے پاس بالکل نہ ہو "

" رسول اللہ صلعم نے اور کئی دوسری چیزوں کا ذکر کیا جس کی بنا پر ہم لوگوں نے (جو وہاں موجود تھے) یہ محسوس کیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو کسی زاید چیز کے رکھنے کا حق نہیں ہے "

(مسلم اور ابوداؤد میں ابوسعیدؓ کی روایت سے)

زاید سے کیا مراد ہے اس کا تعین اُس حدیث سے ہو جاتا ہے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے اور جس کے ذریعہ سے نجی اور ذاتی ملکیت کو رہنے کے مکان، پہننے کے لئے کچھ کپڑے اور روزانہ کھانے کے لئے کچھ خوراک تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اس طرح مال کی ملکیت کو نہ صرف نظری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ اسلام میں انفرادی ملکیت کی گنجائش اُس سے بھی کم تھی جتنی بالشوکوں کے یہاں ہے۔

ملکیت کو محدود کرنے کے علاوہ اسلام نے اپنے وراثت کے منصفانہ قوانین کی رو سے نہ صرف بڑی بڑی جاگیروں یا کروڑپتیوں کی نسل کو جاری رہنے سے روکا بلکہ ایک ہی خاندان کے لوگوں میں تقسیم دولت کو نہایت صحیح بنیادوں پر قائم کر دیا۔ اسلام کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کا وقف علی الاولاد کا قانون ہے جس کے ذریعہ اپنی اولاد کے وراثت کے حق پر بھی پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ والدین جس جایداد کو منفعت عامہ یا خیرات کے لئے

وقف کردیتے ہیں اس کی مکمل ملکیت سے ان کی اولاد محروم ہو جاتی ہے اگرچہ ان کے لئے اتنی کافی آمدنی باقی رہتی ہے جس سے وہ مصیبت یا افلاس کا شکار نہیں ہو سکتے۔ وہ اس جایداد کو محض متولی کی حیثیت سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس کو تعیشات میں ضایع نہیں کر سکتے۔

اسی طرح اسلام نے ملکیت ذاتی پر اور بھی گوناگوں پابندیاں لگادی ہیں۔

جب ابوذر غفاریؓ نے قرآن کی آیتوں کی تفسیر اس طرح پر کی کہ اس سے ملکیت ذاتی کی تنسیخ ہوتی تھی تو یہ سوال اٹھا تھا کہ اور آج بھی علما اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ اگر اسلام ملکیت ذاتی کو ختم کرنا چاہتا تھا تو اس نے وراثت اور زکوٰۃ کے قوانین اور سرمایہ داری کے خلاف دوسرے قاعدوں اور پابندیوں کو کیوں بنایا۔

جو لوگ اس لاثانی مصلح کے ذہن اور طریقوں کو جانتے ہیں ان کے لئے اس سوال کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں ہے۔

ان کا مقصد تو یہ تھا کہ تمام مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو تمام زمانوں اور مقاموں اور معاشرتوں کے لئے چاہے وہ ترقی کی کسی منزل پر کیوں نہ ہوں رفع کر دیں۔ انھیں رحمۃ العالمین بناکر بھیجا گیا تھا۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ قدرت نے ہر انسان کے اندر جو نیکی رکھی ہے اس سے ہر امکانی فایدہ معاشرت کی بہبودی کے لئے حاصل کریں۔

ہم جانتے ہیں کہ فطرت نے دنیا کا کارخانہ کچھ اس نہج پر بنایا ہے کہ اس نے انسان کے اندر جسمانی آرام، دولت، ملکیت اور اضافہ نسل کی محبت کو بھی رکھ دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دولت اور ملکیت کے ساتھ آرام و عافیت کی زندگی، انسانوں کے کاموں اور ان کی محنتوں کے لئے آج ایک بہت بڑی محرک بن گئی ہے۔ انسانی نسل کی توسیع کے لئے قدرت نے عورت اور مرد کے اندر اولاد کی محبت کو رکھ دیا ہے۔ جانوروں میں بھی نہ صرف اپنے بلکہ غیروں کے چھوٹے بچوں کے ساتھ اُنس اور الفت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان کے جذبات اس لحاظ سے بھی دوسری مخلوقات سے مختلف ہیں۔ جانوروں میں تو محبت اور الفت بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن

انسان کی محبت اپنی اولاد کے ساتھ زندگی بھر قایم رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جب وہ موجود نہ ہو، اور مر جائے جب بھی ان کے آرام و آسائش کے لئے کچھ انتظام باقی رہے۔

ان حقایق کی موجودگی میں اسلام نے یہ چاہا کہ ایک طرف تو کام کے ان ارادی اور قدرتی محرکات کو زبردستی ختم نہ کیا جائے جیسا کہ بالشوک ان کو انسانی جبلّت اور قدرتی جذبات کے خلاف ختم کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اُس نے چاہا کہ معاشرت اور ریاست کو ان جبلّی خواہشات کے خراب اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔

ہمیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ انسان فطرتاً بدی کی طرف رجحان لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان کو جس ذات نے پیدا کیا اور ترقی دی ہے وہ بُرائی سے پاک ہے۔ اُس نے بنی نوع انسان میں بھی بُرائی کو پیدا نہیں کیا۔ آدمی اپنی قوتوں، اہلیتوں اور جبلّتوں کا غلط استعمال کر کے اپنے لئے بدی کو خود پیدا کرتا ہے۔ چونکہ خدا نے انسان کو ایک حد تک آزاد پیدا کیا اس لئے صحیح راستہ پر چلانے کے لئے بھی خدا اپنی مرضی کو انسان پر ہمیشہ عاید نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے انسان کو اس حق سے محروم نہیں کیا کہ وہ اپنی اچھی صفات کو بھی اگر وہ چاہے تو غلط طریقہ پر استعمال کر سکتا ہے۔ انسان کو ایک مشین کا پُرزہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ قرآن کہتا ہے

"خدا نے تمہیں اپنی ذہانت کو استعمال کرنے کی تلقین کی ہے (سورہ ؟) [۵۱]

انسان کے اندر بہت سے جذبات ہیں۔ اگر ان کا استعمال مناسب طریقہ پر کیا جائے تو یہ فایدہ مند ہوتے ہیں نہیں تو ان سے جماعت کو بلکہ بعض وقت خود افراد کو نقصان پہنچتا ہے بعض وقت اس کی عقل بھی اُسے گمراہ کرتی ہے۔

انسان اپنی خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اگر اُسے دولت سے محبت ہوتی ہے تو وہ اپنی تمام دماغی قوتوں کو اور تمام جسمانی قوتوں کو اس کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ وہ جس

---

[۵۱] یہ حوالہ قدوائی صاحب نے صحیح نہیں دیا ہے۔ ایڈیٹر

پیشہ کو بھی اختیار کرتا ہے اس میں دوسروں سے سبقت لے جانے کے لئے اپنی پوری دماغی قوت کو صرف کرتا ہے۔ وہ خطرے برداشت کرنے کے لئے قربانیاں کرنے کے لئے بھی تیار رہتا ہے۔ فرض کیجئے حالات ناسازگار نہیں ہیں اور وہ اپنے کام اور پیشہ میں کامیاب ہوتا ہے۔ فرض کیجئے وہ اپنے پیشہ میں مہارت پیدا کرلیتا ہے اور اپنے دماغ کے ذریعہ دولت پیدا کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ماہرانہ مشورہ کے لئے معاوضہ طلب کرتا ہے اور آرام اور خوشی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ جماعت کو نقصان نہیں پہنچاتا تو اسلام اس کو اس بات کی اجازت دے گا۔ بالشوکوں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ اس کو ایسا نہیں کرنے دیں گے اگرچہ وہ غیر ملکی ماہروں کو زیادہ اجرتیں اس وقت بھی دیتے ہیں[۵۲] لیکن جب وہ اُسے بند کریں گے تو نہ صرف فرد کو نقصان پہنچائیں گے بلکہ جماعت کو بھی نقصان پہنچائیں گے کیونکہ اس کے بعد لوگوں میں ماہر بننے کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہے گا۔

فرض کیجئے ایک آدمی کو دولت سے محبت ہے وہ اس کے لئے اپنے دماغ سے کام لے کر ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جو جماعت کے لئے بھی مفید ہے اور بازار میں فروخت بھی خوب ہوتی ہے۔ اسلام اُسے اس وجہ سے ملامت نہیں کرے گا کہ اُسے اپنی کتاب کے دام اچھے مل رہے ہیں۔ لیکن اسلام اس سے اس بات کی توقع کرے گا کہ جو روپیہ اس نے اپنے دماغ اور قلم سے پیدا کیا ہے اس کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ اسلام اس سے کہے گا کہ دولت کا صحیح مالک خدا ہے اور کتاب کا مصنف صرف اس کا متولی ہے۔ اس کی زندگی کے ہر لمحہ میں ناسازگار حالات پیدا ہوسکتے تھے اور وہ کام کی تکمیل اور کامیابی میں مزاحم ہوسکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے اُسے اس تحفظ کے لئے خدا کا ممنون ہونا چاہیئے اور مستحقوں کو اپنی دولت میں شریک کرنا چاہیئے۔ اُسے زکوٰۃ بھی ادا کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اسلام دوسرے قوانین کے ذریعہ سے جو سرمایہ داری کے خلاف ہیں اُسے سرمایہ دار نہیں بننے دے گا۔ ایسا شخص ہر ایک سے بلکہ کل جماعت سے یہ کہ سکتا ہے کہ اپنی

---

۵۲ لیکن اب تو بالشوک ملکی ماہر مزدوروں کو بھی زیادہ اجرتیں دینے لگے ہیں۔ ایڈیٹر

پیدا کی ہوئی دولت کا مالک وہ خود ہے لیکن خدا سے وہ ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ خدا نے اُس کو اعلیٰ دماغ عطا کیا اور خدا نے ہی اُس کے لئے حالات کو سازگار رکھا۔

یا فرض کیجئے کہ ایک آدمی کو اپنے خاندان یا اولاد سے جو محبت ہے وہ اس کے لئے کام یا پیشہ کو بہترین طریقہ پر کرنے کی محرک ہے۔ اسلام اس محرک کو ختم نہیں کرے گا۔ اُس نے وراثت کے منصفانہ قوانین بنا دئے ہیں جن کے ذریعہ سے اس کا خاندان اور اس کی اولاد اُن چیزوں سے فایدہ اٹھا سکے گی جو وہ ان کے لئے ترکہ میں چھوڑ جائے گا اور اس طرح وہ افلاس اور محرومی سے بچ سکیں گے اور اس کے نام کو اُس کے بعد جاری رکھیں گے۔

اسلام کی بہترین سعی اس بات کی طرف رہی ہے کہ ایک شخص کی آزادی پر صرف اتنی ہی پابندی لگائی جائے جو جماعت کے مفاد کے لئے اور خود اس کے مفاد کے لئے قطعی طور پر ناگزیر ہے اور انسان کے لئے بہترین کوشش کرنے کی جو ترغیبات ہیں وہ باقی رہیں۔ اسی بنا پر اسلام کے قوانین غیر تغیر پذیر نہیں ہیں۔ جبر کے استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکا اسلام نے پرہیز کیا ہے۔ اُس نے کوشش کی کہ ہر شخص اچھے کام اپنی مرضی، عادت کی قوت یا طبعی رجحان کی وجہ سے کرے۔ اسی لئے اس نے اچھے کاموں کے طبعی محرکات کو ختم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ چند اچھی پابندیوں کے بعد ترکہ اور وراثت کی اجازت دی گئی۔ اور مرنے کے بعد ایک شخص کی جایداد کو جبراً ضبط نہیں کیا جاتا۔ اسلام نے ایسے قاعدے اور قانون بنائے جن سے ایمانداری اور جایز طور پر دولت حاصل کی جائے اور جب اس دولت کو ترکہ میں چھوڑا جائے تو بھی اُس سے جماعت کو فایدہ پہنچتا رہے۔ وقف علی الاولاد کے ذریعہ باپ کی محنت کی کمائی ہوئی دولت کو اُس کے بیٹے بھی ضایع نہیں کر سکتے۔ وہ پابند ہو جاتے ہیں کہ اُسے اپنی عرضی یا موج یا ذاتی تعیش کے لئے خرچ نہ کریں بلکہ عام بہبود کے لئے صرف کریں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ خاندانی نام یا شہرت کے باقی رہنے کا بھی اس کے ذریعہ بندوبست ہو جاتا ہے۔

اسلام کا خاص مقصد یہ رہا ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جو سرمایہ داری کے خلاف ہوں جن سے دولت تقسیم ہو سکے، سب کو مساوی مواقع مل سکیں اور ایک غیر طبقہ وارانہ جماعت وجود میں

آسکے اور تمام دنیا میں ایک واحد برادری قائم ہوسکے۔

اگر اسلام کے تمام قوانین کی لفظاً اور معناً پیروی کی جائے تو ملکیت ذاتی کی تمام خرابیاں رفع ہوجائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک شخص اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھے تو ذاتی ملکیت یا خدا کی راہ میں صرف کرنے کی پوری آزادی جماعت کے لئے نقصان رساں ہونے کی جگہ ایک نعمت اور برکت ثابت ہوگی۔ اگر آدمی اپنی دولت کو ایک وقف سمجھ کر استعمال کرے اور یہ خیال رکھے ایک سمیع وبصیر اور رحمان ورحیم خدا نے اُسے یہ دولت عطا کی ہے تو یہ بات جماعت کے لئے اس سے زیادہ مفید ثابت ہوگی کہ ایک آدمی بالکل غریب رہے اور صرف اتنا ہی جمع کرے جو صرف اس کو ذاتی طور پر زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔

بالشوک جانتے ہیں کہ ان کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ افراد کو بالکل آزادی نہیں دیتے یہ ایک مطلق العنان آمریت قائم کردیتے ہیں چاہے یہ آمریت مزدوروں کے طبقہ کی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بالشوزم افراد کو غلام بنا دیتا ہے چاہے یہ غلامی جماعت ہی کی کیوں نہ ہو۔ بالشوزم میں ہر موقع پر ایک شخص کو دوسرے اشخاص کے سخت احکام کی اطاعت کرنا پڑتی ہے یہ کرو یہ نہ کرو۔ اس حکم دینے والی اور حکومت کرنے والی جماعت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صرف چند افسروں اور عاملوں تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے یہ چند اشخاص کی حکومت ہوجاتی ہے بلکہ چند افراد کی بھی نہیں صرف ایک فرد واحد یعنی آمر مطلق کی حکومت ہوکر رہ جاتی ہے۔

اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے لئے کسی شخص یا کسی گروہ یا طبقہ کی آمریت نہیں رکھی گئی ہے۔ کوئی مسلم کسی دوسرے شخص یا کسی گروہ اور طبقہ کا غلام نہیں ہے۔ وہ ایک اور صرف ایک آمر مطلق کا غلام ہے لیکن وہ انسان نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو عقل وفہم سے بالاتر ہے۔ ہر شخص چاہے وہ کتنا ہی طاقتور اور ذی اقتدار کیوں نہ ہو حتیٰ کہ رسولوں میں برگزیدہ ترین رسول بھی سب اس کے غلام ہیں۔ لیکن اس غلامی اور دوسری غلامیوں میں فرق ہے۔ یہ غلامی اس کی ہے جو بےنظیر اور بے مثال ہے۔ جو ایک لامحدود ابدی اور ازلی وجود کا مالک ہے جس کی نہ کوئی شکل ہے نہ جگہ جس کے

نہ اولاد ہے نہ اس کے مشابہ کوئی چیز ہے۔ جو ہمارے نہایت پوشیدہ خیالات کا رازدار ہے جو علیم و بصیر ہے۔ جو اپنی قدرت کے لزوم کی وجہ سے موجود رہتا ہے اور اپنی ذات میں سے اپنی تمام اخلاقی اور دماغی قوتوں کو حاصل کرتا ہے۔

اسلام میں صرف اسی وجود کو حکم دینے کا حق حاصل ہے۔ وہی صرف انسان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ لاغالب الا اللہ وہی خطا اور قصور سے پاک اور منزہ ہے۔ انسانوں کی اکثریت بھی ہمیشہ صحیح راستہ پر نہیں ہوتی۔ بعض وقت صرف ایک آدمی راہ راست پر ہوتا ہے۔ ایسے مواقع لینن کی زندگی میں بھی پیدا ہوئے۔ اس لئے ایک آدمی کسی ایسے دوسرے آدمی کی اطاعت کیوں قبول کرے جس کے متعلق امکان ہے کہ وہ غلطی پر ہو؟ آدمی کیوں اس وجود کے احکام کی اطاعت نہ کرے جس کے متعلق یقین ہے کہ وہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ یہ جاننے کے بعد کہ کوئی . . . . انسان یا انسانوں کا گروہ یا ان کی اکثریت یا ان کی پوری تعداد غلطی سے مبرا اور منزہ نہیں ہے کون ایسا شخص ہے جو خدا کے سامنے سر نہیں جھکائے گا؟ کون ایسا شخص ہے جو دوسروں کا فرماں بردار غلام بننے کی جگہ یہ نہ چاہے گا کہ اپنے ضمیر خیال اور عمل کی آزادی کو قائم رکھے؟

انہی مصلحتوں کے پیش نظر اسلام نے نجی ملکیت میں کچھ لچک رکھی ہے تاکہ ہر آدمی کی آزادی اور اس کا اختیار تمیزی باقی رہے۔ نیز یہ کہ کام کے لئے جو اس کے قدرتی محرکات ہیں جہاں تک وہ پسندیدہ اور فطری ہیں وہ بھی باقی رہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام نے ملکیت ذاتی کی تنسیخ کی ہوتی تو قرآن میں وراثت کے قوانین درج نہ کئے جاتے ان کی توجہ میں اس بات کی طرف مبذول کراؤں گا کہ خدا کا ایک نام الوارث بھی ہے اور قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ "انت خیر الوارثین" کہ تو بہترین وارث ہے۔ اور وہ سوال کرتا ہے " اور تمھارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ تم خدا کی راہ میں نہ خرچ کرو؟ درآنحالیکہ اللہ ہی تو آسمان اور زمین کا وارث ہے (سورہ ، ۵۷ آیت ۱۰)۔

اس سے ثابت ہوا کہ قانون وراثت کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے نجی اور ذاتی ملکیت کی تنسیخ نہیں ہوتی۔ ہر سچا مسلمان اس بات کو زیادہ پسند کرے گا کہ وراثت کے قوانین کو نظر انداز کر دے اور

اپنے مال اور دولت کو خیرالوارثین کی وراثت میں دے دئے۔

یہ سمجھنا غلطی ہے کہ بالشوکوں نے تمام نجی اور ذاتی ملکیت کو ختم کردیا ہے ...... نجی ملکیت سے بالشوک کا خاص مطلب "ذرایع پیدائش دولت" سے ہے۔ اشترکیوں کے اعلان حقوق" میں یہ لکھا گیا ہے کہ "کمیونزم جماعت کی پیداوار پر قبضہ کرنے کی طاقت سے کسی شخص کو محروم نہیں کرتا" جس کا مفہوم یہ ہے کہ نجی ملکیت کی بعض شکلوں کو جائز طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے مثلاً کپڑے، مکان، باغ، چھوٹا کھیت، لیکن صرف ذاتی استعمال کے لئے تجارت یا نفع کے لئے نہیں۔

بالشوزم درمیانی طبقہ کے ان لوگوں کا جو جایداد کے مالک ہوتے ہیں دشمن ہے۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو کہتا ہے کہ "درمیانی طبقہ کے جایداد کے مالکوں کو بلاشبہ راستے سے صاف کردینا چاہیئے"۔

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ہر قسم کا ترکہ روس میں ختم نہیں کیا گیا ہے۔ پابندیاں لگادی گئی ہیں جیسی اسلامی قانون کے ماتحت لگائی گئی ہیں اگرچہ پیمانہ اور طریقہ مختلف ہے۔ روس میں اور دوسرے کئی یورپ کے ملکوں میں ایک شخص کے مرنے کے بعد حکومت کی طرف سے "محاصل موت" یا "محاصل ترکہ" لگائے جاتے ہیں۔

بہرحال، موجودہ زمانہ میں روس میں تجربہ جاری ہے۔ اور یہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ صنعتی جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اگر بالشوکوں کو فتح ہوئی تو اشتمالیت تمام دنیا پر چھا جائے گی اور ملکیت ذاتی آج جس طرح آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اس حیثیت سے غائب ہوجائے گی۔ اگر انھیں ناکامی ہوئی تو کسی نہ کسی شکل میں ملکیت ذاتی کا رواج روس میں بھی ہوجائے گی۔

ہم نے حالات سے جو کچھ اندازہ کیا ہے اُس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالشوک ازخود اُس سمجھوتہ کو اختیار کریں گے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ نصب العین تو یہ باقی رہے گا کہ ملکیت ذاتی کو قطعی طور پر ختم کردیا جائے لیکن ایسے ذرایع بھی اختیار کئے جائیں گے جن سے ذاتی محرکات اور بچوں اور خاندان کی محبت کے طبعی میلانات وغیرہ کو اظہار کا موقع مل سکے گا۔

نقشے کے مطابق شہر بسانا

(محمد عاقل صاحب ایم۔ اے، استاد معاشیات جامعہ)

ہندوستان کے شہر آج کل جس انداز سے بسے ہوئے ہیں انھیں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہمارے دیس میں سمجھ بوجھ اور سگھڑ پن کا بڑا کال ہے۔ اپنی سینکڑوں ہزاروں ضرورتوں کو بھینٹ چڑھا کر جو پونجی اکٹھی کی جاتی ہے وہ اس ملک میں دو ہی کاموں پر خرچ کی جاتی ہے ایک بیاہ شادی پر اور دوسرے گھر بنانے پر۔ اس لئے گھر بنانے کے لئے روپیہ کی کمی نہیں ہوتی۔ روپیہ خوب دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے۔ مکانوں کو الگ الگ دیکھا جائے تو سارے مکان بُرے بھی نہیں ہوتے لیکن جس طرح تنگ، گنجان اور پیچ در پیچ گلی کوچوں میں مکانات بکھرے ہوتے ہیں اور گھر کے گندے پانی کی نکاسی اور کوڑے کرکٹ اور میلے کے پھینکنے کا خراب انتظام ہوتا ہے اس کی وجہ سے ہمارے شہر بالکل دوزخ معلوم ہوتے ہیں۔ جو شہروں کا حال ہے وہی قصبوں اور دیہاتوں کا بھی ہے۔ گنتی کے چند بڑے شہروں اور چھوٹے شہروں کی سول لائنوں اور چھاونیوں کو چھوڑ کر جہاں کچھ رونق اور صفائی نظر آتی ہے باقی ہر جگہ مکان دوکانیں سڑکیں گلیاں کچھ ایسے بے ڈھنگے پن سے ایک دوسرے سے ملائی جاتی ہیں کہ کہاں سر ہے کہاں پیر کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ شہر ایک بھول بھلیاں بن جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رہنے والوں کے دماغوں میں بڑی الجھی ہوئی گانٹھیں پڑی ہوئی ہیں جن کا سلجھانا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص لوبھ اور لالچ کے جال میں پھنسا ہوا نظر آتا ہے۔ صرف اپنا آرام سوچتا ہے دوسرے کی بے آرامی کی اسے بالکل فکر نہیں ہوتی۔ پھر اپنا آرام سوچنے میں بھی عقل و تمیز سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ نہایت مورکھ پن سے تجویزیں اور منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنا فایدہ ہو یا نہ ہو دوسروں کے نقصان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ جہاں موقع دیکھا زمین پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے ایک چبوترہ نکال دیا یا ایک چھجا یا چھتا بنوا دیا یا پرنالہ، موری یا نالی

کھلوادی۔ گھر کے کوڑے کا انبار لگا دیا۔ پھر اس کی وجہ سے بیماری یا وباء پھیلے، تباہی اور موت آئے انھیں اس سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ لوگ اپنے مکان کو اچھا اور بڑا اور دوسرے کے مکان کو خراب اور چھوٹا دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ایک اچھے مکان کی سوبھا اور رونق دوسرے اچھے مکان سے بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔ لیکن نفسا نفسی، آپا دھاپی، تجھے مجھ سے کیا اور مجھے تجھ سے کیا کا جو نقشہ ہمارے دیس کے شہروں میں نظر آتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ جب تک شہر کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام ہمارے ہاتھوں میں نہ تھا اس وقت تک تو خیر اس بات کے لئے عذر موجود تھا اور ہم اپنی صفائی میں کہہ سکتے تھے کہ ہمیں مل جل کر کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے بننے اور ان میں ہمارے با اختیار نمائندوں کے پہنچ جانے سے یہ عذر بھی جاتا رہا ہے اور اب دنیا کی نگاہ میں ہم خود ہی مجرم بن گئے ہیں اس میں شک نہیں ہندوستان کی غریبی اور افلاس سے بھی شہروں میں ویرانی، اداسی اور بے رونقی پیدا ہوتی ہے لیکن پھر بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ آج کل تو ہم موری کے کیڑے کی طرح کیچڑ میں لوٹ رہے ہیں اور اپنی اس حالت میں مگن ہیں۔ ہمارے دل میں اس حالت کے بدلنے کی امنگ اور چاہ پیدا ہونا چاہیئے۔ اس لئے آج کی بات چیت میں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شہر اور دیہات کو کس طرح بارونق اور آرام دہ بنایا جا سکتا ہے کس طرح ان میں ایک امتیازی وصف اور سب شہروں سے جدا ایک خاص رنگ پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس میں میونسپلٹیاں ڈسٹرکٹ بورڈ مکان بنانے والی کمپنیاں اور افراد کس طرح باہم مل جل کر کام کر سکتے ہیں۔

نقشہ کے مطابق شہر بنانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ شہر بالکل نیا بسایا جائے اور دوسری یہ ہے کہ جو شہر موجود ہے اسی میں توسیع، ترمیم اور اصلاح کی جائے۔ سرے سے بالکل نیا شہر بسانے کا موقع تو بہت کم ملتا ہے۔ البتہ پرانے شہروں میں ترمیم، اصلاح اور توسیع کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ جہاں سول لائن اور چھاونیاں بنانے کا موقع ہو وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ پرانے شہر سے ذرا ہٹ کر بالکل ایک نئی آبادی بسائی جائے اس طرح جو

لوگ شہر کو ترقی دینا چاہتے ہیں ان کے لئے نئے شہر کے بسانے کی تمام سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر دونوں کام ساتھ ساتھ چلیں یعنی ایک طرف پرانے شہر کی صفائی، رونق اور خوبصورتی بڑھائی جائے اور دوسری طرف سول لائن کو نئے نمونہ کا بنایا جائے اور دونوں ایک دوسرے سے قریب آتے جائیں تو کچھ دنوں میں دونوں کے مل جانے سے سارے شہر کی رونق اور دلکشی بڑھ جائے گی بعض ایسے بھی آدمی ہیں جن کے خیال میں اس صورت میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرانے شہر کے پاس نئے شہر کے بسانے سے پرانے شہر کے اور زیادہ ویران ہو جانے کا ڈر ہے۔ سب اچھے مکان اور خوش حال اور تمیزدار لوگ نئے شہر میں جا بسیں گے اور صرف برے مکان غریب اور بدسلیقہ آدمی پرانے شہر میں رہ جائیں گے۔ یہ اعتراض ہے بہت وزنی لیکن اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں جگہوں کا انتظام ایک ہی میونسپلٹی کے ہاتھ میں رہے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ پرانی جگہ کے رہنے والوں کے نمائندے اپنے ساتھ ناانصافی نہ ہونے دیں گے۔ اور ایسی تدبیریں اختیار کریں گے جن سے لوگ اپنے آبائی مکانوں کو چھوڑ کر نہ جانے پائیں گے۔

شہر کی ترقی کے لئے منصوبے دو طرح کے بنائے جاتے ہیں۔ ایک کو ہم باقاعدہ منصوبہ کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو بے قاعدہ منصوبہ۔ باقاعدہ منصوبہ میں تو ہر چیز ترتیب سے رکھی جاتی ہے سڑکیں جو خانے کی شکل کی ہوتی ہیں چوراہے، چوک، فٹ پاتھ، سڑک کے کنارے کے درخت، نالیاں، روشنی کے کھمبے، رہنے کے مکان، سرکاری عمارتیں، دوکانیں سب قرینے اور ترتیب سے مناسب جگہ پر رکھے جاتے ہیں۔ ہر چیز کا ایک مقررہ نمونہ ہوتا ہے جس کی پابندی کی جاتی ہے۔ لیکن بے قاعدہ منصوبہ میں چیزوں کو ایک ہی طرح کے نمونہ کے مطابق نہیں بنایا جاتا بلکہ اس میں خاصا تنوع اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ منصوبوں کے اس فرق کی وجہ سے دو الگ الگ مسلک پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے طریقہ اور قاعدہ کو ہی اچھا سمجھتا ہے۔ لیکن پرانے شہر کو ترقی دینے کے لئے باقاعدہ منصوبہ کے اختیار کرنے میں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

اس لئے یہاں تو بے قاعدہ منصوبہ پر عمل کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نئے شہر کے بسانے میں باقاعدہ منصوبوں پر عمل سہل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی بہت سے آدمی باقاعدہ اور بے قاعدہ منصوبوں کے میل کو ہی زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

ان ابتدائی باتوں کو سمجھنے کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ منصوبہ کے مطابق شہر بنانے کے لئے کن کن چیزوں پر دھیان دینا ضروری ہے۔ اس ضمن میں سات خاص باتیں ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ میں ہر ایک کے بارے میں مختصر طور پر کچھ باتیں بیان کروں گا۔

(۱) سب سے پہلے جس شہر کو نقشہ کے مطابق بنانا ہے اس کا جائزہ یا سروے کرنا ضروری ہے۔ اس سروے میں سب سے پہلی بات جو دیکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ شہر کی ترقی کا رجحان کس طرف ہے اور اس کی ضروریات کیا کیا ہیں۔ اس کا محل وقوع کیسا ہے۔ تجارتی مرکز ہے یا صنعتی مرکز۔ صوبہ ریاست کی راج دھانی ہے یا تعلیم اور تیرتھ کی جگہ یا سمندر کے کنارے واقع ہے یا پہاڑ کی چوٹی پر وغیرہ وغیرہ۔ اگر پرانے شہر کو ترقی دینا ہے تو اس کی تمام موجودہ عمارتوں اور سڑکوں نالیوں اور پانی کے حاصل کرنے کے ذریعوں، کھلی جگہوں اور آمد و رفت کے مرکزوں، بازاروں اور دفتروں وغیرہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ زمین کے مالکوں سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ نیز عمارت بنانے کا جو سامان مقامی طور پر آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے اس کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ غرضکہ ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ منصوبہ بنانے والے کے پاس موجود ہونا چاہیئے۔

(۲) دوسری بات جس کی طرف شہر کا نقشہ بناتے وقت دھیان رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ شہر کے حدود یا اس تک پہنچنے کے راستے کیسے ہیں۔ بہت سے شہروں میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ دیہات اور شہر کو تقسیم کرنے والی کوئی حد فاصل نہیں ہوتی اور شہر کے کنارے کے مکان اکثر بہت خراب اور گندے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر کے کنارے پر کھیتوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ بھی ویران سا نظر آتا ہے اور اس میں خاک اڑتی دکھلائی دیتی ہے جس سے شہر میں داخل ہونے والے شخص کے دل پر شہر کے بارے میں پہلا اثر بہت خراب پڑتا ہے پرانے زمانہ میں شہر پناہ اور

فصیلوں کے ذریعہ شہر اور دیہات کا فرق قائم رہتا تھا۔ لیکن اب ریلوں کا رواج ہو گیا ہے۔ اس لئے شہر میں داخل ہونے کا راستہ زیادہ تر ریلوے اسٹیشن بن گئے ہیں۔ اب ایک اجنبی نووارد کے دل پر ریلوے اسٹیشن کی شکل و صورت اور اس کے قریب کے مکانوں کی حالت کا اثر سب سے پہلے پڑتا ہے۔ اس لئے کوشش یہ کرنا چاہیئے کہ ریلوے اسٹیشن کے باہر خوبصورت چوک سا بنا دیا جائے اور اس چوک کے آگے ایسے دل لبھانے والے پارک ہوں جن میں سے گذر کر لوگ شہر میں داخل ہو سکیں۔ سڑک کے ذریعہ شہر میں داخل ہونے والوں کے لئے بھی پارک میں سے ہو کر گذرنا دلچسپی اور دلبستگی کا باعث ہو گا اور اس طرح شہر و دیہات میں فرق و امتیاز قائم ہو جائے گا۔

(۳) تیسری چیز جو نقشہ بنانے والے کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے وہ شہر کے مرکز اور چوک ہیں۔ شہر کی خوبصورتی کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ ایسی عمارتیں یا مکان جن میں مرکز بننے کی اہلیت ہے مناسب جگہ پر رکھے جائیں۔ مثلاً میونسپل ہال اور دوسری سرکاری عمارتیں، لائبریری، مسجد، مندر، تھیٹر، مارکٹ، کونسل چیمبر، کلاک ٹاور، فوارے، اسٹیچو، گھاٹ، یونیورسٹی، کالج اور اسکول کی عمارتیں، ڈاکخانہ، تحصیل تھانہ، پارک ریس کورس بندرگاہیں وغیرہ وغیرہ ان سب میں مرکز بننے کی اہلیت ہے۔ شہر کو اس طرح ترتیب دینا چاہیئے کہ یہ سب نمایاں جگہ پر رہیں اور شہر کی رونق اور خوبصورتی کو بڑھائیں۔

(۴) چوتھی بات جو شہر کا نقشہ بنانے والے کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے وہ شارع عام یعنی خاص خاص سڑکوں کی ترتیب اور ان کی دیکھ بھال ہے۔ سڑکوں کا سب سے پہلا کام تو آمد و رفت کی سہولت پیدا کرنا ہے۔ ان کا دوسرا کام یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے عمارتیں بنانے کے لئے عمدہ جگہیں نکل آتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی قسم کی سڑکوں سے یہ دونوں کام پورے ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو سڑکیں آمد و رفت کے لئے بہت مناسب ہیں ان پر مکان خوبصورت وضع کے نہ بن سکیں اور جن سڑکوں پر مکان خوبصورت بن سکتے ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ آمد و رفت کے لئے اچھی نہ ہوں۔ اس لئے کبھی ایک سہولت کو قربان کرنا پڑے گا اور کبھی دوسری کو۔ آمد و رفت کی

سہولت اس میں ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں کم سے کم فاصلہ طے کرنا پڑے اور آدمی تیزی کے ساتھ دوسری جگہ تک پہنچ جائے۔ شارع عام تین طرح کے بنائے جاتے ہیں۔ ایک تو چوخانہ کی شکل کے راستے ہوتے ہیں جن میں سڑکیں ہر جگہ زاویہ قائمہ یعنی رائٹ انگل بناتی ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کے لئے اکثر ایک سڑک کی جگہ دو یا دو سے زاید سڑکوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے سڑکوں کی دوسری قسم پیدا ہوئی ہے جس میں ان چوخانے والی سڑکوں کے ساتھ کچھ ایسی سڑکیں بنادی جاتی ہیں جو انھیں درمیان سے کاٹتی ہوئی گذرتی ہیں۔ ان کے علاوہ سڑکوں کی تیسری قسم وہ ہے جس میں سڑکیں خاص خاص مرکزوں کے چاروں طرف مکڑی کے جالے کی طرح بناری جاتی ہیں۔ سڑکوں کی تقسیم کے بعد دوسری قابل لحاظ چیز سڑکوں کی ساخت ہے۔ اچھی بنی ہوئی سڑک سے طبیعت میں شگفتگی اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے کنارے کے درخت اور روشنی کے کھمبے لگانے اور نالیاں نکالنے میں بھی اگر سلیقہ سے کام لیا جائے تو سڑک کے حسن میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۵) پانچویں بات جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ اس بات کا فیصلہ ہے کہ عمارتیں کہاں کہاں کس ترتیب کے ساتھ بنائی جائیں اور آباد علاقوں کی سڑکیں کس طرح نکالی جائیں۔ شارع عام کا تعین کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ اسی کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے نقشہ بنانے والے کو شہر کی سب عمارتوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ خاص خاص عمارتوں مثلاً مسجدوں، مندروں، لائبریریوں، ہوٹلوں، مدرسوں، مارکٹوں، سرکاری دفتروں وغیرہ کی بابت پہلے سے طے کرلینا چاہئے کہ ان کے لئے کون سی جگہ موزوں ہوگی۔ باقی مکانوں کے محل وقوع کے بارے میں بھی ایک عام خاکہ بنالینا چاہئے۔

(۶) چھٹی بات جو سوچنے کے لایق ہے وہ مکانوں کے قطعات کا فیصلہ ہے۔ نیا شہر بساتے وقت تو زمین کو قطعات میں شروع سے تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ان پر ترتیب کے ساتھ مکان بن سکتے ہیں۔ لیکن جہاں پہلے سے مکان بنے ہوئے ہوں وہاں بھی مکان بنانے والوں کو اس بات کا پابند

کیا جا سکتا ہے کہ مکان کے آگے پیچھے یا درمیان میں کچھ مقررہ جگہ ضرور خالی رکھیں اور مکان کی تعمیر میں چند اصولوں کا خیال رکھیں۔ پانی کی بہم رسانی اور نکاسی اور زمین دوز نالیوں کے ذریعہ میلے کی صفائی وغیرہ کی ضرورتوں کو بھی پہلے سے ہی سوچ لینا ضروری ہے۔

ساتویں بات جو سوچنے کے لایق ہے وہ یہ ہے کہ مختلف وضع کے جو مکان اور عمارتیں بنیں ان میں انفرادی تنوع کے ساتھ ساتھ باہمی ہم آہنگی قائم رہے۔ کوئی مکان انمل اور بے جوڑ نہ ہو۔

اوپر جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر پوری طرح میونسپلٹیاں ہی دھیان دے سکتی ہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ پر الگ رہ کر اس کام کو نہیں کر سکتا۔ کوآپریٹو سوسائٹی اور مکان بنانے والی کمپنیاں بھی میونسپلٹی سے مل کر اس کام کو خوب ترقی دے سکتی ہیں۔ ہندوستان کی اکثر میونسپلٹیوں میں شہر کو ترقی دینے کے لئے قانون بنے ہوئے ہیں۔ لیکن کام کی رفتار بہت سست ہے۔ جب ہم ہندوستان کے شہروں کا دنیا کے دوسرے شہروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو شرم سے گردن جھکا لینا پڑتی ہے۔ چند شہروں کو چھوڑ کر باقی سب شہروں کی حالت بہت خراب ہے۔ اس میں ہماری غریبی اور افلاس کو بھی بڑا دخل ہے لیکن زیادہ تر قابل الزام ہمارے وہ میونسپل ممبر ہیں جو اپنے فرض کو ٹھیک طرح نہیں سمجھتے اور اسے پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔

سیاسی تعلیم

(محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ استاد معاشیات جامعہ)

جب ۱۸۶۷ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ میں اس تجویز پر بحث ہو رہی تھی کہ انگلستان میں رائے دینے کے حق کو عام کر دیا جائے تو رابرٹ لو نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے ایک بات کہی تھی جو بعد میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ بات یہ تھی Educate your masters یعنی " اپنے مالکوں کو تعلیم دو" اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں کو حاکموں کے چننے، حکومت کی پالیسیاں بنانے اور بگاڑنے، حکومت کے عہدہ داروں کو مقرر اور برطرف کرنے کا اختیار دے رہے ہو۔ پہلے ان میں اچھے اور برے، کھوٹے اور کھرے، فایدہ اور نقصان کے پرکھنے کی قابلیت پیدا کرو۔ ان میں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرو ـــــ بعد میں انھیں سیاسی اختیارات سپرد کرنا۔

" اپنے مالکوں کو تعلیم دو" اس جملہ کو دو طرح سے کہا جا سکتا ہے ایک صورت تو یہ ہے کہ اس میں طنز اور طعنہ کو شامل کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس میں ہمدردی اور دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے۔ اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے گویا کہنے والا انتہائی حقارت اور تمسخر کے ساتھ بے پڑھے لوگوں کی برائیاں گن گن کر سنا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پوچھتا جاتا ہے "کیوں صاحب! کیا ایسے ہی لوگوں کو رائے کا حق دوگے کیا انھیں کو اپنا آقا۔ حاکم اور سردار بناؤ گے۔ کیا ایسے ہی کاٹھ کے الوؤں، لٹھ گنواروں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور سونپو گے۔" اور دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک نہایت دکھ بھرے دل کے ساتھ یہ جملہ زبان سے نکالا جائے غریب جاہلوں کی پستی اور گمراہی میں پوری طرح شرکت کی جائے۔ ان کی ذہنی اور اخلاقی سطح بلند کرنے کی نہایت سچائی اور غمگساری کے ساتھ تمنا کی جائے۔ اس لئے اس جملہ کے ان دونوں پہلوؤں پر ہمیں نظر کرنا چاہیئے اس جملہ میں جو ٹھٹھول اور طعنہ کا پہلو ہے وہ ضرور برا لگتا ہے۔

لیکن اس کے کڑوے پن میں جس انمول نصیحت کا امرت رس ہے اُسے ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اُسے تو ہمیں اپنے دل میں پوری طرح جگہ دینا چاہیئے۔

ہم ہندوستان میں پنچایتی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں لیکن حکومت کا کام بڑی ہشیاری، مہارت اور ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ اسے ہر جاہل اور ناسمجھ آدمی اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا۔ اگر پنچایتی حکومت کا کام اچھی طرح چلانا ہے تو حکومت کے عہدہ داروں اور ان کے چننے والوں دونوں میں تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کی اس ضرورت سے انکار کرنے والا میرے خیال میں شاید ہی کوئی ہو اس لئے اس کے بارے میں تو کچھ کہنا فضول ہے البتہ جس سوال پر بحث کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم کس طرح کی دی جائے؟

میں بلا کسی لانبی تمہید کے شروع میں ہی تعلیم کے بارے میں جو میرا نصب العین ہے اسے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں پنچایتی حکومت کی کامیابی کے لئے تمام شہریوں میں چار چیزیں پیدا کرنا ضروری ہیں:- اول اپنے حقوق و فرائض کا احساس، دوسرے معاملہ کے ہر پہلو کو سوچنے کی قابلیت، تیسرے آزاد فیصلہ کی قوت اور چوتھے کیرکٹر کی پختگی۔ جب تک یہ چاروں خوبیاں شہریوں میں پیدا نہیں کی جائیں گی وہ کبھی بھی کسی پنچایت کے مفید رکن نہیں بن سکیں گے۔

پنچایتی نظام میں ہر معاملہ میں ہر شخص سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کو رائے دینے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا۔ بلکہ انھیں آزادی ہوتی ہے کہ چاہیں تو رائے دیں چاہیں نہ دیں۔ اس لئے سب سے پہلی ضرورت تو اس بات کی ہے کہ لوگوں میں رائے دینے کا شوق پیدا کیا جائے۔ وہ اس بات کو اپنا اخلاقی فرض سمجھیں کہ ہر سیاسی مسئلہ سے انھیں دلچسپی لینا چاہیئے اس کے بعد دوسری چیز جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو مسائل زیرِ غور ہیں ان کے بارے میں جتنی ضروری معلومات ہیں انھیں حاصل کریں۔ ان کی موافقت اور مخالفت میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے اُسے خود سوچیں دوسروں سے اس کے بابت بحث و مباحثہ کریں۔ پھر تیسری بات یہ ہے کہ خوب سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنی ایک آزاد رائے قائم کریں اور جب ایک بات کو طے کرلیں تو آخیر تک

اس پر ایمانداری کے ساتھ جمے رہیں۔ ان کے کیرکٹر میں اتنی پختگی ہونی چاہئے کہ لالچ یا خوف سے اس رائے کو بدل نہ ڈالیں۔ جن آدمیوں کو حکومت کے عہدوں کے لئے چنیں پہلے انھیں خوب آزما کر دیکھیں جانچیں تولیں اور پرکھیں۔ جب وہ ہر طرح اہل ثابت ہوں تو پھر ان پر پوری طرح بھروسہ کریں۔ اگر ضرورت ایسی آجائے کہ حکومت کا بوجھ انھیں خود اپنے کاندھے پر اٹھانا پڑے تو اپنی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ کرکے کام کو ہاتھ میں لیں اور کوشش کے ساتھ اس کو انجام تک پہنچائیں۔

اگر ان تعلیمی مقاصد کو جو ابھی بیان کئے گئے ہیں صحیح مان لیا جائے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی تعلیم پھیلانے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ کیا محض پڑھنا لکھنا جان لینے سے اس قسم کی اہلیت پیدا ہوسکتی ہے؟ یا اس کے لئے کسی اخلاقی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے کتابی تعلیم اور اخلاقی تربیت دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔ کتابی تعلیم تو اس لئے ضروری ہے کہ جب تک ایک شہری کو اپنے ملک کے جغرافیائی حالات، آب و ہوا، آبادی، صنعت، تجارت اور زراعت، مذہبوں، زبانوں، رہنے سہنے کے طریقوں، تمناؤں اور حوصلوں کا علم نہ ہو، اسے آمدنی اور خرچ، نفع اور نقصان کا حساب کرنا نہ آتا ہو تو وہ حکومت کی بہت سی پالیسیوں کو نہ سمجھ سکے گا اور اس لئے ان کے بارے میں اپنی کوئی معقول رائے بھی نہیں دے سکے گا۔ اس کے پاس اتنا علم ضرور ہونا چاہئے کہ وہ اپنے دماغ پر زور ڈال کر بڑی بڑی باتوں کا تھوڑا بہت اندازہ کرسکے۔ اگر یہ ممکن نہ ہوا تو وہ اپنا فرض ٹھیک طریقہ پر انجام نہ دے سکے گا۔ اس سلسلہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جن باتوں کا سیکھنا میں نے ابھی ابھی ضروری بیان کیا ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جنھیں آدمی ذاتی طور پر سفر کرکے یا کاروبار میں شریک ہوکے کتاب سے زیادہ اچھا سیکھ سکتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اس قسم کے موقعے سب لوگوں کو نہیں ملتے۔ اور جنھیں ملتے ہیں وہ بھی خاصی عمر گذر جانے کے بعد ان سے فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور پھر بھی جہاں تک پرانے زمانہ کی باتوں، تجربوں اور مشاہدوں کا تعلق ہے ان کا پتہ انھیں نہیں ملتا۔ اس لئے کتابوں کے پڑھنے کی ضرورت تو سب کے لئے باقی

رہتی ہے۔ کتابوں میں لاکھوں آدمیوں کے سینکڑوں سالوں کے تجربے اور مشاہدے لکھے ہوتے ہیں۔
یہ ہر ملک و قوم کا ایک نہایت بیش قیمت سرمایہ ہوتی ہیں۔ لیکن کتابوں کی اس تعریف سے یہ نہ سمجھنا
چاہئے کہ محض ان کا پڑھ لینا اور یاد کر لینا کافی ہے۔ نہیں اس سے کچھ اور زیادہ کی بھی ضرورت ہے۔
بعض وقت دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض عالموں کے مقابلے میں جاہل لوگ معاملات کے بارے میں
زیادہ صحیح اور مناسب فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ عالم بے عمل بس کتاب کی پڑھی
ہوئی باتیں جانتے ہیں اور انہیں زندگی کا کوئی ذاتی تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہوتا۔ یا محض اپنی ذات میں
کھوئے ہوئے رہنے کی وجہ سے ان میں سب کے لئے کام کرنے کی عادت اور سب کا فائدہ سوچنے
کی قابلیت نہیں ہوتی یا خیال پرستی کی وجہ سے دنیا کی حقیقتوں کو بھول جاتے ہیں یا پھر کیرکٹر میں اتنی
پختگی نہیں ہوتی، عقیدہ میں اتنی مضبوطی نہیں ہوتی کہ جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کے لئے پوری قربانی
اور کوشش کر سکیں۔ اپنے اور دوسروں کے حقوق کے حاصل کرنے کے لئے معقولیت سے لڑ سکیں
اور اپنے فرائض اچھی طرح ادا کریں اور دوسروں کو ان کے فرائض کے ادائیگی کے لئے آمادہ کر سکیں۔
اس تمام بیان سے ظاہر ہوا کہ شہری حقوق اور فرائض کو پورا کرنے کے لئے کتابی تعلیم اور اخلاقی تربیت
دونوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اخلاقی تربیت کی کیا صورت نکالی جائے؟
اخلاقی تربیت صرف عمل سے ہی ممکن ہے۔ ابتدائی مدرسہ سے اگر بچوں کو پنچایتی طریقہ پر کام کرنے کی
مشق کرائی جائے۔ ہر کام پنچایتی مشورہ سے ہو بچوں میں سے عہدہ دار منتخب کئے جائیں جو بچوں کو ہی
جواب دہ ہوں غرضکہ بچوں کی پنچایتی دنیا کو اگر بڑوں کی پنچایتی دنیا کا ایک عکس بنا دیا جائے تو یہ تربیت
بچپن سے ہی شروع کر دی جا سکتی ہے اور اگر محلہ محلہ، گاؤں گاؤں ہر ہر پیشہ کی پنچایتیں ہوں تو تمام معاملات کا فیصلہ
پنچوں کی رائے سے ہو تو پنچایتی نظام کا یہ عملی تجربہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ان چھوٹی چھوٹی پنچایتوں
میں جو تجربہ حاصل ہوگا اس سے شہریوں کو وہ اخلاقی تربیت مل جائیگی جس کی اعلیٰ عہدوں میں خوبی کے
ساتھ کام کرنے کے لئے ضرورت ہے۔

لیکن تعلیم کے جو مقاصد ابھی میں نے بیان کئے انھیں سن کر بہت سے لوگوں کے دل میں شاید

یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ تو بالکل شیخ چلی کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اسے عملی شکل دینا بالکل ممکن نہیں ہے۔ حکومت کے کاروبار آج کل اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ہر شہری کے لئے ان کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ صرف بڑے بڑے ماہر اور تعلیم یافتہ لوگ انھیں سمجھ سکتے ہیں اور انھیں صحیح طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔ تمام شہریوں کی سمجھ میں یہ سب معاملات جب ہی آ سکتے ہیں جب انھیں تعلیم بہت اونچے درجے تک دلائی جائے۔ آج کل ہر حکومت کے قبضہ میں بہت بڑا رقبہ ہوتا ہے جس کی آب و ہوا، پیداوار، مذہب، زبانیں، تمدن، پیشے، رہنے سہنے کے طریقے، خواہشیں اور ضرورتیں، مواقع اور امکانات بہت مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ پھر دنیا کے سارے ملکوں کے باہمی تعلقات بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک ملک کے موسمی تغیرات، سیاسی، تجارتی، صنعتی اور زراعتی تبدیلیوں کا اثر فوراً دوسرے ملک قبول کرتے ہیں۔ باہر کے مال پر محصول، فوج کا خرچ، سرکاری قرضے، مزدوروں کے ساتھ رعایت، سکہ اور شرح مبادلہ کی پالیسی غرضکہ ملک کی ہر قسم کی پالیسیوں کا اثر دوسرے سب ملکوں پر پڑتا ہے۔ اس لئے پالیسیوں کے بناتے وقت بڑی ہشیاری، بیدار مغزی اور علم کی وسعت سے کام لینا ضروری ہے ورنہ نہایت سخت سیاسی پیچیدگیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ان سب باتوں کو سمجھنے کے لئے بڑے وسیع علم کی ضرورت ہے جسے ایک ملک کے صرف چند آدمی ہی سیکھ سکتے ہیں باقی لوگوں کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے۔ بظاہر یہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ جہاں یہ مشکلیں پیدا ہوئی ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے حل بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ سائنس اور ایجادوں کی ترقی نے جہاں حکومت کے فرائض کو پیچیدہ بنا دیا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ عام لوگوں کی تعلیم کے لئے بھی ہزاروں سہولتیں پیدا کر دی ہیں چھاپہ کی ایجاد، اخبار، کتب خانہ، ڈاک خانے، ریلیں، بحری جہاز، تار گھر، ٹیلیفون، ہوائی جہاز، میجک لنٹرن، سنما، ریڈیو، ٹیلی وژن، سوسائٹی، کلب، عجائب گھر، سینکڑوں قسم کی نمائشیں غرضکہ ہزاروں ایسے ذرائع پیدا ہو گئے ہیں جن سے تعلیم کو وسیع اور ہمہ گیر بنایا جا سکتا ہے۔ اب عمر کے صرف ابتدائی سالوں تک تعلیم کو محدود رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے بلکہ اب ہر شہری اپنی روزی بھی کما سکتا ہے، اپنے خاندانی اور دوسرے معاشرتی فرائض بھی انجام

دے سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنا علم بھی بڑھا سکتا ہے اور اپنی پوری عمر ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی بسر کر سکتا ہے۔ ہر روز وہ آنکھوں سے دیکھ کر کانوں سے سن کر گھر بیٹھے بیٹھے تمام دنیا کی سیر بھی کر سکتا ہے۔ ماضی اس کے لئے زندہ کیا جا سکتا ہے، مستقبل اس کے لئے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ آسان بنا کر اسے سمجھایا جا سکتا ہے اور اس طرح وہ اپنی نجی ترقی اور ذاتی تکمیل کے کام کو جاری رکھ سکتا ہے اور ایک مثالی ریاست کا ایک مثالی شہری بن سکتا ہے۔ پرانے زمانہ میں جن پابندیوں میں ہم زندگی گزارتے تھے ان کے جاری رکھنے کی اب کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔ ہمارے لئے ترقی کے نئے نئے راستے کھلتے جا رہے ہیں۔ جدید حکومتوں میں جہاں شہریوں کے فرائض بڑھے ہیں وہاں ان فرائض کو پورا کرنے کے لئے سہولتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ ہمیں شکایت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم ان سے پوری طرح فایدہ اٹھانا نہیں جانتے اس لئے تعلیم کا جو مقصد اور طریقہ میں نے بتلایا اسے ناقابل عمل نہیں کہا جا سکتا۔ اگر لوگوں میں ہمت ہو تو آسانی سے اسے عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

لیکن میں نے تعلیم کے بارے میں اب تک جو کچھ کہا اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آپ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا مقصد بس لوگوں کو سیاسی حیثیت سے ایک اچھا شہری بنانا ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ان کی مذہبی زندگی، معاشی زندگی، جمالیاتی زندگی، علمی اور تحقیقاتی زندگی ـــــ ان سب کو جنھیں ہر نظام تعلیم میں بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور جن پر ہر شخص کی تہذیب و تکمیل کا بہت بڑی حد تک انحصار ہے ان سب کو آپ نے نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ نے انسان کو سیاسی حیوان سمجھ کر بس اس کی اس سیاسی حیوانیت تک اپنی توجہ کو محدود رکھا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی تعلیم کا نصب العین بہت ناقص ہے۔

میں یہ بات مانتا ہوں کہ میں نے سیاست کو انسانی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ طریقہ میں نے مجبوری سے اختیار کیا ہے اس زمانہ کے واقعات کا کچھ ایسا ہی تقاضا ہے۔ اس میں شک نہیں انیسویں صدی میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہی حکومت اچھی ہے جو اپنی رعایا کی زندگی

سے کم سے کم تعلق رکھے۔ اس کا کام بس اتنا ہے کہ باہر کے حملوں اور ملک کے اندر کے بلووں سے اپنی پرجا کی حفاظت کرے اور کچھ عدالت کے فرائض بھی انجام دیتی رہے۔ اس کے بعد حکومت کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ افراد کی روزی حاصل کرنے کی کوششوں، ان کی تمدنی وابستگیوں، ان کی ذہنی تعلیم، ان کے جمالی ذوق کی تربیت، ان کے مذہبی معتقدات سے حکومت کو کوئی سروکار نہیں۔ ہر شخص کو ان معاملات میں انفرادی آزادی ملنا چاہئے۔ یہ خیالات تھے جو انیسویں صدی کے پہلے حصہ میں لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ اُمید کی جاتی تھی کہ جب افراد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور انھیں اپنے ذاتی مفاد کے مطابق ترقی کرنے کی پوری آزادی دی جائے گی تو ہر شخص کی ترقی سے کل جماعت کی ترقی از خود پیدا ہو جائے گی۔ لیکن بعد کے تجربے اور مشاہدے نے اس امید کو غلط ثابت کر دیا۔ معاشی زندگی میں امیر اور غریب کے دو مخالف طبقے بنتے چلے گئے۔ مزدوروں نے اپنی انفرادی آزادی سے فایدہ یا تو خود نہیں اٹھایا یا اپنی غریبی کی مجبوریوں کی وجہ سے وہ فایدہ اٹھا نہ سکے بہر حال ان کی حمایت میں حکومت کو حفاظتی قانون بنانا پڑے اور معاشی زندگی میں حکومت کی یہ دخل اندازی روز بروز بڑھتی جارہی ہے پھر عام تعلیم کے بارے میں بھی قانون بنائے گئے اور تعلیمی قوانین کے حلقہ میں رفتہ رفتہ ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم کی نگرانی بھی شامل کرلی گئی۔ اس کے علاوہ مکانوں کی تعمیر، حفظان صحت، سڑکوں، نہروں، ریلوں کی تعمیر کتب خانوں، کلچر گیلریوں، آرٹ میوزم، عجائب گھر وغیرہ کے قیام اور پریس اور دوسرے وسائل نشرواشاعت کی سنسرشپ کے ذریعہ حکومت نے ادب اور جمالیات کے مختلف شعبوں پر بھی اپنی نگرانی قائم کرنا شروع کر دی ہے۔ ہمہ گیر حکومت کا نصب العین ترقی پا رہا ہے اور لوگ ہر قسم کی بھلائی کو حکومت کی معرفت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہر کام کے لئے اجتماعی کوشش کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی زندگی نے اس زمانہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل کرلی ہے اور افراد کی زندگی کی تعمیر و تہذیب میں حکومت کے وسائل سے کام لینا نہایت ضروری خیال کیا جانے لگا ہے میں نے جس نظام تعلیم کو پیش کیا اس میں سیاسی

زندگی کو اہمیت ، زمانہ کے اسی رجحان کو دیکھ کر دی گئی ہے ۔ اگر شہریوں میں اپنے سیاسی فرائض کو صحیح طریقہ پر انجام دینے کی اہلیت پیدا ہو جائے تو وہ اپنی زندگی کے اور دوسرے مقاصد کو بھی خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے ،

تعلیم اور کھیل

(جناب عروج الحسن صاحب استاد جامعہ تعلیمی مرکز ۲)

تعلیم اور تربیت کا مفہوم جیسا کہ بعض اوقات غلطی سے سمجھا جاتا ہے واحد نہیں ہے۔ تعلیم اس کام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے ہم کو کسی خاص علم و فن یا کسی خاص پیشے میں واقفیت یا لیاقت حاصل ہوتی ہے اور تربیت وہ شے ہے جس سے مختلف قوائے انسانی نشو و نما پاتے اور ترقی کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ورزش یا کھیل کے قاعدے جانتا ہو تو ہم کہیں گے کہ اس نے ایک فن کی تعلیم پائی ہے لیکن باوجود اس واقفیت کے وہ ورزش بھی کرتا ہو یا کھیلتا بھی ہو تو اس وقت ہم کہیں گے کہ اس نے تربیت بھی پائی ہے۔ تعلیم اور تربیت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر تعلیم ہوئی اور ہم کو اپنے علم سے کام لینا نہ آیا یعنی تربیت نہ ہوئی تو وہ علم فایدہ مند نہ ہوگا۔

تربیت کی تین قسمیں ہیں۔ تربیت جسمانی۔ تربیت عقلی۔ اور تربیت اخلاقی۔ یہاں پر چونکہ میں تربیت جسمانی کی اہمیت دکھانا چاہتا ہوں اس لئے اس مضمون میں اسی پر بحث کروں گا۔

تربیت جسمانی سے یہ مراد ہے کہ ہمارے تمام اعضا اور قوائے جسمانی اپنا معمولی کام بخوبی انجام دینے کے لائق ہو جائیں۔ اس میں دو اغراض شامل ہیں۔

۱۔ جسم کی طاقت اور چستی کو ترقی دینا۔ ان دونوں اغراض کا ماحصل یہ ہے کہ طلبہ عقلی اور اخلاقی تربیت کے لئے تیار ہو جائیں۔ جسمانی تربیت عقلی اور اخلاقی تربیت سے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ بیمار اور کمزور آدمی کسی کام پر استقلال کے ساتھ محنت نہیں کر سکتا اور نہ اپنے فرائض کو ٹھیک ٹھیک انجام دے سکتا ہے۔

چونکہ ہم کو طلبہ کی تربیت کرنی مقصود ہے' اس لئے عقل اور اخلاق کی تربیت کے علاوہ جسمانی تربیت بھی معلم کا فرض ہے۔ پس اس کو ایسے اسباب اور وسائل بہم پہنچانے چاہئیں جن سے

طلبہ کی جسمانی صحت بنی رہے۔

طلبہ کی صحت قائم رکھنے کے لئے جسمانی ریاضت بہت ضروری ہے جسمانی ریاضت میں علاوہ ورزش وغیرہ کے مختلف جسمانی کھیل بھی لازم ہیں۔ اسی بنا پر یہ بات خاص طور پر اہم ہوتی جاتی ہے کہ بچوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ جو محنت ان کو درپیش ہے اس کے لئے محض عقلی قابلیت ہی نہیں بلکہ اُس محنت سے جو سخت تکان اور ضعف ہوتا ہے اس کے برداشت کرنے کے لئے جسمانی قوت بھی پیدا ہو جائے۔ کھیل کود کے کام جن کی طرف فطرۃً رغبت ہوتی ہے جسمانی بہبودی کی غرض سے طلبہ کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ جو شخص اس کو نظرانداز کرتا ہے وہ ان وسائل کو روکتا ہے جو جسمانی نشوونما کے لئے خداتعالیٰ نے مقرر کئے ہیں۔

کثرت مطالعہ کے آفت ناک نتائج ہر جگہ نظر آتے ہیں مختلف قسم کی بیماریاں اس سے پیدا ہوتی ہیں رفتہ رفتہ دماغ وجسم کمزور ہونے لگتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مدرسوں اور کالجوں میں زیادہ تر وہی طلبہ بیمار ہوتے ہیں جو کثرت مطالعہ کے عادی ہو چکے ہیں لیکن جو جسمانی کسرت کرتے رہتے ہیں وہ ان مصیبتوں سے بچے رہتے ہیں۔ اس چیز کا سارا بار والدین اور اساتذہ پر ہے جو بچوں کے لئے پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کا انتظام نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ والدین کھیل کود کو آوارگی سمجھ کر اپنے بچوں کو اس میں شریک ہونے سے روکتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ کھیل کود میں سوائے وقت ضائع ہونے کے اور کوئی تعلیمی فائدہ نہیں ہے۔

بڑوں کی برابر بچے محنت نہیں برداشت کرسکتے نہ جسمانی اور نہ دماغی۔ جب کہ بڑوں کو زائد از اعتدال محنت سے جو اُن سے لیجاتی ہے۔ صریحاً اتنی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو پھر اس عقلی محنت کی وجہ سے جو بچوں کو بھی بسا اوقات بڑوں کی برابر کرنی پڑتی ہے۔ بچوں کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم مدرسہ کی اس تربیت کی جانچ پڑتال کرتے ہیں جس پر اکثر زور دیا جاتا ہے تو تعجب اس بات کا نہیں کہ وہ نہایت مضر ہے۔ بلکہ اس بات کا ہے کہ بچے اس کی

برداشت ہی کیوں کر کر سکتے ہیں۔ جس کے نتائج ضعف، زرد روئی۔ افسردہ دلی اور عام صحت کی خرابی ہوتے ہیں۔ دماغی ورزش عرصہ دراز تک کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی ورزش کم کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف جسمانی افعال کی ابتری ہے بلکہ جسمانی ساخت کی بے قاعدگی بھی ہے۔

جن بچوں کا رنگ اسکول میں داخل ہونے کے وقت سرخ و سفید ہوتا ہے تھوڑے ہی عرصے میں اُن کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور وہ اکثر مریض رہتے ہیں۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ تعلیم ختم کرنے سے پہلے ہی طلبہ مضمحل ہو جاتے ہیں اور تعلیم چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اگر مدارس کی موجودہ حالت پر غور کیا جائے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مدرسے بہت کم ہیں جن میں متوسط درجہ کے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ محنت نہ کرنی پڑتی ہو۔ زیادہ تر مدارس کا نصاب اس قدر سخت اور بے قاعدہ ہے کہ طلبہ کو امتحان پاس کرنے کے لئے نہایت سخت محنت کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے ان کے جسمانی نظام پر نہایت مضر اثر پڑتا ہے۔

اکثر والدین اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے بچے کو کتابی تعلیم دی جائے۔ اور بچے کی عقل کو زبردستی ترقی دینا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو جسمانی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے یا آخر کار بچہ غبی ہو جاتا ہے یا قبل از وقت اجل کا شکار ہو جاتا ہے۔

دماغ ابتدائی عمر میں جثہ کے لحاظ سے نسبتاً بڑا مگر ساخت کے لحاظ سے نامکمل ہوتا ہے اور اگر نا واجب مستعدی کے ساتھ دماغ سے کام لیا جائے تو جس قدر ترقی اس عمر کے مناسب حال ہونی چاہئے اُس سے زیادہ ترقی تو ہو جاتی ہے مگر آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس درجہ اس کا قد اور طاقت بصورت دیگر پہنچ سکتے تھے اس میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ قبل از وقت نمو پانے والے بچے اور جوان جو ایک خاص عرصے تک تمام مشکلات پر غالب آتے تھے اُن کی ترقی لبا اوقات یکایک رک جانے اور اُن کے والدین کی بڑی بڑی امیدوں کے خاک میں مل جانے کی ایک وجہ بلکہ خاص وجہ یہی ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ حصول علم ہی سب کچھ ہے اور یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس سے بھی زیادہ ضروری بات علم کا انضباط ہے۔

جو معلم اپنے شاگردوں کے ذہنوں کو ترقی دینے کے شوق میں اُن کے جسموں سے غفلت کرتے ہیں ان کو یہ بات یاد نہیں کہ دنیا کی کامیابی بہ نسبت معلومات کے جسمانی قوت پر زیادہ منحصر ہے اور جو تدبیر علم کو دماغ میں ٹھونس لینے کے سبب جسمانی قوت کو زائل کرتی ہے ۔ وہ آپ اپنی ناکامی کا باعث ہے ۔ مضبوط ارادہ اور نہ تھکنے والی مستعدی جو حیوانی طاقت کی افراط کا نتیجہ ہیں ۔ یہ دونوں باتیں تعلیم کے بڑے بڑے نقصانوں کا بہت کچھ معاوضہ کر سکتی ہیں اور جب اس طاقت کے ساتھ اس کافی دوانی تعلیم کو شامل کر لیا جائے جو صحت کو قربان کئے بغیر حاصل ہو سکے تو اُن لوگوں پر جن کو کثرت مطالعہ نے ضعیف کر دیا ہے یقیناً بآسانی فتح حاصل ہو سکتی ہے ۔ اگر دولت کے ساتھ لگاتار بیماریاں لگی رہیں تو دولت کے حاصل کرنے سے کیا فایدہ ہے ۔ عزت و امتیاز کی کیا وقعت ہے اگر اس کے ساتھ میراق بھی پیدا ہو جائے ۔

جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ تعلیم دی جائے بلکہ جتنی اعلیٰ تعلیم دی جائے اتنی ہی بہتر ہے ۔ بشرطیکہ کوئی جسمانی نقصان نہ ہو ۔

آجکل بچوں کی جسمانی تعلیم میں زیادہ تر چار نقص پائے جاتے ہیں ۔

(۱) بچوں کو ناکافی خوراک دی جاتی ہے ۔

(۲) ناکافی لباس پہنایا جاتا ہے ۔

(۳) ناکافی ورزش کرائی جاتی ہے ۔

(۴) عقلی محنت بہت زیادہ لی جاتی ہے ۔

دماغی تعلیم کے ساتھ جسمانی تعلیم دینا ضروری ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ جسمانی تعلیم جس قدر جماعت سے باہر دیجا سکتی ہے اتنی جماعت میں نہیں ۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جماعت محض دماغی تعلیم کے لئے ہے ۔ جماعت کے کرہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ روشنی کافی آتی ہو ۔ صاف ہوا کا بہ آسانی گذر ہو ۔ لیکن یہ کافی نہ ہوگا جب تک کہ کسی قسم کی جسمانی ورزش بھی نہ ہو ۔ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر اس کی ضرورت لازمی ہے ۔

۱۔ ایک حالت میں دماغی محنت کرنے کے بعد آرام کرنا۔

۲۔ دماغ پر زور دینے کے بعد جسم کو حرکت دینا تاکہ خون کی روانی تمام جسم میں ہو سکے۔

۳۔ کھلی ہوا میں سانس لینا اور اعضا کو حرکت دینا تاکہ سینہ بڑھ سکے اور پھیپڑوں اور دل کی حرکت میں اضافہ ہو۔

۴۔ جسم محنت کرنے کا عادی ہو۔

۵۔ اپنے چہرے اور جسم سے دوسروں پر اثر ڈال سکے۔

اگر مناسب ورزش کی جائے تو ہمارے جسم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بڑھے۔ مدارس میں ورزش کا انتظام لازمی ہے۔ اس سے نہ صرف جسمانی قوت ترقی کرتی ہے بلکہ طالب علم میں مستقل مزاجی۔ صبر۔ لطافت۔ اور قوت بیان پیدا ہوتی ہے۔

ایک مقرر جو محض اپنی زبان سے کام لیتا ہے وہ اپنی تقریر کا دوسروں پر اتنا اثر نہیں ڈال سکتا جتنا کہ وہ مقرر جو اپنی وجاہت اور اعضا کی حرکت سے دوسروں پر اثر ڈال سکتا ہے۔

اسکول کے اوقات میں طلبہ کی جسمانی ورزش کے لئے ایک وقت ضرور مقرر ہونا چاہئے۔ ۵۰ منٹ دماغی محنت کرنے کے بعد اگر دس منٹ جسمانی ورزش کرائی جائے تو طالب علموں میں زیادہ علم۔ زیادہ عقل۔ خوش مزاجی۔ اور خوبصورت جسم پیدا ہوں گے بمقابلہ ان طلبہ کے جو متواتر کئی گھنٹے دماغی کام کرتے ہیں۔

طلبہ کے کھیل میں معلم کو شریک ہونا کم از کم موجود ہونا ضروری ہے اس کی موجودگی سے دو فایدے ہوتے ہیں۔ برائیوں کو دبانا اور خوبیوں کو ابھارنا۔ کھیل کے میدان میں بچے کی طبعی۔ عقلی۔ اور اخلاقی قوتیں کام کرتی ہیں۔ جو معلم بچے کی ان خصوصیات کو نہیں پہچانتا وہ بچے پر کبھی قابو نہیں پا سکتا۔ بجائے اس کے کہ بچے کی ان قوتوں کو روکا جائے یہ بہتر ہے کہ اس کو صحیح رستے پر لگا دیا جائے۔ اور جو خامیاں ہوں ان کی اصلاح کی جائے۔ میرے اس مضمون کا یہ مقصد نہیں ہے کہ کسی خاص کھیل کی طرف توجہ دلائی جائے بلکہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ کتابی تعلیم کے ساتھ

جسمانی تعلیم لازمی ہے اور ایک اچھے طالب علم کے لئے تندرست ہونا ضروری ہے تو ہر وہ کھیل جس سے جسمانی نشو نما ہو اور ساتھ ہی ساتھ عقلی اور اخلاقی تعلیم بھی ہوتی ہو بچوں کو کھلانا ضروری ہے۔ جسمانی نشو نما کے معنی صرف یہ نہیں کہ جسم موٹا ہو یا انسان مزدور کی طرح بھاری بوجھ اُٹھا سکے بلکہ جسم میں چستی اور پھرتی بھی ہو اور آسانی سے کسی بیماری کو قبول نہ کر سکے۔ اس قسم کے بھی بہت سے کھیل ہیں جس میں جسمانی نشو نما کم اور دماغی نشو نما زیادہ ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ان کو اعتدال کے ساتھ کھیلا جائے۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ اکثر کھیل ایسے ہیں جن کے ذریعے ہر مضمون کی تعلیم دیجا سکتی ہے بشرطیکہ معلم خود بھی دلچسپی لیتا ہو اور بچوں کو یہ سکھائے کہ کھیل سے نہ صرف جسمانی اور تفریحی فائدہ ہے بلکہ اخلاق بھی سدھر جاتے ہیں، اتحاد عمل۔ احساس فرض۔ ضبط نفس اور ایثار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں میں اُن ذمہ دار ہستیوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن کے ہاتھ میں آئندہ نسلوں کی باگ ڈور ہے کہ وہ اس قسم کی سہولتیں پیدا کر دیں جن سے مدارس اور نہ صرف مدارس میں بلکہ گھروں پر بھی علاوہ عقلی اور اخلاقی تعلیم کے جسمانی تعلیم بھی دیجا سکے اور نہ صرف سہولتیں ہی پیدا کریں بلکہ خود بھی دلچسپی لیں اور اگر کوئی شخص اس قسم کی چیزیں جاری کرنا چاہے تو اس کی امداد کریں۔ اس سلسلہ میں میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں۔

۱۔ ہر شعبہ تعلیم میں ایک ایسا استاد ہونا چاہئے جو طلبہ کو مختلف جسمانی ورزشیں کرا سکے اور کھیل کھلا سکے۔

۲۔ روزانہ تعلیمی اوقات میں ایک وقت ایسا مقرر کر دیا جائے جس میں طلبہ کو ورزش کرائی جائے اور کھیل کھلائے جائیں۔

۳۔ ہر سال انعامی مقابلے ہوا کریں۔

۴۔ والدین پر اس کی اہمیت ظاہر کی جائے کہ گھر پر بھی بچے کے لئے کھیل اور ورزش کا معقول انتظام ازبس ضروری ہے۔

۵۔ ہر مہینے ایک میڈیکل افیسر تمام طلبہ کا معائنہ کیا کرے۔

اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات پر ایک نظر

جناب احمد علی صاحب علوی متعلم جامعہ

(بہ سلسلہ ماہ اکتوبر)

سر سید نے ۱۸۸۵ء سے جو نیا چولا بدلا اور جس نے ان کے بعض ساتھیوں اور دیگر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور رؤسا و جاگیرداروں پر بہت اثر ڈالا۔ اس سے نوجوانوں پر بھی کچھ کچھ اثر پڑا اور وہ چنگاری جو سلگ چکی تھی پھر افسردہ ہو چلی یہ نیا اثر کہاں سے آیا تو اس کے متعلق ہم کچھ اوپر بیان کر چکے ہیں اب ذرا اس کی اور تشریح و تفصیل کر دینا چاہتے ہیں اگر آپ سر سید کے ماحول کا مطالعہ کریں اور اسوقت کی انگریزی حکومت کی پالیسی پر غور کریں تو شاید آسانی سے معلوم ہو جائیگا کہ قدامت پسند انگریزوں نے کانگریس کے وجود کو ایک خطرہ محسوس کیا اور لبرل حضرات کو ایک طرف سمجھایا دوسری طرف ہندوستان میں بعض آدمیوں کو آلہ کار بنایا۔ مسٹر بیک علی گڈھ کالج میں اسی مقصد کے ماتحت کام کرتے رہے انھوں نے سر سید پر غلبہ حاصل کر لیا۔ سر سید بدلے تو تھے یورپ سے واپسی ہی پر مگر انکے گرد جو نورتن جمع تھے انھوں نے کچھ کچھ ان کو سنبھالا۔ مگر بیک صاحب کے آنے کے بعد وہ اثر کم ہو چلا۔ پھر کانگریس کے قیام سے سر سید کو مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے متعلق خطرات پیدا کئے گئے۔ اس شدید حملے کے دفاع کی کوشش سر سید کے بعض ساتھیوں نے کی مگر ایک طرف گورنمنٹ نے سبز باغ دکھائے۔ مسلمانوں کی تباہی کے خطرات پیش کئے اور دوسری طرف بڑھاپا اور خانگی مصائب۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سر سید بدلے اور بالکل بدل گئے۔ وہی شخص جو کل انگریز و ہندوستانی کو ایک سطح پر لانا چاہتا تھا اور اس کے لئے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کر کے مولویوں سے بگاڑ پیدا کر چکا تھا۔ آج انگریزوں کے تفوق کا علی الاعلان منادی تھا مگر اتفاقات کہئے یا خوش نصیبی کہ کانگریس کے قیام نے ہندوستان میں عمل کی ایک تازہ روح پھونکی اور چند مسلمان رہنما بھی اس سے متاثر ہوئے۔ نوجوانوں میں بھی جان

آ گئی اور ان کے دل کی کھیتی جس پر نا امیدی کا پالا پڑ چکا تھا اس آفتاب کی کرنوں سے پھر ہری ہوئی۔
سجاد حسین کا اخبار بہت مقبول تھا ایک طرف اس نے دوسری طرف بعض دوسرے اخباروں نے جنھیں سرسید سے اختلاف تھا شور مچایا۔ مولانا شبلی جو سرسید کے ساتھی تھے وہ بھی اس پر تیار نہ ہوئے اگرچہ تھوڑے عرصہ تک انھوں نے علی الاعلان مخالفت نہ کی مگر ۱۹۰۸ء میں سرسید کے انتقال کے فوراً ہی بعد قلم اٹھایا، لکھا اور بہت جوش کے ساتھ لکھا، دلیل کے ساتھ لکھا اور بڑے درد کے ساتھ لکھا۔

> "وہ پرزور دست و قلم جس نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جبکہ کورٹ مارشل کے ہیبتناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی تعریف میں کہا تھا...... کہ بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں اور یہ صرف انھی کی بدولت ہے کہ علم، آزادی اور حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی...... حالات گردو پیش نے اُسے ایسا مجبور کر دیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالٹیکس سے روک دیا یہ کیوں ہوا کن اسباب سے ہوا۔ کس چیز نے دفعتہً یہ اختلاف پیدا کر دیا ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ آج اجتہاد و تقلید سے آزادی کا زمانہ ہے۔"
>
> (مضامین شبلی) مسلم گزٹ لکھنؤ ۱۹۰۸ء

۱۹۰۱ء تا ۱۹۲۰ء ۱۹۰۰ء میں اردو ہندی کے جھگڑے نے اور ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے مسئلے نے ہندو اور مسلمان کے درمیان منافرت کو اور شدید کرنا شروع کر دیا۔ مسٹر بیک نے مسلمانوں کو کافی تیار کر ہی دیا تھا اس لئے خوب زوروں سے ایک دوسرے کے خلاف قلم چلا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور اس کے قیام کا مقصد ہندوؤں کے خلاف متحدہ محاذ جنگ قائم کرنا تھا۔ ۱۹۱۱ء تک یہ خلیج نہ پاٹی جا سکی۔ مولانا حسرت اور محمد علی مرحوم نے جو نوجوانوں کے سردار تھے بہت کوشش کی کہ یہ اختلافات

ختم ہوں مگر آغاخاں صاحب کا وجود بھلا اتحاد کیوں کر پیدا ہونے دیتا۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ ہوئی اور اب مسلمانوں کی ہر جماعت کو احساس ہوا کہ لارڈ کرزن نے انھیں صرف بیوقوف بنا کر ہندوؤں سے لڑا دیا تھا تاکہ اختلاف سے فائدہ حاصل کرے اور آسانی سے حکومت چل سکے۔ مسلمانوں کو یہ بھی احساس ہوا کہ گورنمنٹ برطانیہ وفادار کے ساتھ نہیں بلکہ قوی کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے اس لئے مسلمانوں کی پالیسی بدلنا شروع ہوئی۔ نواب وقارالملک بہادر کے قلم تک سے یہ سطریں نکلیں۔

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ کی تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گذر گیا بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں جان بھی ہے اوران کو اس سے کچھ تکلیف محسوس ہوگی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون" (وقار حیات صفحہ ۶۹۹)۔

۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی مرحوم نے اپنا اخبار کامریڈ نکالا اور ۱۹۱۳ء سے اردو میں ہمدرد کا اجرا ہوا۔ اس درمیان میں مولانا شبلی مرحوم کا قلم برابر سیاسی بیداری پیدا کرتا رہا۔ مولانا نے علی گڈھ سے علیحدگی پر ایک اخبار مسلم گزٹ نکالا تھا جو برابر سیاسی رہنمائی کرتا رہا انگریزوں کی سیاست "لڑاؤ اور حکومت کرو" کو وہ خوب سمجھ چکے تھے اور اتحاد کی تلقین اور آزادی کا حصول انکا موضوع قلم تھا۔ ۱۹۱۲ء میں جب کہ اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہورہی تھی ان کے قلم سے حسب ذیل سطور نکلیں۔

" حالت یہ ہے کہ رعایا میں سے دو قوموں کی باہمی نزاع اور چارہ جوئی کا نام پالٹیکس ہے اگر یہ پالٹیکس ہے تو سرکاری عدالتیں اور ہائی کورٹ سیاست گاہ اعظم ہیں .... پالٹیکس کا خط وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ انتظام حکومت میں رعایا کی شرکت کس حد تک ہونی چاہیئے یعنی پالٹیکس نام ہے گورنمنٹ اور رعایا کے باہمی مطالبہ حیات کا نہ کہ رعایا کے باہمی تنازعات کا"

(مضمون مولانا شبلی) مسلم گزٹ ۹-۱۰-۱۹۱۲ء

ماحول کے ان اثرات نے اردو ادب پر بہت سے اثرات مرتب کئے اخبارات کے علاوہ رسائل نے بھی سیاسی مباحث پر تنقیدیں لکھیں۔ ناول اور ڈرامے میں بھی عام لوگوں کے کیرکٹر اور جذبات۔ سماج

کے مظالم کے خلاف آنے لگے ۔ علامہ شبلیؔ، اقبالؔ، اور چکبستؔ تو قومی اور سیاسی شاعری کے شاہسوار تھے ہی اور اردو شاعری میں ایک نئے باب اور نئی زندگی کے مناظر کی تصویر کشی کر رہے تھے ۔ غزل گو شعرا نے بھی سیاسی اور قومی جذبات کی جھلک دکھانا شروع کی اور عملی زندگی کی تلقین کی ۔ مولانا شبلی نے بہت سی قومی نظمیں لکھی ہیں مسلم لیگ کا نصب العین "سوٹ ایبل" سلف گورنمنٹ، تھا اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ،۔

چہرہ پہ ہے جو سیلف گورنمنٹ کا نقاب ۔۔۔ ہر دیدہ ور اسیر طلسم مجاز ہے
سمجھے نہ یہ کہ "سوٹ ایبل" کی جو شرط ہے ۔۔۔ تمہید سجدہ ہائے جبین نیاز ہے
سمجھے نہ لوگ یہ کہ یہی لفظ پُر فریب ۔۔۔ اس ملک میں طلسم غلامی کا راز ہے

چکبستؔ کی قومی نظمیں فنی خوبیوں کے لحاظ سے تو ضرور بہت خوب ہیں مگر جوش و ولولہ کے لحاظ سے زیادہ بہتر نہیں اقبالؔ نے ۱۹۰۵ء سے قبل ہی قومی شاعری شروع کی تھی مگر تھوڑے عرصہ بعد ماحول نے انھیں اور زیادہ متاثر کیا ۔ تھے تو وہ نوجوان ہی مگر قدرت نے انھیں دل و دماغ صرف شاعر ہی کا نہیں بلکہ فلسفی، مفکر اور رہنما کا دیا تھا اس لئے انھوں نے اپنی شاعری سے حقیقی شاعری کا کام لیا ۔ اور بڑی پر جوش نظمیں لکھیں ۔ انکی نظموں نے عام طور پر تمام ہندوستانیوں میں اور خاص کر مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی، نئے ولولہ اور جوش کے ساتھ اچھوتی اور باعزت زندگی بسر کرنے کی خواہش پیدا کی ۔ اقبال کی شاعری میں فطرت نے قوتوں اور حکومتوں کو زیر و زبر کر دینے کی قوت ودیعت کی ہے ۔ اس زمانے میں انکی شاعری نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکایا ۔ راہ عمل دکھائی اور حیات تازہ بخشدی ۔ انکے دل میں درد تھا اور سوز، ایک کرب و بیچینی، اس لئے انھوں نے بچے اور نوجوان، جوان اور بوڑھے سب کو دہ درد بھرا دل دکھایا اور تڑپانے کی کوشش کی ۔ انکی صدائے درد یقیناً تمام ہندی قوم کو بسمل بنانے کے لئے کافی ہے ۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ۔۔۔ ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
ہو رہے گی مگر گی کے ہینا آشنائی ہے غضب ۔۔۔ ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جسکے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

ہندوستان کی تصویر جوان کی آنکھوں نے دیکھی اس سے ان کے قلب پر کیا گذر رہی تھی دل پکڑ کر سنئے۔

عطا مجھکو بیاں ایسا ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دیدیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھکو تیرے نوحہ خوانوں میں

سن اے غافل صدا میری، یہ ایسی چیز ہے جسکو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنیوالی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل پر گامزن محبوب فطرت ہے

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

اس دور کے دوسرے نوجوان شعراء نے بھی سیاسی نظمیں لکھی ہیں مگر نہ تو انمیں ادبی خوبیاں ہیں اور نہ فنی۔ البتہ جوش و جذبہ سب کے یہاں یکساں ہے اور کافی۔

مولانا محمد علی مرحوم جو انگریزی زبان کے بے مثل ادیب اور سحر طراز مقرر بھی تھے۔ انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں میں بولا بھی بہت اور لکھا بھی کافی۔ موجودہ دور میں سیاسی بیداری پیدا کرنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم محمد علی (روحی فدا) کی شخصیتیں بہت نمایاں ہیں مگر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک نظر بندی کے زمانے میں انکی شاعری خوب چمکی۔ مذہبی جوش نے اس میں نئی روح پیدا کردی۔ قید و بند کی حالت میں ان کے جذبات نے اشعار کی صورت اختیار کی۔ غالباً غزل گو شعراء میں وہ اپنے جوش، جنون، شورش اور سرگرمی کے لحاظ سے ممتاز ترکہے جاسکتے ہیں اس لئے ان کے

چند شعر حاضر ہیں۔

مصائب کے بعد راحتیں لازمی ہیں اس خیال کو کتنے بہتر طریقے سے پیش فرماتے ہیں۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد   ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسین رضؓ اصل میں مرگ یزید ہے   اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سلطان جابر کے خلاف جنگ کا جذبہ کتنا قوی۔ کتنی بہادری کے جذبے کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو   خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

چند شعر اور سن لیجئے۔ دیکھئے کتنی سچی، سادہ اور صحیح تعلیم ہے اور کتنے جوش اور ولولہ کے ساتھ۔

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی   ہے ہوس زیست جو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست   قلبِ مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر   کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی   اس دورِ اعتدال میں دار و رسن کہاں

مستحقِ دار کو حکم نظربندی ملا   کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

۱۹۱۱ء سے الہلال اور ۱۹۱۳ء سے ہمدرد نے اتحاد و اتفاق کا پیغام بہت جوش اور سرگرمی کے ساتھ پہنچانا شروع کیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں ہوئے اور دونوں جماعتوں میں اتحاد ہو گیا۔ جنگ عظیم کے سلسلے میں بہت سے رہنما نظر بند کر دئیے گئے تھے۔ ان وجوہ سے سارے ملک میں ایک بیداری کی لہر دوڑی۔ سیاسی جلسے بہت بڑی تعداد میں ہونے لگے اور بعض نوجوان قومی رہنماؤں نے سخت سے سخت تقریریں کیں۔ جنگ عظیم میں ترکوں کی شرکت، اور شوکت علی، محمد علی" اور حسرت موہانی کی نظر بندیوں نے عوام میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اس کا اثر ملکی ادب پر پڑنا ناگزیر تھا۔

اُردو ادب نے بھی اسکا اثر قبول کیا نثر پر کم اثر پڑا۔ شاعری پر زیادہ اور وجہ ظاہر ہے شاعر حساس تر ہوتا ہی ہے۔ اس زمانے کے سیاسی رجحانات کافی ترقی پذیر ہیں۔ خلافت کے مسئلہ نے تو ایک قیامت ہی بپا کر دی تھی۔ لوگوں نے علانیہ گورنمنٹ کو بُرا کہنا شروع کر دیا ہر اخبار کچھ نہ کچھ روزانہ برطانیہ کی شان میں لکھ مارتا تھا۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چند نمونے تقریر اور تحریر سے اس زمانے کے بھی پیش کر دیئے جائیں۔

(۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۴ء)

"ہم تلوار اٹھائیں گے۔ بشرطیکہ عدم تعاون ناکام رہے۔ پھر ہم ایک دفعہ عدم تشدد اور عدم تعاون کے نظام سے اپنی وفاداری' تائید اور حمائت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس وقت تک دشمنانِ اسلام کے خلاف ہتھیار اٹھانے' اور تشدد کی جنگ کرنے کو ملتوی کرتے ہیں جب تک عدم تعاون ناکام نہ رہ جائے۔" (تقاریر مولانا محمد علی صفحہ ۹۵ حصہ دوم)۔

اس سے زیادہ تند و تیز۔ اس سے بڑھکر سخت لہجہ ابوالکلام صاحب کا تھا۔

"آج میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے سپاہیوں کو برگشتہ کیا ہے میں نے انگریزی فوج کو برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے میں نے سیکڑوں سپاہیوں سے کہا ہے کہ انگریزی فوج میں رہنا۔ نوکری کرانا۔ بھرتی کرانا حرام ہے۔ آج بھی ہر سپاہی سے کہتا ہوں۔ میں کلکتہ میں پولیس کے ستر آدمیوں کو علیحدہ کرا چکا ہوں۔ میں نے سپاہیوں سے کہا ہے اور آج بھی میری یہی کوشش ہے اور ہوگی کہ میں ایک ایک سپاہی کے کان تک پہنچا دوں کہ ایک مسلمان کا کورٹ مارشل کی گولی کھانا زیادہ بہتر ہے لیکن ایک منٹ کے لئے بھی یونین جیک کے سامنے گردن جھکانا بہت بُرا۔" (خطبہ ابوالکلام صفحہ ۳۴)

اب ملک کا ماحول یہ تھا اور یہ تھی مسلمان رہنماؤں کی تحریر و تقریر مگر پھر بھی تعجب ہے کہ ہمارے نثر نویسوں پر بہت کم اثر پڑا اور ابتک ان کا ماحول مختلف ہے۔ خیر اس کا ذکر پھر ہوگا۔ اس زمانے کی ایک اور تحریر پیش کی جاتی ہے۔

"(ہمارے یہاں کے) وبائی امراض کی اصلی وجہ ہندوستان کا ہمہ گیر افلاس ہے جو سلطنت برطانیہ کی شہنشاہیت کا نتیجہ ہے۔ جب تک اس شاہنشاہیت کا خاتمہ

نہ ہو جائے ۔ ہندوستان کا افلاس رفع نہیں ہو سکتا اور جب تک افلاس سے فارغ البالی
نصیب نہ ہو جائے مختلف امراض کا پیدا ہونا یقینی ہے ۔ لہٰذا پلیگ کے انسداد کے لئے
چوہوں کے مارنے کے ساتھ ساتھ ان چوہوں سے بھی نجات حاصل کرنا چاہیئے جو
ہندوستان کے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور غریب ہندوستان کی مالی ، اقتصادی ، تباہی
بربادی کا باعث ہو رہے ہیں اس بربادی کا علاج حکومت ہند کا محکمہ حفظانِ صحت
نہیں کر سکتا بلکہ خود ہندوستانی ہی کر سکتے ہیں ۔ کاش تمام ہندوستانی متفقہ طور پر
اس عالمگیر مالی اور اقتصادی پلیگ کا جلد سے جلد انسداد کر دیں ، پھر دیکھیے گا کہ پلیگ
کے چوہے خود بخود بھاگ جائیں گے اور ہندوستان کو آرام و چین کے دن نصیب ہوں گے۔"

(ہماری غربت اور افلاس کا دردناک افسانہ ص ۲) ۔

جنگ آزادی کے التوا کے بعد سارے ملک میں ایک بار پھر اتحاد و اتفاق کے بجائے نفاق و عناد
کی کوشش کرائی گئی سوامی شردھانند جی کی تحریک شدھی اور سنگھٹن اور مسلمانوں کی تحریک تنظیم نے زور پکڑا ۔
فرقہ وارانہ فسادات کی ایک آگ سارے ہندوستان میں لگ گئی ۔ خود مسلمانوں میں حجاز کے مسئلے نے دو فریق
کر دئے مگر ان حالات کے ساتھ ساتھ اشتراکیت اور عالمگیر انسانیت کی تحریک نے بھی جنم لیا ۔ جس نے
رفتہ رفتہ حالات کو بدلنا شروع کیا ۔ عوام میں زندگی کا احساس اب اور قوی تر ہونے لگا ۔ اخبارات اور
رسائل اس پر مجبور تھے کہ عوام کی مرضی کے مطابق چلیں ۔ منشی پریم نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں ملکی
مسائل پر لکھنا شروع کیا اور یقیناً انھوں نے ملک کے ہر طبقے کے خیالات اور جذبات کی مناسب اور سچی
مصوری کی ۔ پھر بھی دوسرے ادیبوں پر اثر کم پڑا ۔ ہاں البتہ نوجوانوں نے اور خاصکر سوشلسٹ خیال کے
نوجوانوں نے بہت کوشش کی ۔ اور کامیاب بھی ہوئے ۔ انگارے اور شعلے سی کتابیں لکھی جانے لگیں
اور اس دور کے مزدور ، کسان ، طالب علم ، متوسط ، امرا اور کارخانے داروں وغیرہ ہر قسم اور ہر جماعت کے
لوگوں کے حالات ، خیالات کی سچی تصویر کشی کی گئی ۔ موجودہ دور کے بالکل نوجوان افسانہ نگاروں میں حیات اللہ
انصاری ، احمد علی ، شاہد لطیف ، جعفری جیسے لکھنے والے پیدا ہونے شروع ہوئے مگر ان لوگوں نے سماج

(۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۷ء)

کی دکھتی ہوئی رگ کو تیز نشتر سے بہت گہرا چیرا ہے جو شاید بہت عرصہ تک لوگوں کو خوفزدہ رکھے گی ہمارا خیال ہے کہ سماج کا یہ گندہ اور تاریک ترین رخ پیش کرنا شاید ہمارے نوجوانوں کو صحیح راہ سے ہٹادے گا اور ہمارے پختہ اور آزمودہ کار ادیبوں کو بھی کنارہ کشی پر مجبور کردیگا۔ اس لئے ان کی یہ جدوجہد جہاں جوش عمل اور دلی کرب کا اظہار کررہی ہے وہاں ایک نقصان بھی پہنچا کر رہے گی۔ ہمارے پرانے لکھنے والوں کے جرائم کی سزا ہمارے نوجوان لکھنے والوں کو عموماً اور سارے سماج اور ساری جنتا کو خصوصاً دینا بڑا ظلم ہے اور کسی طرح مناسب نہیں ہمارے ترقی پسند مصنفین کو چاہیئے کہ قدم سنبھال کر اٹھائیں تاکہ ایسا نہو کہ گذشتہ کاہلی اور سستی کے بدلے یہ تیز قدمی اور بے جانے بوجھے اور تیرہ و تار راستے پر لمبے لمبے ڈگ کسی کھائی یا گڈھے میں نہ گرادیں اور بفرض محال آپ کہیں کہ راستہ جانا بوجھا اور صاف ہے تو بھی پیر رپٹ جانے اور پھسل کر گر پڑنے کا خطرہ تو پھر بھی رہے گا۔

ہمارے نوجوان ادیبوں میں اختر حسین رائے پوری صاحب بہت سمجھ بوجھ کر لکھنے والے ہیں وہ ادب پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کی تنقیدیں اگر ایک طرف صحیح ادب کی طرف راہ نمائی کرتی ہیں تو دوسری طرف سیاسی و معاشی معاملات میں بھی وہ ہمارے ادیبوں کے لئے اچھا نمونہ ہیں۔ ان کا یہ مقولہ اوپر بھی پیش کیا جاچکا ہے۔ اور اب پھر سنایا جاتا ہے۔

> "ادب، ماضی، حال اور مستقبل میں تعلق پیدا کرتا ہے، رنگ و نسل، ملک اور قوم کا رشتہ توڑ کر انسانی وحدت کا سبق دیتا ہے۔ (ادب[۵۱] اور زندگی از اختر صاحب اردو ۱۹۳۵ء)

جنگ عظیم کے بعد ترکوں کے مصائب نے ایک طرف اور دوسری طرف ہماری ملکی جنگ آزادی نے ہمارے شعرا میں بہت سے سچے شاعر پیدا کردئے اور اگرچہ ان میں سے بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو زبان اور فن کے لحاظ سے قابل تعریف نہیں ہیں پھر بھی خیال اور جذبہ کے لحاظ سے وہ ہمارے پرانے

---

[۵۱] اس مقالہ میں اختر صاحب کے مضمون "ادب اور زندگی" سے کافی مدد لی گئی ہے۔ علوی

کاملین فن اور ماہرین زبان، قصیدہ اور غزل گو شعرا سے بہت بلند ہیں۔ شعر و ادب زبان اور فن کے نہیں بلکہ ماحول کی سادہ اور اصلی مصوری کے مظہر ہیں۔ آرزو اور حسرت کی شاعری اور جوش و ساغر کی شاعری میں یہی فرق ہے۔ عشق اور بھوک ممکن ہے کہ گذشتہ زمانے میں ایک ساتھ جاری رہ سکتے ہوں مگر اب وہ زمانہ کہاں اب تو زمانہ روٹی اور کپڑے کے عشق کا ہے۔ ترک اور مغبچہ، محبوب و معشوق تھے ضرور مگر اب انکی محبت والفت صرف کہانی ہے اور بس۔

موجودہ دور کے سیاسی رجحان والے شعرا میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، سیماب، جوش، ساغر، روش صدیقی، احسان بن دانش اور افسر میرٹھی خاص سے ممتاز ہیں۔

غالباً یہ حقیقت ہے اور اسکے بیان کرنے میں ہمیں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اقبال کی شاعری اور پیام ایک آزاد اور مسلمان قوم کے لئے "روشن ہدایت" ہے اور انکی شاعری میں وہ تمام خوبیاں، اچھائیاں، رفعت و بلندی پائی جاتی ہے جو ایک قوم کی کایا پلٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ وہ غالباً سب سے بڑے فلاسفر اور مفکر ہیں جنھوں نے اپنے فلسفہ اور ارفع ترین "مذہبی" فلسفہ کو شعر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ بڑے مفکر اور بڑے شاعر ہیں۔ غالباً دنیا نے اتنا بڑا شاعر، فلاسفر ابتک نہیں پیدا کیا ہے اور نہ صدیوں تک اس کی امید۔

لیکن ان کی موجودہ شاعری عام لوگوں کے لئے بہت خشک ہے اور نرا فلسفہ، مگر پھر بھی اصحاب فہم کی روح کی تازگی اور بصیرت کی تیزی کے لئے کافی و شافی ہے اب ہم ان کے چند شعر جن کا تعلق ہندوستانی مسلمان سے ہے پیش کریں گے۔

وہ اپنے مخاطب "مردِ مومن" سے ارشاد فرماتے ہیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج بن نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل نہ "جل ترنگ"

ہندی مسلمان آج تقدیر پر بھروسہ کر کے اپنے ہاتھ پاؤں چلانا بھول گیا ہے۔ اس حرکت پر تنبیہ ہوتی ہے۔

اس قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم　　جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!
"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز　　تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر!
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا　　کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

ہمارے بعض علماء کرام اور مفتیان شرح متین کبھی کبھی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولوالامر منکم کی تفسیر فرماتے ہوئے اولوالامر کے معنے صرف بادشاہ فرماتے ہیں اور ہمارے آقائے ولی نعمت انگریز بہادر کی اطاعت کا حکم عنایت ہوتا ہے علامہ اقبال اس مسئلے پر انکے اجتہاد کے متعلق فرماتے ہیں:۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے　　نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق!
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں　　آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق!
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب　　کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

ہندی مسلمان کا تخیل اسلام کے لئے کیا ہے۔ وہ اسلام کو کیا سمجھتا ہے اس کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے راہ عمل بھی معین فرماتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ صحیح چیز کیا ہے۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت　　وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد!
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو　　آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد
اے مرد خدا تجھکو وہ حاصل نہیں قوت　　جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید　　جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد!
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت　　ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غلامی نے ہمارے مذہبی رہنماؤں کو کس راستے پر دھکیل دیا ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے رہنمائی فرماتے ہیں:۔

سخت باریک ہیں امراض امم کے اسباب　　کھول کر کہئے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شبیری میں غلاموں کے شیوخ اور امام　　دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی!
ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید　　قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی!

جوش ملیح آبادی موجودہ دور کے بڑے پر جوش شاعر ہیں انکے پیام میں واقعیت، سرجوشی و سرگرمی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے ان کی نظموں میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

موجودہ حکومت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں

تو نے شاعر سے یہ اے غاصب حکومت کیا کہا　　تو نہ مانے گا مجھے تو قتل کر دوں گی تجھے
قتل سے کیا ڈر جاؤں گا اتنا سمجھتی ہے ذلیل　　جا، اور ایسی سوقیانہ قسم کی دھمکی نہ دے

ایک جگہ موجودہ استعماری حکومت کو ان الفاظ میں تنبیہ کرتے ہیں۔

ڈر اس وقت سے اے دشمنانِ امن و آسائش　　بنالیں جب حکم خونریز تلواروں کو ہم اپنی
کہ ان کا فیصلہ کچھ اس قدر دو ٹوک ہوتا ہے　　کہ دو ٹکڑوں میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی

ہندوستان کے آرام پسندوں اور تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھ جانے والوں کو ہوش میں لانے کے لئے شاعر کہتا ہے:۔

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی، ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے　　کہ آزادی کا اک لمحہ ہی بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

شاعر اپنے اور ہندوستانی نوجوان کے جذبات کا اظہار اس نعرۂ انقلاب سے کرتا ہے۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب　　میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

ایک نظم میں اپنے لڑکے کو کچھ نصیحتیں کی ہیں اسی کا ایک شعر ہے

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کیلئے　　سر کٹانا ہند کے آزاد کرنے کے لئے

نوجوان شاعر نظامی اپنے ساتھیوں میں اپنے جوش، جذبۂ وطنیت، مادرِ وطن کی محبت کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ مگر ان کی شاعری میں قوتِ بیان و جدتِ ادا کی کمی ہے اور فنی و ادبی لحاظ سے بھی کمزوریاں بہت ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کا جذبہ سچا ہے اور ان کا پیام ملک کے لئے "رحمت و برکت" ہے

نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تم کون ہو ؟ کیا تھے ؟ اور کیا ہو گئے ؟

اے جوانو ' نوجوانو توڑ دو بندِ غلامی

خوش جمالو ' نونہالو پھینک دو سر سے بارِ غلامی

اے حسین و علیؓ کے سپوتو اے محمدؐ کے شہزور بیٹو

نسل سے بادشاہوں کی تم ہو

پھر بھی ہو یادگارِ غلامی

اے جوانو ' نوجوانو

ابیمنو کی اولاد تھے تم عہدِ ماضی کی روداد تھے تم

یاد ہے پہلے آزاد تھے تم

اب ہو اک یادگارِ غلامی

اے جوانو ' نوجوانو

یہ تمھاری چھلکتی جوانی اور یہ لعنت جاودانی

یہ سراسیگی و سرگردانی

یہ دلِ داغدارِ غلامی

اے جوانو ' نوجوانو

اس غلام آسماں کو الٹ دو ارضِ ہندوستاں کو الٹ دو

ہو سکے تو جہاں کو الٹ دو

کیوں ہے باقی ' دیارِ غلامی

اے جوانو ' نوجوانو

آن ظاہرِ اہلِ وفا کی شان ظاہر ہو دستِ خدا کی

ہے جہاں قبر اہلِ وفا کی

اب وہاں ہو مزارِ غلامی

اے جوانو ' نوجوانو

شاعر اپنے وطن سے وفاداری و جاں نثاری کا عہد کرتا ہے، آئندہ ہونے والے انقلاب کی بھیانک اور وہشتناک تصویر اس کے سامنے ہے مگر پورے جوش و ولولہ کے ساتھ مادر وطن پر قربان ہو جانے کا عہد کرتا ہے۔ کاش ہم اور آپ سب مل کر یہ عہد کریں اور استقلالی و پامردی کے ساتھ اس پر قایم رہیں۔

جب مجھے بیڑوں سے عریاں کر کے باندھا جائیگا　　گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا

جب دہکتی آگ پر مجھکو لٹایا جائے گا

اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا

گولیاں چاروں طرف سے گھیر لیں گی جب مجھے　　اور تنہا چھوڑ جائے گا مرا مرکب جب مجھے

اور سنگینوں پہ چاہیں گے اٹھانا سب مجھے

اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

مرتے مرتے اک تماشائے وفا بن جاؤں گا

خون سے رنگین ہو جائے گی جب تیری بہار　　سامنے ہونگی مرے جب سرد نعشیں بار بار

جب مرے بازو پہ سر آ کر گریں گے بار بار

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

اور دشمن کی صفوں پر بجلیاں برساؤں گا

حکم آخر قتلگہ میں جب سنایا جائے گا　　جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے گا

جب یکایک تختۂ خونی اٹھایا جائے گا

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

گذشتہ صفحات میں ایک اجمالی خاکہ اور ایک دھندلی سی تصویر اردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات کی پیش کی گئی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ مطالعہ کی کمی، قوت بیان کے نہونے اور وقت کی تنگی نے اسے بہت تشنہ رکھا ہے۔ اس کے لئے معذرت چاہتے ہوئے اور اپنی کوتاہ نظری، کم علمی اور بے بصیرتی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا جاتا ہے کہ آپ حضرات خود غور و فکر فرمائیں اور اس مسئلہ پر قلم اٹھاکر ہماری اور ہمارے ادب کی صحیح اور سچی راہ نمائی کریں۔

آخر میں ہم پھر ادب جدید کی ضرورت کی طرف آپ کے خیالات کا رخ پھیرنا چاہتے ہیں اور اسی سلسلے میں گذشتہ ادب پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے چند باتیں اور عرض کرنے کی جسارت و جرأت کرتے ہیں۔

ہمارا گذشتہ ادب عام ملکی ماحول کے اثرات سے بہت کم اثر پذیر ہوا ہے اور اسی بنا پر وہ زندگی کی حقیقتوں سے ناآشنا اور بالکل خالی ہے۔ وہ زندگی کے مصائب اور تکلیفات کے دفاع کے متعلق راہ نمائی کرنے سے بالکل معذور ہے کیونکہ وہ تو سرے سے ہی ناواقف اور بیگانہ ہے کہ زندگی اور اسکی حقیقت کیا ہے۔

ادب دراصل انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا سب سے پہلا اور سب سے آخری اور بلند تر مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس کائنات، اس تباہ حال دنیا سے وطن اور رنگ و نسل کے اختلافات کو مٹاکر نیست و نابود کردے۔ اور ایک ایسی جماعت انسانی پیدا کرے جو صرف نظریۂ انسانیت کی داعی ہو اور جسکا مرکزی تصور ساری دنیا کو ایک ہی قسم کا آدمی بنانا ہو۔ اور اگر کوئی جماعت ان خیالات کی دنیا میں موجود ہے اور اسکا عملی کام بھی جاری ہے تو ہمارے ادب کو بھی اس جماعت کا ترجمان بن کر دنیا میں امن و آسائش کی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

آج تک ہمارا ادب زندگی کو بے کار، فانی اور بے ثبات کہتا آیا ہے۔ انسان کی عاجزی، کمزوری ولاچاری کا مرثیہ خواں رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اس بزدلی و نامردی کو چھوڑ دے، اس کمزوری سے ہٹے اور پورے زور و شور، پوری آن بان اور پورے جوش و ولولہ کے ساتھ پکار اٹھے کہ زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے، انسان عاجز اور لاچار نہیں اگر عمل کی قوتیں استعمال کی جائیں اور بالکل

صحیح طریقے سے استعمال کی جائیں تو وہی اس دنیا کا بنانے و بگاڑنے والا، کارساز حقیقی اور مالک اصلی ہے۔ قیامت اور محشر کے معنے صرف یہ ہیں اور انکی حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ روح الاجتماع وادر محشر بنکر ظلم واستبداد سے باز پرس کرے اور پھر ان کو جہنم کا راستہ دکھلادے۔ اور پھر ایک نئی جنت ایک ترو تازہ و شاداب بہشت کی تخلیق اس اجڑی دنیا میں کی جائے۔ یہ جنت ہر انسان کو ہر طرح کی جسمانی، ذہنی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچا سکے گی اور ہر شخص برابر فائدہ اٹھا سکے گا۔

انسانیت اور ادب کی راہیں الگ الگ نہیں ہیں دونوں کی نجات کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ روشن و صاف مسلک کیا ہے۔ ہمارے ایک ادیب نے کہا ہے۔

"وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور اپنے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کی ارتقا میں حائل ہوں"

غالباً اس موقعہ پر بیجا نہ ہوگا اگر چند جملے اُردو زبان کے متعلق بھی عرض کر دیئے جائیں۔ زبان اور مذہب دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے نہ کہ صرف مسلمانوں کی تو آپ کا فرض ہے کہ اسے قومی زبان بنانے کے لئے اس میں ہر قسم کے جذبات و خیالات ادا کیجئے۔ قومی زبان کے لئے ضروری ہے کہ وہ وسیع ہو۔ اس میں ہر فرقہ، ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگوں کے جذبات پائے جاتے ہوں۔ صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اُردو میں مسلمان کے خیالات، ہندوؤں کے افکار، عیسائیوں، سکھوں، بودھوں اور پارسیوں کے جذبات بھی ہونے چاہئیں۔ مذہب پر ایمان رکھنے والوں اور لامذہبوں دونوں کو اپنے اپنے خیالات، اپنی اپنی باتیں لکھنے کا برابر حق ہونا چاہیئے۔ ہر فن، ہر صنف اور ہر علم کے متعلق ہر شخص کو لکھنے کا حق ہونا چاہیئے۔ ہر نقطہ خیال اور ہر زاویۂ فکر کو پیش کرنے کی اجازت ملنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم یا ملک کی زبان نہیں کہی جا سکتی کہ جس کے حسن و قبح، اچھائی و برائی کا فیصلہ ساری قوم، تمام جنتا اور سارے لوگ نہیں بلکہ صرف مذہبی جماعت والے کریں۔

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا دوست ہو جائے تو اسے خوشی اور اطمینان اور ایک طرح کا سہارا ہو جاتا ہے۔ اور دشمنی اندیشے اور خوف پیدا کرتی ہے میونچ کانفرنس نے جہاں ایک تماشہ ختم کیا ہے وہاں ایک نیا تماشہ شروع کر دیا جنہیں دوستی قائم ہوئی تھی ایک دوسرے سے بدگمان ہو گئے۔ اور جنکی عداوت نے یورپ کو جنگ اور تباہی کی بھیانک صورت دکھائی تھی آپ ہی آپ گہرے دوست بن گئے جرمنی اور چیکوسلواکیا میں اب میل ملاپ اور عہد و پیمان ہو رہے ہیں اور جنگ کا وہ طوفان جو وسطی یورپ میں برپا ہوا تھا اب دوستی کی ہواؤں پر اڑ کر مغربی یورپ پر چھا رہا ہے۔

ستمبر کے آخر میں جب برطانیہ مجبور ہو کر، یا صاف صاف کہئے کہ جرمن ہوائی جہازوں کی بمباری سے بچنے کیلئے جنگ کی تدبیریں کرنے لگا تب فوراً معلوم ہو گیا کہ جنگ کی تیاری کی جو دہوم مچائی گئی تھی وہ سب دکھاوا تھا اور اگر کسی دشمن نے واقعی حملہ کر دیا ہوتا تو اسکی روک تھام نہ کی جا سکتی اس بات نے انگریزوں کی خودداری کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ اور اگر جرمنی سے سمجھوتا ہو جانے کی ہر طرف خوشیاں منائی گئیں تو سب کے دلوں میں یہ ڈر بھی پیدا ہو گیا کہ یہ خوشی صرف امن کے خواہشمندوں کی نہ تھی بلکہ ایسے لوگوں کی جو ایک بڑے خطرے سے بال بال بچے تھے۔

یہ احساس کہ وہ کمزور ہے اور دشمنوں سے ڈرتی ہے ہر زندہ قوم کو اپنی طاقت بڑھانے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں میونچ کی گفتگو کے بعد ہی سے جنگ کی تیاری کے اور زیادہ چرچے ہونے لگے ہیں۔ بحری اور ہوائی جہاز بنانے کا کام زیادہ تیزی سے کیا جانے لگا ہے۔ اور ہوائی حملوں سے بچنے کی زیادہ معقول اور کارگر تدبیریں کی جانے لگیں۔ ایسی فضا میں ہٹلر کی خواہش کا کون خیال کر سکتا تھا کہ چار ریاستوں کا اتحاد جس کی طرح میونچ میں ڈالی گئی تھی ایک حقیقت بن جائے اور انگلستان

فرانس جرمنی اٹلی مل کر کوئی ایسا معاہدہ کرلیں کہ جس سے وہ روپیہ جو جنگ کے سامان پر صرف کیا جارہا ہے زیادہ مفید کاموں میں لگایا جا سکے۔ اب وہی انگریز جو جرمنی کے ہمدرد تھے محسوس کر رہے ہیں کہ اگر جرمنی کی طاقت بہت زیادہ نہیں بڑھ گئی۔ ہے تو انگلستان کی اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہئیے۔ چیکوسلواکیا کی رام کہانی سب بھول گئے اب انھیں اپنی سلامتی کی فکر ہے اور اسکا عام طور پر اندیشہ کیا جا رہا ہے کہ لڑنے کے بجائے انسانیت سے بیٹھ کر اور دوستانہ طریقے پر مطالبے پیش کرنے اور منظور کرانے کا جو سبق مسٹر چیمبرلین نے ہر ہٹلر کو میونچ میں پڑھایا تھا۔ وہ کہیں انھوں نے یاد نہ کر لیا ہو۔ اور اب کہیں کہ آؤ بیٹھیں۔ اور جرمنی کی نو آبادیوں کی واپسی کے معاملے کو انسانیت سے طے کرلیں۔

برطانیہ میں اب جرمنی کی مخالفت کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے اور مسٹر ونسن چرچل کی طرح کے لوگ جو جرمنی کے پیدائشی دشمن ہیں اور بہت سے ایسے بھی جو جرمن کے دوست نہیں تھے۔ مگر چیکوسلواکیا کی خاطر لڑنے پر تیار نہیں تھے اب صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ جرمن کی طاقت کا اس طرح بڑھ جانا انگلستان اور سارے یورپ کے لئے ایک بڑا زبردست خطرہ ہے۔ اور ہر ہٹلر کے انداز میں وہ باتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوست کے آپ ہی آپ بگڑ جانے پر کی جاتی ہیں وہ پوچھ رہے ہیں کہ میونچ کی گفتگو کے بعد جنگ کی تیاری کے کیا معنی اب تو ہمیں اس حماقت سے باز آ جانا چاہئیے وہ کھلم کھلا کہہ چکے ہیں کہ مسٹر ایڈن اور ڈف کی تقریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ میں ایک پارٹی ہے جو جرمن سے لڑنا چاہتی ہے اگر مسٹر چیمبرلین نے اسے قابو میں نہ رکھا اور برطانیہ کی سیاستاسی کے حوالے کر دی تو اس کا انجام برا ہوگا پھر تو یہ برطانیہ اور جرمنی کی دوستی قائم نہ رہ سکے گی اور نو آبادیوں کا مسئلہ کسی معقول طریقے پر طے نہ ہو سکے گا۔ بہر حال جرمنی اب برطانوی مدبروں کی نصیحتیں سننے اور ان سے سیاست کا سبق لینے پر تیار نہیں۔ ہر ہٹلر کی ان باتوں کو جرمن اخبار اس طرح دہراتے ہیں کہ وہ مطلب ظاہر ہو جائے جسے بیان کرنا ہٹلر فی الحال مناسب نہیں سمجھتا۔ مشرقی اور جنوب مشرقی افریقہ کی سابق جرمن نو آبادیوں کے واپس دینے کے خلاف جو مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اسکے بارے میں جرمن اخبار لکھ رہے ہیں۔ کہ انھیں روک دینا چاہئیے اس لئے کہ وہ پہلے ہی سے ایسا تعصب پیدا

کر رہے ہیں جسکی وجہ سے جرمنی کو اس کا حق دینے کا مسئلہ طے نہ ہو سکے گا، اس کے علاوہ ہٹلر کے حوصلہ مند پیرو اور مشیر اسے یقین دلا رہے ہیں کہ وہ جرمنی کی سابق نوآبادیوں کو اس کے سامنے تحفے کے طور پر پیش کریں گے۔ اور بعض کو تو کامیابی کا اتنا یقین ہے بڑے دن کے تحفوں کے ساتھ یہ پیش کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

موقع شناس انگریز ابتک جرمنی کے ہمدرد اس وجہ سے تھے کہ صلح نامہ ورسائی میں جرمنی کے ساتھ ایسی زیادتیاں کی گئیں جن کا اثر مٹائے بغیر یورپ کو امن نصیب نہیں ہو سکتا تھا لیکن دوسرے کی زیادتیوں اور اپنی زیادتیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انگلستان نے فرانس کی یورپی سیاست کی جڑ کاٹ دی اور بہانہ یہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یورپ جنگ کی آفتوں سے بچ نہ سکے گا۔ اب جو جرمنی نے چیکوسلواکیا کو اس طرح اڑا دیا ہے جس طرح پہاڑوں میں رستہ بنانے والے بڑی بڑی چٹانوں کو بارود سے اڑا دیتے ہیں اور چیکوسلواکیا کو اپنی سیاست میں اس طرح لگا لیا ہے جیسے چٹانوں کے ٹکڑوں سے سڑک کے پشتے بنتے ہیں۔ اب جو اس نے ہنگری بلغاریہ ترکی کو اپنی سیاست اور تجارت کے کل پرزے بنا دیا ہے۔ بحر اڈریاٹک کی تجارت میں حصہ دار ہو گیا ہے اور عراق اور اور ایران تک بڑھ کر بحر روم کے مشرقی حصے کو گھیر رہا ہے اب جرمنی کا مطالبہ ہے کہ مشرقی افریقہ میں اسکی جو نوآبادیاں تھیں واپس دے دی جائیں۔ اس نے برطانیہ کے دل کے اور ہی تاروں کو چھیڑ دیا ہے اور اس کے مزاج پر اور ہی اثر ڈالا ہے۔ بلقان اور ترکی میں انگریزی تجارت کو کوئی خاص دخل نہ تھا اور نہ اب ہے لیکن جرمنی کا اس راستے کے دونوں طرف مورچے قائم کر لینا جو انگلستان سے ہندوستان آتا ہے۔ عرب مصر، شام اور عراق میں جہاں انگریزی تجارت اور سیاست سیاہ اور سفید کی مالک تھی۔ برابر کا حق مانگنا اور اس حق کو حاصل کرنے کے لئے کافی طاقت پیدا کر لینا۔ یہ تو ایسے مجبن ہیں جو برطانیہ کو جرمنی سی یقینا خفا کر دیں گے اور دوستی کے طور طریق کو زیادہ دیر تک نبھانا دشوار ہو جائیگا۔ ۲ اکتوبر کو سر سموئیل ہور نے ایک تقریر میں یقین دلایا تھا کہ ہر ہٹلر واقعی امن پسند ہیں اور ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ اپنے وعدے پورے نہیں کرتے۔ اس لئے کہ جب سے انھوں نے انگلستان سے گفتگو میں طے کر لیا۔ کہ

جرمنی کے جنگی جہازوں کی انگلستان کے بیڑوں سے ۳۵ فی صدی نسبت رہے گی تب سے اُنھوں نے جہازوں کی تیاری میں اسکا خیال رکھا اب بھی اگر انکے اور برطانیہ کے درمیان کچھ طے پایا تو ان کے وعدوں پر اعتبار کیا جا سکتا ہے سر سموئل ہور اس جماعت کے جو ہر ہٹلر کی حامی اور سرپرست ہے ایک بہت ممتاز رکن ہیں۔ اور انکی تقریر کا مقصد غالباً صرف ان تقریروں کا اثر دور کرنا تھا جو مسٹر چرچل نے حال ہی میں کی ہیں۔ اس لئے کہ اگر ہٹلر نے اس کا مطالبہ کیا کہ جیسے بحری جہازوں میں جرمنی کے ۳۵ اور انگلستان کے ۱۰۰ کی نسبت منظور کی گئی ہے ویسے ہی ہوائی جہازوں میں انگلستان کے ۳۵ جرمنی کے ۱۰۰ کی نسبت منظور کر لی جائے۔ تو سر سموئل ہور اپنی قوم کو اس پر راضی نہ کر سکیں گے۔ ہر ہٹلر یہ مطالبہ ضرور کریں گے کیونکہ انھیں اپنی بحری قوت کی کمی اس طرح پوری کرنی ہے۔ ورنہ انگلستان کا پلہ بھاری رہتا ہے اور سچی دوستی صرف برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے وہ اگر یہ مطالبہ کر بیٹھے تو دیکھئے گا کہ انگریز ہمدرد بغلیں جھانکتے ہوں گے سر سموئل ہور نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ جرمنی سے دوستی ہو جائے پر ہم جنگ کی تیاری اس لئے کر رہے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے بعد جو وزیر ہوں گے انکی پالیسی کیا ہوگی اگر سر سموئل ہور کو اپنے وارثوں کا اتنا خیال تھا تو انھیں جرمنی سے دوستی بھی نہ کرنی چاہئے تھی اس لئے کہ معلوم نہیں کہ اس کا برطانیہ کی سیاست پر کیا اثر ہو اور بعد کی وزارتیں اپنے آپ کو کن کھیڑوں میں مبتلا پائیں۔ اس طرح بات بنانے کا مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ہٹلر بدگمان نہ ہو جائیں اور انگلستان کمزور ہونے کے سبب اپنے کسی معاملے میں دبنے پر مجبور نہ ہو ایسے بہت سے معاملے نظر بھی آرہے ہیں۔

مسولینی نے برطانیہ کو خوش کرنے کی خاطر اور جنرل فرینکو نے چند ضروری اختیارات حاصل کرنے کی غرض سے ہسپانیہ سے قریب دس ہزار اٹلین سپاہی ملک کو واپس بھیج دئے ہیں لیکن برطانیہ کو ان اعداد پر اعتبار نہیں اور اب بھی اتنے اٹلین سپاہی موجود ہیں کہ مسولینی جب چاہے انگریزی سیاست اور تجارت کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ مالٹا کا جزیرہ جو اب تک بڑا مورچہ تھا اب اٹلی کے ہوائی جہازوں کی بدولت بے کار ہو گیا ہے جبرالٹر اٹلی اور جرمنی کے مورچوں میں گھرا ہوا ہے اس لئے انگریز مسولینی

اور فرینکو کی اس عنایت سے مطمئن نہ ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا برطانوی سیاست چاہتی تھی کہ ایک طرف مصر اور دوسری طرف فلسطین میں قدم جما کر نہر سوئز کو محفوظ کر لے سو وہ کام بھی بنتا نظر نہیں آتا۔ فلسطین کے معاملے میں مصریوں نے برطانوی سیاست کو سہارا دینے سے صاف انکار کر دیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ عرب کا عرب سے اور مسلمانوں کا مسلمانوں سے ایسا تعلق ہو گیا ہے جو آسانی سے توڑا نہیں جا سکتا اسکا ایک سبب تو مغربی ایشیا کے مسلمانوں کی بیداری ہے۔ جسے سیاست اب تدبیر یا بندوق کی گولیوں سے دور نہیں کر سکتی۔ اور دوسرا خطرناک سبب یہ ہے کہ غیر قوموں نے یہاں کے معاملات سے دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ پہلے تو برطانیہ کی دولت ایسی تھی کہ غیر قوموں سے مدد مانگنا یا کسی غیر قوم کا مدد کرنا ناممکن سا تھا لیکن اب جب سے برطانیہ نے جرمن اور اٹلی کے ساتھ توپ کے بجائے زبان سے بات کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے برطانیہ کی ساکھ نہ جانے کیوں جاتی رہی ہے۔

کم از کم سننے میں تو یہی آیا ہے کہ جب سے حبش میں انگریزوں کی مرضی کے خلاف ہو جانے سے پھر ہسپانیہ میں اٹلی کی مداخلت اور اس سال مسٹر ایڈن کا استعفیٰ اور جیسا کہ چند غیر ذمہ دار لوگ بغیر سوچے سمجھے کہتے ہیں، برطانیہ کی اٹلی سے دوستی کی خواہش کرنے پر فلسطین کے عربوں کی ہمت بڑھ گئی تھی، ویسے ہی میونخ کانفرنس نے عربوں کی بغاوت میں نئی جان ڈال دی ہے اس وقت چند بڑے شہروں کے سوا ہر جگہ باغیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے اور بڑے بڑے شہروں میں بھی فوج نہ ہو تو برطانوی قبضے کا نام و نشان بھی نہ رہے۔ عربوں نے ملک کو آزاد کرنے کے لئے جو کمیٹی قائم کی ہے اس کے صدر نے مسٹر وائزمان کو ایک تار دیا تھا کہ آپ نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ مشرق میں رہنے والے یہودیوں کے سر پر ایسی آفت لائیگا جس کی مثال آپ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ عرب یہودیوں کو فلسطین پر نہ قبضہ کرنے دیں گے اور نہ آبادی کی اکثریت بننے دیں گے چاہے اس کوشش میں ہر ایک عرب ہلاک ہو جائے واقعی عرب اس وقت اپنی کامیابیوں کی وجہ سے اتنے شوخ اور گستاخ ہو گئے ہیں کہ وہ برطانوی سیاست کو زبان سے نہیں بلکہ عمل سے ایسے چیلنج دے رہے ہیں اور معلوم

ہوتا ہے کہ انکا خیال ہے یہودیوں کی طرح اور قوموں کا بھی تھکنے کے بعد مزاج ٹھیک ہوتا ہے برطانوی سیاست اس غلط فہمی کو دور کرنے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ جیسے اور جگہوں پر سرکشوں کی جھونپڑیوں پر بم پھینک کر انکی گوش مالی کی جاتی ہے ویسے ہی بیت المقدس اور دوسری چھوٹی بڑی بستیوں پر انگریزی فوج سرکشی کے آثار مٹا رہی ہے انگریزی اخبار کہتے ہیں کہ یہ سخت تدبیریں اس وقت تک کے لئے اٹھا رکھنی چاہئیں تھیں جب تک ہم چپ چاپ اپنا کام نہ نکال لیتے۔ عرب اور یہودیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے بدلے میں فیس کے طور پر کچھ وصول کرتے اور یہ کام سر پھوڑ کر نہیں کیا جاتا بہرحال اب صورت یہ ہے کہ مشرقی بحر روم میں بھی انگریزی سلطنت کی بنیاد کمزور ہو رہی ہے۔ اور ہر ہٹلر کی باتوں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اسے ایک افسوسناک حالت نہیں بلکہ تماشہ سمجھتے ہیں خاص اس زمانہ میں جبکہ انھیں برطانیہ کا شکرگزار ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ انھیں سڈٹین علاقے بغیر خون بہائے واپس دلوا دئے انھوں نے یہ کہا کہ فلسطین کے مسئلوں کو پیدا کر کے پھر حل کرنا انگریزوں کی قسمت میں لکھا ہے۔ جو ایک بہت بے تکی بات ہے اس سے اور کچھ نہیں تو یہ ضرور ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ جس دوستی کا برطانیہ سے مطالبہ کر رہے ہیں وہ خود ان کے دل میں نہیں ہے برطانیہ کے مدبر کچھ ایسے بھولے نہیں کہ وہ ایسی بات کو نہ سمجھیں اور کیا تعجب ہے کہ جب نو آبادیوں کی واپسی کا مطالبہ پیش ہو وہ ہر ہٹلر کے غصے اور اکڑ فوں کو وہی تماشہ دکھانا چاہیں اور کہیں کہ ایسا تماشہ دکھانا ہٹلر کی قسمت میں لکھا ہے ؎

م۔م

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

تنقید و تبصرہ

باغی | جاذب دہلوی صاحب کی نظمیں اکثر مختلف رسائل میں چھپتی رہتی ہیں اور ایک آدہ نظم کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اب ایوان ادب نے اُن کا نیا کلام "باغی" کے نام سے چھوٹی تقطیع پر شائع کیا ہے جس میں نظموں کو چار پانچ مختلف عنوانات کے تحت میں یکجا کیا گیا ہے۔

شاعر ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی کشمکش سے شدید طور پر متاثر معلوم ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اُن کی نظموں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اُن کے احساسات اور جذبات کی صحیح معنی میں آئینہ دار ہیں کچھ بے جا نہ ہوگا۔ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کی خواہش ہے کہ سرمایہ داری کے نظام کہن کو شکست کر دیا جائے، قصر استبداد کی بنیادیں ڈہا دی جائیں اور فرقہ وارانہ جذبات کو یکسر ختم کر کے ہندوستان کی جملہ اقوام ایک متحدہ قوم بن کر رہیں۔ مذہب سے بھی شاعر بیزار معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُن کی جو نظمیں "مذہب اور اسکے اجارہ دار" کے تحت میں جمع کی گئی ہیں ان سب سے یہی پتہ چلتا ہے۔ اکثر جگہ مولویوں اور خدا کے خلاف استنے تند لہجہ میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے کہ نظم کی متانت کا خون ہوکر رہ گیا ہے۔ مثلاً اپنی نظم "ایک مذہبی مناظرہ" میں لکھتے ہیں۔

ہیں دونوں آخر پرانے پٹھے قلم اٹھانے ہیں بیٹھتے ہی یہ اپنا پہلو بچا بچا کر وہ اپنا پہلو بدل بدل کر

پٹھے کا لفظ کس قدر سوقیانہ ہے اسی طرح ایک دوسری نظم "مولوی" میں قرآن اور خدا کے ساتھ جو تمسخر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:۔

ہیں گورمنٹ کے مدح خواں ابھی کانگرس کے تھے ہم زباں
ہے "کلام پاک" کی ڈگڈگی یہ خدا کو جس پہ نچاتے ہیں

بعض جگہ فنی اسقام بھی نظر آجاتے ہیں مثلاً ایک نظم "بھگتی" میں آپ نے خبط اور ضبط کا قافیہ وقت اور بھگت باندھا ہے جو ناجائز ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر مجموعی طور پر کتاب اچھی ہے،

طباعت و کتابت بھی دیدہ زیب ہے۔ (ح۔ ی)

سراج سخن | مرتبہ جناب عبدالقادر صاحب سروری مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ چار مینار۔ حیدرآباد دکن۔ تقطیع چھوٹی۔ صفحات ۱۵۲۔ قیمت ۱۲ طباعت و کتابت خوشنما۔

یہ کتاب سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی چوتھی کتاب ہے۔ اور اس میں سید شاہ سراج الدین اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مرتب جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد ہیں۔ کتاب کے شروع میں سروری صاحب نے سراج کے بارے میں نہایت تحقیق اور کاوش سے ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ "دکن کی اردو شاعری" کے عنوان سے ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے گذشتہ چار سو سال کے دکن کے اردو شاعروں کو سات دوروں میں تقسیم کرکے ان کے کلام کی خصوصیات پر ایک مختصر تبصرہ تحریر فرمایا ہے جسے دیباچہ عمومی کے نام سے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

سراج اس تقسیم کے اعتبار سے چوتھے دور کے شاعر ہیں۔ ان کا زمانہ ایک عبوری زمانہ تھا جس میں قدیم رنگ کی شاعری ختم ہو رہی تھی اور نئے طرز کا آغاز ہو رہا تھا۔ میر تقی میر، سراج سے دس سال چھوٹے تھے۔ جس وقت سراج کا دیوان مرتب ہوا ان کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ سروری صاحب اپنے مقدمہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "سراج اور میر تقی میر کی طبیعت میں ایک طرح کی مناسبت تھی اور دونوں کی شاعری کا نمایاں وصف سوز و گداز ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میر کے ہاں بعض مضامین اس طرح بندھے ہیں جس طرح سراج کے کلام میں باندھے گئے تھے۔ بعض جگہ تو مصرعوں کا توارد سا ہو گیا ہے"۔ اس سلسلہ میں سروری صاحب نے مندرجہ ذیل دو دو شعر دونوں کے پیش کئے ہیں:۔

سراج	میر
خندہ دنداں نما لازم نہیں اے سحر حسن	مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشک آب دار
نہیں تو اب جاتی رہیگی ان میں موتی کی آب	مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

جس پھول نے ترے سیں کیا دعوی بہار ‏ دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سی باغ میں
وہ پائمال آفت باد خزاں ہوا ‏ سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

ان اشعار سے سراج کے کلام کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری دو سو سال قبل کی اُردو شاعری اور زبان کا نمونہ ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ کے ابتدائی ادوار کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہوگی۔ (م - ع)

نور مشرق | از جناب مہرلال صاحب ضیا سونی ایم۔ اے فتح آبادی ناشر جیوتی پرشاد گپتا، گپتا پرنٹنگ ورکس اسپلینڈ روڈ۔ دہلی۔ تقطیع چھوٹی صفحات ۱۲۶ مجلد، طباعت و کتابت خوشنما۔ قیمت عہ

یہ ضیا صاحب کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا تعارف جوش صاحب ملیح آبادی آزاد صاحب انصاری اور منتظر صاحب صدیقی اکبر آبادی نے فرمایا ہے۔ جوش صاحب نے اپنے تعارف میں تحریر فرمایا ہے کہ "ان کا کلام غزل گوئی کی غیر فطری سخرگی سے قطعاً پاک ہوتا ہے۔ .... ضیا صاحب نوجوان ہیں اور نو مشق......... لیکن ان کی نظموں کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ اگر ان کی مشق اسی طرح جادۂ صحیح پر گامزن رہی...... تو وہ ہندوستان کے ممتاز شعرا میں سے شمار ہونے لگیں گے۔" آزاد صاحب تحریر فرماتے ہیں "یہ مجموعہ دور حاضر کی ترقی یافتہ شاعری کا ایک دلچسپ اور نظر نواز مجموعہ ہے .... اگرچہ ابھی آپ کی شاعری پورے بلوغ کو نہیں پہنچی۔" ان بالغ نظر شعرا کی تنقید کے بعد کتاب کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

کتاب کے تین حصے کئے گئے ہیں۔ نظمیں، گیت اور سانیٹ (Sonnets) نظموں کے چند عنوانات طلوع سحر، انقلاب بہار، بوندوں کا ساز، خوبصورت ارادے وغیرہ ہیں۔ گیت کے عنوانات برہن کا گیت، من کا گیت، پی بن وغیرہ ہیں۔ سانیٹ، اپنی میرا سے، یاد، دھوکا وغیرہ ہیں نئے رنگ کی شاعری سے جن لوگوں کو لگاؤ ہے ان کے لئے یہ کتاب دلچسپ ہوگی۔ (م - ع)

مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو (ہند)

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عار	عہ۱۲ر
القول الاظہر	عہر	۸ر
رہنمایانِ ہند	عاگر	عمہر
امرائے ہنود	ہیہر	سے ر
القمر	عہر	۱۰ر
تاریخ تمدن حصہ اول	عار	عمہر
" " " دوم	عار	عمہر
فلسفۂ جذبات	عاہر	عار
البیرونی	عار	عمہر
دریائے لطافت	سے ر	عاہر
طبقات الارض	عاہر	عار
مشاہیر یونان و رومہ حصہ اول	للعہ	سے ر
" " " دوم	سے ر	عاہر
اسباق النحو حصہ اول	•	۸ر
" " " دوم	•	۸ر
علم المعیشت	صہر	صہر

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے ر	عاہر
" " " دوم	عاہر	عار
تاریخ یونان قدیم	عا	•
نکات الشعراء	عاہر	عہ۱۲ر
وضع اصطلاحات	ہیہ۱۲ر	ہیہر
بجلی کے کرشمے	عہ۱۲ر	عمہر
تاریخ طب قدیمہ	عہ۱۲ر	•
محاسن کلام غالب	عہر	۱۰ر
قواعد اردو	عاہر	عار
تذکرہ شعرائے اردو	عہ۱۲ر	عہر
جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق	سے ر	عاہر
تاریخ ہند ہاشمی	•	۱۲ر
مثنوی خواب و خیال	عمہر	عہر
کلیاتِ ولی	صہر	للعہ
چمنستانِ شعراء	صہر	للعہ
ذکر میر	•	عار

المشتہر منظفر حسین شمیم مہتمم انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن

"بلاغ" امرتسر

معاصرین کرام کی نظروں میں

۱۔ بلاغ میں محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ "ایمان"

۲۔ قرآنی حقائق و معارف کی اشاعت اور صرف کلام اللہ کے جامع و مکمل اصول کی طرف فرزندانِ توحید کو مائل کرنا بلاغ کے مقاصدِ خصوصی ہیں۔ بلاغ معارف قرآنیہ کا صحیح ناشر اور تعلیماتِ الٰہیہ کا بہترین مبلغ ہے۔ "ترجمان سرحد"

۳۔ رسالہ اپنے موضوع میں بہت اچھا ہے اور متانت و سنجیدگی کا جو اعلیٰ معیار اس میں قائم رکھا گیا ہے، وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ "الجمعیۃ"

۴۔ وہ لوگ جو قرآنی علوم کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونا چاہتے ہیں، اُن کے لئے اس رسالے کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ "دورِ جدید"

۵۔ قرآن شریف کی روزانہ تلاوت کرنے والوں کے لئے رسالہ بلاغ واقعی سچی رہنمائی کرے گا۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ بہترین ہے۔ "کراچی نیوز"

۶۔ تمام کا تمام رسالہ قرآن کی تعلیم اور مذہبی احکام کا دلچسپ اور بہترین آرگن ہے۔ "سالار"

۷۔ ہر مضمون قابل قدر معلومات کا مرقع ہوتا ہے، قرآن حکیم کی تفسیر بھی بالاقساط شائع کی جاتی ہے۔ "فیروز پور زمیندار"

مملکتِ دکن کا واحد اردو انگریزی نیم ماہی فلمی رسالہ

زیر نگرانی :- محمد حسام الدین خاں صاحب غوری

زیر ادارت ایل - سی بعلہ بی اے

مووی لینڈ

صنعت فلم سازی کی اصلاح و ترقی کا علمبردار

صنعت فلم سازی کے ہر پہلو پہ گرانمایہ مضامین،
نگارشانوں کی رنگین و رومان خیز کہانیاں،
مغربی شاہکار مضامین کے تراجم،
روح پر وجد طاری کرنے والی نظمیں۔

فلموں پر لاجواب تعمیری و تنقیدی مقالات،
دکھی زندگیوں کی اشک افشاں داستانیں،
تازہ ترین فلمی حالات و دلچسپ معلومات
اور دلکش و دل پذیر تصاویر

سے مزین ہو کر

ہر ماہ عیسوی کی پہلی تاریخ کو اس کا اردو ایڈیشن اور ۱۵ تاریخ کو انگریزی ایڈیشن شائع ہوتا ہے

دونوں ایڈیشن کا سالانہ چندہ

(للعہ) مع محصولڈاک

کسی ایک ایڈیشن کا سالانہ چندہ

(دعہ) مع محصولڈاک

قیمت فی کاپی صرف -۳

منیجر مووی لینڈ متصل بنسی لال پیٹھ، سکندر آباد دکن

تفاسیر ثلاثہ ثنائیہ

از حضرت مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری

معارف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر نظام القرآن کے مندرجہ ذیل اجزاء کا اردو ترجمہ چھپ کر تیار ہے۔ مولانا کے فہم و تدبر قرآن پر تمام عرب و عجم کا اتفاق ہے۔ ترجمہ مدیر "الاصلاح" کے قلم سے ہوا ہے اور ہندوستان کے تمام ارباب علم و ادب نے ترجمے کی خوبی اور سلاست کی داد دی ہے۔

اجزاء تفسیر اردو میں		اجزاء تفسیر عربی میں	
تفسیر سورہ تین	۷ر	تفسیر سورۃ القیامہ	۴ر
″ ″ عصر	۶ر	″ ″ العبس	۴ر
″ ″ فیل	۸ر	″ ″ التین	۴ر
″ ″ کوثر	۸ر	″ ″ الفیل	۸ر
″ ″ الکافرون	۴ر	″ ″ الکوثر	۴ر
″ ″ لہب	۶ر	″ ″ الہب	۴ر
″ ″ اخلاص	۵ر	الرای الصحیح فی من ہو الذبیح	۱۰ر

امعان فی اقسام القرآن ۸ر

تفسیر کے علاوہ مولانا کی دوسری تصنیفات

اسباق النحو حصہ اول ۵ر۔ حصہ دوم ۶ر۔ تحفۃ الاعراب ۲ر۔ اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔

امثال آصف الحکیم عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کے لئے بہترین ریڈر ہے۔ ۴ر

دیوان حمید۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا فارسی دیوان ہے۔ ۶ر

خرد نامہ منظوم۔ خاص فارسی زبان میں امثال سلیمانؑ کا ترجمہ ۸ر

ملنے کا پتہ:۔ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ (یوپی)

ناول اور افسانے

بنی اسرائیل کا چاند۔ مصنفہ رائڈر ہیگرڈ۔ مترجمہ عبدالمجید صاحب حیرت بی اے (علیگ)، فرعون کا دور حکومت شاہزادہ سیتی ولی عہد سلطنت کے انصاف و عدل کے لئے معزولی، عبرانیوں پر مظالم، ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے، مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے درپے مختلف قسم کی وبائیں۔ بنی اسرائیل کی آزادی، فرعون کی معہ لشکر غرقابی سیتی و میراپی کے تعلقات کی دل گداز داستان۔ قیمت مجلد عہ

میدان عمل۔ ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کے بے نظیر ناول میدان عمل میں ملک کی موجودہ بیدار و بے چین روح کی ایک جھلک ہے۔ اس ناول کے افراد اس دور کے وہ زندہ انسان ہیں جو محبت کرنے اور محبت کی آگ میں اپنا سب کچھ جلا کر خاکستر کر دینے کے اہل ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں ہندوستان کا مستقبل ہے۔ اور اُن کے کارناموں پر کروڑوں انسانوں کی فلاکت کا بار۔ قیمت مجلد عا

بیوہ۔ منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایے میں لکھے ہیں۔ ایک بیوہ کی ترغیبات اس کی الجھنوں اور اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششوں کو بہترین طریقے سے پیش کیا گیا۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیے۔

واردات۔ منشی پریم چند آنجہانی کے جادو نگار قلم کے تیرہ تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ یہ افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی تصویریں ہیں۔ جو افسانوں کی شکل میں منشی جی آنجہانی نے پیش کی ہیں۔ کاغذ طباعت اعلیٰ۔ تقریباً دوسو (۲۰۰) صفحات۔ قیمت مجلد عہ

کیمیاگر۔ محمد مجیب صاحب بی اے آکسن کے مختلف افسانوں کا دلکش مجموعہ۔ طباعت وغیرہ خوب صورت یہ افسانے اعلیٰ اور ستھرے مذاق کے طبقے میں عموماً پسند کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ

دامن باغبان۔ مشہور ادیب و صحافت نگار جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کے منتخب اصلاحی افسانوں کا نہایت قابل قدر مجموعہ۔ ہر افسانہ ایک مستقل پیام ہے۔ اور ہر لحاظ سے کامیاب، طباعت وغیرہ عمدہ اور نفیس۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ لاہور لکھنؤ

سلسلہ منتخبات نظم اردو

۱۔ معارف ملت ۲۔ جذبات فطرت ۳۔ مناظر قدرت

مرتبہ
پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے۔ ال ال بی (علیگ)

وہ حضرات جنھوں نے اردو شاعری کی ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی داستان سمجھ رکھی ہے اس سلسلہ انتخاب کو ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل نظموں پر وہ سر دھنتے ہیں ان کی ہم پلہ نظمیں خود ان کی زبان میں موجود ہیں شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے۔

معارف ملت (چار حصے)

جلد اول۔ حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں قیمت عہ
جلد دوم۔ مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل کی تصویریں قیمت عہ
جلد سوم۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق شعرا کا دلپذیر کلام قیمت عہ
جلد چہارم۔ اخلاق و حکمت کے انمول موتی قیمت عہ

جذبات فطرت (چار حصے)

جلد اول۔ میر و سودا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ
جلد دوم۔ غالب، ذوق، ظفر اور حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب قیمت عہ
جلد سوم۔ تقریباً تیس قدیم، مستند اور باکمال شعرا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ
جلد چہارم۔ تقریباً ساٹھ جدید شعراء کے کلام کا دلکش انتخاب قیمت عہ

مناظر قدرت (چار حصے)

جلد اول۔ متعلق اوقات یعنی صبح، شام، دن، رات، برسات اور بہار کے دلکش مناظر قیمت عہ
جلد دوم۔ متعلق مقامات یعنی آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل اور عمارات کی صاف ستھری تصویریں قیمت عہ
جلد سوم۔ متعلق نباتات و حیوانات یعنی پھول، پھل، کیڑے، پتنگے اور چرند و پرند کا مطالعہ و مشاہدہ۔ قیمت عہ
جلد چہارم۔ متعلق عمرانیات یعنی ہندوستان کا تمدن، رسم و رواج، عید، تیوہار اور میلے ٹھیلوں کے دلچسپ حالات قیمت عہ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعاتِ جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعاتِ جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

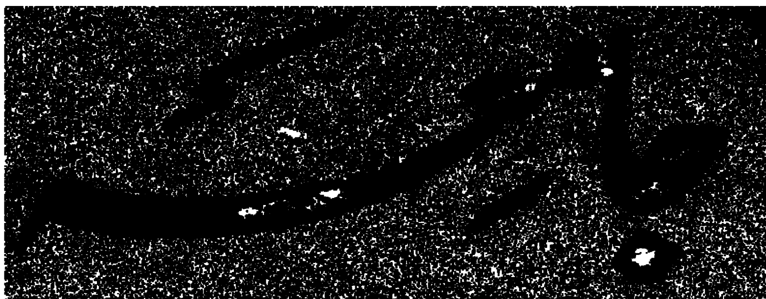
جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

اُمید ہے کہ اربابِ ذوق اور تاجرانِ کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون کریں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی ، لاہور ، لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی



مکتبہ جامعہ دہلی

شعلۂ طور

(طبعِ ثانی)

شاعرِ فطرت حضرت جگر مرادآبادی کے دیوان "شعلۂ طور" کے دوسرے ایڈیشن میں ترتیب بالکل نئی رکھی گئی ہے جس سے کتاب کی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے، اس کے علاوہ اس ایڈیشن میں بہت کچھ تازہ کلام بھی شامل کردیا گیا ہے۔

طبعِ ثانی کتابت و طباعت کی جاذبیت، جدتِ ترتیب، صحت و صفائی اور بعض دیگر خصوصیات کے لحاظ سے، بالکل نئی کتاب ہے۔

قیمت ۔ عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی ، نئی دہلی ، لاہور

جامعہ

زیرادارت :- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے ۔ پی ایچ ، ڈی

نمبر ۱	جنوری سنہ ۱۹۳۸ء	جلد ۲۹

فہرست مضامین

سنہ ۱۹۳۷ء ۱

(۱) ہندوستان (ر ـ ر)

(ا) جمہوریت کا تجربہ ۳

(ب) انتخابات ۳

(ج) حکومت یا نکتہ چینی ۵

(د) وزارتوں کے کام ۶

(ہ) دیہی مسئلہ ۷

(و) مزدور اور اشتراکی ۹

(ز) کانگریس اور مسلم لیگ ۱۰

(ح) فیڈریشن ۱۲

(ط) معاشی زندگی ۱۳

(ی) کساد بازاری کا ڈر ۱۳

(ک) دولت آفرینی ۱۴

(ل) قیمتیں ۱۴

(م) تجارت خارجہ ۱۵

(ن) ہندوستان اور برطانیہ کا تجارتی معاہدہ ۱۶

(۲) ممالک غیر (م ۰ م)

(ا) برطانیہ ۱۷

(ب) امریکہ ۱۹

		صفحہ
(ج) روس		۱۹
(د) سیاسی رسہ کشی کا دوسرا فریق		۲۰
(ہ) ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں عدم مداخلت		۲۲
(و) روم برلن کا محور		۲۵
(ز) جاپانی سیاست		۲۶
(۳) اسلامی دنیا۔	(م س)	
(ا) شمالی افریقہ		۳۱
(ب) طرابلس		۳۲
(ج) مصر		۳۳
(د) سوڈان اور حبش		۳۵
(ہ) یمن اور حجاز و نجد		۳۶
(و) شام		۳۶
(ز) عراق		۳۷
(ح) ترکی		۴۰
(ط) فلسطین		۴۱
(ی) اتحادِ عرب اتحادِ شرق		۴۱
۲ سیاسیاتِ عالم پر چند مفید کتابیں	(ذ، ح)	۴۴
۳ مزدور	مولوی محمود علی خاں صاحب بی اے۔	۵۰
۴ زمینداروں کا ماضی اور حال	برکت علی صاحب فراق بی اے۔ (جامعہ)	۵۱
۵ ہندوستانی بینکار	محمد احمد سبزواری صاحب بی اے۔ (عثمانیہ)	۶۱
۶ غزل	حضرت جگر مرادآبادی	۷۲
۷ رفتارِ عالم اسپین۔ برطانیہ اور اسپین۔ اٹلی۔ جرمنی جنوبی امریکہ۔ مصر۔ حجاز۔ مراکش مسولینی اور اسلامی دنیا۔ چین اور جاپان کی جنگ		۷۳
۸ تعلیمی دنیا	جناب محمد عبدالغفور صاحب ایم اے (علیگ)	۹۳
ضمیمہ۔ وردھا ایجوکیشن کمیٹی کی رپورٹ		۱۰۵
اشتہارات		۱۳۶

قیمت سالانہ صہ ر — فی پرچہ عہ ر

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

سنہ ۱۹۳۷ء

ہندوستان

جمہوریت کا تجربہ ایک سال اور گذر گیا۔ اس سے پہلے بھی بہتیرے سال گذرے اس کے بعد بھی نہ جانے کب تک زمانہ بیتتا رہے گا لیکن اس پچھلے سال کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ اس وجہ سے یاد رکھا جائے گا کہ ذمہ دار حکومت کا ایک عظیم الشان تجربہ چاہے کتنی ہی ادھوری شکل میں سہی بہرحال اس سال شروع ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بھی یہ واقعہ اس سال کو اہم بنا دے، اس لئے کہ باہم مل جل کر رہنے سہنے سے جو سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کے حل کرنے کے طریقوں میں آج دنیا جس اختلاف کا میدان کارزار بنی ہوئی ہے وہ اگر یوں طے نہ ہوا کہ گنتی کے چند آدمیوں کے پیچھے جو چاہے اپنی مستعدی اور قابلیت سے یا اپنی مکاری اور سفاکی سے اکیلے بن گئے ہوں باقی ساری انسانیت بھیڑوں کے ایک گلے کی طرح آنکھ بند کر کے چلے اور اگر اس میں ذرا تامل کرے تو سر دے، بلکہ یوں طے ہوا کہ لوگ باہمی مشورہ اور بات چیت سے، ایک دوسرے کو سمجھا کر اپنی سماجی زندگی کے معاملات کا تصفیہ کر لیا کریں۔ ضرور اپنے فیصلوں کے نافذ کرنے کے لئے سردار مقرر کر لیں اور سمجھ داروں کی سمجھ بوجھ سے فیصلہ کرنے میں ضرور مدد لیں۔ لیکن فیصلہ کا اصل اختیار اور اس کی اصل ذمہ داری خود قوم کے سر ہو یعنی اگر شخصی اطاعتِ مطلق کی جگہ جمہوری تعاون سے انسانیت نے اپنی سماجی زندگی کو سنوارنے کا فیصلہ کیا تو شاید سنہ ۱۹۳۷ء دنیا کی تاریخ میں اس لئے یادگار ہو جائے گا کہ ہندوستان جیسے براعظم میں بڑی حد تک اس طریقہ کا تجربہ اس سال شروع ہوا تھا۔

انتخابات کئی سال کے بحث مباحثہ سے، صبر و تشدد، سادگی و پرکاری، بے خودی اور ہشیاری کے معرکوں کے بعد ہندوستان کی حکومت کا جو نیا دستور سنہ ۱۹۳۵ء میں بنا اس کے

گورنر اسے آئینِ وقت کے سراسر خلاف بتاتے تھے۔ آخر کار کانگریس کو لفظوں میں تو وہ بات نہ حاصل ہوئی جو وہ چاہتی تھی مگر باہمی گفتگو میں یہ بات صاف ہو گئی کہ انگریز واقعی نئے دستور کو پوری طرح آزمانے کو تیار ہیں اور بیچ میں کھنڈت نہیں ڈالنا چاہتے۔ اُدھر انگریزوں پر یہ صاف ہو گیا کہ کانگریس بھی وزارت سے اتنی نہیں بھاگتی جتنی اس کے انتہا پسند ظاہر کرتے ہیں۔ اس آئینی اور سیاسی گتھی کو سلجھانے میں مہاتما گاندھی، لارڈ لن لتھگو اور لارڈ لوتھین کا بڑا حصہ رہا، لیکن اصل چیز تو سیاست عالم کا موجودہ رنگ ہے۔ جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان میں کسی قسم کی بے چینی اور سیاسی حرکت نہیں چاہتے اور جیسے تیسے یہاں کی سیاسی جماعتوں کو خوش رکھنے کا تصفیہ کر چکے ہیں۔ غرض اس وقت سات صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں ہیں جو نئے دستور کو "ختم" کرنے کے لئے گئی ہیں مگر جن سے پچھلے ۲ مہینے میں ایک دفعہ بھی کسی گورنر سے کوئی ان بن نہیں ہوئی۔

وزارتوں کے کام

نئے آئین ہند ۱۹۳۵ء کے نقائص جو بھی ہوں (اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں قدم قدم پر تنگ دلی اور شبہ کا اثر نمایاں نہیں ہے) پھر بھی نئی جمہوری وزارتیں صاف دیکھتی ہیں کہ اس کی حدود میں رہ کر بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کر بھی رہی ہیں۔ جمہور میں یہ احساس عام ہے کہ اب حکومت ہماری ہمدرد ہے، نہیں کم و بیش ہماری ہے۔ سیاسی زندگی میں پژمردگی کی جگہ امید اور امنگ ہے، محض تخریبی تنقید کی جگہ تعمیری کام پر ذہن اور ارادہ کی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔ ابھی اتنا زمانہ نہیں گذرا کہ نئی وزارتوں کی کارگذاریوں پر حکم لگایا جا سکے لیکن کانگریس ہی کے صوبوں میں، کیا سارے ملک میں نئی وزارتوں نے اپنے کام سے لوگوں کو مایوس نہیں کیا ہے۔ سیاسی قیدی ہر جگہ چھوڑے گئے، اخبارات کی ضبط شدہ ضمانتیں واپس ہوئیں، آزادی خواہ سیاسی جماعتوں پر جو پابندیاں تھیں وہ ہٹا دی گئیں، ترک موالات کے سلسلے میں جو جائدادیں ضبط ہوئی تھیں اُن کی واپسی کی کارروائی بھی شروع ہو چکی ہے۔ کانگریس نے شراب نوشی کے روکنے کی کوشش ہمیشہ کی ہے اور اپنی سیاسی تحریک کے سلسلہ میں بعض موقعوں پر جو اثر اس نے اس سلسلہ میں پیدا کیا وہ ہندوستان کی اصلاحی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اب اختیار پانے کے بعد

اس چیز کو کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ اگرچہ شراب کے استعمال کو بالکل بند کر دیا جائے تو سب صوبوں کو مجموعی طور پر کوئی ۱۳ کروڑ روپیہ کا نقصان ہوگا اور اُن کی کل آمدنی اس وقت کوئی ۸۰ کروڑ ہے۔ یہ نقصان آمدنی کو دیکھتے ہوئے بہت ہے۔ مگر انسان کی طرح حکومت بھی خالی روپئے کی کمی بیشی کا خیال کر کے ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ کانگرسی حکومتوں نے ٹھان لی ہے کہ یہ اصلاح کر کے چھوڑیں گے۔ اگرچہ مالی اور انتظامی دشواریوں کے باعث ذرا پھونک پھونک کر قدم اُٹھائیں گے۔ بنگال کی حکومت نے بھی اس پالیسی کی تائید کی ہے اور تعجب ہوتا اگر یہ مسلمان اکثریت والا صوبہ ایسا نہ کرتا۔ یقین ہے کہ دوسرے غیر کانگرسی صوبے بھی اس اخلاقی مطالبہ کے سامنے اپنے کیسۂ زر کو ہلکا کرنے تک پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔ مدراس کے صوبے نے یکم اکتوبر سے سالم کے ضلع میں یہ تجربہ شروع بھی کر دیا ہے اور اب تک کے نتائج آئندہ کوششوں کی کامیابی کی بڑی امید پیدا کر رہے ہیں۔

دیہی مسئلہ

سب سے اہم مسئلہ جس سے حکومتیں دوچار ہیں دیہی آبادی کی حالت کا سدھار ہے۔ یہی در اصل ہندوستان کی اکثریت کا مسئلہ ہے۔ یہ ملک جس کی زرخیزی کے افسانوں سے دنیا کا ادب بھرا پڑا ہے اپنے باشندوں کی اکثریت کو چٹنی روٹی بھی نہیں دیتا۔ ان گنت آدمی پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور شاید یہ اس سفر حیات میں ایک دفعہ بھی سیر ہو کر نہیں کھاتے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا کھیل نہیں، ایسے مسئلے حل ہو جائیں تو قوموں اور ملکوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔ اس وقت جو کیا جا رہا ہے وہ بھی غنیمت ہے اس لئے کہ پہلے اتنا بھی نہیں کیا جاتا تھا مگر غالباً جلد معلوم ہوگا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے بہت ناکافی ہے۔ کانگرسی صوبوں میں ہر جگہ حسب وعدہ کسانوں کی دشواریوں کو دفع یا ملتوی کرنے کی تدبیریں کی گئی ہیں اور نئے قانون زیر غور ہیں، اُن کی غرض یہ ہے کہ لگان کا بوجھ کم کیا جائے۔ قرض کے دباؤ سے جہاں تک ہو سکے کسان کو نجات دی جائے، قرض کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے سہولتیں پیدا کی جائیں، کام چلانے کے لئے اُدھار دینے کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جائے۔ یہ سب تدبیریں اچھی ہیں اور ان کی امید ہی سے کسان خوش ہے اور سمجھتا ہے کہ اب میری پوچھ ہے، میرے لئے کچھ ہوگا۔ ضرور ہوگا اور اس سے حالت کو سدھارنے کا ولولہ اور تیز ہوگا، کیا عجب ہے کہ

جمہور کے اس ولولہ کا ساتھ قوم کا دماغ بھی دے اور واقعی سُدھار کی کوئی صورت نکل ہی آئے۔ اس لئے کہ محض لگان کم کرنے اور قرض معاف کرانے سے زیادہ دن کام نہیں چلے گا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا سیلاب ان جزوی اصلاحوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دے گا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک مردم شماری سے دوسری مردم شماری تک دس برس کی مدت میں ہندوستان کی آبادی میں کوئی ۳ کروڑ کا اضافہ ہوا تھا اور یہ اضافہ ہی اضافہ فرانس کی پوری آبادی کے برابر ہے! لگان کم کرکے اُن کے پیٹ پالنے کی تدبیر کیسے نکل آئے گی۔ اس کے لئے ہندوستان کی ساری معیشت کو منظم کرنا ہوگا۔ صنعت اور زراعت میں صحیح تعلق قائم کرنا ہوگا، آبادی کو بے تُکے بڑھنے سے روکنے کی تدبیر کرنی ہوگی، زراعت کی دولت آفریں قوت کو بڑھانا ہوگا۔ اس میں دنیا کے دوسرے ملکوں کے تجربے سے سبق لینا ہوگا۔ جو ٹھوکریں اوروں نے کھائی ہیں اُن سے بچنا ہوگا، علوم صحیحہ اور علوم اجتماعی کی تحقیق سے مشعل راہ کا کام لینا ہوگا۔ معاشی دولت آفرینی اور جماعتی تنظیم کے لئے بہتر امکانات کو آزمانا ہوگا۔ اس عظیم الشان کام کے کرنے میں شاید ابھی کچھ دیر ہو مگر اس کی ذہنی تیاری ازبس ضروری ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ اس ذہنی تیاری کو بس جوش دلانے اور نفرت پھیلانے تک محدود کیا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے بہترین دماغ ان مسائل پر غور و فکر میں اپنے دن رات ایک کر دیں تاکہ جب تدبیر کرنے کا موقع اور اختیار ہاتھ میں آئے تو ہم اندھوں کی طرح اٹکل سے آگے قدم نہ بڑھائیں۔ بلکہ کچھ تو جانتے ہوں کہ کرنا کیا ہے۔

لیکن یہ تو دور کی بات تھی، اس وقت تو صوبوں کی حکومتیں کسان کے فلاح کے لئے جو کچھ کر رہی ہیں وہی لوگوں کو "انقلاب" معلوم ہوتا ہے۔ زمیندار خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں بہت ناخوش ہیں اور رائج الوقت اصطلاح سے استفادہ کرکے "ستیاگرہ" کی دھمکی دے رہے ہیں۔ انھیں اگر اپنی تاریخ معلوم ہو اور جسم اجتماعی میں اپنے تعطل کا احساس ہو تو وہ بجائے بیکار دھمکیاں دینے کے زرعی پیداوار بڑھانے، دیہات کی حالت سدھارنے، کسانوں کی صحیح نمائندگی کرنے اور ان کے بھلے میں اپنا بھلا دیکھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ایک معطل عضو کو جسم اجتماعی کب تک گھسیٹے پھرے گا۔ اچھا موسم پاکر کسی معتبر سرجن کے مشورہ سے اسے کاٹ ہی پھینکے گا۔

دیہات سدھار کا کام جو کانگریس کے جواب میں پچھلی حکومتوں نے ہی برائے نام شروع کیا تھا اسے اب خلوص سے انجام دینے کی تدبیریں کی جارہی ہیں، دیہی صفائی، پینے کے پانی کا انتظام، طبی امداد دیہی شفاخانے ان سب پر پہلے سے زیادہ توجہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب دیہات کی شکل اور اس کی آسائشوں میں معتدبہ فرق ہوجائے گا۔

مزدور اور اشتراکی

صنعتی مزدوروں کا مسئلہ ہندوستان میں ابھی اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ کسانوں کا۔ مگر کانگریس حکومتیں ہر جگہ اپنے وعدہ کے مطابق مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کی تدابیر بھی نکال رہی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں کانگریس حکومتوں کو ایک سخت دشواری کا سامنا بھی کرنا پڑرہا ہے۔ یہ تو بالکل معلوم ہے کہ کانگریس کی اشتراکی جماعت وزارتیں قبول کرنے کی مخالف تھی۔ اب کہ کانگریس نے وزارتیں قبول کرلی ہیں اس جماعت کے غیر ذمہ دار لوگ مزدوروں کو اکسا کر وزارتوں کے لئے دشواریاں پیدا کر رہے ہیں۔ جتایا یہ جاتا ہے کہ سیاں کوتوال ہوئے اب ڈر کاہے کا ہے۔ پھر جب حکومت امن قائم رکھنے کے لئے کچھ کرتی ہے تو کہتے ہیں دیکھو یہ کانگریس والے بھی سرمایہ داروں کے ساتھی ہیں، اٹھو، "انقلاب زندہ باد" ذمہ دار اشتراکی اس ہنگامہ کے مخالف ہیں اسے روکنا بھی چاہتے ہیں مگر اشتراکی جماعت کا ایک خاصا بڑا حصہ ان کے قابو سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ ادھر کانگریس والے بھی اہنسا کی وجہ سے خون اور انقلاب کے نام تک سے ذرا ضرورت سے زیادہ پریشان ہوجاتے ہیں۔ پہلے سے جو لوگ تو اس عدم تشدد کے معاملے میں پوری طرح ساتھ نہ تھے ہی اہنسا والوں کو ان کی ہر بات کھٹکتی ہے اس شبہ کی وجہ سے بے اعتباری ہے اور جب اس بے اعتباری کا اظہار بھی ہوجاتا ہے تو جی دکھتے ہیں۔ بمبئی کے وزیر کے۔ ایم۔ منشی پر بہار اشتراکی والے اسی وجہ سے خفا ہیں۔ پھر یہ بھی عجیب نہیں کہ تشدد کے زبانی اعلانات پر جو کچھ کانگریسی حکومتوں کی طرف سے ہو رہا ہے اس میں گورنروں کا تھوڑا بہت دخل ہو اور وزیر بھی چونکہ تشدد کے حامی تو ہیں نہیں اس راز کو فاش نہ کرنا چاہتے ہوں۔ غرض کئی صوبوں میں مزدوروں کی بے چینی کے آثار سامنے آتے رہے ہیں۔ کانگریس نے امن قائم رکھنے اور تشدد کی ترغیب سے روکنے کے لئے جو انھیں قانونوں سے کام لیا جو چند مہینے پہلے تک خود ان کے خلاف

برتے جاتے تھے تو یہ ہر شخص کو کچھ نرالی سی بات لگتی ہے اور انتہا پسند تو اس کو خوب اچھال رہے ہیں صنعتی مزدوروں کے علاوہ بہار میں کسانوں کی تحریک نے خاصی قوت پکڑ لی ہے اور اس کے جلد کانگریس سے ٹکرا جانے اور انقلابی تحریک بن جانے کے امکانات صاف نظر آتے ہیں۔ کانگریس کے اندر پرانے تجربہ کار کانگریسیوں اور نئے اشتراکی تجربہ کرنے والوں کا اختلاف بڑھ رہا ہے۔ گاندھی جی کی بزرگی اور پنڈت جواہرلال کی سعادت مندی ان مختلف الخیال گروہوں کو ملائے ہوئے ہیں۔ مگر کب تک؟

کانگریس اور مسلم لیگ

اس اختلاف سے بھی کچھ زیادہ شدید اور فی الحال ملکی سیاست کے لئے انتشار کا باعث کانگریس اور مسلم لیگ کا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف یوں تو کسی نہ کسی شکل میں مدت سے چل رہا ہے مگر جدید دستور کے نفاذ کے بعد سے یہ اس نے سیاسی فضا کو یکسر مکدر کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعت لیگ ہے۔ یہ انتخابات سے پہلے معطل میں تھی۔ مگر جب انتخابات کا وقت آیا تو اس کے روح رواں مسٹر جناح نے مسلمانوں کے ترقی دوست عناصر کو اس کے پرچم تلے جمع کرنا چاہا۔ بعض جگہ مثلاً صوبجات متحدہ میں بہت سے وہ لوگ جو ہندوستان کی آزادی چاہتے تھے اور آزادی کی تحریک میں پہلے پورا پورا حصہ بھی لے چکے تھے اس میں شامل ہوگئے۔ وہ عناصر جن پر خود غرضی یا وطن دشمنی کا شبہ ہوتا تھا اس سے جدا ہوگئے۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر صوبے میں یہی ہوا۔ بہت جگہ ان لوگوں نے جو آزادی کی تحریک کے سخت مخالف رہ چکے تھے لیگ کے نظام پر قبضہ پالیا۔ انتخابات ہوئے۔ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلم لیگ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی اکثریت کسی دوسری جماعت میں شریک تھی، کہیں کانگریس میں کہیں پرجا پارٹی میں، کہیں یونینسٹ جماعت میں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں لیگ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ انتخابات میں کانگریس کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی تو ان کی طرف سے اعلان ہوا کہ ہم خالص کانگریسی وزارت بنائیں گے۔ کسی اور جماعت کو شامل نہ کریں گے حالانکہ کم از کم صوبہ متحدہ میں انتخابات کے زمانے میں ہر شخص سمجھتا تھا کہ کانگریس اور لیگ مل کر وزارت بنائیں گے۔ انتخابات میں کانگریس کے ممتاز لوگوں نے لیگ کے امیدواروں کے لئے اور لیگ کے ممتاز کام کرنے والوں نے کانگریس

،امیدواروں کے لئے کوشش کی تھی۔ جب کانگریس نے اپنی غیر متوقع کامیابی کے بعد لیگ کو ساتھ لینے سے انکار کیا تو ظاہر ہے اچنبھا ہوا۔ گمان ہونے لگا کہ کامیابی کے نشے میں جب لیگ کی ضرورت نہیں رہی تو یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے، آگے کے متعلق شبہات قوی ہونے لگے۔ اسی زمانے میں پنڈت جواہرلال اور مسٹر جناح میں ایک تحریری مباحثہ چھڑ گیا۔ پنڈت جی نے کہا کہ ملک میں بس دو جماعتیں ہیں سامراج کے حامی اور اس کے مخالف، انگریزی حکومت اور کانگریس۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کے جداگانہ وجود پر اصرار کیا۔ کئی مرتبہ اُن کی طرف سے بھی بیانات شائع ہوئے۔ اِن کی طرف سے بھی جن سے عام ہیجان اور بدگمانی میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔ کانگریس نے جواہرلال جی کی ہدایت کے مطابق براہ راست مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دینی شروع کی، مسٹر جناح نے مسلم لیگ کو منظم کرنا شروع کیا۔ دونوں کو کامیابی ہوئی۔ کچھ مسلمان خاصی تعداد میں کانگریس میں بھی شریک ہوئے، اور لیگ کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا وہ بھی لیگ کے کامیاب ترین جلسوں میں سے تھا۔ اس اجلاس میں مسلمان اقلیت والے صوبوں کے علاوہ بنگال اور پنجاب کے وزیر اعظم بھی موجود تھے، انھوں نے لیگ سے اپنا تعلق پھر استوار کیا تو لیگ کی قوت میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ ادھر صوبجات متحدہ میں اتفاق سے پانچ حلقوں میں دوبارہ انتخاب کی نوعیت بھی آئی۔ اس میں ایک جگہ یعنی بجنور میں تو حافظ محمد ابراہیم صاحب کو لیگ کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی۔ باقی چار جگہ لیگ جیتی۔ ان انتخابات میں دونوں طرف سے اس قدر زور لگا کہ تعلقات اور بھی کشیدہ ہوگئے۔ اور کانگریس اور لیگ کے تعلقات سے زیادہ خود مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے جو نہایت شدت سے ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے ہیں اور جن میں محترم سے محترم ہستی بھی مخالفوں کی گالیوں اور دشنام سے محفوظ نہیں۔ ملت کو متحد کرنے کے لئے پگڑیاں اچھل رہی ہیں!

لیکن تمام ہنگامہ میں، کہ قومی بدنصیبی کی داستان کا ایک ورق ہے، ایک بات کام کی یہ ہوئی کہ لیگ نے اپنے لکھنؤ کے اجلاس میں آزادی کامل کو اپنا مقصود قرار دیا۔ ملک کی فلاح کے لئے ایک معاشی پروگرام بھی مرتب کیا جسے کہتے ہیں کہ مشہور اشتراکی ایم۔ این رائے نے کانگریس کے پروگرام

سے بہتر بنایا ہے۔ کیا یہ دونوں جماعتیں لیگ اور کانگریس جو یوں متحد المقصد ہیں برابر لڑتی ہی رہیں گی اور ہمارا ملک تدبر سے اتنا خالی ثابت ہوگا کہ اس قضیہ کو کہ کچھ شخصیتوں کا، کچھ جذبات کا۔ کچھ اکثریت میں اس احساس کے پیدا کرنے کا معاملہ ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کئے بغیر آگے چلنا دشوار ہے۔ کچھ اقلیتوں میں اس احساس کا کہ معاملاتِ انسانی میں جمہوری نظام کے ماتحت بھی صرف سر ہی نہیں گنے جاتے۔ سر کے اندر مغز ہو تو تھوڑے بھی بہتوں پر بھاری پڑتے ہیں، نہ چکا سکے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس تفرقہ کے وجود سے انکار کر دینا کافی ہے یہ مٹ جائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ چیز نفسِ جماعت میں راسخ ہوگئی ہے، یہ ایک ذہنی گتھی ہے، جب تک حل نہ ہوگی طرح طرح سے اپنا اثر ظاہر کرے گی۔ یہی ہماری سیاست اور تدبر کا پہلا امتحان ہے۔ سنہ ۳۷ء میں تو ہم حل سے کچھ دور ہی ہوئے، دیکھئے سنہ ۳۸ء میں کیا ہوتا ہے۔

فیڈریشن ہم نے سنہ ۳۸ء ارادۃً لکھا ہے۔ اس لئے کہ علاوہ اس عام مفاد قومی کے جو ان جماعتوں کے سمجھوتہ سے وابستہ ہے اگلے سال فیڈریشن کے قیام کا جو مسئلہ غالباً سامنے آئے گا اس میں اس کے تصفیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس وقت تو کانگریس بھی فیڈریشن کی مخالف ہے اور لیگ بھی۔ تفصیلات سے قطع نظر ہمارا خیال ہے کہ فیڈریشن کی یہ مخالفت عقلی ہے جذباتی نہیں اس لئے غالباً کوئی صورت اس کے حل کی نکل آئے گی۔ ممکن ہے ریاستوں کے نمائندے نامزد نہ ہوں منتخب ہو کر آئیں اور اس سے کانگریس کو امید ہو جائے کہ وہ ہمیشہ مرکزی اسمبلی میں اقلیت میں نہ رہے گی۔ اور وہ فیڈریشن کو اس طرح قبول کرے جس طرح صوبوں میں نئے دستور کو قبول کیا ہے۔ یا اگر ریاستوں کو یہ تبدیلی جس کے سلسلہ جنبانی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شروع کر دی گئی ہے، منظور نہ ہو اور وہ فیڈریشن میں شامل ہونے سے انکار کریں تو صرف برطانوی صوبوں کا وفاق بن جائے تو اسے تو کانگریس شاید بخوشی قبول کرلے گی۔ جب کانگریس قبول کرلے گی تو ظاہر ہے کہ لیگ بھی کر ہی لے گی۔ اور اسی لئے ترقی دوست اور آزادی خواہ کانگریس اور لیگ کی مفاہمت اور بھی ضروری ہے۔

معاشی زندگی

سیاست کی یہ ساری گرماگرمی جس کا ذکر اوپر ہوا سرد پڑ جائے اگر معیشت اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ صوبوں میں سارے تعمیری کاموں کے لئے روپیہ درکار ہے۔ شراب نوشی کے انسداد سے حکومتوں کی آمدنی کچھ گھٹنے لگی ہے۔ لگان کم کرنے سے بھی۔ نئے ٹیکس لگائے جائیں گے لیکن نئی نئی جمہوریت جس کے قدم ابھی اچھی طرح جمے نہ ہوں ٹیکس لگانے سے ہمیشہ ڈرتی ہے۔ اگر تجارت کو فروغ ہوا اور کاروبار اچھا رہا تو شاید کام چلے۔ اس لئے ذرا اس سال میں کاروبار کی حالت پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔

کساد بازاری کا ڈر

اس سال کے آخری حصے میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں یہ اندیشہ ظاہر کیا جانے لگا ہے کہ ۲۹ سنہ کی کساد بازاری کے بعد اب جو بازاروں کی حالت سنبھلی ہے وہ زیادہ قائم بھی رہے گی یا نہیں، کہیں پھر بازار مندے نہ پڑیں۔ ہندی معیشت دنیا کی معیشت کے ساتھ کچھ ایسی گتھی ہوئی ہے کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس کا اثر ہندوستان پر بہت سخت پڑ سکتا ہے۔ بلکہ عام کساد بازاری میں اسے تو اوروں سے بھی کچھ زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ اس کی زرعی پیداوار کی مانگ بند ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی کے بہت بڑے حصے یعنی کسانوں کی جان پر بن جاتی ہے۔ اگر اس وقت جبکہ جمہوریت کا نیا تجربہ شروع ہوا ہے اور قومی تعمیری کاموں کے لئے حکومتوں کو ہر جگہ وسائل کی شدید ضرورت ہے۔ یہ صورت پیدا ہوئی تو مصیبت ہو جائے گی۔ پیشین گوئی کرنا تو مشکل بھی ہے اور غلط بھی، مگر کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ اندیشہ شاید صحیح ثابت نہ ہوگا دنیا کی موجودہ معاشی حالت سے یہ امکان ضرور معلوم ہوتا ہے کہ چڑھتے ہوئے بازار ذرا رک جائیں، مانگ ذرا دھیمی پڑے مگر اس کا خطرہ زیادہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ عام اور شدید کساد بازاری کی شکل اختیار کرے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہندوستانی مرکزی اور صوبجاتی حکومتیں ان دشواریوں کو سامنے رکھیں جو کساد بازاری سے ان کے لئے پیدا ہو سکتی ہیں تاکہ اگر یہ آئے تو وہ بے خبر نہ ہوں۔ یہ احتیاط اس لئے اور ضروری ہے کہ ہندوستان میں اجناس زرعی و صنعتی کی پیداوار پچھلے دنوں خاصی بڑھی ہے اور قیمتوں میں کچھ اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ڈر ہے کہ

طلب اور رسد کا توازن بگڑنہ جائے۔

دولت آفرینی ہندوستان کی دولت آفرینی کے اعداد پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی عام کساد بازاری کے بعد سے ملک نے معتد بہ ترقی کی ہے۔ شکر کی صنعت تو تقریباً ساری کی ساری اس زمانہ میں وجود میں آئی ہے۔ اب تک یہ لیس درآمدہ شکر کی جگہ پردیسی شکر پیدا کرتی، تھی اب موجودہ ملکی کھپت سے خاصی مقدار زیادہ تیار کرسکے گی۔ پچھلے اپریل سنہ ۳۶ء کے مقابلے میں ۶۱ فیصدی اور مئی میں مئی سنہ ۳۶ء سے کوئی ۲۰۰ فیصدی زیادہ شکر ملک میں بنی! سنہ ۳۶-۲۹ء کے مقابلے میں سوتی کپڑے کے کارخانوں نے سنہ ۳۷-۳۶ء میں کوئی ۵۰ فیصدی زیادہ کپڑا پیدا کیا اور سنہ ۳۸-۳۷ء کے شروع کے چار مہینوں میں پچھلے سال کے مقابلے میں تقریباً اور ۷ فیصدی زیادہ سیمنٹ اور لوہے کی صنعت میں بھی پیداوار بہت بڑھی ہے۔ سیمنٹ کی پیداوار بھی پچھلے سال سے زیادہ رہی ہے۔ شکر کی پیداوار تو سنہ ۳۷-۳۶ء میں پہلے سے دوگنی ہوگئی۔

قیمتیں دولت آفرینی کے اس اضافہ کے ساتھ مانگ بھی ضرور بڑھی ہے۔ کپڑا بنا زیادہ تو باہر سے درآمد بھی کم ہوئی ہے اور اب چین و جاپان کی جنگ کی وجہ سے زیادتی پیداوار سے قیمت کے کم ہوجانے کا اندیشہ اور کم ہوگیا ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کو باہر کی مانگ نے خوب سہارا دیا ہے۔ سیمنٹ کی مانگ بھی خود ملک میں خاصی بڑھ رہی ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قیمتوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے جتنا کہ اکثر دوسرے ممالک میں۔ ذیل کے نقشے میں چھ ملکوں کی مجموعی قیمتوں کے انڈکس نمبر درج ہیں۔ اگر سنہ ۲۹ء کی قیمت کو ۱۰۰ فرض کیا جائے تو عام قیمت کی سطح یہ رہی ہے

	ہندوستان	برطانیہ	ریاستہائے متحدہ امریکہ	جاپان	فرانس	جرمنی
سنہ ۳۶ء	۸۲ر۳	۸۴	۹۰ر۷	۸۲ر۴	۸۸ر۴	۹۰ر۴
سنہ ۳۷ء	۶۴ر۵	۶۷ر۷	۶۸	۷۳ر۳	۶۸ر۲	۷۰ر۳

سنہ ۳۶ء	۶۶ء۷	۸۵/۸	۸۸ء۴	۹۷ء۸	۸۲ء۸	۸۶ء۵
سنہ ۳۷ء	۷۳/۸	۸۹	۹۱ء۲	۱۰۸ء۴	۱۰۰ء۳	۷۷ء۳
	(ستمبر)		(جون)	(جون)	(ستمبر)	(جون)

یعنی ہندوستانی قیمتیں دوسرے ملکوں سے بھی کم بڑھی ہیں۔ اس لئے اگر مانگ میں برابر اضافہ نہ ہوتا گیا تو ڈر ہے کہ کہیں پیداوار مانگ سے زیادہ ہو کر بازار کو یکایک پست نہ کر دے۔

تجارت خارجہ اسی سلسلہ میں ہندوستان کی تجارت خارجہ کے کچھ اعداد بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء کی ہندوستان کی تجارت کا جو ریویو اس سال حکومت کی طرف سے شائع ہوا ہے وہ پچھلی اطلاعات سے کئی حیثیتوں میں بہتر ہے۔ محض تجارت خارجہ کے اعداد یکجا کر دینے کی جگہ اس مرتبہ یہ پوری ہندی معیشت پر ایک تبصرہ سا ہے۔

اس سال کی تجارت میں ہندوستان کا برطانیہ پر ۱۸ کروڑ روپیہ آتا ہے سنہ ۳۴ء اور سنہ ۳۵ء میں برطانیہ اور ہندوستان کی درآمد و برآمد برابر برابر رہی تھی، اور سنہ ۳۴ء میں تو ۵ کروڑ ہمارے ذمہ نکلتا تھا۔ سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں یعنی جنگ سے پہلے تو برطانیہ اور ہند کی تجارت میں ہمارے ذمہ ۵۵ کروڑ نکلا تھا۔ اب جو اس سال ہمارے ۱۸ کروڑ ان پر آتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ برطانیہ نے ہندی مال کی خریداری کی طرف خاص توجہ کی ہے بلکہ ہماری تجارت خارجہ کا رخ کچھ بدل گیا ہے۔ اسی سنہ ۱۴ء میں برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں سے جو تجارت ہماری تھی اس میں ہمیں کوئی ۱۰۰ کروڑ یافتنی تھا اور سنہ ۳۷-۳۶ء میں کل ۶۴ کروڑ ہے۔ خود سلطنت برطانیہ کے دوسرے ملکوں کو ہم نے سنہ ۱۴ء میں ۲۵ کروڑ کا زیادہ مال دیا تھا اور اس سال کل ۱۳ کروڑ کا۔ جاپان کے ذمہ سنہ ۱۴ء میں ہمارے ۱۸ کروڑ نکلتے تھے اور اس سال ۹ کروڑ ہیں۔ برطانیہ نے بالواسطہ خریداری کی جگہ براہ راست خریداری شروع کر دی ہے اور اس طرح ہماری تجارت کا تعلق اس سے اور زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں سے اس تعلق کی کمی زیادتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کل تجارت کا کتنا حصہ کس ملک سے ہے۔ اس سال ہماری کل تجارت کا ۳۸ فیصدی کے قریب برطانیہ سے ہے۔ ۱۷ فیصدی جاپان سے۔ صرف برآمد کی تجارت کو لیجیے تو صرف مال

ہم باہر بھیجتے ہیں اس کا تقریباً ۳۲ فیصدی برطانیہ کو جاتا ہے اور ۱۵ فیصدی جاپان کو۔ برطانیہ اور جاپان
سے تجارتی معاہدوں کے باعث دوسرے ممالک سے ہماری تجارت گھٹتی جاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رفتہ
رفتہ ہماری تجارت خارجہ بس دو ملکوں برطانیہ اور جاپان پر منحصر ہو جائے گی۔

ہندوستان اور برطانیہ کا تجارتی معاہدہ

ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان تجارتی معاہدہ کی بات چیت اس سال کے واقعات میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سر ظفر اللہ خان جو ہندوستانی حکومت کے نمائندے تھے اور ان کے غیر سرکاری مشیر برطانوی محکمہ تجارت سے کوئی معاہدہ نہ کرسکے۔ سنا ہے کہ محکمہ تجارت برطانیہ کے شرائط ایسے تھے کہ ہندوستانی نمائندے انھیں کسی حالت میں بھی نہیں مان سکتے تھے اور ہمیں ان کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے کوئی ایسا معاہدہ کرنے سے انکار کیا جس میں اُن کے ملک کے مفاد کو نقصان پہنچتا۔ یہ جراٴت اور دیانت آیندہ سیاسی کاموں کے لئے فال نیک ہے۔ البتہ اس وقت معاملہ کے یکسو نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کا نقصان ہو رہا ہے۔ اوٹاوا کا معاہدہ گھٹتے جاتا ہے۔ پھر حکومت نے دوسرے ملکوں سے تجارتی گفتگو کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کر رکھا ہے جب تک برطانیہ سے معاملہ نہ ہو جائے۔ لیکن ہمارے انتظار میں دنیا ٹھہری تو نہیں رہے گی۔ اس نفسی نفسی کے زمانے میں خصوصاً آزاد تجارت کے خاتمہ کی وجہ سے ہر ملک اس فکر میں ہے کہ اور جتنوں سے ہو سکے الگ اپنا معاہدہ کرے۔ ہر ملک اپنے مفاد کا خیال کرکے ایسے معاہدے کر رہا ہے اور ہم منہ تکتے ہیں۔ کہیں اس انتظار میں دنیا ہمارے لئے تنگ نہ ہو جائے۔ کیا ہندوستان سے معاہدے کے انتظار نے برطانیہ نے بھی اپنے تجارتی سفیروں کو چھٹی دے دی ہے؟!

اس تبصرہ میں مرکزی اسمبلی کا ذکر نہیں آیا۔ صوبوں میں نئے دستور کے نافذ ہونے سے اس کا تماشہ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ پھر بھی جگہ ہوتی تو بیمہ کے قانون اور ریلوے کے متعلق مباحث کا ذکر کیا جاتا۔ جگہ کی کمی کے باعث ووڈ ایبٹ رپورٹ اور وردھا تعلیمی کانفرنس کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا گیا جو ممکن ہے کہ اس سال کے اہم واقعات ثابت ہوں۔ ان پر رسالہ جامعہ میں غالباً علیحدہ بحث ہو گی۔

ممالکِ غیر

دنیا کی سیاست کا نقشہ اس بستی کا سا ہے جہاں ڈاکے اور آتش زدگی کی وارداتیں ہوا کرتی ہوں
ہر آدمی دوسرے کا پیٹ کا سا ہو، کسی کے پاس حلال کی کمائی یا دھوکے اور زبردستی سے حاصل کیا
ہوا اتنا مال ہو کہ وہ ہر وقت اسے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچتا رہے، کسی کی حالت ایسی ہو کہ وہ اپنی ترقی
کے فراق میں دوسروں کو پریشان کرتا رہے اور بہت سے بیچارے ایسے مجبور ہوں کہ سارے پڑوسی اُن کی
محنت اور استعداد سے فائدہ اُٹھانا اپنا حق سمجھیں۔ سنہ ۳۶ء کی طرح اس سال بھی دنیا میں دولت اور اثر
کی نئی تقسیم، یعنی عالم گیر جنگ کی بلا تو ٹل گئی، لیکن ہسپانیہ کی خانہ جنگی، جو جولائی سنہ ۳۶ء میں شروع ہوئی تھی
اس سال بھر جاری رہی، اور ۸ جولائی سے چین اور جاپان کی جنگ شروع ہوئی یہ دونوں فلیتے ممکن ہے
جل کر رہ جائیں، ممکن ہے شعلے کو کسی بارود خانے تک پہنچا دیں اور ایسا دھماکا ہو کہ ساری دنیا جل جائے

آج کل کی جنگ میں شکست ہی کا نہیں بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا خطرہ ہے، اور یہ خطرہ
قوموں کے غرور اور غصے پر عاقبت اندیشی کا ٹھنڈا پانی چھڑکتا رہتا ہے۔ پھر بھی عالم گیر جنگ کی آگ سے کھیلنے
والے موجود ہیں، جنھوں نے اس کا اندازہ کرکے کہ دوسرے اُن کے خاص مقصد کے اس قدر خلاف ہوں
گے یا نہیں کہ عالم گیر جنگ کی بے پناہ مصیبتیں گوارا کریں اپنا مطلب زبردستی پورا کیا ہے۔ جاپان نے مانچوکو پر
اٹلی نے حبش پر اسی طرح قبضہ کیا، ہسپانیہ کی خانہ جنگی سے برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، سب اپنا اپنا
مطلب نکالنا چاہتے ہیں، اور سنہ ۳۷ء کی خاص یادگار، جاپان کی یہ کوشش ہے کہ وہ چین پر مسلط ہو جائے۔
جاپان اور اٹلی نے غریب اور لاوارث کا جھونپڑا گرا کر اپنا احاطہ بڑھایا ہے، جرمنی چار برس سے کہانی
کے دیو کی طرح "مانس گن" کہہ رہا ہے، اور اس کے پڑوسی سب سہمے جا رہے ہیں۔ بین الاقوامی اتحاد مانچوکو
اور حبش، ہسپانیہ اور چین کے معاملے میں نرا ڈھونگ ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ
ذوالقرنین کی دیوار ہے جو دنیا کو یاجوج ماجوج سے بچائے ہوئے ہے۔

برطانیہ | ان قوموں میں جو دنیا کو عالم گیر جنگ سے محفوظ رکھنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ سب سے پیش پیش

انگریز ہیں، کیوں کہ برطانوی سامراج دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے، اور اس کی مورچہ بندی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ حبش کے معاملے میں اٹلی سے دب کر، صلح نامۂ رسائی کی جو خلاف ورزیاں جرمنی نے علانیہ کیں ان سے چشم پوشی کر کے اور فاشسٹ قوتوں، یعنی اٹلی اور جرمنی کو ڈھیل دے کر انگلستان نے اپنی آبرو کھو دی ہے لیکن دوسری طرف انگلستان نے ۱۹۳۵ء سے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی جنگی قوت بڑھانا شروع کیا ہے، بحر روم اور سنگاپور میں بحری مرکز قائم کئے ہیں، کینیڈا جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ہندوستان کی معاشی زندگی کو اپنے کاروبار سے وابستہ کیا ہے، مصر کو آزاد اور ہندوستان کو ایک نئے دستور میں الجھا کر اس طرف سے اطمینان حاصل کیا ہے اور یہ سب قوت کے آثار ہیں۔ ورنہ یہ تو انگلستان کی پرانی حکمت عملی ہے کہ لڑائی میں تبھی شریک ہو جب اسے اپنی طرف سے لڑنے والے مل جائیں جن کے لئے لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا ہو، جن کی نسبت یقین ہو کہ دشمن کا غصہ انھیں پر اُترے گا۔ اور لڑائی کی مصیبتیں بھی زیادہ تر وہی جھیلیں گے۔ انگلستان اس وقت دنیا کی مطمئن قوموں میں سے ہے، لڑائی سے اس کو فائدے کی امید نہیں، نقصان کا خاصہ اندیشہ ہے اور اسی اندیشے کو جتا کر اس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی ہے۔ اس کے لئے مصلحت بس اسی میں ہے کہ تیاری کی دھوم مچائی جائے۔ اس کے مخالف سمجھ گئے ہیں کہ انگلستان بات کا جواب نہ دے تو لات کا دے سکتا ہے ملک کی عام رائے مدبروں کو سہارا دے رہی ہے، بے روزگاری کم ہو گئی ہے، سرمایہ داروں کی جیبیں بھر رہی ہیں اور معاشی زندگی میں رونق نہیں تو ایسی چہل پہل ضرور پیدا ہو گئی ہے جو کئی سال سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

امریکہ

امریکہ بھی انگلستان کی طرح اطمینان چاہتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی معیشت میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انھوں نے امریکہ کو کساد بازاری کے الجھاؤ میں ڈال دیا ہے، اور اب اس کی ضرورت ہے کہ وہاں کی معاشی زندگی کو ایک نئی تنظیم دی جائے۔ مسٹر روزولٹ کئی سال سے کوشش کر رہے ہیں کہ سرمایہ داروں کو اس پر راضی کر لیں کہ وہ حکومت کی ہدایتوں پر عمل کریں اور تنظیمی تجویزوں کو کامیاب بنانے میں حکومت کی مدد کریں۔ اسی سلسلے میں جنوبی امریکہ میں پچھلے سال وہ کانفرنس ہوئی تھی

جس میں مسٹر روزولٹ خود گئے تھے اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست ہائے متحدہ اور جنوبی امریکہ کو ایک معاشی واحدہ مان کر دونوں براعظموں کی تجارتی تنظیم باہمی مشورے کے بعد اور خاص اصولوں اور قاعدہ کے مطابق کی جاتی ہے۔ مسٹر روزولٹ کی کوششیں ابھی پورے طور پر بارآور نہیں ہوئی ہیں، لیکن امریکہ کی حالت بے شک سدھر رہی ہے، اور لڑائی تنظیم کا سارا کام بگاڑ دے گی۔ امریکہ والوں کی خودداری اور اخلاقی حس، اور اُن سے کہیں زیادہ ان کے وسیع تجارتی اور صنعتی تعلقات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ دنیا کے معاملات سے بالکل بے رخی برتیں، اور حبش ہو یا ہسپانیہ، مانچوکو یا چین، امریکہ کو اپنی اغراض کی وجہ سے واقعات پر نظر رکھنا اور اس کا اعلان کرتے رہنا پڑتا ہی ہے کہ اس کی غیر جانب داری کیا صورت اختیار کرے گی اور کس حد تک برتی جائے گی۔ غیر جانب داری برتنا کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ اس سے تاجروں کو جو منافع لڑنے والی قوموں کے ہاتھ بیچنے میں ہو سکتا ہے نہیں ہوتا، بے روزگاری کم کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتا ہے، سرمایہ دار حاجت مند قوموں کو قرضہ نہیں دے سکتے۔ غرض دوسروں کی ضرورت سے جائز ناجائز کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنے کی صورت نہیں رہتی۔ دوسری طرف احتیاط نہ برتی جائے تو امریکہ خود بخود جنگ کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ اور امریکہ پر ہی نہیں بلکہ ہر طبقے کے لوگ کسی بات پر متفق ہیں تو یہ کہ لڑائی سے بہر صورت بچنا چاہیئے۔ ۱۹۳۷ء کے شروع میں امریکہ والوں کو غیر جانب داری پر مجبور کرنے کے لئے جو قانون موجود تھا اس میں ترمیم کی گئی اور امریکہ والے اپنے مسلک پر قائم رہیں گے جب تک کہ وہ اُسے چھوڑنے پر بالکل مجبور نہ ہوئے۔

روس انگلستان اور امریکہ سے بھی زیادہ روس امن کا خواہش مند ہے۔ معاشی زندگی کی تعمیر کے جن منصوبوں پر ۱۹۲۸ء سے عمل درآمد شروع ہوا تھا وہ اب اپنا پھل لا رہے ہیں۔ اشتراکی تنظیم نے اب ضروریات پوری کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اب بھی اگر وہاں زندگی اور آسائش کا معیار یورپ اور امریکہ کے مقابلے میں بہت گرا ہوا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ تنظیم کافی نہیں ہوئی ہے اور ملک میں جو قدرتی ذخیرے موجود ہیں اُن سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکا ہے۔ روسی فوجیں تعداد میں شاید تمام یورپی ملکوں سے زیادہ ہیں۔ ہوائی جنگ کے لئے دنیا سے بہتر نہ کہیں سامان ہے اور نہ شاید استعداد

لیکن اشتراکی نظام کے لئے اس وقت جنگ سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں۔ سٹالن نے اس سال "ٹروٹسکی کے پیرووں" کا جو صفایا کیا ہے اس کا بھید بھی، جیسا کہ "جامعہ" کے پچھلے نمبر میں بتایا گیا تھا غالباً یہ ہے کہ وہ حاکم جماعت سے ان تمام لوگوں کو نکال دینا چاہتا تھا جن کے اصول یا حوصلے یا طبیعتیں قومی پالیسی میں جنگجوئی کا میلان پیدا کر سکتی تھیں۔ اب ہر روسی کا قومی، اخلاقی، دینی فرض یہ ہے کہ اپنے ملک سے محبت کرے اور اس پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار رہے، اشتراکی تنظیم کو زیادہ مجتمع اور زیادہ کامیاب کرنے کے حوصلے کو زندگی کا مقصد سمجھے اور خیال اور عمل میں اپنے "رب" سٹالن کی فرماں برداری کرے۔ روسی قوم کا "رب" قومی جوش سے تعمیر کا کام لینا چاہتا ہے۔ لڑائی سے وہ ہی قوم ہی کو نہیں، اس کے رب کی ربانیت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اسی وجہ سے سنہ ۳۵ء میں مانچوکو کی ریلیں جاپان کے ہاتھ بیچ دی گئیں، اور جون میں جب روسی جاپانی مسلح کشتیوں میں جھڑپ ہوگئی تو معاملہ بہت جلد رفع کر دیا گیا۔ منجملہ اور باتوں کے روس کے اس رویے نے جاپان کو یقین دلا دیا کہ چین پر حملہ کر کے جتنی جلدی قصہ ختم کر دے اتنا ہی کم دوسروں کی دخل اندازی کا امکان ہوگا۔

اس وقت اگر انگلستان، امریکہ اور روس سیر اور مطمئن ہیں تو اٹلی، جرمنی اور جاپان بھوکے ہیں اور ہر طرف منہ مار رہے ہیں۔ دنیا کی سیاسی کشتی انھیں تینوں کی بیتابیوں کے سبب سے ڈگمگاتی رہتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہی اسے کسی نہ کسی دن ڈبوئیں گے۔

سیاسی رسہ کشی کا دوسرا فریق

جنگ عظیم سے پہلے یورپی سیاست کا رنگ قریب قریب وہی تھا جو اس وقت ہے، جرمنی انگلستان اور فرانس سے ان کی تجارت اور سیاسی حیثیت چھین رہا تھا، اُن کی بعض نوآبادیوں پر حاوی ہونا چاہتا تھا، اور خاص بحر روم میں اٹلی کی یہ چال تھی کہ جرمنی کے زور پر اس محاذ کو توڑ دے جو انگلستان اور فرانس نے ہسپانیہ کی نیازمندی سے فائدہ اٹھا کر قائم کیا تھا۔ جب لڑائی چھڑی تو اٹلی نے جرمنی کو دغا دی۔ جرمنی نے شکست کھائی مگر اٹلی نے بھی دھوکا کھایا اور اٹلی کو صلح نامہ ورسائی سے جا اور بے جا اتنی ہی شکایتیں ہوگئیں جتنی کہ جرمنی کو آج کل ہیں۔ چنانچہ اٹلی نے سنہ ۲۲ء سے سنہ ۳۰ء تک فرانس، چکوسلواکیا اور رومانیہ کے اتحاد کو توڑ کر ایسی

ترتیب قائم کرنا چاہی جس میں اس کی حیثیت کم از کم فرانس کے برابر ہو، اور جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا تو اس نے ہسپانیہ، البانیہ، ہنگری یونان، ترکی، آسٹریا سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے، اور اپنے آپ کو ان ریاستوں کا طرفدار ظاہر کیا جو صلح نامہ ورسائی پر نظر ثانی کرانا چاہتے تھے۔ جرمنی نے صلح نامہ ورسائی کی مخالفت شروع کی تو اٹلی نے اُسے بھی سہارا دیا۔ لیکن جرمنی کی نازی تحریک نے آسٹریا کی طرف پھیلنے کی کوشش کی تو موسولینی نے فوراً اپنے تیور بدلے، آسٹریا کو جرمنی سے الگ رکھنے کے بارے میں فروری ۱۹۳۴ء میں انگلستان اور فرانس سے مل کر ایک مشترک اعلان شائع کیا۔ اور ادھر آسٹریا اور ہنگری سے بھی باہمی تحفظ کا معاہدہ کیا جو روم پروٹوکول کہلاتا ہے۔ اسی سال جون میں ہٹلر موسولینی سے ملنے آیا مگر اکتوبر میں پھر نازیوں نے آسٹریا کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہا اور اس کے جواب میں موسولینی نے فرانس سے گفتگو شروع کی جس کا نتیجہ روم کا معاہدہ تھا (جنوری ۱۹۳۵ء) پھر جب مارچ میں ہٹلر نے اعلان کر دیا کہ جرمنی صلح نامہ ورسائی کی پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتا تو اٹلی، فرانس اور انگلستان نے ایک مشترک رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا جو سٹریزا کا محاذ کہلاتا ہے۔

یہ موسولینی کی سیاست کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس وقت دیکھنے میں آیا جب اس نے حبش پر حملہ کیا، اور انگلستان اور فرانس کے مشوروں کو ٹھکرانے اور ان کی عظمت اور طاقت کا منہ چڑھانے لگا۔ موسولینی نے اس طرح پینترا بدلا تھا کہ انگلستان اور فرانس دونوں اچنبھے میں رہ گئے، وہ لڑائی کے لئے تیار نہ تھے اور ان کی مخالفت شروع ہوئی تب بھی بہت ڈرتے ڈرتے، مگر آخر میں انھوں نے اٹلی کو 'نیک چلن' قوموں کی برادری سے خارج کر دیا۔ اس وقت جرمنی نے اٹلی کو سہارا دیا۔ ہٹلر نے اٹلی کا تجارتی بائیکاٹ کرنے سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا، اٹلی نے حبش فتح کیا تو اس نے سب سے پہلے اس کے قبضے کو تسلیم کیا، اور اس کے معاوضے میں موسولینی نے جرمنی اور آسٹریا کے درمیان سمجھوتے کی جو کوشش ہو رہی تھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ ۱۹۳۶ء کے شروع سے اس وقت تک جرمنی اور اٹلی کے تعلقات بڑھتے رہے ہیں، اور ہسپانیہ کی خانہ جنگی نے ان کی سیاست کو گویا ایک رنگ میں رنگ دیا ہے

جرمنی کی سیاست کا نیا دور ہٹلر کے برسر اقتدار ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سیاست غالباً

اندر سے کھوکھلی ہے، مگر ظاہری ہنگامہ آرائیوں میں سب سے آگے ہے ہٹلر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں لیگ سے علیحدہ ہوگیا، مارچ ۱۹۳۵ء میں اس نے صلح نامہ ورسائی کو بیچ بازار میں، پھاڑ کر پھینکا اور اس کی قائم کی ہوئی فوجی پابندیوں کو ماننے سے ڈنکے کی چوٹ پر انکار کیا۔ ٹھیک ایک سال بعد اس نے مغربی جرمنی کے اُن علاقوں میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ جہاں صلح نامہ کی رو سے وہ نہیں رکھی جا سکتی تھیں، اور اب جو ایسی کوئی پابندی نہیں رہ گئی ہے جسے توڑ کر وہ اپنی قوت اور آزادی کا مظاہرہ کرسکے تو وہ نوآبادیوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ہٹلر کی باتیں اس کے عمل سے بھی زیادہ ہنگامہ خیز ہیں۔ وہ دنیا کو یہودیوں اور بولشویکوں سے پاک کرنا چاہتا ہے یہودیوں کو اس نے جرمنی سے نکال دیا ہے اور اب وہ اپنا سارا غصہ بولشویکوں پر اتارا کرتا ہے۔ اسی غصہ کی آڑ لے کر اس نے نومبر ۱۹۳۶ء میں جاپان سے ایک معاہدہ کیا جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ کمیونسٹ اصولوں اور اُن کی تبلیغ کی مخالفت کی جائے' اور اسی غصے کی بنا پر وہ ہسپانی خانہ جنگی میں باغیوں کا ساتھ دے رہا ہے۔

ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں "عدم مداخلت"

ہسپانیہ کی خانہ جنگی کو ڈیڑھ سال کے قریب ہوگیا ہے اور ابھی تک اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں ۱۹۳۷ء کا پورا سال "عدم مداخلت" کی کوششوں میں گذرا اور کوئی کامیابی نہیں ہوئی، سوا اس کے کہ ابھی تک گفتگو کے لئے موقع باقی ہے۔ فروری تک بس غیر جانب دار ریاستوں کے لئے ایک دستور العمل تیار کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کو ایک خالص ملکی مسئلہ بنا دیا جائے۔ غیر ملکوں کے رضاکار ہسپانیہ کے اندر داخل ہونے نہ پائیں اور باہر کے غیر قوموں کے جہاز سامان جنگ نہ پہنچانے پائیں طریق عمل پر اتفاق اور مجموعی حیثیت سے تجویز پر عمل در آمد ہوتے ہوتے دو مہینے گذر گئے، اور اس دوران میں فرینکو اور ہسپانی حکومت کو برابر باہر سے مدد پہنچتی رہی۔ چنانچہ مارچ میں جب میڈرڈ پر حملہ ہوا تو فرینکو کی طرف سے چار اٹیلین دستے لڑ رہے تھے، اور جب "عدم مداخلت" کمیٹی کے ایک اجلاس میں غیر ملکوں کے رضاکاروں کو واپس بھجوانے کا مسئلہ پیش کیا گیا تو اٹلی کے نمائندے کاؤنٹ گراندی نے صاف صاف کہہ دیا کہ اٹلی کی فوجیں ہسپانیہ سے اس وقت تک واپس نہ بلائی جائیں گی جب تک

کہ کمیونسٹوں کا صفایا نہ ہوجائے گا۔ غداخدا کرکے عدم مداخلت کے پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوا، مگر اس کو ڈیڑھ مہینہ نہیں ہوا تھا کہ جرمنی کے ایک پہرہ دینے والے جہاز پر ہسپانی حکومت کے ہوائی جہازوں نے گولہ باری کی۔ جس کے بدلے میں جرمن جہاز نے ایک ہسپانی بندرگاہ پر گولے برسائے۔ پھر وسط جون میں ایک جرمن جہاز پر آب دوزوں نے حملہ کیا۔ اور اس واقعہ کے بعد جرمنی اور اس کے ساتھ اٹلی نے اعلان کر دیا کہ وہ عدم مداخلت کے مجوزہ پروگرام پر عمل کرنا مناسب نہیں سمجھتے عدم مداخلت کمیٹی نے برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ سمجھوتہ کرا دے، اور برطانیہ کی طرف سے ایک لمبی چوڑی تجویز پیش ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ غیر ملکوں کے رضاکار ہسپانیہ سے بلائے جائیں اور سمندر پر فرنکو اور ہسپانی حکومت دونوں کو وہ حقوق دے جائیں جو دو لڑنے والی ریاستوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن جب تجویز پر گفتگو شروع ہوئی تو اٹلی اور جرمنی کا اصرار تھا کہ فرنکو کو حقوق پہلے دیے جائیں اور رضاکاروں کے مسئلے پر بعد کو غور کیا جائے، باقی تمام اراکین اس کے خلاف تھے۔ اور پہلے رضاکاروں کے معاملے کو چکانا چاہتے تھے۔ یہ سوال زیر بحث تھا اور ایک طرف اٹلی اور جرمنی، دوسری طرف روس کی خوشامد کی جا رہی تھی کہ اچانک فرانسیسی اور برطانوی جہازوں پر گمنام ہوائی جہازوں اور آب دوزوں نے حملے شروع کئے اور پہرہ دینے والے جہازوں کی نوعیت اور اختیارات بدلنے کی ضرورت ہوئی۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ عدم مداخلت کمیٹی کے اوپر چھوڑ دیا جائے، یونوں میں انگلستان اور فرانس نے ایک کانفرنس کی جس میں بلغاریہ، یونان، رومانیہ، ترکی، یوگوسلاویا، روس، مصر، اٹلی اور جرمنی کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، مگر اٹلی اور جرمنی نے شریک ہونے سے انکار کیا تو اس کے باوجود انگلستان اور فرانس نے مشرقی اٹلانٹک کے زیر بحث حصوں اور بحر روم کو اپنے اور دوسری ریاستوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور برطانوی اور فرانسیسی جنگی جہاز آب دوزوں کا سراغ لگانے میں مشغول ہوگئے۔ اٹلی کو برطانیہ اور فرانس کی تجویزوں پر یہ اعتراض تھا کہ انھوں نے اٹلی کو وہ حیثیت نہیں دی جو اسے اس کی طاقت کو دیکھتے ہوئے ملنا چاہیئے، اور جرمنی نے اٹلی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن جب بعد کو اٹلی کے سپرد بحر روم کا زیادہ حصہ کیا گیا تو وہ بھی راضی ہوگیا اور اس طرح ایک بڑا خطرہ دور ہوگیا۔

یہ خطرہ عدم مداخلت کے مسئلے سے بہت بڑا تھا اور ظاہر ہے کہ جب تک اس طرف سے اطمینان نہیں ہوا، عدم مداخلت پر گفت گو ملتوی رہی لیکن نیون کانفرنس کے فیصلوں میں اٹلی کو شریک کر کے اور اٹلی کی بحری قوت کو تسلیم کر کے بھی برطانیہ اور فرانس ہسپانیہ میں اپنا مطلب حاصل نہ کر سکے۔ اٹلی نے پہلے تو یہ منوا لیا کہ ہر معاملے میں اس کے ساتھ جرمنی سے مشورہ کرنا اور اس کی رضامندی حاصل کرنا ضروری سمجھا جائے اور پھر کہا کہ عدم مداخلت کی کمیٹی جو کچھ طے کرے اس پر عمل کرنے نہ کرنے کا حق محفوظ رکھے گا۔ فرانس اور انگلستان اس بات سے گھبرائے ہوئے ہیں کہ اٹلی نے میجورکا کے جزیرے پر قریب قریب قبضہ کر لیا ہے اور منورکا کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے، اور فرانس کی تشویش اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی کہ اکتوبر میں اٹلی نے لیبیا کو فوج اور سامان بھیجنا شروع کر دیا۔ عدم مداخلت کی کمیٹی نے ۴ نومبر کو چند ریزولیوشن پاس کئے جن پر عمل کیا جائے تو عدم مداخلت کا معاملہ بہت کچھ سلجھ جائے گا لیکن اب روس عدم مداخلت کمیٹی سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اٹلی اور جرمنی نے بھی اتحاد عمل کے بہت ہی مشروط اور کچے وعدے کئے ہیں۔

در اصل عدم مداخلت کی کمیٹی قائم صرف اس لئے ہوئی ہے کہ مداخلت کے لئے ایک آڑ مل جائے ہسپانی حکومت کے صدر سینور آزانا نے ۱۸ جولائی کو ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ ہسپانیہ برسوں سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ صلح اور دوستی برت رہا ہے۔ لیکن اب وہ ہمارے کانوں، ہمارے خام مال، ہماری بندرگاہوں، ہماری آبناؤں، ہمارے بحری مرکزوں کے فراق میں آتے ہیں، اس نیت سے نہیں کہ ہمیں ستائیں بلکہ ان سیاسی قوتوں کو جن سے ہمارے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ یعنی اٹلی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہسپانیہ، فرانس اور برطانیہ کے اس اتحاد کو توڑ دے جس کی بدولت انگریز اور فرانسیسی بحر روم کے مغربی حصے پر حاوی رہے ہیں اور چونکہ ہسپانی حکومت کو وہ کسی سازش میں اپنا شریک نہیں بنا سکتا اس لئے وہ خانہ جنگی میں مداخلت کر کے قوت کے پرانے توازن کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ جرمنی نے جنگ عظیم سے پہلے ہسپانیہ اور فرانس کی افریقی نوآبادیوں میں اپنی تجارت کے قدم جمانا شروع کیا تھا اور وہ مغربی بحرۂ روم کے معاملات کو برطانیہ، فرانس اور ہسپانیہ کے نجی معاہدوں کی تحت سے نکال کر بین الاقوامی

معاملات کی حیثیت دینے کی فکر میں تھا۔ اب جرمنی بھی اسی فکر میں ہے۔ ہسپانی خانہ جنگی میں باغی کامیاب ہو جائیں تو غالباً ہسپانیہ، ہسپانی اور فرانسیسی مراکش اور افریقہ کے شمالی اور مغربی ساحل کی تجارت کا بہت بڑا حصہ جرمنی کو مل سکے گا۔ ظاہر ہے برطانیہ اور فرانس کو یہ منظور نہیں ہو سکتا، لیکن وہ کھل کر نہ کچھ کہہ سکتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ وہ خانہ جنگی میں کسی فریق کی پوری پوری حمایت نہیں کر سکتے، کیونکہ حکومت کی کھلم کھلا مدد کرنے میں خوف ہے کہ پھر اٹلی اور جرمنی علانیہ باغیوں کے ساتھ مل جائیں گے اور فرینکو پر اب بھی اگر احسان کرنے کی گنجائش ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کی کامیابی مغربی بحر روم میں قوت اور اثر کا ایک نیا توازن قائم کرے گی۔ لطف تو یہ ہے کہ انگریز اور فرانسیسی ایمان داری سے عدم مداخلت پر بھی اصرار نہیں کر سکتے، اس لئے کہ اس میں اٹلی اور جرمنی کے بگڑ جانے ہی کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ خود ان کو اس کی آزادی نہیں رہتی کہ جیسا موقع ہو ویسی ہی اپنے فائدے اور اپنے اثر اور اقتدار کے تحفظ کی تدبیریں کریں۔ پھر کیا تعجب ہے کہ عدم مداخلت کا ڈھونگ بنایا گیا ہے، اٹلی اور جرمنی کی ناز برداری کی جاتی ہے، اور انگریز ان کے سامنے گویا ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک ادا ہے اور اسے بدلنے میں کچھ دیر نہ لگے گی۔

روم برلن کا محور عدم مداخلت کے مسائل نے یورپی سیاست میں وہ نیا منظر پیدا کیا جو روم برلن کا محور کہلاتا ہے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ اٹلی اور جرمنی کے ارادے اور خواہشیں در اصل وہ محور ہیں جس پر یورپی سیاست گھومتی ہے۔ یہ محور ۱۹۳۶ء میں قائم ہوا اور یورپی سیاست نے ۱۹۳۷ء میں اس کے گرد چکر لگاتے لگاتے اس کو اور بھی مستقل اور مضبوط کر دیا ہے۔ اٹلی اور جرمنی کی حکومتیں ان دو برسوں میں ایک دوسرے کے نمائندوں کی خاطر تواضع کرتی رہی ہیں اور ستمبر ۱۹۳۷ء میں مسولینی کے جرمنی جانے سے بغیر کسی باضابطہ عہد و پیمان کے دونوں کی دوستی پر مہر لگ گئی۔ ملاقات کے سلسلے میں ہٹلر اور مسولینی کی جو تقریریں ہوئیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک عدم مداخلت کے مقابلے میں اٹلی اور جرمنی کے درمیان جو اتفاق رہا ہے وہ قائم رہے گا، جرمنی اٹلی کو بحر روم میں سہارا دے گا، اٹلی جرمنی کے اس مطالبے کی تائید کرتا رہے گا کہ اسے خام مال کے ذخیروں پر

دست رس ہونا چاہئے اور نوآبادیاں ملنا چاہئیں، اور فرانس اور انگلستان کے مقابلے میں دونوں اپنا اتفاق اور اتحاد عمل جتائیں گے۔ روس اور کمیونزم کو برا بھلا کہتے کہتے فاشسٹ اور نازی عقائد کے مبلغوں نے ایک دوسرے سے مشابہت بھی محسوس کی ہے، اور ورسائی کے صلح نامہ کی مخالفت اور اس کے ڈگری داروں سے رقابت بھی اٹلی اور جرمنی کے اتحاد کو بڑھائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اٹلی کی سیاست ایک حد تک گیدڑ بھبکی ہے اور موسولینی کے جرمنی جانے کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ انگلستان اور فرانس کی نیازمندی میں کچھ فرق آ رہا تھا، اور آب دوزوں کے حملوں کا جواب انھوں نے اس قدر جلد اور ایسے قطعی طور پر دیا تھا کہ اٹلی کی جرمنی سے اپنی دوستی جتانے کی ضرورت پڑ گئی۔ دوسری طرف جرمنی فرینکو کے معاملے میں کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا، اس لئے کہ فرینکو کے جلد کامیاب ہونے کی امید پوری نہیں ہوئی ہے اور نہ پوری نظر ہوتی آتی ہے، جرمنی اگر مایوس ہو گیا تو اٹلی کے منصوبے بھی رہ جائیں گے۔ بسمارک کا مقولہ ہے کہ ہر اتحاد گھوڑے اور سوار کا اتحاد ہوتا ہے۔ اور سمجھ دار آدمی وہ ہے جو سوار بنے گھوڑا نہ بنے۔ اٹلی اور جرمنی کا اتحاد بھی اسی قسم کا ہے۔ لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دونوں میں گھوڑا کون ہے سوار کون۔

جاپانی سیاست

انگلستان اور فرانس اٹلی اور جرمنی کی چالوں کے جواب سوچنے میں مصروف ہیں۔ روس اور امریکہ اندرونی تنظیم میں، اور سب کی دشواریاں اور ذمہ داریاں اتنی ہیں کہ جب تک جان پر نہ بن آئے وہ کسی دور افتادہ محاذ پر لڑنے سے بچیں گے۔ جاپان نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر چین پر حملہ کر دیا۔ اٹلی جرمنی کی طرح بین الاقوامی مصالحت اور امن جاپان کے دل کو بھی لگا ہے، لیکن جیسے موسولینی اور ہٹلر اس کو ناممکن سمجھتے ہیں جب تک کہ ان کی قوت اور اقتدار کو سیاسی اور معاشی دنیا میں تسلیم نہ کیا جائے اور انھیں اتنی نوآبادیاں نہ مل جائیں کہ وہ اپنی تمام معاشی ضروریات پوری کر سکیں، ویسے ہی جاپان نے بھی بین الاقوامی امن کی خاطر اپنے آپ کو اس پر مجبور پایا کہ چین کو فتح کرلے جاپان نے ۱۹۳۱ء میں مانچوریا پر قبضہ کیا اور اپنے قبضہ کو چین سے تسلیم کرا لیا۔ اس کے بعد اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، اور مشرق میں جاہار اور جنوب میں ہوپئی کے صوبے ہضم کرنا چاہے۔

اس میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اگرچہ صوبوں کی حکومت میں اس کا خاصا اثر ہوگیا، اور نومبر ۱۹۳۶ء میں اس کے اشارے پر اور اس کی مدد سے مانچوکو اور اندرونی منگولیا کی فوجوں نے صوبہ سوئی یوآن پر حملہ کیا تو وہ بھی پسپا کردی گئیں جب یہ حملہ ہوا تو چینی جاپانی حکومتوں میں گفتگو ہو رہی تھی اور جاپانی چاہتے تھے کہ چینی حکومت چاہار اور ہوپیئی کے مالی انتظامات سے اور بینکوں کو مرکز سے الگ کردے، ان میں اور ریلیں بنوائے اور وہاں کے قدرتی ذخیروں، خاص طور پر لوہے کی کانوں سے فائدہ اٹھانے کی تدبیروں میں جاپان کی مدد کرے لیکن سوئی یوآن پر حملہ ہوا تو چینیوں نے مزید گفتگو سے انکار کردیا۔ اس سے جاپان کے مطالبوں میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں جاپان نے چند حادثوں کی آڑ لے کر جس میں جاپانیوں کو جان اور مال کا کچھ نقصان ہوا تھا چینی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اس کے خلاف ایجی ٹیشن بند کرنے کے لئے اخباروں کی نگرانی کی جائے، درسی کتابوں پر نظرثانی کرکے جاپان کے خلاف ان میں جو کچھ ہو نکال دیا جائے۔ اس کو اسکولوں میں اپنے انسپکٹر بھیجنے کا حق دیا جائے۔ اس کے علاوہ چین سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ کوریا کے انقلابیوں کے سرکچلنے میں جاپان کی مدد کرے۔ یہ سب باتیں مان لی جائیں تو چین پر جاپان کی حکومت "مفت" میں قائم ہو جاتی، لیکن کہا جاتا ہے کہ جاپانی اس سے بھی زیادہ چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا تھا کہ "کومنٹانگ" کی بیخ کنی میں چین ان کا ساتھ دے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ مطالبہ تھا کہ شمالی چین کے پانچ صوبے ایک خودمختار واحدہ بنا دیے جائیں

جاپان کے مطالبوں نے حد سے گذر کر دوا کا کام کیا۔ اور ستمبر اور دسمبر ۱۹۳۶ء میں مارشل چیانگ کائی شک کا ایک طرف اس پارٹی سے جو کانٹون اور جنوبی چین پر حاوی تھی اور دوسری طرف وسط چین کے صوبے شن سی کے سپہ سالار سے سمجھوتا ہوگیا۔ اسی کے ساتھ چین کے اور صوبہ داروں اور سپہ سالاروں نے چیانگ کائی شک کی ماتحتی کا اقرار اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔ اور سارے چین میں باہمی ارتباط اور ہم آہنگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جاپانی سیاست کے لئے یہ علامت بہت خطرناک تھی، اور اسی کا علاج کرنے کے لئے اس نے جنگ چھیڑ دی چینیوں میں بس اتحاد کی صورت نظر آئی تھی، جاپان کے پاس لشکرکشی کی تفصیلات تک تیار رکھیں، اور اس نے اس کا بھی انتظام کرلیا تھا کہ کوئی غیر قوت چین کی مدد کو پہنچ

کر اس کی مجوزہ فوجی کارروائیوں میں کوئی عذر کرے

جاپان ۱۹۳۳ء میں لیگ سے علیحدہ ہو گیا پھر اس نے اعلان کر دیا کہ وہ واشنگٹن کے معاہدہ پر جو ۱۹۲۲ء میں ہوا تھا اور جس کے مطابق وہ چین کے کسی معاملے میں ان نو ریاستوں سے مشورہ لئے بغیر جو اس معاہدے میں شریک تھیں کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا، آیندہ عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے یہ بھی جتا دیا ہے کہ وہ ان مصلحتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا جن کے خیال سے ۱۹۲۲-۱۹۲۱ء کی واشنگٹن کانفرنس نے انگلستان، امریکہ اور جاپان کے جنگی جہازوں کی تعداد میں ۵ : ۵ : ۳ کا تناسب قائم کیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب اس نے مانچوریا پر حملہ کیا تو کسی غیر قوت نے اس کی روک ٹوک نہیں کی۔ لیگ نے اسے حملہ آور قوم ٹھہرایا۔ مگر انگلستان نے اس سے نجی معاملہ کرکے اسے مطمئن کر دیا اور فرانس نے اس کا کھلم کھلا ساتھ دیا۔ اس کے ڈپلومیٹک اعلانات کا بھی کسی نے جواب نہیں دیا، اگرچہ ان سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اب تک جاپان نے جو وعدے کئے ہیں ان پر اعتبار کرنے والا احمق بنے گا۔ صرف ریاستہائے متحدہ نے فلپائن جزیروں کو آزاد کر دیا اور ہوائی جزیروں میں ایک بحری اور ہوائی مرکز قائم کیا جس کی تعمیر ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور برطانیہ نے سنگاپور میں ایک بحری مرکز بنایا۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ جاپان مشرقی ایشیا کی سیاست کو ایک بالکل خانگی معاملہ نہ سمجھے، اپنی مصلحت کے مطابق ایشیا کے سیاسی استحکام کی تدبیریں نہ کرے۔ اور سب کے منہ پر یہ نہ کہے کہ مشرقی ایشیا میں انھیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

جاپان اور چین کی لڑائی کو شروع ہوئے ایک مہینہ گذر چکا تھا جب لیگ کو اس واقعے کی خبر ہوئی اور اسے یہ طے کرنے میں ایک مہینہ اور لگ گیا کہ جاپان کی کارروائی "مدافعانہ" جنگ نہیں مانی جا سکتی، جاپان کا بستیوں اور غیر مسلح آبادیوں پر بم برسانا قابل اعتراض ہے اور دونوں فریق صلح کر لیں تو بہت اچھا ہوگا۔ دوسری طرف انگلستان اور امریکہ اسی بمباری کے خلاف احتجاج کرکے رہ گئے۔ ۱۴ ستمبر کو پریزیڈنٹ روزولٹ نے قانون غیر جانب داری کے مطابق سرکاری جہازوں کو حکم دیا کہ چین یا جاپان کو سامان جنگ نہ پہنچائیں، لیکن غیر سرکاری جہاز چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ اس سے چین کے ہاتھ اور بندھ

گئے ، اور جاپان انگلستان اور امریکہ سے خریدے ہوئے ہوائی جہازوں اور ڈچ مشرقی ہند سے خریدے
ہوئے پٹرول کی بدولت چینی بستیوں کو ویران کرتا رہا ۔ انگلستان نے اسی وقت سانس لیا جب شروع
اکتوبر میں پریزیڈنٹ روز ولٹ نے ایک تقریر میں جاپان پر زیادتیاں کرنے کا الزام لگایا اور امریکہ
والوں سے کہا کہ اگر انھوں نے دنیا کے حالات سے بے رخی برتی تو امن قائم رکھنا مشکل ہو جائے ۔ انگلستان
کے وزیر اعظم نے اس تقریر کی بہت تعریف کی اور جھٹ سے برسلز میں ایک کانفرنس کا انتظام کیا گیا
لیکن جاپان نے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ۔ اٹلی نے صاف ظاہر کر دیا کہ وہ جاپان کے
خلاف کسی کارروائی میں شریک نہ ہوگا اور جرمنی نے اس کی تائید کی ۔ انگلستان کی کوشش تھی کہ
کانفرنس کے فیصلوں کی ذمہ داری امریکہ کے نمائندے پر ڈالی جائے ۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی
اور انگریز اس راز کو بھی نہ چھپا سکے کہ انھیں چین کو مدد پہنچانے کا خیال نہیں ہے بلکہ ایسی کارروائی سے
بچنے کی فکر ہے جن سے جاپان کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو ، کیوں کہ جاپان سے اُن کا سارا معاملہ نجی طور
پر ہوا ہے اور جاپان کی وعدہ خلافی سارا کام بگاڑ دے گی ۔

برسلز کانفرنس خود غرضی اور پست ہمتی کا مظاہرہ بن کر رہ گئی ، مگر دوسری طرف ۶ نومبر کو
اٹلی ، جرمنی اور جاپان کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رو سے اٹلی اس معاہدے میں شریک مانا گیا جو
۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو جرمنی اور جاپان کے درمیان ہوا تھا اور جس کا مقصد بولشوک پروپگنڈا کی مخالفت
تھی ۔ واقف کار لوگوں کا خیال ہے کہ اس معاہدے میں کچھ بھید بھی ہے ، اور ۸ نومبر ۱۹۳۷ء کو ہٹلر نے
ایک تقریر بھی کی جس میں روم برلن کا محور یورپی سیاست کا اور روم برلن ٹوکیو کا مثلث عالم گیر
سیاست کا مرکز بنایا گیا اور اس کا اعلان بھی کیا گیا کہ یہ مثلث ایسی ریاستوں کا اتحاد ہے جنھوں نے اپنے
حقوق اور اہم اغراض کے تحفظ کا تہیہ کر لیا ہے ۔

اب بے چارے چین کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ لیکن انسانی اخلاق سے اس طرح بے رخی
برتنا جیسے کہ ریاستیں آج کل کر رہی ہیں آخر میں سب کے لئے مضر ہی ثابت ہوگا ۔ جاپان کے پاس
اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ مانچوکو سے پورا فائدہ اٹھا سکے ۔ چین فتح بھی ہو گیا تو اس پر قبضہ رکھنے میں بڑی

دشواریاں پیش آئیں گی اور سرمائے کی کمی یقیناً جاپان کو دوسری قوموں کے لئے چین میں گنجائش نکالنے پر مجبور کرے گی۔

چین پر حملہ جاپان کی فوجی پارٹی کے اصرار پر کیا گیا ہے۔ یہ پارٹی سیاسی اور معاشی مصلحتوں کو نہیں سمجھتی اور سیاسی آداب کیا انسانیت کو بھی نہیں مانتی ، اور بہت ممکن ہے اس پارٹی کا شیطانی غرور جاپان کو ایسی مہموں میں الجھا دے جن کا بار ملک کے موجودہ معاشی نظام سے نہ اٹھایا جاسکے امریکہ اور یورپ کی ریاستیں یہ سمجھے بیٹھی ہیں کہ جاپان کا پیٹ اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہ سارے چین کو ہضم کر جائے۔ اور انھیں بھی خاصا حصہ ضرور ملے گا۔ لیکن جاپان کو پیٹ ہی بھرنے کی ضرورت ہوتی تو اس کے لئے مانچوکو بہت کافی تھا۔ اس کی نیت بھرنے کے لئے ممکن ہے پورا چین بھی کافی نہ ہو اور وہ چین کا بٹوارہ کرنے کی جگہ اور کچھ مانگ بیٹھے۔ ادھر یورپ میں دیکھئے تو انگلستان اور فرانس اپنی پونجی محفوظ رکھنے کی خاطر فاضلات ایک ایک کرکے فاشسٹ قوتوں کے حوالے کر رہی ہیں مگر وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب انھیں اپنی پونجی خطرے میں نظر آئے گی۔ انگلستان جمہوریت کی پشت پناہ ہوتے ہوئے فاشزم کی درپردہ امداد کر رہا ہے اور عالم گیر جنگ سے بچنے کا بہانہ کرکے اٹلی کی گستاخیاں برداشت کر رہا ہے۔ اس رویے سے برطانیہ کی بین الاقوامی حیثیت کو صدمے پہنچ رہے ہیں اور بہت جلد ایسی صورت پیدا ہوسکتی ہے کہ انگلستان کی اتنی حیثیت بھی نہ رہنے کا خطرہ ہو جو اس کے سامراج اور تجارت کی سلامتی کے لئے لازمی ہے ابھی تو فاشسٹ اور جمہوری، کومیونسٹ اور سرمایہ دار سب قسمیں کھاتے ہیں کہ اس عالم کا ہم سے بڑھ کر کوئی دل دادہ نہیں لیکن دنیا کی سیاست اور معیشت اس قدر پیچیدہ ہوگئی ہے کہ اغراض اور مقاصد کا اچانک ایسا تصادم ہو جانا بہت ممکن ہے جو جھوٹ اور دھوکے پر قائم کئے ہوئے نظام کو درہم برہم کر دے۔ اور اس ساری کمائی کو گنوا دے جس کی خاطر یہ طومار باندھا گیا ہے۔

اسلامی دنیا

یوں تو دنیا جب سے بنی ہے بدل ہی رہی ہے لیکن ادھر چند برسوں سے اس کے بدلنے کے ڈھنگ اور ہو گئے ہیں، پہلے غیروں کو تو چھوڑئے اپنوں کو ایک دوسرے کی بِپتا کی خبر نہ ہوتی تھی، اب یہ حال ہے کہ کہیں اسپین میں جنگ کی چنگاری چمکتی ہے تو اس کے شعلے اُٹھ اُٹھ کر پورب پچھم کے خرمنوں کو تکنے لگتے ہیں، فلسطین میں گولی چلتی ہے تو اس کی آواز بٹاویا سے طنجہ تک کی فضا کو گونجا دیتی ہے، دوسری بات اس زمانہ کی انوکھی یہ ہے کہ اگلے وقتوں میں زمانہ چیونٹی کی چال چلتا تھا، پر اب تو وہ اپنی تیز رفتاری میں بجلی کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء کی دنیا کا مقابلہ دسمبر ۱۹۳۸ء سے کیجئے، آپ کو دوسرا ہی عالم نظر آئے گا، خاص طور پر اسلامی ممالک میں نئے زمانے کی انقلابی روح اپنے پورے شباب پر ہے، نتیجہ! ایک ہمہ گیر انقلاب اور وہ بھی برق پا، ایک برس میں جو مسافت قطع ہوتی ہے پہلے کئی برسوں میں اس کا طے کرنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ دنیا کے کسی سیاسی سمندر میں کہیں جوار بھاٹا اٹھتا ہے تو اس کی موجیں دنیائے اسلام کو ضرور جھکولے دے کر رہتی ہیں، یورپی سلطنتوں کی رقابتیں، عربوں کی کھیتی کو پروان چڑھانے میں دنوں میں وہ کام کر رہی ہیں جس کے لئے ان کو برسوں تک خون پسینہ ایک کرنا پڑتا۔

شمالی افریقہ مراکش، الجزائر اور ٹیونس کے متعلق کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہاں کے باشندے اپنے آپ کو فرانسیسی رنگ میں رنگنے سے بچا سکیں گے، جاہل تو جاہل تھے ہی، پڑھے لکھے اور بھی گئے گذرے تھے۔ عربی سے نابلد اور مذہب سے بیزار، اسلام کی صورت کم نظر علماء اور خرقہ فروش صوفیوں نے اتنی گھناونی بنا دی تھی کہ نوجوان اس کے نام سے بد کتے تھے، بدیسی حکومت چاہتی تھی کہ اُن کو اپنے حسب و نسب سے بیگانہ اور ملک و ملت سے متنفر کر کے انھیں فرانسیسی بنا دیا جائے، اور مراکشی عربوں کی اپنے وطن میں وہی حیثیت ہو جو کالے حبشیوں کی سرزمین امریکہ میں ہے۔ فرانس نے اپنے تمدن کو خوش رنگ بنانے اور اسلام کو بدنما

کرنے میں اپنا تمام زور صرف کر دیا، امید تو تھی کہ پرانی نسل کے مٹتے ہی مراکش سے اسلام، عربی تمدن اور عربی زبان مٹ جائے گی لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔

اسلامی مشرق سے نئے خیالات کی گھٹا اٹھی جو ٹیونس، الجزائر اور مراکش کی تمام بستیوں پر برستی چلی گئی ساتھ ہی عام اقتصادی بدحالی، دیہی آبادی کی بے اطمینانی اور اہل حرفہ کی تباہی نے ملک میں ایک سیلاب پیدا کر دیا جس کے سامنے فرانسیسیوں کے تمام تمدنی کارنامے اور علمی کوششیں خس و خاشاک ثابت ہوئیں، فرانس سے دشمنی اور فرانسیسی تمدن سے نفرت نئی نسل کا شعار بنی۔

اس سال اسپین کی خانہ جنگی اور فرانس سے اٹلی اور جرمنی کی رقابت نے مراکشیوں کے دل میں سلگتی ہوئی آگ کو اور ہوا دی چنانچہ قوم پرست نوجوانوں نے کھلم کھلا حکومت کی مخالفت کی ٹھانی اب معاملہ احتجاج سے گذر چکا ہے۔ مراکشی کچھ اتنے ہیٹے بھی نہیں کہ فرانس کی فوج اور پولیس کا مقابلہ نہ کر سکیں ظاہر ہے ان حالات میں قتل و خون ہوگا، اب فرانس ایک طرف صلح و صفائی کی تدبیریں کر رہا ہے اور اپنی سابقہ حکمت عملی میں تبدیلی کا وعدہ کرتا ہے، اور دوسری طرف اپنی ہوائی قوت بڑھا رہا ہے۔ بہرحال وہ مراکشی جو چند برس پہلے ایک فرانسیسی فوجی افسر کے قول کے مطابق خنزیر کھاتے اور ہمارے ساتھ شراب پیتے تھے، اب ایک نئی روح سے سرشار ہیں۔ بے شک فرانس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں لیکن قوموں کی کھیتیاں خون سے ہی سینچ کر پھل پھول لاتی ہیں، اور افریقہ کے عرب اور بربر خون بہانے میں کچھ زیادہ بخیل بھی نہیں۔

طرابلس

طرابلس سے اٹلی کو سونا اور تیل تو ملنے سے رہا البتہ ساحلی علاقوں میں انگور اور زیتوں کی کاشت کے لئے کچھ زمینیں ہاتھ آگئیں، اب مسولینی کو سوجھی کہ طرابلس کے چند لاکھ عربوں سے کچھ اور کام لے۔ قتل کے بعد جفا سے توبہ کر لینا کچھ ایسا مشکل تو ہے نہیں اور اس قسم کی پشیمانی کو دنیا "زود پشیمانی" کہا کرے لیکن سچ یہ ہے کہ کچھ زیادہ بے اثر نہیں رہتی۔ اہل طرابلس کے نصیب جاگے، مسولینی طرابلس تشریف لے گئے نیوز ایجنسیوں کے قول کے مطابق جو ظاہر ہے اطالوی تھیں موصوف کا شاندار استقبال ہوا آپ نے عربوں کو یقین دلایا کہ ان کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا، اور حکومت کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی

نہ ہوگی رنگے ہاتھ آپ نے محافظ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا ، اور دنیا جہاں نے صور اسرافیل کی طرح یہ سُن لیا کہ آج سے اٹلی اسلام کا دوست ہے ۔

میسولینی کی اسلام دوستی " کا مسلمانوں کو کیا یقین آتا ، اور طرابلسی پناہ گزیں جو ہزاروں کی تعداد میں مصر میں زندگی گذار رہے ہیں ۔ کیسے مان لیتے کہ کل کے بھیڑیے آج صلح پسند انسان بن گئے لیکن اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اہل طرابلس کو کچھ قدرے آرام ملا ۔ اور فرانس کے کان کھڑے ہو گئے ٹیونس الجزائر اور مراکش کے عربوں نے دیکھا کہ اُن کے بھائی جو اٹلی کے ماتحت ہیں اُن تمام مظالم سے بچ گئے ہیں جن کا وہ شکار ہو رہے ہیں ۔ فرانس سے بیزاری تو تھی ہی اب میسولینی کی اس چال نے انھیں اور بھی بیزار کر دیا ہے ۔ ساتھ ہی طرابلس میں اٹلی کی فوجیں پہنچ رہی ہیں ۔ معلوم نہیں فوجوں کی اس نقل و حرکت سے میسولینی کا مقصد کیا ہے ۔ انگریزوں کو دھمکانا یا فرانس سے ٹیونس کا ہتھیانا ۔

طرابلس کی آزادی تو ابھی بہت دور کی چیز ہے ۔ البتہ سیاسی دنیا کی ہماہمی نے ان صحرا نشینوں کو اپنی اہمیت کا یقین دلا دیا ہے اور اپنی اہمیت کا یقین وہی ہے جو آگے چل کر قوموں کی قسمت بدل دیتا ہے ۔

مصر

اٹلی اور حبش کی جنگ سے مصر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ، نومبر ۳۵ء میں طلبہ کے ہنگامے شروع ہوئے ۔ ۳۶ء کے آخر میں کافی خوں خرابہ کے بعد مصری برطانی معاہدہ طے پا سکا اس سال کی ابتدا ہی میں معاہدہ کا نفاذ ہوا ، برطانی ہائی کمشنر نے سفیر کا نام پایا ، انگریزی فوجی افسر رخصت ہو گئے ۔ اور اُن کی جگہ برطانی فوجی مشن آن موجود ہوا ، اجنبی مراعات کے متعلق مونترو کے مقام پر یورپی حکومتوں سے سمجھوتہ ہوا ۔ وفد کے صدر نحاس پاشا مونترو سے لوٹتے تو جمعیت اقوام میں داخلہ کے لئے جنیوا پہنچے ، بہر حال مصر آزاد ہو گیا ۔ نحاس پاشا فاتحانہ شان و شوکت سے وطن آئے تو ملک میں مخالفین نے کافی ہوا باندھ لی تھی ۔ معاہدہ پر اعتراضات تھے اور وہ تھے برمحل ۔ مونترو میں مصری وفد نے ۔ب کر اجنبی حکومتوں سے سمجھوتہ کیا ، اعتراضات سننے کی یہاں کسے تاب تھی ، ہوا یہ کہ سیاسی پارٹیاں باہم دست و گریباں ہونے لگیں ۔ پارٹی کی اکثریت اس لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے ،

مخالفین کو اپنے حق بجانب ہونے کا یقین ہے اس لئے وہ مخالفت سے باز نہیں آتے ، نہ حکومت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ وطن کے مفاد کے لئے اقلیت کی بات مان لے۔ اور نہ اقلیت اصول سیاست پر عامل ہے کہ رائے عامہ کو ہم نوا کرنے کے لئے شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرتی ، گالی گلوچ سے نوبت مار پیٹ تک پہنچی اور ایک سرپھرے نے نوحاس پاشا کو ٹھکانے لگانے تک کی جرأت کر لی ، مصر کی سیاسی زندگی کا یہ گھناؤنا پہلو اس سال کا سب سے بڑا افسوسناک سانحہ ہے ، اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ مصر کی موجودہ نام نہاد آزادی بھی بے معنی ہو کر رہ جائے ، اور آخر انگریزوں کو ثالث بن کر تمام نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لینا پڑے ہے۔ جس طرح وہ گذشتہ پچاس برس کے عرصے میں بارہا کر چکے ہیں۔

مصر کی سیاسی زندگی تو ہمارے لئے صرف ایک سرمایہ عبرت ہی ہے ، لیکن وہاں کی اجتماعی اور دینی تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مشعل راہ کا حکم رکھتی ہے۔ وادی نیل کی سرزمین میں سب سے پہلے مشرقی یعنی اسلامی اور مغربی تمدن کی ٹکر ہوئی۔ مشرق بے بس تھا اور زار ونزار اور مغرب جوان ، چوکس اور چوبند ، نتیجہ اول الذکر کی شکست اور سرافگندگی اور موخر الذکر کے غلبہ اور اقتدار کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایک صدی اسی بے بسی میں گذری ، جنگِ عظیم نے پہلی بار مشرق کو سر اٹھانے کی ہمت دلائی۔ مغربی اقتدار بالفعل تو باقی رہا لیکن اس کا طلسم ٹوٹ گیا ، اور اس کے ساتھ مغربی تمدن کی برتری کا پول بھی کھل گیا۔ نوجوان اپنی پرانی لکیر چھوڑ کر ایک عرصے سے مغربی بتوں کے پجاری بن چکے تھے اب جو وہ بت ٹوٹے تو نئی راہ کی تلاش ہوئی ، آج ہر نوجوان کے دل میں نئی راہ پانے کا ولولہ ہے ، اور ان کا اضطراب ، الحاد اور سرکشی ، نتیجہ یہ ہے اسی ولولہ ہی کا ، خوش قسمتی سے اس نئی راہ کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے مصر کی فضا اور اسلامی ملکوں سے زیادہ سازگار ہے۔ مصر ہی میں جمال الدین افغانی نے درسِ حکمت کی مسند بچھائی ، شیخ محمد عبدہٗ نے جمود اور تنگ دلی کے طلسموں کو توڑا ، ازہر نے جہاں تک ہو سکا اہل مصر کو مذہب سے بیگانہ نہ ہونے دیا۔ مصر میں نہ ترکی کی سی انتہا پسندی ہے اور نہ ہندوستان کا سا جمود۔ اگر شیخ مصطفےٰ مراغی مصر میں نہ پیدا ہوتا تو اور کہاں

موصوف صحیح معنوں میں مجدد بن سکتے ہیں ، اور اس نازک دور میں تجدید کے بغیر اسلام کے بقا کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔

ازھر کی اصلاح کا اثر صرف دینی عقائد اور مذہبی مسائل تک محدود نہ رہے گا بلکہ اگر موجودہ شیخ الازہر مصطفےٰ مراغی اپنے مبارک ارادوں میں کامیاب ہو گئے تو اصلاح شدہ ازھر دنیائے اسلام کا دینی اور اجتماعی مرشد بنے گا اور اسی کے طفیل سرزمین حجاز سو مدتوں بھٹکا ہوا راہی پھر اسی ارض مقدس کو اپنا قبلہ بنائے گا ۔ ضرورت ہے کہ ہم ترکی کے انقلاب کے ساتھ مصر کے تدریجی ، ارتقا کو بھی اپنے سامنے رکھیں ۔

سوڈان اور حبش

انگریزوں نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کیا ۔ قبضہ غاصبانہ تھا ، اور خود اپنی زبان سے اُسے وقتی اور عارضی کہتے تھے ۔ اسے دائمی بنانے کے لئے انھوں نے سوڈان پر ہاتھ بڑھایا ، مصری چیختے ہی رہے لیکن سوڈان پر برطانی نظم و نسق کا جال بچھ گیا ۔ تقریباً پچاس برس تک برطانیہ سوڈان والوں کو یہ تعلیم دیتا رہا کہ تم ایک ملت ہو ، مصریوں سے تمھارا کوئی تعلق نہیں یہاں تک کہ مصر والوں کا سوڈان جانا بند کر دیا ۔ جب حبش پر اٹلی نے اقتدار جمایا تو برطانیہ کو سوڈان کی فکر ہوئی ۔ اب برطانی نقارخانے سے یہ صدا بلند ہوئی کہ مصری اور سوڈانی دونوں ایک ملت ہیں ، دونوں کا مذہب ایک ، زبان ایک اور قومیت (عربی) ایک ۔ چنانچہ برطانی مصری معاہدہ کے بعد سوڈان میں مصری اثر بڑھنے لگا ہے ، ازھر کے علماء تبلیغ و تدریس کے لئے سوڈان بھیجے جا رہے ہیں ۔ برطانی مصلحت کا تقاضا ہے کہ سوڈان اور مصر دونوں ایک ہو کر مضبوط بن جائیں تاکہ وہ اٹلی کے سامراج کے لئے تر نوالہ نہ بن سکیں ۔

اخبارات کا بیان ہے کہ حبش کے مسلمانوں پر میسولینی کی خاص نظر عنایت ہے ۔ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ وہاں مسلمان پوری آبادی میں آدھے سے زیادہ ہیں ، بہر حال یہ یقینی ہے کہ وہ تیس چالیس فیصدی ضرور ہیں ، اگر افریقہ میں مسلمانوں کو سنبھلنے اور اپنی حالت درست کرنے کے مواقع ملتے رہے ، اور یورپی سلطنتوں کی حریفانہ کش مکشوں نے انھیں اطمینان کا سانس لینے

دیا تو مشرقِ قریب کی طرح وسط افریقہ بھی اسلامی بن جائے گا۔

یمن اور حجاز و نجد

یمن گمنامی کی زندگی سے باہر آتا نظر نہیں دیتا، امام یمن حمید الدین یحیٰ قدامت پرست ہیں۔ کہتے ہیں اُن کا طرزِ حکومت پرانے زمانے کے بادشاہوں کی پوری نقل ہے۔ ملک میں صرف ایک اخبار ہے اور وہ بھی ماہوار اور کل چار صفحے کا، روپیہ جمع کرنے کا بہت شوق ہے، نہ تعلیم کا خیال ہے اور نہ زمانے کی نزاکت کا احساس۔ اٹلی برسوں سے یمن پر نظر جمائے بیٹھا ہے۔ دونوں میں دوستانہ عہد نامہ بھی ہو چکا ہے لیکن انگریز کی جان کو دعا دیجئے کہ مسولینی اب تک یمن کو ہضم نہیں کر سکا۔

نجد و حجاز کی حالت یمن سے تو بہتر ہی ہے لیکن اصلاح و ترقی کے راستے پر اس کے قدم بھی کچھ سست ہی پڑ رہے ہیں خاندانی استبدادی حکومت کی وجہ سے وہاں قومی حکومت کا خیال عام نہیں ہوا اور عرب قومیت کا وہ جنون جو عراق، شام اور فلسطین کے باشندوں پر سوار ہے یہاں اس کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ استبدادی خاندانی حکومتیں کسی زمانے میں موزوں ہوتی ہوں گی لیکن سچ یہ ہے کہ اب تو ان کا دور دورہ قومی زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے

شام

۱۹۳۷ء کے شروع ہی میں شام اور فرانس کا معاہدہ طے پا گیا۔ نئے انتخابات میں قوم پرستوں کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اور معاہدہ کی رو سے شام ۱۹۳۹ء میں کہیں جا کر آزاد ہوگا اور یہ آزادی عراق اور مصر کی سی ہوگی بلکہ اگر سچ پوچھئے تو شام کی آزادی اپنے ان دو ہمسائیوں سے بھی گئی گذری ہوگی۔ عراق کو موصل کے چشموں نے مالا مال کر دیا ہے اور مصر کے لئے نیل دھن دولت ہے لیکن بے چارا شام ان دونوں نعمتوں سے محروم ہے، اور ان کے بدلے میں اسے اگر ملا ہے تو نصف درجن اسلامی فرقے اور تقریباً نصف درجن ہی عیسائی فرقے جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ اور ان میں پائدار اتحاد ہونا کافی محنت طلب ہے۔

شام کو کچھ تو فرانس نے ان سترہ برسوں میں لوٹا ہے، اور رہا سہا قومی تحریک کے خونریز ہنگاموں کی نذر ہوا۔ لبنان کا صوبہ سرسبز ہے، لیکن فرانس نے اُسے علیحدہ جمہوریت بنا دیا ہے۔

شامیوں کے سر پر فرانس کا یہ بھی بڑا احسان ہے کہ اس نے ازراہِ کرم باقی تین جمہوریتوں کو شام کے ساتھ ملحق کردیا ہے۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ شام ذرا سا تو ملک ہے لیکن فرانس نے اس کو چار پانچ جمہوریتوں میں تقسیم کردیا، نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کو یک جا کر کے شامی ملت کا بنانا قوم پرستوں کے لئے مشکل ہوگیا ہے۔ ذاتی کدورتیں مذہبی عناد کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور شیعہ اور سنی، اور مسلمان اور عیسائی کی دشمنی ملی شیرازہ کو منتشر کردیتی ہے۔

شامی قوم پرستوں کی راہ بڑی کٹھن ہے، عربی سربلندی کا جنون اور قومی عزت کا غرور اگرچہ مصیبتوں میں ہراسان نہیں ہونے دیتا لیکن اجڑے ہوئے باغ کو نئے سرے سے ہرا بھرا کرنا بڑی محنت اور قربانی چاہتا ہے۔ شامی محنت میں تو مشہور ہیں ہی اب رہنماؤں کے ایثار اور جذبہ ملی کا امتحان ہے۔

عراق

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بکر صدقی نے عراق میں فوجی انقلاب کردیا، وزرا سہم گئے، جس کے جہاں سینگ سمائے چھپ کر جان بچانے گیا۔ سلیمان حکمت نئی وزارت کے صدر بنے، بکر صدقی فوجی آدمی تھا، زبان اور قلم کی بجائے بندوق اور پستول سے کام لیا، مخالفین موت کے گھاٹ اترے اور پھر کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ رہی۔ بکر صدقی کا رجحان ترکوں کی طرف زیادہ تھا اور وہ اتحادِ عرب تحریک کا زیادہ حامی نہ تھا۔ بظاہر حالات نئی وزارت کے لئے سازگار نظر آتے تھے، اور ہر طرف امن تھا لیکن یکبارگی یہ اطلاع ملی کہ ۱۱ اگست کو موصل کے ہوائی اسٹیشن میں بکر صدقی ایک سپاہی کی گولی کا نشانہ بنا۔ پانچ دن بعد سلیمان حکمت کی وزارت بھی ٹوٹ گئی اور جمیل المدفعی وزیر اعظم ہوئے، ابھی حال میں پارلیمنٹ کے نئے انتخابات ہوئے، جن میں حکومت کے حامیوں کی جیت ہوئی، عراق کا مشہور مدبر یٰسین نوری اور جمیل المدفعی میں اتحاد ہوگیا ہے۔ اور اب یہی اعتدال پسند گروہ کافی عرصے تک برسرِ اقتدار رہے گا۔

فلسطین کے ہنگامہ سے عراقی رائے عامہ بہت متاثر ہے، اور برطانی حکمت عملی کے خلاف نہایت سخت احتجاج کیا جارہا ہے، گذشتہ ستمبر دمشق کے قریب بلودان کے مقام پر عرب رہنماؤں کا

ایک اجتماع ہوا جس کے صدر عراق کے ہی ایک سابق وزیراعظم تھے۔ اس اجتماع میں عرب ملکوں کے چار سو نمائندے شریک ہوئے، فلسطین کا معاملہ زیر غور تھا، کانفرنس نے برطانیہ کی عرب دشمن پالیسی کی مذمت کی، اور برطانوی سیاست دانوں کو تنبیہ کر دیا کہ وہ فلسطین میں عربوں پر مظالم توڑ کر مشرق قریب کے ممالک میں اپنے وقار کو ختم کر رہے ہیں۔

عراق کے شیعہ اور سنی وطن پروری کی رو میں آپس کے جھگڑے اور پرانے کینہ بھول رہے ہیں اب نہ شیعوں کا غلو سنیوں کے خلاف باقی ہے اور نہ سنی اپنے بھائیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مفاد وطن نے سب کو بھائی بھائی بنا دیا ہے، سب عرب ہیں اور عراقی۔ اس لئے آپس میں بغض وحسد کیوں ہو۔ عراق میں مزدور تحریک کا بھی چرچا ہے اور اشتراکی خیالات بھی عام ہیں۔ لیکن یہ تحریک ابھی انقلابی نہیں ہوئی

ترکی

جنگ حبش کے دوران میں ترکی حکومت نے برطانیہ کی ہمنوائی کی تھی اور اٹلی کے خلاف اقتصادی قیود عائد کرنے میں ترکی بھی شریک ہوا تھا۔ گذشتہ سال درہ دانیال کو مسلح کرنے کا حق بھی اس نے یورپی سلطنتوں سے منوالیا اور اس سال سنجق اسکندرونہ کا جھگڑا بھی ترکی کے حسب منشا طے ہو گیا۔

سنجق اسکندرونہ کی جنگی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ترک اس کو نہ فرانس کے ہاتھ میں چھوڑ سکتا ہے اور نہ اس پر شام کا قبضہ ہی برداشت کر سکتا ہے، اس علاقہ کا رقبہ ۴ ہزار کیلومیٹر ہے اور کل آبادی میں سے جو تقریباً ۱۸۶۰۰۰ ہے ترک ۸۵۰۰۰ سے زیادہ نہیں یہاں پر حلب، استنبول اور بغداد سے آنے والی ریلوے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور آگے چل کر ایران کو باہر کی دنیا سے تجارت کرنے کے لئے بھی اس بندرگاہ سے کام لینا پڑے گا۔ سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۶ء کے معاہدوں میں ترک اس علاقے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ لیکن فرانس نے یہ منظور کر لیا تھا کہ اسکندرونہ کے ترکوں کو تمدنی آزادی حاصل ہو گی، اور جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں کا تمام نظم ونسق ان ہی کا ہو گا۔ اب سنہ ۳۶ء میں شام سے فرانسیسی حکم برداری ختم کرنے کی تجویز ہوئی تو ترکی نے اسکندرونہ کے معاملے کو اٹھایا۔ ترکی کا کہنا یہ ہے کہ

شام کے ماتحت اسکندرونہ کے ترکوں کا تمدن اور ملکی نظم ونسق میں ان کی آزادی باقی نہ رہ سکے گی۔ اُن کا مطالبہ تھا یہ ہے۔

(۱) سنجق اسکندرونہ کو خود اختیاری حکومت دی جائے۔ (۲) اسے غیر مسلح رہنے دیا جائے (۳) علاقے کی سرکاری زبان ترکی ہو (۴) لبنان اور شام کی طرح اس کی آزادی تسلیم کرلی جائے اور ان تینوں کی ایک فیڈریشن بن جائے۔

سنہ ۳۶ء کے آخر میں یہ جھگڑا شروع ہوا، ابتدا میں تو فرانس نے ترکوں کی بات سُنی اَن سُنی کردی اس پر ترکی رائے عامہ میں جوش پیدا ہو۔ مصطفےٰ کمال جھلاکر انگورہ سے جنوب کو قونیہ کیطرف روانہ ہوگئے اسی شہر میں وزرار بھی پہنچ گئے اور باہم صلح ومشورے کے بعد مصطفےٰ کمال تو واپس انگورہ چلے گئے لیکن حکومت نے فرانس کو یہ جتلادیا کہ اسکندرونہ کے معاملے میں ترک خاموش نہیں رہیں گے، اسی اثنا میں ترکی وزیر خارجہ اٹلی پہنچے اور اطالوی وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ فرانس ڈرا کہ کہیں ترکی اٹلی کا ساتھی نہ بن جائے۔ آخر اسکندرونہ کے لئے وہ ترکوں سے کیوں بگاڑتا۔ مقدمہ جمعیت اقوام کے روبرو پیش ہوا، اور ترکی مطالبات قبول کرلئے۔

اسکندرونہ کھوکر شام بھلا کیسے چپ رہ سکتا تھا، وہاں بڑے زور کا ہنگامہ شروع ہے اور ترکوں کے خلاف عربوں کا غصہ بے قابو ہو رہا ہے۔ خود اسکندرونہ کی سنجق میں عرب اور ترک باہم گتھم گتھا ہو رہے ہیں اور ارمنی جو کافی تعداد میں وہاں موجود ہیں۔ عربوں کے حامی ہیں، اسکندرونہ کے جھگڑے نے "عرب ترک دشمنی" کی آگ بھڑکادی ہے اور اگر صلح صفائی کی کوشش نہ کی گئی تو دونوں قوموں کا بگاڑ ہر دو کے لئے بُرا ہوگا۔

بحر روم کا شرقی حصہ ترکی مقبوضات سے ملا ہوا ہے۔ اس میں جزیرہ قبرص تو برطانیہ دبائے بیٹھا ہے اور روڈس پر اٹلی قابض ہے اب اگر اسکندرونہ کا ساحلی علاقہ ترکی اثر سے باہر رہتا تو جس طرح درہ دانیال کے غیر مسلح ہونے سے ترکی کے یورپی اور ایشیائی صوبوں کی حفاظت مشکل ہوگئی تھی، اسی طرح اناطولیہ بھی دشمنوں کے رحم وکرم پر ہوتا،

ترک کو دنیا اب تک سپاہی کی حیثیت سے جانتی ہے اور صدیوں سے اسے لڑنے کے سوا اور کام بھی کوئی نہیں رہا۔ لیکن اب ترک تلوار اور بندوق کی بجائے ہل اور مشین چاہتا ہے۔ اناطولیہ کے بنجر علاقوں کو آباد کرنے میں بھی ترکوں کو بڑی مدت چاہیئے اور اگر انھیں اپنی جان کی حفاظت میں لڑنا نہ پڑا تو وہ ایک سو سال تک اپنے ملک کی اصلاح و ترقی میں اتنے مصروف رہ سکتے ہیں کہ انھیں اردگرد کے ملکوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وقت اُن کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے اور اناطولیہ کے میدان اسی قدر اور انسانوں کو نان و نفقہ دے سکتے ہیں۔ ان حالات میں ترکی کی خارجی حکمت عملی سوائے صلح و دوستی کے اور کیا ہو سکتی ہے۔

ترکوں کی خارجی سیاست کے یہ تین اہم پہلو ہیں۔ اول روس سے اتحاد لیکن اس طرح نہ کہ ترکی اس کا دلیو بن کر رہ جائے اور خود روس کو بھی ترکوں کی دوستی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے اسے اپنے مغربی علاقوں کی طرف سے اطمینان ہے۔ برطانیہ سے دوستی، اور تیسرے بلقان کی ریاستوں اور وسط ایشیا کے اسلامی ملکوں سے دوستانہ تعلقات، چنانچہ اس سال ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کا معاہدہ اس بات کی دلیل ہے کہ ترکی ان ملکوں کی دوستی سے نہ صرف برطانیہ اور روس کی نظروں میں اپنی ساکھ بنا سکتا ہے بلکہ اسے اس کی وجہ سے بلقان میں خاص منزلت حاصل ہو جاتی ہے۔ ترکی امن خواہ ملکوں کی صف میں ہے اور اگر پھر کبھی عالم گیر جنگ کے شعلے بھڑکے تو ترکی غیر جانب دار رہنے کی پوری کوشش کرے گا۔

ترک گو امن خواہ سہی لیکن وہ کیل کانٹے سے بھی لیس ہو رہے ہیں۔ اس سال کے بجٹ میں ۵ ۷ لاکھ پونڈ فوجی مصرف میں منظور ہوئے اور ۵ ۴ لاکھ پونڈ بجٹ کے علاوہ اسلحہ کی تیاری کے لئے نکالے گئے۔

اکتوبر میں عصمت پاشا کی وزارت ختم ہوئی اور اُن کی جگہ جلال بیار وزیر اعظم بنے۔ وزیروں کے بدلنے سے ترکی کی داخلی اور خارجی حکمت عملی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ترکوں کا ایک نصب العین ہے اور مصطفےٰ کمال سے لیکر معمولی سپاہی تک ہر ایک اسی نصب العین تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے ملک کے

اندر اصلاح و ترقی چاہتے ہیں، اور باہر عزت اور امن

فلسطین برطانی شاہی کمیشن کے فیصلے نے فلسطین میں ایک آگ لگادی ہے۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ نہ انگریز کی جان محفوظ ہے اور نہ یہودی امن میں ہے۔ انتہا پسند نوجوان اپنے اعتدال پسند بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔

یوں تو جنوری ہی سے اکے دُکے قتل کی وارداتیں ہورہی ہیں اور کئی ایک عرب جو یا تو پولیس کے افسر اور سپاہی تھے یا دولت مند تاجر اور زمیندار اپنے انتہا پسند نوجوانوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ لیکن ستمبر میں جوں ہی جمعیت اقوام کی مجلس حکمبرداری کے فیصلہ کی خبریں جینوا سے القدس پہنچیں۔ دہشت پسند میدان میں آگئے۔ ۲۶ ستمبر کو شمالی فلسطین کے ضلع گلیلو کا انگریزی ڈپٹی کمشنر اور اس کا محافظ مار دئے گئے۔ اس پر حکومت اپنے پورے جلال میں آگئی عرب مجلس اعلیٰ توڑ دی گئی اور اس کے رہنما قید ہوئے، مفتی برخاست اور سینکڑوں شبہ میں گرفتار برطانی ہائی کمشنر مستعفی ہوگئے، اور سرچارلس جو بنگال کے دہشت پسندوں کو دبانے میں کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں پولیس کے افسر اعلیٰ بنادئے گئے۔ اب برطانی فوج اور پولیس کا راج ہے۔ راستے بند۔ سڑکوں پر پہرے اور دہشت پسندوں سے معرکے گرم ہیں۔ مار دھاڑ شروع ہے اور بظاہر حالات سدھرنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی

اتحاد عرب، اتحاد شرق اسلامی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، عربی اسلامی دنیا اور غیر عربی اسلامی دنیا۔ عربی اسلامی دنیا میں اتحاد عرب کا بڑا زور ہے۔ اس تحریک کی ابتدا فرانس اور برطانیہ کی شہ سے ہوئی تھی۔ جنگ عظیم میں اس کے نام سے عرب ترکوں کے خلاف اُٹھے۔ اور اب "ریاستہائے متحدہ عربیہ" کا تخیل ہر نوجوان عرب کا نصب العین بن گیا ہے

مغربی سامراج نے عربوں کو ابھی اتنی فرصت نہیں لینے دی کہ وہ "ریاستہائے متحدہ عربیہ" کی تصویر میں رنگ بھر پائیں۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ اتحاد عرب کے حامیوں کا جوش و خروش کہیں آزاد مشرقی ممالک کی سیاست کا توازن نہ بگاڑ دے، شامی اس تحریک کے علمبردار ہیں اور ان کی ترکوں سے دشمنی قومی ورثہ بن گئی ہے۔ سنجق اسکندرونہ کے واقعہ نے اس دشمنی کو اور محکم کردیا ہے۔ اور اگر

آپس کے بغض و حسد کا یہی حال رہا تو اتحادِ عرب تحریک کا ترک دشمن ہونا یقینی ہو جائے گا۔

عراق اتحادِ عرب کا مؤید ضرور ہے لیکن شامیوں کی طرح اتنا پرجوش نہیں۔ بکر صدقی اور سلیمان حکمت تو اس کو محض ایک بے معنی ہائے وہو سے تعبیر کرتے تھے اور کہتے ہیں کہ اسی بے حسی کی بنا پر بکر صدقی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یمن اور جزیرہ عرب میں تو رائے عامہ ہے ہی نہیں، بادشاہوں نے جو کہہ دیا وہی ملک کی آواز سمجھی گئی البتہ فلسطین میں یہ تحریک پورے شباب پر ہے۔ طلبہ کے جلسے ہوں یا گانے کی محفل، علماء کی مجلس ہو یا ادباء کی کانفرنس، اتحادِ عرب کی تان ہر جگہ چھیڑی جاتی ہے، اور یہی نعرہ ہے جو ہر شخص کو بھاتا ہے۔

مصر زبان و ادب میں اتحاد کا حامی اور سیاست میں اس سے بے تعلق ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کافی عرصے تک سیاسی اتحادِ عرب کا قدردان نہیں بنے گا، ہاں ٹیونس، الجزائر اور مراکش میں اس تحریک کو پورا غلبہ حاصل ہے۔

ترک اپنے پڑوس میں اس قسم کی تحریک کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ ریاستہائے متحدہ عربیہ کا مخالف کون ہو سکتا ہے لیکن شامی عرب جس نہج پر یہ تحریک چلا رہے ہیں اس کا بار آور ہونا ترکوں کے لئے مشکلات پیدا کر دے گا۔ اب ترک اس جوڑ توڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ اتحادِ عرب کی تحریک کی قیادت شامی عربوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ گذشتہ برس عراق کے فوجی انقلاب میں ترک دوست نوجوانوں کا بڑا ہاتھ تھا جو شامیوں کے اقتدار کے خلاف ہیں۔ اور عراق کو شام کی قسمت سے وابستہ کر کے اپنے آپ کو شامی لیڈروں کا خوشہ چیں بنانا نہیں چاہتے۔ بکر صدقی اور سلیمان حکمت اتحاد شرق کے حامی تھے اور جذباتی تحریک کے مقابلے میں وہ ٹھوس مفاد کے لئے باہم اتحاد کو ناگزیر سمجھتے تھے، افغانستان، عراق، ایران اور افغانستان کا دوستانہ معاہدہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ایران اور عراق میں ایک عرصے سے سرحد کے معاملات پر جھگڑا چل رہا تھا، اور آپس کے تعلقات بہت حد تک خراب ہو چکے تھے۔ ترکی بیچ میں پڑا۔ اور معاملہ بخیر و خوبی طے ہو گیا، اس کے بعد پیمان اسدآباد ہوا جس میں ان چاروں سلطنتوں نے آپس میں مل جل کر رہنے کا عہد کیا۔

تحریک اتحاد عرب کا جوش و خروش ترکوں کو عربوں سے دور رکھے گا۔ ضرورت ہے کہ جذبات کی بجائے ٹھوس حقائق پر سیاسیات کی عمارت اُٹھائی جائے۔ مشرق قریب میں امن و امان کا قیام اور ان ملکوں کا بھلا صرف اس میں ہے کہ عرب اور ترک صلح و آشتی کو اپنا دستور بنائیں۔ پُرانے مردے تو دفن ہو ہی چکے ان کو اکھیڑنا اپنی زندگی کو تلخ بنانا ہے۔ عربوں اور ترکوں کی دوستی دونوں کو سرافراز اور عزت مند کر سکتی ہے اور دونوں کی لڑائی میں نہ اسلام کا فائدہ ہے اور نہ مشرق کی بھلائی

اتحاد عرب اور اتحاد شرق کی تحریک کا صحیح امتزاج ہی اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو روشن کر سکتا ہے ورنہ اگر اتحادِ عرب والوں کا بس چلا تو وہ ابوجہل اور ابولہب کو بجائیں گے اور اس کی ضد میں ترکوں کو ہلاکو اور چنگیز کو سراہنا تو یقینی ہو جائے گا وطن پرستی اور قوم پرستی کا یہ انجام نہ اسلام کے لئے اچھا ہوگا اور نہ انسانیت اس سے آرام پائے گی۔

سیاسیاتِ عالم پر چند مفید کتابیں

رسالہ جامعہ میں سیاستِ خارجہ پر جو نوٹ نکلتے ہیں ان میں ناظرین کی دلچسپی کا اندازہ ہمیں اُن خطوط سے ہوتا ہے جو دفتر کو وصول ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر صاحبان مزید مطالعے کے لئے کتابیں دریافت کرتے ہیں ان خطوں کا جواب تو انفرادی طور پر دے دیا جاتا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سالانہ تبصرے کے ساتھ مختلف اہم مسائل سے متعلق کچھ کتابوں کے نام درج کر دیے جائیں جو زیادہ تر اسی سال شائع ہوئی ہیں۔

چین اور جاپان کے متعلق ذیل کی کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا :۔

China at the Crossreads. By Peng-Chun Chang

ایک چینی عالم کی اس کتاب سے چینی قوم کی دشواریاں اور آرزوئیں سامنے آتی ہیں اور اس مہیب ڈراما پر جو آج اس مہذب ملک کی سرزمین پر کھیلا جا رہا ہے ایک اداس سی روشنی ڈالتی ہیں۔

The Political Thoughts of Sun yat Son. By Paul Linebarger

مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ چینی قومی تحریک کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ مصنف ایک زمانے میں چینی قائد سن یات سن کا مشیرِ قانونی تھا۔ اُن کے بنیادی اصولوں کی اچھی تشریح اس کتاب سے ہوتی ہے۔

The North China Problem. By Shuhsi-hsu.

یہ کتاب نانکنگ کی جمعیتہ امور بین الملل نے شنگھائی سے شائع کی ہے۔ چین اور جاپان کے تعلقات سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحے۔ چینی نقطۂ نظر کو خوبی اور وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ صرف شمالی چین کے مقامی مسائل پیش نظر ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ چین جاپان کی موجودہ کشاکش کے مختلف پہلو اس سے واضح ہوتے ہیں۔

Far East in Ferment By Gunther Stein.

مطبوعہ لندن۔ واقعاتِ موجودہ کا پس منظر سمجھنے کے لئے کارآمد کتاب ہے

Japanese Trade & Industry: Present and Future. (Compiled by Mitsubishi Economic Research Bureau Pub. New York)

جاپان کی معاشی حالت اور ترقی کے متعلق صحیح معلومات کا نہایت کارآمد ذخیرہ ہے۔ معتبر اعداد و شمار یک جا جمع کر دئے گئے ہیں۔ ۶۶۳ صفحے

Population Pressure and Economic Life in Japan.

By Ryoichi Ishii.

مطبوعہ لندن حجم ۲۵۹ صفحات۔ قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنس

جاپان کے سامراجی اقدام کو سمجھنے کے لئے اس کے مسئلہ آبادی کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس پر متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتاب اچھی ہے اور مسئلہ کے اکثر پہلوؤں پر اس سے مفید روشنی پڑتی ہے۔

Japan's Feet of Clay. By Freda Utley.

جاپانی فوجی کامیابیوں کے سیلاب میں تنقیدی نظر اکثر ملک کی اندرونی کمزوریوں پر نہیں پڑتی

اخباروں کی جزوی تفصیلات کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ توازن ذہنی کے لئے مفید ہے۔ یہ کتاب جاپانی ہیئت معاشی و سیاسی کی بہت سی بنیادی کمزوریوں کو ظاہر کرتی ہے۔ بڑی تفصیل سے معلومات فراہم کرکے مصنف نے بتایا ہے کہ عجب نہیں جاپانی اقتدار کا بلبلا جلد ٹوٹ جائے۔

برطانوی سلطنت کے متعلق ذیل کی دو کتابیں اچھی ہیں :۔

The British Empire:

A Report by a Study Group of Members of the Royal Institute of International Affairs

مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ حجم ۳۶۶ صفحات۔ قیمت ۱۵ شلنگ۔

برطانوی سلطنت کی ساخت، اس کے مختلف اراکین کے دستور اساسی، اور سلطنت کے مسائل پر نہایت جامع تبصرہ ہے۔ ایک حصہ میں مختلف اجزاء سلطنت کی کیفیت اور اُن کے دستور اساسی سے بحث کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں اُن اجزاء کے باہمی تعلقات اور اس سے متعلق دستور اور آئین کا ذکر ہے، تیسرے حصہ میں اس تعلق سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان پر بحث ہے۔ نوآبادیات کے مسئلہ پر جس نے جرمن مطالبہ کی وجہ سے خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے ایک مفید باب شامل ہے۔

برطانوی سلطنت کی ساخت اور اس کے مخصوص مسائل کے متعلق ایک اور مفید کتاب ایک جرمن مصنف کی بھی انگریزی میں ترجمہ ہوکر شائع ہوئی۔ جس سے انگریزوں کی قومی سیرت اور ان کی سیاسی جبلت پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اور اس وجہ سے مختلف مسائل کے فہم میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ کتاب ہے :۔

The British Empire: Its Structure and its Problems.

By Johannes Stoye

مطبوعہ لندن - حجم ۴۴۴ صفحات - قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنس

یورپ کی سیاست میں روس کے اندرونی اختلافات کے متعلق بہت کچھ نکلتا رہا ہے۔ مگر بعض سابق انقلابیوں کے خلاف مقدمہ کی کارروائی سے بہت سی وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو معمولاً سامنے نہیں آتیں - یہ کارروائی چھپ گئی ہے۔ حکومتِ وقت کے خلاف لیون ٹروٹسکی سے زیادہ اور کوئی کیا لکھ سکتا ہے۔ اس لئے روس کے اندرونی حالات کے سمجھنے کے لئے ذیل کی کتابیں مناسب ہوں گی:-

The Revolution Betrayed. By Leon Trotsky.

ترجمہ مطبوعہ لندن ، حجم ۳۱۲ صفحات ، قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنس -

اس کتاب میں ایک بے پناہ مناظر نے اپنے سیاسی مخالفوں کے کام اور ان کی نیت کو بے نقاب کیا ہے۔ لیکن غالباً تعصب اور مبالغہ کے ساتھ۔ بہرحال روس میں اس وقت جس اندرونی سیاسی تضاد کے مظاہر روز سامنے آتے ہیں اُن کے سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

Report of Court Proceedings in the Case of the Anti-Soviet Trotskyite Centre

روس کے محکمہ عدالت نے ماسکو میں اور بعد کو (**Collet's Bookshop.**) نے لندن میں شائع کی۔ اس عدالتی کارروائی کی لفظ بہ لفظ روئداد درج ہے - بہت مفصل اور اکثر باریک گوشوں پر روشنی ڈالنے والی - یہ کتاب ۵۸۰ صفحے کی کتاب ہے ، اور قیمت ہے صرف ۲ شلنگ ۶ پنس - اس کا ایک خلاصہ **The Moscow Trial** کے نام سے **Anglo-Russian Parliamentary Committee.** نے ایک شلنگ کی قیمت پر بھی شائع کیا ہے۔

مغربی سیاست کے دوسرے مسائل پر کتابوں کی کثرت معلوم۔ ذیل کی کتابوں کا مطالعہ بہت سے مسائل کے فہم میں مدد دے گا۔

The Colonial Problem:

A Report by a Study Group of Members of the Royal Institute of International Affairs.

مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس صفحات ۴۴۸، قیمت ۱۲ شلنگ۔

نوآبادیوں کے مسئلہ کے سمجھنے کے لئے تقریباً تمام ضروری معلومات اس مفید کتاب میں یکجا مل سکتی ہے۔ ضروری مسائل پر حاوی ہے اور صحیح معلومات کا ذخیرہ ہے۔

The Dangerous Sea: The Mediterranean and its Future.

By George Solocombe.

مطبوعہ لندن۔ حجم ۳۰۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنیں۔

بحیرہ روم پر پچھلے دنوں ساری دنیا کی نگاہیں لگی رہی ہیں۔ یہاں کی قوتوں میں ایک نیا توازن رونما ہو رہا ہے، اور جب تک وہ قائم نہ ہو جائے حالت ڈانوا ڈول ہے۔ اس کتاب میں بحیرہ روم کی ساحلی قوتوں کے اسلحہ، ان کے مقاصد، اور ان کی تدابیر کی ایک اچھی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ سیاسی اور فوجی تاریخ کا ایک خاکہ بھی اس میں مل جاتا ہے۔

جرمنی اور اٹلی کے تعلقات کے سلسلہ میں دراصل وسطی یورپ کے معاشی اور سیاسی مسائل کے سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لئے ایک جرمن کتاب کا ترجمہ انگریزی میں لندن سے شائع ہوا ہے جو کارآمد ہے یعنی:۔

Central Europe and the Western World. By G. Schacher

حجم ۲۴۴ صفحات، قیمت ۱۰ شلنگ۔

یورپ کے کئی ممالک میں خصوصاً جرمنی اور اسپین میں مذہب اور ریاست میں جو ٹکر ہو رہی ہے اس کے سمجھنے کے لئے ذیل کی کتابیں مفید ہیں۔

Religion and the European Mind. By Adolf Keller.

Church and State on the European Continent.

By Adolf Keller.

مطبوعہ لندن اور

Things that are Caesars: the Genesis of the German Church Conflict. By Paul Means.

مطبوعہ نیویارک۔

عام حوالہ کی کتابوں میں ایک امریکی کتاب بہت کارآمد ہے۔

The Political Handbook of the world, 1937.

(Council of Foreign Relations, New York.)

مختلف ممالک کی حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کی کیفیت اور اُن کے پروگرام تفصیل سے دیئے ہیں۔ مشہور اخبارات کے رجحانات بتائے ہیں۔ بین الاقوامی اداروں مثلاً جمعیتِ اقوام، عدالت عالمی، بین الاقوامی لیبر آفس، وغیرہ کے حالات شامل کئے ہیں۔ معلومات صحیح ہے اور مفید۔

مزدور

مولوی محمود علی خاں صاحب بی اے - بھوپال

دل ضبط سے معذور و زباں نطق سے مجبور
اس کشمکش و ضیق میں ہے بندۂ مزدور

نرمی کرے مزدور پہ کیوں خواجۂ بے رحم
کیوں موردِ الطاف ہو قاہر کا یہ مقہور

کب زندگیِ عیش کو سختی کا تصور
مغلوب پہ رحمت کرے کیوں فاتح و منصور

احساسِ مروت ہے، نہ احساس جفا ہے
سرمایہ پرستی نے کیا قلب کو مسحور

مزدور کو مشکل سے ملے سدِ رمق بھی
دولتکدۂ خواجہ ہو الوان سے معمور

فردوسِ زمیں منعمِ ناکارہ کا مسکن
آرام گہِ عیش و طرب جلوہ گہِ حور

مزدور کا گھر فاقہ و ذلت کا نشیمن
آرام سے، صحت سے، تنعم سے بہت دور

تقسیم غلط محنت و دولت کی سراسر
صدیوں کے مظالم سے حقیقت ہوئی مستور

شاعر نہیں، مزدور ہوں، مزدور کا ہمدرد
ہنگامۂ دل کرتا ہوں قرطاس پہ مسطور

نے عشق سے مطلب ہے، نہ الفت سے سروکار
نے ہجر سے مغموم ہوں، نے وصل سے مسرور

نے ناقہ و محمل سے، نہ لیلیٰ سے غرض ہے
نے داخلِ موضوعِ سخن "برقِ سرِ طور"

نے تیشۂ فرہاد، نہ شیریں سے ہے مطلب
مزدور کا حامی ہے فقط شاعرِ مزدور

زمینداروں کا ماضی اور حال

زمیندار کا لفظ آج کل کہ جمہوریت کا زمانہ ہے، ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک یا قوم میں مشکل ہی سے سنا جاتا ہوگا۔ انگلستان میں تو یقیناً ڈیوک، ارکوئس، ارل، اور کاؤنٹ کے الفاظ کم و بیش انھیں معنوں میں سننے میں آتے ہیں جن معنوں میں ہندوستان میں نواب، راجا، مہاراجا، بابو وغیرہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ دوسرے ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، روس، آسٹریا، اٹلی میں بھی ایک زمانہ تھا جب جاگیردار ہوتے تھے۔ اور انگلستان میں آج جو ڈیوک وغیرہ نظر آتے ہیں، وہ اسی زمانے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ بادشاہ کے جو بالکل مطلق العنان فرماں روا ہوتا تھا، دربار کی زینت ہوتے تھے۔ اور وقت پڑنے پر نقدی اور فوج سے اس کی امداد کرتے تھے۔

ہندوستان میں دستور تھا کہ بادشاہ اپنے بڑے بڑے عہدہ داروں کو تنخواہ کے بجائے جاگیریں دیتا تھا۔ جس کے بدلے وہ شاہی فرامین کے مطابق حکومت کا کام کرتے تھے۔ ان جاگیرداروں، صوبہ داروں، اور منصب داروں کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا تھا جو زمین کا مالک یا زمیندار کہلاتا ہو۔ زمین پر کام کرنے والے کسان براہِ راست بادشاہ یا جاگیردار کو مال گذاری دیتے تھے۔ یہ نظام کار مغلوں کے زمانے تک رہا۔ مگر جب مغلوں کو زوال ہوا اور طوائف الملوکی پھیلی تو جہاں کہیں جس کہ اقتدار ہوا، وہی ایک مخصوص خطۂ زمین کا مالک بن بیٹھا۔ یہ حالت تو موضوع سے بالکل الگ ہے۔ اس زمانے میں نہ کسان کو اطمینان نصیب تھا نہ مالک کو۔ مگر جب آہستہ آہستہ انگریزوں کی مقبوضات بڑھتی گئیں اور انھیں فوجداری کے ساتھ ساتھ مال کے محکموں کا انتظام بھی کرنا پڑا تو انھیں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ایک غیر ملک کے رہنے والے دیسی آدمیوں سے کسی طرح کا معاملہ آسانی سے نہیں کر سکتے تھے۔ کہیں اختلاف زبان۔ کہیں اختلاف معاشرت اور کہیں اختلاف مفاد مانع ہونے لگے۔ اس وقت انھوں نے سوچا کہ مال گذاری وصول کرنے کے لئے ہندوستانی ایجنٹ اور ٹھیکیدار مقرر کرنے چاہئیں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ اور

کامیاب رہے۔ یہ ٹھیکے اور کمپنیاں پہلے میعادی ہوتی تھیں اور کمپنی اپنا فائدہ دیکھ کر زیادہ بااثر اور کامیاب لوگوں کو ٹھیکے دیتی تھی۔ یہ ٹھیکے دار رعایا سے اتنا وصول کرتے تھے کہ سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے بعد کچھ بچ بھی رہے اس سلسلے میں یہ ٹھیکے دار مظالم بھی کرتے تھے۔ جس کے ثبوت انگریزی حکومت کی تاریخ کے ابتدائی اوراق میں بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ مگر پھر ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس کے ایک بندوبست کے ذریعے یہ نظام دوامی کر دیا گیا اس طرح کسان ہمیشہ کے لئے ان ٹھیکہ داروں کے قبضے میں آ گئے۔ اور زمین کی ملکیت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کا پرآشوب زمانہ ہندوستان سے انگریزوں کی قوت کھو چکا تھا۔ اور وہ اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے جہاں ہر جائز و ناجائز کوشش روا رکھتے تھے وہاں ہندوستانیوں کی خوشامدیں کر کے پناہ کے طالب بھی ہوتے تھے۔ اور جس نے انھیں پناہ دے دی اسے انھوں نے حسب وعدہ ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد زمینیں دلوائیں۔ تعلقہ داروں، زمینداروں کا ایک طبقہ اس طرح وجود میں آیا کہ بیٹھے بٹھائے زمین ہاتھ آ گئی۔ اور وہ اس کے مالک بن گئے۔

ہندوستان کے تعلقہ داروں، پٹے داروں، نوابوں اور زمینداروں کی تاریخ کا یہ مختصر سا جائزہ لینے سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ ان کا وجود ہندوستان کے اقتصادی نظام میں بالکل اتفاقی ہے انگریزوں کے اقتدار کے ابتدائی ایام میں ان کی حیثیت ٹھیکہ داروں سے زیادہ اور کچھ نہ تھی اور چونکہ کمپنی کو صرف مال گذاری سے کام تھا۔ اس لئے یہ لوگ آزاد ہو کر رعایا سے جیسا چاہتے تھے سلوک کرتے تھے پیداوار ہو یا نہ ہو، فصل خراب ہو جائے۔ قحط پڑے۔ اُن کی بلا سے۔ یہ اپنے مطالبات کسان کی ہڈی گلا کر وصول کرتے تھے۔ مال گذاری کے علاوہ ہر قسم کی رشوت جائز رکھتے تھے۔ زمینداروں میں نذرانہ، مالکانہ، آبیانہ، شادیانہ اور اسی قسم کے دوسرے اور جو مطالبات رائج ہیں، اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

ٹھیکہ داروں کے اس نظام میں آگے چل کر تبدیلی بھی ہوئی۔ بنگال، بہار اور صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع میں جہاں استمراری بندوبست ہو چکا تھا یہ نظام بدستور باقی رکھا گیا۔ مگر دوسرے صوبوں

مثلاً مدراس بمبئی اور یوپی وغیرہ میں تبدیلیاں ہوئیں۔ مدراس اور بمبئی میں تو رعیت واری بندوبست رائج کیا گیا جس سے رعایا کا تعلق براہِ راست سرکار سے ہوگیا۔ مگر یوپی کے محال واری بندوبست سے تعلقہ داریاں اور پٹے داروں کا وجود نہ صرف باقی رہ گیا بلکہ مستقل ہوگیا۔ بہار اور بنگال میں بندوبست استمراری کے سبب وہ علاقے جو ٹھیکہ داروں کے زیرِ نگرانی تھے۔ ہمیشہ کے لئے ٹھیکہ داروں کی ملک ہوگئے اور وہاں بھی مالک اور محروم کے دو ممتاز طبقے قائم ہوگئے۔

اس زمانے سے اس طبقے کے لوگوں کا کسانوں کے ساتھ آقا اور غلام کا تعلق چلا آتا ہے۔ حکومت عوام کی حالت بدلنے سے گھبراتی ہے۔ اس لئے زمیندار بھی خوب کھُل کھیلتے ہیں۔ اور حکام مال کی خوشنودی کے لئے جس طرح چاہتے ہیں مال گذاری کی آڑ میں اُن سے سلوک کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطری دنارتِ طبع سے مجبور رہے۔ وہ لوگ کم ہوتے ہیں ——— اور جو ہوتے ہیں، اُن کا درجہ عام سطح سے بہت بلند ہوتا ہے ——— جو تمام انسانوں کو ہر حیثیت سے ایک سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ایک ایسی فضا میں کہ غربت و افلاس کا تسلط ہو، جو لوگ کھاتے پیتے بھی ہیں۔ اپنی حالت کو غنیمت سمجھتے ہیں اور چونکہ برسوں کے مشاہدے سے سمجھ لیتے ہیں کہ زندگی کی جو عام سطح قائم ہوگئی ہے وہ نہیں بدل سکتی، اپنی حالت کو قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لئے قدرتاً وہ ایسی طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں جو مقتدر ہوتی ہے اور اپنی طرف سے اس طاقت میں اضافہ کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ یہ فعل بالکل فطری اور نفسیاتی تحریک سے ہوتا ہے۔ ارادے کو اس میں بہت کم دخل ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بحالتِ موجودہ زمینداروں کی بالکل یہی کیفیت ہے۔ طوائف الملوکی کا آشوب، پھر غیروں کا قبضہ، اس کے بعد بتدریج عوام کی پست حالی۔ یہ وقت کے وہ حقائق تھے جن کے پیشِ نظر انھیں اتفاقی طور پر جو حیثیت حاصل ہوگئی تھی اسے باقی رکھنے کے لئے انھوں نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا اور اب بھی دے رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی اور اقتصادی بیداری نے تو انھیں اور بھی آتش زیرِ پا کردیا ہے اور برطانوی اقتدار کے بقا ہی میں ان کی بقا بھی نظر آتی ہے۔

ہندوستان کی سیاسی بیداری اور سوراج کی تحریک میں زمینداروں نے ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیا۔ کچھ زمیندار تو ایسے ضرور ہیں جو نہایت خلوص اور صداقت سے اس قومی جنگ میں شریک ہیں، لیکن اُن کی حیثیت یا تو مستثنیات کی ہے یا پھر یہ لوگ چھوٹے زمینداروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو الفاظ کے لحاظ سے تو زمیندار ہیں مگر بلحاظ معنی کسانوں کے طبقے میں آتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار پٹنے کی زمیندار کانفرنس میں بالو مہیش پرشاد ایم ایل سی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا تھا۔ واضح رہے کہ بالو مہیش پرشاد بھی ایک بڑے زمیندار ہیں۔

"ملک کی آزادی کی جنگ میں زمینداروں نے ہمیشہ رکاوٹ ڈالی ہے۔ سول نافرمانی کی تحریک میں زمیندار جماعتی حیثیت سے اس سے الگ رہے۔ بڑے بڑے زمیندار جو جنتا کے فطری لیڈر رہتے ۔ لڑائی سے الگ تھلگ رہے۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں نے یہ دیکھ کر کانگریس میں پناہ لی اور یہ سمجھا کہ اُن کے حقوق کی وہی محافظ ہے۔"

جب تک سوراج کی تحریک صرف تحریک تھی۔ اس وقت تک زمینداروں نے نہ صرف یہ کہ اس تحریک کی مخالفت کی بلکہ حکومت کی پہنچ سے باہر جو علاقے تھے وہاں پیغام رسانی پکڑ دھکڑ اور اپنے مقدور بھر سزا اور گوشمالی زمینداروں ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ امن سبھائیں قائم کر کرکے کانگریس کے جلسوں کے مقابلے میں جلسے کرکے قوم کے لیڈروں کی ہجو اور سرکار برطانیہ کی قصیدہ خوانی کی جاتی تھی اور عوام کو کانگریس کی شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

اب جبکہ کانگریس کی کوشش اور قربانی سے نئے آئین کے ماتحت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں کچھ منصب پہنچ گئے تو زمینداروں کو بہت خطرہ ہوا اور انتخابات کے سلسلے میں انھوں نے رائے دینے والوں کو ہر ممکن طریقے سے پھسلانے کی کوشش کی ۔ ۔ ۔ کبھی دھمکی دی گئی کہ اگر کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دیا تو سارے کھیت بے دخل کرلئے جائیں گے۔ بقایا لگان میں گھر نیلام کرالیا جائے گا۔ مال گذاری بڑھا دی جائے گی۔ کھیتوں کا نذرانہ دینا پڑے گا کبھی امیدیں دی گئیں کہ فلاں راجہ صاحب کو فلاں نواب صاحب کو ووٹ دو اس لئے کہ تم لوگ ہمارے پالے پلتے ہو۔ ہماری زمین سے تمھارا خرچ چلتا ہے۔ اور یہ ہمارا کام ہے۔ باقاعدہ کارندے

اور غیر علاقوں میں گھوم گھوم کر کانگریس کے خلاف پرچار کرتے تھے۔ مگر ان تمام تدابیر کے باوجود جب کانگریس کی اکثریت منتخب ہو گئی تو مایوسی کے ساتھ ساتھ کھٹکا بھی ہوا۔ پہلے تو عارضی وزارتوں سے کسی قدر دل بندھے رہے لیکن آخر کار جب کانگریسی وزارت کے منصبوں پر آگئے اور انھوں نے اپنے پروگرام اور منشور کے مطابق کام شروع کیا تو چاروں طرف سے زمینداروں کے احتجاج کی آوازیں آرہی ہیں۔ جلسے ہو رہے ہیں۔ انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔ کانگریس کے جنیدوں کی یاد دلائی جارہی ہے اور ملک کی ذہنی نشو ونما میں اپنے طبقے کا حصہ اجاگر کیا جارہا ہے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہے۔

اس عرصے میں مجالس آئین ساز کی تقریروں کے علاوہ زمینداروں کے دو جلسے بڑے پیمانے پر منعقد ہو چکے ہیں ایک بہار کے زمینداروں کی کانفرنس پٹنے میں اور دوسری لکھنؤ میں۔ ان کانفرنس کی کارروائیوں میں موضوع بحث کانگریس کا رویہ اور عوام کی خدمت کا جذبہ رہا ہے۔ انھیں دو عنوانوں کے ماتحت جس سے جتنا بھی ہو سکا، کانگریس اور کانگریس کے انقلابی رجحان کی مذمت کی۔ کانگریس کو (Divide and Rule) کی منافقانہ پالیسی کا ملزم ٹھہرایا اور اس کے مقابل ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کا عزم صمیم کیا۔ دوسرے عنوان پر بھی خوب خوب داد خطابت دی گئی: زمینداروں نے ہمیشہ کسانوں کا بھلا چاہا ہے۔ ان کے مددگار و غم گسار رہے ہیں۔ کسان اور زمیندار دونوں ایک خاندان کے دو رکن ہیں زمیندار کسانوں کے قریبی اور حقیقی رہنما ہیں۔ اور جو لوگ انھیں انقلاب کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور زمینداروں کے خلاف بھڑکاتے ہیں وہ صرف اپنی سیاسی اغراض پوری کرنے کے لئے انھیں سپر بناتے ہیں اور

> "زمینداروں کو ان کے عمل کا جو خالص ہمدردانہ اور قومی تھا، کیا انعام ملا۔ اگر عوام کو خود غور کرنے کا موقع دیا جاتا تو وہ سمجھتے کہ ان کے لئے زمینداروں نے کیا کیا ہے، لیکن ان کے دماغ میں تو یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ جو کچھ انھیں ملا ہے، وہ کانگریس کی بدولت ملا ہے۔ حالانکہ مجالس آئین ساز میں اس زمانے میں اس کی کوئی آواز بھی نہ تھی۔"[۵]

---

[۵]:- راجہ صاحب جہانگیر آباد کا خطبہ صدارت

اس کے علاوہ ایک عنوان "زمینداروں کے وجود کی ناگزیری" بھی رہا ہے۔ اس پر بھی خوب سرحاصل بحثیں ہوئیں۔ "زمینداروں نے قومی تمدن و معاشرت ، زبان ، مذہب و اخلاق ، علم و فن ۔ تعلیم و اصلاح میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ خود کانگریس نے موجودہ اقتدار زمینداروں ہی کے بل بوتے پر حاصل کیا ہے۔ زمیندار موجودہ سماج کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

ان تقریروں اور دعووں میں اتفاق سے زمینداروں کی طرف سے اسی پہلو کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے زمینداری نظام کے مخالفین اپنے نظریے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں یعنی عوام اور زمینداروں کا تعلق۔

یہی پہلو واقعی غور کے قابل بھی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں جب سے زمینداروں کا وجود ثابت ہے اس وقت سے ہندوستان کو بہت سی منزلوں سے گذرنا پڑا ہے اس عرصے میں اس نے پستیاں بھی دیکھیں اور بلندیاں بھی ، لیکن غریب عوام کا افلاس سوا روز بروز بڑھنے کے گھٹتا نظر نہیں آتا۔ زمینداروں کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے کسانوں کی بہتری کے لئے اکثر اوقات نقصان تک برداشت کئے ہیں، بے بنیاد اور بے دلیل معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہوگا تو کسی خود غرضانہ مصلحت کی بنا پر ہوا ہوگا ۔جس میں خلوص کا شائبہ تک نہ تھا ، ورنہ ایمان اور دیانت داری سے جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے رائیگاں نہیں جاتا۔ اگر عوام کی بہتری کے لئے کوئی کام کیا گیا ہوتا تو آج وہ روٹی کے ٹکڑوں اور کپڑے کے چیتھڑوں کے محتاج نہ ہوتے۔

زمین دار اپنے وجود کی اہمیت ثابت کرنے کیلئے ایک دلیل ایسی لاتے ہیں جو واقعی اس قابل ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے ۔ وہ کہتے ہیں کہ زمینداروں ہی کے طبقے سے ہندوستان کی تہذیب قدیم کا نام باقی ہے۔ انھیں کے دم قدم کی بدولت تمدن و معاشرت، مذہب و اخلاق اور شعر و ادب کا چراغ روشن ہے ۔ انھوں نے اپنے روپئے سے اپنی محنت اور اپنے ایثار سے ایسے ادارے قائم کئے ہیں جنھیں آج تہذیب و تمدن اور مذہب کا محافظ کہنا چاہیئے ۔ جہاں تعلیم حکومت کے بخل کا شکار ہوئی وہاں زمینداروں نے تعلیم گاہیں قائم کیں۔

یہ دلیل واقعی معقول اور غور طلب ہے ۔ ہندوستان کا پرانا تمدن مغربی تمدن کے سیلاب

میں اپنی وقعت کبھی کا کھو چکا تھا اگر اس باب میں زمینداروں نے اس کی سرپرستی نہ کی ہوتی۔ یہی حال تعلیم کا بھی ہے۔ زمینداروں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور گو اپنی تعلیم کا استعمال غلط کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنی تعلیم سے ملک کی ذہنی خدمات بھی انجام دی ہیں اور ان خیالات میں اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی ذات سے ہندوستان کے عہدِ زریں کی یادگار قائم ہے تو وہ حق بجانب ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اس کا دوسرا رُخ اتنا ہی کریہہ اور ہولناک ہے جتنا یہ خوبصورت اور جاذبِ نگاہ ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ ان عوام پر مشتمل ہے جن کے لئے ملک کی غلامی کے بعد سے تمدن و معاشرت اور تعلیم اور تہذیب نقوشِ باطل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ انھیں اپنے پیٹ کی فکر ہی سے نجات نہیں ملتی تو وہ تمدن و معاشرت کی طرف کیا توجہ کریں گے۔ یہ چیزیں انسانی زندگی کا جوہر ضرور ہیں اور اُن کے بغیر انسان انسان نہیں کہلا سکتا۔ لیکن اُن کی نشوونما کے لئے ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اطمینانِ کلی شرط ہے۔ تاریخ کے تاریک ادوار اس جوہر سے کیوں خالی نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں رفع احتیاجات کی دھن میں زندگی کو مرصع اور خوش گوار تر بنانے کی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستان کا کسان تاریخ کے اس تابناک دور میں بھی اپنی زندگی سے تاریخ کے اسی تاریک عہد کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بقائے تمدن کے لئے زمیندار کی یہ کوشش جو اس کے وجود کی واحد وکیل ہے اگر کسانوں کے لئے بھی موجبِ برکات ہوتی اور اس سے وہ بھی برابر نہیں، تو ایک حد تک ہی سہی فیض یاب ہوتے تو یقیناً قابلِ تحسین تھی۔ مگر حالات یہ نہیں ہیں۔ تعلیم، تمدن اور مذہب کے بقا کے لئے جو کچھ بھی کیا گیا ہے اس سے کسان کو دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ان اداروں سے فیض یاب بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے اور روپیہ پیدا کرنے کے ذرائع۔ پیٹ کے علاوہ کسان جماعتی زندگی کا صرف ایک پہلو کسی قدر جانتا ہے اور اسے برتتا ہے۔ وہ چند مذہبی رسمیں ہیں جن کی صورتیں امتدادِ زمانہ نے مسخ کر دی ہیں۔ ان میں بھی موجودہ تعلیم و تمدن کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ یہ سینہ بہ سینہ اس زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ جب مذہب اور معاشرت کے ادارے قائم نہ تھے۔ بلکہ بے لوث اور مخلص مبلغین اپنے ذخیرۂ علم سے لوگوں کو فیض یاب کرتے تھے۔ غرض ہندوستان کے زمیندار اور سرمایہ دار جس طرح قوم کی دولت کے یکا و تنہا مالک ہیں، اسی طرح تمدن، معاشرت، تعلیم مذہب و

اخلاق اور علوم اجتماعی بھی انھیں کی ملک میں آگئے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ یہ لوگ موجودہ انقلابی فضا سے بچنے کے لئے اسی چیز کو سپر بھی بناتے ہیں۔ فائدہ خود اُٹھاتے ہیں۔ احسان ساری جماعت پر رکھتے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر کیا یہ خیال قائم کرنا کہ اس تہذیب و تمدن کی وجہ سے عوام کا نقصان چھوڑ کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے مبالغہ ہوگا؟ حالات کے اس تجزئے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل تہذیب و تمدن کی بقا کا سوال عوام کی بہتری کی کوشش میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ تہذیب و تمدن بجائے خود بری چیز نہیں لیکن ان کا استعمال اکثر برا ہوتا ہے۔ دنیا کی گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ صاحب ملک طبقے مذہب اور تہذیب و تمدن کو عوام کی طاقت کے مقابلے میں آڑ بنا کر مدتوں اپنے وجود کا تاریک پہلو چھپاتے رہے ہیں۔ ان "زریں اصول حیات" کو بالکل اسی طرح آج ہندوستان میں بھی برتا جارہا ہے۔ جب بھوکے عوام کروڑوں کی تعداد میں بھوک سے تڑپتے ہوتے ہیں تو زمینداروں اور پونجی پتیوں کا طبقہ تہذیب و تمدن کے راگ الاپ الاپ کر درد آشنا دلوں کو محو خواب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

زمینداروں نے اپنے احتجاجی جلسوں میں اپنی تنظیم کے پہلو پر بہت کافی زور دیا ہے اور اس کا اہم ترین جزو چھوٹے زمینداروں کی جماعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بڑے زمینداروں نے چھوٹے زمینداروں کو بتایا ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ کانگریس کی پالیسی صرف بڑے زمینداروں ہی کے لئے مہلک ثابت ہوگی بلکہ وہ چھوٹے زمینداروں کی جڑ بھی کاٹ دے گی۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ کانگریس ان کو اپنی طرف ملا کر انھیں ان کی وسیع برادری سے الگ کرنا چاہتی ہے۔ اور اس طرح زمینداروں کے طبقے میں پھوٹ ڈالنا چاہتی ہے۔

چھوٹے زمینداروں کی حالت کسانوں سے کسی طرح بھی بہتر نہیں ہے اور نہ اُن کا مفاد کسانوں سے مختلف ہے۔ یہ طبقہ کانگریس کی جنگ میں کافی بڑی تعداد میں شریک ہوا تھا اور اس خیال سے شریک ہوا تھا کہ اس کے حقوق کی حفاظت کانگریس کے علاوہ اور کوئی جماعت نہیں کرسکتی۔ تناسب کے لحاظ سے وہ سب سے زیادہ یعنی ساڑھے بارہ لاکھ کی تعداد میں ہیں اور غربت و افلاس اور تعلقدار اور مہاجن کے ہاتھوں وہ بھی کسانوں کی طرح تنگ ہیں۔ بڑے زمیندار انھیں اپنی صحبتوں کے ناقابل

سمجھتے ہیں اور انھیں اپنے گھروں میں ملازم تک رکھتے ہیں غرض چھوٹے زمینداروں کا بڑے زمینداروں سے مفاد کے لحاظ سے میل ناممکن ہے یوں یہ دوسری بات ہے کہ یہ لوگ آیندہ اپنی تحریک میں والینٹیروں کی رسد کے لئے ہمدردی کرکے اُن کی تائید حاصل کرلیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ ہمدردی محض مصلحت اندیشی پر مبنی ہوگی۔ بہار کے زمینداروں نے کانگریس کے خلاف ستیاگرہ کی جو دھمکی دی ہے، وہ صرف اس اُمید پر کہ ستیاگرہ کے حربے کا استعمال چھوٹے زمیندار کانگریس میں رہ کر سیکھ چکے ہیں۔ اور وہ اُن کے ذریعے اپنی تحریک کامیابی سے چلاسکیں گے۔

(۲) کانگریس پر پھوٹ ڈالنے کا الزام تو یہ ایک غیر ذمہ دارانہ بیان ہے کانگریس گورنمنٹ نے مالگزاری کے متعلق یو۔پی میں جو احکامات صادر کئے ہیں ان کا صاف مقصد تھا کہ مالگزاری کی وصولی میں زمیندار کی مالی حالت کا لحاظ رکھا جائے۔ یعنی جن زمینداروں کے پاس واقعی روپیہ نہیں ہے۔ یا جن کے علاقوں میں بہت سالگان باقی ہے ان پر سختی نہ کی جائے۔ اس کے برخلاف سنہ ۱۹۳۳ء میں اُس وقت کی حکومت نے جو حکم صادر کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ دس ہزار یا اس سے زیادہ مال گذاری ادا کرنے والوں پر سختی نہ کی جائے۔ اس کھلی ہوئی تقسیم کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہا گیا اور جب یہ امتیاز اُٹھا دیا گیا۔ اور ہر زمیندار سے یکساں برتاؤ کرنے کی تدبیر نکالی گئی تو کہا جاتا ہے کہ کانگریس زمینداروں میں پھوٹ ڈالتی ہے۔

زمینداروں کا طبقہ مستقبل کی طبقہ وارانہ جنگ کے امکان سے بہت ہراساں ہے اور کانگریس کی تحریک پر یہ الزام ہے کہ اس کے ذریعے موجودہ برادرانہ نظام جماعت میں طبقہ وارانہ ذہنیت کی پرورش کی جارہی ہے اور ایک خاص طبقہ زمینداروں کے خلاف پیدا کیا جارہا ہے۔ لیکن جب اُن کے جلسوں اور صدارتی خطبوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو طبقہ آفرینی کا الزام الٹے انھیں کے سر لگتا ہے۔ کوئی تقریر یا بیان ان الفاظ سے خالی نہیں ہوتا کہ "زمینداروں کو متحد ہونا چاہئے" "ہمارا بحیثیت ایک مستقل جماعت کے یہ فرض ہے اور وہ فرض ہے" ان الفاظ سے طبقہ پروری ثابت ہوتی ہے یا بھائی چارا؟ اس کے فیصلے کے لئے ہم خود زمینداروں کے احساس سلیم کو دعوت دیتے ہیں لیکن اگر کانگریس طبقہ وارانہ کشمکش کی فضا نہ بھی پھیلائے اور خواہ زمیندار اس کے خلاف بڑی سے بڑی طاقت کیوں نہ استعمال

کریں، جس وقت تک سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے یہ کش مکش جلد یا بدیر وجود پذیر ہوگی اس لئے کہ دنیا نے اپنا رنگ بہت کچھ بدل دیا ہے۔ ہندوستان پر حالانکہ ابھی وہ رنگ غالب نہیں آیا ہے لیکن وہ اس کا اثر ضرور محسوس کرنے لگا ہے۔

ہندوستانی بینکار

(از محمد احمد سبزواری بی اے (عثمانیہ)

ہندوستانی بینکار[1] سے مراد وہ فرد یا جماعت ہے جو قرضے دینے کے علاوہ امانتیں رکھتی ہو یا ہنڈیوں کا کاروبار کرتی ہو یا دونوں قسم کے کام انجام دیتی ہو۔ اس تعریف میں ملک کے تمام غیر منظم دیسی ادارے یا وہ سیٹھ، ساہوکار، صراف، بنئے، مہاجن، ملتانی، مارواڑی، اور چیٹی آجاتے ہیں جو اس قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔ "ساہوکار" سے مراد وہ شخص ہے جو صرف قرضے دیتا ہے مگر دوسرے کاروبار نہیں کرتا۔

مرکزی بینکاری تحقیقاتی کمیٹی کی اکثریت نے اپنی رپورٹ کے صفحہ ۷۳ پر ہندوستانی بینکاروں میں سوائے امپیریل بینک کے دوسرے تمام اداروں مثلاً مبادلہ بینک، مشترک سرمایہ دار بینک، انجمن ہائے امداد باہمی، اور وہ افراد یا جماعتیں جو امانتیں رکھتی اور ہنڈیوں کا کاروبار کرتی ہیں، کو شامل کیا ہے۔ مگر ساہوکار کی تعریف میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی ہے۔

کمیٹی نے ہندوستانی بینکاروں اور ساہوکاروں میں یہ فرق بتایا ہے کہ اول الذکر بینکاری کی ابتدائی خدمات انجام دیتے ہیں۔ یہ تجارت اور صنعت کے لئے زیادہ قرض دیتے ہیں، ساہوکار کا قرض عموماً "صرف" کے لئے ہوتا ہے، بسا اوقات اس کے خلاف بھی ہوتا ہے، مگر مجموعی حیثیت سے ان دونوں طبقوں کے سرمایہ کا کثیر حصہ ان ہی دو مختلف مدوں میں نظر آتا ہے، بینکار اور ساہوکار دونوں بلاضمانت اور باضمانت قرض دیتے ہیں، مگر بینکار بلاضمانت رقم کم دیتے ہیں۔ بینکار قرض حاصل کرنے والے کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہیں مگر ساہوکاروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بینکاروں کے موکل واقف کار اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اسو جہ سے اپنا قرضہ وقت پر واپس کر دیتے ہیں اسی وجہ سے ان کی شرح سود ۶ سے ۹ فیصدی یا انتہائی حد ۱۲ فیصدی ہوتی ہے، مگر ساہوکاروں کے موکل ان پڑھ اور ناواقف لوگ ہوتے ہیں۔ قرضہ کی ادائی کا کوئی

---

[1] "ہندوستانی بینکار" میں نے انڈجینس بینکرس کا ترجمہ کیا ہے۔

خیال نہیں رکھتے۔ پھران کو قرض دینے میں مختلف قسم کے خطرات کا سامنا بھی ہوتا ہے اسی وجہ سے شرح سود بھی ۹ فیصد سے ۱۸ فیصد تک ہوتی ہے، ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کے باوجود ہندوستانی بینکار اور ساہوکار میں فرق کرنا بہت مشکل ہے، چنانچہ مسٹر عطا راللہ اپنی انگریزی کتاب "پنجاب میں امداد باہمی کی تحریک" میں صفحہ ۵۳ پر لکھتے ہیں کہ "ہندوستانی بینکار اور ساہوکار میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، ان دونوں میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے اگر ساہوکار اپنے پیشے کے علاوہ تجارت کرتا ہے تو بینکار بھی ایسا ہی کرتا ہے، امتیازی صورت صرف یہی باقی رہ جاتی ہے کہ ساہوکار کے یہاں بینکاری بالکل ابتدائی درجہ میں ہوتی ہے اور بینکار کے یہاں اس کی صورت بہت کچھ منظم ہوجاتی ہے۔"

ایل، سی جین نے اپنی کتاب "ہندوستان میں اندجینس بینکنگ" میں اسی مسئلہ سے بحث کی ہے کہ جب ہندوستانی بینکار قرض دینے کے علاوہ امانتیں رکھتے ہیں، درشنی اور عندالطلب ہنڈیوں کو قبول کرتے اور خریدتے اور ان پر قرض دیتے ہیں تو پھران میں اور مغربی ممالک کے منظم بینکوں میں کیا فرق ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے پہلا فرق یہ بتایا ہے کہ ہندوستانی بینکاروں کے پاس، امانتوں کی تعداد کل کاروباری سرمایہ کے لحاظ سے بہت کم ہوتی ہے، مگر منظم بینکوں کا دارومدار امانتوں پر ہی ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ منظم بینک نقد رقم کی شکل میں روپیہ ادا نہیں کرتے بلکہ رقم کی ادائی چیک کی صورت میں ہوتی ہے، مگر ہندوستانی بینکار رقمیں بصورت نقد ادا کرتے ہیں، اگرچہ بعض بینکار چیک اور پاس بک رکھتے ہیں۔ مگر ان کا چلن صرف مقامی علاقہ تک محدود ہوتا ہے تیسرا فرق یہ ہے کہ ہندوستانی بینکار روپیہ کے لین دین کے علاوہ دوسرے کاروبار بھی کرتے ہیں مگر منظم بینک صرف روپیہ کا لین دین کرتے ہیں اگرچہ ابتدائی دور میں ان کا کاروبار بھی محدود نہ تھا مگر اب انہوں نے اپنا دائرۂ عمل محدود کر لیا ہے۔

ہندوستان میں بینکاری کی تاریخ

ہندوستان میں بینکاری کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی اس کی کوئی صحیح تاریخ تو موجود نہیں مگر قدیم جریدوں اور مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ طریقہ ویدوں کے زمانہ (۲ ہزار تا ۱۴۰۰ قبل مسیح) سے رائج ہے، ایم۔ ایل ٹینان نے لکھا ہے کہ "غالباً ہندوستان ہی دنیا میں ایک ایسا ملک ہے جسکی دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بینکاری

کے متعلق معلومات بہت قدیم ہیں"۔ ٹیلرنے تاریخ ہند میں قدیم ہندوستانی بینکاری کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "منو کے قوانین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں آج سے ۳ ہزار برس پہلے علم بینکاری کس قدر ترقی کرچکا تھا۔ بینکارز رکے تغیرات کو اچھی طرح سمجھتے تھے یہ لوگ بہی کھاتے، حساب کھاتے اور روزنامچے رکھتے تھے۔ یہ مفرد اور مرکب دونوں قسم کا سود لیتے تھے، تجارتی مال واسباب کا بیمہ کرتے تھے ہنڈیاں کاٹتے تھے۔ مختصر یہ کہ موجودہ زمانہ کے تمام کاروبار کم وبیش انجام دیتے تھے"۔

منو اور وشنو کی کتابوں میں ابتدائی مسیحی صدیوں کی بینکاری کا ذکر موجود ہے چھٹی صدی سے سولہویں صدی تک بینکاری کا کوئی مکمل خاکہ موجود نہیں۔ البتہ جینوں کے ایک کتبہ سے جو کوہ آبو میں محفوظ ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ بارہویں صدی میں جینی بینکار بڑے مالدار ہوتے تھے، چودہویں صدی میں ملتانیوں کو اس کاروبار میں بڑا دخل تھا اور دہلی کی حکومت روپیہ کے معاملہ میں ان کی امداد حاصل کیا کرتی تھی، فیروز شاہ کے زمانہ میں سرسوتی کے بینکار حکومت کو قرض دیا کرتے تھے،

سترہویں صدی کے وسط میں فرانسیسی سیاح جے، بی، ٹیورنیئر نے یہاں کی بینکاری کے حالات کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر گاؤں میں ایک صراف ہوتا ہے جو روپیہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا ہے، امانتیں رکھتا ہے، اور تجارت خارجہ میں بڑی امداد پہنچاتا ہے۔ اس نے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ سورت پر مختلف مقامات مثلاً لاہور، سرونج، آگرہ، احمدآباد، برہان پور، ڈھاکہ، پٹنہ اور بنارس کیلئے ہنڈیاں کاٹی جاتی تھیں جنکی مدت ۲ ماہ کی ہوتی ہے۔ مگر شرح سود نہ صرف زیادہ تھی بلکہ ہر مقام کی شرح مختلف ہوتی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں راستہ میں مال کے چوری جانے یا ضائع ہوجانے کے خطرات بہت زیادہ تھے مغلوں کے زمانہ میں بینکاروں کی بڑی اہمیت تھی، اورنگ زیب نے ایک مشہور بینکار مانک چند کو "سیٹھ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کا بھانجا فتح چند بنگال کا مشہور ساہوکار گذرا ہے جسکا خطاب "جگت سیٹھ" تھا فرخ سیر اسکو اکثر خلعت بھیجا کرتا تھا۔ نوابان بنگال اور بنگال کے ساہوکاروں میں بڑے اچھے تعلقات تھے۔

سترہویں صدی میں جب انگریز یہاں آئے تو وہ یہاں کی زبان سے ناواقف تھے، پھر اصول بینکاری سے بھی نابلد اس وجہ سے انہوں نے اپنی ذاتی کوٹھیاں قائم کیں مگر ہندوستانی حساب اور زبان سیکھنے کے لیے

متعدد انعامات مقرر کیے، ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی براہ راست مالگذاری وصول نہ کرتی تھی بلکہ یہ کام بینکاروں کے سپرد تھا، وہ پندرہ یا بیس روز کی معیادی ہنڈیوں پر مالگذاری ادا کرتے تھے اور پھر کاشتکاروں سے رقمیں وصول کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اچھا نہیں کہا جا سکتا اور اس میں نہ صرف کاشتکاروں کو نقصان تھا بلکہ حکومت کا انحصار بھی بینکوں پر تھا، اس وجہ سے ۱۸۰۰ء میں اس طریقہ کو اڑا دیا گیا، اٹھارہویں صدی کے آخر میں ملک کی سیاسی حالت خراب ہو گئی، سیاسی بدنظمی کی وجہ سے ان کی لاکھوں کی رقمیں ڈوب گئیں، پھر نئی حکومت کے خزانے اور ان کی شاخوں نے اور مغربی ملکوں کے منظم بینکوں نے ان کے رہے سہے کاروبار کا بھی خاتمہ کر دیا۔

بینکاری کسی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مختلف ذاتیں مثلاً جینی مارواڑی ملتانی اور چیٹی ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ منظم "ناٹو کوتیا چیٹی" ہیں جنکی شاخیں ہندوستان کے باہر بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ منیم یا گماشتے ان کا کام کرتے ہیں اور ماہوار یا ہفتہ وار رپورٹ اپنے مالکوں کے پاس بھیجتے ہیں، ہندوستانی بینکار اکثر انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں، ان کی تعلیم گھر پر ہوتی ہے، جب لڑکا بارہ سال کا ہو جاتا ہے تو باپ کی دوکان پر بہ حیثیت ملازم کے کام کرنے لگتا ہے، شادی کے بعد گو وہ رہتا باپ کے ساتھ ہی ہے مگر اپنا کاروبار الگ شروع کر دیتا ہے، ان کی بعض ذاتوں میں روپیہ پیدا کرنے کا جذبہ اس قدر غالب ہے کہ ان کی عورتیں بھی سوت کات کر، ٹوکریاں بنا کر اور روپیہ کے لین دین سے روپیہ پیدا کرتی ہیں۔ ملک کے بعض حصوں میں ان کی انجمنیں بھی ہیں، مگر ان کا دستور بہت معمولی ہوتا ہے، ان کا سال ۱۵ کارتک بدی سے شروع ہوتا ہے جس وقت دیوالی منائی جاتی ہے اور اس رات "لچھمی" کی پوجا کی جاتی ہے،

صحیح اعداد نہیں معلوم ہو سکے کہ ملک میں ان کی تعداد کتنی ہے اور کسقدر سرمایہ کاروبار میں لگا ہوا ہے مگر زرعی مالیات، اندرونی تجارت اور چھوٹی صنعتوں میں زیادہ تر ان ہی کا سرمایہ ہے۔ ان کے کاروبار اور طریق کاروبار کی تشریح ذیل میں کی گئی ہے،

قرضہ ہندوستانی بینکار پرامیسری نوٹوں، رسیدوں، دستاویزات، گروی، رہن، رہن بالوفا، اقساط اور دوسرے طریقوں اور صورتوں میں قرض دیتا ہے، پرامیسری نوٹ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ قرض گیرندہ ایک

تحریر لکھ دیتا ہے کہ اس نے اتنی رقم قرض لی، اس میں شرح سود بھی درج ہوتی ہے، اس کاغذ پر ٹکٹ لگانا پڑتا ہے بعض اوقات پرامیسری نوٹ کے بجائے صرف رسید لکھ دی جاتی ہے، دستاویزات پر بھی قرض ملتا ہے ان پر ٹکٹ لگانا ضروری ہوتا ہے اور ان کو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے، دستاویز میں ساری باتیں مثلاً رقم قرضہ، شرح سود، مدت معینہ یا مدت معینہ کے اندر رقم روانہ کرنے کی صورت میں زیادہ شرح سود وغیرہ کا تفصیل سے ذکر ہوتا ہے، وسط سندھ میں "ٹکٹ بہی" کا زیادہ رواج ہے اس کی شکل موجودہ "پاس بک" سے ملتی جلتی ہے۔ اس پر ٹکٹ لگایا جاتا ہے اور قرض گیرندہ اپنے دستخط کرتا ہے، مگر اس میں شرح سود یا دوسری شرائط کا ذکر نہیں ہوتا اور یہ باتیں زبانی طے کی جاتی ہیں،

مکان اور زمین کو رہن رکھ کر بھی قرض حاصل کیا جاتا ہے، رہن کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو اشیائے رہن مرتہن کے قبضہ میں رہتی ہیں، مگر ایسی صورت میں ان کا کرایہ دینا پڑتا ہے اور یا بنیکار ان پر قبضہ ہوجاتا ہے۔ چاندی اور سونے کے زیورات اور برتنوں وغیرہ کی ضمانت پر بھی قرض ملتا ہے، سونے کی شکل میں اصلی قیمت کی نصف سے کچھ زائد اور چاندی کی شکل میں نصف کے مساوی رقم قرض مل جاتی ہے، بعض وقت اشیا رہن بالوفا کی صورت میں رہن رکھی جاتی ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر رقم مدت معینہ کے اندر ادا نہ کیگئی تو رہن شدہ شے بنیکار کی ملکیت ہوجاتی ہے

ماہوار یا روزانہ اقساط پر بھی قرض ملتا ہے، قرض لینے والا یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنا قرض قساط سے ادا کریگا۔ مگر اقساط کی تعداد ہمیشہ بڑھ جاتی ہے مثلاً ایک شخص نے ۱۰۰ روپیہ قرض لیئے وہ ان کو دس ماہ میں دس روپیہ کے حساب سے ادا کرسکتا ہے مگر اسکو ۱۲ ماہ تک قسطیں ادا کرنا ہوں گی۔ یہ طریقہ بڑا نفع بخش ہے مگر یہ صرف چھوٹے اور ادنیٰ طبقوں تک محدود ہے۔ قرض لینے کا ایک اور طریقہ "ہاتھ ادھار" کہلاتا ہے بغیر کسی دستاویز، تحریر یا گواہ کے رقم ادھار مل جاتی ہے، مگر اس قسم کی رقم صرف ان ہی افراد کو ملتی ہے جنکی ساکھ بہت عمدہ ہو، قرض لینے والے کو چاند، سورج یا اپنی اولاد کی قسم کھانا پڑتی ہے کہ وہ رقم ادا کرے گا اور تعجب ہے کہ ان قرضوں میں کبھی بے ایمانی نہیں ہوتی ممکن ہے اسکی وجہ یہ عقیدہ ہو کہ اگر قسم کی خلاف ورزی کی گئی تو مصیبت یا تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زرعی قرضوں میں بیج قرض لیا جاتا ہے اور فصل

پر اس کی سوائی، ڈیوڑھی یا دوگنی مقدار ادا کی جاتی ہے بعض وقت بٹائی ہوتی ہے اور بعض مرتبہ یہ وعدہ کرنا پڑتا ہے کہ اپنی پیداوار وہ بینکار کے ہاتھ ہی فروخت کرے گا معمولی بینکاروں کے پاس "چلت کھاتہ" کا چکر بھی نظر آتا ہے بات یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص نے کچھ رقم لی اور اصل وسود اقساط سے ادا کرنے کا وعدہ کیا مگر اصل رقم کبھی ادا نہیں ہوتی اور ہمیشہ سود یا رقم کا بہت ہی معمولی حصہ ادا ہوتا ہے یا مزید قرض لیکر رقم پھر پوری کر لی جاتی ہے ۔

امانتیں

اکثر لوگ اپنے زائد ذخیرے بینکاروں کے پاس امانت رکھواتے ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ ان کے پاس کتنی رقم اس میں جمع ہے، مگر ان امانتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، چالو کھاتوں اور معینہ امانتوں کی شرح میں اختلاف ہوتا ہے مثلاً آسام میں چالو رقموں پر ۴ سے ۹ فیصد اور معینہ رقموں پر ۶ سے ۷½ فیصد تک سود ادا کیا جاتا ہے۔ بمبئی میں گرم بازاری کے زمانے میں شرح سود ۴ سے ۶ فیصد اور سرد بازاری میں ۳ سے ۴ فیصد تک رہتی ہے بمبئی کے ملتانی بازار میں عندالطلب امانتوں کی شرح ۳ تا ۶ فیصد ہوتی ہے بنگال میں امانتوں پر ۹ سے ۱۲ روپیہ تک سود ملتا ہے، اجمیر اور دہلی کے بینکار یا تو امانتیں رکھتے ہی نہیں یا صرف اپنے رشتہ داروں اور ان افراد کی جن سے کافی تعلقات ہوں رقمیں بطور امانت رکھتے ہیں ۔

ہنڈیاں

ہندوستان میں ہنڈیوں کا رواج بہت قدیم زمانہ سے ہے، ہنڈیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک میعادی دوسرے درشنی یہ مختلف رقموں کی اور مختلف مدت کی ہوتی ہیں مگر کسی ہنڈی کی مدت ایک سال سے زائد نہیں ہوتی۔ ان پر ٹکٹ لگانا ضروری ہے، ملک میں ہنڈی کی "واپسی" کو بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے اور غالباً ابتدائی دور سے اب تک ایسی بہت کم مثالیں ملیں گی جب ہنڈیاں واپس ہوتی ہوں، جب کوئی ہنڈی لکھنے والا اپنی ہنڈی واپس کردے تو وہ دیوالیہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ بہرحال چونکہ اس میں خطرہ نسبتاً کم ہے، اس وجہ بینکار ہنڈیوں کا کاروبار خوب کرتے ہیں اور یہ ان کی آمدنی کا معقول ذریعہ ہیں۔

طریق حساب و کتاب

بینکاروں کے پاس حساب کی مختلف کتابیں ہوتی ہیں جن کو "بہی" کہا جاتا ہے مثلاً روکڑ بہی، نقل بہی، کھاتہ بہی، بیاج بہی اور روزنامچہ وغیرہ۔ کھاتہ بہی اور روزنامچہ کے اندر ایک صفحہ پر دین داریوں کا حساب درج ہوتا ہے اور دوسرے صفحہ پر لین داریوں کا روزانہ

شام کو میزان لگا کر معلوم ہو جاتا ہے کہ آج کتنا کاروبار ہوا بعض بینکار سود ہی یا بیاج ہی کے نام سے ایک الگ کتاب رکھتے ہیں جس میں صرف سود ہی کا حساب درج ہوتا ہے ہر بینکار کا کاروبار کے حساب رکھنے کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔ نہ صرف مختلف صوبوں یا شہروں میں بلکہ ایک ہی شہر کے بڑے بڑے بینکار اپنا حساب دوسروں کے طریقے سے الگ رکھتے ہیں۔ چنانچہ محققین نے بتایا ہے کہ صرف پنجاب میں ہی ۱۵ ہزار رقم کے مختلف حسابی طریقے رائج ہیں بعض بینکاروں کے خفیہ نشان اور علامتیں بھی ہوتی ہیں جو ان کے مخصوص طریقہ حساب میں مدد دیتی ہیں۔

شرحِ سود مختلف بینکاروں کی مختلف کاروباروں کے لیئے شرح سود مختلف ہوتی ہے، اگر قرض لینے والا صاحب اعتماد ہے تو شرح ۸ سے ۱۲ فیصد تک اور اگر معمولی شخص ہے تو ۱۲ اسے ½ ۳۷ فیصد تک ہو جاتی ہے جس کاروبار میں خطرات غیر معمولی ہوں وہاں ۵۰ سے ۱۰۰ فیصد تک سود لیا جاتا ہے۔ زیورات کی ضمانت پر جو رقم قرض لی جاتی ہے اس کی شرح ½ ۷ سے ۱۸ فیصد کے درمیان رہتی ہے، مگر عدالت کسی صورت میں ۹ فیصد سے زائد شرح کو تسلیم نہیں کرتی، ہنڈیوں کی شرح بھی بازاری حالات مقامی ضروریات اور گرم و سرد بازاری کے تحت بدلتی رہتی ہے، عموماً ان کی شرح ۶ سے ½ ۱۲ فیصد کے درمیان رہتی ہے،

مزید مطالبات اول تو ان کی شرح سود ہی زیادہ ہے، اس پر طرہ یہ کہ دیگر جائز اور ناجائز طریقوں سے مزید مطالبات کرتے ہیں جن میں چند حسب ذیل ہیں۔

دس روپیہ پر ۴ ریا ½ ۲ روپیہ سینکڑہ بطور "لکھائی" کے وصول کرتے ہیں، جب تک یہ رقم ادا نہ کیجائے رقم قرض نہیں مل سکتی، کانپور میں تو مزید ڈھائی روپیہ سینکڑہ "گنگاجی" کے نام سے بطور خیرات وصول کیئے جاتے ہیں، قرض لیتے وقت "دستوری" (دستور کے مطابق) اور "نذرانہ" وصول کرتے ہیں اور چونکہ زمانہ قدیم سے ان کا رواج چلا آ رہا ہے اس وجہ سے دینے والوں کو زیادہ ناگوار نہیں گذرتا۔ بنگال میں ۲۵ بلکہ بعض اوقات ۵۰ فی صد حصہ بطور دلالی وصول کر لیا جاتا ہے، بعض اوقات قرض لینے والا مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ بینکار کے بعض کام مفت کرے یا بعض اشیاء مثلاً چارہ، لکڑی، کوئلہ وغیرہ مفت پہنچائے۔ اگرچہ ان لوگوں کو تہوار کے موقع پر کچھ انعام اکرام بھی مل جاتا ہے۔ کبھی قرضدار بینکار کے یہاں کسی چیز مثلاً گھی یا دودھ کی "بندوڑ" باندھنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اسکو ان اشیاء کی قیمت نہیں ہی دیجاتی یا بہت کم دی جاتی ہے،

ان کے نقصانات

چونکہ ان کا اصل ذاتی ہوتا ہے اور یہ اپنا سرمایہ امانتوں سے حاصل نہیں کرتے اس وجہ سے قومی سرمایہ کو ان کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے، لوگوں کو روپیہ بطور امانت رکھنے کا شوق پیدا نہیں ہوتا اور سرمایہ بطور اندوختہ رکھنے کی عادت پڑ جاتی ہے. حالانکہ اگر یہ اس طرف توجہ کریں تو سرمایہ کی بڑی تعداد جمع ہو سکتی ہے کیونکہ منظم بینکوں کی شاخیں صرف شہروں اور بڑے قصبات میں ہیں، چھوٹے قصبات اور بڑے دیہات جن کی تعداد لاکھوں کے قریب ہے، وہاں سرمایہ فراہم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، دوسرا نقصان یہ ہے کہ یہ بینکار اپنے موکلوں سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اعلیٰ شرح سود، سود در سود مزید مطالبات اور دیگر طریقوں سے عوام کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں تیسرے یہ کہ ان کی وجہ سے ملک میں کوئی منظم "بازار زر" یا "بازار بٹہ" قائم ہونے کا امکان نہیں کیونکہ ان میں اور منظم بینکوں میں کوئی تعلق نہیں ہے. بینکوں کے اس انتشار کی وجہ سے بینکوں کے محفوظ ذخیرے چھوٹی چھوٹی مقداروں میں منقسم ہو گئے ہیں اور ملک کو "ذخیرہ واحد" کی عدم موجودگی کے تمام نقصانات برداشت کرنا پڑ رہے ہیں،

ان بینکاروں کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ ہوتا ہے، بعض جگہ امپیریل بینک یا دوسرے بینک بھی ان کو قرض دیتے ہیں مثلاً رنگون کے چیٹیاروں کو امپیریل بینک اور مبادلہ بینک اس شرط پر قرض دیتے ہیں کہ اگر وہ ضمانت میں گورنمنٹ کے تمسکات پیش کریں یا عندالطلب پرامیسری نوٹ لکھ دیں تو بینک ان کو اپنے حسابات سے زیادہ رقمیں لینے کی بھی اجازت دیتے ہیں، پنجاب میں امپیریل بینک ان کی ہنڈیوں پر اپنی مقررہ شرح سے نصف فیصد شرح پر بٹہ بھی کاٹتا ہے، مگر عام طور پر یہ لوگ منظم بینکوں سے بہت کم کاروبار کرتے ہیں،

یہ تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستانی بینکار عوام کا خون چوستے ہیں اور غریبوں اور حاجتمندوں سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کی زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو ان سے بڑی مدد مل رہی ہے، ہندوستان میں ۲½ ہزار بڑی آبادیاں ہیں اور صرف ۴۰۰ ایسی ہیں جہاں منظم بینک یا ان کی شاخیں ہیں، اس وجہ سے ان کا وجود ناگزیر معلوم ہوتا ہے چنانچہ

صوبجاتی کمپنیوں اور مرکزی بینکاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے ان کو منظم بینکوں اور بالخصوص ریزرو بینک سے تعلق قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔ ہندوستان میں سرمایہ مشترک کے بینکوں کی ارتقائی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ خواہش کرنا کہ ملک میں ان کی شاخیں اور زیادہ کھل جائیں گی محض ایک دل خوش کن خیال ہے اور نہ ہی انجمن ہائے امداد باہمی ان کی جگہ لے سکتی ہے، اس وجہ سے ملکی مفاد اور خود ان کے ذاتی مفاد کے تحت بہتر صورت یہی ہے کہ ان ہی سے منظم بینکوں کا کام لیا جائے اور ان کی قدیم حیثیت کو زندہ کیا جائے کمیٹی نے اس سلسلہ میں حسب ذیل سفارشات کی ہیں

پہلی سفارش یہ ہے کہ ان بینکوں کا تعلق ریزرو بینک سے ہونا چاہیئے، جو بینکار اپنا الحاق ریزرو بینک سے کرانا چاہتے ہوں ان کی ایک فہرست ریزرو بینک کے پاس رہے گی۔ اور بینک ان کو وہی تمام مراعات دے گا جو وہ سرمایہ مشترک کے بینکوں کو دیتا ہے، پہلے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ریزرو بینک کا رکن صرف بینکار ہو سکتا ہے، جسکا کاروبار تین لاکھ کا ہو۔ مگر اب یہ حد دو لاکھ مقرر کی گئی ہے،

ریزرو بینک کے قانون کی رو سے ہر رکن پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا کچھ فیصد ریزرو بینک میں محفوظ رکھے۔ مگر کمیٹی نے ان بینکاروں کی مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سفارش کی تھی کہ ان تمام بینکاروں کو جن کی امانتیں ان کے کل سرمایہ کے پانچ گنی حصے سے کم ہیں، پانچ سال کے لیئے اس قاعدے سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور بعد میں کسی معقول تجویز پر عمل کیا جائے،

کمیٹی کا خیال تھا کہ ان دونوں سفارشوں سے ان بینکوں کی ساکھ اور حیثیت میں اضافہ ہوگا اور ریزرو بینک یا دوسرے بڑے بینک اپنے ان ارکان سے چک یا ہنڈیاں جمع کرنے میں گماشتہ کا کام لے سکیں گے، کمیٹی نے ایک "آل انڈیا بینکرس ایسوسی ایشن" کے قیام کی بھی سفارش کی ہے۔ اس کے رکن نہ صرف ریزرو بینک کے ارکان ہو سکیں گے، بلکہ دوسرے چھوٹے چھوٹے بینکار بھی اس کے رکن بن کر اپنی ساکھ اور اعتماد میں اضافہ کر سکیں گے کمیٹی نے یہ بھی بتایا کہ ان بینکاروں کو اپنے حسابات صاف رکھنا چاہئیں اور سالانہ یا ششماہی حکومت کے مجوزہ تنقیح کنندوں سے اپنے حسابات کی تنقیح کرانا چاہیئے، نیز ریزرو بینک کو بھی یہ حق رہنا چاہیئے کہ وہ جب چاہیئے ان کے حسابات کی جانچ پڑتال کر سکے۔

اسی سلسلہ میں کمیٹی نے دوسری تجاویز بھی پیش کی تھیں مثلاً ان کو سرمایہ مشترک کے بینکوں میں

تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یا جرمنی کے "کومان دِت" (Kommandit)
بینکوں کے اصولوں پر بینکاری کرنے کی ہدایت کی جائے، یعنی بجائے اسکے کہ منظم بینک قصبات و
دیہات میں اپنی شاخیں کھولیں وہ ان ہی کو اپنی شاخیں تصوّر کریں، تیسرے یہ کہ ہندوستانی بینکاروں
کا ایک " امداد باہمی بینک" قائم کیا جائے، جو اپنے اراکین کی ہنڈیاں خریدے اور ان پر بٹہ کاٹے تاکہ
" دلالی" کا کام بڑے پیمانہ پر ہو سکے،

کمیٹی کی سفارشات پر نظر ڈالنے سے ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے بینکاروں کی حیثیت
اور اعتماد بڑھانے کے لئے تو مختلف قسم کی تجاویز پیش کردیں، مگر ایسی کوئی ترکیب پیش نہ کی جسکی وجہ
سے وہ اعلیٰ شرح سود، یا زائد مطالبات، یا موکلوں سے خدمات اور نذرانے وصول نہ کرسکیں۔
کمیٹی کو غالباً ان پر بڑا اعتماد تھا کیونکہ اس نے خود کہا ہے کہ ان مراعات کے معاوضہ میں جو ان کو
دی جارہی ہیں ان سے اقل ترین شرح سود کا تعین ضروری نہیں ہے، کمیٹی کا خیال تھا کہ جب دوسرے
ادارے ان کو کم شرح سود پر رقمیں فراہم کریں گے تو یہ بھی اپنے موکلوں سے کم شرح وصول کریں گے
مگر ہم کو اس خیال سے اتفاق نہیں۔ نیز میری ذاتی رائے ہے کہ جب ان کو مراعات دی جائیں
تو ان پر کچھ پابندیاں بھی عائد کرنا چاہئیں جو حسب ذیل ہو سکتی ہیں۔

(۱) شرح سود کا تعین ہونا چاہیئے جو کسی صورت میں ۸ فیصد سے زائد نہ ہو،

(۲) امانتوں کی شرح سود بھی کم ہونا چاہئے۔ کیونکہ جب یہ بینکار امانتوں پر ۹ سے ۱۲ فیصد
تک سود ادا کریں گے تو اگر اپنے موکلوں سے ۱۲ سے ۲۴ فیصد تک سود وصول کریں تو کیا بیجا ہے،
شرح سود میں کمی اسیوقت کی جاسکتی ہے جب امانتوں کی شرح بھی کم کردی جائے،

(۳) مزید مطالبات، خدمات اور نذرانے وغیرہ لینے کی سخت ممانعت کی جائے،

(۴) اس بات کی کوشش کی جائے کہ یہ غیر پیدا آور اغراض کے لئے کم سے کم قرض دیں۔
کیونکہ غیر پیدا آور قرضہ آمدنی پر ایک بار ہوتا ہے، اور اس کی ادائی ناممکن ہوتی ہے،

(۵) سب سے آخری اور سب سے اہم پابندی یہ ہونا چاہیئے کہ ان کو اس اصول کے تحت

کاروبار کرنے پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنا قرضہ اقساط سے واپس حاصل کر سکیں اور قسط کی رقم میں نہ صرف سود کی گنجائش رکھی جائے بلکہ اصل کی بھی کچھ تعداد ادا ہوتی رہے ظاہر ہے کہ ابتدا میں سود کی رقم زیادہ ہوگی مگر بعد میں سود کی رقم اور اصل کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی، اس طریقہ سے ان کو اور موکل دونوں کو فائدہ ہوگا۔ موکل کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ ایک مقررہ قسط سود سمجھ کر ادا کرتا رہے گا، مگر اسی قسط پر ایک مدت معینہ میں وہ اپنا پورا قرض ادا کر دے گا۔ بینکار کو یہ فائدہ ہوگا کہ آج کل اس کو سود ہی سود ملتا ہے اور بسا اوقات اصل سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، مگر اس طریقہ سے اس کو اصل مع سود کے وصول ہو جایا کرے گا۔ اور کاروبار کرنے کے زیادہ مواقع نکل آئیں گے اور ایک طویل مدت میں شرح سود کی تخفیف وسعت کاروبار سے پوری ہو جائے گی۔

بہرحال اگر ان تجاویز پر عمل کیا جائے تو بڑی آسانی سے منظم بینکاری کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے، اور ملک کی کاروباری زندگی کو خاطر خواہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

غزل

از حضرت جگرؔ مراد آبادی

وہ مست ہوں کہ الٹ دی حبِ آستیں میں نے
دکھا دئے حرم و دیر سب یہیں میں نے

مٹا کے دل سے ہر اک نقش دل نشیں میں نے
تجھے بھی دیکھ لیا پا لیا یہیں میں نے

بنایا عشق کو یوں حسن آفریں میں نے
تجلیاں رُخِ فطرت سے چھین لیں میں نے

چھپا کے دل میں غمِ اشک آفریں میں نے
بنا تو لی ہے ستاروں کی سرزمیں میں نے

کبھی یہ وہم کہ میں کیا ہوں میرا سجدہ ہی کیا
کبھی یہ فکر جھکا دی اگر جبیں میں نے!

تری نگاہ کے صدقے کہ پھر سے یاد آیا
بھلا دیا تھا جو اک درس اولیں میں نے

نہ عشق سے کوئی مطلب نہ حسن سے سروکار
کچھ اس طرح کی بھی گھڑیاں گذار دیں میں نے

الٰہی خیر کہ دیکھا ہے خواب میں دمِ صبح
شبابِ و حُسن کا ایک پیکرِ حزیں میں نے

مری یہ فطرتِ معصومِ عشق ارے توبہ
کسی نے بھی جو کہا کر لیا یقیں میں نے

مگر وہ تیری نگاہوں میں ہر وہ چھیڑ کہاں
ہزاروں دیکھ لئے یوں تو نکتہ چیں میں نے

تجھے خبر ہو جو ساقی تو مجھ پہ رشک کرے
الٹ لئے ہیں جو دریائے آتشیں میں نے

رفتارِ عالم

اسپین

یورپ کے سیاسی مطلع پر جنگ کی گھٹائیں گھِر گھِر کر آ رہی ہیں، اگر کہیں امید کی بجلی چمکتی بھی ہے تو اس کی چمک اندھیرے کی ایک نئی تہ جمانے کا کام کرتی ہے، قریباً دو مہینے ہوئے برطانوی وزیرِ اعظم نے میسولینی سے نامہ و پیام کی طرح ڈالی، خیال تھا کہ دونوں حریف صلح و صفائی سے آپس کے جھگڑے نمٹالیں گے، شاید حبش کے معاملہ میں برطانیہ جھک جانے اور بحیرہ روم میں میسولینی برطانیہ کے حقوق ماننے میں تامل نہ کرے، لیکن ابھی سلام دعا تک معاملہ پہنچا تھا کہ نیائن کانفرنس بلانے کی ضرورت پیش آ گئی (رسالہ جامعہ بابت اکتوبر) بس پھر کیا تھا سب کیا کرایا اکارت گیا، اور پہلے ہی دن دوستی میں کھنڈت پڑ گئی، نیائن کانفرنس کی وجہ سے میسولینی بھرے بیٹھے تھے کہ انھیں ہٹلر کا بلاوا آیا، جرمن میں ان کا بڑے معرکہ کا استقبال ہوا، دونوں ڈکٹیٹروں نے اپنے اونچے اونچے بولوں سے دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ روم اور برلن کی دوستی پکی ہو گئی ہے، اور دونوں کبھی بھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس ملاقات کے بعد میسولینی نے وطن پہنچتے ہی ایک طرف تو طرابلس میں فوجیں بھیجنا شروع کر دیں اور دوسری طرف فرانکو کو کھلم کھلا امداد دی۔ برطانیہ حبش اور بحیرہ روم کی وجہ سے اٹلی سے خفا تھا ہی، اب فرانس کو خدشہ ہوا کہ اگر اٹلی کا حلیف فرانکو اسپین کا مالک بن گیا اور اسپینی ساحل کے قریب کے جزیروں میجارکا اور منارکا پر اٹلی کا جھنڈا لہرانے لگا تو یورپ میں وہ جرمنی، اٹلی اور ان کے حلیف فرانکو کے نرغہ میں تینوں طرف سے گھر جائے گا، اور ان جزیروں کی وجہ سے اس کے لئے افریقی مقبوضات سے آمد و رفت جاری رکھنا بھی مشکل ہو گا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں فرانس عاجز اور بے بس ہو جائے گا۔

حالات کی نزاکت کا تقاضہ تھا کہ فرانس کے سیاسی حلقے تلملا اُٹھتے، اور اسپین کو اٹلی کے قبضہ میں جانے سے روکنے کے لئے برطانیہ سے تعاون کا مطالبہ ہوتا، چنانچہ عدم مداخلت کانفرنس کا شور پھر بلند ہوا، فرانس نے دھمکی دی کہ اگر اٹلی مداخلت سے باز نہ آیا تو وہ بھی اسپین کی حکومت کی مدد کرے گا' کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی. فرانس نے اپنے مطالبات پیش کئے. اٹلی اور جرمنی نے اُن کے ماننے سے انکار کیا، برطانیہ ثالث تھا، فرانس اسپین کی حکومت کی مدد پر تُلا ہوا تھا، برطانیہ نے اُسے روکا، اُدھر اٹلی اور جرمنی کو ہموار کیا آخر طے پایا کہ اسپین کی دونوں جماعتوں کی قانونی حیثیت تسلیم کر لی جائے' لیکن اس شرط پر کہ پہلے باہر کی فوجیں جو فریقین کی طرف سے اسپین میں لڑ رہی ہیں واپس بُلا لی جائیں، اب اس بات پر جھگڑا ہوا کہ واپسی کس طرح عمل میں آئے. قصہ کوتاہ دونوں جماعتوں کے نقطۂ نظر مختلف تھے، ایک کمیشن بھیجنے کی تجویز ہوئی، کمیشن تو جب جائے گا جائے گا، اب تو چین اور جاپان کی جنگ نے سب کو اُدھر متوجہ کر دیا ہے، فرانکو ہے کہ برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے، میڈرڈ پر سخت بم باری شروع ہے، اور اگر حالات ایسے ہی رہے، اور اٹلی کی مدد فرانکو کو برابر پہنچتی رہی تو اسپین کی اشتراکی حکومت کب تک مقابلہ کرے گی،

برطانیہ اور اسپین ناظرین کو تعجب ہوگا کہ برطانیہ نے اسپین کے معاملہ میں یہ انوکھا چلن کیوں اختیار کیا ہے، غیر جانب داری کا ڈھونگ رچا کر ایک طرف تو اس نے فرانس کو اسپینی حکومت کی مدد سے باز رکھا اور دوسری طرف اٹلی اور جرمنی کو کھلم کھلا فرانکو کی مدد کرنے کا موقعہ دیا، فرانس کی اشتراکی حکومت اور فرانسیسی جمہور اسپین میں مداخلت پر مصر تھے لیکن برطانیہ نے جرمنی کے حملہ سے ڈرا کر فرانس کو ایسا کرنے سے روکا، آخر اس سے برطانیہ کا مقصد کیا ہے. کیا وہ اسپین کو جنرل فرانکو کے سرپرستوں جرمنی اور اٹلی کے ہاتھ میں دینے میں راضی ہے، کیا جبل الطارق کے اردگرد ہٹلر اور میسولینی کی قوت برطانی سامراج کے لئے خطرناک نہیں، بحیرہ روم کی سیادت کی خاطر تو وہ اٹلی سے دست و گریباں ہے، کیا اسپین پر فرانکو کا قبضہ بحیرہ روم میں برطانی سیادت پر اثر انداز نہ ہوگا،

اس معمہ کو سمجھنے کے لئے یہ جان لیجئے کہ اسپین کے معاملہ میں برطانی سیاست دانوں کی دو جماعتیں ہیں۔ برطانیہ کے قدامت پسند سیاسیٔن کا گروہ فرانکو سے اتنا نا امید نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ فرانکو برطانی مفاد کا دشمن نہیں اور اسپین کا مالک بن کر وہ مسولینی کا پٹھو نہیں بنے گا، ان سیاسیٔن کا خیال ہے کہ برطانیہ کو فرانکو سے تعلقات قائم کر لینے چاہیئے، اور اس سے دوستی کر کے اُسے ہٹلر اور مسولینی کے اثر سے نکالنے کی سعی کرنا چاہیئے چنانچہ کچھ عرصہ ہوا برطانیہ کے غیر سرکاری سفیر فرانکو کے "دربار" میں پہنچ گئے ہیں اور اُدھر فرانکو نے اپنے نمائندے لندن بھیج دئے ہیں۔

بعض خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانکو اور اٹلی کے فوجی افسروں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہوگئی ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ فرانکو میڈرڈ لے کر اٹلی کے احسان کا جوا گردن سے اُتار پھینکے اور یورپ میں نئے دوست ڈھونڈ لے۔

برطانیہ کے سیاست دانوں کا تدبر شروع ہی سے غیر جانب داری کی اہمیت سمجھ رہا تھا انگریز جذبات کی رو میں کسی خاص سیاسی مسلک کی حمایت یا مخالفت کرنا نہیں جانتے، وہ واقعات کی روشنی میں اپنی راہ نکالتے ہیں، نہ اشتراکیت سے انھیں لگاؤ ہے اور نہ فاشستی قوت سے یارانہ۔ اسپین کی اشتراکی حکومت برطانیہ کے پہلو میں فرانکو کے کانٹے سے کم تکلیف دہ نہیں ہوسکتی تھی، لیکن فرانکو اگر برطانیہ دوستی کا عہد کر کے اسپین کی عنانِ حکومت کا مالک بن جائے تو برطانیہ کو اور کیا چاہیئے۔

ابھی ابھی برطانیہ نے پرتگال سے بھی نئے سرے سے دوستی گانٹھی ہے، اسپین کے معاملہ میں دونوں ملکوں میں کچھ بگاڑ ہو چلا تھا لیکن مصلحت وقت جذبات پر غالب آئی، اور پرتگال کے ساتھ برطانیہ کو دوستی کرنا ہی پڑی۔ یہ یاد رہے کہ پرتگال اسپین کی اشتراکی حکومت کا سخت مخالف اور فرانکو کا یار دمساز ہے، پرتگال اور برطانیہ کی اس نئی دوستی سے اسپین کے مستقبل اور فرانکو کے آئندہ طرزِ عمل کا پتہ لگ سکتا ہے۔

اٹلی۔ اٹلی نے جمعیت الاقوام کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ یوں تو حبش کی جنگ کے زمانہ

سے اٹلی جمعیت سے بے تعلق تھا لیکن اس ہفتہ اس نے رہے سہے رشتہ کو بھی توڑنے کا اعلان کر دیا، اب وہ لیگ سے کٹ کر جرمنی اور جاپان کے ساتھ جا شامل ہوا ہے، جمعیت اقوام سے اس وقت قطع تعلق کے اس کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ جرمنی، جاپان اور اٹلی کے اتحاد کو اور مضبوط کیا جائے، اور برطانیہ اور فرانس کے خلاف متحدہ محاذ کی ایک عملی صورت پیش کر دی جائے، اٹلی کے اس اقدام کو سمجھنے کے لئے پچھلے ایک ماہ کی سیاسی سرگرمیوں کا جاننا ضروری ہے

اٹلی اور برطانیہ کا بگاڑ حبش کے حملے سے شروع ہوا، حبش پر اٹلی کا قبضہ برطانی سامراج کو ذرا نہیں بھاتا، اس وقت فرانس نے میسولینی کی اس طرح مدد کی جس طرح آج برطانیہ فرانکو کی کر رہا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ حبش اٹلی نے ہتھیا لیا، انگریزوں نے اب تک اٹلی کے اس غاصبانہ قبضہ کو تسلیم نہیں کیا، میسولینی برطانیہ کی اس روش پر جلا ہوا ہے، پچھلے دنوں برطانی وزیر اعظم نے میسولینی کی طرف دوستی کا ہاتھ ضرور بڑھایا لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی، سچ یہ ہے کہ مسولینی انگریزوں سے ابھی صلح کرنا نہیں چاہتا وہ جانتا ہے کہ برطانیہ بین الاقوامی سیاست کی الجھنوں میں بری طرح گرفتار ہے، چین جاپان کی جنگ مشرق بعید میں برطانی مفاد کو ختم کر کے رہے گی، میسولینی کی گیدڑ بھبکیاں اس وقت محض بے کار نہیں ہیں، چنانچہ وہ ایک طرف روم اور برلن کے اتحاد کا راگ الاپتا ہے تو دوسری طرف جرمنی، جاپان، اور اٹلی کی دوستی کا اعلان کرتا ہے، اس کا خیال ہے وہ اس طرح برطانیہ کو دق کر کے حبش اور بحیرہ روم کے قضیہ میں اس سے اپنی من مانی شرطیں منوا سکتا ہے۔

اپنے ان منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے میسولینی نت نئی چالیں چلتا ہے، فرانس کے خلاف ٹیونس، الجزائر اور مراکش کے عربوں کو اکسایا جا رہا ہے، ادھر مصر کی سرحد پر ایک لاکھ کے قریب فوج اکٹھی کر رکھی ہے، ریڈیو کے ذریعہ عربی زبان میں بڑے زور شور سے پروپگنڈا شروع ہے، حبش پر قابض ہو کر وہ دریائے نیل کے ایک منبع کا بھی مالک بن گیا ہے، اسپین میں اٹلی کا اثر تو اپنا کام کر ہی رہا ہے، بہر حال میسولینی کے تمام مہروں کی زد اس وقت برطانیہ پر ہے، ظاہر ہے یا تو وہ جھلا کر لڑنے مرنے پر تل جائے گا یا میسولینی کی باتیں مانے گا، لڑائی کی آگ میں کودنا اس وقت

برطانیہ کو منظور نہیں اب صرف دوسرا ہی راستہ کھلا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میسولینی بھی برطانیہ سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتا، وہ جانتا ہے کہ اس بازی میں اول تو جیت مشکل ہے دوسرے حبش اور اسپین میں اپنی طاقت صرف کرکے نئی جنگ کی طرح ڈالنا ٹھیک نہیں، مگر دوسروں کی کمزوریوں سے اس وقت خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔

جرمنی فرانس کے سابق وزیر اعظم مشہور اشتراکی رہنما موسیو بلوم نے پچھلے دنوں ایک تقریر میں کہا کہ ضرورت ہے کہ برطانیہ، فرانس اور روس آپس میں ایکا کرلیں، پر برطانیہ اس معاملہ میں اب تک تذبذب میں ہے۔ فرانس کی رفاقت پر تو برطانیہ مجبور ہے لیکن روس سے اس کا اتحاد ابھی مشکل نظر آتا ہے، بات یہ ہے کہ برطانیہ کے قدامت پرست طبقے اشتراکی روس سے کچھ زیادہ خوش نہیں، اور دوسرے انھیں ہٹلر کی دوستی سے کلی ناامیدی بھی نہیں۔ ان کے خیال میں ہٹلر کی حکمت عملی اور برطانی مفاد میں تصادم کا بہت کم امکان ہے، ہٹلر بذات خود برطانیہ سے بگاڑ نہیں چاہتا۔ دے دے کے فریقین کے درمیان اگر کوئی جھگڑا ہے تو وہ نوآبادیات کا ہے جو جنگ عظیم میں جرمنی سے چھین لی گئی تھیں اور اس جھگڑے کا نمٹانا کچھ اتنا مشکل نہیں کہ خون خرابے کے بغیر نہ ہوسکتا ہو۔

یورپ کی فضا میں روم اور برلن کے اتحاد کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے، برطانیہ اس اتحاد کے خلوص کا زیادہ قائل نہیں، ۱۹۱۴ء میں بھی اٹلی جرمنی کا ساتھ دینے کا عہد کرچکا تھا لیکن عین وقت پر اپنا قول ہار گیا، اور فرانس اور برطانیہ کے ساتھ مل گیا، سیاسی دنیا کی دشمنیاں اور دوستیاں تو ڈھلتی چھاؤں ہیں۔ آج میسولینی ہٹلر کی دوستی پر نازاں ہے لیکن اگر جرمنی آسٹریا کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے تو میسولینی ہی سب سے پہلے ہٹلر کا گلا دبائے گا۔ کسی حکومت کو دوسری پر مطلق بھروسہ نہیں، آخر برطانیہ کیوں نہ روم اور برلن کی دوستی کو کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتا۔

کچھ عرصہ ہوا لارڈ ہیلی فیکس (سابق لارڈ اروِن) جرمنی گئے، جانے کے لئے بہانہ تو کچھ اور کیا لیکن مقصود ہٹلر، گوئرنگ اور دوسرے نازی لیڈروں سے ملنا تھا، چنانچہ آپس میں

ملاقاتیں ہوئیں، معاملہ تو سب کا سب پردہ راز میں ہے۔ برطانی پارلیمنٹ میں سوائے اس سرسری ذکر کے اور کوئی بحث نہیں ہوئی، البتہ کابینہ میں اس مسئلہ پر خوب گفتگو ہوئی، اس سلسلہ میں فرانس کے وزیراعظم اور وزیرخارجہ لندن بلائے گئے ان کی ملاقاتوں کے بعد صرف یہ معلوم ہوسکا کہ برطانیہ اور فرانس یک جان اور دو قالب ہیں، اور آئندہ دونوں پورے اتفاق سے ہر شاہراہ پر گامزن ہوں گے،

لارڈ ہیلی فیکس کی اس ملاقات کے بعد جرمنی میں نوآبادیات کا مسئلہ بڑے زور شور سے اٹھایا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نوآبادیات کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تیار ہے اگر جرمنی اسلحہ کو کم کرنے پر تیار ہو، اور جمعیت اقوام کی رکنیت قبول کرے، برطانیہ اور جرمنی کا معاملہ ابھی بیچ میں ہی تھا کہ اٹلی نے جمعیت اقوام سے علیحدگی کا اعلان کردیا اور اتحاد ثلاثہ کی تان چھیڑ کر بین الاقوامی سیاست کی فضا میں اور پیچیدگیاں پیدا کردیں،

فرانس، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، اسپین اور روس کی باہمی کھینچا تانی تو آپ نے ملاحظہ فرمائی لیکن مشرقی یورپ کی حکومتوں کا بھی براحال ہے، پولینڈ، چکوسلوویکیا، یگوسلاویا، رومانیا اور اسٹریا اور ہنگری کی حکومتوں کو اپنی اپنی فکر پڑی ہے، مثل مشہور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، اگر بڑی سلطنتوں میں چھڑ گئی تو ان چھوٹی حکومتوں کو لامحالہ کسی نہ کسی کا ساتھ دینا ہوگا، اب ہر حکومت اپنے حلیف ڈھونڈنے میں مصروف ہے، سیاست داں دارالخلافوں کے چکر کاٹ رہے ہیں، باہم نامہ وپیام کا سلسلہ شروع ہے، بہرحال عالمگیر جنگ کا خطرہ ہے کہ بھوت کی طرح یورپ والوں کے سروں پر سوار ہے۔

جنوبی امریکہ جنوبی امریکہ کی جمہوریتوں میں آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ برازیل میں فاشستی حکومت برسراقتدار آگئی، اور اس نے پہلا کام یہ کیا کہ باہر کے سرمایہ پر پابندیاں لگادیں، اندازہ ہے کہ ان پابندیوں کی وجہ سے برطانیہ کا کروڑوں روپیہ جو برازیل میں لگا ہے خطرہ میں پڑ گیا ہے، چین کی منڈی تو برطانیہ کے ہاتھ

سے جا رہی ہے، اب جنوبی امریکہ سے بھی برطانیہ کا اقتدار اٹھتا نظر آتا ہے۔

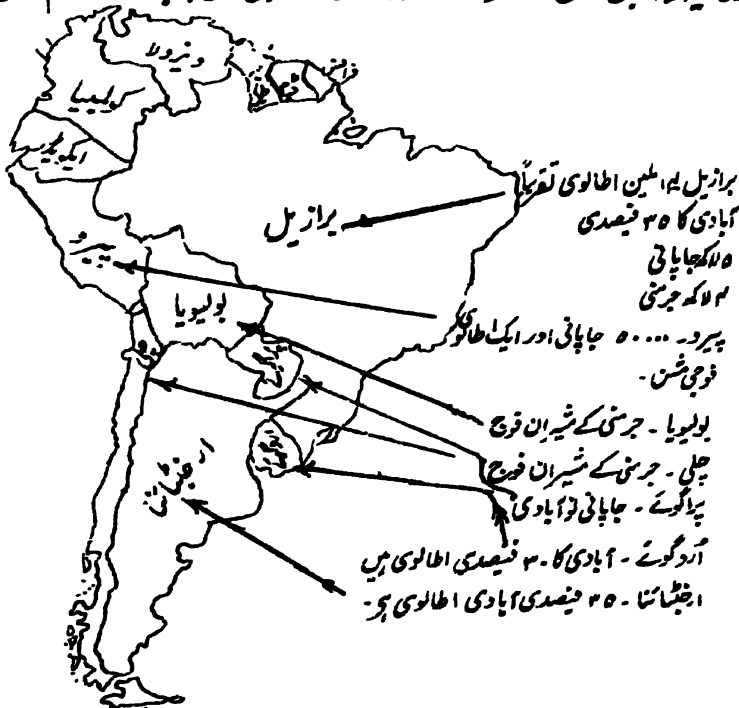
جنگ عظیم سے پہلے جنوبی امریکہ کی منڈیوں میں برطانیہ کے مقابلہ پر کوئی نہ تھا، ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ایک دفعہ برطانی مدبر لارڈ کینگ نے کہا تھا کہ اگر پرانا امریکہ ہمارے پاس نہیں رہا تو اس کی تلافی اب جنوبی امریکہ سے کرنی چاہیئے، چنانچہ برطانی سرمایہ نے جنوبی امریکہ کی تجارت سے خوب ہاتھ رنگے، اور لائڈ جارج کے قول کے مطابق تو جنگ عظیم میں برطانیہ کی جیت کا ایک سبب ارجن ٹائن کا گوشت اور اناج تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو اقتصادی سربلندی کا سہرا برطانیہ کے سر سے چھن چکا تھا، چنانچہ ریاست ہائے متحدہ کو اس وقت جنوبی امریکہ پر اپنا اقتصادی اقتدار جمانے کا اچھا موقع مل گیا، چنانچہ برطانیہ دوسرے درجہ پر آ گیا۔ اور امریکہ نے اس کی جگہ لے لی۔

جنوبی امریکہ میں خام اجناس کی بڑی کثرت ہے، پیٹرول میں بھی ریاست ہائے متحدہ کے بعد اس کا نمبر ہے ۱۹۳۰ء کی عالمگیر کساد بازاری نے جنوبی امریکہ کا اقتصادی توازن بھی بگاڑ دیا، ملک میں مزدوروں کی شورش اور سرمایہ داروں کی حرص نفع طلبی نے طبقہ واری جنگ کی نیو ڈالی بات بات پر دونوں میں کشاکش ہونے لگی، اس افراتفری میں باہر کی حکومتوں کو دخل دینے کا خوب موقع ملا، جمہوریتوں کے صدروں کے انتخاب میں حریف سلطنتیں اپنے اقتدار سے کام لینے لگیں، ہر حکومت اپنے نمائندہ کی پیٹھ ٹھونکتی، الغرض اجنبی سرمایہ نے جنوبی امریکہ کی ریاستوں کو سازشوں، غارتگریوں اور بغاوتوں کا میدان کارزار بنا دیا ہے۔ منظر مختلف ہیں، نام جدا جدا ہیں، مگر ساری دنیا میں ہر جگہ بس بات ایک ہی ہے۔ ایسا سخت تصادم ہے کہ انسانیت کی قسمت اس فیصلہ سے وابستہ معلوم ہوتی ہے۔

خام اجناس کی تلاش میں آج دنیا کی بڑی حکومتیں دیوانی ہو رہی ہیں، جنوبی امریکہ کی خانہ جنگی اور بدامنی جرمنی، جاپان اور اٹلی کے لئے جو خام اجناس کی بھوک میں دنیا کو کھانے پر تل گئے ہیں خداداد نعمت تھی، اب ان تینوں نے جنوبی امریکہ پر ہلہ بول دیا ہے، اشتراکیت کی جگہ فاشستی تحریک لے رہی ہے، ملکی سرمایہ دار فاشستی حکومتوں کی مدد سے مزدوروں کو بری طرح سے کچل

رہے ہیں - ارجن ٹائن میں برطانیہ کا سرمایہ سب سے زیادہ لگا ہوا ہے، اور جزائر برطانیہ کو اناج اور گوشت زیادہ تر اسی ملک سے جاتا ہے۔ یہاں کے اطالوی آبادکار میسولینی کے اثر میں آچکے ہیں۔ اور برطانی مفاد پر میسولینی کے زبردست پروپگنڈے کی سخت زد پڑ رہی ہے، برازیل میں "Heil Hitler" کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے ابھی حال میں برازیل اور جرمنی کا تجارتی معاہدہ ہوا، اس کا اثر یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کی تجارت گھٹ گئی اور جرمنی کو ان کا حصہ مل گیا، برازیل میں تقریباً ۵ لاکھ کے قریب جاپانی ہیں، اُن کا زور بھی اپنا رنگ لا رہا ہے، دوسرے جاپان کا سستا مال جنوبی امریکہ کی منڈیوں سے برطانیہ اور امریکہ کو نکال باہر کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔

اس وقت جنوبی امریکہ کی اکثر ریاستوں میں جرمنی، جاپان اور اٹلی کا پروپگنڈا بڑے زور شور سے ہو رہا ہے، اور موجودہ کسادبازاری اور مزدوروں کی شورش نے اس پروپگنڈے کے لئے فضا بھی سازگار پیدا کر رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے ہاتھ سے جنوبی امریکہ کی تجارت اور اس کی خام اجناس کا اجارہ آہستہ آہستہ نکل رہا ہے، اور اگر واقعات کی رفتار یہی رہی تو آئندہ جنگ میں برطانیہ کو ارجن ٹائن سے گوشت اور اناج کا ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ م۔س



مصر جیسا کہ ہمارا خیال تھا مصر کی سیاسی جماعتوں کے فضول جھگڑوں نے آخر ناگوار شکل اختیار کر لی، "قاہرہ" کی تازہ اطلاع ہے کہ سبز پوش جماعت کے ایک نوجوان نے وفد کے رہنما اور موجودہ وزیر اعظم نحاس پاشا پر پے در پے کئی گولیاں چلائیں، حسن اتفاق تھا کہ موصوف بال بال بچ گئے، اب تک تین سو کے قریب گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔

وفد کے حامیوں کے جوش کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اس حملہ کی خبر سن کر دستوری جماعت کے لیڈر محمد محمود پاشا کے مکان پر حملہ بول دیا اگر وقت پر پولیس نہ پہنچ جاتی تو بڑا خون خرابہ ہوتا، سبز پوش نوجوان کی اس حماقت سے اُن کے حریف خوب فائدہ اٹھائیں اور کچھ بعد نہیں کہ حالات اتنے نازک ہو جائیں کہ یا تو نحاس پاشا مختار مطلق بننے کی کوشش کریں یا وزارت سے الگ کر دئے جائیں۔

مصر میں نوجوانوں کا بے قابو ہو کر اس قسم کے سنگین سیاسی جرائم کر گزرنا کوئی نئی بات نہیں، آرام طلب اور رنگین مزاج مصریوں کی طبیعت کا یہ میل کچھ عجیب ہی ہے، نپولین کو مصر میں قیام کے عرصہ میں اس رجحان کا کافی تلخ تجربہ ہوا۔ انگریز بھی اس کی وجہ سے کبھی نچنت نہ بیٹھ سکے نوجوانوں کے اس جنون پر ایک دفعہ ایک انگریز مدبر نے کہا تھا کہ مصر میں ٹھنڈی ہوا کے نرم نرم جھونکوں کے ساتھ یکبارگی آندھیاں اور جھکڑ بھی آجاتے ہیں۔

"سبز پوش" تحریک ردّ عمل ہے تجربہ کار سیاسیئن کی بے عملی اور خود غرضی کا، ۱۹۳۴ء میں اس تحریک کی داغ بیل پڑی، سبز پوش نوجوان سیاسی مسلک میں انتہا پسند تو ہیں ہی لیکن اُن کے پیش نظر مذہبی اور اخلاقی اصلاح کا پروگرام بھی ہے، ان کا لیڈر احمد حسین ۱۹۳۳ء میں جامعہ مصریہ کا طالب علم تھا، زمانۂ تعلیم میں اُس نے طلبہ کی جماعت میں اپنا رسوخ پیدا کیا، اس نے دیکھا کہ ۱۹۲۰ء کے انتہا پسند رہنما وزارتوں کا مزہ چکھ کر اعتدال کی طرف مائل ہیں، سعد زغلول مرحوم کے وقت کے سیاسی تصورات فرسودہ ہو چکے ہیں۔ احمد حسین نے نوجوانوں کے سامنے ایک نئے مصر کی تصویر کھینچی، اُس کی پُر اثر تقریروں نے طلبہ کے اُن جذبات کو اُبھارا جو صدیوں سے اُن کے آبا وَاجداد کے دلوں میں پرورش پا رہے تھے۔ سعد مرحوم کے سامنے صرف مصر کی آزادی کا مسئلہ

تھا، احمد حسین کی آنکھوں نے دنیا یکسر بدلی ہوئی دیکھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مشرق قریب کے ممالک بے جان لاشے تھے، لیکن چودہ برس کی مدت نے ان کی کایا پلٹ دی تھی اب مصر مرکز تھا عربی اور اسلامی دنیا کا۔ احمد حسین نے نوجوانوں کو سلطان صلاح الدین کا زمانہ یاد دلایا جب مصر صرف آزاد نہیں بلکہ آزاد اسلامی دنیا کا پایہ تخت تھا، اس نے مصری طلبہ کو بتایا کہ اسلامی تمدن کو خونخوار صلیبیوں اور مردم خوار تاتاریوں سے بچانے والے ہمارے ہی آبا و اجداد تھے' ازہر ہی وہ شمع ہے جو ہزار برس سے اپنی روشنی سے اسلامی دنیا کے گپ اندھیرے کو منور کر رہی ہے

اگر سعد زغلول ازہر سے نالاں تھے تو احمد حسین اس پر نازاں، سعد نے شامیوں اور فلسطینیوں سے بھائی چارہ رکھنے سے انکار کر دیا تھا اور احمد حسین مشرق قریب کو مصر کا داہنا ہاتھ اور ٹیونس اور مراکش کو بایاں ہاتھ سمجھتا ہے۔

سبز پوش تحریک کی اہمیت سیاسی کی بجائے تمدنی زیادہ ہے، انیسویں صدی کی ابتدا میں برسوں کے سوئے ہوئے مصر نے آنکھ کھولی تو اسے فرانس نے اپنی گود میں لیا۔ فرانسیسی اثر نے مصریوں کو "فراعنہ پرست" بنایا، سعد زغلول نے مصر، مصریوں کے لئے نصب العین پیش کیا اور اب مصر اسلام کی وراثت کا محافظ بن کر میدان میں قدم رکھتا ہے۔

سبز پوشوں کی جماعت کا نام "نوجوان مصر" ہے، ان کی ہر دلعزیزی دیکھ کر وفد پارٹی نے "نیلی پوش" میدان میں لا کھڑے کئے آخر الذکر کی پشت پر حکومت ہے، اس لئے ان کی دراز دستیاں بہت بڑھ گئی ہیں، کبھی کبھی دونوں جماعتوں میں تصادم ہو جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی دشمنی نے ایک سبز پوش نوجوان کو سیاسی جرم کے ارتکاب پر ابھارا ہے۔

بے شک وفد جماعت کی اکثریت ہے، اور نحاس پاشا کو لوگ بہت چاہتے ہیں، لیکن ہوا کا رخ بتاتا ہے کہ نوجوان مصر جیسی جماعتیں ایک نہ ایک دن وفد کی سیادت کو ختم کر کے رہیں گی

چند دن سے تو قاہرہ سے برابر یہ خبریں آ رہی ہیں کہ نحاس پاشا کی وزارت اب ٹوٹنے ہی والی ہے، موصوف پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ملک کے دستور اساسی میں ایک

اہم تبدیلی کرانا چاہتے ہیں، جس کے لئے بادشاہ تیار نہیں۔ اگر وزارت کے اصرار اور بادشاہ کے انکار کا یہی حال رہا تو آخر میں نحاس پاشا کو مستعفی ہی ہونا پڑے گا۔

مصر کے دستور اساسی میں بادشاہ کو پارلیمنٹ برخاست کرکے اپنے چنے ہوئے وزیروں کی مدد سے ملک پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ دراصل دستور کی یہی دفعہ ذمہ دار ہے اُن تمام وزارتی انقلابوں کی جو ۱۹۲۳ء سے اب تک مصر میں ہوئے ہیں۔ مرحوم شاہ فواد انگریزوں کے ساختہ پرداختہ تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی وزارت قومی مطالبات کے لئے انگریزوں کے خلاف اَڑ جاتی تو دوسرے دن شاہ فواد پارلیمنٹ کو ٹھکانے لگاتے، اور نئے وزیر جو برطانی ہائی کمشنر کے چنے ہوئے ہوتے حکومت کی باگ سنبھالتے۔ ایک بار پہلے ۱۹۳۰ء میں بھی نحاس پاشا نے دستور اساسی کی اس دفعہ کو بدلنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پورے پانچ سال تک دستور معطل رہا، اور غیر ذمہ دار وزارتیں برسر اقتدار رہیں، آخر خدا خدا کرکے حبش و اٹلی کی جنگ نے نازک صورت حال پیدا کی، اور بہت خون خرابے کے بعد مصر میں پرانا دستور بحال ہوا، اب نحاس پاشا کی وزارت پھر دستوری چٹان سے ٹکرانا چاہتی ہے۔ دیکھئے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

مصری برطانی نئے معاہدہ سے پہلے تو برطانیہ کو صرف اسی دفعہ کی وجہ سے آئے دن ملک کے معاملات میں دخل دینے کا موقع مل جاتا تھا، چنانچہ لارڈ لائڈ (سابق گورنر بمبئی) کی قماش کے ہائی کمشنر تو معمولی معمولی باتوں پر وزارت کو برطرفی کی دھمکی دے دیا کرتے تھے، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں انگریز بین الاقوامی سیاست کی الجھنوں میں گرفتار ہے، اور وہ کسی طرح نہیں چاہے گا کہ اپنے کسی فعل سے مصر کی اکثریت سے بگاڑ پیدا کرے۔ قاہرہ کی ۳۰ دسمبر کی اطلاع ہے کہ وفدی وزارت ٹوٹ گئی اور محمد محمود پاشا وزیر اعظم ہوگئے

حجاز

حج کا زمانہ قریب آرہا ہے، سرزمین حجاز کے باشندوں اور حکومت دونوں کے لئے حج ہندوستان کے موسم برسات کا سا حکم رکھتا ہے، حاجی زیادہ آئیں تو رعیت اور راعی نہال ہوجاتے ہیں اور کم ہوں تو قحط سالی ہوتی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں نے تو اب اس ارض مقدس سے دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیا ہے، اب نہ تطہیر حجاز کا جوش رہا اور نہ احیائے خلافت

راشدہ کا ولولہ، حجاز کی دھن سمائی تھی تو تن من کی بھی خبر نہ رہی تھی، ہر مجلس میں ابن سعود کا ذکر اور ہر سرگرمی حجاز کے لئے وقف، اب بھلا یا ہے تو خبر بھی نہیں لیتے کہ اس سرزمین پر کیا گزر رہی ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء کی عالمگیر کساد بازاری نے ابن سعود کے خزانہ کو بھی خالی کر دیا، جاوا، ہندوستان اور مصر سے حاجی کم آئے، آمدنی گھٹ گئی، حکومت کے لئے اپنے کارندوں تک کو تنخواہ دینا مشکل ہو گیا ابن سعود نے ادھر ادھر سے قرض لینے کی بہت کوشش کی لیکن سنگلاخ پہاڑیوں، ریت کے تودوں اور بدوؤں کے خیموں کو دیکھ کر کون روپیہ دے، آخر حکومت کو معدنی کانوں اور تیل کے چشموں کا خیال آیا، اور ایک انگریز کمپنی کو زمین کے ان خزانوں کو نکالنے کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اگر کمپنی کی کوششیں بارآور ہوئیں تو عراق اور ایران کی طرح حجاز کی مالی مشکلات بھی اس تیل سے بہت حد تک حل ہو سکیں گی۔

شریف حسین کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو حجاز میں اپنا اثر قائم کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا لیکن "اصولی جنگ" نے ہمیں عملی دنیا سے بے تعلق کر دیا، ہم بے کار نظری بحثوں میں اُلجھ گئے، نکلے تو تھے مسلمانوں کی عالمگیر اخوت قائم کرنے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے مسلمانوں کو خلافت اور حجاز سے ہی بدظن کر دیا، بے وجہ کی شوراشوری کا انجام بے نگی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے، ۹ کروڑ مسلمانوں کی اس بے سری فوج نے ہندوستان میں تو اپنی بھد کرائی تھی، اسلامی دنیا میں بھی اس نے اپنے وقار کو خود اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔

تعجب تو یہ ہے کہ شریف حسین اور ابن سعود کے جھگڑے میں ہم نے زمین و آسمان ایک کر دیا تھا لیکن جب بدلے ہوئے حالات کو ذرا سدھارنے کا وقت آیا تو ہماری صلاحیتوں نے بالکل جواب دے دیا، اپنے مقابلہ میں مصر والوں کو دیکھئے، شریف حسین اور ابن سعود کے جھگڑے کے وقت وہ خاموش رہے (جسے ہم نے اس وقت اسلام فروشی اور مصر پرستی سے موسوم کیا) بعد میں محمل کے حادثہ کی وجہ سے دونو ملکوں میں شکر رنجی پیدا ہو گئی، لیکن اب صلح و صفائی ہے، مصری سرمایہ برابر حجاز پہنچ رہا ہے "بنک مصر" نے جدہ اور مکہ میں اپنی شاخیں کھول دی ہیں، موسم حج میں ہوائی

آمد و رفت کا انتظام کر لیا ہے، حاجیوں کو لانے والے جہاز بھی بنک مصر کے ہیں، کچھ عرصہ سے بنک نے ہوٹلوں کا سلسلہ قائم کرنا شروع کر دیا ہے، ان دنوں حکومت مصر کافی مقدار میں حجاز کی حکومت کو قرض دینے پر غور کر رہی ہے، ظاہر ہے مسلمانوں کا سرمایہ اگر حجاز کی ترقی کے لئے فراہم نہ ہوگا تو غیر مسلم دنیا اس میدان کو کیوں چھوڑے گی۔ پھر ترقی ہوگی مگر آزادی! اور اختیار؟ کیا ہندی مسلمان اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔

ہم نے سب کچھ لٹا کر بے ننگ و نام کا لقب پایا، اور دوسرے ہیں کہ اپنے اندانے میں رہ کر دوسروں کو نفع بھی پہنچاتے ہیں اور خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مراکش اسپین کی خانہ جنگی میں مراکشی عربوں کی شرکت نے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے انقلاب کا امکان پیدا کر دیا ہے۔ آج الجزائر، ٹیونس اور مراکش کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں اسپین کی جنگ کا چرچا ہے، اور عرب اپنے قہوہ خانوں میں بڑے جوش و خروش سے اپنے بھائی بندوں کی بہادری اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں، اور اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں جب مراکش سے لے کر مصر کی سرحد تک یہ ملک پردیسی غاصبوں سے آزاد ہو جائے گا اور مسلمان بے دین عیسائیوں کو اپنے وطن مقدس سے نکال باہر کریں گے معلوم نہیں فرانکو نے کن وعدوں پر اسپینی مراکش کے عربوں کو اپنے ساتھ ملایا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ سے عربوں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں اور اب فرانکو کو فتح ہو یا شکست عربوں کو غلام رکھنا نا ممکن ہو گیا ہے، سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ اس کی دوسری وجہ شمالی افریقہ کی اقتصادی بدحالی ہے، اسپینی مراکش کا علاقہ تو زیادہ سرسبز بھی نہیں، البتہ فرانس نے اپنی مقبوضات میں زمین کو زرخیز بنانے میں بڑی سعی کی لیکن اس کا حاصل تمام کا تمام فرانسیسی نوآبادکاروں کو ملتا ہے، مراکشی جیسے پہلے خالی ہاتھ تھا اب بھی ویسا ہی ہے۔ اور پچھلے دو برس کی خشک سالی نے تو اسے بالکل قلاش بنا دیا ہے، ظاہر ہے فاقہ کشی کا حل بغاوت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

سکتے ہیں۔ ان کے خمیر میں آگ ہی آگ ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو ان علاقوں کو فتح کرنے میں برسوں تک جنگیں کرنا پڑیں۔ اور پھر اسلامی دور کے ایک ہزار سال میں یہ سرزمین ہمیشہ بغاوت گاہ بنی رہی، دوسروں کی حکومت یہ لوگ مشکل سے ہی مانتے ہیں، خود اپنے بھائیوں کا استبداد ان کی برداشت سے باہر تھا۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک پردیسی حکومت جس کا مذہب، تمدن اور زبان اہل مراکش سے بالکل مختلف ہو ان سرکش اور آتشیں مزاج والوں کو کب تک غلام بنا سکتی ہے۔

مراکش، اور الجزائر فرانس کے سیاسی اور معاشی وجود میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دے رہا ہے، ہزاروں من غلہ اور لاکھوں من شراب ان علاقوں سے فرانس پہنچتی ہے۔ تقریباً پچھتر ہزار فرانسیسی مراکش میں اور دس لاکھ الجزائر میں آباد ہو گئے ہیں۔ مراکشی اور الجزائری فوجیں ہی تھیں جو فرانس کے دشمنوں کے سامنے جنگ عظیم میں سینہ سپر ہوئیں، اور آئندہ ان ہی پر فرانس کو بھروسہ ہے۔ اب اگر شمالی افریقہ کی بے چینی اور بدامنی بڑھتی ہی گئی تو فرانس کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی،

الجزائر میں فرانس کی ایک لاکھ فوج پڑی ہے، جن میں زیادہ تر وسط افریقہ کے کالے سپاہی ہیں، فرانس جانتا ہے کہ وہ الجزائر کی ۶۰ لاکھ آبادی کو اپنی ایک لاکھ فوج سے قابو میں نہیں رکھ سکتا، اسی طرح مراکش کے جنگجو قبائل کو فوج کے زور سے فرمانبردار بنائے رکھنا مشکل ہو گیا ہے، اب وہ ہوائی قوت کو بڑھا رہا ہے، فرانس کا خیال ہے کہ وہ صرف طیاروں کی مدد سے شمالی افریقہ کی بغاوت کو فرو کر سکے گا لیکن آپ جانتے ہیں کہ دلوں کی آگ یوں توپ و تفنگ سے نہیں بجھتی، او محکوم کا غصہ اور انتقام حاکموں کی سختی اور استبداد یا ان کی دریا دلی، اور مہر و کرم سے کم نہیں ہوتا، مراکش کی مسلمان آبادی جسے غاصب عیسائی حکومت نے نہ صرف اپنا غلام بنا رکھا تھا، بلکہ انھیں اپنے مذہب تمدن اور زبان سے زبردستی دور رکھنے کی کوشش کی تھی اب آزاد ہو کر رہے گی۔

جنگ عظیم نے اسلام کے جس سیلاب کو بڑی مدتوں کے بعد حرکت دی تھی، وہ افغانستان ایران، ٹرکی اور مشرق قریب کے ممالک سے بہتا ہوا بحر اوقیانوس تک پہنچ کر رہے گا، اور دنیا ایک بار پھر اس دور کو دیکھے گی جو آج سے ایک ہزار برس پہلے رونما ہو چکا ہے۔

میسولینی اور اسلامی دنیا

پریشان حالی و درماندگی میں دست گیری کرنے والے کو بزرگوں نے دوست بتایا ہے لیکن اگر دست گیری میں خلوص نیت کی شرط نہ ہو تو آج میسولینی مسلمانوں کا سب سے بڑا دوست ہے اس لئے کہ آجکل اس کی مہربانیاں ان پر عام ہو رہی ہیں۔ میسولینی اس وقت جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اطالیہ کی خارجی سیاست کا تقاضہ ہے، جو اسے اپنی زندگی کے لئے لابدی نظر آتا ہے۔ مگر بہر حال یہ چیز ہے بہت دلچسپ۔ ادھر برطانیہ اور فرانس امن وامان کے قیام کے لئے شدید کارروائیوں کے لئے مجبور ہوتے ہیں ادھر میسولینی کو مظلوموں کی دلدہی کا موقعہ مل جاتا ہے۔ الجزائر کے مظلوموں تک وہ خود تو نہیں پہنچ سکا لیکن اس کے بالکل متصل اپنے علاقے لیبیا میں اس نے اسلام کی نصرت وحمایت کے جو پرشور نعرے لگائے ہیں اُن کی گونج کیا الجزائر میں پہنچی؟ اور پھر کسی کو کیا خبر کہ پس پردہ عملی ہمدردی بھی شامل حال ہو۔ اطالوی پریس اسلامی ملکوں کی خبروں کو خوب نمک مرچ لگا کر شائع کرتا ہے اور جب مراکو کے متعلق خود فرانسیسی اخبار یہ کہتے ہوں کہ"

> " ہمیں اپنے آپ ہی سے پوچھنا چاہئے کہ کیا ہم نے شمالی افریقہ میں ان فرائض کو پورا کیا ہے جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ صحت اور صفائی، متعدی بیماریوں کی روک تھام، پانی کی فراہمی وغیرہ وغیرہ سماجی کاموں کی ایک اچھی خاصی فہرست بن سکتی ہے۔ اب بتائیے ہم نے کیا کیا ہے، جب ہم اپنے غیر متوازی میزانیہ اور وطنی مشکلات کو دیکھتے ہیں تو دل اطمینان دلاتا ہے کہ جو کچھ کیا ہے اس سے زیادہ ہم کر بھی نہیں سکتے تھے لیکن بہر حال فتح ایک بڑے عرصہ تک حقوق سے زیادہ فرائض ہی عاید کرتی ہے"

تو اطالیہ کے اخبارات اس پر کیا کچھ حاشیہ نہ چڑھاتے ہوں گے۔ بحیرہ روم کے

ساحلی مقامات میں کچھ نہیں تو پچاس لاکھ مسلمان تو ضرور ہیں یہ سب اطالیہ کے زیر اثر ہیں۔ فلسطین کے لئے یہاں گرمجوشی کے ساتھ چندے ہوئے۔ برطانیہ نے مفتی اعظم اور ان کے ساتھیوں کے خلاف جو اقدام کیا ہے اس سے اس تمام علاقے میں برہمی پھیل گئی اور یہاں تک سننے میں آیا کہ مفتی اعظم بیت المقدس کے بعد لیبیا ہی کو اپنے قیام سے معزز فرمائیں گے۔ ادھر مفتی اعظم نے فلسطین سے جاتے ہوئے جو بیان دیا تو اس کے یہ جملے بڑی آب و تاب کے ساتھ اطالوی اخبارات میں چھاپے گئے

برطانیہ کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ اپنے موجودہ طرز عمل کی بدولت وہ عربوں کی بلکہ تمام عالم اسلام کی رہی سہی ہمدردی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔"

انگریز پر بھروسہ کرنے کی سزا عرب بیس سال سے اب تک بھگت رہے ہیں اگر اب کہیں ان دوسرے "خیر اندیش" پر اعتبار کیا تو ظاہر ہے کیا ہوگا۔

عربوں کو تو محض اپنی قوت کے بل پر لڑنا ہے حبشہ کی نوخیز سلطنت جس کی مہم میں اطالیہ نے شرم و شرافت ہی نہیں بلکہ جان کی بازی لگا دی تھی، اس کی تعمیری کوششوں کا خاص مرکز ہے۔ اسی متاع عزیز کی بدولت آج سب پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے، حبشہ کی داخلی تعمیر و ترقی کے لئے حال ہی میں تیرہ ارب لیرا حکومت نے منظور کئے ہیں جو ۶ سال تک بالاقساط ادا ہوں گے۔ لیکن خارجی حفظ و امن اس سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ ادھر امام یمن کے متعلق خبر اڑی تھی کہ وہ میسولینی کے دام میں نہیں آئیں گے۔ یمن اور حبشہ کا قرب اور پھر غضب بالائے غضب درمیان میں برطانوی بحر و بر۔ اس لئے وہ سب سے پہلے امام کی طرف ملتفت ہوا اور بالآخر رام کر لیا۔ ۱۵ ستمبر کو ۲۶ء والے تجارتی اور دوستانہ معاہدہ کی تجدید عمل میں آگئی۔ یمن کی طرف سے تحفے تحائف بھیجے گئے اور پھر یہ اطلاع بھی آگئی کہ امام نے اطالیہ سے سامان جنگ منگایا ہے۔

سلطان ابن سعود سے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے لیکن اطالیہ کی ایک چپقلش کام آگئی۔ ۲۶ء میں امام اور سلطان لڑ گئے اور آپ (اطالیہ) یمن کے دوست ہونے کے باوجود غیر جانب داری کی شان سے کھڑے تماشہ دیکھا کئے۔ اس احسان کا تھوڑا بہت تو اثر ہونا ہی چاہیئے تھا

حبشہ کی ساری جنگ میں عرب سے کوئی آواز نہ اٹھی۔ ادھر حبشہ پر قبضہ ہوتے ہی میسولینی نے سلطان کا دل اس طرح ہاتھ میں لیا کہ حجاج کا ایک قافلہ اس نئی سلطنت سے شاید پہلی بار بھیجا۔ اور بقول مارننگ پوسٹ بہت سوں کے مصارف بھی جناب میسولینی نے برداشت کئے۔

آجکل عدن کی صورت حال بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ستمبر میں یہ طے کیا کہ حضر موت جو اب تک نیم برطانوی علاقہ تھا بالکل اپنے تصرف میں لے لینا چاہیے حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے تجویز کو فوراً جامہ عمل پہنا دیا گیا۔ غریب بدو اپنی آزاد منشی پر حملہ برداشت نہ کر سکے۔ کچھ اور نہ بن پڑا، دو چار انگریزوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ عدن کی حضرموت کی بے چینی اطالیہ کے لئے دو وجہوں سے اہم ہے ایک حبشہ سے قریب دوسرے اُمت اسلامیہ۔ اطالوی اخبارات میں ان خبروں کو نمایاں جگہ ملی۔ ان ہی اخباروں کا بیان ہے کہ بدوؤں پر ہوائی جہازوں سے آٹھ دن تک بمباری کی گئی۔ اور آباد فصلیں، بھیڑ بکریاں، اونٹ سب تہس نہس کر کے رکھدئے اس اطلاع میں مبالغہ کی آمیزش ضرور ہوگی لیکن یہ تو واقعہ ہے کہ حضرموت میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ انگریز حاکم کبھی سختی کرتے ہیں اور کبھی خود ہی نرم بن جاتے ہیں۔

مصر اطالوی مقبوضات کے بیچوں بیچ میں ہے، اپنی سیاسی اہمیت کی وجہ سے وہ کس کو محبوب نہیں ہے۔ پھر میسولینی کو کیوں نہ عزیز ہوگا۔ یوں بھی کوئی پچاس ہزار اطالوی مصر میں بسے ہوئے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اسکندریہ جیسے اہم نقطہ پر میسولینی مصر سے تعلقات برابر بڑھا رہا ہے۔ مانترو کانفرنس جو برطانیہ کی فسوں کاری اور مصریوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ عظیم الشان بن گئی تھی، اس میں اطالوی سفیر نے سر آڑے وقت میں مصر کو سہارا دیا۔ فرانسیسی نمایندے جب بنا بنایا کھیل بگاڑنے والے تھے تو اطالوی سفیر نے شدت کے ساتھ مصریوں کا ساتھ دیا۔ غرضیکہ مصر سے بنائے رکھنے کی بھی میسولینی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

فلسطین کے خونچکاں واقعات بھی اطالیہ میں دردمندی کے ساتھ سنے اور سنائے جاتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فلسطین والوں کو خود بھی میسولینی سے کوئی توقع ہے لیکن ان حالات میں

مثبت ہمدردی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ عید میلاد النبی کے موقع پر جلسوں میں کہیں کہیں "محافظ اسلام" میسولینی کی تصویر بھی آویزاں ہوئی تھی۔

اِدھر البانیا تو عملی حیثیت سے اطالوی نوآبادی ہی بن گیا ہے۔ اٹلی میں تیل کا کال ہے۔ البانیہ سے اُسے تیل بھی مِل جاتا ہے۔ البانیہ کے تہذیب و تمدن میں بھی اطالیہ بقدر ضرورت مدد کرتا ہی رہتا ہے۔ یہ دس لاکھ کی آبادی اور ایک معقول بندرگاہ اطالیہ کے لئے امداد غیبی کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ برطانیہ، اطالیہ کی اس غم خواری کے جواب میں کیا کر رہا ہے اس لئے کہ

ع۔ بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں

اس کے ہاں ابھی بہت سے لارنس موجود ہیں۔ عربوں سے قریب تر ہونے اور اپنے پروپیگنڈے کو کامیاب تر بنانے کے لئے اسی مہینے اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ لندن کے ریڈیو اسٹیشن سے عربی میں تقریریں براڈکاسٹ ہونے لگی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ عرب عربی کے اس "عروج" پر مسرور ہیں۔

بہرحال انگریز دوستی کا دم بھریں یا میسولینی زخموں پر پھایا رکھیں، دونوں مطلبی ہیں۔

چین اور جاپان کی جنگ

۷ جولائی کو پائی پنگ سے کوئی تیس میل مغرب کی طرف ایک جاپانی فوج میں جو "مشق" کر رہی تھی اور ایک چینی فوج میں جسے یہ مشق ایک خطرناک حقیقت کی پرچھائیں معلوم ہوئی ذرا سی جھڑپ ہو گئی، جاپان نے جھٹ چین پر پچھلے معاہدوں کی خلاف ورزی کا الزام لگایا، اپنی نیک نیتی اور صلح پسندی اور چینیوں کی فتنہ پروری کا ڈھول تو اور کینوں کا اعلان کیا، اور مدافعت کے لئے کارروائی شروع کر دی۔ اس مدافعت میں جنگ کا ایک مکمل نقشہ سامنے رکھا گیا تھا۔ اور جاپانی فوجوں نے نہایت باضابطگی اور ترتیب سے بڑھنا شروع کیا۔ اب چینی دار السلطنت ان کے قبضے میں ہے، اور چین کے باقی دونوں سیاسی اور تہذیبی مرکزوں کانٹون اور ہانکاؤ پر حملہ ہو رہا ہے۔

جاپان کا مقصد، کم از کم نان کنگ کی فتح تک، یہ تھا کہ چین کے پانچ شمالی صوبوں، چاہار، سوئی یوآن، شان سی اور شان تنگ پر پورا تسلط ہو جائے۔ جنگ کے اس حصے کو ہم پانچ

مہموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتے ہی جاپانی فوجوں نے پائی پنگ کے مغرب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق میں جو تین ریلوے جنکشن ہیں ان پر قبضہ کیا۔ اور پائی پنگ سے ٹی ان ٹس پاؤٹنگ اور کلگان کو جو ریلوے لائنیں جاتی ہیں ان کا سہارا لے کر آگے بڑھیں۔ پہلی مہم یہ تھی کہ پائی پنگ سے ٹی ان ٹس ہوتے ہوئے تاکوتک، جہاں بحری فوج اپنے قدم جما چکی تھی، قبضہ کیا جائے۔ اور پھر تسی نان پر۔ دوسری مہم کا مقصد پائی پنگ۔ ہانکاؤ ریلوے پر اس حد تک قبضہ کرنا تھا کہ شانسی صوبہ جاپانیوں کے لئے محفوظ ہو جائے۔ تیسری مہم کلگان، تاتنگ، سوئی یوآن کی طرف بھیجی گئی، تاکہ چاہار اور سوئی یوآن صوبوں پر قبضہ کرے اور اندرونی منگولیا کی فوجوں سے مل جائے۔ پانچویں مہم شنگ ہائی اور چھٹی نان کنگ کی تھی۔

اب شمال سے دیکھئے تو تیسری مہم نے پائی پنگ سے سوئی یوآن تک جو ریل جاتی ہے اس کے آخری اسٹیشن پاؤ تو تک قبضہ کر لیا ہے، اور اندرونی منگولیا کے شہزادے تہ وانگ نے چینیوں کو صوبہ یوآن کے شمالی حصے سے بے دخل کرکے جاپان کی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ اس مہم میں تاتنگ پر قبضہ کرنے کے بعد جاپانی فوج کا ایک حصہ تائی یوآن کی طرف مڑ گیا، تاکہ پائی پنگ ہانکاؤ ریلوے کے برابر جو لائن تائی یوآن سے اتر دکھن جاتی ہے اس پر قبضہ کرے۔ یہ سمجھئے چوتھی مہم تھی، اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دوسری مہم کی فوج کو، جو پائی پنگ ہانکاؤ ریلوے کے ساتھ پائی پنگ سے جنوب کی طرف بڑھ رہی تھی، چینیوں کو شانسی صوبے سے نکالنے میں مدد دے

ان چاروں محاذوں پر چینی کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ اس لئے کہ ہمت تو تھی مگر سامان نہ تھا جاپانیوں کا خیال تھا کہ شانگ ہائی پر بھی وہ اسی طرح اپنے سامان اور تنظیم کی بدولت بازی لے جائیں گے لیکن یہاں پر چینی اڑ گئے۔ فتح بہر حال جاپانیوں کی ہونا تھی لیکن چینی فوج کی ہمت اور ایثار نے اس کو ایک مثال بنا دیا ہے جو یقیناً آئندہ مقابلوں میں کام آئے گی۔ شانگ ہائی اور نان کنگ کی فتح جاپانیوں کی پانچویں مہم تھی، اب وہ دریائے یانگ ٹسی کے ساتھ ساتھ ہانکاؤ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کانٹون پر حملہ، جو اب شروع ہو رہا ہے، یہ نئی مہمیں ہیں۔ ان میں بھی جاپان کو کامیابی ہوگی

لیکن اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کا اندازہ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ ہر فتح میں شکست کا بھی کچھ نہ کچھ سامان ہوتا ہے،

جاپان نے شمال کے تین صوبوں کی تمام ریلوے لائنوں اور بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا ہے، بس شان تنگ ابھی باقی ہے۔ یہ کام دراصل اتنا مشکل نہ تھا، جتنا کہ وہ جواب شروع ہو رہا ہے۔ کیونکہ چینیوں کی مخالفت برابر جاری ہے اور کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئی ہے، جاپانیوں کو اب پھیل کر لڑنا ہوگا، اسقدر پھیل کر کہ ان کے ہوائی جہاز اور ٹینک کچھ زیادہ کام نہ آئیں گے، اس لڑائی کا سدباب شاید جاپان دوست صوبہ داروں اور کاؤنسلوں کے قیام سے بھی نہ ہو سکے، اس لئے کہ موجودہ چینی حکومت جنگ کو قومی حیثیت دینے میں کامیاب ہوئی ہے اور اب چینی کومیونسٹ بھی خلوص سے اس کی مدد کر رہے ہیں۔ جاپانی تسلط بھی ویسا نہیں جیسا کہ فتوحات کی خبریں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے، چین بہت بڑا اور بہت آباد ملک ہے، ریلوے لائنوں اور بڑے شہروں پر جاپان کا قبضہ ہونے سے چینیوں کے لئے اپنی مخالفت کو منظم کرنا قریب قریب ناممکن ہوگا، مگر دوسری طرف اتنے بڑے ملک میں قزاقانہ جنگ کا مقابلہ کرنا ایک مہم ہے جو شاید جاپانی فوج سے بھی سر نہ ہو سکے گی،

حال میں جاپانی جنرل ماتسوئی نے، جو شانگ ہائی نان کنگ کی فوج کا سپہ سالار ہے، اس کا اعتراف کیا ہے کہ جاپانی فوج تھک گئی ہے اور سردی بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ سستانے کو موقع مل جائے تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا، لیکن اگر چینیوں کی سرکشی کا یہی رنگ رہا تو جاپانی لڑائی جاری رکھیں گے اور ہانکاؤ تک یانگ ٹسی کی وادی پر قبضہ کر لیں گے۔ دراصل اب چینیوں کو اس کا بھی موقع نہ دیا جائے گا کہ سرکشی سے توبہ کریں، جاپان کی فوجی پارٹی نے کہا ہے کہ ہانکاؤ اور کان ٹون دونوں فتح کئے جائیں گے اور مجرم چین کو موت کی سزا دی جائے گی۔

تعلیمی دُنیا

رکٹر لارن زلیاکس اور مسٹر سالٹر ڈیوس نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے ڈیلیگیٹوں نے ۵ ر دسمبر کو جامعہ ملیہ کا معائنہ کیا۔ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کل دُنیا کی تعلیم نو کی انجمن ہے جسکا مقصد تعلیم جدید کے اصولوں اور طریقوں کی اشاعت ہے۔ اس کے مقاصد کے پرچار کے لئے انجمن کے تین ممتاز ممبر اس موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کر رہے ہیں۔ رکٹر زلیاکس کا تعلیمی تجربہ بطور طالب علم اور استاد بین الاقوامی ہے، ان کی تعلیم امریکہ ہوئی انگلستان میں بیڈیلنر Bedales کے مشہور و معروف ادارے میں سات سال کی طویل مدت تک استاد رہے اس کے بعد انہوں نے تعلیم نو کے اصولوں کو ذاتی طور پر عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے وطن ہلنگ فورس Helsingfors فن لینڈ میں ایک ہائی اسکول قائم کیا آپ ایک بین الاقوامی کمیشن کے جو مسئلہ امتحانات پر تحقیقات کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا صدر رہ چکے ہیں اور آج کل نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے صدر ہیں۔ مسٹر سالٹر ڈیوس کا انگلستان کی سب سے ترقی پذیر کاونٹی (ضلع) کے تعلیمی نظم و نسق کا چالیس سالہ تجربہ ہے۔ آپ کینٹ Kent کاونٹی کے ڈائرکٹر تعلیمات ہیں۔ تعلیم پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے انگریزی حلقے کے صدر ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دونوں اصحاب کو جامعہ کی سیر کرائی اور انہیں وہ بلند اصول بتائے جن پر جامعہ کام کر رہی ہے۔ نیز آپ نے ان مشکلات کا بھی ضمناً تذکرہ کیا جو ان کو اس کام میں برابر پیش آتی رہی ہیں۔ دونوں اصحاب جامعہ کے طریقۂ تعلیم۔ عملی ماحول اور بچوں کی آزادی اور تخلیقی آرٹ کی دلچسپیوں سے بے حد محظوظ ہوئے۔

یہاں ہم ان کی چٹھیوں سے چند اقتباسات دیتے ہیں جو انہوں نے ذاکر صاحب کو لکھیں۔

زلیاکس صاحب لکھتے ہیں:۔ جامعہ ملیہ کی سیر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص معاونین سے گفتگو میرے لیئے بے حد موثر اور تخیل آفریں تجربہ تھی۔ یہ ادارہ اپنے بلند اصول تعلیمی روح، اور عملی جذبے

کی بنا پر جو اس میں کارفرما ہے ان تمام اداروں سے بہتر ہے جنہیں میں نے خود دیکھا ہے یا جن کے متعلق سُنا ہے،

اسی طرح مسٹر سالڈ ڈیوس نے مفصلہ ذیل الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ اسکول کی سیر سے بے حد دلچسپی ہوئی یوں تو مجھے اپنے کل دنیا کے دورے میں بہت سے مدرسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر مجھے اتنا کہنے میں بالکل تامل نہیں ہے کہ آپ کا مدرسہ کئی پہلوؤں سے ان تمام اداروں سے زیادہ دلچسپ ہے میرے خیال میں آپ ان تمام اصولوں کو عملی شکل دے رہے ہیں جنہیں دنیا نے ابھی تک محض نظریہ کے طور پر تسلیم کیا ہے اور تعلیمی دنیا انکو بہت آہستہ آہستہ بتدریج عمل میں لا رہی ہے، درحقیقت آپ ان تعلیمی اصولوں کو عملاً کام میں لا رہے ہیں جو میں اپنی کاونٹی کینٹ Kent میں رائج کرنا چاہتا ہوں، میری دلی تمنا ہے کہ آپ اور آپ کے معاونین اپنے بلند مقاصد میں کامیاب ہوں اور آپ کا مکمل ادارہ جلد نئی تجویز کردہ عمارت میں منتقل ہو جائے،

اٹلی سینور بتائی وزیر معارف ملی نے ایوان نمائندگان (چیمبر آف ڈپٹیز) میں تقریر کرتے ہوئے فاشزم کے تعلیمی پہلو پر یوں تبصرہ کیا۔

ہر مدرسے کی روح میں فاشزم کا عنصر نمایاں ہونا چاہیئے۔ طاوی تہذیب کے اتحاد اور یکجہتی کا راز اس میں مضمر ہے کہ یہ سو فیصدی فاشزم کے اصولوں پر مبنی ہے اور اسے دوسرے عناصر سے کسی قسم کی رواداری اور سمجھوتے سے بدترین قسم کی منافرت ہے، ہمارا طرۂ امتیاز یہی ہمارا فاشسٹ ہونا ہے، یہی جنگ کے لئے ہمارا ہتھیار ہے اور اسی سے ہی ہم تہذیب و تمدن کی ترویج کے لئے جنگیں کرتے ہیں۔ اسی تہذیبی مقصد کے لئے ہمیں پیہم جنگ کرنا چاہئے اور جب تک یہ چیز کارزار حیات میں ایک مستقل صورت اختیار نہ کرے تب تک ہمیں آرام کا سانس نہ لینا چاہئے،

سینیٹ میں ایک تقریر کے دوران میں سینور بتائی نے اعلان کیا کہ اب تک مدارس میں ۹۰۰۱ ریڈیو کے سٹ لگ چکے ہیں جن سے دو ملیون بچے استفادہ کر رہے ہیں،

ڈنمارک میں عملی اسکول - کچھ سالوں سے ڈنمارک کے ماہرین تعلیم طلباء کی اس بڑھتی ہوئی تعداد کو شبہ اور بے چینی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جو مڈل سکولوں میں داخلہ لے رہے ہیں یہ اوارے کتابی تعلیم کے سلسلہ کی ابتدائی کڑی ہیں، طلباء کا رجحان محض کتابی تعلیم سے ہٹانے کے لیئے تجویز کی گئی ہے کہ ایک نئے قسم کا اسکول جاری کیا جائے جسکا نام عملی اسکول ہو اور جس میں امتحانات کی کوئی قید نہ ہو۔ اس اسکول کا اصل مقصد ایسے طلباء کی ضرورت کو پورا کرنا ہے جو آئندہ زندگی میں کسی دستکاری کو پیشہ بنائیں گے،

[illegible] سائنس کانگریس کے جشن جوبلی کی تقریب [illegible] جو سائنسداں انگلستان یا دیگر [illegible] سے شرکت کی غرض سے آرہے ہیں ان میں سے بعض کا [illegible] ذکر سر جیمز جینز صدر مشترکہ اجلاس کانگریس [illegible] کیمبرج کے معروف پروفیسر طبیعیات، ڈاکٹر رینگ پروفیسر نفسیات [illegible] رل یونیورسٹی زیورش، پروفیسر فیشر لندن، پروفیسر ارنسٹ بیکر کیمبرج وغیرہ اہم ہیں،

کاروباری تعلیم Vocational Education - پچھلے دنوں ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں [illegible] کی تعلیمی اسکیم اور اس کے صنعتی پہلو سے بہت دلچسپی اور کہیں کہیں ہلکی یا شدید نکتہ چینی کا اظہار کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں چند ایک ترقی پذیر ممالک کے مدارس میں اضافی اصلاحات کے سلسلہ میں چند چیزیں [illegible] واضح کر دیں گی کہ آج کل تعلیمی دنیا میں بالعموم نصاب میں کاروباری رجحان کو پیدا کرنے اور تعلیم کو آئندہ زندگی کے مشاغل سے نزدیک تر لانے کے لئے کیا جد و جہد کی جا رہی ہے،

فرانس میں Moulins کے الیرز کے ابتدائی اسکولوں میں پچھلے اکتوبر سے دیہاتی دستی صنعت و حرفت کے سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے، اس میں بارہ سال سے زیادہ عمر کے بچے داخل ہو سکیں گے - ہر ہفتے بیس گھنٹے تو کاروباری تربیت کے لئے - دس عام تعلیم اور چھ زراعتی اصول اور عملی تجربات کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں - بچوں کے لیئے مختلف پیشوں میں سے انتخاب کرنے کے لئے دلچسپ انتظام

کیا گیا ہے۔ مقامی صناع مثلاً بڑھئی۔ لوہار قفل بنانے والا۔ زراعتی مستری۔ بجلی کا مستری وغیرہ بچوں کو اپنی مخصوص صنعت سکھاتے ہیں۔ بچے صرف ایک صنعت باقاعدہ طور پر نہیں سیکھتے بلکہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ ان سبھی پیشوں میں تھوڑی بہت دلچسپی لیں اور بالآخر آئندہ زندگی کے لئے اپنے رجحان اور میلان کے مطابق ایک پیشہ چن لیں، اس انتخاب کا حق انہیں اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب وہ بڑھئی کی شاگردی میں ۱۶۰ گھنٹے، لوہار کے پاس ۲۴۰۔ زرعی مستری کے پاس ۱۶۰ گھنٹے۔ جست کی نالیاں درست کرنے والے کے ہاں ۸۰ گھنٹے اور بجلی کے مستری کی شاگردی میں ۱۶۰ گھنٹے کی تعلیم مکمل کر چکیں گے۔

بلجیم میں مزدوروں کی یونیورسٹی۔ شارلی روئی کے مقام پر ایک سوشلسٹ صوبے کے وسط میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا ہے جو اس پورے صوبے کی اقتصادی زندگی کے لئے دل و دماغ کا حکم رکھتا ہے، چونکہ یہ یونیورسٹی مزدور اور غریب طبقہ کے لئے کھولی گئی ہے، اس کے لئے اس کا بنیادی اصول کم سے کم خرچ پر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم مہیا کرنا ہے، اس کا ہر بات میں لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جو طلبا، دن میں تعلیم پاتے ہیں وہ کھانا وہیں ایک رسٹوران میں کھاتے ہیں، جسکا انتظام طلبا کی انجمن امداد باہمی کے ہاتھ ہے۔ یہاں محض خوراک کے دام لئے جاتے ہیں اگرچہ نرخ بہت ہی کم ہیں تاہم خوراک کا معیار تسلی بخش ہوتا ہے، طلبا کے لئے ایک دارالاقامہ بھی اسی طرز پر چلایا جا رہا ہے، جہاں صرف دھلائی کا خرچ لیا جاتا ہے، باقی سب کام طلبا اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں، اس نظام کے ماتحت تعلیم کا خرچ اسقدر کم ہو گیا ہے کہ ایک ہفتے کی خوراک اور رہائش کے لئے محض ۶۰ سے ۷۰ بلجیک فرانک درکار ہوتے ہیں جو تقریباً سات روپیہ کے برابر ہوتے ہیں، اس پر بھی بعض نادار طلبا کے لئے اور کمی کی گنجائش باقی رہتی ہے،

اس ادارے کا مقصد ہانا ؤ کے صوبے کے لئے مزدور۔ کاریگر۔ صناع اور انجنیر مہیا کرنا ہے۔ لیکن طلبا کا تعلق تعلیم کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ پرانے اور نئے طلبا ایک ادارے میں منسلک ہیں جسکی مصروفیات کا مرکز یونیورسٹی ہے، یونیورسٹی کا کام انکی آئندہ زندگی میں ان کے لئے معیار عمل پیش کرنا ہے جس سے وہ اپنی کارگزاری کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں، مفید معلومات اور جدید تحقیقات کی اطلاعات بھی انہیں اس ادارے

سے ملتی رہتی ہیں۔ اپنی کاروباری زندگی میں ان کو جو دقتیں اور مشکلات پیش آتی ہیں ان کے سلجھانے کے لئے ان کے پرانے اساتذہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں،

اس ادارے کا مقصد محض کاریگر اور مستری ہی تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے دل و دماغ کی تربیت کرنا ہے جو محنت سے عار نہ کرے، ہاتھ کا کام اس کے لیئے ایک شان خودداری لئے ہوئے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے تہذیبی اور کرداری پہلوؤں کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ ادارے کا مقصد کلچرڈ یا مہذب مزدور تیار کرنا ہے، ضبط و نسق کی پابندی اور بلند کردار کی تخلیق میں اساتذہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہر استاد طلبا کے لیئے مثل خاندان کے شفیق باپ کے ہیں۔

یونیورسٹی کی دیواریں۔ انجمن روم۔ بورڈنگ وغیرہ مختلف قطعات اور فوٹو سے مزین ہیں۔ فوٹو کے ذریعہ اخلاق کی تعلیم بہت پرانا طریق ہے۔ مگر ان چیزوں کی اہمیت جبھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے ماحول میں لگائے جائیں جہاں کہ لفظی عبارت کو عملی شکل دی گئی ہو۔ جب کسی کمرے میں ٹالسٹائی یا کنفوشس کے جملے خوبصورت تحریریں چسپاں ہوں اور ساتھ ہی محنت کی عزت کا بلند اصول ادارے کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہو تو ان قطعات کا اثر گہرا اور دیرپا ہو سکتا ہے،

اس یونیورسٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ دنیا کی سب یونیورسٹیوں سے کم عمر کے طلبا کے داخلے کی اجازت دیتی ہے، ابتدائی جماعتوں میں ۱۲ سال سے ۱۴ سال کے طلبا ہیں۔ یہ طلبا زیادہ تر ہاتھ سے کام کرتے ہیں، کام کی مختلف نوعیت سے ان کی دلچسپیوں میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے اور بعض تو اس والہانہ شغف سے کام کرتے ہیں کہ ان کو حد سے زیادہ تھکا دینے والی مشقت سے بچانے کے لئے خاص احتیاط کرنی پڑتی ہے، بہرحال اس اوائل عمر میں ہاتھ کا کام ان پر کسی قسم کا ضرر رساں اثر نہیں ڈالتا۔

مصر۔ محمود النمر نیزی بے نے جو وزارت معارف میں کاروباری تعلیم کے کنٹرولر ہیں اس تعلیم کی ترویج اور توسیع کے سلسلے میں حکام کے سامنے چند دلچسپ اور مفید تجاویز پیش کی ہیں ان کی رائے میں مدارس میں کھلونے بنانے کی صنعت کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کرنا چاہیئے جس کے لیئے ایک طرف تو ملک میں بے حد مانگ موجود ہے اور دوسری طرف یہ صنعت غیر ملکی کھلونوں کی درآمد کا مناسب اور مستقل سد باب

کردیگی۔ اس کے علاوہ وزارت کی توجہ نئی نسل کے لئے صناع اور عمدہ دستکار پیدا کرنے کی طرف مبذول ہوچکی ہے، اس سلسلہ میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ اگر کوئی بچہ اپنے باپ کی صنعت یا دستکاری سیکھنا چاہے گا تو اسکی فیس اور دیگر تعلیمی مصارف میں پچاس فیصدی کمی کردی جائیگی۔ فن معماری، جہازسازی اور آرائشی آرٹ کی تعلیم پر خاص توجہ دی جا رہی ہے،

فلسطین میں بہت سی بچوں کی بستیاں موجود ہیں جنہیں اکثر جمہوریہ اطفال کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے

ماسز تفیہ کا گاؤں جسکی بنیاد آج سے ۱۱ سال پہلے رکھی گئی تھی ۱۵۰ بچوں کی آبادی پر مشتمل ہے، بچوں کے لئے چار دار الاقامے ہیں لڑکے اور لڑکیاں علیحدہ رہتے ہیں لیکن ہر قسم کا زرعی کام اکٹھا کرتے ہیں اور باہمی اشتراک اور تعاون سے گاؤں کے زراعتی فارم کو بہت کامیابی سے چلاتے ہیں، یہاں آٹھ گھنٹے روزانہ کام کا اصول رائج ہے اور اسی میں سکول مضامین، زراعت اور خانگی کام سب شامل ہے، کام بچوں کو ان کی عمر اور جسمانی صحت کا لحاظ کرکے دیا جاتا ہے تعلیم کی حیات ملی سے گہری وابستگی اور تعلق ہے،

تل عفیف اور یوروشلم کے مابین بن شمن کا گاؤں ۱۹۲۹ء میں قائم کیا گیا جس میں ۳۰۰ بچے ہیں۔ یہاں اور بھی کم عمر کے بچے موجود ہیں جنکو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، تین سے آٹھ سال، نو سے تیرہ، چودہ سے سترہ، ان تمام گاؤں میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں اور ضبط و نسق کا انصرام بچوں کے ہاتھ میں ہے،

گاندھی جی نے جب پہلے پہل ہریجن اخبار میں اپنی تجاویز پیش کی تھیں تو اس سلسلے میں انہوں نے ضمناً فلسطین کے مدارس کا بھی ذکر کیا تھا کہ وہاں اس قسم کی کوشش کی جا رہی ہے۔ در حقیقت ہندوستانی تعلیمی مسائل کے لئے ہمیں مفید ہدایات ان مغربی ممالک سے نہیں مل سکتیں۔ جنکا کافی نظام مشین کی صنعت پر مبنی ہے اور جن کے ہاں روپیہ کی اتنی فراوانی ہے کہ وہ تعلیمی اداروں کی تشکیل اور اصلاح کے لئے دل کھول کر خرچ کرسکتے ہیں، ہمارے لئے زیادہ مفید ان ممالک کی مثالیں ہیں جو اقتصادی لحاظ سے پسماندہ ہیں، جن کی کثیر آبادی زراعتی یا گھریلو دستکاری سے

اپنا گزارہ چلاتی ہے، اس قسم کے ممالک فلسطین، میکسیکو وغیرہ میں ہیں۔ فلسطین کے یہودیوں کو اس چیز کی خاص ضرورت ہے کہ وہ اپنی قوم کو جو صدیوں سے زرعی اور صنعتی مشاغل سے علیحدہ ہو چکی ہے دوبارہ ان کی طرف لائیں، ہندوستان میں بھی ہمیں اپنی پرانی صنعتی روایات کو جو ایک زمانہ میں یورپ اور مشرق قریب کی منڈیوں میں خراج تحسین حاصل کرتی تھیں دوبارہ زندہ کرنا ہے اس سلسلے میں یہ کہنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ فلسطین میں بھی گاندھی جی کی رائے کے مطابق بچوں کو ابتدائی جماعتوں سے ہی پیشہ یا ہنر یا کسی صنعت سے روشناس کرانے کی کوشش کی جاتی ہے مکیسکو ( ) پچھلے دنوں مکیسکو کے اسکولوں کی تعداد میں جو کسان اور اس کے بچوں کی تعلیم کے لئے کھولے گئے ہیں، معتد بہ اضافہ ہوا ہے، یہ تسلی بخش ترقی کسانوں کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے جو اپنے گاؤں میں تعلیم جاری کرنا چاہتے ہیں اور جو اسکولوں کے کلچرل اور سماجی فوائد کے معترف ہو چکے ہیں،

پچھلے دنوں پیرس میں کل دنیا کی نمائش منعقد ہوئی تھی جسکے سلسلے میں مفصلہ ذیل بین الاقوامی کانفرسوں نے اپنے اجلاس کئے۔

ایک کانفرنس حفاظت اطفال [illegible] کی ہوئی جسمیں طبی اور قانونی شعبوں کے علاوہ ایک شعبہ تعلیمات بھی تھا جس میں تعلیم کے دوران میں سزا۔ اس کے نرتی اور نتائج اور اس کی اخلاقی حیثیت پر بحث و تمحیص کی گئی تھی۔

انجمن صلیب احمر (جونیر ریڈ کراس) کی بھی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ان مسائل پر بحث کی گئی جن کی مدد سے اس تحریک میں اجتہاد اور دلچسپی کی روح پھونکی جا سکے۔ نیز بین المدارس خط و کتابت اس مفید تحریک کی موجودہ حالت، اور اسکی ترقی کے امکانات۔ و ایک سالنامہ کی ترتیب کا مسئلہ بھی اسی جلسے میں پیش کیا گیا۔

ان کے علاوہ یوتھ ہوسٹل کانفرنس۔ یوری نوجوانوں کی کانفرنس اور تجرباتی معلمی کی کانفرنسوں

کا بھی انتظام کیا گیا۔ آخر الذکر کے صدر موسیو پیرن مشہور معروف سائنس داں ہوں گے،

پچھلے دنوں دنیائے مصوری میں پروفیسر نکولس دی روئش کی پنجاہ سالہ جوبلی کی تقریب منائی گئی۔ پروفیسر موصوف کی چار ہزار تصویریں جن میں سے بیشتر نادر روزگار ہیں یورپ امریکہ اور ہندوستان کے عجائب خانوں پکچر گیلریوں اور روئش ہالوں میں موجود ہیں، روئش ہال وہ عمارتیں ہیں جو مصور کے قدر دانوں نے اس کے شاہکاروں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے پیرس۔ بلگراڈ۔ ریگا بنارس زاگریب، پراگ۔ الہ آباد وغیرہ میں بنوائی ہیں، روئش عجائب خانہ واقعہ نیویارک میں ہی ایک ہزار کے قریب تصاویر موجود ہیں، روئش نہ صرف ایک ماہر فن اور روحانی حس کو بیدار کرنے والا مصور ہے بلکہ وہ ایک سائنس داں، آثار قدیمہ کا ماہر، فلسفہ اور بین الاقوامی اخوت کا کلچرل علمبردار ہے۔ روئش کی دلچسپ شخصیت اور اسکی ادبی، فنی اور فلسفیانہ دلچسپیوں نے آئن شٹائن۔ سیٹر لنک، آندرے کیف اور ٹیگور جیسی بلند پایہ ہستیوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے،

پچھلے دنوں روئش نے نگر میں جو کلو کی وادی میں واقع ہے اُرسوتی ہمالین ریسرچ انسٹیوٹ قائم کیا ہے، جہاں مصور نے اپنا مستقبل کا گھر بنا لیا ہے، یہاں ہندوستان اور مرکزی ایشیا کی تاریخ، آثار قدیمہ، لغت اور علم حیوانات و نباتات پر علمی تحقیقات کی جاتی ہے۔ روئش نے اپنی اس والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار جو اسے ہندوستان کے تمدن اور تہذیب سے ہے اپنی تصنیفات میں پرجوش طرز بیان میں کیا ہے،

ہنگری۔ بوداپسٹ میں بیکار اساتذہ کی انجمن کا ایک جلسہ ہوا جسکی افتتاحی تقریریں اساتذہ کی باہمی تعاون اور ایک ایسے مستقل ادارے کے قیام کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے جو ہنگری کے تقریباً سات ہزار اساتذہ کے روزگار کا ضامن ہو سکے، انجمن کے بنیادی اصول یہ ہونے چاہئیں۔ ٹریننگ کالجوں میں طلبا کی کم سے کم تعداد لی جانا چاہیئے، تربیت یافتہ اساتذہ کا حق ملازمت اس مدت کی

نسبت سے بڑھنا چاہئیے، جو انہیں ڈپلوما پاس کرکے گزر چکی ہے، مثلاً ایسے فرد کو جسے حال میں ہی ڈپلوما ملا ہو دوسرے پر ترجیح نہ دینا چاہئیے جو برسوں سے روزگار کا متلاشی ہو۔ ایسی نئی جگہیں اور ملازمتیں تلاش یا پیدا کرنا چاہئیں جن پر اساتذہ مقرر کئے جا سکتے ہیں، مثلاً گھروں پر تعلیم دینا، پبلک جگہوں کی نگہداشت، غریب بچوں کی امداد کے ادارے۔ انجمن الاطفال کا انتظام وغیرہ،

مہاراجہ ٹراونکور نے اپنی چھبیسویں سالگرہ کے موقعہ پر ٹراونکور یونیورسٹی قائم کرنے کا اعلان کیا، اس کے مقاصد نظام تعلیم کی نئے سرے سے تشکیل۔ ٹکنیکل تعلیم اور اس کی ترقی عملی سائنس کے بارہ شعبوں میں علمی تحقیقات کا بہتر طریق پر منظم کرنا اور اس کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا کیرالا آرٹ اور کلچر کی ترقی اور اس کی حفاظت ہونگے، یونیورسٹی کے چانسلر مہاراجہ ٹراونکور اور وائس چانسلر سر سی۔ پی راما سوامی آئر دیوان ریاست ہوں گے جن کی ان تھک کوششوں کے طفیل یونیورسٹی معرضِ وجود میں آئی ہے، ہمیں امید ہے کہ نظام تعلیم کی از سر نو تشکیل کو یونیورسٹی کے ہاتھوں میں دے کر ارباب اختیار اس غلطی کے مرتکب نہ ہوں گے، جو برطانوی ہند کے ماہرین تعلیم کرتے رہے ہیں جنہوں نے پورے ابتدائی اور ثانوی درجوں کو یونیورسٹی میں داخل ہونے کا ابتدائی زینہ بنا لیا ہے

الہ آباد یونیورسٹی کی تقریب جوبلی اس سال بہت دھوم دھام سے منائی گئی جس میں بہت سی یورپی اور امریکی یونیورسٹیوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے، بہت سے مشاہیر علم و سیاست کو ڈاکٹر کی ڈگریاں دی گئیں، اس مرتبہ یونیورسٹی کے جلسہ اسناد کا ایڈریس مالوی جی نے ہندی زبان میں پڑھا

ڈاکٹر سید حسین صاحب نے جامعہ میں دو تقریریں فرمائیں، صاحب موصوف ایک زمانے میں خلافت کے پرجوش کارکن اور روزنامہ انڈیپنڈنٹ کے مدیر تھے، اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت نے آپ کو جبرالٹر میں قید کر دیا تھا۔ آجکل آپ امریکہ کی ساوتھ کیلی فورنیا

یونیورسٹی میں اسلامیات کے لکچرر ہیں۔ امریکہ آپ نے اپنے بے نظیر زورِ قلم اور جادو بیانی سے میدان صحافت اور تقریر میں بڑا نام پیدا کیا ہے، آپ ایک عرصہ تک رسالہ نیوا ورنیٹ کے مدیر رہے جو مشرقیات پر امریکہ کے بہترین جرائد میں شمار ہوتا تھا،

لارڈ نفیلڈ Nuffield نے جامعہ اوکسفورڈ کو ایک گریجویٹ کالج کے قیام کیلئے دس لاکھ پاؤنڈ کا عطیہ دیا ہے۔ عمارت کے لئے زمین بھی جسکی قیمت ایک لاکھ پونڈ ہے، لارڈ موصوف نے اپنی طرف سے عطا کردی ہے، اس کے علاوہ فزیکل کیمسٹری کا ایک معمل قائم کرنے کی غرض سے ایک لاکھ پونڈ اور طبی تحقیقات کی امداد کے لئے دو لاکھ پونڈ دیئے ہیں، اس مقصد کے لئے پچھلے سال انہوں نے بیس لاکھ پونڈ دیئے تھے، ان کی کل عطیات کی رقم ایک کروڑ پونڈ کے قریب ہوتی ہے، گریجویٹ کالج کا مقصد نصاب میں سوشل مضامین کے مطالعہ کو سماجی ضروریات، صنعت و حرفت وغیرہ سے قریب تر لانا ہے، اس ادارے کی ایک خصوصیت وہ طلبار ہوں گے جو نصف وقت، تو مختلف پیشوں اور کارخانوں میں کام کریں گے اور نصف وقت تعلیمی مصروفیت میں گزاریں گے، ایسے طلبار کے لئے فیلوشپ اور وظائف کا خاص انتظام کیا گیا ہے، ہندوستان میں جہاں بدقسمتی سے امیر طبقے کو فراہمی زر اور اسکی حفاظت یا اس کے بے جا اسراف سے فرصت نہیں ہے، لارڈ نفیلڈ جیسے ہمدردان قوم عنقا کا حکم رکھتے ہیں۔ بیٹسیٹ یا انا ملائی چٹیار۔ نظام حیدرآباد یا ٹاٹا کے عطیات ایک صحرائے ویران کے لئے پانی کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہیں

اوکسفورڈ یونیورسٹی میں سیل روڈس۔ جنوبی افریقہ کے مشہور انگریز سیاستداں اور استعماریت پسند مفکر نے مختلف ممالک کے طلبار کے لئے وظائف مقرر کئے ہیں جنہیں سیل روڈس سکالرشپ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں جرمن طلبا نے بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔ اب ھام برگ کے ایک سوداگر نے جو اپنا نام اخفائے راز میں رکھنا چاہتا ہے، شکریہ اور امتنان

کے طور پر انگریز طلبار کے لئے جرمن یونیورسٹیوں میں وظائف قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ان وظائف کی رقم تین ہزار مارک سالانہ ہوگی۔

معطی نے ان وظائف کو قائم کرتے ہوئے یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ یہ عطیات جرمن اور انگریزوں میں مفاہمت اور رواداری کی بنیادیں مضبوط کردیں گے اور اس ذریعہ سے یورپی تمدن وتہذیب کے اتحاد و یگانگت کا احساس شدت سے پیدا ہوگا،

---

۴ نومبر کو لیسسٹر میں برٹش ورکرز ایجوکیشنل اسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر ٹاونی منعقد ہوا جس میں چارسو مندوبین نے شرکت کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے مزدوروں کی تعلیمی تحریک کے دو مقاصد کی تصریح کی۔ پہلا مقصد تو مزدور جماعت کے افراد کے لئے ایسی تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا جنکے ذریعے سے ان کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوجائیں۔ دوسرا عوام میں اس بے انصافی کا احساس پیدا کرنا جو مزدور طبقے کے تعلیمی معاملات میں برتی جا رہی ہے اور ایک ایسے نظام تعلیم کی تشکیل کے لئے راہ صاف کرنا جسکا اصل الاصول جمہوریت ہو۔ دوسری اور اہم تجاویز کے علاوہ اس کانفرنس نے ایک تجویز اسکولی بچوں کے لیے بہتر غذا اور ریاضت جسمانی کے مسئلہ پر منظور کی۔ کانفرنس کی رائے میں حکومت نے اب تک اس اہم مسئلہ کو حل کرنیکی کوئی تسلی بخش کوشش نہیں کی۔ بقول ایک مقرر کے ورزش جسمانی کو بہتر غذا کے مسئلہ پر فوقیت دینا گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنا ہوگا،

ژورنال دی ماسکو۔ ازبکستان میں کتب خانوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافے پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے "۱۹۳۰ء میں کتب خانے محض ۰۰ تھے ۱۹۳۵ء میں ان کی تعداد ۴۴۴ ہوگئی، اور تجویز یہ تھی کہ ۱۹۳۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۷۰۸ ہوجائے گی جن میں سے ۱۵ کتب خانے دیہی حلقوں میں ہوں گے۔ ۱۹۳۶ء کی تجویز کے مطابق محض شعبۂ تعلیم کے کتب خانوں کے لئے ایک ملیون

کتابیں فراہم کی جائیں گی۔ ہر گاؤں کی لائبریری میں کم از کم دو ہزار کتابیں ہونگی اور ہر ایک سرکٹ Circuit لائبریری میں چھ ہزار سے آٹھ ہزار۔

ایران۔ مدارس کی تعطیلات کے ایام میں ملک بھر میں اساتذہ کے لئے ایسے کورسوں کا انتظام کیا گیا ہے، جو ان کی تعلیمی اور کلچرل استعداد میں اضافہ کرسکیں۔ مختلف اضلاع میں کھیلوں کے کیمپ کا انتظام کیا گیا جن کی مدت دو ہفتے سے تین ہفتے تھی ان کیمپوں میں نہ صرف اساتذہ کو ایک دوسرے سے ملنے جُلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقعہ مل گیا بلکہ وہ کھیل اور جسمانی ریاضت کے جدید سائنٹفک طریقوں سے بھی روشناس ہو گئے۔

مسلم لائبریری بنگلور۔ مسلم لائبریری بنگلور کے ناظم صاحب کی طرف سے ایک اپیل موصول ہوئی ہے، اس میں ہمدردانِ زبان و ادب اردو سے درخواست ہے کہ اس ادارے کی امداد کی جائے، ابھی اس کی اپنی کوئی عمارت نہیں ہے اور کتابیں بھی ناکافی ہیں، ناظم صاحب نے اپنے مراسلے میں مسلم لائبریری کی خدمات پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور آخر میں زعمار قوم کی چند رائیں بھی پیش کی ہیں جس سے لائبریری کی افادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی زبان کے موجودہ رجحان ارتقا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی قوم کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ قومی زبان کے نشو ونما کے لیے ہر ممکن کوشش کرے، قوموں کی زندگی بڑی حد تک ان کے ادب سے وابستہ ہوتی ہے، اس نظرئے کے ماتحت مسلم لائبریری بنگلور امداد کی جائز طور پر مستحق ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی ایک قومی خدمت ہے،

ضمیمہ رسالہ "جامعہ" جنوری سنہ ۳۸ء

ڈاکٹر ذاکر حسین

وردھا ایجوکیشن کمیٹی کی رپورٹ

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور

قیمت ۲ر

دہلی ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء

مہاتما گاندھی   صدر آل انڈیا نیشنل ایجوکیشن کانفرنس وردھا

کی خدمت میں

مہاتماجی

میں آپ کی خدمت میں اس کمیٹی کی رپورٹ پیش کرتا ہوں جو وردھا کانفرنس نے ۲۳ اکتوبر ۳۷ء کو اس لئے بنائی تھی کہ کانفرنس کی تجویزوں کو سامنے رکھکر بنیادی تعلیم کی ایک اسکیم تیار کرے۔

کمیٹی کے اُن ممبروں نے جو وردھا میں موجود تھے ۲۴ اکتوبر کو آپ سے مل کر بات چیت کی تھی۔ اس کے بعد دوسری تیسری نومبر کو کمیٹی کے اور سب ممبر وردھا میں اکٹھے ہوئے۔ صرف پروفیسر کے، ٹی، شاہ کسی ضروری کام کے سبب سے نہیں آسکے۔ ۲۲، ۲۳، ۲۴ نومبر کو پھر یہ کمیٹی وردھا میں ہوئی مگر پروفیسر سیدین نہیں آسکے اور پروفیسر کے، ٹی، شاہ صرف پہلے دن شریک ہوئے۔ آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ کمیٹی کے ممبروں نے دوستوں کی طرح سر جوڑ کر بات چیت کی اور ہر ایک نے معاملے کو سلجھانے کی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ ہم لوگوں نے اس رپورٹ کے ساتھ شہادتیں نہیں لکھیں لیکن ہم ان سب دوستوں کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اُس معاملے کے متعلق جو ہمارے سامنے تھا اپنی رائے لکھ کر بھیجی تھی۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس رپورٹ میں بہت سی باتوں کی کمی ہے۔ کچھ تو اپنی کمی کی وجہ سے اور کچھ وقت تھوڑا ہونے کی وجہ سے ہم اس سے اچھی رپورٹ پیش نہیں کرسکے۔ اس میں ایک کمی یہ ہے کہ ہم نے کتائی اور بُنائی کے سوا کسی اور ہاتھ کے کام کا پورا نصاب (سِلے بس) نہیں دیا ہے۔ اگر اور وقت ملتا تو ہم بہت خوشی سے اور کاموں کا نصاب بھی پیش کرتے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم دوسری دستکاریوں کو جو تعلیم کے لئے اتنی ہی اچھی یا اس سے بھی اچھی ہیں ضروری نہیں جانتے۔ ہمیں امید ہے کہ آگے چل کر جب ہم آپ کی ہدایت کے مطابق ہر درجے کا پورا نصاب الگ الگ بنائیں گے تو اُس میں کھیتی اور باغ کے کام کا بھی پورا نقشہ پیش کریں گے۔

ہم صوبوں کی حکومتوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے ہمیں بہت سی کام کی باتیں لکھ کر بھیجیں

خاص کر ہم حکومت بہار کی حکومت کا احسان مانتے ہیں کہ اُس نے ایک تعلیم کا افسر اور ایک زراعت کا افسر بھیج دیا تھا کہ جب ہمیں ضرورت ہو ہمارے کام میں مدد دے۔ آریا نائیکم صاحب اور آشا دیوی صاحبہ ہماری کمیٹی کے ممبر تھے۔ یہ بھی ہمیں خاص طور پر اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انھوں نے خط و کتابت کے بھاری کام کو بہت اچھی طرح نبٹایا اور ہمارے جلسوں کے لئے جن کاموں کی ضرورت تھی اُن کو بہت اچھی طرح کیا۔

میں اپنی طرف سے مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے اسٹاف کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میرے کام میں دل سے مدد کی اور مجھے اپنی قیمتی معلومات اور وقت سے فائدہ اٹھانے کا پُورا موقع دیا۔

ہم یہ رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سچے دل سے امید کرتے ہیں کہ آپ کی رہنمائی میں یہ اسکیم ہمارے ملک میں تعلیم کے ایک اچھے نظام کی بنیاد ثابت ہوگی۔

نیاز مند

ذاکر حسین

چیرمین

مضمونوں کی فہرست

پہلا حصہ

بنیادی اصول

آج کل کا تعلیمی نظام

مہاتما گاندھی کی رہنمائی

اسکول میں بچے کا کام

دو ضروری شرطیں

شہریت کا وہ خیال جو اس اسکیم میں سامنے رکھا گیا ہے

اپنا خرچ آپ نکالنا اور یہ اسکیم

دوسرا حصہ

مقصد

بنیادی تعلیم کے سات سال کے کورس کا خاکہ

بنیادی دستکاری

مادری زبان

ریاضی

سماج کا علم

عام سائنس

ڈرائنگ

موسیقی

ہندوستانی

تیسرا حصّہ

اُستادوں کی ٹریننگ

اُستادوں کی ٹریننگ کا پُورا کورس

اُستادوں کی ٹریننگ کا چھوٹا کورس

چوتھا حصّہ

نگرانی اور امتحان

(الف) نگرانی

(ب) امتحان

پانچواں حصّہ

انتظام

پہلا حصّہ

بُنیادی اصول

آج کل کا تعلیمی نظام | تعلیم کا جو نظام آج کل ملک میں چل رہا ہے اُسے قریب قریب سارے ہندوستانی بُرا کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں وہ قومی زندگی کی اٹل ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکا اور اُس کی طاقتوں کو ٹھیک راستے پر نہیں لگا سکا۔ آج جب کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اور قوموں کی زندگی نئے روپ لے رہی ہے، ہماری تعلیم زندگی کے اصلی دھارے سے الگ اپنے اُسی پُرانے ڈھرّے پر چلی جا رہی ہے اور بدلے ہوئے حالات سے میل نہیں کھا سکتی۔ نہ تو وہ ہماری روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور نہ اُس کے سامنے کوئی ایسا اونچا خیال ہے جو قوم کے مردہ جسم میں جان ڈال دے۔ وہ بچوں کو یہ نہیں سکھاتی کہ سماج کے مفید رکن بنیں، اپنا بوجھ آپ اُٹھائیں، اور قوم کے کام میں اچھی طرح حصہ لیں۔ اُس کو چاہئے تھا کہ ایسی سماج کی جگہ جس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتا ہے، ایک دوسرے کو لوٹتا اور دباتا ہے نئی سماج کا ڈول ڈالے جس میں سب مل کر کام کرتے ہیں۔ مگر اسے تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لئے ہر طرف سے یہ پکار ہے کہ تعلیم کے اس نظام کو بدل کر ایک نیا نظام بنایا جائے جس کی نیو انسانوں کی ہمدردی اور بھلائی پر رکھی گئی ہو، جو قوم کی ضرورتوں اور خیال سے میل کھاتا ہو اور اس کی اٹل ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔

تعلیم کی جو اسکیم ہندوستان کے بچوں کے لئے بنائی جائے وہ کچھ باتوں میں اُس اسکیم سے بالکل الگ ہوگی جو پچھم کے ملکوں میں بنائی گئی ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کی زندگی کا راستہ الگ ہے۔ اس نے ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اہنسا کا طریقہ لیا ہے۔ ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا ہے۔

مہاتما گاندھی کی رہنمائی | اور میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مہاتما گاندھی کی سوجھ بوجھ اور رہنمائی آڑے وقت میں ہمارے کام آئی۔ انھوں نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی راہ نکالیں گے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہو اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے۔ ان کی اسکیم کا بنیادی

خیال جو انھوں نے ہزیجنس کے مضمونوں میں اور وردھا کی تعلیمی کانفرنس میں ظاہر کیا تھا یہ ہے۔ صحیح تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسی دستکاری سکھائی جائے جس سے کچھ کمایا جا سکے اور اسکول کے سارے مضمون اسی دستکاری کے ذریعے سے پڑھائے جائیں۔ اگر دستکاری کی تعلیم اچھی طرح دی جائے تو اس سے اسکول کے پڑھانے والوں کا خرچ نکل آنا چاہئے۔ ان کے خیال میں اس سے حکومت کو بے فیس کی لازمی بنیادی تعلیم کے جاری کرنے میں مدد ملے گی۔ اگر یہ نہ ہوا تو آج ملک کی جو سیاسی اور مالی حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے بنیادی تعلیم کا خرچ اٹھانا حکومت کے بس کی بات نہیں ہے۔

اسکولوں میں ہاتھ کا کام | آج کل قریب قریب سب تعلیم کے ماہروں کی رائے ہے کہ بچوں کو کسی مناسب دستکاری کے ذریعے سے تعلیم دینا چاہئے۔ یہ انسان کی پوری تعلیم کا سب سے اچھا طریقہ سمجھا جاتا ہے۔

بچوں کی طبیعت کے لحاظ سے دیکھئے تو اس میں یہ اچھائی ہے کہ نری دماغی تعلیم کا بوجھ ہٹ جاتا ہے۔ ایسی تعلیم سے بچے جنھیں ہاتھ سے کام کرنے کا شوق ہوتا ہے بہت گھبراتے ہیں اور ان کا یہ گھبرانا برا نہیں بلکہ اچھا ہے۔ دستکاری کے ذریعے سے ہاتھ اور دماغ کی تعلیم ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ بچے خالی یہی نہیں سیکھتے کہ لکھا ہوا یا چھپا ہوا پڑھ لیں بلکہ وہ چیز سیکھ لیتے ہیں جو اس سے کہیں بڑھ کر ہے یعنی اپنے ہاتھ اور دماغ کے ذریعے سے کوئی مفید کام کرنا۔ یہی تعلیم ہے جو پوری تعلیم کہی جا سکتی ہے۔

سماجی پہلو سے دیکھئے تو اس عملی کام سے جو ساری قوم کے بچے مل جل کر کریں گے ذات پات کے بندھن ٹوٹ جائیں گے، ہاتھ کا کام کرنے والوں اور دماغ کا کام کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جو بیر ہے اور جو دونوں کے لئے برا ہے وہ جاتا رہے گا۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے دلوں میں محنت کی سچی عزت اور سب انسانوں کے ایک ہونے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اور یہ بہت بڑا اخلاقی فائدہ ہے۔

قومی آمدنی کے پہلو سے دیکھئے تو اس سے ہمارے ملک کے کام کرنے والوں میں کمائی کی طاقت بڑھ جائے گی اور وہ اپنے خالی وقت سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائیں گے۔

اور سب چھوڑ کر خاص تعلیمی پہلو سے دیکھئے تو دستکاری کو تعلیم کا ذریعہ بنانے سے بچوں کا علم زیادہ ٹھوس ہو جائے گا۔ اس طرح علم کو زندگی سے لگاؤ پیدا ہو گا اور اس کے سب پہلو ایک دوسرے سے جڑے

ہوئے ہوں گے۔

دو ضروری شرطیں | یہ فائدے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دو باتوں کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ ایک تو جو دستکاری چنی جائے وہ تعلیم کے لئے مناسب ہو۔ اُسے انسان کے بنیادی کاموں اور دلچسپیوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہو اور وہ تعلیم کے پورے کورس میں پھیلائی جا سکے۔ رپورٹ میں آگے چل کر جہاں ہم نے بنیادی دستکاریوں کے چننے کی سفارش کی ہے وہاں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ سب لوگ جنہیں اس اسکیم سے کسی طرح کا تعلق ہے اس کا خیال رکھیں۔ تعلیم کی اس اسکیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ ایسے کاریگر پیدا کئے جائیں جو خالی ہاتھ کا کام کر سکتے ہوں۔ بلکہ یہ ہے کہ دستکاری سے تعلیم کا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ دستکاری صرف اسکول کے کورس کا ایک حصہ نہ ہو بلکہ اور سب مضمونوں کی تعلیم کا طریقہ بھی اسی کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ ہر مضمون کے سکھانے میں اس پر زور دیا جائے کہ سب مل جل کر کام کریں، جو کرنا ہے اُس کا نقشہ پہلے سے سوچ لیں اور ہر چیز میں پوری صحت کا خیال رکھیں۔ جہاں تک ہو سکے ہر بچہ اپنی اپنی ہمت سے کام کرے اور اپنے کام کا ذمہ دار ہو۔ اسی بات کو مہاتما گاندھی نے کہا ہے "دستکاری خالی ہاتھ کے کام کی طرح نہ سکھائی جائے جیسے آج کل سکھائی جاتی ہے بلکہ علمی طریقے سے یعنی بچہ ہر کام کے بارے میں یہ بھی جان لے کہ یہ کیوں اور کس لئے کیا جاتا ہے" مگر بتلانے سے نہیں بلکہ اپنی سمجھ اور اپنے تجربے سے۔ اگر صرف اتنا ہوا کہ کورس میں ایک مضمون بنائی، کتائی یا بڑھئی کا کام بڑھا دیا گیا اور دوسرے مضمون اسی پرانے طریقے سے پڑھائے جاتے رہے تو بچے اسی طرح بے سمجھے سیکھتے رہیں گے۔ علم کے الگ الگ ٹکڑے ہو جائیں گے جن میں کوئی جوڑ نہ ہوگا اور اس اسکیم کا اصل مقصد ہی جاتا رہے گا۔

شہریت کا وہ خیال جو اس اسکیم میں سامنے رکھا گیا ہے | ہم چاہتے ہیں کہ پڑھانے والے اور تعلیم کے ماہر جو اس اسکیم کو چلائیں وہ شہریت کے اس خیال کو اچھی طرح سمجھ لیں جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ ہونے والی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست، معیشت اور تہذیب میں جمہوریت کا رنگ دن پر دن بڑھتا جائے گا۔ نئی پود کو کم سے کم یہ موقع ملنا چاہئے کہ اپنے ملک کے مسئلوں کو اپنے حق کو اور اپنی ذمہ داری کو

سمجھے ۔ ایک بالکل نئے نظام کی ضرورت ہے جس سے لوگوں کو کم سے کم اتنی تعلیم مل جائے کہ وہ شہریوں کے حق اور فرض کو کام میں لا سکیں ۔ پھر آج کل ہر سمجھ دار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہئے یعنی کسی مفید سیوا کے ذریعے سے وہ حق ادا کرنا چاہیے جو سماج کا اس پر ہے ۔ وہ تعلیم جو نکمے آدمی پیدا کرتی ہے (چاہے وہ امیر ہوں یا غریب) ہر طرح سے بُری ہے ۔ یہی نہیں کہ وہ سماج کی کام کرنے اور پیدا کرنے کی طاقت کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ لوگوں کے خیال اور عادت کو بگاڑتی ہے ۔ یہ اسکیم اس لئے بنائی گئی ہے کہ ملک میں کام کرنے والے پیدا ہوں جو ہر مفید کام کو چاہے وہ میلا اٹھانے ہی کا کام ہو عزت کے قابل سمجھیں، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہوں اور ہو سکتے ہوں ۔

جب اسکول کے کام اور سماج کے کام میں اتنا گہرا تعلق ہوگا تو بچے جو برتاؤ اسکول میں سیکھیں گے انھیں باہر آکر برت سکیں گے ۔ اس طرح یہ نئی اسکیم جو ہم پیش کر رہے ہیں ملک کے ہونے والے شہریوں کو اپنی قدر اور عزت کرنا، اپنے آپ کو سدھارنا، سماج کی سیوا کرنا اور مل جل کر کام کرنا سکھائے گی ۔

غرض یہ اسکیم ایسی جماعت کا خیال پیش کرتی ہے جس میں مل جل کر کام کیا جائے، جس میں پڑھنے والوں کو لڑکپن اور جوانی میں جب کہ ان پر ہر چیز کا گہرا اثر پڑتا ہے سماج کی سیوا کی دُھن لگ جائے ۔ اسکول کی تعلیم ہی کے زمانے میں وہ یہ سمجھنے لگیں گے کہ قومی تعلیم کے اس بڑے تجربے میں جو کیا جا رہا ہے وہ خود بھی کام کر رہے ہیں ۔

اپنا خرچ آپ نکالنا اور یہ اسکیم | اس بارے میں کہ یہ اسکیم اپنا خرچ آپ نکالے گی کچھ باتیں کہنا ضروری ہے اس لئے کہ لوگوں نے اس کے معنی کچھ سے کچھ سمجھ لئے ہیں ۔ ہم صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم بنیادی تعلیم کی اس اسکیم کو جس کا خاکہ وردھا کانفرنس نے بنایا تھا، اور جسے ہم اس رپورٹ میں پھیلا کر بیان کر رہے ہیں، ہر حالت میں اچھا سمجھتے ہیں ۔ اگر یہ اپنا خرچ کچھ بھی نہ نکال سکے تب بھی اسے تعلیم کی اچھی پالیسی، اور قوم کی ترقی کی ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے ۔ مگر خوش قسمتی سے یہ اچھی تعلیم اپنے چلانے کا بہت کچھ خرچ بھی نکال لے گی ۔ ہم اس رپورٹ میں دکھائیں گے کہ وردھا کانفرنس کی کھینچی ہوئی حد کے اندر اس تعلیم سے اس کے خرچ کا بڑا حصہ نکل آئے گا ۔ (دیکھو ضمیمہ) ضمیمے میں جو حساب دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ جس اسکول میں کتائی اور

بُنائی بنیادی دستکاری ہو اس کی آمدنی سے اسکول کے خرچ کا کتنا حصہ نکل سکتا ہے۔

اس دستکاری کی آمدنی اور خرچ کا حساب لگانے میں ہمیں کچھ مشکل نہیں ہوئی اسلئے کہ یہ کام پچھلے سترہ برس سے مہاتما گاندھی کی نگرانی میں بڑی اچھی طرح سے ہو رہا ہے۔ مزدوری کا حساب اس شرح سے کیا گیا ہے جو آل انڈیا چرخا سنگھ نے مہاراشٹر میں رکھی ہے۔ دوسری دستکاریوں میں بازار کے بھاؤ سے حساب لگایا جا سکتا ہے۔ مہاتما جی نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت کو اس کا ذمہ لینا چاہیئے کہ اپنے ہوتے اسنے شہریوں کے کام کی پیداوار کو اس بھاؤ پر خرید لے گی۔

"ہر اسکول اپنا خرچ آپ نکال سکتا ہے اس شرط پر کہ حکومت سکولوں میں بنائی ہوئی چیزوں کو خرید لے" (ہریجن - ۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء)

ہم اس رائے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں — اس آمدنی سے جو مالی فائدہ ہوگا اسے چھوڑ کر یوں بھی ہمارا خیال ہے کہ سکھانے والوں اور سیکھنے والوں کے کام کی اچھائی کو جانچنے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ ہونا چاہیئے اگر یہ نہ ہوا تو ڈر ہے کہ کام سست پڑ جائے گا اور اس سے کوئی تعلیمی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ بات تعلیم کے ان ماہروں کے تجربے سے صاف ظاہر ہے جنھوں نے اپنے اسکولوں میں "ہاتھ کا کام" یا "عملی کام" کرایا ہے۔

مگر یہاں ہمیں ایک بات جتا دینا ہے۔ اس اسکیم کے چلانے میں ایک بہت بڑا ڈر اس کا بھی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ آمدنی پر اتنا زور دیا جائے جس سے اس کا تعلیمی اور تہذیبی فائدہ جاتا رہے۔ ایسا نہ ہو کہ سکھانے کا سارا وقت اور دھیان اس میں لگ جائے کہ لڑکوں سے زیادہ سے زیادہ محنت لیں اور دستکاری کی تعلیم کے ذہنی، سماجی اور اخلاقی پہلو کو بھول جائیں۔ اس بات کا استادوں کی تعلیم اور نگرانی کرنے والوں کی ہدایت غرض ہر کام میں ہمیشہ دھیان رہنا چاہیئے۔

دوسرا حصہ

مقصد

جو تھوڑا سا وقت ہم کو ملا تھا اس میں ہم سات برس کی تعلیم کا ایسا پروگرام نہیں بنا سکتے جس میں ہر چھوٹی چھوٹی

چیز کا ذکر ہو پھر بھی ہم الگ الگ سرخیوں کے نیچے یہ لکھے دیتے ہیں کہ نئے اسکولوں میں کیا کام کیا جانا چاہئے۔

ہر صوبے کے تعلیمی بورڈ میں ایک ممبر ہونا چاہئے جو کورس بنانے میں ماہر ہو اور اُس کا یہ کام ہو کہ سات برس کی تعلیم کا پورا کورس بنائے۔ نئے اسکولوں میں استاد قابل لوگوں کی نگرانی میں جو تجربہ حاصل کریں گے اس کی مدد سے وہ کمی جو کورس کے بنانے میں رہ جائے پوری ہو جائے گی۔ پھر بھی ہم اس رپورٹ کا ایک اور ضمیمہ تیار کریں گے جس میں ہر درجے کے کورس کے بارے میں خاص خاص باتیں لکھدی جائیں گی۔

بنیادی تعلیم کے سات سال کے کورس کا خاکہ

۱۔ بنیادی دستکاری | سیکھنے والے کو اُس کام میں جو اس نے اپنے لئے چُنا ہو اتنی مہارت ہو جانی چاہئے کہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اُسے اپنا پیشہ بنا سکے۔

نیچے لکھی ہوئی بنیادی دستکاریاں اسکولوں میں سکھائی جا سکتی ہیں:-

(الف) کتائی اور بُنائی

(ب) بڑھئی کا کام

(ج) کھیتی

(د) پھل اور ترکاریاں پیدا کرنا

(ہ) چمڑے کا کام

(و) کوئی اور دستکاری جس کے لئے مقامی حالات مناسب ہوں اور جو اوپر لکھی ہوئی شرطوں کو پورا کرتی ہو۔

جن اسکولوں میں کتائی اور بُنائی یا کھیتی کے سوا کوئی اور بنیادی دستکاری سکھائی جائے اُن میں بھی سیکھنے والوں کو روئی دُھننا، تکلی کاتنا اور کھیتی باڑی کا معمولی کام بتانا چاہئے۔

۲۔ مادری زبان | مادری زبان کو اچھی طرح سکھانا ساری تعلیم کی بنیاد ہے۔ جب تک کوئی شخص اپنی زبان اچھی طرح نہ بول سکتا ہو اور صحیح اور صاف نہ لکھ سکتا ہو اُس کے خیال میں بھی صحت اور صفائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ مادری زبان کے ذریعے سے بچہ اپنی قوم کے خیالات اور جذبات کے خزانے کو حاصل کرتا ہے۔ اسلئے

اس سے سماجی اور اخلاقی تعلیم کا کام اچھی طرح لیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ذریعے سے بچہ خوب صورت چیزوں کے شوق کو ظاہر کرتا ہے اور اگر اس کے سکھانے کا صحیح طریقہ برتا جائے تو ادب، خوشی، اور تسکین کا سامان بن سکتا ہے۔ سات سال کی تعلیم سے نیچے لکھے ہوئے مقصد حاصل ہو جانے چاہئیں:۔

۱۔ بچہ اپنے آس پاس کی چیزوں، لوگوں، اور واقعات کے بارے میں آسانی سے بات چیت کر سکے اور پھر اسے دھیرے دھیرے اتنی مشق ہو جائے کہ

۲۔ وہ ہر چیز کے بارے میں جس سے اس کو روزمرہ کام پڑتا ہے صاف اور ٹھیک ٹھیک بات چیت کر سکے۔

۳۔ ایسی عبارتوں کو جو زیادہ مشکل نہ ہوں چپ چاپ پڑھ کر سمجھ سکے (کم سے کم معمولی اخباروں اور رسالوں کو آسانی سے پڑھ لے)۔

۴۔ نظم اور نثر کو زور سے پڑھتے وقت اس طرح ادا کر سکے کہ اس کا مطلب صاف ہو جائے اور وہ اس کا لطف اٹھا سکے (اونگھ اونگھ کر پڑھنے کا جو بے جان طریقہ عام طور پر دکھائی دیتا ہے اس کو بالکل چھوڑ دے)۔

۵۔ فہرست، انڈیکس، ڈکشنری اور حوالہ کی کتابوں کو برت سکے اور عام طور پر اپنا علم بڑھانے اور لطف اٹھانے کے لئے کتب خانہ سے کام لے سکے۔

۶۔ صاف، صحیح، اور خاصی تیز رفتار سے لکھ سکے۔

۷۔ صاف اور سادہ عبارت میں روزمرہ کے واقعات کو بیان کر سکے۔ جیسے گاؤں کے عام جلسوں کی رپورٹ لکھنا۔

۸۔ سیدھے سادے نج کے خط اور کاروبار کے خط لکھ سکے۔

۹۔ اچھے اچھے لکھنے والوں کی کتابوں یا ان کے چنے ہوئے ٹکڑوں کو پڑھ کر ان سے واقفیت اور دلچسپی حاصل کر چکا ہو۔

۳۔ ریاضی | اس کے سکھانے کا مقصد یہ ہے کہ بچہ حساب اور جامیٹری کے معمولی سوالوں کو جو اس کی دستکاری

یا گھر کی اور آس پاس کی زندگی سے پیدا ہوں، تیزی سے حل کر سکے۔ اُسے تجارتی حساب اور بہی کھاتے کا کام بھی جاننا چاہیے۔

ہمارے خیال میں یہ مقصد نیچے لکھے ہوئے قاعدوں کو سکھانے اور اُن کی کافی مشق کرانے سے حاصل ہو سکتے ہیں :-

سادہ جوڑ باقی ضرب تقسیم — مرکب جوڑ باقی ضرب تقسیم — معمولی کسر — اعشاریہ کسر — اربعہ — اکائی کا قاعدہ — سود — پیمائش کے ابتدائی قاعدے — عملی ہندسہ (جامیٹری) — بہی کھاتے کا ابتدائی کام —

تعلیم صرف عدد کے جاننے اور برتنے پر ختم نہیں ہو جانی چاہیے۔ اُس کو زندگی کی ضرورتوں سے گہرا تعلق ہونا چاہیئے جو بنیادی دستکاری، اسکول اور جماعت کے روزمرہ کے کاموں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح سے مقداروں اور قیمتوں کا اندازہ کرنے سے بچوں کی عقل اور سمجھ کو ترقی کا پورا موقع ملیگا۔

۴ - سماج کا علم | اس کے مقصد یہ ہیں :-

۱ - بچے کو عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کی ترقی سے دلچسپی ہو جائے۔

۲ - وہ اپنے آس پاس کے سماجی اور ملکی حالات کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اُس کے دل میں اُن کے سدھارنے کا شوق پیدا ہو۔

۳ - اُس کے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آنے والے زمانے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسی سماج کا گھر ہوگا جس کی نیو مل کر کام کرنے اور محبت، سچائی اور نیاؤ پر رکھی جائے گی۔

۴ - وہ شہریت کے حقوق اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح جان لے۔

۵ - اُس میں وہ شخصی اور سماجی خوبیاں پیدا ہو جائیں جن سے کہ آدمی اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں کے بھروسے کے قابل ہو جاتا ہے۔

۶ - سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائے۔

یہ مقصد ایک ایسے کورس سے حاصل ہو جائیں گے جس میں تاریخ، جغرافیہ، شہریت کا علم اور آج کل کے

زمانے کے حالات شامل ہوں اور دُنیا کے مذہبوں کے اصول بتاکر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں۔ شروع اس طرح کرنا چاہئے کہ بچہ اپنے آس پاس کے حالات اور معاملات کو جانے پھر اُسے اس بات سے دلچسپی پیدا کرانی چاہئے کہ لوگ اپنی اپنی ضرورتوں کو کیونکر پورا کرتے ہیں۔ اس طرح اُس کے دل میں دوسرے لوگوں کی زندگی اور کام کے جاننے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔

۱۔ دنیا کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا خاکہ کھینچ کر بتایا جائے۔ انسانوں کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے بڑے بڑے واقعات پر خاص زور دیا جائے اور یہ دکھایا جائے کہ کس طرح دھیرے دھیرے سیاست اور تہذیب کے لحاظ سے لوگوں میں میل جول پیدا ہوتا گیا۔ محبت، سچائی، بنیاؤ، مل جل کر کام کرنا، قوم کا ایکا، انسانوں کی برابری اور برادری ان سب باتوں پر زور دینا چاہئے۔ چھوٹے درجوں میں تاریخ اس طرح پڑھائی جائے کہ خاص خاص لوگوں کی زندگی کے حالات بتادئے جائیں اور بڑے درجوں میں اس طرح کہ سماج کی پوری زندگی اور تہذیب کی ترقی دکھائی جائے۔ اس کا بہت خیال رکھا جائے کہ کہیں پچھلے زمانے پر فخر کرنے کا یہ انجام نہ ہو کہ بچوں کو اپنی قوم پر بے جا گھمنڈ ہو جائے کہ اس کے سوا سب کو برا سمجھنے لگیں۔ جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعے سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہمسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہمسا، دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو۔ ہندوستانی قوم کے جاگنے کی تاریخ اور ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی آزادی کی کوششوں کا حال بتا کر بچوں کو اس کے لئے تیار کرنا چاہئے کہ ہنسی خوشی اس بوجھ کو ٹھا سکیں اور اس بدلتے ہوئے زمانے کی کڑیاں سہہ سکیں۔ قومی تہواروں اور قومی ہفتے کا منانا ہر اسکول کی زندگی میں ایک خاص چیز ہونی چاہئے۔

۲۔ بچوں کو پبلک کے فائدے کی چیزیں، پنچایت، امداد باہمی کی انجمن، سرکاری ملازموں کے فرض، ڈسٹرکٹ بورڈ یا میونسپلٹی کا قاعدہ قانون، یہ سب جاننا چاہئے۔ انھیں جاننا چاہئے کہ ووٹ کیا ہے اور کس طرح کام میں لایا جاتا ہے۔ ایسی کونسلوں سے جن کے ممبروں کو لوگ چن کر بھیجتے ہیں کیا فائدہ ہے۔ یہ پہلے کس طرح

نہیں اور پھر کیونکر ترقی کرتی رہیں۔ ان چیزوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو خالی کتابی نہ ہو بلکہ زندگی کے واقعات سے گہرا تعلق رکھتی ہو۔ اسکولوں میں ایسے کام کیے جائیں جن کے ذریعے سے بچوں کو سوراج کا طریقہ سکھایا جائے۔ ہو سکے تو اسکول کا اپنا اخبار ہو نہیں تو بچے باہر کا کوئی اخبار مل جل کر پڑھتے رہیں جس سے انہیں روزمرہ کے خاص خاص واقعات معلوم ہوتے رہیں۔

۴۔ سماج کے علم کے کورس میں دنیا کے جغرافیہ کا خاکہ، ہندوستان کا پورا حال اور دوسرے ملکوں سے اس کا تعلق بتایا جائے۔ اس میں نیچے لکھی ہوئی باتیں ہونی چاہئیں:۔

(الف) اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے پودوں، جانوروں اور انسانوں کی زندگی اور اس پر آس پاس کے جغرافی حالات کا اثر (کہانیاں، بیان، تصویریں سب سے کام لینا، قدرتی چیزوں کو آنکھوں سے دکھانا، ہر چیز میں مقامی حالات کا حوالہ دینا)۔

(ب) موسم کے حالات کو سمجھنا اور سمجھانا (یہ زیادہ تر باہر کا کام ہے جیسے سورج کو دیکھنا او یہ معلوم کرنا کہ ہر موسم میں اس کی اونچائی میں کیا فرق ہوتا ہے، ہوا کا رخ بتانے والے آلے سے اس کا رخ معلوم کرنا، تھرمامیٹر اور بیرومیٹر سے ہوا کی گرمی اور دباؤ کو معلوم کرنا۔ اس کو لکھنے اور بتانے کے طریقے۔ مینہ کے برسنے کا حساب رکھنا وغیرہ)

(ج) نقشہ دیکھنا اور نقشہ بنانا، گولے پر دنیا کا نقشہ دیکھنا، آس پاس کے مقامات کو دیکھنا اور ان کا نقشہ سمجھنا، نشانوں کو پہچاننا، اٹلس اور اس کے انڈکس کو برتنا۔

(د) آنے جانے اور چیز بھیجنے کے ذریعے اور زندگی اور کاروبار سے ان کا تعلق معلوم کرنا۔

(ہ) مقامی پیشوں کھیتی اور صنعت کا حال معلوم کرنا۔ (کھیتوں اور کارخانوں میں جا کر) مختلف علاقوں کا اپنی ضرورتیں آپ پوری کرنا یا ایک دوسرے کا پابند ہونا۔ کھیتی اور صنعت کے طریقوں کا مقامی حالات کے مناسب ہونا۔ ہندوستان کی بڑی بڑی صنعتیں۔

۵۔ عام سائنس | اس کے مقصد یہ ہیں:۔

۱۔ بچوں کو اس قابل بنانا کہ آس پاس کی دنیا کو سمجھ سکیں۔

۲ - انھیں اس کی عادت ڈالنا کہ چیزوں کو صحیح طور پر دیکھیں اور جو دیکھنے ہیں اسے تجربہ کر کے جانچیں -

۳ - انہیں اس قابل بنانا کہ سائنس کے ان بڑے اصولوں کو سمجھ سکیں جس کی مثالیں :-

(الف) اُس پاس کی قدرتی چیزوں

(ب) سائنس کو انسان کے کام میں لانے میں ملتی ہیں -

۴ - انھیں بڑے بڑے سائنس والوں کے حالات بتانا جنھوں نے علم کے لئے قربانیاں کی ہیں۔

تاکہ ان کے دل پر اثر پڑے -

کورس میں کئی سائنسوں کے نیچے لکھے ہوئے مضمون شامل ہونے چاہئیں :-

(الف) آس پاس کی دنیا کا علم

آس پاس کے پودوں، جانوروں اور چڑیوں کا حال جاننا -

فصلوں کے بدلنے اور اس اثر کا علم جو اس سے پودوں، جانوروں، چڑیوں اور انسانوں کی زندگی

پر پڑتا ہے - ہر فصل کی پیداوار کو پانا -

(ب) پودوں کا علم

پودے کے الگ الگ حصے اور ان کے کام

پودے اگنا، بڑھنا اور پھیلنا -

اسکول کے باغ اور آس پاس کے کھیتوں میں کام کرا کر بچوں کو سمجھانا کہ تری، گرمی اور روشنی کی

مختلف حالتوں اور بیج اور کھاد کی مختلف قسموں کا کیا اثر پڑتا ہے -

(ج) جانوروں کا علم

بیماری کے کیڑوں، اڑنے والے اور رینگنے والے کیڑوں، چڑیوں اور جانوروں کا حال معلوم کرنا

اور یہ جاننا کہ ان میں کون انسان کے دوست اور کون دشمن ہیں -

(د) بدن کا علم

انسان کا جسم - اس کے عضو اور ان کے کام -

(ہ) صحت اور صفائی کا علم

جسم کی صحت - دانتوں، زبان، ناخونوں، آنکھوں، بالوں، ناک، کان کھال اور کپڑوں کی صفائی -

گھر اور گاؤں کی صفائی صحت کا انتظام - میلا ٹھکانے کا انتظام -

صاف پانی - گاؤں کا کنواں

صاف ہوا - درختوں کا کام ہوا کی صفائی میں - ٹھیک سانس لینا صحت کے لئے اچھا اور برا کھانا

وہ کھانا جس میں سب ضروری چیزیں شامل ہوں -

زخمیوں اور بیماروں کی مدد اور معمولی دوا علاج -

چھوت - چھوت کی بیماریاں - ان سے کیونکر بچ سکتے ہیں -

پاک زندگی سے صحت قائم رہتی ہے -

(و) جسم کی تربیت

کھیل - کسرت - ڈرل (دیسی کھیلوں کا شوق دلایا جائے)

(ز) آسان کیمیا

ہوا، پانی، تیزاب، نمک وغیرہ کیا ہیں اور کیوں کر بنتے ہیں

(ح) ستاروں کا علم

جس سے رات کو رستہ پہچان سکیں -

(ط) کہانیاں

سائنس دانوں اور نئے ملک ڈھونڈھنے والوں اور ان کے کاموں کی جو انھوں نے انسان کی بھلائی کے لئے کئے -

۶ - ڈرائنگ | اس کے مقصد یہ ہیں :-

۱ - آنکھ کو شکلوں اور رنگوں کے پہچاننے اور ان میں فرق کرنے کی مشق -

۲ - شکلوں کو یاد رکھنے کی مشق -

۳ - قدرت کی اور آرٹ کی خوبصورت چیزوں کو جاننا اور ان سے لطف اٹھانا۔

۴ - چیزوں کا اچھا نقشہ سوچنا اور سجاوٹ کا کام۔

۵ - دستکاری میں جو چیزیں بنانی ہیں ان کی ڈرائنگ۔ یہ مقصد اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔

(الف) بچے جن چیزوں کو دیکھیں یا پڑھیں ان کی ڈرائنگ کریں۔

(ب) نمونے سے اور یاد سے پودوں، جانوروں انسانوں وغیرہ کی شکلیں کھینچیں (یہ کام سائنس، دستکاری وغیرہ کے سلسلے میں)۔

(ج) چیزوں کے نقشے سوچیں اور بنائیں۔

(د) اسکیل، گراف، اور تصویروں کی ڈرائنگ کریں۔

پہلے چار سال میں ڈرائنگ کا کام پڑھائی اور سائنس اور دستکاری کی شکلیں بنانے کے سلسلے میں ہونا چاہیئے۔ بعد کے تین سال میں، نقشہ سوچنے، سجاوٹ کے کام اور باقاعدہ ڈرائنگ پر زور دینا چاہیئے۔ تاکہ بچے اپنے کام کے سلسلے میں صحیح شکلیں بنا سکیں۔

۷ - گانا | اس کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اچھے گیت یاد ہو جائیں اور انہیں اچھے گانے کی پہچان اور شوق ہو جائے بچوں میں تال کا جو قدرتی احساس ہوتا ہے اسے ترقی دینے کے لئے انہیں دونوں ہاتھوں سے تال دینا سکھایا جائے۔ قدم ملا کر ایک خاص تال کے ساتھ چلنے سے بھی اس میں مدد مل سکتی ہے۔

اس کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ صرف اچھے گیت چنے جائیں جن کا اخلاقی اثر بھی اچھا ہو۔ ان کا مضمون بھی پاک اور اونچا ہونا چاہیئے۔ مل کر گانے پر خاص زور دیا جائے۔

۸ - ہندوستانی | ہندوستانی کو اسکول کورس میں لازمی رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ قومی اسکولوں میں پڑھتے ہوئے بچے، دیس کی عام زبان تھوڑی بہت جانتے ہوں اور بڑے ہو کر ہندوستان کے دوسرے صوبے کے لوگوں کے ساتھ آسانی سے کام کر سکیں۔ اس زبان کو سکھانے میں اُستاد کو بچوں کے دل میں یہ بات بٹھا دینا چاہیئے کہ یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا سب سے بڑا اور اچھا پھل ہے۔ یہ ان کے اچھے سے اچھے خیالات اور جذبات کا خزانہ ہے۔ انہیں زبان کی بڑائی اور طاقت پر فخر کرنا چاہیئے۔ اور دل سے اُس کی

سیوا کرنے کا شوق ہونا چاہئے۔

جن علاقوں میں ہندوستانی بولی جاتی ہے اُن میں یہ مادری زبان ہوگی لیکن بچوں اور اُستادوں دونوں کے لئے لازمی ہوگا کہ ناگری اور فارسی دونوں خط سیکھیں تاکہ ہندی اور اردو میں لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھ سکیں دوسرے علاقوں میں جہاں صوبے کی زبان مادری زبان ہوگی ہندوستانی پانچویں اور چھٹے درجے میں لازمی رکھی جائے گی لیکن بچوں کو دونوں خطوں میں سے ایک خط چننے کا اختیار ہوگا۔ لیکن اُستادوں کو دونوں طرح کے بچوں سے کام پڑے گا اس لئے اچھا ہے کہ وہ دونوں خط سیکھ لیں۔

کم سے کم ہر اسکول میں دونوں خطوں کے سکھانے کا کافی انتظام ہونا چاہئے۔ کورس کا عام خاکہ پانچویں درجے تک لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک ہی ہوگا۔ چوتھے اور پانچویں درجے میں لڑکیوں کے لئے عام سائنس کے کورس کو بدل کر اس میں گھر کے کام کاج کا علم بھی شامل کرنا چاہئے۔ چھٹے اور ساتویں درجے میں لڑکیوں کو اجازت ہوگی کہ بنیادی دستکاری کی جگہ گھر کے کام کاج کا اونچا کورس لے سکیں۔

تیسرا حصّہ

اُستادوں کی تعلیم

شاید اس اسکیم کے چلنے کی سب سے ضروری شرط اُستادوں کی اچھی تعلیم ہے۔ یوں بھی عام طور پر جیسے اُستاد ہوتے ہیں ویسی ہی تعلیم ہوا کرتی ہے لیکن جب تعلیمی نظام کو ایک سرے سے بنانا ہو تو اچھے اُستادوں کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ اُستاد نئے تعلیمی اور سماجی خیالات کو جو اس اسکیم میں سامنے رکھے گئے ہیں اچھی طرح سمجھتے ہوں اور اُن کو عمل میں لانے کا شوق اور جوش رکھتے ہوں۔

چونکہ اُن کو صرف کتابی مضمون نہیں بلکہ دستکاریاں بھی سکھانی ہوں گی اس لئے اُن کی تعلیم میں کئی بنیادی دستکاریوں کا اچھی طرح جاننا بھی شامل ہونا چاہئے۔

انھیں ہر مضمون نئے طریقے سے پڑھانا ہوگا۔ سب مضمونوں کو علم کے الگ الگ ٹکڑے نہیں بلکہ ایک ہی

کام کے حصے سمجھیں گے جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ اُستادوں کو کام کے نقشے سوچنا، پڑھائی کے مضمونوں میں تعلق پیدا کرنا اور اس طرح علم، زندگی اور کام کو ایک دوسرے سے جوڑنا سکھایا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سماج کی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اسکول اور سماج کے گہرے تعلق کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

نئی اسکیم کو صحیح طریقے سے چلانے کے لئے ان باتوں پر خاص زور دینا چاہئے۔ ان کے علاوہ اُستادوں کو اور ضروری چیزیں بھی جاننا چاہئے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

ٹریننگ اسکول میں داخلے کے لئے یہ شرط ہونی چاہئے کہ امیدوار کسی قومی یا سرکاری طور پر مانے ہوئے مدرسہ میں میٹریکولیشن تک پڑھ چکا ہو یا ورنیکولر فائنل یا اُس کے برابر کوئی اور امتحان پاس کرنے کے بعد کم سے کم دو برس پڑھانے کا تجربہ حاصل کر چکا ہو۔

اُستادوں کی تعلیم کا پورا کورس
(تین سال کا)

۱۔ (الف) روئی بونا، اُٹھانا، دُھننا (یا اُون کا دھونا) اون اور سوت کا تنا اور تانا لگانا۔

(ب) چرخے (یا اوزاروں کا جن سے بنیادی دستکاری میں کام لیا جائے) کے مستری کا کام۔

(ج) گاؤں کی صنعتوں کا اور خاص طور پر اپنی چنی ہوئی دستکاری کا معاشی علم۔

(د) بڑھئی کا معمولی کام جس کی چنی ہوئی صنعت میں ضرورت پڑے۔

۲۔ ان بنیادی صنعتوں میں سے کوئی ایک سیکھنا۔

(الف) کتائی، وُبنائی

(ب) کھیتی

(ج) ترکاری اور پھل اُگانا

(د) بڑھئی کا کام

(ہ) کھلونے بنانا

(د) چمڑے کا کام

(س) کاغذ بنانا

یا کوئی دستکاری جو کسی علاقے کے لئے مناسب سمجھی جائے۔

۳ - تعلیم کے نیچے لکھے ہوئے اصول۔

(الف) دستکاری کے ذریعہ تعلیم دینے کا بنیادی خیال۔

(ب) اسکول کا تعلق سماج سے۔

(ج) بچوں کی طبیعت کے علم کا ایک آسان خاکہ (جہاں تک ہو سکے اس کا تعلق تجربے اور واقعات سے ہو) اور وہ اصول جن کے مطابق آدمی کام سیکھتا ہے۔

(د) پڑھانے کے طریقے۔ خاص کر کام کے نقشے سوچنا اور ان پر عمل کرنا۔

(ہ) نئی تعلیم کے مقصد اور ان کا تعلق ملک کی زندگی کے اصلی حالات سے۔

۴ - بدن کے علم صحت اور صفائی کے علم اور کھانے پینے کے علم کا ایک خاکہ جس کا تعلق گاؤں کے روزمرہ کے مسئلوں سے ہو۔

۵ - سماج کے علم کا جو کورس بنیادی تعلیم میں پڑھایا گیا ہے اُسے دوہرانا اور آگے بڑھانا تاکہ اُستاد سماج کے طرح طرح کے مسئلوں کو اچھی طرح سمجھ سکے اس کے بعد ایک نظر اس پر ڈالنا چاہئے کہ پچھلے پچاس برس میں ہندوستان کا اور دنیا کے دوسرے ملکوں کا کیا حال رہا ہے۔

۶ - مادری زبان کی پڑھائی جس کے ذریعے سے اُستاد ہندوستان کے آرٹ اور ادب کے چوٹی کے نمونوں سے واقف ہو جائے اور ملکی تہذیب کی عام بنیاد کو سمجھ سکے۔

۷ - ہندوستانی کا علم فارسی اور ناگری دونوں خطوں کا لکھنا اور پڑھنا (یہ نہ صرف ہندوستانی بولنے والے علاقوں میں بلکہ سارے ہندوستان کے سرکاری اور سرکار سے مدد پانے والے مدرسوں میں لازمی ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر اس تعلیم کا بنیادی تہذیبی اور سماجی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

۸ - بورڈ پر لکھنا اور ڈرائنگ بنانا۔

۹ - جسم کی تربیت، ڈرل اور دیسی کھیل -

۱۰ - اُستادوں کی نگرانی میں ان اسکولوں میں پڑھانے کی مشق کرنا جو ٹریننگ اسکولوں کے ساتھ لگے ہوئے ہوں -

ہم چاہتے ہیں کہ ٹریننگ اسکولوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھی ہوں جن میں اُستاد اور شاگرد ہر وقت ساتھ رہ سکیں - ان میں سب کے میل جول سے ہر طرح کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا سامان ہونا چاہئے تاکہ ٹریننگ پانے والے اُستادوں کو اپنی اپنی خاص دلچسپیاں ظاہر کرنے کا موقع ملے اس لئے ہم ٹریننگ اسکولوں کے اُستادوں کو توجہ دلاتے ہیں کہ انھیں اپنے شاگردوں کے لئے خالی وقت میں طرح طرح کی سماجی دلچسپیوں اور تفریحوں کا سامان کرنا چاہئے -

ان اسکولوں کی کامیابی کا صحیح اندازہ اس سے ہوگا کہ ان میں طرح طرح کی دلچسپیوں اور تفریحوں کا سامان ہو ٹریننگ پانے والے جوش اور شوق کے ساتھ اُن میں شریک ہوتے ہوں - اور اسکولوں کی جماعتی زندگی پر اُن کا اچھا اثر پڑتا ہو -

شاید اس کورس کو دیکھ کر لوگوں کو یہ خیال ہو کہ یہ بہت بھاری ہے اور اس کا پڑھانا قابل عمل نہیں ہے - ہم اس خیال کو دور کرنا اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اگر ٹھیک طریقے سے کام لیا جائے تو یہ کورس اچھی طرح پورا کیا جا سکتا ہے - ایک تو یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تین سال کا کورس ہے اور غور کرنے کے بعد اس کا ایک اچھا نقشہ بنایا جا سکتا ہے - دوسرے یہ کہ کچھ سال کے بعد جب یہ اسکیم اچھی طرح چل جائے گی تو ٹریننگ پانے والے وہ لوگ ہوں گے جو نئے اسکولوں میں تعلیم پا چکے ہیں اور دستکاری کی تعلیم اور دوسرے مضمونوں کا بہت سا حصہ پہلے سے سیکھ چکے ہیں - اس لئے ٹریننگ اسکول میں انھیں نئے مضمون سیکھنے نہیں پڑیں گے بلکہ جو کچھ پہلے سیکھ چکے ہیں اُسی کو آگے بڑھانا اور پیشے کے طور پر سیکھنا ہوگا - تیسرے ہم پھر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہاں یہ مقصد نہیں ہے کہ یہ سب مضمون علمی طریقے سے حاصل کئے جائیں (کیونکہ اس سے کام بہت مشکل ہو جائے گا) بلکہ صرف یہ ہے کہ شہریت، صحت اور صفائی، زخمیوں اور بیماروں کی مدد، بچوں کے طبیعت کے علم اور طریقۂ تعلیم کے عملی مسئلے جو اسکول میں پیدا ہوتے ہیں سکھا دئے جائیں - ہاں ہمیں امید یہ ضرور ہے کہ اگر ٹریننگ پانے والے کے

دل میں اپنے پیشے کا شوق اور علمی دلچسپی پیدا کردی جائے گی تو ان میں سے بہت سے لوگ مضمونوں کی تعلیم کو اپنے طور پر جاری رکھیں گے اور آگے بڑھ جائیں گے لیکن جہاں تک کہ اس تین سال کی تعلیم کا تعلق ہے ہمارا مقصد عالم فاضل پیدا کرنا نہیں بلکہ ہوشیار سمجھدار پڑھے لکھے دستکار پیدا کرنا ہے جو صحیح خیالات اور سماج کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں اور قوم کے بچوں کو اس تعلیمی اسکیم کا مقصد اور اس کی قیمت سمجھا سکے۔

استادوں کی تعلیم کا چھوٹا کورس

اس اسکیم کو جلد سے جلد شروع کرنے کے لئے ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ اس وقت کی ضرورت کو سامنے رکھکر ان استادوں کو جو موجودہ اسکولوں، قومی مدرسوں اور آشرموں سے خاص طور پر چنے گئے ہوں ایک سال کا چھوٹا کورس پڑھایا جائے۔ یہ چنے ہوئے استاد ایسے ہوں جنہیں پڑھانے کے کام یا دستکاری کا اچھا تجربہ ہو اور جن سے یہ امید ہو کہ وہ اس اسکیم کو صحیح طریقے سے سمجھ کر اور جوش کے ساتھ چلا سکیں گے۔ ان استادوں کی تعداد ہر صوبے میں اُن اسکولوں کے لحاظ سے مقرر ہونی چاہئے جو شروع میں کھولے جائیں گے۔

ان استادوں کے کورس میں نیچے لکھی ہوئی چیزیں ہونی چاہئیں:۔

(الف) دھنائی اور تکلی کی کتائی۔ یہ ہر ایک کے لئے لازمی ہو گی چاہے اس نے اپنے لئے کوئی بنیادی دستکاری بھی چنی ہو۔

(ب) جن بنیادی دستکاریوں کا ذکر اوپر آچکا ہے ان میں سے کوئی ایک تاکہ استاد اسکول کے پہلے تین درجوں میں تعلیم دینے کے قابل ہو جائے۔

(ج) بدن کے علم صحت اور صفائی کے علم اور کھانے پینے کے علم کا ایک چھوٹا کورس۔

(د) دستکاری کے مدرسے اور سماج کی زندگی سے اُس کے تعلق کا بنیادی خیال۔

(ہ) سب مضمونوں کو دستکاری کے ذریعے پڑھانے کے آسان نقشے سوچنا۔

(و) ہندوستانی قوم کے جاگنے کی تھوڑی سی تاریخ، اور اس صدی میں دنیا کی بڑی بڑی تحریکوں کی تاریخ۔

(ز) استادوں کی نگرانی میں کم سے کم ۲۵ سبق پڑھانا۔

چوتھا حصّہ

نگرانی اور امتحان

الف ۔ نگرانی

نئے اسکولوں کے لئے قابل اور ہمدرد نگرانی کرنے والے استادوں کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اچھے اُستادوں کی۔ نگرانی کے کام میں خاص مہارت کی ضرورت ہے اور ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ نگرانی کرنے والوں کی ٹرینِنگ کا خاص انتظام ہونا چاہئے۔ ہمارے خیال میں نگرانی کرنے والے کے لئے کم از کم اس کی ضرورت ہے کہ اُس نے بنیادی اسکول کے اُستاد کی پوری ٹرینِنگ پانے کے بعد دو سال کامیابی کے ساتھ تعلیم دی ہو اور اُس کے بعد ایک سال نگرانی اور انتظام کی خاص ٹرینِنگ پائی ہو۔ نگرانی کرنے والے کو خالی معائنہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ اُستادوں کو اپنا دوست اور ساتھی سمجھ کر اُنھیں اپنے علم اور تجربے سے مدد دینی چاہئے۔ نگرانی اور رہنمائی کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح پورا کرنے کا موقع دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انتظامی اور دفتری کام کا بوجھ جہاں تک ہوسکے کم ہو۔ اس لئے نگرانی کرنے والے کافی تعداد میں ہوں اور اُن کے حلقے بہت بڑے نہ رکھے جائیں۔ اس میں خرچ زیادہ ہوگا لیکن یہاں بچت کرنے میں نقصان ہے۔

ب ۔ امتحان

امتحان کے اس طریقے نے جو ہمارے ملک میں چل رہا ہے تعلیم کو تباہ کر دیا ہے۔ امتحان کی لَے اتنی بڑھا دی گئی ہے جس کا کچھ ٹھکانا نہیں اور اگر تعلیم کے بگڑنے میں کچھ کسر تھی تو وہ اس سے پوری ہوگئی۔ سب ماہروں کی رائے ہے کہ بچوں کا الگ کام یا اسکول کا کام جانچنے کے لئے امتحان کا طریقہ بے جا اور ادھورا ہے۔ یہ ایک من مانی کارروائی ہے جس پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ قومی تعلیم کی اس نئی اسکیم کو اس کے زہریلے اثر سے بچائیں۔

امتحان کا مقصد اس طرح پورا ہوسکتا ہے کہ ہر حلقے میں تعلیمی بورڈ کے انسپکٹر کچھ چُنے ہوئے بچوں کے

کام کا نمونہ دیکھکر اسکولوں کے کام کا اندازہ کرلیں۔ اس طرح سے جانچ کرنے میں تعلیم کے ان ماہروں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے جو کورس بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ جانچ اتنی ہی ہونی چاہئے کہ سارے کورس کو سمیٹ لے اور اس طرح ہونی چاہئے کہ نمبر امتحان لینے والے کی شخصی رائے سے نہ دئے جائیں بلکہ ان اصولوں کے مطابق جنہیں ہر شخص بیان کر سکتا ہو اور سمجھ سکتا ہو۔

نمونوں کو جانچنے کے طریقے سے اسکول کا کام ترقی کرے گا اور کم سے کم چھ ہفتہ کا وقت جو اب امتحان کے لیے تیاری کرانے اور نوٹ لکھوانے اور رٹانے میں خرچ ہوتا ہے بچ جائے گا۔ اس سے یہ کام لیا جا سکتا ہے کہ بنیادی دستکاری میں ہر بچے کی قابلیت دوسرے دوسرے کئی ہفتے تک جانچی جائے اور باقی وقت میں سب بچے اپنے گاؤں کے سدھار کا کام کریں۔

بچوں کے سال بھر کے کام کا ریکارڈ رکھا جائے اور اس کو دیکھ کر استاد انہیں ایک درجہ سے دوسرے درجے میں چڑھانے کا فیصلہ کریں۔ پورے اسکول کے کام کی جانچ اس طرح کی جائے کہ حلقہ کا تعلیمی بورڈ سال میں ایک بار اسکول کے ہر درجے سے کچھ بچوں کا کام نمونے کے طور پر جانچے۔ جہاں تک ہوسکے بچوں سے کسی درجے کا پورا کام یا اس کا بڑا حصہ دوبارہ نہیں کرانا چاہئے۔ اگر درجے میں بہت سے بچے فیل ہوجائیں تو استاد کے کام کی نگرانی کرنے کی ضرورت ہے اگر سارے اسکول میں بہت سے لڑکے فیل ہوں تو اس کے انتظام کی جانچ کرنی چاہئے۔ اور اگر سب ہی اسکولوں میں فیل ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ کورس میں کچھ خرابی ہے۔ اور مختلف درجوں کے لئے ٹھہرائے ہوئے معیار میں کچھ خرابی ہے اس کو دور کرنا چاہئے۔ غرض یہ کسی طرح جائز نہیں کہ لڑکوں سے اسی درجے کا کام پھر سے لیا جائے۔

تعلیمی بورڈ کو اسکول کے کام کا اندازہ ایک تو ان نمونوں کی جانچ سے کرنا چاہئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ دوسرے بنیادی دستکاری میں بچوں کی قابلیت سے تیسرے اس ترقی سے جو استادوں اور شاگردوں کی کوشش سے گاؤں کی یا محلہ کی زندگی میں ہوئی ہے۔ اگر ہر سال ضلع کے اسکولوں کے کام کی نمائش کی جائے تو اس سے کام کا ایک اچھا معیار قائم رکھنے میں بہت مدد ملے گی۔

پانچواں حصّہ

انتظام

۱۔ تعلیم کے جو مقصد ہم نے اوپر (دوسرے حصہ میں) بیان کئے ہیں اُن کو حاصل کرنے کے لئے بچوں کو سات سال تک اسکول میں رہنے کی ضرورت ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لازمی تعلیم سات برس کی عمر پوری ہونے کے بعد سے شروع ہونی چاہیئے۔ چونکہ ہم نے یہ اصول مان لیا ہے کہ بنیادی تعلیم جہاں تک ہو سکے سب بچوں کے لئے ایک ہی ہو اس لئے ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ وہ سات سے چودہ برس کی عمر تک ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے لازمی کر دی جائے۔ ہاں لڑکیوں کے ساتھ اتنی رعایت کر دی جائے کہ اگر اُن کے سرپرست چاہیں تو انھیں بارہ برس کی عمر پوری ہو جانے کے بعد اسکول سے اُٹھا لیں۔

۲۔ ہم اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ہم نے جو پورے سات برس کی عمر کو لازمی تعلیم شروع کرنے کی حد ٹھہرایا ہے اس میں بچے کی زندگی کا ایک اہم حصہ چھوٹ جاتا ہے۔ اس زمانے میں وہ گاؤں کے غریب گھروں میں پلے بڑھے اور بے سمجھ ماں باپ کی نگرانی میں رہ کر جنھیں اپنی زندگی کا ٹھاٹھ ہی مشکل ہے۔ ہمیں اس ضرورت کا پوری طرح احساس ہے کہ حکومت کی طرف سے تین سے لے کر سات سال تک کے بچوں کی تعلیم کا بھی کوئی انتظام کیا جائے لیکن افسوس ہے کہ ملک کے حالات خاص کر مالی مشکلوں کو دیکھتے ہوئے ہم اس کی سفارش نہیں کر سکتے پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ حکومت اس ذمہ داری کو جو آگے چل کر اس پر آئے گی نہ بھولے۔ ہمیں اُمید ہے کہ جب ہماری بنیادی تعلیم کی اسکیم جسے گھر کی زندگی سے گہرا تعلق ہے اچھی طرح چلنے لگے گی تو بچے کو اسکول جانے سے پہلے گھر پر اچھی خاصی تربیت مل سکے گی۔ اس سے بڑی عمر والوں کی تعلیم کو بھی مدد ملے گی جس کی طرف حکومت کو جلد سے جلد توجہ کرنی پڑے گی۔

۳۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ کورس کے مختلف مضمونوں کے پڑھانے میں جو وقت لگے گا اس کا اندازہ کریں ہمارے خیال میں یہ تقسیم مناسب ہوگی۔

بنیادی دستکاری ۳ گھنٹہ ۲۰ منٹ

گانا۔ ڈرائنگ اور حساب	۴۰ منٹ
مادری زبان	۴۰ منٹ
سماج کا علم اور عام سائنس	۳۰ منٹ
کسرت	۱۰ منٹ
بیچ کا خالی وقت	۱۰ منٹ
میزان	۵ گھنٹہ ۳۰ منٹ

یہ اندازہ ہم نے کتائی اور بنائی کو بنیادی دستکاری سمجھ کر کیا ہے۔ دوسری دستکاریوں میں وقت کی تقسیم مختلف ہو سکتی ہے مگر کسی صورت میں بھی بنیادی دستکاری کو اس سے زیادہ وقت نہیں دینا چاہئے جتنا کہ اوپر کے نقشے میں دیا ہے۔

اندازہ ہے کہ اسکول سال میں دوسو اٹھاسی دن کام کرے گا جس کا اوسط مہینے میں ۲۴ دن پڑتا ہے۔

۴۔ بچوں کی مختلف دلچسپیوں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے کم سے کم اسکول کے آخری دو درجوں میں کئی دستکاریوں کا انتظام ہونا چاہئے۔

۵۔ ہماری رائے میں ہر اسکول کے ساتھ اتنی زمین ہونا چاہئے جس میں اسکول کا باغ اور کھیل کا میدان بن سکے۔

۶۔ سائنس والوں کی چھان بین سے یہ ثابت ہوا ہے کہ لڑکوں کو برا کھانا ملنے میں اور ان کے اسکول کے کام میں پیچھے رہنے میں گہرا تعلق ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ گاؤں کے بچوں کو عام طور پر کافی کھانا نہیں ملتا ہم زور کے ساتھ سفارش کرتے ہیں کہ پوری کوشش کرنی چاہئے کہ اسکول کے گھنٹوں میں لڑکوں کو ایک ہلکا سا ناشتہ دے کر یہ کمی پوری کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت کی اور پبلک کی مدد سے اس کا خرچ پورا ہو جائے گا۔

۷۔ اُستادوں کی تنخواہ کے بارے میں ہم گاندھی جی کی اس تجویز کی تائید کرتے ہیں "ہو سکے تو پچیس روپیہ مہینہ ہو لیکن بیس روپے سے کم کبھی نہ ہو"۔ ہمارے خیال میں اونچے درجوں کے لئے شاید زیادہ قابلیت

کے استاد رکھنے کی ضرورت ہوگی اور انھیں اس سے زیادہ تنخواہ دینی پڑے گی۔

۸۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ اس تجربے کے پہلے دو تین سال میں خاص طور پر قابل استاد رکھے جائیں چاہے اُن کی تنخواہ کچھ زیادہ ہو تاکہ چنے ہوئے اسکولوں میں وہ نئے کورس اور نئے طریقہ تعلیم کو چلا سکیں اور اس اسکیم میں جن چیزوں کی کمی رہ گئی ہے انھیں پورا کرسکیں۔ جب شروع کا مشکل کام ہو جائے گا تو معمولی اُستاد جو ہمارے ٹریننگ اسکولوں کی تین سال کی تعلیم پا چکے ہوں گے اچھی طرح کام چلا سکیں گے۔

۹۔ ہماری رائے میں ہر درجے میں بچوں کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ اگر اس سے زیادہ ہوگی تو اُستاد اپنا بھاری کام اچھی طرح انجام نہیں دے سکیگا۔

۱۰۔ اُستادوں کے چُننے میں اُن لوگوں کو ترجیح دینا چاہئے جو اُسی علاقے کے ہوں جہاں اسکول واقع ہے۔

۱۱۔ عورتوں کی ہمت بڑھانے کے لئے کہ وہ تعلیم کے پیشے کو اختیار کریں ان کی ٹریننگ کے لئے خاص آسانیاں ہونی چاہئیں۔

۱۲۔ ٹریننگ اسکول کے امیدواروں کو چننے میں بہت اچھی طرح غور کرنا چاہئے اور اس کے لئے مناسب اصول بنانے چاہئیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جب تک یہ مشکل مسئلہ حل نہ ہوگا یہ اسکیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ تعلیم کے کام کے لئے خاص سماجی اور اخلاقی طبیعت و صفات کی ضرورت ہے اور یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر شخص جو اس پیشے کا اُمیدوار بن کر آتا ہے اُس کے لئے مناسب ہے، اس لئے ہمیں چُننے میں بہت غور اور احتیاط سے کام لینا چاہئے اور جہاں تک ہو سکے صرف اُنھیں لوگوں کو چُننا چاہئے جن کی طبیعت سماج کی سیوا کے لئے خاص طور پر مناسب ہو۔

۱۳۔ ہماری تجویز ہے کہ ٹریننگ اسکولوں میں پڑھنے والوں کے رہنے کا بھی انتظام ہو اُن میں ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگ شامل ہوسکیں اور کھانے پینے اور اُٹھنے بیٹھنے میں چھوت چھات نہ برتی جائے۔

۱۴۔ ان اسکولوں میں دستکاری کی تعلیم دینے کے لئے وہ کاریگر جو اپنے کام میں اُستاد ہوں رکھے جاسکتے ہیں اگر ضرورت ہو تو بنیادی اسکولوں کے اُستادوں کو دستکاری کی تعلیم میں مدد دینے کے لئے اور بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو ٹھیک کرکے بازار میں بھیجنے کے لئے مقامی کاریگروں سے کام لیا جاسکتا ہے۔

۱۵ - ٹریننگ کالجوں اور اسکولوں میں بڑے پیمانے پر ایسے کورس جاری کرنا چاہئیں جن میں اسکولوں کے استاد چھٹی کے زمانے میں اپنا علم تازہ کر سکیں تاکہ ان کی قابلیت قائم رہے اور بڑھتی رہے - یہ کورس کئی طرح کے ہونے چاہئیں - عام تہذیب کے، خاص تعلیم کے سیکھنے کے اور دستکاری کے -

۱۶ - ہر ٹریننگ اسکول کے ساتھ ایسے بنیادی اسکول لگانے چاہئیں جن میں ٹریننگ پانے والوں کو پڑھانے کی عملی تعلیم دی جائے - یہاں تعلیم کے نئے طریقوں کو آزمانا چاہئے - ان اسکولوں میں خاص طور پر قابل استاد رکھے جائیں اور یہ اپنے حلقے کے اور اسکولوں کے لئے نمونے کا کام دیں - دوسرے اسکولوں کے استادوں کو موقع دیا جائے کہ یہاں آکر کام کا طریقہ اور تعلیم کا سامان دیکھیں -

۱۷ - اسکولوں میں دستکاری جاری کرنا، کورس کے مضمونوں کا تعلق ایک دوسرے سے اور زندگی سے قائم کرنا، کام کے ذریعے سے تعلیم دینا، بچوں میں اپنے شوق سے کام کرنے اور سماجی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا، جو اس نئی اسکیم کے خاص مقصد ہیں، تب تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک استادوں اور شاگردوں خاص کر استادوں کے لئے مناسب کتابیں اور سامان مہیا نہ کیا جائے - نمونے کی چیزیں، استادوں کے لئے کتابیں اور سب مضمونوں کی پڑھائی میں تعلق پیدا کرنے کے پروگرام تیار کرنا بہت ضروری ہے - اسی طرح بچوں کے لئے نئی اسکیم کے مطابق بالکل نئی کتابیں لکھوانے کی ضرورت ہے - ہر صوبے کا تعلیمی بورڈ اور قومی تعلیم کا مرکزی ادارہ جس کے قائم کرنے کی ہم نے نیچے سفارش کی ہے اس کام میں بہت مدد دے سکتا ہے - جو صوبے نئے طرز کے اسکول کھولنا چاہتے ہیں انھیں ان ضروری کتابوں اور سامان کے مہیا کرنے کا جلد سے جلد انتظام کرنا چاہئے -

۱۸ - امتحان کے حصے میں ہم نے اس کا ذکر کیا ہے کہ اسکول کے کام کی باقاعدہ جانچ ہر صوبے کے تعلیمی محکمے کا ایک اہم کام ہے - ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہر صوبے کے تعلیمی بورڈ میں تعلیم کے ماہروں کا ایک قابل اسٹاف رکھا جائے - یہ اسٹاف اسکول کے کورس کو لوگوں کی اصلی ضرورتوں کے مطابق بنانے اور استادوں کو کام کے جانچنے کے نئے طریقے سکھانے کے لئے علمی ریسرچ کرتا رہے - اس کا یہ بھی کام ہو کہ تعلیم کے نئے طریقوں کو آزمائے، اس ملک میں اور دوسرے ملکوں میں جو تجربے کئے جا رہے ہیں ان سے

استادوں کو باخبر رکھے اور استادوں اور نگرانی کرنے والوں کی ٹریننگ کی رہنمائی کرے ۔

۱۹ ۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ سرکاری بورڈوں کے علاوہ قومی تعلیم کا ایک الگ غیر سرکاری مرکزی ادارہ قائم کیا جائے جس کے ذمے کوئی انتظامی کام نہ ہو ۔ اس میں ایسے لوگ شامل ہوں جو تعلیم اور دوسرے تہذیبی کاموں میں خاص قابلیت رکھتے ہوں ۔ اس ادارے کے مقصد یہ ہوں گے :۔

(۱) تعلیم کی پالیسی اور عمل کام میں مشورہ دینا ۔

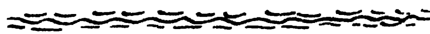
(۲) ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں جو تعلیمی کوششیں کی جا رہی ہیں ، ان کے اصول اور مقصد پر غور کرنا اور اس کے نتیجے سے ان سب لوگوں کو اطلاع دینا جو تعلیمی مسئلوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ۔

(۳) ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں اور دوسرے ملکوں کے تعلیمی کام کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا ۔

(۴) تعلیم کے مسئلوں پر ریسرچ کرنا ۔

(۵) تعلیم کا کام کرنے والوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسالے شائع کرنا ۔

۲۰ ۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ملک کے مختلف محکموں میں جن میں اس کے ہونے والے شہریوں کی بھلائی کے لئے کام کرنا چاہئے آپس میں بہت کم تعلق ہے ۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ تعلیم کے محکمے کو حکومت کے اور محکموں (صحت ، زراعت ، تعمیرات ، امداد باہمی ، لوکل سیلف گورنمنٹ) سے مل کر کام کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ اسکولوں سے تندرست ، خوش حال اور قابل بچے پیدا ہو سکیں ۔



تاریخ و سیاسیات

تاریخ الامّت

از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ ابتدائے رسالت سے آخر زمانۂ خلافت تک تمام ضروری معلومات اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔ ملک کی متعدد یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبا کے لئے خاص طور سے مفید

حصہ اول۔ سیرۃ الرسول	قیمت مجلد عہ	حصہ چہارم۔ خلافت عباسیہ۔	قیمت مجلد عہ
حصہ دوم۔ خلافت راشدہ	" عہ	حصہ پنجم۔ عباسیہ بغداد۔	" عہ
حصہ سوم۔ خلافت بنی اُمیہ	" عہ	حصہ ششم۔ عباسیہ مصر۔	" عہ

حصۂ ہفتم۔ خلافت عباسیہ۔ عہ

جو صاحب مکمل سٹ بہ یک وقت خریدینگے انھیں پورا مجلد سٹ عـ۵ روپے میں دیا جائے گا

انقلاب فرانس

فرانس کی تحریک آزادی اور وہاں کے انقلاب کی تاریخ میں ہمارے لئے بہت سے سبق ہیں جامعہ ملیہ کے ایک لائق فرزند مولوی عبد القادر بی اے (جامعہ) نے انقلاب فرانس پر ایک عالمانہ نظر ڈالی ہے۔ جمہوریت فرانس پر یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

آزادی

یہ جان اسٹورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ ہے جو سیاسیات [illegible] جزو ہے۔ مل انگلستان کے ان چند ارباب فکر میں سے ہے جنہوں نے [illegible] میں اپنا لوہا منوالیا۔ مترجم مسعود [illegible]

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اُردو زبان میں پہلی کوشش

"کلیم" دہلی

زیرِ ادارت شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اِس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ ٹھوس اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب بھی ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے۔ عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے (عہ)، ششماہی تین روپے آٹھ آنے (ﷲ) اور نمونے کے پرچے کیلئے ۹ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

منیجر کلیم، ۱۴ جاتی نواس۔ دریا گنج دہلی

بقائے صحت کیلئے ایک اچھی دوا

اوکاسا OKASA

دماغی کام کرنے والوں کیلئے ایک بہترین چیز ہے

۱ اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔

۲ اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

۳ اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

۴ اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے

سو ٹکیوں کا بکس دس روپے (عہ) — آزمائش کے لئے ۳۰ ٹکیاں چار روپے (للعہ)

اوکاسا کے استعمال سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی ٹکیاں استعمال کی جائیں۔ اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبہ پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے یا ذیل کے پتے سے بھی منگا سکتے ہیں۔

اوکاسا کمپنی برلن، انڈیا لمیٹڈ نمبر ۱۲ ریمپرٹ رو پوسٹ بکس نمبر ۴۹۶ بمبئی

صحیفۂ چین

از

اسد علی انوری فرید آبادی

"صحیفۂ چین" میں چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ پرانے زمانے میں مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی علوم کا معیار کس قدر بلند تھا۔ زبان میں سلاست اور روانی کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

کتابت طباعت نہایت عمدہ اور کاغذ چکنا لگایا گیا ہے۔ کتاب کی جلد بندی میں خاص اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ڈسٹ کور کی رنگینی نے اس کی زینت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۱۸/

مکتبہ جامعہ دہلی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۴

آپ کا بچہ

اگر لکھنے پڑھنے سے جی چراتا ہی تو اسے

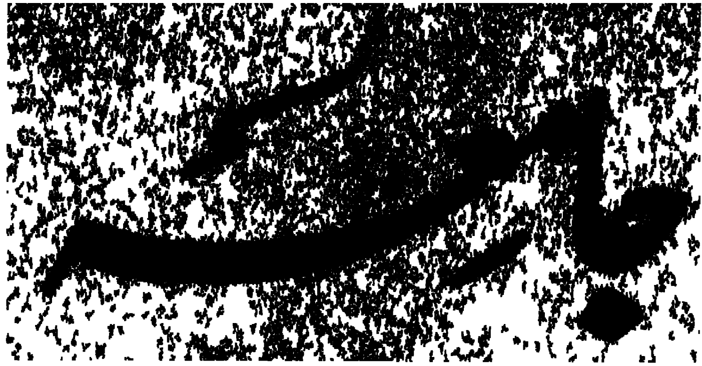
پیام تعلیم باتصویر

پڑھنے کو دیجئے۔ پیام تعلیم کے پر لطف اور مفید تعلیمی مشغلے، اچھی اچھی اخلاقی نظمیں اور عام معلومات کے دلچسپ مضمون دیکھ کر بچہ خود بخود پڑھنے لکھنے کی طرف مائل ہو جائے گا اور اس کا تعلیمی ذوق اس کے مطالعہ سے روز بروز نشو و نما پانے لگے گا۔ بچے جن مضامین کو پڑھنے سے مدرسے میں جی چراتے ہیں پیام تعلیم کے ذریعے نہایت کامیابی سے سیکھ لیتے ہیں اور اپنے ذہن پر کسی قسم کا بار نہیں محسوس کرتے

ابتدائی تعلیم کے ماہرین نے پیام تعلیم کو بچوں کا بہترین رسالہ تسلیم کیا ہے اور ابتدائی مدارس میں بچوں کو اس کا مطالعہ کرانے کی سفارش کی ہے۔

چندہ سالانہ عہ۔ فی پرچہ ۲ر

مکتبہ جامعہ :- دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور



مکتبہ جامعہ دہلی

شعلۂ طور

(طبع ثانی)

شاعرِ فطرت حضرت جگر مراد آبادی کے دیوان "شعلۂ طور" کے دوسرے ایڈیشن میں ترتیب بالکل نئی رکھی گئی ہے جس سے کتاب کی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے، اس کے علاوہ اس ایڈیشن میں بہت کچھ تازہ کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

طبع ثانی کتابت و طباعت کی جاذبیت، جدتِ ترتیب، صحت، صفائی اور بعض دیگر خصوصیات کے لحاظ سے یہ بالکل نئی کتاب ہے۔

قیمت - ۱۲؍

مکتبہ جامعہ

دہلی ، نئی دہلی ، لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ١٨٩٢

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ٢٩	فروری ١٩٣٨ء	نمبر ٢

فہرست مضامین

١	جدید تصوریت	جناب مرزا محبوب بیگ صاحب کاکوری	١٢٩
٢	رنگ و غ	حضرت متین مچھلی شہری	١٦٤
٣	ناٹین کنٹک کانفرنس	جناب محمد احمد صاحب سبزواری بی اے (عثمانیہ)	١٦٥
٤	فیڈریشن یا وفاق	جناب خواجہ محمود حسن صاحب بار ایٹ لا دہلی	١٧١
٥	وردھا کمیٹی کی رپورٹ	جناب خواجہ غلام السیدین صاحب	١٧٧
٦	غزل	حضرت جگر مرادآبادی	١٩٠
٧	معجم المصنفین	جناب مولینا عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی	١٩١
٨	یوم اقبال	جناب مولینا اسلم صاحب ۔ جیراجپوری	٢٠١
٩	نوائے مظلوم	جناب محمود علی خاں صاحب بھوپال	٢٠٦
١٠	تنقید و تبصرہ	ع ۔ ح	٢٠٧

۱۱ ۔ رفتارِ عالم

ا ۔ ممالکِ غیر	م ، م	۲۱۱
ب ۔ اسلامی دُنیا	م ، س	۲۱۶
ج ۔ ہندوستان		
(i) ہندوستان کی مالیات کا مسئلہ ۔ جناب پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے		۲۲۲
(ii) ۱۹۳۶ء کا ریلوے بجٹ جناب ریاض الدین صاحب ایم اے		۲۲۹

قیمت سالانہ صہ ر   فی پرچہ ۸ ر

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

جدید تصوّریت

جدید تصوریت زمانہ حال کے فلسفہ کا سب سے آخری نظریہ ہے۔ اس کو بیشتر فلسفی عموماً نہایت مستند مذہب خیال کرتے ہیں۔ اس کے خاص نمائندے دو اطالوی ہیں: بینی ڈیٹو کروچے (پ ۱۸۶۶) اور گیووانی جینٹائل (پ ۱۸۷۵)۔ فلسفہ کے اس مذہب کو دعویٰ تو عالمگیر استناد کا ہے لیکن یہ اپنے خواص کے لحاظ سے خالص اطالوی ہے کیوں کہ کروچے اور جینٹائل دونوں اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ حسن کاری اور تاریخ کی اہمیت پر زور دے کر دنیا کے بارے میں خالص اطالوی نقطۂ نظر کا اظہار کر رہے ہیں۔

لیکن ہم کو بحث فی الوقت ان کے فلسفے سے ہے اور اس باب میں اگر ہم یہ دیکھیں کہ ان کا ہیگل کے فلسفہ سے کیا رشتہ ہے تو ظاہر ہے ان کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کیونکہ ان کے نظریے اصل میں ہیگل ہی کے فلسفہ کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

ہیگل کے مذہب کے بڑے عقیدے دو ہیں۔

(۱) پہلا یہ کہ فکر ایک زندہ اور فعال حقیقت ہے یعنی کائنات کی پوری وسعتوں میں حقیقی اور موجود اگر کوئی شے ہے تو وہ فکر ہے۔ اس طرح فکر جب کائنات کی واحد موجود شے ہے تو ضروری ہے کہ حقیقت کی گرفت بھی اسی کے ذریعہ ہو۔

(۲) دوسرا یہ کہ بلا واسطہ فکر یا راست تجربہ کے مقابلے میں فکر کی تعمیری وحدت کا درجہ بلند ہے یعنی کلی فکر یا وجود مطلق انفرادی فکر سے بہت زیادہ بلند پایہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ انفرادی فکر میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس کی یہ سرایت ضروری اس لئے ہے کہ انفرادی فکر اسی کی وجہ سے قابلِ فہم بنتی ہے اور ترقی بھی۔

ان عقیدوں کے متعلق ہیگل کا خیال یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور باہم غیر متناقض ہیں لیکن بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ ان میں موافقت نہیں پیدا کی جا سکتی کیونکہ وہ ایک دوسرے کے متناقض ہیں۔

لیکن جہاں پہلے عقیدے سے اطالوی تصوریت نکلی ہے وہاں دوسرے سے فلسفہ کی [illegible]

کہ دوسرے عقیدہ پر زور دیا جائے، چنانچہ انگریزی تصوریت کا ایک نہایت اہم دبستان جس کے سربرآوردہ وکلا بریڈلے اور بوسینکے ہیں وجودِ مطلق کی کلّی اور انفرادی فکر کی جزئی حقیقت پر نہایت شدت سے زور دیتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کا مرکزی عقیدہ ہے، اس عقیدہ کا سب سے نتیجہ خیز نکتہ یہ ہے کہ کائنات ساکن اور مکمل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انفرادی فکر مسلسل ترقی کر سکتا اور اپنی ترقی کے نتایج کو مسلسل ترتیب دے سکتا ہے لیکن کائنات بہرحال وحدت ہے اور مکمل۔ اس کی فطرت میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ عدیم التغیر ہے لیکن انگریز تصوریئین جو کُل کو اپنی جگہ پر بالکل مکمل سمجھتے ہیں اس سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ کائنات مجموعی حیثیت سے محدود اور متناہی ہے، اس کے برخلاف وہ تو ہردم اپنے نئے ہونے کا ہر وقت ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے کیونکہ متناہی صورتوں میں اپنے آپ کو مسلسل ظاہر کرتی ہے۔ اب ہر متناہی صورت چونکہ اس کا پورے طور پر کبھی اظہار نہیں کرتی نہیں کر سکتی اس لئے دوسری صورتوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کائنات کے ظہور آپس میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف یعنی نئے ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کہ وہ ہر جزئی ظہور میں یکساں داخل اور ساری ہے اور اس کے باوصف کہ وہ اپنی لامتناہی کلیت کو ہر لحظہ برقرار رکھتی ہے اس میں بذاتِ خود کوئی تغیر نہیں ہونے پاتا۔ یعنی وہ تاریخ نہیں کیوں کہ تاریخ کی روئدادوں میں بلا کا تنوع ہوتا ہے، کائنات کے اس تصور پر بڑے بڑے حملے ہوئے ولیم جیمس اور رناتجین نے اپنے نقطۂ نظر سے وجودیین نے اپنے لحاظ سے اور جدید تصوریین نے اپنے زاویۂ نگاہ سے اس پر متعدد اعتراضات کئے ہیں اس تصور پر جو اتنی نکتہ چینیاں کی گئیں اُن کے اسباب یہ ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ وجودِ مطلق جو کلّی حقیقت کے مترادف ہے ہمارے متناہی تجربہ کے عقب میں اور اس کے ورے ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہمارے تجربہ کی رسائی کے ماوراء ہے یعنی حقیقت کا علم ممکن نہیں۔ اور

(۲) دوسرا یہ کہ وجودِ مطلق انفرادی افکار کا منبع بھی ہے اور مرجع بھی بہ الفاظ دیگر یہ کہ وہ تجربہ کی کلّی شرط اور مختتم تالیف ہے اس سے دو باتیں لازم آتی ہیں۔

(ا) یہ کہ ترقی معدوم اور تغیر بے حقیقت ہے اور

(ب) یہ کہ فکر فاعل نہیں بلکہ منفعل ہے۔

مختصر یہ کہ اگر کائنات مجموعی حیثیت سے واقعتہً غیر متغیر اور مکمل ہے تو اس کے ظہورات کی مرئی تفریق اور کثرت بھی اسی کی طرح غیر متغیر اور مکمل ہے، لہٰذا ہیگل کا یہ قول کہ "فلسفہ تاریخ ہے" سراسر بے معنی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انگریز تصوریئیں اور ان کے ناقدوں کی مناظرہ آرائیوں کے محاسن اور معائب سے تفصیلی بحث کا یہ کوئی محل نہیں تاہم اگر ہیگل کے مذکورہ بالا قول کے مضمرات پر ایک سرسری مگر مُبصرانہ نظر ڈال لی جائے تو غالباً بے جا نہ ہوگا کیونکہ یہیں سے جدید تصوریئین اپنے ہیگلی ساتھیوں سے جدا ہوتے ہیں اور یہیں سے اس ترقی کی داغ بیل پڑتی ہے جو ان کے ہاتھوں ہیگل کے فلسفہ کو نصیب ہوئی۔ اگر ذہن ہی کائنات کی واحد موجود شے ہے تو تاریخ سے مراد ظاہر ہے کہ ذہن کی تاریخ ہوگی لہٰذا اس میں نہ صرف واقعات اور سانحات کی کھتونی ہوگی بلکہ ذہن کی ترقیاں بھی درج ہوں گی۔ یہاں تک تو جدید تصوریئیں اپنے ہیگلی ساتھیوں کے دوش بدوش ہیں لیکن اس کے بعد ان کی رائیں مختلف ہوجاتی ہیں۔ جدید تصوریئیں کہتے ہیں کہ اگر حقیقت عبارت ہے وجود مطلق سے تو وہ زماناً آگے نہیں بڑھ سکتی یعنی ترقی نہیں کرسکتی، کیونکہ وجود مطلق بہرحال مکمل اور غیر متغیر ہے اسی طرح فکر اگر وجود مطلق کا ایک متناہی ظہور ہے یعنی پہلے ہی سے مکمل تو وہ فاعل نہیں ہوسکتا کیونکہ فعلیت تغیر اور ترقی کو مستلزم ہے۔ اور پھر تاریخ میں چونکہ ترقی کا تصور متضمن ہے اور وجود مطلق اور بنابریں فکر دونوں مکمل ساکن ہیں لہٰذا حقیقی تاریخ کا وجود محال ہے لیکن ہیگل تو کہتا ہے کہ "فلسفہ تاریخ ہے" تو کیا یہ جملہ بے معنی ہے؟ اگر نہیں تو یہ ضروری ہے کہ ہیگل کا دوسرا عقیدہ باطل ہو چنانچہ جدید تصوریئیں کہتے کہ ہمیں اس وجود مطلق کو جو ساکن ہے اور براہ راست انفرادی تجربوں کے عقب میں کارفرمائی کررہا ہے یک قلم بھلا دینا چاہیئے اور دیکھنا صرف ان تجربوں کو چاہیئے جو انفرادی ہیں اور جن کی معرفت ہمیں بلاواسطہ حاصل ہے، کروچے اور جنٹائل کی ترقی کا راز یہی ہے ان کے نزدیک ذہن فعّال ہے اس نے اپنے کو آپ ہی خلق کیا اور وہ اپنے سے ہی تمام چیزیں خلق کرتا ہے وہ حقیقی اور لفظی معنوں میں دنیا کی واحد موجود شے ہے اس کے سوا دنیا میں کوئی چیز موجود نہیں حتیٰ کہ وہ وجود مطلق بھی نہیں جو ابتدا میں سبھوں کا مصدر اور انتہا میں سبھوں کا مرجع ہے

فلسفہ حقیقت کی ہستی یا ماہیت سے بحث کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذہن کی ہستی یا

ماہیت سے بحث کرتا ہے گویا فلسفہ عبارت ہے، ذہن کے اپنے آپ غور کرنے سے لیکن ذہن کا اپنے آپ پر غور کرنا اپنے آپ کو خلق کرنے کے مساوی ہے اور یہ چیز ذہن کی عین ماہیت اور ہستی ہے لہذا ذہن دُہرا فعل انجام دیتا ہے، ایک تو اپنے آپ کو یا اپنی ترجمانیوں کو خلق کرتا ہے اور دوسرے اپنے آپ کی یا اپنی تخلیقوں کی ترجمانی کرتا ہے خالق کی حیثیت سے وہ تاریخ ہے، لہذا تاریخ سے وہ حقیقت مراد ہے جو ہر وقت حاضر ہے وجہ یہ کہ ذہن حقیقت کی یعنی اپنی تخلیق میں مسلسل مصروف ہے۔ ترجمان کی حیثیت سے وہ فلسفہ ہے، لہذا فلسفہ تخلیقی فعلیت کے استمرار سے زیادہ کچھ نہیں، وجہ یہ ہے کہ ذہن بہ سبب اپنی مسلسل تخلیق کے تکمیل نفس کا ایک عمل ہے پس ذہن جو اپنی ماہیت اور ہستی سے بحث کرتا ہے تو یہ خود اسکی ماہیت اور ہستی ہے اس طرح فلسفۂ تاریخ اور تاریخ فلسفہ دونوں ایک ہیں۔

غرضکہ ہیگل اور جدید تصوریئیں کی حیثیتوں میں تین فرق یہ ہے کہ اول الذکر کے نزدیک کائنات میں زمانی ترقی برائے نام ہے اور مؤخر الذکر کے ہاں وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، اس طرح حقیقت ایک دائمی تکوّن ہے وہ کبھی کامل نہیں ہوسکتی کیوں کہ کامل اور تاریخی ہونا دو متناقض خواص ہیں جو کہیں اور کبھی مجتمع نہیں ہوسکتے لیکن حقیقت کی یہ حرکت نامتناہی اقدام نہیں بلکہ دوری حرکت ہے یہ حرکت حقیقت کی جان ہے، اس میں مسلسل اُپج ہے کیوں کہ حقیقت دائرہ میں گردش کرتے ہوئے ہمیشہ نیا اضافہ آپ کرتی ہے لیکن یہ اضافہ کبھی مکمل نہیں ہوتا، یوں ہر پل میں اسکو کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوتا ہے، مگر جو حاصل ہوتا ہے وہ پورے طور پر نہیں ہوتا۔ حقیقت کے یہ دو خاصے ہیں اور ان کا اظہار وہ ایک سرے سے لے کر دوسرے تک بالکل مساوی ادا کرتی ہے۔ اس ضمن میں کروچے کے الفاظ یہ ہیں "ترقی کا تصور اس ڈھب کا ہونا چاہیئے کہ اس سے بیک وقت دو شرطیں پوری ہوں ایک تو یہ کہ ہر پل میں حق اور خیر حاصل ہو اور دوسری یہ کہ ہر نئے پل میں شک پیدا ہو لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ جو حاصل ہوگیا اُسے کھو دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اُسے محفوظ رکھا جائے، گویا ہر وقت ایک نیا حل پیش ہو اور ہر دم ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو جس سے نئے حل کی ضرورت دامنگیر ہو" اس طرح ترقی کا حقیقی تصور وہ ہے جس کے پیش نظر دو بالکل مختلف مقصد نہ ہوں یعنی ممکن الحصول غایت یا "متناہی ترقی" اور ناممکن الحصول غایت یا "نامتناہی ترقی" دونوں

سے مجتنب ہو۔"

کروچے کے ان الفاظ کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ جدید تصوریین کے عام مابعد الطبیعی تصور کی ضروری تلخیص ہماری نظروں کے سامنے رہے اور دوسرا یہ کہ کائنات کے بارے میں کروچے کا نقطۂ نظر کیا ہے یہ ہمیں معلوم ہو جائے، آیئے اب یہ دیکھیں کہ اس تصور کو فلسفہ کے روایتی مسائل پر کیسے منطبق کیا گیا لیکن اس مقصد کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ ہم کروچے اور جنٹائل کے نظریوں پر الگ الگ نظر ڈالیں۔

(۲)

بے نی ڈیتو کروچے۔ کروچے نے اپنے فلسفہ کا نام "فلسفہ روح" تجویز کیا ہے اور چار جلدوں کو محیط ہے جس کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

(۱) جمالیات یا حُسن کاری اور زبان حکمت،

(۲) منطق یا خالص تصور کی حکمت

(۳) عملی فلسفہ یا معاشیات اور اخلاقیات ۔ اور

(۴) تاریخ نگاری کا نظریہ اور اس کی تاریخ

ان کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ ڈگلس اینسلی نے کیا ہے یہ تو خیر ایک جملہ معترضہ تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم کروچے کے فلسفہ کی گہرائیوں میں اتریں مناسب یہ ہوگا کہ اس کے بنیادی عقیدہ کو جس کے بموجب ذہن دنیا کی واحد موجود شے ہے ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کریں کیوں کہ اس سے ہمیں آئندہ سطور کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

عام تصوری فلسفیوں کی طرح کروچے بھی یہ مانتا ہے کہ دنیا میں صرف تجربہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے وجود کا ہمیں بالیقین ہے لہذا حقیقی صرف تجربہ ہے اس کے سوا کوئی چیز حقیقی نہیں اور اگر ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ تجربہ سے متعلق ضرور ہے، یعنی یا تو اس کی کوئی شرط ہے یا اس کا کوئی جزو ہے یا اسکی کوئی حرکت ہے یا اس کا کوئی درجہ ہے یا اس سے متعلق کوئی مفروضہ ہے، اس کے علاوہ یہ تجربہ

یکسر بالفعل اور محض حال ہی حال ہے، رہ گئے ماضی اور مستقبل سو وہ حقیقی صرف اس لئے ہیں کہ حال پر منحصر اور اس سے مربوط ہیں۔

بادی النظر میں معلوم یہ دیتا ہے کہ تجربہ میں ایک اور چیز لاینفک طور پر اس کا جزو ہے، یہ وہ شے ہے جس کا تجربہ کیا جاتا ہے اور جو صاحب تجربہ کے روبرو موجود ہے اور تجربوں کو حرکت میں لاتی اور اس کے خواص کی تعیین کرتی ہے لیکن یہ خیال ایک باطل خیال ہے کیوں کہ تجربہ اور تجربہ میں آنے والی چیز کا یہ امتیاز یہ معنی رکھتا ہے کہ تجربہ کو تجربہ سے الگ کیا جائے، حالانکہ تجربہ ایک کُل ہے ایک وحدتِ تام ہے اور بہ لحاظ ماہیت سراسر ذہنی۔ اس کے ماسوا تجربہ اور تجربہ میں آنے والی چیز کی یہ تفریق بجائے خود صاحب تجربہ ذہن کی ایک پیداوار ہے اس طرح "شے" کوئی چیز نہیں وہ کبھی ہمارے تجربہ میں نہیں آتی تجربہ میں ہمیشہ مفروضہ شے کا تجربہ آتا ہے اور تجربہ کا تجربہ خود تجربہ ہے، لہذا راست معرفت ہمکو ہمیشہ اپنے تجربہ کی حاصل ہوتی ہے کسی اور چیز کی نہیں کیونکہ کوئی اور چیز ہے ہی نہیں، جب صورت حال یہ ہے تو یہ فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ شے یا خارجی دنیا کی حیثیت ذہن کی ایجاد سے کچھ زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خارجی دنیا کے مقرون کُل کی ایک تجرید ہے جسکو ذہن اپنے مقاصد اور مصالح کی تکمیل کے لئے انجام دیتا ہے۔ یوں جب خارجی شے کا کہیں وجود نہیں تو یہ ضروری ہے کہ ذہن اپنی اشیاء کو آپ خلق کرے۔ چنانچہ ہوتا یہی ہے اور اسی سے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ تجربہ بذاتہ ایک ایسی فعلیت ہے جو اپنی تعیین اور تخلیق آپ کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر تجربہ آپ اپنا خالق بھی ہے اور آپ اپنی مخلوق بھی۔ چونکہ جو کچھ ہوگا وہ اسی قبیل سے ہوگا۔ اس لئے یہ ماننے میں کوئی دشواری نہیں کہ حقیقت ایک عالمگیر ذہن یا روح ہے۔ جو اپنے آپ اور اپنے ماحول دونوں کو یکساں پیدا کرتی ہے لہذا ذہن ایک گنبد بے در ہے۔ جس میں نہ کوئی چیز داخل ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کوئی چیز خارج ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی حقیقت چونکہ بے صورت نہیں ہوتی لہذا ہر وہ صورت جسکو حقیقت اختیار کرتی اور کر سکتی ہے لازماً ذہن یا تجربہ پر مبنی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ اس طرح حقیقت سرتاسر تجربہ سے پیدا ہوتی ہے اور ایسی کوئی حقیقت ہمارے علم میں نہیں جو تجربہ پر مبنی نہ ہو۔

اب چونکہ حقیقت گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور ہر صورت تجربہ پر مبنی ہوتی ہے اس لئے ہر صورت مساوی حقیقت رکھتی ہے ان حالات کے تحت فلسفہ کا واحد فریضہ یہ ہے کہ وہ ان متنوع صورتوں کو مناسب ترتیب سے جگہ دے ان کے باہمی رشتہ کی تعیین کرے اور جو خدمتیں وہ تجربہ کے کل کی تعمیر میں انجام دیتی ہیں ان کو پورے طور پر اجاگر کرے۔ کروچے کا فلسفہ اسی نصب العین کو لے کر میدان عمل میں آتا ہے۔ اس لئے آیئے یہ دیکھیں کہ وہ اپنے پیش نہاد کی تکمیل میں کہاں تک کامیاب رہتا ہے۔

(ا) نظری فعلیت۔ صورتوں میں پہلی صورت علم کی ہے، جسے کروچے نظری فعلیت کے نام سے موسوم کرتا ہے، اب چونکہ تجربہ کے تصور سے ہی یہ لازم آتا ہے کہ ذہن علم کے معروض کو خود پیدا کرے، لہذا نظری فعلیت کی تحتانی قسمیں دو ہیں (۱) ایک وہ جس کے تحت میں ذہن مادہ بہم پہنچاتا ہے اور (۲) دوسری وہ جس کے تحت میں وہ اس مادہ کی تبویب اور تنظیم کرتا ہے۔ یہ قسمیں بالترتیب (۱) وجدان اور (۲) تصوری فکر کہلاتی ہیں۔ اور جمالیات اور منطق میں اس سے بحث کی جاتی ہے۔

(۱) وجدان۔ کروچے کے نزدیک حسی ادراک کوئی چیز نہیں اس کے یہاں نہ محسوسات ہیں اور نہ معطیات حواس۔ جو کچھ ہے وہ تجربہ ہے۔ اس طرح جب اشیا یا معطیاتِ حواس کا کوئی وجود نہیں تو تجربہ میں کوئی انفعالی عنصر بھی نہیں، لہذا ادراک کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس میں ذہن ا کو کسی خارجی شے ب کی معرفت حاصل ہوتی ہے یا جس میں ا، ب کو اپنے سانچوں میں ڈھالتا ہے یا جس میں ا، ب کے ساتھ گھل مل جاتا ہے یا جس میں ا، ب میں اور ب، ا میں نفوذ پاتا ہے یا جس میں ا، ب کی تالیف کرتا ہے (جیسا کہ اکثر فلاسفۂ متقدمین نے سمجھا ہے) بلکہ ایک فعلیت ہے جس میں ا اپنے معطیات کو تمثالات اور وجدانات کی صورت میں خود ہی پیدا کرتا ہے، اس فعلیت کا اصطلاحی نام جمالی فعلیت ہے۔

کروچے نے ملکۂ ادراک کی ان لفظوں میں تعریف کرکے اس کو گویا حسن کار یا شاعر کا ملکہ

بنا دیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ادراک کا تعلق صرف شاعروں اور حسن کاروں سے ہے۔
کیونکہ ادراک میں ہم سب حقیقتہً اپنی حسن کاری اور شاعری کا اظہار کرتے ہیں، میں اوپر یہ کہہ آیا ہوں
کہ جمالی فعلیت اپنے معطیات آپ پیدا کرتی ہے اور اب اس عمل کی انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ
تشریح کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ ذہن اپنے وجدانات کو تمثالات کی صورت میں ظاہر کرتا ہے
لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وجدانات اور تمثالات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں یا جو وجدان
ظاہر نہ ہوا وہ وجدان کی حیثیت سے باقی رہ سکتا ہے، اس لئے کہ وجدان اور تمثالی کے جداگانہ ناموں
میں صرف زبان کی ضروریات کا خیال ملحوظ ہے ورنہ نہ ان کی ہستیاں ایک دوسرے سے الگ ہیں
اور نہ وہ جداگانہ وظائف انجام دیتے ہیں اور پھر یہ واقعہ ہے کہ کوئی وجدان ایسا نہیں جو ظاہر
نہ ہوا ہو کیونکہ وجدان خود آپ اپنا اظہار ہے لیکن وجدانات کو تمثالات کی صورت میں ادا کرنا
حسن کار کے فریضہ سے ہے، لہٰذا حسن کاری سراسر غنائی چیز ہے، یعنی یہ کہ جو وجدانات شاعر کی روح
کے اعماق میں جنم لیتے ہیں ان کو ادا کیا جائے اس کے ماسوا حسن کے معنی خود اظہار کے ہیں یا زیادہ
کامیاب اظہار کے ہیں۔ لہٰذا قبح مماثل ہے قصورِ اظہار کے علیٰ ہذا حسن سے جو ہمیں رغبت ہوتی
ہے اس کی وجہ کامیابی اظہار کی پسندیدگی ہے اور قبح سے جو نفرت ہوتی ہے اس کا سبب قصورِ اظہار
کی ناپسندیدگی ہے اور پھر جیسے اظہار تخلیقِ حسن ہے ویسے ہی اس کی داد اور قدردانی بھی تخلیقِ حسن ہے
لہٰذا ہم حسن کار کی طبعی جولانیوں کو پسند اور قدر کی نگاہوں سے صرف اس لئے دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے اپنے وجدانوں
کو نہایت کامیاب پیرایہ میں ادا کرتا ہے غرض کہ کروچے کے نزدیک حسن کاری اظہار سے زیادہ نہیں ہے۔
حاصل کلام یہ کہ جمالی فعلیت نہ اشیار کی واقعیت یا عدم واقعیت پر غور کرتی ہے نہ ان کی تعریف یا تبویب
یا تنظیم انجام دیتی ہے اور نہ ان کے تخمینہ کی زحمت گوارا کرتی ہے اس کے برعکس وہ صرف ان کو جوں
کی توں قبول کرتی اور جوں کی توں ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حسن کار کسی خارجی شے
کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بہار کی حسن فروش صبح نے اقبال کی نظم
"گل رنگیں" پیدا کی۔ اس طرح جن چیزوں کو حسن کار ادا کرتا ہے وہ اس کے اپنے وجدانات میں ان

وجدانات کو ذہن پیدا کرتا ہے اور ان سے وہ مسالہ بنتا ہے جس سے حقیقت کی تعمیر ہوتی ہے، یہاں تک جو فلسفہ کروچے کا پیش کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) ہر تجربہ میں ایک عنصر ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جس میں وجدانات کو سوچا یا چنا نہیں جاتا بلکہ ان کی حالت میں انھیں قبول اور ظاہر کیا جاتا ہے، اس لمحہ کی فعلیت تجربہ اور فکر دونوں کی لازمی شرط ہے یہ فعلیت اگرچہ تصوری عناصر (حسن کا ذکر آگے آتا ہے) کے بغیر بالفعل کبھی نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ فکر کے ترکیبی اجزا ہیں تاہم منطقی اعتبار سے اسکو ان تصوری عناصر سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ فکر اور تصور ہمیشہ ایک مقدم واقعہ پر منحصر ہوتا ہے اور یہ مقدم واقعہ جمالی فعلیت ہے لیکن جہاں جمالی فعلیت تصور سے منفک ہو سکتی ہے تصور جمالی فعلیت سے منفک نہیں ہو سکتا یوں کروچے جمالی فعلیت کو تجربہ میں سب سے نچلا یعنی سب سے پہلا درجہ دیتا ہے، حالانکہ کانٹ اور دوسرے فلسفیوں نے اسے سب سے اونچا یعنی سب سے آخری درجہ دیا تھا۔

(۲) تجربہ کا یہ عنصر حسن کاروں اور شاعروں کے کارناموں میں خاص طور پہ اجاگر ہوتا ہے اور نظری اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ادراک میں ایک ابتدائی مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب کہ ہر انسان لازمی طور پر شاعر بھی ہوتا ہے اور حسن کار بھی۔ چنانچہ کروچے کہتا ہے کہ "ہر انسان کا ذہن اس کی نظری زندگی کے پہلے لمحہ میں جو تخئیلی اور وجدانی ہوتا ہے تجرید یا تامل سے گراں بار نہیں ہوتا۔ اس لمحہ میں وہ شاعر ہوتا ہے۔ شاعری کی طرح حسن کاری بھی اولین ادراکات کو خلق کرتی اور علمی زندگی کی بنا ڈالتی ہے، وہ ہمارے ذہنوں میں اشیا کی ان اوضاع کو ہمیشہ تازہ رکھتی ہے جنہیں فکر تامل کے اور عقل تجرید کے حوالہ کرتی ہے، اس طرح حسن کاری کی بدولت ہم سدا شاعر بنے رہتے ہیں پس حسن کاری اگر نہ ہو تو نہ تفکر حرکت میں آسکتا ہے اور نہ اس کے پر اسرار تخلیقی کارنامے انجام پا سکتے ہیں"، کروچے فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ حسن کاری اور ادبیات کا ایک بلند پایہ نقاد بھی ہے یا شاید وہ پہلے نقاد ہے اور پھر فلسفی لیکن کچھ ہی ہو اتنا بہرحال یقینی ہے کہ معاصر ادیبوں اور حسن کاروں کی تخلیقوں پر جتنی بھی تنقیدیں اسکے قلم سے نکلی ہیں ان سب کا مرکزی اور بنیادی خیال یہ ہے کہ حسن کاری اظہار کے مترادف ہے،

(۲) تصور۔ نظری فعلیت کی دوسری قسم تصوری فکر کے نام سے موسوم ہے یہ فکر معروض وجدان میں عمومیت پیدا کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر نظری فعلیت کی پہلی قسم جو وجدانات اور تمثالات بہم پہنچاتی ہے ان میں اضافات کے قائم کرنے اور ان اضافات کو جاننے کا عمل کروچے کی زبان میں تصوری فکر کہلاتا ہے۔ یہ فکر ہمیشہ جمالی فعلیت کے متعاقب واقع ہوتا ہے کیوں کہ اس فعلیت سے اس کا مواد بہم پہنچتا ہے، لہذا یہ فکر کبھی جمالی فعلیت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا، جمالی فعلیت میں جو وجدانات ہمارے ہاتھ آتے ہیں وہ انفرادی اشیاء کے وجدانات ہوتے ہیں یا اگر صحتِ بیان کا زیادہ اہتمام کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود انفرادی اشیا رہوتے ہیں، اچھی شراب، اچھی شطرنج، اچھی سیرت ان کی چند مثالیں ہیں یہاں پر آپ نے دیکھا کہ اچھائی کا ایک تصور آپ کے روبرو پیش ہوا ہے جس کے ذریعہ آپ ان مختلف وجدانوں کے باہمی علاقوں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں، اس تصور سے کلّیت تشکیل پاتی ہے جو تفکرات کی ایک لازمی شرط ہے،

رسل کے ہاں یہ تصور کلّیہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، لیکن کروچے کا تصور موجودئیں کے کلّیہ کے ساتھ ایک گونہ مشابہت رکھنے کے اصلاً اس سے مختلف ہے، سب سے بڑا اختلاف ان میں یہ ہے کہ کروچے کے نزدیک تصور یکسر ذہنی ہے صفتوں کی جماعت کا جو خارجی دنیا میں پائی جاتی ہے قائم مقام نہیں۔ وہ تفکر کا ایک لمحہ ایک مرحلہ ہے، اور اس کے خواص تین ہیں (۱) ایک یہ کہ وہ کلّی ہوتا ہے (۲) دوسرا یہ کہ وہ مظہر ہوتا ہے اور (۳) تیسرا یہ کہ وہ مقرون ہوتا ہے۔

ان سہ گانہ خاصوں کو پہلے سے بخوبی سمجھ لینا ضروری ہے، کیونکہ انہی کی بدولت حقیقی اور غیر حقیقی یا جعلی تصوروں میں تمیز ممکن ہے۔ آیئے ہر ایک خاصہ پر الگ الگ نظر ڈال لیں۔

تصور کا پہلا خاصہ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا یہ ہے کہ وہ کُلّی ہوتا ہے۔ اس سے کروچے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ تصور تجربہ کے ہر ظہور میں برابر موجود ہوتا ہے، اس طرح کے کلّی تصوروں میں صفت، شکل، ارتقا، اور حسن کا شمار ہے گویا ہر معمولی سے معمولی، چھوٹے سے چھوٹے، اور مجرد سے مجرد تجربہ میں صفت، شکل، اور حسن کے خواص لازماً موجود ہوتے ہیں۔ اگر کسی تجربہ میں یہ نہ پائے جائیں تو سمجھ لیجیے،

وہ تجربہ غیر حقیقی ہے۔ اسی طرح تصور زندگی کے ہر ادراک یا ہر وجدان یا ہر تمثال میں یکساں اور ساری ہے، لیکن جہاں وہ اس میں جاری وساری ہے وہیں اس کے ماورا بھی ہے یعنی اگر جملہ انفرادی تحریریں کو یک جا جمع کرنا کسی طرح ممکن ہوتا تب بھی یہ تجربے مجموعاً تصور کی جگہ نہیں لے سکتے۔ لہذا صفت ایک تو حقیقت کے ہر ظہور میں لازماً موجود ہوتی ہے اور دوسرے وہ حقیقت کے جملہ ظہوروں کی "میزان کل" نہیں ہوتی۔

تصور کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ مُظہر ہوتا ہے یعنی تمثال جمالی فعلیت کا اظہار کرتی ہے، اسی طرح تصور منطقی فعلیت کا اظہار کرتا ہے، فکر کے حقیقی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صورت کا حامل ہو اگر وہ کسی صورت کا حامل نہ ہوگا تو فکر بھی نہ ہوگا فکر کو یہ صورت تصور سے ملتی ہے تصور فکر کو صورت ویسے ہی عطا کرتا ہے، جیسے کہ تمثال وجدان کو عطا کرتی ہے، لہذا تصور فکر یا منطقی فعلیت کا صوری اظہار ہے،

تصور کا تیسرا اور آخری خاصہ یہ ہے کہ وہ مقرون ہوتا ہے، مقرون ہونے سے حقیقی ہونا مراد ہے، اب تصور چونکہ تجربہ کے ہر لمحہ میں یکساں موجود ہوتا ہے اور تجربہ حقیقت کی واحد صورت ہے، وہ تصوری بھی ہے مقرون ہونے کی یہ صفت جبلی اور حقیقی تصوروں میں مابہ الامتیاز ہے جبلی تصور ایک اسم جمع ہے ان متعدد ادراکات کا جو آپس میں ایک خاصیت مشترک رکھتے ہیں۔ مثلاً گھر، مثلث پانی، آدمی، وغیرہ۔ فلسفہ کا بڑا حصہ سدا اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح ان جبلی تصوروں کو حقیقی ثابت کر دکھائے یعنی یہ منوا دے کہ وہ اشیاء کی جن جماعتوں کی قائم مقامی کرتے ہیں ان سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں۔ لیکن کروچے ان کوششوں کو لاحاصل کوششیں قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گھر کا جبلی تصور انفرادی گھروں کے مجموعے سے علیحدہ اور بالذات قائم نہیں ہے وہ ایک اسم جمع ہے جسے ہم چاہیں تو ذہنی مختصر نویسی کا ایک جوڑ بھی کہہ سکتے ہیں، یہاں پر ہوتا در اصل یہ ہے کہ ذہن جملہ موجود گھروں سے بعض مشترک صفات منتزع کرتا اور انھیں گھر کے نام سے موسوم کرتا ہے، اس طرح گھر ایک علامت بن جاتا ہے۔ جو تمامی موجود گھروں میں سے ہر ایک پر یکساں دلالت

کرتی ہے،

جبلی تصور کی اس تعریف سے اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ وہ تمام مخصوص حکمتوں کا مدار علیہ ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح منطق خالص تصور سے بحث کرتی ہے اسی طرح طبیعی اور ریاضیاتی حکمتیں جبلی تصور سے بحث کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کروچے فلسفہ کو معقرون حکمت اور مخصوص حکمتوں کو تجرد حکمتیں قرار دیتا ہے۔ فلاسفہ پر عموماً اور تصوریئین پر خصوصاً یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ سائنس سے بیر رکھتے ہیں لیکن اس الزام کی حقیقت بس اتنی ہے کہ تصوریئین حکمتوں کے معروضات کو حقیقی نہیں مانتے ورنہ ان کو نہ حکمتوں کے افادہ پر کوئی شک ہے اور نہ ان کے نتائج کی اہمیت پر کوئی شبہ، وہ کہتے صرف یہ ہیں کہ حکمتوں کے موضوعات کو حقیقت سے نہیں بلکہ اس کی تجریدوں سے سروکار ہے جو ایک خاص غرض و غایت کے تحت پایۂ تکمیل کو پہنچائی گئی ہیں۔ اسی طرح انھیں حکمتوں کے نتائج کی صحت میں کوئی کلام نہیں البتہ وہ مانتے صرف یہ ہیں کہ یہ صحت مطلق نہیں اضافی ہے یعنی یہ کہ حکمتوں کے نتائج ایک خاص دائرہ کے اندر صحیح ہیں اور یہ دائرہ وہ ہے جسے ہر سائنس داں اپنی مرضی کے مطابق کھینچتا ہے۔ اتنا جان لینے کے بعد آیئے یہ دیکھیں کہ بنائے قضیہ کیا ہے؟

اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ جدید تصوریئین کے نزدیک ایک تو حقیقی صرف ذہن ہے دوسرے جب ذہن حقیقت میں نفوذ کرتا ہے تو تجربہ حاصل ہوتا ہے اور تیسرے ذہن کے تجربہ سے الگ کوئی حقیقت موجود نہیں ہے، لہذا کسی چیز کا کہیں وجود نہیں جو ذہن کے تجربہ میں آئی ہو یعنی جو تجربہ سے الگ اور قائم بالذات ہو۔ اب سائنس پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایسی چیزوں سے بحث کرتی ہے جو ذہن سے الگ اور مستقل الوجود ہیں، مثلاً اعداد کے خواص کہ جن سے علم حساب بحث کرتا ہے، حیات حیوانی کا کردار کہ جس سے حیوانیات بحث کرتی ہے ذہن کی ساخت کہ جس سے نفسیات بحث کرتی ہے اور حرارت و آواز کے خواص کہ جن سے طبیعیات بحث کرتی ہے، ان حکمتوں میں مذکورہ بالا اشیاء پر ان کی اضافات پر اور اُن قانونوں پر جن کے مطابق وہ وقوع پذیر ہوتی ہیں، اس طرح بحث کی جاتی ہے گویا کہ وہ قائم بالذات ہیں۔ اُن کا وجود تجربہ سے مستغنی ہے اور وہ بالکل حقیقی ہیں، حالانکہ ان چیزوں کو متعلقہ حکمتیں تجربہ کے

معروض کل سے بذریعہ تجرید حاصل کرتی ہیں، انھیں ان کے مشترک خواص کے اعتبار سے چُنتی اور چھانٹتی ہیں اور یوں ان سے اسمائے جمع مرتب کرتی ہیں جو کروچے کی زبان میں جعلی تصورات کہلاتے ہیں،

لیکن ادراکات کہ عین حقیقت سے بذریعہ تجرید حاصل ہوں ان سے بحث کرنے والی حکمتوں میں ایک ایسا حق پایا جاتا ہے جو مقررہ حدود کے اندر حقیقی ہے، لہذا حکمتوں میں صرف وہی حکمت مطلق حقیقی نتائج کی حامل ہوسکتی ہے جو یکسر واقعی چیز یعنی عین ذہن سے بحث کرتی ہو، اس طرح فلسفہ سائنس سے بدرجہا زیادہ حقیقی ہے، کیونکہ وہ خالص تصوّر سے بحث کرتا ہے جو ذہن کی کوئی تجرید نہیں بلکہ اس کی زندگی کا ایک لمحہ ہے،

خالص تصوّر کے اس خیال کو ترقی دے کر کروچے اس سے دو عقیدے اور اخذ کرتا ہے، ان میں سے ایک کا تعلق ماورائی تجربہ سے ہے اور دوسرے کا عمل کے امکان سے،

اب تک ہمنے جس تجربہ کا ذکر کیا ہے، اور اب تک ہمیں جس تجربہ سے سروکار رہا ہے وہ تمام تر افراد کا تجربہ ہے اس تجربہ کے ماوراء بالفرض اگر کوئی کُلی ذہن ہو بھی تو نہ اس کا ثبوت آسان ہے اور نہ اس ثبوت کو سمجھنا سہل ہے، چنانچہ بیشتر فلسفیوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ ایسا ثبوت اگر کوئی بہم پہنچا یا بھی جائے تو لائق وثوق نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کروچے کا فلسفہ وجود مطلق کا انکار کر کے بعض سخت قسم کی تنقیدوں کی آماجگاہ بن گیا ہے، اس پر نہ صرف موضوعی تصوریت[۱] ہی کا الزام عاید ہوسکتا ہے، بلکہ یہ بھی اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ لاغیر نفسیت[۲] میں بہ آسانی تبدیل ہوجاتا ہے، لیکن یہ موقع اس قسم کی تنقیدوں کے اظہار کا نہیں ان کو میں اس مضمون کی آخری سطروں میں پیش کروں گا، فی الحال اتنا جان لینا بھی کافی ہے اور ضروری بھی کہ ان الزاموں کے مقابلہ

---

[۱] Subjective idealism کا ترجمہ ہے اس سے وہ عقیدہ مراد ہے جو یہ بیان کرتا ہے کہ ہمکو علم صرف اپنے تصورات کا ہوتا ہے [۲] solipsism کا ترجمہ ہے جس سے وہ عقیدہ مراد ہے جو یہ کہتا ہے کہ کائنات کے واحد موجودات ہمارے ذہنی احوال ہیں، مترجم۔

میں کروچے اپنی مدافعت آسانی سے نہیں کرسکتا۔ تاہم اس خیال سے کہ کروچے کے فلسفہ کا مجوزہ خاکہ ناتمام نہ رہے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں اس کے مذکورہ بالا دونوں عقیدوں کو جن کے بغیر اس کا نظام فلسفہ مکمل نہیں ہوسکتا تھا مجملاً بیان کردوں۔

کروچے کہتا ہے کہ فلسفہ میں بحث جس تجربہ سے کی جاتی ہے وہ انفرادی نہیں بلکہ کُلّی تجربہ ہے کیونکہ کلّی ذہن سے تعلق رکھتا ہے، اس تجربہ سے فرد کے تجربہ کو گہرا لگاؤ ہے"۔ فلسفہ کُلّی شعور سے بحث کرتا ہے، فرد کے شعور سے نہیں کیونکہ فرد آخر فرد ہے اور کُلّی شعور وہ ہے جس پر ہر فرد کی فردیت مبنی ہے"۔ اس نقطہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی ذہن کو کلّی ذہن کے ساتھ ملانے والی کڑی کون ہے، کروچے کہتا ہے کہ تصور اور اسکی دلیل کا خلاصہ یہ ہے،

وجدانات کا تصوّرات سے گراں بار ہونا ضروری ہے، جو وجدانات تصوّرات سے گراں بار نہیں ہوتے وہ نرے حسی ادراکات ہوتے ہیں، جن کی ماہیت اور حیثیت کے بارے میں ہم اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک کہ سوچنا نہ شروع کردیں، لیکن سوچنے کے معنی تصدیق قائم کرنے کے ہیں اور کوئی تصدیق تصورات سے خالی نہیں ہوتی۔ اس طرح وجدانات اور تصورات کے ملنے سے تصدیق مبنی ہے، جو فکر کی اظہاری صورت ہے، ہم اپنے خیالات کو دوسروں پر اور دوسرے اپنے خیالات ہم پر اسی تصدیق کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں گویا تصدیق ہمارے آپس میں ایک مشترک چیز ہے۔ لیکن اگر میرا تجربہ بالکلیہ انفرادی ہے تو یہ مشترک چیز موجود نہیں ہوسکتی، میں ایک پیدائشی اندھے میں رنگ کا کوئی خیال نہیں پیدا کرسکتا کیونکہ میرے اور اس کے مابین کوئی ایسا واسطہ موجود نہیں ہوتا جس کے ذریعہ میں اپنے شعور کو اس کے شعور کے ساتھ ملا سکوں، اس کے ماسوا تصورات مختلف ذہنوں میں مشترک ہوتے ہیں، مثلاً صفت کا تصوّر کہ وہ نہ صرف میرے ہی تجربہ کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کے بھی تجربہ کی دلیل ہے اس طرح ہم انسان آپس میں مراسلت اپنے تجربہ کے وجدانی عناصر کے ذریعہ نہیں کرتے بلکہ تصوری عناصر کے ذریعہ کرتے ہیں، لیکن صفت کا تصوّر اس وقت تک مختلف ذہنوں اور تجربوں میں مشترک نہیں ہوسکتا جب تک کہ جملہ ذہن اور تجربے ایک کلّی ذہن کے مختلف شئون نہ ہوں، لہذا تصوّر کلّی اس لئے ہے کہ کلّی تجربہ کا ایک لمحہ ہے،

کروچے کُلّی تجربہ کے وجود کو ایک اور حجت کے ذریعہ ثابت کرتا ہے۔ یہ حجت تاریخ کے اس تصور پر مبنی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "تاریخ" ذہنی فعلیت کا خلاصہ ہے یوں ذہن کوئی ایسی چیز نہیں جس کی کوئی تاریخ ہو یعنی جو اپنے تاریخی حوادث سے الگ اور ممیز ہو۔ بلکہ وہ آپ اپنی تاریخ ہے اور ایک ایسی تاریخ ہے جس کا حال اس کے ماضی کے ذریعہ اور جس کا مستقبل اس کے حال کے ذریعہ علی الاتصال متعین ہوا چلا جاتا ہے، لہذا ایک تو فرد کے ذہنی عمل کی تاریخ لامتناہی ہے، اور دوسرے اس تاریخ میں اور اس ذہنی عمل میں جس کی وہ کھتونی کرتی ہے کوئی فرق نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حقیقت جس سے ذہن بحث کرتا ہے یا جسے وہ اپنے لئے خلق کرتا ہے تاریخ ہے اس کو دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کُلّی حقیقت تاریخ ہے کیوں کہ ذہن ہمیشہ کُلّی حقیقت سے بحث کرتا ہے، اس طرح جب انفرادی ذہن بھی تاریخ ہے اور سناری ذہن بھی تاریخ تو یہ ماننے میں کون امر مانع ہے کہ وہ دونوں ایک ہیں۔ (ب) عملی فعلیت۔ اخلاقیات کے بارے میں کروچے کے خیالات کا مکمل اقتباس اگر ضبط تحریر میں لایا جائے تو مضمون کی کوتاہ دامنی بری طرح مجروح ہو جائیگی۔ اس لئے میں یہاں پر اس کی اخلاقیات کے صرف چند موٹے موٹے خد و خال بیان کر دینے پر قناعت کرونگا، اخلاقیات میں ذہن کی دوسری فعلیت بروئے کار آتی ہے۔ جسے کروچے عملی فعلیت کے نام سے موسوم کرتا ہے جس طرح نظری فعلیت کا وظیفہ علم ہے اسی طرح اس فعلیت کا وظیفہ ارادہ یا عمل ہے۔ یہاں پر میں نے ارادہ یا عمل کے الفاظ جان بوجھ کر استعمال کئے ہیں کیونکہ کروچے کے نزدیک ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہے، جیسے کوئی وجدان ایسا نہیں جو ممنونِ اظہار نہ ہو ویسے ہی کوئی ارادہ ایسا نہیں جو شرمندۂ عمل نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ارادہ عمل سے منفک نہیں یعنی وہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کے متعاقب "ہاتھ پاؤں کی حرکتیں واقع ہو بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی بلکہ یہ حرکتیں خود ارادہ ہیں"۔ اس طرح ہر چھوٹے سے چھوٹا اور ضعیف سے ضعیف ارادہ بھی عضو یہ کو حرکت میں لاتا ہے اور خارجی اثرات پیدا کرتا ہے۔ علی ہذا بے ارادہ کوئی عمل واقع نہیں ہو سکتا۔ جو چیز عمل میں نہیں یعنی ارادہ نہیں۔ وہ میکانی حرکت ہے اور میکانی حرکت ایک جعلی تصوّر ہے۔

عملی فعلیت نظری فعلیت کے تابع ہے کیوں کہ عمل علم پر موقوف ہے، اس میں شک نہیں کہ

علم عمل کے لئے ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ علم عمل کے بغیر ہو سکتا ہے درحالیکہ عمل علم کے بغیر معرض وجود میں نہیں آ سکتا۔ نظری فعلیت کی طرح عملی فعلیت کی بھی قسمیں دو ہیں (۱) معاشیات اور (۲) اخلاقیات پہلی قسم مفید کے تصور پر مبنی ہے اور دوسری خیر کے تصور پر جس طرح عملی فعلیت نظری فعلیت کے تابع ہے، اسی طرح اخلاقیات معاشیات کے تابع ہے، پھر جیسے نظری فعلیت عملی فعلیت سے آزاد اور بے تعلق ہے ویسے ہی معاشیات اخلاقیات سے آزاد اور بے تعلق ہے اس فرق کے قیام سے یہ اظہار مقصود ہے کہ معاشیاتی قسم کی فعلیت میں ہمارے اعمال ایسی چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جو شخصی طور پر مفید ہوتی ہیں اور اخلاقیاتی قسم کی فعلیت میں یہ شخصی احتیاجات اور ان کی تسکینات اوروں کی احتیاجات اور تسکینات بن جاتی ہیں۔ اس طرح خیر کا تصور افادہ کے کلی تصور سے زیادہ نہیں۔ وہ دوسروں کی خواہشات اور احتیاجات کے متعلق اسی قسم کے عمل کا متقاضی ہے، جس قسم کے عمل کی ہماری اپنی خواہشات اور احتیاجات کی تکمیل کے لئے ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ ہر عمل میں افادہ اور خیر دونوں برابر برابر شریک ہوتے ہیں۔ یعنی نہ خالص معاشی، نفس پرستانہ، اور انفرادی عمل جیسی کوئی چیز موجود ہے اور نہ خالص اخلاقی، غیر پرستانہ، اور کلی عمل جیسی کوئی چیز چنانچہ کروچے کہتا ہے کہ "خالص سے خالص اخلاقی چال چلن میں بھی ایک عنصر ایسا موجود ہوتا ہے، جس سے ہم اغماض برتنا چاہتے ہیں کیوں کہ ہمارا عمل ہمہ گیر ہونے پر بھی انفرادی اور شخصی ہوتا ہے"۔ لہذا نفس پرستی اور غیر پرستی دو معارض تصورات نہیں بلکہ تجربہ کے دو ایسے لمحے ہیں جو از روئے منطق ایک دوسرے سے مربوط اور ناقابل انفکاک ہیں اسطرح ہر عمل اثیاری بھی ہوتا ہے اور استیثاری بھی۔

الغرض کروچے کے نظریۂ علم کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ واحد حقیقی شے صرف ذہن یا تجربہ کو سمجھتا ہے یہ ذہن یا تجربہ بالذات ایک فعلیت ہے جس میں دو لمحات ہوتے ہیں (۱) خالص وجدان اور (۲) خالص تصور یہ دونوں لمحے نہ ایک دوسرے کے آگے ہیں اور نہ پیچھے۔ بلکہ یہ زمانی اضافت ان میں پائی ہی نہیں جاتی۔ پھر نہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر اپنا وظیفہ انجام دے سکتا ہے، مختصر یہ کہ ان کے آپس میں ایک گہرا اتحاد ہے یہ اتحاد ایک ترکیب کا نتیجہ ہے جو تجربہ کو اسی حالت میں ملتی ہے، جس میں کہ وہ ہے

اب یہ لمحات جو الگ الگ کئے گئے ہیں تو وہ بعد کے غور و تامل کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ اصل میں تو وہ دونوں ایک ہیں۔ لہٰذا تجربے دو ممتاز چیزوں کی وحدت ہے، اضداد کا مجموعہ نہیں ہے

یہاں پر کروچے کے فلسفہ کی ضروری تلخیص ختم ہو جاتی ہے، اس لئے اب ہمیں گیاوِنی جنٹائل سے رجوع کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے جدید تصوریت میں کون کون سی جدتیں کی ہیں۔

(۳)

گیاوِنی جنٹائل۔ جنٹائل کروچے کا ایک شاگرد ہے، مگر ایک ایسا شاگرد ہے جو اُستاد سے بہت آگے بڑھ نکلتا ہے، اس نے کروچے کے ساتھ ملکر جدید تصوریت کو مقبول بنانے میں ان تھک کوشش کی ہے لیکن ساتھ یہ بھی کوشش کی ہے کہ استاد کے نظریوں کو ان کی منطقی انتہاؤں تک پہنچائے،

اس کا پورا فلسفہ اس کی دو کتابوں میں بند ہے، جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

(۱) خلاصۂ تعلیمات ———————— اور

(۲) ذہن عمل خالص کی حقیقت سے

آخری تصنیف خطبات کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ پروفیسر ولڈن کار نے کیا ہے جو ۱۹۲۲ میں چھپا۔

جنٹائل جیسا کہ ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے کروچے کے نظریوں کو ان کی منطقی انتہاؤں تک پہنچاتا ہے لہٰذا تمہیداً یہ بتلانیکی ضرورت ہے کہ وہ جاتا کس سمت میں ہے کروچے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے تجربہ کو ایک وحدت یا فقہ کل سمجھتا ہے۔ یہ کل دو لمحوں یا فعلیتوں پر مشتمل ہے، اپنی باری پر یہ دو لمحے یا فعلیتیں پھر اور دو قسموں پر مشتمل ہیں گویا تجربہ چار قسم کی فعلیتوں کی ایک ترکیب ہے، ان چار قسم کی چار فعلیتوں کے متعلق یہ مان لیا گیا ہے کہ وہ ذہن کی یکتائی میں کوئی خلل نہیں ڈالتیں، لیکن تجربہ کے یہ جوڑ چونکہ ذہن کے اپنے آپ پر غور کرنے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ایسے فروق ہیں جو منطقی طور پر تجربہ سے مستنبط ہوتے ہیں، لہٰذا ذہن بیک وقت وحدت اور چار طرح کی کثرت نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر وہ وحدت کاملہ ہے تو اپنے آپ سے ایسے فروق نہیں پیدا کر سکتا جو اس کی اپنی وحدت کی طرح حقیقی ہوں۔ لیکن

یہ فروق اگر ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے معطیات ہیں تو وہ نہ کبھی وحدت تھا اور نہ اب ہے

اس طرح ذہن اگر وقت واحد میں وحدت اور سرچشمۂ کثرت نہیں ہو سکتا تو ہمیں یا تو کروچے کے ملحوں اور ان کی تحتانی قسموں سے ہاتھ دھو لینا چاہیئے یا پھر تجربہ کی وحدت ہی سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ جنٹائل نے اپنے لئے پہلی راہ منتخب کی ہے وہ ایک ایسے ذہن کا قائل ہے جو یکسر وحدت ہے جو اول بھی وحدت ہے اور آخر بھی وحدت ہے، اب رہ گئی کثرت سو وہ اسی وحدت سے ماخوذ ہے

جنٹائل ذہن یا تجربہ کو لفظی معنوں میں دنیا کی واحد موجود شے سمجھتا ہے گویا دنیا اس کے نزدیک صرف شاہد روح کی جلوہ گاہ ہے،

لیکن ایک ایسے دعویٰ میں دقت یہ ہے کہ اس کی رو سے کثرت کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ حقیقت جب ایک ہے جب وہ دنیا کی ہر چیز کو جس سے وہ خود بھی خارج نہیں یکساں بناتی اور بگاڑتی ہے اور جب وہ جملہ اضداد اور فروق کو پوری قوت سے دفع کرتی ہے تو یہ ہماری دنیا اور یہ اسکی مختلف چیزیں موجود کیسے ہو سکیں، کیسے ہو گئیں؟

جنٹائل کہتا ہے کہ مجازی کثرت حقیقت کی وحدت کا بروز ہے مگر سوال یہی ہے کہ یہ بروز واقع ہوتا کیونکر ہے؟ کیوں کہ ہمیں شروع ہی میں یہ باور کرایا گیا ہے کہ تجربہ دنیا کی واحد موجود شے ہے اور یہ کہ تجربہ میں آنے والی شے کو خود تجربہ ہی میں تلاش کرنا چاہیئے گویا علم ایک ایسی اضافت ہے جو ذہن اور خارجی دنیا کے مابین نہیں پائی جاتی بلکہ خود تجربہ کے اندر موجود ہوتی ہے، جنٹائل کو اس نتیجہ یا دعویٰ کی صحت سے انکار نہیں وہ کہتا ہے کہ شعور ذات اس دعویٰ کی ایک مسکت دلیل ہے۔ کیونکہ اس میں جاننے والا موضوع بھی ذہن ہی ہوتا ہے اور علم میں آنیوالا معروض بھی ذہن ہی، بہ الفاظ دیگر یہ کہ شعور ذات میں ذہن اصلاً واحد اور یکتا رہتے ہوئے ان دونوں شکلوں میں مساویانہ کارفرما ہوتا ہے یا یہ کہ ایک ہی ذہن ایک ہی وقت میں عالم بھی ہوتا ہے، اور معلوم بھی لیکن واضح رہے کہ موضوع اور معروض ذہن کے دو ٹکڑے نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ذہن اپنی ہر شکل میں سالم اور ثابت ہوتا ہے۔ موضوع کی صورت میں بھی وہ اتنا ہی کامل ہوتا ہے جتنا کہ معروض کی صورت میں۔ اس طرح ذہن

جو ہستی کی ان شکلوں میں تفریق کرتا اور انھیں اپنی اپنی سمتوں میں بڑھے جانے کی اجازت دیتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ میں تفریق کرتا اور اپنے آپ کو مختلف سمتوں میں بڑھے جانے کی اجازت دیتا ہے لیکن خیال رہے کہ وہ ہر شکل میں مُسلّم ہوتا ہے غرض کہ شعور ذات دو ایسی ممتاز شکلوں کی ایک ترکیب ہے جن میں سے ایک کا روپ اگر ذہن دھارے تو موضوع کہلاتا ہے اور اگر دوسرے کا تو معروض۔

اب جو بات شخصی طور پر صحیح ہے وہ کُلّی طور پر بھی صحیح ہے کیونکہ ذہن دنیا کی واحد موجود شے ہے اور شعور ذات ذہن کی خاصیت ہے اگر یہ کوئی اجمال ہے اور تفصیل طلب تو میں کہوں گا کہ تجربہ کا دنیا کی واحد حقیقی اور موجود شے ہونا صرف اسی کی معرفت کا ہمیں راست حاصل ہوسکنا اور اس کا مکمل وحدت ہونا یہ ایسے واقعات ہیں جو جنٹائل کے ہاں کروچے سے زیادہ اہم ہیں کیونکہ جنٹائل کا ذہن باوجود دنیا کی ظاہری کثرت اور سطحی گوناگونی کی تہ میں کام کرنے کے اپنی متاع وحدت کو ایک مفلس کی طرح سدا اپنے سینہ سے چمٹائے رکھتا ہے تو کیا یہ سامنے والا مکان یہ سڑک یہ جنگل یہ درخت محض فریب، دھوکہ، چھل اور التباس ہیں؟ اگر نہیں تو ذہن کی مکمل وحدت کہاں؟ جنٹائل کہتا ہے کہ موضوع اور معروض کا یہ فرق اعتباری ہے، ایک تو اس لئے کہ تجربہ اور بنا بریں ذہن کے سوا دنیا میں کوئی چیز نہ موجود ہے اور نہ حقیقی اور دوسرے اس کے کہ یہ فرق پیداوار ہے، اس اضافت کی جو شعور ذات میں پائی جاتی ہے اور عرف عام میں علم کہلاتی ہے شعور ذات میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے موضوع بھی ذہن ہی ہوتا ہے اور معروض بھی ذہن ہی لیکن کسی نے آج تک یہ جرارت نہیں کی کہ ذہن کو ذہن سے جدا کرے، لہذا اس واقعہ کے پیش نظر کہ ذہن دنیا کی واحد موجود شے ہے اور اپنے معروضات خود آپ پیدا کرتی ہے یہ ماننے میں کوئی امر مانع نہیں کہ کلی حقیقت یا کلی ذہن کا نمونہ شعور ذات ہے، کیوں کہ شعور ذات ذہن کی بلند ترین خصوصیت ہے،

یوں ذہن کا مطالعہ دو طرح ممکن ہے موضوع کے شعور کی حیثیت سے اور معروض

کے شعور کی حیثیت سے موضوع کے شعور کی حیثیت سے جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو حسن کاری وجود میں آتی ہے اور معروض کے شعور کی حیثیت سے جب کیا جاتا ہے تو مذہب ظہور پذیر ہوتا ہے گویا حسن کاری موضوعی اور مذہب معروضی چیز ہے لیکن نہ حسن کاری اعلیٰ درجہ کی حقیقت ہے اور نہ مذہب کیونکہ اول الذکر اگر قطعی موضوعی ہے تو موخر الذکر قطعی معروضی ہے اور اعلیٰ درجہ کی حقیقت موضوعیت اور معروضیت کا مرکب ہوتی ہے تو پھر یہ شرف کس کو حاصل ہے، جنٹائل کہتا ہے کہ فلسفہ.... حسن کاری اور مذہب کا ایک مرکب یا آمیزہ ہے" فلسفہ اس لئے کہ جملہ صورتیں بالآخر اس میں ضم ہو جاتی ہیں حق، بالفعلیت کاملہ، اور روح کا نمائندہ ہے" جنٹائل کا یہ تصور فلسفہ ہیگل کے تصور سے چنداں مختلف نہیں لیکن جنٹائل اور ہیگل میں اتفاق صرف اسی ایک نقطہ پر نہیں اور بھی کئی متقاطع نقاط ہیں۔

اس نوبت پر جنٹائل کے فلسفہ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز پہلو ہمارے سامنے آتا ہے، اس کا یہ تصور جس کا میں اب ذکر کرنے چلا ہوں ایک ایسا تصور ہے جو جدید تصوریت سے ہمدردی نہ رکھنے والوں کو بے حد چونکا دیگا وہ کہتا ہے کہ فلسفی حقیقت کا خالق ہے کیونکہ فلسفہ نام ہے حقیقت کے مطالعہ کا جس کو عین ذہن کا مطالعہ بھی کہا جائے تو بے جا نہیں اس طرح فلسفہ ایک ایسا عمل ہے جس میں ذہن اپنے آپ کو جانتا ہے، لیکن ذہن اپنے آپ کو جانتا اسی وقت ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو سوچے لہذا ذہن جب اپنے آپ کو جانتا ہے تو اپنے آپ کو سوچتا ہے اور اپنے آپ کو سوچنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ پر اپنے آپ کا اضافہ کر رہا ہے یعنی اس ذات کو پیدا کر رہا ہے جو اس کے علم میں آتی ہے، فکر کی ماہیت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے کو مسلسل خلق کرتا ہے۔ اور اس کی تخلیق یہ ہے کہ ہم اس کو سوچیں گویا فکر کا فکر فلسفہ ہے اس طرح فلسفہ جس فکر پر فکر کرتا یعنی جس فکر کو فلسفاتا ہے، اس سے بالذات جدا نہیں بلکہ واقعہ میں اسی کے تسلسل سے عبارت ہے۔ غرضکہ فلسفہ اور حقیقت دونوں ایک ہیں اور فلسفی اسی اعتبار سے حقیقت کا خالق ہے کیوں کہ فلسفانے سے مراد پیدا کرنا ہے اور پیدا فکر ہوتا ہے جو کائنات کی واحد حقیقی شے ہے،

اس طرح فکر کا علم حقیقت کا علم ہے اور فکر کے متعلق فکر کرنے کے معنی اسے پیدا کرنے کے ہیں، چنانچہ جنٹائل کہتا ہے "موجود کوئی شے نہیں بلکہ یہ فکر ہے جو اپنے آپ کو پیدا کرتے ہوئے موجودات کو پیدا کرتا ہے"۔

یہاں تک جو فلسفۂ جنٹائل کا پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے،

(۱) تجربہ دنیا کی واحد موجود شے ہے اور تجربہ میں آنے والی شے خود تجربہ کا ایک جزو ہے اب جو ہم اسے تجربہ سے علیحدہ خیال کرتے ہیں تو اس میں صرف استدلال کی رعایت یا سہولت مدنظر ہے زیادہ کچھ نہیں۔

(۲) ذہن بسبب دنیا کی واحد موجود شے ہونے کے اپنے معروضات خود آپ پیدا کرتا ہے

(۳) شعورِ ذات تجربہ یا ذہن کی ایک اعلیٰ خصوصیت ہے یہاں موضوع بھی ذہن ہی ہوتا ہے اور معروض بھی ذہن ہی۔

(۴) ذہن کا مطالعہ جب موضوع کے شعور کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو حسن کاری وجود میں آتی ہے اور جب معروض کے شعور کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو مذہب نمودار ہوتا ہے، فلسفہ حسن کاری اور مذہب دونوں کا مجموعہ ہے وہ شعورِ ذات کی ایک اعلیٰ قسم ہے فلسفی حقیقت کا خالق ہے،

(۵) کُلی حقیقت یا کُلی تجربہ یا کُلی ذہن (کیونکہ ان اصطلاحوں میں معناً کوئی فرق نہیں) کا نمونہ شعورِ ذات ہے۔

ان پہلوؤں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد میں اب یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ انفرادی تجربہ اور کُلی (یعنی مجموعی) تجربہ میں کونسا رشتہ ہے،

جنٹائل جیسا کہ سطورِ بالا کا مطالعہ شاہد ہے یہ مانتا ہے کہ فرد کا تجربہ شعورِ ذات کا ایک مکمل نمونہ ہے، اس سے یہ نتیجہ بداہتہً مستنبط ہوتا ہے کہ جملہ تجربے شعورِ ذات کے وزن پر ہیں، لیکن جملہ تجربے شعورِ ذات کے وزن پر اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ وہ ایک تجربۂ اعلیٰ کے اجزاء ہوں ورنہ اس اشتراک

معنوی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ۔ یہ تجربہ اعلیٰ یا یہ ہمہ گیر اور دائم الفعل ذہن ایک کامل بالذات اور خود راز حقیقت ہے اور ہر انفرادی تجربہ باوجود اپنے ساتھی تجربوں سے مختلف ہونے کے ایک نہ ایک طرح اس کی آئینہ برداری کرتا ہے ، اس طرح کلی تجربہ شخصی تجربوں میں داخل اور ان کی ایک گٹھڑی ہے ۔

جنٹائل کا فلسفہ ایک دقیق فلسفہ ہے مگر یہ قصور اس بنیادی اصول کا ہے جس پر وہ مبنی ہے ۔ اور جو یہ ہے "تجربہ دنیا کی واحد حقیقی شے ہے لہذا حقیقت اگر حقیقت ہے تو اس کا مثل تجربہ ہونا لازماً سے ہے" ۔ اس طرح ذہن جب ایک مرتبہ یہ خیال کر لیتا ہے کہ تمامی حقیقت اس کی اپنی صورت پر ہے تو وہ جلد اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ حقیقت واقعتہً اس کی اپنی فعلیت یعنی فلسفہ سے عبارت ہے کیونکہ فلسفہ میں ذہن اپنے آپ پر غور کرتا ہے اور اپنے آپ پر غور کرنا اپنے موضوع (یا اپنے آپ) کو آپ پیدا کرنے کے مترادف ہے ۔

یہ دعویٰ معلوم تو بے حد مستبعد دیتا ہے مگر واقعہ میں اتنا مستبعد نہیں ہے کیونکہ جب تجربہ کا وجود بدیہی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ شعور ذات تجربہ کی سب سے مستقل اور واضح قسم ہے تو یہ ماننے میں کوئی امر مانع نہیں کہ کائنات ذہن کی یا ذہن کی سب سے اعلیٰ فعلیت یعنی فلسفہ کی مثل ہے ، تاکہ جنٹائل کے اصول کا عالمگیر اطلاق دشوار ہے مگر یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تجربہ آنیوالی شے تجربہ کا جزو نہیں غرضکہ معروض ذہن کی پیداوار ہے ۔

اس نقطہ پر پہنچکر جنٹائل کے اس اساسی دعوی کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا جس کی رو سے تجربہ ایک آزاد اور خود مختار فعلیت ہے ، وہ اپنی ذات اور اپنی دنیا کا خالق ہے وہ موجودات کو بھی ویسے ہی پیدا کرتا ہے ۔ جیسے کہ اپنی ذات کو ۔

(۴)

<u>ایک سرسری تنقیدی نظر</u> ۔ یہاں پر جدید تصوریت کے فلسفہ کی روداد ختم ہو جاتی ہے اور اگر میں بھول نہیں رہا تو مجھے چند الفاظ اس فلسفہ کے حسن و قبح پر کہنے ضرور ہیں ۔

کروچے اور جنٹائل متفق صرف اصول میں ہیں ورنہ فروع میں ان کا اختلاف انتہا کو پہنچا

ہوا ہے۔ جنٹائل کروچے کے نتائج کو ادھورے نتائج سمجھتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کروچے صرف آدھی دور چل کر رہ گیا ہے اس غلطی کے کفارہ کی ادائی کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لی ہے، گویا جو کام استاد انجام نہ دے سکا اسے شاگرد نے پورا کیا اس میں شک نہیں کہ کروچے بھی جنٹائل کی طرح اس بات کا دل وجان سے متمنی تھا کہ جدید تصوریت کی منطق کو زیادہ سے زیادہ غیر متناقض بنائے لیکن وہ اپنی کوششوں میں زیادہ کامیاب نہ رہ سکا وجہ یہ ہے کہ وہ تجربہ کی وحدت کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس سے کثرت کے حصول کا خواہاں بھی ہوتا ہے یہ بھی مانتا ہے کہ تجربہ فاعل اور ترقی پذیر ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ وجدان اور تصور کے فرق کو قائم رکھتا ہے، لہذا تجربہ اگر بڑھتا ہے تو اس کی صورتوں کے فروق ابتدا میں معین نہیں ہوتے۔ لیکن اگر وہ معین ہوتے ہیں یعنی تجربہ بڑھتا نہیں ہے تو روح کی وحدت وحدت نہیں۔

آیئے اب تھوڑی دیر کے لئے ہیگل کے فلسفہ سے رجوع کریں یہاں آپ محسوس کریں گے کہ تجربہ کروچے کے فلسفہ کی طرح ممیزات کی نہیں بلکہ اضداد کی ترکیب ہے۔ ظاہر ہے کہ اضداد کی ترکیب سے تناقضات پیدا ہوتے ہیں اور تناقضات سے نئی نئی ترکیبیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے پھر نئے نئے تناقضات پیدا ہوتے ہیں۔ اور سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہتا ہے جب تک کہ مطلق یا ہمہ گیر ترکیب حاصل نہیں ہو جاتی۔ لہذا اضداد کی ترکیب میں ایک دائمی ترقی ہے ایک مستمر نمو ہے لیکن ممیزات کی ترکیب میں ایسی کوئی سمائی نہیں وہ مزید ترقی کی کوئی احتیاج پیدا نہیں کرتی۔ اس میں تناقضات ہوتے نہیں ہیں۔ لہذا ممیزات بالکل ساکن ہیں اور ان میں کوئی محرک ایسا نہیں جو انھیں آگے بڑھائے اور زیادہ سے زیادہ کامل وحدت کی طرف رجوع کرے۔

انہی باتوں کو دیکھتے ہوئے جنٹائل نے ذہن کی وحدت پر بے حد زور دیا ہے۔ یہ تو خیر کروچے کے فلسفہ کی ایک تنقید تھی اور بہرصورت کوئی ایسی چیز نہیں جسے بنیادی کہا جا سکے، کیونکہ اس سے جدید تصوریت کی مرکزی کمزوریوں کا پتہ نہیں چلتا اس کے لئے ہم کو کچھ اور چھان بین کرنی چاہیئے ایک بات یہاں بطریق احتیاط کہہ دینی ضرور ہے اور وہ یہ کہ ذیل کی تنقیدوں میں ہیگل کے فلسفہ سے کروچے اور جنٹائل کے مجموعی فلسفوں کا مقابلہ کیا جائے گا، ورنہ جو لوگ یہ نہیں مانتے کہ فکر یا تجربہ یا روح حقیقت کی واحد

صورت سے ان کے نقطۂ نظر سے اس فلسفہ پر کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی تردید کو چھوڑ دیجئے۔

جدید تصوریت پر حسب ذیل اعتراضات (تصوری نقطۂ نظر سے) وارد ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔

(ا) ایک یہ کہ جدید تصوریت نے لاغیر نفسیت یا موضوعی تصوریت سے بچنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ کامیاب نہیں ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ اس کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ انفرادی تجربہ کے عقب میں یا اس کے ماورا کوئی چیز موجود نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کروچے اور جنٹائل دونوں نے کلی تجربہ کے وجود کا اقرار کیا ہے۔ لیکن ان کو خود اپنے پیش کردہ مقدمات کی بنا پر یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک ایسی چیز کے وجود کا اقرار کریں جو بلا واسطہ ان کے علم میں کبھی نہیں آتی یا جس کا علم انھیں تجربہ کی بنا پر نہیں ہوتا ایسی صورت میں ان کے مجموعی تجربہ کی حیثیت کسی طرح لاک کے جوہر یا تنقیدی موجودئیں کی طبیعی شے سے زیادہ نہیں کیوں کہ راست علم ہم کو ان میں سے کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ لہذا جدید تصوریت کا کلی تجربہ یعنی جملہ انفرادی تجربوں کا مجموعہ ایک معروضہ ہے جس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔

اس کے مقابلہ میں ہیگل کے فلسفہ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر موضوعی تصوریت اور لاغیر نفسیت دونوں سے بچاؤ کا کافی سامان مہیا ہے۔ کیوں کہ ہیگل یہ مانتا ہے کہ بلا واسطہ تجربہ متناہی اور جزئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں نہ کلی حقیقت بہ تمام و کمال موجود ہے اور نہ وہ یکسر حقیقی ہے چنانچہ اگر ہم اس کی تحلیل کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تضادات اور تناقضات سے مملو ہے اب یہ تناقضات اور تضادات رفع اسی وقت ہوتے ہیں جب کہ ہم ایک وجود مطلق کا اقرار کریں یعنی یہ مانیں کہ انفرادی تجربہ ایک بڑے کل کا ایک چھوٹا سا جزو ہے، لہذا کل اپنے ہر جزو میں موجود ہے۔ یوں ہیگل کے فلسفہ پر موضوعی تصوریت یا لاغیر نفسیت کا الزام عاید نہیں کیا جاسکتا۔

(ب) دوسرا یہ کہ جدید تصوریت کثرت کی کوئی توجیہ نہیں کرسکتی۔

اس میں شک نہیں کہ کروچے نے تجربہ کی چار فعلیتوں کے ذریعہ کثرت کی توجیہ کرنے کی ایک اچھی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش کی جنٹائل کے ہاتھوں جو درگت ہوئی وہ ہم سے مخفی نہیں۔

اس طرح تجربہ واحد رہتے ہوئے چار قسم کی فعلیتوں کا مبنیٰ نہیں ہو سکتا لیکن اس کی وحدت کاملہ بھی تو کثرت کے عقدۂ سربستہ کو نہیں کھول سکتی کیونکہ کثرت صرف اسی وقت وحدت سے برآمد ہو سکتی ہے جبکہ اس کی بالقوت یا تصور وحدت میں پہلے سے موجود ہو لیکن اگر کثرت کا امکان بھی وحدت میں پایا جائے تو وحدت وحدت نہیں رہتی اس کے برعکس اگر کثرت کو التباس قرار دیا جائے تب بھی دقت میں کوئی کمی رونما نہیں ہونے پاتی کیونکہ ایک حقیقی وحدت سے ایک ظاہری کثرت کا صدور اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ ایک حقیقی وحدت سے ایک حقیقی کثرت کا صدور مشکل ہے۔ بنابریں وحدت نہ کثرت کی توجیہ کر سکتی ہے اور نہ خطا کی۔

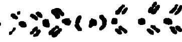
(ج) تیسرا اور آخری اعتراض یہ ہے کہ جدید تصوریت میں ذہن کی فعلیت کا کوئی سبب نہیں ہیگل کے فلسفہ نے تو خیر یہ کہہ کر کہ کل اپنے اجزا میں مسلسل ظاہر ہوتا رہتا ہے اور اجزا متناقض ہوتے ہیں ذہن کی فعلیت کی ایک وجہ جواز دریافت کر لی کیونکہ تناقصات سے بلند ہونے کی کوشش ایک ایسی کوشش ہے جس سے کائنات کی ترقی کے عنصر کی توجیہ بخوبی ہو جاتی ہے لیکن جدید تصوریت کے پاس اس ترقی کی وجہ جواز کیا ہے وہ حرکت کی مدعی ہے لیکن یہ نہیں بتلاتی کہ اس حرکت کا محرک کون ہے وہ کیا چیز ہے جو ذہن کو مسلسل بڑھتے رہنے پر اکساتی ہے۔

ان آرا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہیگل کا کوئی پیرو جدید تصوریت پر کون کون سے اعتراضات کر سکتا ہے لیکن جو تصوریت کے معروضات ہی کو تسلیم نہیں کرتے ان کے لئے ہیگل اور جدید تصوریت کے فلسفوں کے مابہ النزاع سوالات بالکل بیکار ہیں۔ اور اسی لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک فلسفے پر جو اپنے مسلمات، اپنے نقطۂ نظر، اور اپنے استدلال کے اعتبار سے موجودیت یا نتائجیت سے قطعاً مختلف ہے اس کے دائرہ سے الگ ہو کر کوئی تنقید نہیں کی جا سکتی ورنہ ایسی تنقید مریخ کے ساکنوں کی موسیقی پر تبصرہ کرنے کے مترادف ہوگی لہذا ناظرین کو چاہئے کہ وہ فلسفۂ جدید نے تصوریت کی جو نئی نئی شاخیں منظر عام پر لائی ہیں ان میں سے کسی ایک کو پسند کرنے سے پہلے تصوریتیں اور موجودیتیں کے مباحثوں پر ایک ناقدانہ نظر ڈال لیں اور پھر آگے بڑھیں۔

(ترجمہ)

رنگِ داغ

از حضرت متینؔ مچھلی شہری یادگارِ داغ رحمۃ



مجھے وہ شوق کامل ہے مراد جذبۂ دل ہے
کہ راہِ عشق میں ہر ہر قدم پر ایک منزل ہے

یہ مانا میں نے وہ سفاک ہے ظالم ہے قاتل ہے
مگر مل جائے ایسا اور کوئی دوست مشکل ہے

طریقِ عشق میں ہے راہزن بھی خضر بھی دل ہے
بڑی دشوار منزل ہے بڑی آسان منزل ہے

ہمارے دل کو کہتے ہو کہ یہ کس کام کا دل ہے
یہی وہ شے ہے عالم میں جو تم ایسوں کے قابل ہے

محیطِ غم سے بیڑا پار ہونا سخت مشکل ہے
اندھیری رات، طوفاں خیز دریا، دور ساحل ہے

الٰہی خیر! دونوں بجلیاں ٹکرانے والی ہیں
اُدھر برقِ نگہ ہے اِس طرف بیتابیٔ دل ہے

رگوں میں رُوح بن کر دوڑتی ہیں عشق کی لہریں
بدن میں میرے جو قطرہ لہو کا ہے وہ اک دل ہے

تجھے دل دیکے ہم کھوئے گئے ہیں دونوں عالم سے
بتِ ناآشنا۔ تیری محبت کا یہ حاصل ہے

تسلی دینے آئے تھے، کہ وہ تڑپانے آئے تھے
گئے ہیں جب سے آکر اور بھی اب مضطرب دل ہے

بس اتنا فرق ہے، پتھر اگر وہ ہے تو یہ پانی
تمہارے پاس بھی دل ہے ہمارے پاس بھی دل ہے

الٰہی! کیا نرالی شان ہے۔ بحرِ محبت کی،
کہ ہر ہر قطرہ دریا اور ہر اک موج ساحل ہے

متینؔ اچھی گزرتی ہے تصور میں حسینوں کے
ہمارا کلبۂ احزاں بھی گویا عیش منزل ہے

انڈین اکنامک کانفرنس

انڈین اکنامک کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ۲۸ر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء تک حیدرآباد دکن میں ہوا۔ ڈاکٹر پی۔ جے، تھامس پروفیسر معاشیات مدراس اس کے صدر تھے، جنرل سکریٹری ڈاکٹر بی، وی نرائن سوامی نائیڈو اور لوکل سکریٹری مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ناظم معلومات عامہ (سابق صدر شعبۂ معاشیات) اور ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ تھے۔ علی گڈھ، بنارس، کلکتہ، بمبئی، مدراس، ناگپور پٹنہ کی جامعات کے نمائندے اور تیس کے قریب بیرونی ممبروں نے کانفرنس میں شرکت کی۔ جامعہ عثمانیہ اور انڈمیہ کے طلبائے معاشیات بھی کانفرنس میں شریک رہے۔

۲۸ر دسمبر کو ۱۱ بجے اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پیام سے رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ سر اکبر نے خطبہ افتتاحیہ میں ریاستوں اور برطانوی ہند کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "ریاستیں قدیم زمانہ سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہی ہیں اور ان ہی کی بدولت ملک کی قدیم تہذیب کے تصورات محفوظ رہے، اب ریاستوں کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس عظیم الشان سرزمین ہند کی عافیت اس پر منحصر ہے کہ یہاں مختلف قوتوں کے درمیان صحیح توازن قائم رہے جس سے اتفاق و اتحاد کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور ایک قوت دوسری قوت کے دائرہ عمل میں دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب ایسا ہوا تو سارے ملک نے اس سے نقصان اٹھایا ہے"۔ مسائل حاضرہ میں سب سے پہلے آپ نے مسئلہ بے روزگاری کا ذکر کیا اور اس کا علاج طرز تعلیم کی از سر نو تنظیم بتلائی۔ اس سلسلہ میں آپ نے کہا "بے روزگاری کا خاتمہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ ہم اپنے طرز تعلیم کو مسائل حاضرہ کے مطابق بنادیں۔ ملک میں ہر قسم کے قدرتی ذرائع موجود ہیں۔ اور ان سے کام لینا ہمارا فرض ہے"۔ اعداد و شمار کے متعلق کہا کہ "علم الاعداد کی بڑی اہمیت ہے۔ ماہرین معاشر

اور ارباب حکومت دونوں کے لئے صحیح اعداد ہی تنہا رہنما ہیں ان کے بغیر ہمارے پاس کوئی ایسا مواد نہیں جنکی بنا پر ہم کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں، اور جب ایسا مواد دستیاب ہو جائے تو اس پر غیر جانب دارانہ طور پر غور کرنا چاہیئے اور فرقہ پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر ہمکو اپنے اغراض کے بنیادی اتحاد کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔"

صاحب صدر کے خطبۂ صدارت کا عنوان "ہندوستانی معیشت کے اہم مسائل" تھا خطبہ کافی طویل اور مبسوط تھا۔ آپ نے ہندوستانی معیشت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آپ نے بتلایا کہ تجارت خارجہ کے اضافہ، اور صنعت و حرفت کی ترقی کے باوجود ملک کے عام معیار زندگی میں کوئی قابل لحاظ تغیر نہیں ہوا آپ نے ملک کے معیار کی پستی کا سبب پیدائش دولت کی کمی اور تقسیم دولت کی عدم مناسبت کو قرار دیا۔ ہندوستانی کسان کا قرضہ اور اس کی دیگر مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اس کو اس شخص سے تشبیہ دی جو گردن تک پانی میں کھڑا ہے اور جسکو ایک موج غرق کر دینے کے لئے کافی ہے، صنعت و حرفت کے سلسلہ میں آپ نے کہا کہ ملک کے موجودہ مسائل کا حل بڑی بڑی صنعتوں کے قیام سے ختم نہیں ہو سکتا۔ ہمکو جاپان اور جرمنی کی تقلید کرنی چاہیئے جہاں متعدد صنعتیں گھریلو طور پر قائم ہیں، نیز زراعت جو ہمارے ملک کا خاص پیشہ ہے ہماری توجہ کا مستحق ہے اور اس کے بغیر صنعت و حرفت کی ترقی بھی ناممکن ہے، پھر عوام کی قوت خرید میں بھی اضافہ کی ضرورت ہے، حکومت کی قرضہ کی پالیسی پر آپ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ پالیسی بہت قدیم اور فرسودہ ہو چکی ہے۔ ملک میں سڑکوں، ذرائع آب پاشی اور دیگر مفاد عامہ کے کاموں کی بڑی قلت ہے ۳۳-۱۹۳۲ء میں جب کہ کساد بازاری اپنے عروج پر تھی حکومت قرض لے کر ادنی شرح پر ان کاموں کو شروع کر سکتی تھی۔ عدم مداخلت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بڑی صنعتیں اور بڑی آراضیاں خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں مگر چھوٹے پیمانہ پر کام کرنے والوں اور مزدوروں کو حکومت کے تحفظ کی ضرورت ہے، ان کو درمیانی آدمیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تجارت خارجہ کے سلسلہ میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں قومیت کے تخیلات اور خود کفالت کے خیالات نے ہندوستان کی برآمد میں بڑی تخفیف کر دی، ضرورت ہے کہ بعض بیرونی بازاروں کو مستحکم کر لیا جائے مگر اس کے لئے مال کی خوبی بڑھانا، خرید و فروخت کے طریقے کو منظم کرنا، اور خاص خاص ممالک سے تجارتی معاہدے کرنا از حد ضروری ہیں۔ نیز موجودہ دور میں ممالک غیر سے تجارت کے بارے میں

امید بخش توقعات قائم نہیں کی جاسکتیں۔ اس لئے ہندوستان کو اندرونی تجارت کی طرف زیادہ کوشش نہ کرنا چاہیئے بلکہ آبادی کے معیار صحت و کارکردگی کو بڑھانا چاہیئے۔ تاکہ ہم "محنت" کے ثمرات سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکیں۔ آخر میں آپ نے کہا کہ ہندوستان کی معاشی ترقی کا انحصار صوبجاتی حکومتوں اور دیسی ریاستوں پر ہے۔ یہ ان رکاوٹوں کو دور کرسکتے ہیں جو ہمارے معیار زندگی کو پست اور قوت خرید کو ادنیٰ بنائے ہوئے ہیں اور ایسا معاشی لائحہ عمل تیار ہو سکتا ہے جس سے پیدائش دولت میں اضافہ اور معیار زندگی میں بلندی ہو۔ اور اس کام میں معاشین کو ان کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

کانفرنس میں بحث و مباحثہ کے لئے حسب ذیل موضوع مقرر کئے گئے تھے۔

(۱) تجارتی چکر کا نظریہ

(۲) انڈیجنس بنکینگ اس کی تاریخ اور مسائل

(۳) ہندوستان میں مسئلہ بے روزگاری

(۴) صوبجاتی مالی مسائل۔

پہلے تین موضوع پر مقالے پڑھے گئے اور چوتھے موضوع پر تقریریں ہوئیں دو ایک مقالہ نگار حضرات نہ آسکے اس وجہ سے ان کے مقالے رہ گئے۔ جو مقالے پہلے وصول ہوگئے تھے وہ ماہ ستمبر کے "انڈین جرنل آف اکنامکس" میں شائع ہوگئے تھے اور باقی کانفرنس میں تقسیم ہوئے۔

تجارتی چکر کے نظریہ کے سلسلہ میں بعض حضرات نے ہیرڈ اور کینز کے خیالات پیش کئے۔ مگر زیادہ تر بحث و مباحثہ اس بات پر رہا کہ کیا تجارتی چکروں میں تسلسل پایا جاتا ہے اور کیا یہ ایک یکساں وقفہ کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ یہاں دو گروہ تھے ایک کا خیال تھا کہ ان میں قریب قریب تسلسل اور یکسانیت موجود ہے، دوسرے کا خیال تھا کہ ان میں کسی قسم کی یکسانیت اور تسلسل موجود نہیں۔

انڈیجنس بنکینگ کی بحث بڑی دلچسپ ہوگئی۔ جب ڈاکٹر انوار اقبال صاحب قریشی نے انکے علیحدہ وجود سے ہی انکار کیا۔ آپ نے کہا کہ "انڈیجنس بنکینگ" کی اصطلاح من گھڑت ہے اور دیسی زبانوں میں اس طبقہ کا کوئی الگ نام نہیں ہے۔ انڈیجنس بنکرس اور مہاجنوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ آپ

نے مختلف صوبجاتی بنکینگ انکوئری کمیٹیوں کے حوالے دے کر بتایا کہ وہ بھی ان میں کوئی فرق نہ بتا سکیں اور کمیٹی نے جن افراد کو اس فہرست میں شامل کیا ہے جو تقریباً دونوں قسم کے کام کرتے ہیں، آپ نے بتایا کہ ساہوکار اس وقت تک بینکر ہی نہیں کہلا سکتے جب تک کہ وہ باقاعدہ امانتیں حاصل نہ کریں کیونکہ امانتیں حاصل کرنا بینک کا اساسی فرض ہے۔ نیز بینک کی تعریف یہ کی کہ ایسا ادارہ جو امانتیں حاصل کرے اور قرض دے۔ اس کے بعد آپ نے چند مقامی بینکاروں کی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ انڈجنس بینکرس اور ساہوکاروں میں کوئی فرق نہیں اور آپ نے ان تمام خیالی امتیازات کی تردید کی ہے جو مختلف بنکینگ کمیٹیوں نے ان دونوں کے مابین قائم کئے تھے۔ مگر کانفرنس میں کسی نے آپکی اس تردید سے اتفاق نہ کیا اور بعض حضرات نے اپنے دلائل و استدلال پیش کرنے کی بجائے صوبجاتی اور مرکزی بنکینگ انکوئری کمیٹیوں کی رائے ہی پیش کی۔ گویا کمیٹیوں یا کمیشن کی رائے غلط ہی نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر راؤ (احمدآباد) نے بے روزگاری کی مختلف قسمیں بتائیں اور ہندوستان میں جس قسم کی بیکاری ہے اسکو دور کرنے کی تدابیر پیش کیں۔ پروفیسر کاروے (ممبئی) نے ہندوستان کے مختلف طبقوں مثلاً تعلیمیافتہ صناع زراعت پیشہ کی بے روزگاری کا ذکر کیا۔ آپ نے امداد غربا، بے روزگاری کے بیمہ، قحط کی امدادی رقم میں توسیع اور دیہات میں امداد بے روزگاران پر زیادہ زور دیا۔ مسٹر ایس اے صمد (کلکتہ) نے ملک کے کمانے والے اور ان کے مقابلے میں عمروں کے لحاظ سے کچھ نہ کمانے والوں کے اعداد پیش کئے۔ ملک کی بے روزگاری کا مقابلہ غیر ممالک کے مختلف ادوار سے کیا۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد ان کی ڈگریوں کے لحاظ سے پیش کی اور اسکو حل کرنے کی مختلف تدابیر پیش کیں۔

ڈاکٹر انتھونی نادر (آگرہ) نے بتایا کہ اس زمانہ میں روزگار کے مواقع کثرت سے پیدا ہوگئے ہیں ہمکو بھی نئے نئے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئیے۔ نئے مواقع میں آپ نے ہوابازی کو پیش کیا۔ اور ہندوستانی ہوائی فوج، ہوائی فوجی تعلیم کے کالج، اور اندرون ملک ہوائی جہازوں سے آمد و رفت کی توسیع پر زور دیا اور نوجوانوں کے سامنے ایک نیا میدان پیش کیا۔

بمبئی کے پروفیسر سی۔ این وکیل نے صوبجاتی مالیات پر ایک طویل اور دلچسپ تقریر کی۔ آپ نے

کہا کہ اب صوبوں کو نئے نئے اختیارات ملے ہیں۔ مگر انہیں نئی نئی اسکیمیں جاری کرنے کے لئے مزید اخراجات کی ضرورت ہے۔ زراعت سے اب مزید آمدنی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ زراعت خود امداد کی محتاج ہے۔ اس لئے صوبجاتی حکومتوں کو نئے نئے محاصل مثلاً تفریحی ٹیکس، پیشہ وری ٹیکس، محصول فروخت محصول تمباکو عائد کرنے کی ضرورت ہے۔ مفاد عامہ کی خدمات کو خانگی افراد کے ہاتھوں میں نہ چھوڑنا چاہیئے کیونکہ ایک تو کثیر منافع خانگی لوگوں کو ملتا ہے۔ دوسرے حکومت ان پر محصول بھی نہیں لگا سکتی کیوں کہ وہ اس کا بار صارفین پر منتقل کردیں گے۔ نئے نئے قرضے لینا بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے جو پٹنہ یونیورسٹی اور حکومت بہار کے نمائندے تھے کہا کہ صوبجاتی حکومتوں اور مرکزی حکومت کی آمدنی اور اخراجات میں کوئی مناسبت نہیں۔ ضرورت ہے کہ مرکزی حکومت انکم ٹیکس کا کچھ حصہ صوبوں کو دے۔ آپ نے بہار کے حالات کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ حکومت بہار کو صحت عامہ، دیہی تنظیم، ابتدائی تعلیم اور امداد باہمی کے لیئے ۲ کروڑ سالانہ مزید روپیہ کی ضرورت ہے۔ بہار میں آبکاری کی آمدنی بہت کم ہے، حکومت بہار مرکزی حکومت کے ملازموں کی تنخواہ میں تخفیف نہیں کرسکتی۔ وہ صوبجاتی ملازموں کی تنخواہ میں تخفیف، اور زرعی آمدنیوں پر محصول لگانے پر غور کررہی ہے۔ آپ نے محصول وراثت کو بھی مزید آمدنی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا اور مرکزی حکومت کے فوجی اخراجات میں تخفیف کی ضرورت کو ظاہر کیا۔

صاحب صدر نے کہا کہ یقیناً مدافعت و قناعت ہر ملک کے لئے ضروری ہے مگر اس میں حد سے زیادہ بڑھ جانا بھی ٹھیک نہیں۔ صوبوں پر نئے دستور کی رو سے جو نئی پابندیاں عائد ہوتی ہیں اس کے لئے مزید اخراجات کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ملک کی آمدنی کا لحاظ کرتے ہوئے تنخواہیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں تخفیف کی ضرورت ہے تاکہ تقسیم دولت میں عدم مساوات کی صورت باقی نہ رہے محصول فروخت ہر شے پر لگانا زیادہ مفید ہے۔ مفاد عامہ کی خدمات حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا ضروری ہے اور اس وقت تک ان کے اخراجات میں تخفیف نہیں کی جاسکتی۔ اس سلسلہ میں میسور کی مثال قابل تقلید ہے جہاں برقی روشنی کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ دیاسلائی کی صنعت

کو بھی خانگی افراد کے ہاتھوں میں چھوڑنا مناسب ہیں۔ صوبجاتی حکومتوں کو نئے نئے قرضوں کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہندوستان کا قومی قرضہ بہت کم ہے۔ صوبہ متحدہ کے وزیر اعظم قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اپنے یہاں کے اخراجات میں اضافہ کر دیا ہے۔"

دوران کانفرنس میں پروفیسر ڈنی، جی، کاروے، پروفیسر ڈی، جی کاتے، اور ڈاکٹر ڈی، کے آر، وی، راؤ نے مختلف ہندوستانی معاشی موضوعات پر عام فہم تقریریں کیں۔ نمائندان اور ممبران کو رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، نواب مہدی یار جنگ بہادر۔ اور مجلس استقبالیہ کی جانب سے عصرانے دیئے گئے اور محکمہ آرائش بلدہ کے نئے مکانات، زرعی مزرعہ حمایت ساگر، عثمان ساگر، ادارہ مصنوعات ملکی، صنعتی رقبہ مشیر آباد۔ دار الضرب سرکار عالی، قلعہ گول کنڈہ اور میوزیم وغیرہ کی سیر کرائی گئی۔ ۳۱ ردسمبر کو ۹ سے ۱۰ ½ تک کانفرنس کا کاروباری جلسہ ہوا جس میں آئندہ سال کے عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

مجموعی حیثیت سے کانفرنس بہت کامیاب رہی، طعام و قیام کا انتظام بہت معقول تھا مندوبین و اراکین یہاں کے حسن انتظام سے بہت خوش ہوئے۔ اس کامیابی کا سہرا مولوی حبیب الرحمن صاحب ناظم معلومات عامہ کے سر ہے۔ جنہوں نے شعبہ ہائے معاشیات و عمرانیات کے اساتذہ مدوبین اقامت خانہ، اور رضا کار طلبار کے اشتراک سے اسکو کامیاب بنایا۔

فیڈریشن یا وفاق

فرقہ وارانہ اختلاف کی وجہ سے ہندوستان کی فضا ایسی خراب ہوگئی ہے کہ کسی معاملہ میں اتحاد عمل کا خیال بھی مشکل سے آتا ہے۔ مگر ایک مسئلہ ایسا ہے کہ جسکی بابت سب فرقے اور سب جماعتیں متفق معلوم ہوتی ہیں۔ وہ مسئلہ فیڈریشن یا وفاق کا ہے۔ قانون حکومت ہند میں وفاقی نظام وضع کیا گیا ہے۔ اسے سب ناپسند کرتے ہیں اور اس کو ہندوستان کے لئے ناقابل قبول اور موجودہ نظام سے بھی زیادہ مضر سمجھتے ہیں اس پر سب متفق ہیں کہ کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے کہ جس سے قانون مذکور کے وفاقی جز پر عمل درآمد نہ ہونے پائے۔ مگر جب یہ سوال آتا ہے کہ وہ حکمت عملی کیا ہو تو مختلف جواب ملتے ہیں۔ جب کانگریس نے فیصلہ کیا کہ اس کے نمائندوں کو صوبوں میں عہدے قبول کر لینے چاہئیں تو اس مطمح نظر یہ تھا کہ صوبوں کی اسمبلیوں اور وزیروں کے ہاتھوں میں جو اختیارات آئیں گے ان کو فیڈریشن کو روکنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اب سات صوبوں میں کانگریس کی اکثریت ہے اور ان کی حکومت کانگریس کے ہاتھ میں ہے۔ مگر یہ بات روز بروز زیادہ صاف ہوتی جارہی ہے کہ یہ نئی طاقت وفاق کا مقابلہ کرنے میں کارگر نہیں ہو سکتی۔ کیوں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

۱۹۳۵ء کے قانون کے مجوزیہ جانتے تھے کہ اہل ہند اس کو کبھی منظور نہ کریں گے۔ بلکہ اس کو نیست نابود کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے اور اسی کوشش میں ہندوستان کے قابل سے قابل قانونی دماغ شریک ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے اسکو بناتے ہوئے ان امور کا خاص طور پر خیال رکھا۔ اور ایک ایسا نظام تجویز کیا کہ جسکو آئینی طریقوں سے ناکام بنانا ممکن نہیں۔ گورنر جنرل کو مرکز میں اور گورنروں کو صوبوں میں مختلف قسم کے وسیع اختیارات دیئے۔ قانون بنانے کے، احکام جاری کرنے کے، رعایا سے مالیہ وصول کرنے اور اسکو خرچ کرنے کے۔ الغرض ان کو وہ سب اختیارات دیدیئے جو کہ عام طور پر قانون ساز جماعتوں اور ذمہ دار وزیروں کو حاصل ہوتے ہیں۔

قانون ۱۹۳۵ء کے وفاقی جز کو نافذ کرنے کے لئے جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی صراحت دفعہ ۵ میں کی گئی ہے۔ اس کی رو سے بادشاہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی درخواست پر فیڈریشن کو بذریعہ اعلان قائم کرائے۔ صرف شرط یہ ہے کہ ریاستوں کی معینہ تعداد فیڈریشن میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صوبوں کے وزیروں یا ان کی قانون ساز جماعتوں سے فیڈریشن کے قیام کی بابت کوئی مشورہ نہ کیا جائے گا۔ لہٰذا ان کے کسی فعل کا اس پر اثر انداز ہونا بظاہر خارج از بحث ہے۔

فیڈریشن کے قیام کے اعلان کے بعد اگلا قدم وفاقی قانون ساز جماعتوں یعنی فیڈرل اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کا وجود میں لانا ہوگا۔ ان جماعتوں کے کچھ ممبر تو برطانوی ہندوستان کے صوبوں کی نمائندے ہوں گے اور کچھ ریاستوں کے۔ فیڈرل اسمبلی میں جو صوبوں کی طرف سے ممبر ہوں گے۔ ان کو صوبوں کی اسمبلیاں منتخب کریں گی۔ اگر وہ ان کو منتخب کرنے سے انکار کر دیں تو بظاہر وفاق کا کام تمام ہو سکتا ہے اصولاً اس کا امکان ضرور ہے۔ قانون کی دفعہ ۶۰ کی رو سے اگر ⅔ سے زیادہ ممبر کسی صوبہ کی اسمبلی کے اجلاس سے غیر حاضر ہوں تو اس کی کارروائی کو ملتوی کر دینا ضروری ہے۔ لہٰذا جب کبھی کسی صوبہ کی اسمبلی میں فیڈرل اسمبلی کے اراکین کا مسئلہ پیش ہو اور اس کے ⅔ سے زیادہ ممبر غیر حاضر ہو جائیں تو اس کی بابت کارروائی کو ملتوی کر دیا جائے گا۔ اور انتخاب عمل میں سے آنے سے رہ جائے گا۔ مگر اس ترکیب پر صرف اس شکل میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ صوبہ کی اسمبلی کے اراکین کی اکثریت جو کہ ⅔ سے زیادہ ہو وفاقی ممبروں کے انتخاب کو روکنے کا فیصلہ کرے اور اس پر استقلال سے قائم رہے۔ اس وقت کانگریس کو یہ اکثریت حاصل نہیں ہے اور ⅔ ایسی غالب اکثریت ہے کہ سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حصول آئندہ بھی نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔

کونسل آف اسٹیٹ میں ریاستوں کے نمائندوں کا تناسب زیادہ ہوگا۔ ان کی تعداد ۱۰۴ ہوگی۔ صوبوں کے نمائندے ۱۵۶ ہوں گے۔ ان کا انتخاب براہ راست عوام کی طرف سے ہوگا۔ حق رائے دہندگی کی شرائط کم و بیش وہی ہونگی جو اب پرانے نظام کے مطابق مرکزی اسمبلی کی ہیں۔ ان حالات میں کونسل آف اسٹیٹ میں غالباً اکثریت وفاق کے مخالفوں کی نہیں بلکہ اس کے موافقوں کی ہوگی۔

لہذا اس جماعت سے وفاق کی بیخ کنی کرنے میں مدد کی توقع رکھنا بے سود ہوگا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال معلوم ہوتا ہے کہ وفاق کے قائم ہوجانے کے بعد ہم اسکو ختم کرسکتے ہیں یا کم از کم اس میں خاطر خواہ تبدیلیاں کرسکتے ہیں۔ غالباً مسٹر سیتہ مورتی کے ذہن میں یہی بات بھی جب انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ "جس طرح ڈی ویلیرا نے آئرلینڈ میں حکومت پر قبضہ حاصل کرکے وہاں کے نظام میں تبدیلیاں کیں ہم بھی کرسکیں گے"۔ مگر یہ قیاس یک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ہماری مجوزہ وفاقی قانون ساز جماعت مقتدر نہ ہوگی۔ یعنی یہ کہ اسکو صرف چند مخصوص معاملات کی بابت قانون بنانے کا حق ہوگا۔ اور آئینی معاملات اس زمرہ میں نہیں ہیں۔ لہذا اس کو قانون حکومت میں تغیر و تبدل کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ آئرلینڈ کو اسٹیٹیوٹ آف ویسٹمنسٹر کی رو سے اتنی تبدیلیاں کرنے کا حق حاصل ہوگیا تھا۔ اور سلطنت برطانیہ کی عدالت عالیہ پریوی کونسل نے بھی دو مشہور فیصلوں میں اس حق کو تسلیم کرلیا تھا۔ بخلاف اس کے قانون حکومت ہند نے اسکو وفاقی قانون ساز جماعت کے دائرہ اختیار سے صریحی طور پر خارج کردیا ہے۔

بیشک اگر فیڈرل اسمبلی میں وفاقی نظام کے مخالفوں کی اکثریت ہو تو وہ اس کو درہم و برہم کرسکتے ہیں۔ اسمبلی میں ۲۵۰ ممبر صوبوں کی طرف سے ہوں گے۔ اور ۱۲۵ ریاستوں کی طرف سے۔ جہاں تک ریاستوں کے نمائندوں کا تعلق ہے اس کا گمان کرنا ہی بہت عبث ہے کہ وہ وفاق کی مخالفت میں کوئی عملی حصہ لیں گے۔ ان کی سعی تو یہ ہوگی کہ مخالف کوششوں کو ناکامیاب بنائیں اور عجب نہیں کہ اس سعی میں رشوت ناجائز دباؤ طرح طرح کے لالچ اور مذہبی تعصب کا جال پھیلا کر صوبوں کے بعض نمائندوں کی بھی معاونت حاصل کی جاسکے۔ مگر فرض کیجیے کہ فیڈرل اسمبلی میں وفاق کے مخالفوں کی مستقل اکثریت ہے۔ آئینی رواج کے لحاظ سے جس پارٹی کی اکثریت ہوتی ہے اسی کو اپنی وزارت قائم کرنے کا حق ہوتا ہے اگر وفاق کے مخالف اپنی وزارت قائم کرتے ہیں اور اس قانون کے بموجب جسکو ناقص اور آزادی کا منافی سمجھتے ہیں کام کرتے ہیں تو یہ وفاق کی مخالفت نہیں بلکہ درحقیقت اس کی موافقت ہوگی اگر وہ اس کی بندشوں سے آزاد ہوکر کام کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کے افعال خلاف قانون ہوں گے۔

اور گورنر جنرل ان کو علیحدہ کر دے گا۔ آج کانگریسی وزیر صوبوں میں اپنے عہدوں پر قائم ہیں۔ اسوجہ سے کہ قانون نے جو انکے اختیارات کی حد بندی کر دی ہے وہ اسکو تسلیم کرتے ہیں اور اسکو توڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اگر بالفرض فیڈرل اسمبلی میں اکثریت جو کہ وفاق کی مخالف ہے عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے یا عہدوں سے برخاست کر دیجاتی ہے تو گورنر جنرل اقلیت کے نمائندوں کو عہدوں پر مقرر کر دیگا اگر اکثریت قانون سازی کے کام میں رکاوٹیں، پیدا کرتی ہے۔ گورنر جنرل کونسل آف اسٹیٹ کے (جس میں جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں وفاق کے مخالفوں کی اکثریت ہونا بہت دشوار ہے) اور "مشترکہ اجلاس" کے ذریعہ سے اور اپنے اختیارات خصوصی کی مدد سے قانون پاس کرا سکتا ہے۔ اور اقلیتی وزرا کا بجٹ بھی منظور کرا سکتا ہے۔ یہ صورت حال کچھ ایسی ہی ہوگی جیسی کہ آج کل مرکزی اسمبلی میں ہے۔ کہ حکومت ذمہ دار ہے۔ اسمبلی کی اکثریت اس کے خلاف ہے۔ اس کے پیش کئے ہوئے مسودات کو رد کر دیتی ہے۔ بجٹ کو نامنظور کرتی ہے۔ مگر پھر بھی حکومت چلتی رہتی ہے اور جو کچھ چاہتی ہے کرتی رہتی ہے اور اس کی تمام کارروائیاں قانوناً درست اور جائز تصور کی جاتی ہیں۔

پس اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وفاق کے مخالف آئین کی چار دیواری میں رہ کر اسکو نیست و نابود کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان کی تقریریں۔ ان کی تحریکیں اور ترمیمیں جو بسا اوقات منظور ہوجایا کریں گی قومی جذبات کے پر اثر مظاہرے ہوں گے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ آئین کو اگر تبدیل کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف سیاسی جدوجہد کے ذریعہ سے۔

۱۹۳۵ء کے دستور کے متعلق جو بنیادی اعتراض ہے وہ تو یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا بنایا ہوا نہیں بلکہ ایک غیر قوم کی پارلیمنٹ کا ہے۔ اسکے علاوہ اس کی بہت سی دفعات ایسی ہیں جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہیں مگر باوجود ان دونوں نقائص کے کانگریس نے اس کے صوبجاتی جز کے نافذ ہوجانے پر عہدے قبول کر لئے۔ کانگریسیوں نے اس بات کی کوشش ضرور کی کہ انگریزوں کی طرف سے یہ اقرار کر لیا جائے کہ گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال نہ کریں گے۔ مگر انہوں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہ کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دستور کے وفاقی جز کا نفاذ ہو تو جو پارٹیاں اس کے خلاف ہیں وہ عہدے قبول کرنے پر غیر مشروط طریقہ پر آمادہ ہوجائیں یا کوئی ایسی شرائط پیش کریں کہ جن کے

پورا ہونے سے وفاقی نظام کی وہ برائیاں رفع ہوجائیں جو اس کو ناقابل قبول بناتی ہیں۔ وہ شرائط کیا ہو سکتی ہیں صوبوں میں عہدے قبول کرنے کے لئے تو کانگریس نے صرف یہ شرط پیش کی تھی کہ گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال نہ کریں۔ مگر مرکزی حصہ میں علاوہ گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کے جن کے استعمال نہ کئے جانے کا تو وعدہ ہونا چاہیے۔ اور بھی بہت سی دفعات ایسی ہیں جو کہ ہندوستان کے لئے مضر ہیں۔ ان میں سے بعض کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

وفاقی قانون ساز جماعت کے دونوں ایوانوں میں ریاستوں کے نمائندے ہوں گے۔ مگر قانون نے یہ لازم نہیں کیا کہ یہ نمائندے منتخب شدہ ہوں۔ عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا اور درست قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کو ریاستوں کے والی اپنی مرضی کے مطابق نامزد کر دیا کریں گے۔ یہ ممبر ریاستوں کے باشندوں کے جذبات اور خیالات کے ترجمان نہ ہوں گے۔ بلکہ اپنے رئیسوں کی خواہشات کے۔ مگر باوجود اس کے بھی وہ قابل اور دردمند ہو سکتے ہیں۔ نامزدگی کے طریقہ پر اصل اعتراض یہ ہے کہ نامزد کردہ اراکین اور منتخب شدہ اراکین کی ذہنیت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ اول الذکر کی وہ ذہنیت نہ ہوگی جو کہ ذمہ دارانہ خود اختیاری حکومت کے چلانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایک ایسا نقص ہے کہ اگر انگریز چاہیں تو اس قانون کو تبدیل کئے بغیر دور کر سکتے ہیں۔ گورنر جنرل بحیثیت بادشاہ کے نمائندہ تمام ریاستوں پر اقتدار رکھتا ہے اور ان کو مجبور کر سکتا ہے کہ جن اراکین کو وہ وفاقی قانون ساز حکومت کے ایوانوں میں بھیجیں وہ صحیح معنی میں ان کی رعایا کے نمائندہ ہوں۔

بحث کی بابت جو دفعات ہیں وہ ملک کے مفاد کو مدنظر رکھکر نہیں بنائی گئیں۔ جب تک ان پر عمل درآمد ہوتا رہیگا۔ ہندوستان کو شدید نقصان پہنچتا رہیگا۔ دفعہ ۱۱ کی رو سے فوج اور بیرونی معاملات کے محکموں پر وائسرائے کا پورا پورا اختیار ہوگا اور دفعہ ۳۴ کی رو سے قانون ساز جماعت کو اس بات کا حق نہ ہوگا کہ وہ ان محکموں کے خرچ کے لیئے جو رقم گورنر جنرل تجویز کرے اس میں تخفیف کرے۔

علاوہ ازیں دفعہ ۱۲ نے مالی معاملات کو گورنر جنرل کی خاص ذمہ داری قرار دیا ہے اور اس کو اس امر کا ذمہ وار بھی قرار دیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بننے دے کہ جسکی وجہ سے برطانیہ سے آنے والی

اشیا پر غیر معمولی ٹیکس لگ سکے۔ جب تک کہ یہ دفعات مسترد نہ کردی جائیں ہندوستان کے اقتصادی حالت کی درستی ممکن نہیں۔

وردھا کمیٹی کی رپورٹ

گذشتہ سال ہندوستان کی تعلیمی دنیا کا سب سے اہم واقعہ یہ تھا کہ وردھا ایجوکیشنل کانفرنس میں جو اکتوبر کے مہینے میں منعقد ہوئی تھی۔ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنیادی تعلیم کی ایک نئی اسکیم مرتب کی گئی۔ جب سے ہمارے ملک میں موجودہ نظام تعلیم رائج ہے، کوئی ایسی تعلیمی تحریک نہیں اٹھی جو اس اسکیم سے زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔

قبل اس کے کہ اس اسکیم کی خصوصیات سے بحث کی جائے۔ ہندوستان کی موجودہ تعلیمی حالت پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے بغیر اس پس منظر کے نئی اسکیم کے خط و خال پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکتے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جو نظام تعلیم اس وقت ہندوستان میں رائج ہے۔ اس سے ملک میں عام بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ اس بے اطمینانی کا آغاز تعلیمی مفکروں اور کارکنوں کے ایک چھوٹے سے حلقے سے ہوا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا اثر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ نہ صرف طلبا ر ان کے والدین بلکہ ہمارے برخود غلط حکام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ مجموعی نتیجہ ہے بہت سی مختلف قوتوں اور رجحانوں کا۔ جن میں سے کچھ عملی ہیں اور کچھ ذہنی۔ بعض وقتی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض دائمی نصب العین سے مگر وہ چیز جس نے اس تعلیمی اور تمدنی مسئلے کو سیاسی اور معاشی حیثیت سے نازک اور اہم بنا دیا ہے تعلیم یافتہ حلقے کی بے روزگاری ہے۔ دنیا کے عام معاشی حالات کا جو اثر ہندوستان پر پڑا۔ اور جسے ہمارے ملک کے سیاسی حالات نے اور گہرا کر دیا۔ اس کی وجہ سے اس مسئلے کی مخصوص اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے اور لوگ اپنے دل میں یہ سوچنے لگے ہیں کہ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جو نہ صرف ہماری قوم کی تمدنی زندگی سے بے تعلق ہو بلکہ طلبا کو اس قابل بھی نہیں بنا سکتی کہ اپنی روزی کما سکیں۔ لے دے کر اس کا یہی مقصد تھا سو اب وہ

بھی حاصل نہیں ہوتا۔

یہ تو بات کا ایک پہلو ہوا۔ دوسرے پہلوؤں پر نظر ڈالیئے۔ ہماری تعلیم پر صرف یہی اعتراض نہیں کہ وہ ملک کی موجودہ معاشی حالات سے مناسبت نہیں رکھتی بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے کوئی تخلیقی نصب العین نہیں جو قوم کو ابھارے اور آگے بڑھائے۔ دوربین تعلیمی مفکروں کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آج کل دنیا زبردست معاشرتی۔ سیاسی۔ معاشی اور تمدنی قوتوں کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ جن میں سے ہر ایک سماجی نظام کو اپنے اپنے سانچے میں ڈالنا چاہتی ہے۔ ہر سمجھدار آدمی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ نیا سماجی نظام جبر و تعدّی، باہمی مقابلے اور تشدد، یک رنگی اور استبداد پر مبنی ہوگا اور اس میں ایک فرد دوسرے فرد پر ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر ایک قوم دوسری قوم پر زبردستی حکومت کرے گی۔ یا اس کی بنیاد باہمی امداد و ہمدردی پر قائم ہوگی اور اس کے اندر ہر ایک کی شخصیت کو پوری نشو و نما پانے اور اپنے اپنے رنگ میں سماج کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا۔ حرص اور خوف ظلم و حسد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ راحت و مسرت کا معیار حکومت کی جگہ خدمت اور ملکیت کی جگہ تخلیقی عمل قرار پائے گا۔ یہ زبردست مسئلہ جس پر نوع انسانی کے بڑے بڑے اخلاقی اور مذہبی معلم ہمیشہ سے غور کرتے آتے ہیں آج ہمارے سامنے اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ اب تاریخ میں پہلا موقع آیا ہے کہ ہم اتنی قوت رکھتے ہیں (اگرچہ اتنی بصیرت نہیں رکھتے) کہ سماج کی تنظیم اس طرح کریں جس سے زندگی کے مادّی اور تمدنی دولت پر چند آدمیوں کا اجارہ نہ رہے بلکہ اس میں سب کا حصہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا وسیع الاثر معاشی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اور اس کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اپنے بعض طریقوں کو جو ہماری زندگی میں بہت مضبوطی سے جڑ پکڑ چکے ہیں لیں دنیا بدل رہی ہے۔ مگر ہم عادت کے بندے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا سماجی نظام ناقابل تغیر ہے اس مسئلہ کا ایک تعلیمی پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے خیالات اور جذبات کا رُخ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف موڑ دیا جائے تعلیم کے نئے نصب العین اور نئے طریقے کی ضرورت ہے جو بچوں کو لالچ اور خود غرضی کی زندگی کے لئے نہیں۔ بلکہ باہمی خدمت اور تخلیقی عمل کی زندگی کے لئے تیار کرے جس طرح ایک غیر منصفانہ اور غیر انسانی سماجی اور تعلیمی نظام خود غرض انسان پیدا کر سکتا ہے اسی طرح ایک معقول اور منصفانہ نظام

انسانوں کو حقیقی معنی میں انسان بنا سکتا ہے۔ بجز ان لوگوں کے جن کا دل انسانی ہمدردی سے خالی ہے جو تحلیل نفس اور معالجۂ نفس کے اصولوں سے ناواقف اور فطرت انسانی کی اصلاح پذیری کے منکر ہیں کوئی شخص اسے شیخ چلی کا منصوبہ نہیں کہہ سکتا

مگر ہمارا تعلیمی نظام آنکھیں بند کئے اُسی پُرانے ڈھرے پر چلا جا رہا ہے۔ اُسے اس سے بحث نہیں کہ کس قسم کے انسان اور کس طرح کے سماجی نظام پیدا کرنا چاہئیں وہ موجودہ حالت پر قانع ہے خواہ یہ حالت کتنی ہی ابتر کیوں نہ ہو بھلا اس سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ قومی زندگی کی قوتوں کو جمع کر کے کسی بڑے نصب العین کے حاصل کرنے کے کام میں لائے گا۔ وہ اپنے درسیات کے تنگ دائرے سے باہر نکلتا ہے اور زندگی کے حقیقی مسائل کو خطرناک سمجھ کر انہیں ہاتھ تک نہیں لگاتا۔

پچھلے چند سال میں بہت سی کوششیں کی گئیں کہ اس نظام میں تھوڑی بہت تبدیلی اور اصلاح کی جائے۔ نصاب میں کسی قدر توسیع کی گئی اس میں پیشے کی تعلیم برائے نام شامل کر لی گئی اور بے دلی کے ساتھ ادبی تعلیم کو بھی تھوڑی سی جگہ دی مگر یہ سب ظاہری لیپ پوت ہے تعلیم کا عام نظام اپنی جگہ پر قائم ہے۔ محض جزوی تغیر تبدل کر دیا گیا ہے تاکہ جو خرابیاں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ چھپ جائیں جو اصل کام ہے اُس پر اب تک کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس نازک وقت میں مہاتما گاندھی نے اس میدان میں بھی ہماری رہنمائی کی۔ اور جس جوش اور انہماک کے ساتھ انھوں نے ملک کی سیاسی ترقی اور سماجی اصلاح کا کام کیا تھا۔ اسی طرح اب تعلیم کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ انہیں اسکیم کا خاکہ بنانے میں اس پیچیدہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا پورا احساس ہے وہ دیکھتے ہیں کہ افلاس اور بے روزگاری ابنائے وطن کو گھن کی طرح کھا رہی ہے شہر والوں اور گاؤں والوں میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں میں جو خلیج حائل ہے وہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ہمارے مدرسوں کا درس جو زیادہ تر نظری اور کتابی ہے۔ بچے کی پوری شخصیت کی سالم تعلیم کے لئے کافی نہیں ہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمارا سارا سماجی سیاسی اور معاشی پروگرام جہالت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جب عوام کی جہالت کا یہ حال ہو کہ ان میں سے نوے فی صدی حرف شناس

تک نہ ہوں توکسی عمومی تحریک کو چلانا اگر ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سامنے اہمسا یعنی عدم تشدد کا نصب العین اور مختلف طبقوں کی ہم آہنگی کا تصور ہے۔ وہ دیہی صنعت کو مشینوں اور بڑے پیمانے کی صنعت کے حملوں سے بچانا چاہتے ہیں۔ ان سب باتوں کو مدِنظر رکھ کر ان کے سلجھے ہوئے دماغ نے جو جمعیت خاطر کا حیرت انگیز نمونہ ہے یہ تعلیمی اسکیم ترتیب دی ہے۔ ہم اس کے تعلیمی اور معاشی پہلو پر الگ الگ نظر ڈالیں گے۔

مہاتما گاندھی کے خیال میں "محض لکھنے پڑھنے کی قابلیت کوئی تعلیم نہیں ہے"۔ اس کے ذریعہ سے بچوں اور بڑوں کی بہترین قوتوں کو ابھارنے "کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ "بچے کی تعلیم کا آغاز دستکاری سے ہو، تاکہ شروع ہی سے اسے صحیح تربیت ملنے لگے"۔ یہ دستکاری مدرسے کی ساری تعلیم کا مرکز ہو اور تاریخ جغرافیہ، سائنس، ریاضی وغیرہ الگ الگ مستقل مضامین کی حیثیت سے بچے کے دماغ میں نہ ٹھونسے جائیں بلکہ دستکاری کے سکھانے میں جہاں جہاں ضرورت پڑے۔ اسے ان چیزوں کی تعلیم دی جائے۔ بچے کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کی قدرتی رو سے فائدہ اُٹھاکر استاد اس کے دل میں مختلف مضامین کے مطالعہ کا شوق پیدا کرے، نصاب تعلیم بچے کے طبیعی اور معاشرتی ماحول پر مبنی ہونا چاہئے اور دستکاری جو طبیعی ماحول کے وسائل کو معاشرتی ماحول کے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے ان دونوں کے مطالعے کا قدرتی نقطۂ اتصال ہے۔

اس بات کو پہلے ہی سے صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ نفع بخش دستکاری کو تعلیم کا مرکز قرار دینا نظریۂ تعلیم کی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بہت سے قدیم اور جدید ماہرین تعلیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مفید تخلیقی کام بچے کی مکمل تعلیم کے لئے نہایت اہم ہے۔ روسو۔ پستالوزی، فروئبل، مانٹسوری اور رسل اور رمن کے اور بہت سے لوگ اس خیال کے علم بردار ہیں بلکہ بہتوں نے اس پر عمل بھی کیا ہے مثلاً امریکہ میں ڈیوی نے جرمنی میں کیرشن، اسٹائنر نے اور دنیا کے ہر حصہ میں پروجکٹ میتھڈ کے حامیوں نے۔ اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی کا یہ خیال اس لحاظ سے اچھوتا ہے کہ انہوں نے اسے کتابوں سے بالواسطہ نہیں بلکہ اپنے تجربہ سے بلاواسطہ حاصل کیا ہے۔ مگر اس میں وہ جدت نہیں ہے۔

جس کا دعوے ان کے بعض پرجوش معرفین کرتے ہیں۔ اس لئے ہر سمجھدار ماہر تعلیم گاندھی جی کی رہنمائی کا خیر مقدم کرے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے وہ اصول عملی امکان کے دائرے میں آجائیں گے جن کا وہ ہمیشہ سے قائل ہے۔ مگر انہیں اب تک عمل میں نہیں لا سکا۔ اس لئے کہ کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ مروجہ نظام میں بنیادی تبدیلی کر سکے۔ دوسری طرف ان لوگوں کو جو ہر نئی چیز سے ڈرتے ہیں اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتے ہیں مطمئن رہنا چاہئے کہ یہ کوئی غیر آزمودہ انقلابی تجویز نہیں جس سے یہ اندیشہ ہو کہ تعلیم کے سارے نظام کو درہم برہم کر دے گی بلکہ ایسی چیز ہے جس کی تائید ماہرین تعلیم کی رائے اور تجربے سے ہوتی ہے۔

تعلیم اور طریق تعلیم کے اس نئے تصور کی تائید تعلیمی اور نفسیاتی دلائل سے کرنے کے لئے ایک طول طویل بحث کی ضرورت ہے جس کا یہاں موقع نہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ کا وہ حصہ جو اس بات سے متعلق ہے یہاں نقل کر دیا جائے: "نفسیاتی اعتبار سے یہ اسکیم اس لئے پسندیدہ ہے کہ وہ بچے کو خالص نظری اور کتابی تعلیم کے استبداد سے جو انفعالی تحصیل پر مبنی ہے اور جس کے خلاف اس کی فطرت فعال ہمیشہ احتجاج کرتی رہتی ہے، نجات دلاتی ہے۔ وہ تجربے کے ذہنی اور عملی عناصر میں توازن پیدا کرتی ہے اور (مناسب حالات میں) اس سے جسم اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے بچہ وہ سطحی تعلیم حاصل نہیں کرتا جس سے اس میں صرف لکھنے پڑھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور اکثر وہ بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے دماغ اور ہاتھوں سے تعمیری مقاصد کے لئے کام لے سکے۔ یہ گویا اسکی ساری شخصیت کی تعلیم ہے"۔ تعلیمی لحاظ سے یہ اس لئے قابل قدر ہے کہ "دستکاری کو تعلیم کا مرکز بنا کر ہم بچے کے علم میں زیادہ معروضیت اور حقیقت پیدا کر سکتے ہیں" اور علم کا تعلق بچے کی ضرورتوں اور دلچسپیوں سے پیدا کر کے اسکی خشکی اور بے ربطی کو دور کر سکتے ہیں جسکی وجہ سے اسکول کی تعلیم بچے کے لئے بے لطف اور بے معنی ہو جاتی ہے بعنفوان شباب کے زمانہ میں اور اس سے کچھ پہلے دستکاری سکھانا اور زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس عمر میں بچے اور نوجوان محض "الفاظ و علامات کے طلسم" سے اکتا کر "اشیا اور حقائق" کے طالب ہوتے ہیں اس منزل پر پہنچ کر دستکاری یا پیشے کی تعلیم اس کے احساسات اور دلچسپیوں کا مرکز بن جاتی ہے، ان میں ربط اور استواری پیدا کرتی ہے۔ اور اس کی مخصوص شخصیت کی تشکیل کرتی ہے۔

جو لوگ تعلیم کے تہذیبی اقدار پر زور دیتے ہیں انہیں یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔ کہ دستکاری پر زور دینے سے تہذیبی تعلیم کے وہ مقاصد جو واقعی قابل قدر ہیں، فوت ہو جائیں گے۔ اگر تہذیبی تعلیم کا مقصد توسیع نفس یعنی بچے کے دل میں نئی دلچسپیاں اور نئے شوق پیدا کرنا ہے تو یہ مقصد کوئی خاص مضامین پڑھانے سے نہیں بلکہ تعلیم و تعلم میں ایک خاص روح پیدا کر دینے اور بچے کے بڑھتے ہوئے ذہن پر ایک خاص اثر ڈالنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جرمنی کے جید ماہر تعلیم کیرشن اشٹائنر نے بڑی گہری بات کہی ہے۔ مزدور کی تعلیم انسان کی تعلیم کی کنجی ہے۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ جرمنی کے کتابی مدرسوں کو کامی مدرسے بنادیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سچی تہذیب کتابوں کے بالواسطہ علم سے جو تجربہ سے بے تعلق ہو حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے کام سے جو سماج کے لئے مفید ہو اور جس کو بچے خود ہی امنگ سے سمجھ بوجھ کر کریں اسی طرح لندن یونیورسٹی کے پروفیسر نن کا قول ہے کہ ہر قسم کا کام خواہ وہ ہاتھوں کا ہو یا دماغ کا جو بچے کی تخلیقی جبلتوں کو ابھارتا ہے اور فعالانہ دلچسپی کو بیدار کرتا ہے۔ تہذیب نفس میں ممد ہوتا ہے اور یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ دستکاری کے ذریعہ سے بہت سے "بدشوق طالب علموں" کی دماغی قوتیں بھی ابھر آئیں جنھیں معمولی کتابی تعلیم ابھار نہیں سکی۔ اس کے علاوہ خیال اور عمل میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ذہانت اور استدلال کی قوت کو اسوقت تک ترقی نہیں دے سکتے۔ جب تک ان سے ایسے مسائل کے حل کرنے اور ایسے منصوبوں کے پورا کرنے میں کام نہ لیا جائے جو ذہنی بھی ہوں اور عملی بھی۔ جو تعلیم اس نفسیاتی حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے اس سے تخیل کی نشوونما رک جاتی ہے۔ بنیادی تعلیم کی موجودہ تجویز جس میں دستکاری تعلیم کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔ اگر صحیح طریقہ سے چلائی گئی تو وہ یقیناً جودت فکر اور بامقصد عمل کی محرک ہوگی۔

اس کے علاوہ اس اسکیم کے دوسرے پہلو بھی قابل غور ہیں۔ مہاتما گاندھی کہتے ہیں "میں اپنی اس تجویز کو کہ تعلیم دیہی صنعتوں مثلاً کتائی اور دھنائی وغیرہ کے ذریعے سے دی جائے۔ ایک خاموش سماجی انقلاب کا نقطۂ آغاز سمجھتا ہوں۔ یہ شہر اور گاؤں کے تعلقات کے لئے ایک صحیح اخلاقی بنیاد کا کام دے گی اور اس سے موجودہ سماجی بے چینی اور مختلف طبقوں کے خراب تعلقات کو دور کرنے میں بہت مدد ملے گی یہ ہمارے دیہات کے بڑھتے ہوئے انحطاط کو روک دے گی اور ایک منصفانہ سماج کی

بنیاد قائم کر دے گی جس میں غریب اور امیر کی غیر فطری تفریق مٹ جائے گی۔ ہر شخص کو گذر اوقات کے قابل اُجرت مل سکے گی اور آزادی کا حق حاصل ہو جائے گا۔" ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس سماجی نظریہ سے جو اس قول سے ظاہر ہوتا ہے۔ اتفاق نہ ہو۔ خود میرا بھی یہ خیال ہے کہ جو قوتیں بڑے پیمانہ کی صنعت کو سائنس کی بنیاد پر ترقی دینے اور طبقوں کی مخالفت کو بڑھانے میں کارفرما ہیں وہ اس کوشش کے کے ذریعے سے کہ دیہی معیشت کی سادگی قائم رکھی جائے زیادہ عرصہ تک روکی نہیں جا سکتیں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بنیادی تعلیم کی یہ اسکیم تعصب کی اس دیوار کو جو دماغ کا کام کرنے والوں اور ہاتھ کا کام کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہے گرا دے گی اور تعلیم یافتہ طبقے کے دل میں محنت کی عظمت کا احساس پیدا کر دے گی۔ جسے ہمارے موجودہ مدارس نے مٹا دیا ہے، انسانی برادری اور باہمی وابستگی کے اس احساس کو بیدار کرنے سے نہ صرف اس وقت اہم اخلاقی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ آگے چل کر ایک منصفانہ اور ہمدردانہ سماجی نظام قائم کرنے میں آسانی ہو جائے گی معاشی حیثیت سے ممکن ہے کہ یہ تعلیمی اسکیم صنعتی انقلاب کی مصیبت سے پوری طرح نجات نہ دلا سکے۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مفلس اور بے روزگار دیہاتیوں کی قوت پیداوار کو بڑھا دے گی اور انہیں اپنی فرصت کے اوقات میں نفع بخش کام کرنے کے قابل کر دے گی۔ بشرطیکہ یہ معقول طریقے سے چلائی جائے اور اسے حکومت کے سب محکموں کی متفقہ تائید حاصل ہو

لیکن صرف مدرسوں میں دستکاری کو داخل کر دینا کوئی جادو کا منتر نہیں جس سے یہ سب فوائد جو اس اسکیم کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں حاصل ہو جائیں اس کے لئے طریق تعلیم اور نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جن کے بغیر اچھی سے اچھی اسکیم بھی بے کار ثابت ہوگی۔ خود مہاتما گاندھی کو اس ضروری شرط کا پورا احساس ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں "دستکاری محض میکانکی طریقے سے نہیں بلکہ عملی طریقے سے سکھائی جائے۔ یعنی بچے کو ہر عمل کی علت اور غایت بھی بتانی چاہیئے۔" اس کے یہ معنی ہیں کہ جو دستکاری اختیار کی جائے اس میں کافی تعلیمی صلاحیت موجود ہو اور طریق تعلیم میں اس صلاحیت سے معقول طور پر کام لیا جائے۔ اسکیم کا اصل مقصد ایسے کاریگر پیدا کرنا نہیں جو اپنے پیشے کے لئے تیار

کئے گئے ہوں بلکہ یہ ہے کہ دستکاری کے ذریعہ سے جو ذہنی، اخلاقی اور عملی تربیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اسے تعلیمی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے تاکہ ہر فرد تعلیم پاکر نہ صرف ایک اچھا دستکار بلکہ ایک اچھا انسان بن جائے۔ اس لئے دستکاری صرف نصاب تعلیم کا ایک زائد مضمون ہی نہیں بلکہ طریق تعلیم کا ایک اصول ہے جس پر اسکول کا سارا کام مبنی ہے اور جس میں مل کر کام کرنے سمجھ بوجھ کر ایک نقشہ بنانے اور اسے صحت کے ساتھ عمل میں لانے، طلبا میں ذاتی اپج اور ذاتی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کا سبق ہر روز دیا جاتا ہے۔ اگر اسکول کے اور مضامین بدستور پرانے طریقے سے پڑھائے جائیں یعنی طلبا، محض انفعالی طور پر بالواسطہ علم حاصل کریں تو اس اسکیم کا بنیادی مقصد فوت ہو جائے گا۔ طریقہ تعلیم کے علاوہ دستکاریوں کے انتخاب میں بھی بہت احتیاط اور غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر دستکاری کو مکمل اور متوازن ذریعۂ تعلیم بنانا ہے تو وہی دستکاریاں منتخب کی جائیں جن میں قدرتی طور پر انسانی زندگی کے اہم مشاغل اور دلچسپیوں سے ربط پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اور جن کا دائرہ نصاب کے کل مضامین کو گھیر سکتا ہو۔ اسی لئے ذاکر حسین کمیٹی نے ایسی اہم اور وسیع دستکاریاں تجویز کی ہیں جیسے بنائی اور کتائی، زراعت اور باغبانی، لکڑی کا کام، چمڑے کا کام، جو ہمارے ملک میں مدتوں سے چلی آتی ہیں، قدیم روایات کی حامل ہیں اور انسانی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں، اس طرح کی دستکاری ایک مرکز کا کام دے سکتی ہے۔ جس کے گرد تاریخی، جغرافی اور علمی دلچسپیوں کا ایک دائرہ بن جائے۔ آگے چل کر ان کی تقسیم تاریخی، جغرافیہ اور سائنس کے مستقل علوم میں کی جا سکتی ہے۔ لیکن ابتدا میں یہ بچے کے قدرتی غیر منقسم تجربے کے اجزا ہیں جو رفتہ رفتہ نشوونما پاتا ہے

امریکہ میں بیس سال سے منصوبی طریق کا روس میں ترکیبی طریق کا اور دوسرے ملکوں میں اسی قسم کے طریقوں کا جو تجربہ کیا گیا ہے اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ مجوزہ طرز تعلیم پسندیدہ بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ بہت سی ابتدائی مشکلات اور جزوی پیچیدگیاں حل ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈیوی اسکول کے ریکارڈ سے بہت کچھ مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ مناسب دستکاریوں میں معلم کو

کافی موقع ملتا ہے کہ جو دستکاری اسکول میں سکھائی جاتی ہے اسے نصاب کے کل مضامین سے ربط دے سکے۔ ذاکر حسین کمیٹی نے مثال کے طور پر روئی کے پروجکٹ میں کپاس کی کاشت کی تقسیم، روئی کی دھنائی، کتائی اور کپڑا وغیرہ بننے کی مختلف ترکیبوں کے تعلیمی امکانات دکھائے ہیں، اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، بلکہ ریاضی اور زبان کے معلموں کے لئے بھی کس قدر وسیع میدان موجود ہے۔ جغرافیہ داں دنیا کے ملکوں میں روئی کی تقسیم اس کی کاشت کے لئے مناسب آب وہوا۔ اس کی درآمد اور برآمد کپڑے کی صنعت کی مختلف صورتوں سے بحث کر سکتا ہے اس سلسلے میں صنعتی انقلاب کی طرف اشارہ کر سکتا ہے، روئی کے کاشتکاروں اور روئی کے ملوں کے مزدوروں کی معاشی حالت کا نقشہ کھینچ سکتا ہے۔ تاریخ کا معلم بچہ کو اس طرف توجہ دلا سکتا ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو موسم کی تکلیفوں سے بچانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے ہیں اور کپڑوں کو مفید اور خوشنما بنانے کی کوشش کو تمدن کی ترقی سے کیا تعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ کے مطالعہ کا یہ ایک تنگ نقطۂ نظر ہے۔ لیکن اسی کے ضمن میں دوسرے پہلوؤں پر نظر ڈال کر اس میں وسعت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہندوستان کی روئی کی صنعت کی نشو و نما، مغرب سے تجارت کا آغاز اور اس کی ترقی اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اس کا انحطاط۔ اس کے بعد کپڑوں کے کارخانوں کا قائم ہونا سدیشی کی تحریک وغیرہ اس موضوع میں ہندوستان کے معاشی نشیب و فراز کے مطالعہ کی کس قدر گنجائش ہے! اب اس پروجکٹ کو سائنس کے پہلو سے دیکھئے تو کپاس کی کاشت کی منزلیں بیج کا بویا جانا۔ پودے کا اگنا اور بڑھنا۔ اس میں پھول آنا۔ اور فصل کا تیار ہو کر کاٹا جانا ان کے سلسلے میں نباتیات، زراعت، طبعیات، کیمیا، حیوانیات وغیرہ عام سائنس کا پورا کورس ایک معقول اور دلچسپ بنیاد پر سکھایا جا سکتا ہے۔ چرخے کا "رومانی پہلو" اور وہ دیہاتی گیت جو کپاس کی کٹائی اور روئی کی کتائی اور بنائی کے وقت گائے جاتے ہیں جمالیاتی تربیت کا نقطۂ آغاز بن سکتے ہیں۔ اسی کے سلسلے میں حساب کے مختلف عمل آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں۔ غرض کسی کو یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ اس پروجکٹ کو چلانے سے بچے کو کافی اور مفید معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ ظاہر

ہے کہ معلم کو اس طرز تعلیم میں وہ آسانی نہیں ہوگی جو درسی کتابوں کے پڑھانے اور صوری منطق کے طریقہ سے کام لینے میں ہوتی ہے۔ مگر اُسے وہ گُر ہاتھ آجائے گا جو اس سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے کہ کیونکہ ذہنی قوتیں زندگی کی، علم عمل کا، منطق نفسیات کی تابع بنائے جاسکتی ہے۔

اسکیم کے اس پہلو پر کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکال لے بہت کچھ بحث ہوئی ہے اور اس کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے جاتے ہیں کیا تعلیم کے لئے اپنا خرچ آپ نکالنا ممکن ہے؟ کبھی آجتک یہ ہوا بھی ہے؟ اگر ایسا ممکن بھی ہو تو کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟ اس کا یہ ضرر نتیجہ تو نہ ہوگا کہ ابتدا سے نفع کمانے کی خواہش بچوں کے کام کی محرک بن جائے گی؟ پہلے ہم آخری سوال کا جواب دیں گے اس لئے کہ یہ اخلاقی اہمیت رکھتا ہے۔ تنقید کرنیوالوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ نفع کے لئے کام کرنا جب کہ یہ خودغرضی پر یا دوسروں کے کام سے فائدہ اٹھانے پر مبنی نہ ہو بلکہ اس کی غرض ایک بڑے قومی کام میں حصہ لینا ہو تو یہ ایک قابل تعریف چیز ہے آخر اس میں کیا برائی ہے کہ بچے اپنی تعلیم کے خرچ کا کچھ حصہ اپنی محنت سے ادا کریں۔ رہی یہ بات کہ یہ خیال قابل عمل ہے یا نہیں اس کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ یہ واقعی ایک بڑے پیمانہ پر اس کا تجربہ نہ کیا جائے۔ بعض خاص اسکولوں میں یہ تجربہ کامیابی کے ساتھ کیا جاچکا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ اس بات کی ضمانت کے لئے کافی نہیں کہ پوری قومی تعلیم میں بھی یہ صورت کامیاب ہو سکے گی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنا خرچ آپ نکالنا یہاں ایک محدود معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ گاندھی جی نے معقول دلائل سے متاثر ہوکر اپنے پہلے خیال میں ترمیم کردی ہے۔ اور اب وہ صرف اتنا چاہتے ہیں۔ کہ ایک عرصہ کے بعد معلموں کی تنخواہ کا خرچ بچوں کے کام سے نکل آئے۔ دوسرے یکمشت اور ہموقت اخراجات حکومت کے ذمہ ہوں۔ ذاکرحسین کمیٹی نے اس مسئلے پر خصوصاً کتائی اور بنائی کے سلسلے میں اچھی طرح غور کیا ہے اور مزدوری کی موجودہ شرح کے مطابق یہ حساب لگایا ہے کہ اگر حکومت بچوں کے کام کی پیداوار کو خریدنے کی ذمہ داری لے لے تو خرچ کا بہت بڑا حصہ نکل سکتا ہے۔ بشرطیکہ تعلیم اور نگرانی صحیح طریقہ سے کی جائے۔ گاندھی جی نے اس شرط پر دو وجوہ سے زور دیا ہے۔ ایک یہ کہ جب تک مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے اس قسم کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی جائے۔ سات سال کی مفت اور جبری ابتدائی تعلیم کا نظام قائم کرنا محض ایک خیالی چیز بن کر رہ جائے گی۔ البتہ اگر موقت اخراجات کے بڑے حصے کے

نکل آنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو حکومت اس اسکیم کو فوراً جاری کر سکتی ہے ۔ دوسرے وہ دستکاری کو محض ایک زائد مضمون کے طور پر سکھانا نہیں چاہتے ۔ بلکہ اسے معاشی طور پر نفع بخش بنانا چاہتے ہیں تاکہ طالب علم سات برس کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اگر اس دستکاری کو پیشے کے طور پر اختیار کرے تو کم از کم پندرہ روپے ماہوار کما سکے ۔ یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک استادوں اور شاگردوں کے کام کی صحت اور عمدگی کو جانچنے کا کوئی مقررہ معیار نہ ہو ۔ کمیٹی کی رائے میں "بغیر اس قسم کی جانچ کے یہ خطرہ ہے کہ کام سست اور ڈھیلا پڑ جائے گا اور اس میں ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے کوئی تعلیمی قدر باقی نہ رہے گی اگر دستکاری وغیرہ کی تعلیم پر جو وقتاً فوقتاً اسکولوں میں جاری کی گئی ہے نظر ڈالیں تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے ۔" مگر دوسری طرف کمیٹی کو اس خطرہ کا بھی پورا احساس ہے کہ مبادا اس اسکیم کو عمل میں لاتے وقت اس کے معاشی پہلو پر اتنا زور دیا جائے کہ اس کا تعلیمی مقصد فوت ہو جائے ۔ استاد اپنی توجہ اور محنت بچوں سے زیادہ سے زیادہ مکانکی کام لینے پر صرف کر دیں اور دستکاری کے ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر دیں معلموں کی تربیت اور نگرانی کرنے والے اسٹاف کی نگرانی میں بلکہ سارے تعلیمی نظام میں اس بات کی پوری احتیاط مدِ نظر رہنی چاہئے ۔ اس کے بعد کمیٹی کہتی ہے "ہم اس بات کو صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم بنیادی تعلیم کی اس سکیم کو بجائے خود اچھا سمجھتے ہیں ۔ اگر وہ اپنا خرچ کسی حد تک بھی نہ نکال سکے ۔ تب بھی اسے ایک معقول تعلیمی پالیسی اور قومی تعمیر کی ایک ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہیئے ۔ اگر جیسا کہ میں نے دکھایا ہے ۔ اس کے ذریعہ سے تعلیم کا تھوڑا بہت خرچ بھی نکل آئے تو اس کی تائید کی ایک مزید دلیل ہو گی ۔

اس سے انکار کرنا فضول ہے کہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں گی پہلی مشکل ایسے معلموں کی تربیت ہے جو اس نئی بنیادی تعلیم کے تصوّر کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور اس کے طریقۂ تعلیم کے ماہر ہوں ۔ پھر مناسب کتابیں مہیا کرنے کی دقت ہے ۔ پھر وہ مسائل ہیں کہ تعلیم کا معیار کیونکر اتنا بلند کیا جا سکتا ہے کہ سات سال میں بچوں کو وہ سب ضروری معلومات حاصل ہو جائے ۔ جو ایک جمہوری ریاست کے شہریوں کو درکار ہے اور موجودہ تعلیمی نظام کو مجوزہ نظام کی شکل میں لانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا پڑیں گی ؟ کمیٹی نے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے مفید اشارات پیش کئے

ہیں۔ اور تعلیم کے اس نئے تصور کی تشکیل کی کوشش ہے جس کے مطابق اسکول کی بنا عمل اور اتحاد باہمی پر قائم ہوگی اور وہ بچوں کو خود زندگی کے ذریعے سے زندگی کے لئے تیار کرے گا۔ اس نے معلموں کی تربیت امتحانات، نگرانی، نصاب تعلیم اور دوسرے متعلقہ مسائل کے بارے میں اہم سفارشات کی ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سی مشکلات، مثلاً بہتر استاد اور بہتر کتابیں فراہم کرنے اور معیار تعلیم کو بڑھانے کے مسائل اب بھی ہمیں درپیش ہیں خواہ ہم اس اسکیم کو اختیار کریں یا نہ کریں۔ صورت حال یہ نہیں ہے کہ ہم ایک اچھے خاصے نظام تعلیم کی جگہ خواہ مخواہ ایک بالکل نیا نظام جاری کرنا چاہتے ہیں بلکہ اصل میں ہم ایک فرسودہ اور بے جان تعلیم کو جو قومی زندگی کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بدلنا چاہتے ہیں یہ مقصد اس قدر زبردست اور اہم ہے کہ اس کے لئے جس قدر کوشش اور روپیہ بھی صرف کیا جا سکے وہ کم ہے۔ اور ہمارے ذہنی جمود یا قدامت پسندی یا مالی احتیاط کو اس کی راہ میں حائل نہ ہونے دینا چاہئے۔

اس اسکیم پر مجموعی نظر ڈالتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مہاتما گاندھی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ابتدائی تعلیم کے سات برس کے کورس کی حمایت کی ہے درآنحالیکہ محکمۂ تعلیم کے حکام ابھی تک یہی بحث کر رہے ہیں کہ چار سال کا کورس بہتر ہوگا یا پانچ سال کا۔ پھر ان کی جدت تخیل نے تعلیم کو دیہی زندگی اور کاروباری ضرورتوں سے وابستہ کر دیا ہے اور اس حقیقت کو محسوس کر لیا ہے کہ دستکاری ایک مکمل سماجی اور اخلاقی تعلیم کا ذریعہ بنائی جا سکتی ہے، انھوں نے "کتابی اسکولوں" کو بدل کر "کامی اسکول" بنانے اور بچوں کو خالص نظری اور انفعالی تعلیم کے بوجھ سے نجات دلانے کی ایک تدبیر بتائی ہے۔ انہوں نے اس امکان کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر ہم میں اتنی سمجھ اور اتنا تخیل ہو تو ہم اسکول کے کام کے ذریعے سے بچوں کی تخلیقی قوتوں کو ابھار سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی اسکیم نفسیاتی حیثیت سے بہت قابل قدر ہے۔ اس لئے کہ اس نے ملک کی تعلیم کے مسئلے کو ایک اور ہی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ جہاں جزوی تبدیلیوں کی بحث باقی نہیں رہی۔ بلکہ ایک بالکل نئے نظام کا مسئلہ درپیش ہے جو ہماری قومی روح سے اور قومی مقاصد سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس نئی تحریک کے لئے لوگوں کے جوش عمل اور جوش خدمت کو ابھارنا کہیں زیادہ آسان ہے۔ مگر اس مقصد میں کامیابی اس طرح حاصل نہیں ہوگی کہ اس اسکیم کی روح کو چھوڑ کر اس کے الفاظ پر حرف بحرف عمل کیا جائے۔ کمیٹی کی

رپورٹ میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کی ضمن میں بہت سے تعلیمی مسائل حل طلب ہیں جنہیں مخلصانہ اور منصفانہ تحقیق اور تجربے کے ذریعہ سے حل کرنا ہوگا۔ ہندوستان کے معلموں کے لئے صلائے عام ہے کہ وہ موجودہ عہد کے اس سب سے بڑے تعلیمی جہاد میں شامل ہوں اور اُسے انجام تک پہنچائیں۔

غزل

(حضرت جگر مراد آبادی)

مۓ منصور پلا دے ساقی
نور ہی نور پلا دے ساقی

جامِ بلور پلا دے ساقی
چشم بد دور پلا دے ساقی

عمر بھر نام نہ لوں پینے کا
اتنی بھرپور پلا دے ساقی

تاکجا ہستیِ ناکام مری
شعلۂ طور پلا دے ساقی

تجھکو اپنی ہی تجلی کی قسم
ساغرِ نور پلا دے ساقی

مۓ ظاہر تو بہت کچھ پی لی
مۓ مستور پلا دے ساقی

تو تو ساقی ہے تجھے کام سے کام
میں بھی چور پلا دے ساقی

تشنہ کاموں سے اب انکار ہے کیوں
حسبِ دستور پلا دے ساقی

ساغرِ ظلمتِ غم میں بھر کر
بادۂ نور پلا دے ساقی

کہہ گیا کیا یہ سیہ مستی میں
شب دیجور پلا دے ساقی

مۓ گل رنگ کے جلوے کب تک
حاصلِ طور پلا دے ساقی

میں تو جب جانوں مری توبہ کے بعد
کرکے مجبور پلا دے ساقی

صبرِ ایوب کی تجھ کو سوگند
بیٹھے ہیں دور پلا دے ساقی

ساغرِ ہوش میں اب تو بھر کے
روحِ منصور پلا دے ساقی

تیری ہر شرط حقیقی و مجاز
مجھکو منظور پلا دے ساقی

جانے کیا شے وہ افق تاب ہوئی
میں ہوں مجبور پلا دے ساقی

۲ جنوری ۱۹۳۸ء

معجم المصنفین

"معجم المصنفین" کے نام سے ایک جلیل القدر اور مہتم بالشان عربی کتاب مدت سے حیدرآباد میں زیر تالیف ہے۔ مولانا حیدر حسین صاحب شیخ الحدیث ندوۃ العلماء کے برادر محترم مولانا محمود حسن خاں صاحب مدظلہ نے اس عظیم الشان کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ کتاب ایک نہایت مستند اور ضخیم انسائیکلو پیڈیا کی صورت میں تالیف ہو رہی ہے اور دولت آصفیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کی سرپرستی و کفالت میں یہ زبردست علمی کام سرانجام پا رہا ہے۔

یہ مضمون مولانا عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی کے عربی مقالے کا ترجمہ ہے جو جمعیۃ دائرۃ المعارف حیدرآباد میں شیوخ و علمائے ازہر کی آمد کے موقع پر ان کے سامنے پڑھا گیا۔ مولانا عبدالقدوس صاحب کتاب مندرجہ عنوان کی تالیف میں مولانا محمود حسن صاحب کا دست راست ہیں۔ عربی ادب و انشاء پر آپ کو غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ چونکہ آپ کے اس مقالے سے معجم المصنفین کی اہمیت اور اس کے تفصیلی حالات کے علاوہ اور بہت سی کارآمد معلومات حاصل ہوتی ہیں اسلئے اس کا ترجمہ قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

صدر محترم و حاضرین کرام!

میں اس موقع پر کوئی تقریر کرنا یا مفصل علمی مقالہ پیش کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ دولت آصفیہ نے عربی زبان کی خدمت میں جو مساعی مبذول رکھی ہیں ان میں سے بعض سے آپ کو روشناس کراؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دولت ابد مدت نے انتہائی توجہ کے ساتھ اس زبان کی خدمت میں کما حقہ حصہ لیا ہے۔ جو حضارت اسلامیہ کے آغاز سے آج تک علمی زبان بنی ہوئی ہے۔ انہی مساعی مشکورہ میں کتاب معجم المصنفین کا نام سب سے زیادہ جلی اور نمایاں نظر آتا ہے جو ہنوز تنقیح و ترتیب کے منازل سے گزر رہی ہے۔ اب تک اس کی چار جلدیں شائع ہوئی ہیں اور باقی انشاء اللہ عنقریب شائع ہوں گی۔ یہ عظیم الشان کتاب تقریباً

بیس ہزار مطبوعہ صفحات میں ختم ہوگی۔ بلحاظ موضوع یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہوگی۔ جس کی ضرورت وحاجت محتاج بیان نہیں۔ کوئی عالم جسے علم ومدنیت اسلامیہ کی تاریخ سے شغف ہو اس نوع کی کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جو اسلامی تمدن قرون ماضیہ میں انتہائی عروج حاصل کرچکا ہو۔ اور آج تک اسی آب وتاب کے ساتھ باقی ہو اس کی تاریخ کہاں تک اعتنا و التفات کی مستحق نہ ہوگی۔

جن لوگوں کو تاریخ تمدن وحضارت سے دلچسپی رہی ہے۔ خصوصاً اسلامی مدنیت اور زبان عربی کے ادب سے زیادہ تعلق رہا ہے ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ مسلمانوں نے اپنی حکومت وسلطنت کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد ہی علوم وفنون کی خدمت شروع کردی تھی۔ خود بھی کتابیں تالیف کیں اور یونان، فارس اور ہندوستان کے علمائے متقدمین کی کتابوں کے ترجمے بھی اپنی زبان میں کئے۔ بلاشبہ انہوں نے اپنی ان خدمات میں اتنی زیادہ ترقی کی کہ تمام پچھلی قوموں سے اس خصوصیت میں بڑھ گئے اور تالیف میں اتنا غلو کیا کہ بعض مولفین نے پانچسو تالیفوں سے زیادہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ اور بعض کی تالیفات کی تعداد تو اس سے بھی زیادہ ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ دراصل تالیف کا کام عربی زبان میں قرآن کریم کے نزول کے بعد سے شروع ہوا ہے اور یہ قول کہ عربی میں سب سے پہلی کتاب جڑی بوٹیوں پر ایک یمنی شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے لکھی تھی، افسانوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تاریخ آداب پر جس شخص کی نظر ہو وہ ہرگز اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ حق یہ ہے کہ نزول قرآن سے قبل کوئی عربی کتاب موجود ہی نہ تھی اور اگر کہیں کچھ منتشر اور نامکمل اجزاء توریت وانجیل کے تراجم کے تھے بھی تو وہ اتنے غیر مرتب اور ناقص تھے کہ ان پر لفظ کتاب کا اطلاق ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر ترقی کرنیوالی قوم آغاز تالیف کے معاملہ میں مشترک نظر آتی ہے۔ اس نوع کی تمام اقوام میں دیکھا گیا ہے کہ سب سے پہلے آداب دین کی تدوین کی جاتی ہے۔ اس خصوص میں ہندوستانی، یونانی ایرانی اور مصری سب یکساں ہیں۔ چنانچہ ہند، یونان، فارس اور مصر قدیم میں سب سے پہلے وہی گیت جمع کئے گئے جو ان کے معبودوں کی تعریف میں گائے جاتے تھے۔ دینی آداب کے بعد علوم فلسفہ وغیرہ پر توجہ ہوئی۔ رہے عرب تو ان میں چونکہ عمرو بن لحی بانی بت پرستی کے ظہور کے بعد سے کوئی خاص مذہب نہ رہا

تھا۔ اس لئے ان کی کوئی تالیف بھی نہ تھی۔ مذہبی نہ فلسفیانہ۔

جب یونان کا دور اپنی تمام منازل عروج طے کر چکا۔ ایرانیوں اور سریانیوں کے علمی بازار بابل میں چلتے چلتے ماند پڑ گئے۔ علوم کی بھڑکتی ہوئی آگ فارس میں بجھ گئی تو قیاصرۂ روم کی باری آئی اور ملک طبیعیات ہندسہ، فلکیات، عنصریات، الہیات اور تمام علوم حکمت و فلسفہ کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد دولت اسلامیہ کا دور آیا۔ زمانہ نے اپنی فطری گردش کے مطابق پلٹا کھایا اور ساری دنیا خدا کے نور سے جگمگا اٹھی۔ اس دور کے ابتدا میں مسلمانوں کی توجہ تبلیغ کی طرف بہت زیادہ تھی۔ ان کے سینے امہات علوم اور اصول معارف کے خزینے بنے ہوئے تھے۔ اللہ کی کتاب ان کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے شروع شروع میں ان کے لئے کوئی صحیفہ مرتب ہوا نہ کوئی کتاب۔ چھوٹے اپنے بڑوں سے سیکھتے اور علوم حاصل کرتے۔ اور یہی وہ طریقہ تھا جسے روایت و حدیث کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ وہ اسی طرح روایت و سماعت سے تلقین و تعلیم کا فرض پورا کرتے اور رجال و رواۃ حدیث کے جو حالات معلوم ہوتے انھیں ازبر کرتے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ تدوین و تالیف کے کام میں تعنن اور تنوع سے بھی کام لیتے جاتے تھے۔ ان کی توجہات مختلف علوم میں تصنیف کی طرف بھی مبذول ہو گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کے علوم کے مجموعے بہت بڑھ گئے اور کتابوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ اگر کوئی گننا چاہے تو ان کا شمار نا ممکن ہے۔ اسی زمانہ سے روایت کا رواج کم ہوا اور سابقہ طریقہ سے حدیث بیان کرنے کے ابواب تقریباً بند ہو گئے۔ یہ صورت تیسری صدی کے اواخر میں رونما ہوئی اور حدیث، فقہ، تفسیر، اصول فقہ، رجال، عقائد، کلام، معانی اور بیان کو علوم اسلامیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور غالباً صرف و نحو کو بھی انہی کی ایک شاخ قرار دیا گیا۔

اسی طرح جب اللہ نے ممالک و بلاد کے خزانے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے تو ان کی توجہ علوم فلسفہ و حکمت کی طرف مبذول ہوئی۔ انہوں نے خود ان علموں کو حاصل کیا اور سُریانی، رومی، ایرانی اور ہندوستانی زبانوں سے ان علموں کی کتابوں کے ترجمے کئے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ فلسفہ کی کتابیں یونانی سے عربی میں دوسری زبانوں کے واسطے سے ترجمہ ہوئی ہیں اور جو براہ راست یونانی زبان سے لی گئی ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے۔ غرض مسلمانوں کی علمی مساعی سے یونان، بابل اور فارس وغیرہ کے علوم سے کوئی علم ایسا باقی نہ رہا جس کی کتاب عربی میں ترجمہ نہ

ہوگئی ہو۔ نہ اس نوع کی کوئی کتاب ایسی بچی جس کی ان کے یہاں نقل نہ کی گئی ہو۔ یہ سب کچھ بلاد مشرق میں خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں اور بلاد مغرب میں خلفائے امویہ کے عہد میں ظہور پذیر ہوا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو علوم اوائل سب کے سب ضائع ہو جاتے۔

امریکی مستشرق ایڈورڈ کتاب اکتفاء القنوع میں لکھتا ہے

"عربوں نے علوم ریاضی کی نہایت مکمل خدمت کی ہے۔ اگر عرب نہ ہوتے تو ریاضیات میں یونانیوں کی بہت سی تصانیف ضائع ہو جاتیں۔ ان کی بدولت یہ تصانیف عربی زبان میں محفوظ ہیں گو ان کی یونانی اصل مفقود ہو چکی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس ابو جعفر دوسرے عباسی خلیفہ نے علوم ریاضی وغیرہ کے احیا کا کام شروع کیا اور اپنی وسیع مملکت میں مترجم علماء کی خدمات حاصل کیں۔ جنھوں نے خلیفہ کے لئے ہندوستانی، سریانی، فارسی اور یونانی تصانیف کے ترجمے کئے۔ اس کے بعد دوسرے خلفاء خصوصاً ہارون رشید اور اس کے بیٹے مامون الرشید نے بھی اس کی پیروی کی۔"

اس طریق عمل نے علمائے مسلمین کو علوم اسلامیہ اور علوم اوائل کا مجمع البحرین بنا دیا۔ تصانیف کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ کتابوں اور تالیفوں کے ناموں میں اشتباہ ہونے لگا۔ مولفین اور مصنفین کے القاب و اسماء میں بھی خلط ملط ہونے کا اندیشہ بڑھ گیا اور تو اور ارباب تصانیف کی ایک جماعت تک اس اندیشہ کی زد میں آگئی۔ مثلاً رسائل اخوان الصفاء فلاسفہ کی ایک جماعت کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور حکیم مجریطی نے بھی ایک کتاب اخوان الصفاء کے نام سے تصنیف کی ہے۔ ان دونوں میں جو امتیاز ہے علماء سے مخفی نہیں۔

کتابوں کے ناموں میں تو اس حد تک مشابہت پیدا ہو گئی کہ کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی جس کی ہمنام دوسری موجود نہ ہو یا ایک کا نام بعض اجزا میں دوسرے کا شریک نہ ہو۔ کتاب الاشباہ والنظائر مولفہ ابن نجیم المصری المتوفی ۹۷۰ھ فقہ حنفی کی وسیع کتابوں میں ہے۔ اس کے مقابل اسی موضوع پر طوری الحنفی کی ایک کتاب بھی اسی نام سے موجود ہے۔ ساتھ ہی شیخ صدر الدین محمد بن عمر عرف ابن الوکیل شافعی المتوفی ۷۱۶ھ کی کتاب فقہ شافعی میں اسی نام سے موسوم ہے۔ ان کے علاوہ نحو میں علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی کتاب کا بھی یہی نام ہے۔ خود کتاب کشف الظنون جو کتب وفنون کے اسماء میں تمیز قائم کرنے کے لئے تالیف کی گئی ہے

اس کا نام بھی تشابہہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس نام کی ایک مشہور کتاب حاجی خلیفہ رومی کی ہے جسکا نام کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ہے۔ دوسری کشف الظنون عن الشروح والمتون ابراہیم مصری کی ہے۔ تیسری کشف الظنون فی تحقیق الفنون ایک شام کے عالم کی لکھی ہوئی ہے۔

اسی پر مولفین کے اسمار والقاب اور انساب کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ابن اثیر کے نام سے علمار کی ایک جماعت موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ابن اثیر	صاحب "النہایۃ" لغات حدیث میں	یہ تینوں جزیرہ کے علمار سے ہیں۔
ابن اثیر	صاحب "الکامل" تاریخ میں	
ابن اثیر	صاحب "المثل السائر"	

ابن اثیر عقائد کی ایک کتاب کے مصنف ہیں اور یہ یمن کے علمار سے تھے۔

یہی حال "ابن جریر" کا ہے۔ ایک ابوجعفر محمد بن جریر طبری ہیں جو ائمہ اہل سنت میں مذہب جریرین کے امام اور تاریخ وتفسیر وغیرہ کی مشہور کتابوں کے مصنف ہیں۔ دوسرے ابوجعفر محمد بن جریر طبری جو نہ صرف پہلے کے ہمنام بلکہ ہم نسب بھی ہیں فرقہ شیعہ کے ایک عالم اور ان کی مذہبی تصنیفات کے مصنف ہیں۔

اسی طرح لفظ "یہودی" کو لیجئے تو ایک یہودی طبیب باشندہ بغداد کتاب الطب النبوی کے مصنف ہیں اور دوسرے علمائے بغداد میں یہودی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بغداد کے محلہ "یہودیہ" میں رہتے تھے مذہباً یہودی نہ تھے بلکہ مسلمان عالم تھے۔

جب مشابہت اس نوبت کو پہنچ گئی تو مصنفین اور تصانیف کے حالات کا علم ضروری ٹھہرا۔ اگر یہ علم نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کتابوں کے حوالے میں بڑی غلطیاں واقع ہوں۔

تالیف وتصنیف کی کثرت ہونے پر علمار کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسی فہرست وضع کیجائے جس سے کتابوں کے منہ پر جو پردہ پڑا ہوا ہے۔ اٹھایا جاسکے۔ اور شیخ محمد ابن اسحاق ندیم بغدادی المتوفی ۳۸۵ھ نے اس موضوع پر اپنی مشہور کتاب تالیف کی اور اپنی کتاب کو علمار کے طبقات کے مطابق ترتیب دیا۔ پھر شیخ الطائفۂ امامیہ ابوجعفر طوسی المتوفی ۴۶۰ھ نے ایک کتاب لکھی وہ بھی ابن الندیم کی کتاب کی

طرح ہے۔ مگر یہ دونوں کتابیں پیاسے کے لئے پانی کا ایک قطرہ کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے بعد صدیوں تک علماء کو اس موضوع پر کوئی تیسری کتاب نہ ملی۔ اس کے بعد مولی طاش کبری زادہ رومی متوفی ۹۶۲ھ کا زمانہ آیا۔ اور اس نے اپنی مسموعات و مقروآت (سنی اور پڑھی ہوئی کتابوں) کو ایک کتاب میں جمع کر کے اس کا نام مفتاح السعادۃ رکھا۔ اس کے بعد حاجی خلیفہ رومی متوفی ۱۰۶۸ھ نے اپنی مشہور کتاب کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون تالیف کی جسے ابراہیم کی کتاب سے اضافے کرنے کے بعد طبع کیا گیا اور یہ کتاب مشرق و مغرب کے علماء میں مشہور ہو گئی۔

مصنفین کا حال یہ ہے کہ لوگوں نے قرون اولیٰ میں مولفین کے حالات ترتیب دے اور اس موضوع پر سب سے پہلے تصنیف کرنے والے کا نام جہاں تک معلوم ہو سکا۔ شیخ مورخ احمد بن ابی طاہر طیفور بغدادی متوفی ۲۸۰ھ ہے۔ اور اس تصنیف کا نام "اخبار المولفین" ہے یہ کتاب متوسط حجم کی ہے۔ بڑی چھوٹی مصنفین وغیرہ کے حال میں یہ پہلی تالیف ہے۔ اس میں بیشتر حالات انہیں علماء کے ہیں جو عراق و حجاز میں یا ان سے قریب کے مواضع میں پیدا ہوئے۔ احمد بن ابی طاہر کے بعد اس خصوص میں شیخ علامہ ابوالحسن علی بن انجب بغدادی متوفی ۶۷۴ھ کا نام آتا ہے جنکی کتاب (اخبار المصنفین) چھ جلدوں میں ہے۔ اس میں علوم و فنون میں تصنیف و تالیف کا کام کرنیوالے کثیر التعداد اشخاص کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ جلدیں نایاب ہو چکی ہیں اور اب کسی ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ اور اگر پائی بھی جائیں تو ظاہر ہے کہ زمانہ کی ترقی اور مولفین مابعد کے تسلسل سے ناقص رہیں گی۔ ان میں ان مولفین کے حالات نہ مل سکیں گے جو اس کتاب کی تالیف کے بعد ہوئے۔

تراجم رجال کی جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں وہ سب بہت مختصر اور کسی ایک فرقہ یا ایک شہر کے باشندوں کے حالات یا ایک عہد کے حالات تک محدود ہیں۔ ان میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی طالب تحقیق ہندوستان اور ماوراء النہر وغیرہ عجمی و مشرقی ممالک کے علماء کا حال پڑھ سکے۔ کیونکہ عربی زبان میں طبقات کی موجودہ کتابیں جو علمی زبانوں میں سب سے زیادہ عام ہیں، ان کے حالات سے خالی ہیں۔ ان کے سوانح صرف کتابوں میں یا شعرائے عجم کے تذکروں یا صوفیوں کے مکتوب وغیرہ میں ملتے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی کتابوں کے دور دراز

مقامات کے عربی بولنے یا عربی علوم سے شغف رکھنے والے۔ مثلاً یورپ و ایشیا کے بہت سے ممالک کے علمار خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

عہد حاضر کے علما نے بھی تراجم رجال پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مگر یا تو انھوں نے اپنی کتابوں کی بنار مشہور لوگوں کے ناموں پر رکھی ہے اور ان کی تصانیف وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا ہے۔ اس لئے بسا اوقات ان مشہور لوگوں کا حال تو ان کتابوں میں ملجاتا ہے۔ جو دوسرے اعتبارات سے اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ان اشخاص کا نہیں ملتا جنہوں نے اپنی پاکیزہ زندگی کی یادگار کسی عربی کتاب یا رسالے کی شکل میں چھوڑی۔ اس کی مثال خیر الدین زرکلی کی قاموس الاعلام یا کتاب المشاہیر وغیرہ ہیں یا صرف مطبوعہ تصنیفات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ جوامر کی مصنف ایڈ ورڈ کی کتاب اکتفار القنوع کا حال ہے۔ یا یوسف الیان سرکس دمشقی کی کتاب معجم المطبوعات اور جامع التصانیف الحدیثۃ وغیرہ کا۔

ان کتابوں کے مفید ہونے میں کلام نہیں لیکن ان سے مقصود پورا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ کتابیں اپنے موضوع پر حاوی نہیں ہیں۔ مثلاً ان میں ایسی تمام تصانیف اور مصنفین کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو بلادِ عجم و ہند میں ہوئے ہیں۔ ان میں ایسی کتابوں کے نام نہ ملیں گے جو طہران، بوشہر اور شیراز کے مطابع سے عربی زبان میں شائع ہوئی ہیں۔ رہیں یورپ کے علمار کی کتابیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں تو وہ زیادہ تر آداب لغت عربی کی تاریخ پر مبنی ہیں مصنفین کے حالات پر نہیں۔ بچھ وہ خود عربی زبان سے ماخوذ ہیں جن میں ایشیا کے مشرقی ملکوں اور ماوراءالنہر کے عالموں کا کوئی حال نہیں ملتا۔ جیسے پروفیسر بروکلمان جرمنی مستشرق کی تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ہے۔ یہ اگرچہ بہت سے مصنفین اور تصنیفات کی جامع ہے تاہم اس میں بہت سے مولفین اور تالیفات کا تذکرہ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ مزید براں اس کتاب میں متعدد مواقع پر کتب تراجم کے اصلی ماخذ تک رسائی نہ ہونے اور فارسی میں کم لیاقت ہونے کی وجہ سے پروفیسر موصوف کو دھوکا بھی ہوا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ علمار اور عربی کتب کے متعلق تحقیق کرنے والے طلبار کو ایک ایسی کتاب کی کتنی سخت ضرورت ہوگی۔ جو اپنے موضوع پر حاوی اور متعلقہ مقاصد کو پورا کر سکتی ہو مقام

شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان سے شغف رکھنے والے اشخاص پر احسان فرمایا اور علامہ محمود حسن خانصاحب ٹونکی مدظلہ نے اس معرکہ آرا کتاب کی تالیف فرمائی جو تمام مذکورہ بالا مقاصد کی جامع ہے۔ مولانا زاد بقاءہ نے کتاب کے لئے مواد حاصل کرنے کی غرض سے دور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ شام، عراق اور دیار مصر وغیرہ کی سیاحت کی۔ جہاں عربی، فارسی کی قلمی اور نادر کتابوں کے خزانے محفوظ تھے۔ اور اس خصوص میں ناقابل بیان زحمت اٹھا کر اپنی کتاب میں تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابوں کا خلاصہ درج فرمایا۔ اب خدا کے فضل وکرم سے یہ کتاب اتنی جامع اور حاوی کتاب ہوگئی کہ اس سے زیادہ کسی کے تصور میں نہیں آسکتی۔ یہ بات دوسری ہے کہ کسی کو استقصائے کامل کا دعوے مناسب نہیں اور خدا نے ہر عالم کے مقابلہ میں ایک اس سے بڑا عالم پیدا کیا ہے۔

معجم المصنفین میں ایسے دو ہزار اشخاص کا تذکرہ ہے جنکا نام "احمد" ہے۔ جب صرف احمد نام کے دو ہزار لوگوں کا ذکر ایک کتاب میں ہو تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی ضخامت اور وسعت کا اندازہ کیا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ یہ کتاب تقریباً چالیس ہزار مصنفین کے تذکرے، ان کے حالات کی تحقیق، سنین وفات اور ان کی اولاد وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ جس میں ان کے انساب، القاب اور تصنیفات وغیرہ کی نسبت جتنے شبہات ہو سکتے ہیں، رفع کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ہر ایسے شخص کا ذکر مل سکتا ہے۔ جس نے آغاز عہد تالیف سے کر ۱۳۵۰ھ تک عربی میں کوئی تصنیف چھوڑی ہے۔ مگر استقصائے کامل انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ خدا قابل احترام مولف کو عمر مدید ارزانی فرمائے آج آپ رجال وطبقات کے علم میں علماء کے رئیس اعظم ہیں۔ آپ کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور آپ نے اپنی تمام عمر حالات کے جمع کرنے اور ان کی تنقیح وتنقید کرنے میں صرف فرمادی اور نقاد محققین کے مسلک پر کتاب مرتب فرمائی۔ آپ جس کتاب سے اخذ کرتے ہیں، پہلے اس سے مصنف کی حالات درج کرتے ہیں۔ پھر ان کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو اس کے مورخ میں مختلف نظر آتی ہیں۔ پھر اسی باب میں اپنی رائے لکھتے ہیں۔ آخر میں اس کی تصانیف گنواتے اور ان فہرستوں اور کتابوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے یہ معلومات اخذ کی ہیں۔ اس بنا پر یہ کتاب ان مصنفین کے تراجم میں جو عربی زبان میں کوئی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ سب سے زیادہ وسیع کتاب اور نہایت عظیم الشان دائرۃ المعارف ہے۔

اس کتاب کے مسودات حروف معجمہ کی ترتیب سے آخر اسمار تک مکمل ہو چکے ہیں۔ یعنی "یونس"

کے نام تک۔ یہ کتاب جب مکمل طور پر طبع ہوگی تو بیس ہزار صفحات پر ختم ہوگی۔ ابتک چار جلدیں چھپی ہیں جن کے صفحات کا مجموعہ (۱۴۰۰) ہے۔ پہلی جلد مقدمہ اور علوم عربیہ کی تقسیم پر مشتمل ہے۔ دوسری میں ائمہ و فقہائے اربعہ کے حالات ہیں۔ تیسری اور چوتھی میں صرف ان مصنفین کا تذکرہ ہے جنمیں سے ہر ایک کا نام ابراہیم ہے۔ بیضات تقریباً چار ہزار صفحے کے تیار ہیں اور باقی تصحیح و تنقیح کی منزل سے گزر رہے ہیں۔

جب مذکورہ بالا چاروں جلدیں شائع ہوئیں تو علماء اور مستشرقین نے ان کو نظر قبول و استحسان سے دیکھا۔ ان کی بہت تعریف کی اور ان کے متعلق ملاحظات و شذرات لکھے اور سب نے بالاتفاق یہ رائے ظاہر کی کہ یہ کتاب اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع اور بہترین کتاب ہے۔ تعریف کرنے والے حضرات میں علامہ سید سلیمان ندوی، مشہور جرمنی مستشرق سالم کرنکوی اور شیخ محمد صالح مکی وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سے یورپین اصحاب نے تو اس جیسی وسیع کتاب کے ایک شخص کے ہاتھوں مرتب ہونے کو ناممکن قرار دیا ہے اور اس واقعہ کو عجائب زمانہ میں شمار کیا ہے۔

مصنف علام کو اس زبردست مجموعہ کی تالیف کا خیال کس طرح آیا اور ایک شخص تذکرہ و تراجم کے موضوع پر ایسی دائرۃ المعارف مرتب کرنے میں کیونکر کامیاب ہوا۔ اس کی تشریح خود مولف کے الفاظ میں سن لیجئے۔ مولف دام ظلہٗ مقدمۂ کتاب میں لکھتے ہیں۔

"میں اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان علما کے حالات معلوم کرتا رہتا تھا جنہوں نے مختلف علوم میں تصنیف و تالیف کی۔ اور ان مشہور ائمہ کے تذکرے لکھتا رہتا تھا جن کے آثار علوم و فنون میں ملتے ہیں۔ اسی طرح مختلف بیاضوں میں لکھتے لکھتے مصنفین و مولفین کے حالات پر ایک مختصر سا تذکرہ جمع ہو گیا۔ پھر گردش زمانہ سے مجھے کچھ مدت تک علم و علماء کے مذاکرے سے دستکش ہونا پڑا۔ اور جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ بھی نظری ہو گیا اس کے بعد اللہ نے مجھ پر کرم فرمایا اور اپنی ضرورت و شوق کی بنا پر ابنائے دنیا سے علیحدگی اختیار کر سکا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور کتاب سے شغل رکھنے کو کسبِ معاش کے مشغلے پر ترجیح دی۔ یکایک مجھے یہ بات سوجھی کہ جو مسودہ میں نے شروع میں جمع کرتے کرتے چھوڑ دیا ہے۔ اسے مکمل کر لوں۔ کیونکہ اہل علم کو پڑھنے سے زیادہ اس قسم کی کتاب کی ضرورت ہے کہ اس کتاب کا نفع زیادہ عام ہے۔ اسلئے میں نے اس کام کے پورا

کرنے کا عزم کیا اور اللہ پر بھروسہ کیا۔ لیکن حالات مصنفین کا موضوع ان کی کثرت کی وجہ سے بہت وسیع تھا اور کسی ایک شہر یا گروہ یا صدی کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ پھر ان کے حالات کے ماخذ یعنی ان اصحاب کی تاریخ کے مجموعے جنہیں علماء کے مختلف گروہوں نے تصنیف کیا ہے موضوع کے غیر عام ہونے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے کفایت نہ کرتے تھے۔ مثلاً ان کتابوں میں سے بعض صرف نویں یا دسویں صدی وغیرہ کے مشاہیر: اعیان کے ذکر تک محدود ہیں یا بعض مخصوص طبقات مثلاً طبقات حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، یا طبقات محدثین قراء اطباء، نحویین وغیرہ کے حالات پر منحصر ہیں۔ بعض امرائے ملک کے لئے مخصوص ہیں بعض میں صرف ایک شہر کے لوگوں کا ذکر ہے، مثلاً شام، مصر یا حلب یا اندلس وغیرہ، اس لئے اس کتاب کے بہت سے ابواب واصول قرار دے کر اسے متفرق ضخیم وقصیر تصنیفات وتالیفات سے مرتب کرنا ضروری تھا۔ اللہ نے اپنے فضل سے مجھے اپنے شہر میں کتب خانہ پر تصرف عطا فرمایا اور میں نے اہتمام والتزام کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ پھر اسی مقصد سے بلاد بعیدہ کا سفر کیا اور انکے علمی خزانوں سے مستفید ہو کر اس مسودہ کی تکمیل میں منہمک ہوا"۔

ان مسودات کی تنقیح وترتیب میں ایک معین اور اس مسودہ کی سرگذشت سے مطلع ہونے کے اعتبار سے میں آپ کی معلومات میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ جس وقت حضرت مولف اپنے مسودات کو مکمل فرما چکے تھے اس وقت آپکو دولت آصفیہ نے جو ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کی واحد یادگار اور ہندوستان کی اسلامی حضارت کا مرکز ہے آپ کو اپنے پایۂ تخت حیدر آباد میں بلایا اور نواب عماد الملک ناظم تعلیمات نے جو خود ایک منتخب وممتاز عالم تھے اور عربی زبان کی خدمت پر بہت زیادہ توجہ فرماتے تھے۔ آپ کو باصرار تمام آمادہ کیا کہ آپ اپنے اس زبردست کام کو دولت آصفیہ کی اعانت سے تکمیل کو پہنچائیں۔ چنانچہ اب یہ کتاب اسی بابرکت حکومت کی مالی مدد اور مادی ومعنوی مساعدت سے طبع ہو رہی ہے۔ ابتک اس کام کیلئے ضروری اخراجات کئے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی باقی اجزاء اسی سرکار ابد قرار کے مصارف سے طبع ہونگے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ عربی لغت وآداب کے تمام محبوں کو اس کتاب سے مستفید فرمائے۔

از مولانا عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی
مرسلہ جناب محمد زکریا صاحب مائل۔

یومِ اقبال

گذشتہ زمانوں میں بالعموم اہل کمال کو ان کے کمال کی داد ان کی زندگیوں میں نہیں ملتی تھی۔ بلکہ مرنے کے بعد جبکہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے ان کا نام روشن ہوتا تھا۔ عرفی نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے۔

چہ دل کشا بدازیم کہ بعد ازین گویند　　　کہ بودہ است فلاں دام اسمہ استاد

ازینکہ بعد بریدن تمام شانہ شود　　　گرہ کشادہ نگردد زطرۂ شمشاد

لیکن آج ذرائع اسحاق و اتصال اسقدر بڑھ گئے ہیں کہ ساری دنیا بمنزلہ ایک گھر کے ہوگئی ہے۔ اور جو کمال کسی میں ہوتا ہے فوراً ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کے اشعار کی محبوبیت اور مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر اسلامی ممالک تک بھی پہنچ چکی ہے۔ اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کے دل میں ان کی عزت اور عظمت جاگزیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دی انٹر کالجیٹ مسلم برد رہوڈ" نے اس سال کے آغاز میں ۹ جنوری کو "اقبال ڈے" منانے کا فیصلہ کیا تاکہ دنیائے اسلام کے اس عظیم الشان شاعر کے حضور میں وہ اپنی طرف سے عقیدت کا نذرانہ اور تحسین کا خراج پیش کرے۔ ان طلبار نے مجھے بھی اس جلسہ میں مدعو کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ۔ اس لئے میں ۹ جنوری کو دہلی سے لاہور پہنچا۔ دن صرف ایک تھا اور پڑھنے والے۔ بولنے والے نظمیں اور مضامین سنانے والے بہت۔ یعنی تقریباً تین سو کی تعداد میں۔ اس وجہ سے پروگرام بہت طویل ہوگیا تھا۔ اور تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح ۹ ½ بجے سے رات کے ۹ ½ بجے تک رکھی گئی تھیں۔ پہلی نشست میں مسٹر گوکل چند نارنگ صدر جلسہ تھے۔ ہمارا دہلوی قافلہ ذرا دیر سے پہنچا تھا اس لئے ہم اس نشست کے آخر میں شریک ہو سکے۔ اور بعض مقالات اور نظمیں سننے سے محروم رہے۔ دوسری نشست ڈیڑھ بجے زیر صدارت شیخ عبد القادر صاحب ممبر انڈیا کونسل منعقد ہوئی۔ اس میں متعدد مقالے نہایت عمدہ تھے۔ خاصکر خواجہ غلام السیدین صاحب ایم۔ اے پرنسپل ٹریننگ کالج

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا انگریزی مقالہ بہت گراں قدر تھا۔ مولانا عابد علی صاحب عابد ایم۔ اے کی تحریر بھی بہت دلچسپ تھی۔ اور حفیظ جالندھری کی شاعری اور موسیقی دونوں داد کے قابل تھیں۔ نیز صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم۔ اے نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا تھا۔

تیسری نشست جو ساڑھے چھ بجے شام کو شروع ہوئی اس میں علامہ عبد اللہ یوسف علی صدر تھے اسی نشست میں بیگم شاہنواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ ان کے شوہر نے دس مربعے زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام اسی اقبال ڈے کے سلسلہ میں منتقل کر دی ہے۔ اس اعلان نے اس یادگار کو ایک مادی قوت بخشی اور حاضرین نے اس پر نہایت خوشی اور تشکر یہ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد علامہ عبد اللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو بٹھا دیا اور خود چلے گئے۔ پروفیسر محمد عمر فاروق ایم۔ اے، اور پروفیسر منیر الدین صاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ نے انگریزی زبان میں پر مغز مقالے پڑھے۔ کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ جن میں سے مولینا اسد ملتانی کی نظم خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے سُنی گئی۔ آخر میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے اپنی تقریر اقبال اور قرآن پر شروع کی۔ جو اس قدر پسند کی گئی کہ خاتمہ کے وقت بار بار لوگ درخواست کرتے تھے کہ کچھ اور اضافہ کیجئے۔ مگر چونکہ وقت زیادہ گزر چکا تھا اس لئے میں نے جلسہ کو ختم کر دیا اور حسب ذیل تقریر کی۔

> ڈاکٹر اقبال کے کلام کا میں اس وقت سے سلسلہ وار مطالعہ کر رہا ہوں جبکہ آج سے ایک تہائی صدی بیشتر شیخ عبد القادر کا رسالہ مخزن لاہور سے نکلتا تھا جس میں ان کی نظمیں چھپا کرتی تھیں۔ زمانۂ مابعد میں ڈاکٹر صاحب کی مثنویوں اسرار خودی و رموز بیخودی اور پیام مشرق نیز جاوید نامہ وغیرہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے شعر اور ادب کی جسقدر خدمت کی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔
>
> ادھر صدیوں سے مسلمانانِ ہند کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ قرآن سے ان کو لگاؤ نہیں رہا

ہے اور ان کا دینی رشتہ اس کی تعلیمات سے ٹوٹا ہوا ہے ۔ وہ صرف ان خیالات کے پیرو ہیں جو سر تا سر انسانی ہیں جنکو ملاؤں نے فرقہ بندی اور باہمی افتراق کا ذریعہ بنا کر ملت کے اجتماعی شیرازہ کو ایسا درہم برہم کر رکھا ہے کہ جدید تعلیمیافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں ان کی حالت دیکھ کر خود اسلام اور قرآن کی طرف سے بے اعتنائی بلکہ بدگمانی پیدا ہوگئی جو اس صورت میں ہر عقلمند اور صاحب فہم کے دل میں پیدا ہی ہونی چاہئے تھی۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر اقبال نے جو خود تعلیم جدید کے ایک درخشندہ آفتاب ہیں اپنی خداداد قابلیت اور اندرونی روشنی سے شاعری کے ساز پر وہ دیپک کا راگ چھیڑا ۔ جس سے مسلم نوجوانوں کے افسردہ دلوں میں قرآن کی محبت کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے اس کی عظمت اور اسلام کی حقیقت کو پہچانا ۔

بھولے ہوئے راستہ کی طرف قوموں کو مائل کرنا اور ان کو دلوں کو ہدایت کی جانب موڑنا وہ کام ہے جس کے لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل گزشتہ زمانوں میں انبیاء کرام آیا کرتے تھے ۔ وہی کام قدرت نے ڈاکٹر صاحب سے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری سے لیا ۔ مولانا گرامی مرحوم کا یہ قول کسقدر صحیح ہے ۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال　　　پیغمبرئے کرد و پیمبر نتواں گفت

دوسری طرف ہماری شاعری بجائے خود اسقدر مہمل ہوگئی ہے کہ اس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے مدت ہائے دراز سے ٹوٹے ہوئے ہیں ۔ شعراء خود نہیں سمجھتے کہ وہ کس ہذیان میں مبتلا ہیں اور کس لئے مبتلا ہیں ۔ بس ایک پرانی لکیر ہے جسکو پیٹتے چلے جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ اس صدی کے نامور شاعر اور قومیت کے مبصر مولانا حالی مرحوم نے کہا ۔

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر　　　عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر　　　زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا

ڈاکٹر اقبال نے اسی عام بدذوقی کی دنیا میں اپنی شاعری کا رشتہ زندگی اور بالخصوص اسلامی اور قرآنی زندگی کے ساتھ قائم کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے توفیق الہی اپنے کسی خاص ہی بندے کو چنتی ہے۔ چنانچہ آج بھی جبکہ ان کے کلام کا اتنا نمونہ ہمارے شعراء کے سامنے موجود ہے کوئی ان کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چلنے کے قابل نہ ہو سکا۔ بعضوں نے صرف لفظی نقالی کی کوشش کی مگر زندگی کی ان برقی لہروں کو نہیں دیکھ سکے جو ڈاکٹر صاحب کے شعروں کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہیں۔

اسلامی زبانوں میں سے کم سے کم تین زبانوں۔ عربی۔ فارسی اور اردو کے اکثر بڑے بڑے شعراء کے کلام کا میں نے غور اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار ایسے دلکش، امیدوں سے ایسے بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اتنے لبریز ہیں کہ میں انکو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں۔ اس انتہائی زوال اور ذہنی پستی کے زمانہ میں مسلمانان ہند کے لئے ان کا کلام قدرت کی طرف سے ایک ہبت کبریٰ ہے۔ جس نے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اور آئندہ کے لئے وہ ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ ملی سرمایہ ہے۔

ہرچند کہ یہ پہلا اقبال ڈے تھا اور طلبا کی طرف سے تھا جیسے ابتدائی کاموں میں لازمی طور پر خامیاں ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی نہایت کامیاب رہا۔ مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے آنے کی بھی خبریں تھیں اور ان میں سے سوائے مولانا عبدالحق صاحب کے سب کے نام بھی پروگرام میں درج تھے لیکن یہ حضرات اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے ورنہ اقبال ڈے اور بھی زیادہ کامیاب رہتا۔

دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ ۹ بجے سے سلسلۂ گفتگو ساڑھے بارہ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر

نکلنا مشکل ہے۔ کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں۔ عملاً جب موقع اللہ دے۔ بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھکر مجبوراً موضوع سخن بدلنا پڑا۔

اسلم جیراجپوری

نوائے مظلوم

(مولوی محمود علی خاں بی اے)

رہے گا لعنتِ سرمایہ داری میں جہاں کبتک
میسّر ہوگی مظلوموں کو ظالم سے اماں کبتک

غضب ہے جو بنائے اطلس و دیبائے زنگا رنگ
رہے محروم تن پوشی لگائے دھجیاں کبتک

ستم ہے جو کمائے سیم و زر گاڑھے پسینے سے
وہ ہو پامالِ اصحابِ نعم اے آسماں کبتک

فراہم ہو یہ اسبابِ معیشت سب کسانوں سے
مگر بھوکے رہیں، کھائیں ہماری جھڑکیاں کبتک

زمیں اُن کی حجر اُن کے ثمر اُن کے شجر اُن کے
وہ ہوں محروم آسائش اُٹھائیں سختیاں کبتک

سمٹ کر کھیت سے سیلابِ دولت شہر میں آئے
تعیش میں کریں شہری وہ دولت رائگاں کبتک

کرو آگاہ اس مخلوق کو اپنی حقیقت سے
کہو زندہ بنو آخر وجود بے نشاں کبتک

کریں برباد اپنے عیش میں دولت کسانوں کی
یہ ظلم ناروا یہ قہر زیر آسماں کبتک

وہ لفظوں سے کماتے اور کھوتے بھی ہیں لفظوں سے
یہ کفر اقتصادی اور یہ سود و زیاں کبتک

ہے خوں آشامیٔ مزدور ہی سے فربہی ان کی
الٰہی رنگ لائے گا یہ خونِ بے زباں کبتک

رہے گی کب تلک سرمایہ کی یہ گرم بازاری
گریں گی خرمنِ مزدور پر یہ بجلیاں کبتک

اُٹھو دنیا میں کچھ کر کے دکھاؤ نوجوانو! تم
یہ لاحاصل عمل بے سود یہ آہ و فغاں کبتک

بھروسہ اپنی قوت پر کرو سعی و عمل سیکھو
یہ ذکرِ عہدِ زرّیں اور یادِ رفتگاں کبتک

وطن کو اقتصادی موت سے مل کر بچاؤ تم
غلامی کی مصیبت میں رہے ہندوستان کبتک

تنقید و تبصرہ

مبادی سیاسیات، جلد دوم (حکومت) مؤلفہ جناب ہارون صاحب شیروانی۔ ایم۔ اے (آکسن) ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس، بیرسٹرایٹ لا، صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن۔ تقطیع ۲۲×۱۸ ۱/۸ حجم ۱۵۴ صفحے، مع فہرست اصطلات قیمت ہے ر

مبادی سیاسیات، کی پہلی جلد تھوڑے دن ہوئے شائع ہو چکی ہے۔ اور اب اس کے فاضل مصنف نے یہ دوسری جلد شائع کر کے مضمون مکمل کر دیا ہے، پہلی جلد میں مملکت یا ریاست اور اس کے اداروں اور شعبوں پر نظری بحث کی گئی تھی، اس دوسری جلد میں حکومت کے مختلف کام اور کام کرنے کے طریقے، سیاسی زندگی کے مظہر اور اس کا کاروبار سب ترتیب اور مناسب تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب لکھنے کا مقصد طالب علموں کی ایک بڑی ضرورت پوری کرنا ہے، کیونکہ اب تک اردو میں سیاسیات پر کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے طالب علم پڑھ سکیں یا پڑھیں تو سمجھ سکیں، مبادی سیاسیات کے فاضل مصنف چونکہ خود اس فن کے استاد ہیں اس لئے وہ اپنے علم میں ملکہ رکھتے ہیں اور یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ طالب علم کے لئے کتاب کو کس طرح مفید اور آسان بنایا جا سکتا ہے، سیاسیات کا ہر پہلو بہت سلجھا کر پیش کیا گیا ہے۔ بعض اصطلاحیں ثقیل معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ طبیعت ان کی عادی نہیں ہے لیکن خیالات کی طرح مصنف کی زبان بھی بہت سلجھی ہوئی ہے۔ ہم یہ بات خاص طور پر تعریف کے قابل سمجھتے ہیں کہ فاضل مصنف نے علم کو خالص بنانے کی فکر میں اپنے زمانے کے حالات کو نظر انداز نہیں کیا ہے، اور اگرچہ انہوں نے وہ غیر جانب داری برتی ہے جو ہر عالم کے لئے ضروری ہے، حالات حاضر پر ان کی بحث بصیرت افروز ہے۔ روس، اٹلی اور جرمنی کی سیاسی و معاشی تحریکوں، ہندوستان کے لئے دستور (۱۹۳۵ء) اور سیاسی پارٹیوں کی تحت میں کانگرس اور مسلم لیگ کا ذکر کیا گیا ہے، اور

انھیں ابواب پر نظر ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ فاضل مصنف کا نقطۂ نظر بہت معقول ہے اور انہیں دنیا کے کاروبار سے وہ دلچسپی اور لگاؤ ہے جو ایک اچھے استاد کو ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی کتاب نہایت مستند بھی ہے، اور حاشیوں میں ایسی کتابوں کا حوالہ دیدیا گیا ہے جس سے فاضل مصنف نے مدد لی ہے اور جس سے ناظرین مزید تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔ ان تمام صفتوں کا خیال رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "مبادی سیاسیات" علمی اور درسی کتاب کا ایسا نمونہ ہے جو اب تک کم دیکھنے میں آیا ہے۔

چند ہمعصر۔ از مولوی عبدالحق صاحب۔ مرتبہ شیخ چاند مرحوم تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$ حجم ۱۵۱ صفحہ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ قیمت درج نہیں، شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ دکن۔

یہ جناب مولوی عبدالحق کے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف کے شاگرد رشید شیخ چاند مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے مرتب کیا تھا۔ ان مضامین میں ہندوستان کے چند مشہور اور دو ایک غیر مشہور افراد کی سیرت پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ سب لوگ کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز رکھتے تھے۔ ان میں تین باکمال شعرا ہیں یعنی مولانا حالی، حضرت گرامی اور امیر مینائی پانچ جید علما ہیں یعنی مولوی چراغ علی، مولوی سید علی بلگرامی، مولوی عزیز مرزا، مولوی وحیدالدین سلیم، اور پروفیسر مرزا حیرت ایران کے ایک حاذق حکیم یعنی امتیازالدین مرحوم۔ چار رہبران قوم ہیں یعنی سید محمود مرحوم، نواب محسن الملک خواجہ غلام الثقلین اور مولانا محمد علی اور ایک غریب سپاہی ہے جس نے علم و فضل جاہ و منصب سے محروم ہونے کے باوجود اس زمرے میں جگہہ پائی ہے یعنی گدڑی کا لعل "نور خاں"۔ غرض یہ ایک مرقع ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا جس میں ہر رنگ کی بہترین تصویریں نظر آتی ہیں۔

سیرت نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ محقق بھی ہو اور مصور بھی، نقاد بھی ہو۔ اور مبصر بھی اور اسی کے ساتھ ہمدرد بھی کیونکہ ہمدردی کے بغیر انسانی زندگی کا صحیح مطالعہ ناممکن ہے۔ فاضل

مصنف کی ذات ان صفات کی جامع ہے اس لئے انہوں نے حسب امید سیرت نگاری کا پورا حق ادا کردیا ہے۔ اکثر اشخاص کے مفصّل ذاتی اور خاندانی حالات فراہم کئے گئے ہیں اور اُن کی تنقیح اور تصدیق میں ہر طرح کی احتیاط برتی گئی ہے۔ پھر اُن خاکوں میں رنگ بھرنے میں مصنف کے قلم نے موقلم کا کام کیا ہے اور ان کے جاں بخش انداز تحریر نے ان خاموش تصویروں میں جان ڈالدی ہے۔ خصوصاً مولانا حالی اور نور خاں کے حالات کو پڑھ کر پڑھنے والے کو دھوکا ہوجاتا ہے کہ اس نے ان بزرگوں کو کبھی نہ کبھی دیکھا ہے۔ ہندوستان کے سیرت نگاروں کی سنت کے خلاف کسی شخص کے محاسن کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ یہاں تک کہ جن حضرات سے مصنف کو انتہائی عقیدت ہے ان کی تعریف میں بھی ضبط و اعتدال کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جس میں جو کمزوریاں تھیں وہ بھی بے لاگ بیان کردی ہیں لیکن عموماً خشونت اور بے دردی سے نہیں بلکہ نرمی اور ہمدردی سے۔

مضامین کی ادبی حیثیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب اپنے اسلوب کے بادشاہ ہیں۔ معانی کے وزن کو عبارت کی سلاست اور متانت کو شگفتگی کے ساتھ سمونا ان کا حصّہ ہے اور یہ کتاب اِس کی ایک روشن مثال ہے۔

اسلامی ہند پر ایک نظر۔ از محمد شعیب خاں صاحب فیروز۔ تقطیع ۲۲×۲۸/۸۔ حجم ۴۰ صفحہ کتابت طباعت اچھی، کاغذ اوسط درجہ کا۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت۔ برلہ۔ ضلع علی گڈھ۔

اس رسالہ کا موضوع یہ ہے کہ "ہندوستان کے مسلمان اس وقت کس مقام پر ہیں اور کیا کر رہے ہیں یعنی ان کی سیاسی حالت اور ان کا سیاسی عمل کیا ہے۔ اس کی اصل کی وجہ یہ ہے کہ غدر کے بعد ان کی دلچسپی کا مرکز ہندوستان سے اسلامی ممالک کی طرف منتقل ہوگیا اور ان کی سرگرمیاں اسی خارجی سیاست تک محدود ہیں۔ حالانکہ حقیقی سیاسی زندگی وطن پر مبنی اور وطن کی پابند ہونی چاہئے۔ اگر مسلمان اب بھی اپنا سیاسی نظریہ بدل کر ہندوستان کی کو اپنا نصب العین بنالیں تو ان کی بے حسی، بے عملی اور نااتفاقی دور ہوجائے۔ اور جو

احساس کمتری ان میں خواہ نخواہ پیدا ہوگیا ہے وہ جاتا رہے"۔ رسالہ کا انداز تحریر خطیبانہ ہے۔ لیکن اس کے مضامین واقعات کے مشاہدے اور غور و فکر کا پتہ دیتے ہیں۔ جو لوگ سیاسی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور محرک خیال ثابت ہوگا۔

دنیائے تبسم۔ از حضرت شوکت تھانوی حجم ۲۱۶ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی معمولی کاغذ عمدہ قیمت عہ۔ شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی۔

حضرت شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین دنیائے اردو میں بہت مقبول ہیں۔ یہ نیا مجموعہ سلسلۂ "تبسم" کی ایک نئی کڑی ہے۔ جو لوگ طوفان تبسم وغیرہ پڑھ چکے ہیں۔ انھیں "دنیائے تبسم" کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ مصنف کا آرٹ برابر ترقی کر رہا ہے۔ ظرافت کے پردے میں ہندوستانی معاشرت پر تنقید کرنے کا جو طریقہ شوکت صاحب نے نکالا ہے اس میں انہیں اپنے ہم عصروں سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ طنز کی تلخی کو وہ خوش طبعی کی شیرینی سے اس قدر کم کر دیتے ہیں کہ دوا آسانی کے ساتھ حلق سے اتر جاتی ہے۔ اور پورا اثر کرتی ہے۔ مبالغے کے برتنے کا انہیں خاص سلیقہ ہے ان کا مبالغہ حقیقت کے خط و خال کو مٹنے نہیں دیتا۔ صرف اس کے مضحک پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے۔ "مقروض" "لکھنو کا کانگریس سیشن" "مرحومہ" "اختلاج" اس مجموعے کے سب سے کامیاب مضامین ہیں" "مینار گنبد" اور "شہوت" کتاب کے عام معیار سے کسی قدر پست ہیں۔ پہلا مضمون ایک پھبتی کہنے کے لئے لکھا گیا ہے دوسرے میں نرا مبالغہ ہے اور کوئی "بات" پیدا نہیں ہوتی"۔ فلم فوجدار" کا آغاز طنزیہ انداز کا عمدہ نمونہ ہے لیکن یہ انداز آخر تک نہیں نبھ سکا۔ اور آگے چل کر بحث بالکل سنجیدہ ہوگئی ہے۔ لیکن عبارت کی روانی، طرز بیان کی دلآویزی، بے تکلف شگفتگی اور بے تصنع شوخی سے کوئی مضمون خالی نہیں اور مجموعی طور پر یہ کتاب شوکت صاحب کی بہترین تصانیف میں شمار کی جاسکتی ہے۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے مقدمے نے جس میں متانت اور ظرافت آپس میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ کتاب کے لطف میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

ہسپانیہ اور چین ہسپانیہ کی خانہ جنگی جاری ہے۔ لیکن دونوں فریق، ان کی حامی اور غیر جانب داریا عدم مداخلت کی خواہشمند ریاستیں اس طویل جنگ سے عاجز آگئی ہیں۔ حال میں تیروئیل کے مقام پر باغی فوجیں پس پا کر دی گئی ہیں۔ باغی اگر یہ مورچہ سر کر لیتے تو حکومت کا فوجی محاذ ٹوٹ جاتا اور دار السلطنت کو ولنیسیا سے کہیں اور منتقل کرنا پڑتا۔ لیکن اس جنگ میں کوئی مقابلہ فیصلہ کن نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ معاملہ چکانا لڑنے والوں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے جو انہیں لڑا رہے ہیں

چین کی لڑائی بھی طول کھینچ رہی ہے۔ تسی نال اور تسنگ ٹاؤ فتح کرنے کے بعد سے سمجھنا چاہئے کہ دریائے یانگ تسے کے مشرقی حصے، اور اس دریا سے لیکر شمالی دیوار تک سارے ملک پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے، اور سوا ایک ذرا سے ٹکڑے کے جو کانٹون اور ہانکاؤ کو ملاتا ہے چین کی تمام ریلوے لائنیں جاپان کے تصرف میں آگئی ہیں۔ جاپانی اس وسیع علاقے میں "جاپان دوست" حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اور ان کی طرف سے اعلان کیا جا چکا ہے کہ وہ اس انتظام میں کسی غیر قوم کی دخل اندازی گوارا نہ کریں گے۔

جاپانیوں کا اب بھی یہ دعوٰے ہے کہ وہ چین پر لشکر کشی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی ساری کارروائی مدافعانہ ہے۔ پھر کیا تعجب ہے جو انہوں نے ۱۲ جنوری کے ایک اعلان میں یہ کہا کہ جنگ کا جاری رہنا یا ختم ہو جانا مارشل چیانگ کائی شک کے رویئے پر منحصر ہے اور وہ خود جنگ کے لئے تیار ہیں، اور صلح و آشتی سے سمجھوتا کرنے پر بھی آمادہ۔ ان کے مطالبات اب بھی وہی ہیں جو جنگ سے پہلے تھے۔ یعنی یہ کہ چین پر ان کا معاشی اور سیاسی تسلط ہو جائے، چاہے نام کو حکومت چینی ہو۔ اور اگر چینیوں کی غیرت ایسی شرط منظور کرنا گوارا کرتی تو وہ لڑائی کی مصیبت کیوں جھیلتے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ مارشل چیانگ کائی شک

اور ان کے ساتھ چینی قوم اور بھی سرکش ہو جائے گی۔ چینی حکومت نے روس اور امریکہ سے اسلحہ اور بہت سا ضروری سامان جنگ خرید اہے ۔ ڈاکٹر سن یاٹ سن کے لڑکے مسٹر فو غیر معمولی سفیر بن کر ماسکو گئے ہیں اور جاپان کی مخالفت نے چیانگ کائی شک اور مغربی چین کے کومیونسٹ سپہ سالاروں میں جو اتحاد کرا دیا تھا وہ اب اپنا عمل لا رہا ہے ۔ یہ سنا گیا ہے کہ بیرونی منگولیا میں روسی کوشش کر رہے ہیں کہ جاپانی اثرات پر غلبہ حاصل کرلیں ۔ ہانکاؤ میں اس وقت سو روسی پائلٹ (ہوائی جہاز چلانے والے) مع اپنے جہازوں کے موجود ہیں، اور چینی بیانات کے مطابق اس زمانے میں ان کے ہوائی جہازوں نے جاپان کو خاص نقصان پہنچایا۔

جاپانی اس جنگ کی ہر مہم میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن اگر چینی لڑائی پر تُلے رہیں تو یہی کامیابی جاپانیوں کی شکست کا سامان بن سکتی ہے اگر چینی قزاقانہ جنگ کا طریقہ اختیار کریں اور انہیں باہر سے تھوڑی بہت مدد ملتی رہے تو جاپانیوں کی جان پر بن آئے گی اور ان کی حکومت غالباً دیوالیہ ہو جائیگی انہوں نے لڑائی یہ سمجھ کر شروع کی تھی کہ چینی بالکل مقابلہ نہ کرسکیں گے ۔ قبل اس کے کہ کوئی تیسرا فریق درمیان میں پڑسکے۔ لیکن چینیوں کی ہمت ہر شکست کے بعد بڑھتی نظر آتی ہے ۔ مغربی قومیں تو بے شک وہی غیر جانب داری برت رہی ہیں جس پر جاپانیوں نے بھروسا کیا تھا۔ یعنی جاپان ان سے جو کچھ چاہے خرید سکتا ہے ۔ اور چین کے لئے خرید و فروخت پر کوئی قید نہیں تو آمد و رفت کے دروازے قریب قریب بند ہیں ۔ پھر بھی بہت ممکن ہے کہ جاپان کی یہ شکایت کہ امریکہ سے سامان چین کے اندر پہنچایا گیا ہے ۔ صحیح ہو ۔ اور مغربی قومیں یہ دیکھ کر کہ جاپان نہ جلدی سے کامیاب ہوتا ہے نہ ان کی غیر جانب داری کا احسان مانتا ہے ۔ چین کو چوری چھپے مدد پہنچا کر جاپان کو اتنا حیران کریں کہ وہ سیاست کے آداب برتنے پر مجبور ہو جائے اور سارا شکار خود ہی کھا جانے کا بیہودہ حوصلہ نہ کرے ۔

جاپان اور مغربی ممالک ۔ جاپانیوں نے لڑائی شروع ہوتے وقت جو وعدہ کیا تھا کہ وہ چین میں دوسری قوموں کے حقوق اور اغراض کا لحاظ کریں گے ۔ اس پر شاید کسی کو اعتبار نہ تھا ۔ لیکن اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا اب جو جاپان نے رفتہ رفتہ جتا دیا ہے کہ وہ اپنی چینی حکومت اور سیاست کو شراکتی کمپنی کی شکل نہ دے گا ۔ تو کسی کو کچھ بنائے نہیں بنتا ۔ جاپانی سپاہیوں اور ہوائی جہازوں نے

امریکیوں اور انگریزوں کے ساتھ جو زیادتیاں اور گستاخیاں کیں ان کی معافی جاپانی حکومت نے فوراً مانگ لی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ زیادتیاں ان ملکوں کا درجۂ حرارت معلوم کرنے کے لئے کی گئی ہوں۔

اب دیکھنا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کی صلح پسندی جاپانیوں کی جسارت کو کہاں تک برداشت کرے گی۔ چین میں مغربی قوموں میں سب سے زیادہ سرمایہ انگریزوں کا ..... لگا ہوا ہے اور حیثیت قائم رکھنے کی ضرورت سب سے زیادہ انہیں کو ہے اب تک انگریز اپنی کمزوری کو دوستی کے پردے میں چھپاتے رہے ہیں، لیکن جاپان ان کو دبتے دیکھ کر اور دبا رہا ہے۔ ہانگ کانگ کے انگریز گورنر نے حال میں ایک اعلان کے ذریعے یقین دلایا ہے کہ شہر اور جزیرہ بالکل خطرے میں نہیں ہے اور معلوم ہوتا ہے فی الحال جاپان نے جنوبی چین پر سمندر یعنی ہانگ کانگ اور کانٹون کی طرف سے حملہ کرنے کی مہم ملتوی کر دی ہے۔ مگر جاپانی جہازوں نے ہانگ کانگ سے کانٹون کا رستہ بند کر دیا ہے اور ہانگ کانگ انگریزوں کے پاس رہا بھی تو اس سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہو سکے گا۔ اب انگریزی اخبار سنگاپور کے بحری مرکز کی اہمیت اس اندازے سے جتا رہے ہیں کہ ہانگ کانگ چھوڑ دینے میں کوئی خاص مال یا حیثیت کا نقصان نہ معلوم ہو۔

فاشسٹ اتحاد۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں جرمنی اور جاپان کے درمیان "اینٹی کومنٹرن" معاہدہ ہوا تھا۔ جس میں کمیونزم کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا گیا تھا۔ پچھلے نومبر میں اٹلی بھی اس اتحاد میں شامل ہو گیا، اور نئے سال کا تحفہ یہ ہے کہ آسٹریا، ہنگری اور رومانیہ بھی اس میں شریک ہو گئے ہیں۔ رومانیہ میں پہلی جنوری کو فاشسٹ حکومت بھی قائم ہوئی۔ اس طرح نازیوں نے ایک بڑی مہم جس میں انہیں کئی بار ناکامیابی ہوئی تھی۔ آخر کار سر کرلی۔ رومانیہ کے انقلاب اور فاشسٹ اتحاد میں نئے اراکین کے اضافے سے یورپی سیاست کی بے چینی اور بڑھے گی۔ اس لئے کہ یہ اتحاد نام کو تو عقیدے کا اتحاد ہے۔ لیکن یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اس میں اور کوئی بھید نہ ہو۔

ڈینیوب کی وادی۔ آسٹریا، ہنگری اور رومانیہ کے فاشسٹ اتحاد میں شامل ہو جانے سے تمام ملکوں کی سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑے گا۔ جو دریائے ڈینیوب کی وادی میں واقع ہیں۔ یعنی ان تین ملکوں کے علاوہ

چکوسلواکیا، یوگوسلافیہ اور بلغاریہ۔ جنگ عظیم کے بعد سے یہ تمام ملک اس فکر میں ہیں کہ اپنے خام مال کی نکاسی کا انتظام کریں اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنی صنعت کو فروغ دیں اور مصنوعات کے لئے غیروں کے دست نگر نہ ہوں۔ آپس میں یہ خام مال کا تبادلہ کر نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سب میں پیداوار قریب قریب ایک ہی طرح کی چیزوں کی ہے، جرمنی اور اٹلی جو ان کا خام مال خرید نے پر تیار ہیں یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کے معاوضے میں ان کی مصنوعات لی جائیں۔ اگر یہ ریاستیں فرداً فرداً تبادلے کا ایسا انتظام کرنے کی کوشش کرتیں ہیں کہ ایک دوسرے کی کمی پوری کریں تو وہ قومیں جنھیں اب تک خاص تجارتی حقوق حاصل تھے اور سب سے زیادہ جرمنی اور اٹلی اس پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کے قطع تعلق بھی نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری طرف جرمنی اور اٹلی دونوں تجارتی تعلقات کے ساتھ ڈینیوب کی ریاستوں سے سیاسی راہ رسم بھی بڑھانا چاہتے ہیں، تاکہ جنگ کی حالتیں غلے اور دوسری خورونوش کی اشیا حاصل کرنے میں دشواری نہ ہو۔ خام مال کے خریداروں کی حیثیت سے انکے مقابلے کا اور کوئی نہیں، اور چکوسلواکیا کے سوا ڈینیوب کی ریاستوں میں کسی کو لیگ یا برطانوی فرانسیسی اتحاد کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، اس لئے اگر اور کسی طرح رکاوٹیں نہ ہوں تو جرمنی، اٹلی اور ڈینیوب کی ریاستیں ایسا سیاسی اور معاشی اتحاد قائم کرسکتی ہیں جو صلح اور جنگ کی حالت میں سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہو۔ آسٹریا۔ ہنگری اور رومانیہ کا "اینٹی کومنٹرن" معاہدے میں شریک ہونا وسط یورپ کے ایسے ہی اتحاد کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔

لیکن یہ اتحاد چکوسلواکیا کے لئے موت کا پیغام ہوگا۔ کیونکہ وہاں کی جرمن اقلیت نازی حکومت کی ہمدرد ہے اور ہنگامہ آرائی کے لئے بے چین۔ پولینڈ کے لئے بھی یہ اتحاد کچھ کم خطرناک نہ ہوگا۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ دونوں ریاستیں، جو صلحنامہ ورسائی کی بدولت وجود میں آئیں اور جس کا بین الاقوامی سیاست میں خاص مصرف یہ تھا کہ جرمنی کا بازو مارتی رہیں۔ برطانیہ، فرانس اور لیگ سے کتنی مدد حاصل کرسکیں گی۔

برطانیہ اور آئرلینڈ ۔ برطانیہ کے لئے یوں بھی پریشانی کے کون کم اسباب تھے جب اٹلی اسے بحرروم سے اور جاپان مشرق بعید سے بے دخل کرنے کا درپے ہے، اور اب آئرلینڈ نے ایک نئی مشکل پیدا کردی

ہے۔ آئرلینڈ کی "آزاد ریاست" کی معاشی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ انگلستان سے تبادلے کا ایسا انتظام ہو جائے کہ جس سے آئرلینڈ کو تمام ضروری اشیاء ملتی رہیں مگر اس کی مجبوریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جائے اسی طرح آئرلینڈ کی سیاسی اور تمدنی آزادی کا دارومدار اس پر ہے کہ انگریز اسے کمزور جان کر دبا نہ سکیں نئے دستور میں جو حال میں شائع ہوا ہے برطانیہ کے بادشاہ کی وہ رسمی حیثیت جس کی انگریز بڑی قدر کرتے ہیں سمجھنا چاہئے مٹا دی گئی ہے، اور شاید اسی حملے کے جواب میں پارسال شہنشاہ جارج ششم کو السٹر کا سفر کرنے کی زحمت دی گئی۔ السٹر کا صوبہ آئرلینڈ کی آزاد ریاست سے الگ ہے، کیونکہ یہاں آبادی نسل، مذہب اور سیاسی خیالات کے اعتبار سے آئرلینڈ کے باقی باشندوں سے بالکل مختلف ہے۔ اب آئرلینڈ کے صدر مسٹر ڈے ویلیرا اس تفریق کو مٹانا اور السٹر کو آئرلینڈ کی ریاست میں شامل کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ۱۹۲۲ء میں السٹر کو انگریزوں نے اسی غرض سے علیحدہ رکھنے پر اصرار کیا تھا کہ ان کا آئرلینڈ پر دباؤ رہے۔ مسٹر ڈے ویلیرا کی تجویز ہے کہ السٹر اور "آزاد ریاست" کو ملانے کے لئے ایک وفاق قائم کیا جائے اور ایسے کسی اتحاد کے لئے کچھ عرصے سے پروپگینڈا بھی ہو رہا ہے۔ اسی مسئلے کو طے کرنے کے لئے السٹر کے گورنر نے وہاں کی پارلیمنٹ کو برخاست کرکے نئے انتخابات کا حکم دیا ہے اور اسی پر گفتگو کرنے کے لئے مسٹر ڈے ویلیرا ۵ اجنوری کو لندن آئے۔ اس گفتگو کا نتیجہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا ہے۔ لیکن انگریزی اخباروں نے تمہید کے طور پر یہ کہنا شروع کیا ہے کہ مسٹر ڈے ویلیرا السٹر اور "آزاد ریاست" کے اتحاد پر اصرار نہ کریں گے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً وہ اصرار کریں گے۔

مسٹر ڈے ویلیرا ابھی ایک بڑے معاملے میں برطانوی سامراج کی ایک سیاسی رسم کو توڑ چکے ہیں۔ اٹلی نے جولائی ۱۹۳۷ء میں آئرلینڈ کی کونسلیٹ کو سفارت میں تبدیل کر دیا یعنی آئرلینڈ کو آزاد اور برابر کی حیثیت رکھنے والی ریاست تسلیم کیا۔ اس تعظیم کے جواب میں مسٹر ڈے ویلیرا نے دسمبر میں فیصلہ کیا کہ آئرلینڈ بھی ایک سفیر اٹلی کے دربار میں بھیجے۔ سفیر اسی وقت بھیجا جا سکتا ہے جب آئرلینڈ اٹلی کے بادشاہ کو حبش کا شہنشاہ تسلیم کرے جو کہ برطانیہ نے ابھی تک نہیں کیا ہے۔ اور انگریز اس پر بہت "افسوس" کر رہے ہیں کہ آئرلینڈ کے صدر نے ایسے معاملے کا برطانیہ سے مشورہ لئے بغیر فیصلہ کر لیا۔ لیکن آئرلینڈ کے صدر بہت ہوشیار

اور تجربہ کار آدمی ہیں اور برطانیہ کی سیاست کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کا مقصد انگریزوں پر اپنی آزادی اور اپنا اختیار جتانا ہے، اور اس کو جتا کر ہی وہ اپنا اصل مطلب حاصل کر سکیں گے۔

اسلامی دُنیا

عراق۔ ۲۳ دسمبر کو عراق کی نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ہوا۔ انتخاب میں موجودہ حکومت کے حامی ہی بیشتر کامیاب رہے ہیں۔ مرحوم بکر صدقی کے زمانہ میں جن سیاست دانوں نے جان کی سلامتی اسی میں سمجھی تھی کہ بغداد سے دُور دمشق اور قاہرہ میں اپنے آپ کو بچا کر بے جائیں۔ انتخاب کی سُن کر وطن واپس لوٹے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ عراق کے بے تاج بادشاہ یٰسین کی بے وقت موت نے نوری سعید کے لئے راہ صاف کر دی ہے۔ اور اب عراق کی کشتی کے ناخدا یہی بزرگ ہوں گے۔ نوری سعید پاشا فیصل مرحوم کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اور نہایت اچھے قسم کے برطانیہ دوست واقع ہوئے ہیں۔ اس امید سے عراق کے برطانی حلقوں کو ڈھارس بندھی تھی ورنہ اگر بکر صدقی زندہ رہتے تو برطانی اعلیٰ افسر جو تمام شعبوں پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں اب تک کبھی کے نکال دیئے گئے ہوتے۔

انتخابات ہوئے، نوری سعید پاشا بھی شرکت کے لئے دمشق سے پہنچ گئے۔ عام طور پر یہی سننے میں آتا تھا کہ نئی وزارت کے بنانے کا سہرا انہی کے سر رہے گا لیکن انتخابات کے فوراً بعد موصوف چپکے سے بغداد سے چلدیئے۔ اور لوگوں کو اس وقت آپ کے سفر کا پتہ چلا جب موصوف بخیر و سلامتی دمشق کے ہوائی اسٹیشن پر پہنچ گئے، کہتے ہیں نوری سعید بھی بکر صدقی کی طرح فوج کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں تھے۔ اور جب آپ نے راز افشا ہوتے دیکھا تو فرار کو غنیمت جانا۔

مصر میں اگر طلبا سیاست پر حاوی ہیں تو یہاں عراق میں فوج، زمانہ کچھ اس طرح تیز چل رہا ہے کہ قوم کا نوجوان عنصر پرانے سیاست دانوں کی گرفت سے باہر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نوجوان اور پھر عرب نوجوان ان کی طبیعتوں میں قرار کہاں، جذبات کی رو میں جدھر بہہ نکلے کون ہے جو انہیں سنبھال سکے۔ نتیجہ یہ ہے

کہ مصر میں گڑبڑ ہے تو عراق میں بھی خیر نہیں۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ یٰسین پاشا کی ہر دلعزیزی مسلم تھی لیکن نوجوانوں کی شوریدہ سری دیکھئے کہ اس بیچارہ کو وطن سے دور موت کی آغوش میں پناہ لینی پڑی۔ نحاس پاشا کے "زعیم اُمت" ہونے میں کسے شک ہو سکتا تھا لیکن جامعہ مصریہ کے طلبا نے اُس کی وہ دُرگت بنائی کہ توبہ بھلی اور ایک سرپھرے نوجوان نے تو موصوف کو ٹھکانے ہی لگانے کی ٹھان لی تھی فلسطین کا معرکہ بھی اپنی نوجوانوں کے دم سے گرم ہے۔ ورنہ رہنماؤں کا بس چلے تو وہ برطانیہ سے فوراً صلح کرلیں۔ ان کو ڈر یہ ہے کہ اگر صُلح کا ہاتھ بڑھایا اور انگریز کی شرطیں مان لیں تو ہماری جان کی خیر نہیں۔ الغرض مشرق قریب کے ملکوں کا سیاسی مستقبل سب ان نوجوانوں کے ہنگامۂ ہائے ہو سے وابستہ ہے، اس بے سری فوج کو اگر کوئی صحیح معنوں میں حقیقی رہنما مل گیا تو سمجھ لیجئے کہ عربوں کے دن پھر رہے ہیں۔ ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ یہ کہیں آپس میں کٹ کٹ کر فنا نہ ہوجائیں۔

نئی پارلیمنٹ کا افتتاح شاہ غازی کی تقریر سے ہوا۔ پچھلے دنوں کے شور وشرا ور قتل وغارت کے مقابلہ میں موجودہ امن وامان کی تعریف کرتے ہوئے شاہ غازی نے ملک کی عام ترقی کو سراہا، آپ نے فرمایا کہ موصل کے تیل کے چشموں سے جو حق مالکانہ کے طور پر حکومت کو رقم ملتی ہے، اس سے زراعت اور تعلیم کو بہتر بنانے میں بہت مدد مل رہی ہے، نئے کام اتنے شروع ہو رہے ہیں کہ بے کاری تو کجا کام کرنے والوں کی کمی ہو رہی ہے، دریاؤں پر پُل بن رہے ہیں۔ زراعت کے لئے پانی کے بڑے بڑے بندھ بنائے جا رہے ہیں۔ ایران سے سرحد کے متعلق جو جھگڑا چل رہا تھا وہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا اور اب چار سلطنتوں (ایران، ترکی، افغانستان اور عراق) کے دوستانہ معاہدہ نے آپس کے تعلقات کو اور استوار کردیا ہے۔

اب تک تو عراق میں فوج کے بعد مزدوروں کا زور ہے جس ملک میں اجنبی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تمام کاروبار ہوں وہاں کے مزدور کیوں مطمئن ہونے لگے۔ اب تک تو یہ آگ اندر ہی اندر سلگ رہی ہے اور سیاسی ہنگاموں اور حکومت کی سخت گیری نے اسے ابھی سر اٹھانے کی فرصت نہیں دی لیکن مزدوروں کا مسئلہ اور اشتراکیت کا ہوّا عراق کی دُکھتی ہوئی رگ ضرور ہے۔ پچھلے دنوں پارلیمنٹ

میں ایک رکن نے تقریر کرتے ہوئے حکومت پر اشتراکیت کی تائید کا الزام لگایا۔ اشتراکیت کا نام سنتے ہی ۱۱۵ ارکان نے ایوان نہیں آسمان سر پر اُٹھا لیا جلسہ میں وہ کھنڈت پڑی کہ صدر پارلیمنٹ سے بھی یہ طوفان بدتمیزی نہ تھم سکا۔ گلے تھک گئے تو مکّوں سے بے دریغ کام لیا گیا۔ ایوان کیا تھا اسی ہنگامہ نے اُسے اچھا خاصہ دنگل بنا دیا، بارے جوش کم ہوا تو ارکان نے اس "گستاخ رکن" کو قرار واقعی سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ طے کیا کہ وزارت پر اس غلط الزام لگانے کی پاداش میں اسے پارلیمنٹ کے اجلاس میں پہنچنے کی اجازت نہ دی جائے۔ عراقی نمائندوں کا غصہ اس بلا کا تھا کہ معافی مانگنے اور اظہار افسوس کرنے کے بعد بھی اس فیصلہ کو برقرار رکھنے پر اصرار ہوا۔

برطانی عراقی معاہدہ میں برطانیہ کے سامراجی استحکام کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ عراق بدقسمتی سے برطانی مقبوضات کی ہوائی شاہ راہ پر واقع ہے۔ اس لئے معاہدہ میں انگریزوں نے اس سرزمین میں اپنے ہوائی مرکز بنانے کی اجازت لے لی تھی۔ پہلے تو بغداد کے قریب ہی برطانی ہوائی مرکز تھا لیکن چونکہ پایۂ تخت کے بالکل پڑوس میں اجنبی سلطنت کے شکوہ و جلال کا مظاہرہ عراق کے "غیور وطن پرستوں" کو گراں گزرتا تھا اور از بسکہ برطانیۂ عظمیٰ اپنے حلیفوں کے نازک جذبات کی قدردان ہے اس لئے اُس کے ارباب اقتدار نے بغداد سے بہت دور اپنے لئے ایک جگہ ڈھونڈلی نیا ہوائی مرکز نہایت وسیع پیمانہ پر بنایا گیا ہے، اسلحہ کے گودام، جہازوں کے قیام گاہ حفاظتی فوج اور کارکن عملہ کے لئے بہتر سے بہتر جو انتظام ممکن تھا کیا گیا ہے۔ عراق کی آزادی سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا اور نہ مصر کو آزاد ماننے میں کسی کو تامل ہوگا۔ لیکن جب آزاد ملکوں کی فضا برطانی طیاروں کے لئے وقف ہو اور اس کے ساحل آہن پوش جنگی جہازوں کے رزم گاہ ہوں۔ حکومت کے دفاتر میں سب کرتا دھرتا انگریز ہوں، فوج کی تربیت اور تعلیم اور اسلحہ کی فراہمی بھی ان کے سپرد ہو تو اگر مرحوم بکر صدقی اور احمد حسین مصری کی (سبز پوش تحریک کے رہنما) قسم کے نوجوان اپنے رہنماؤں کو نجات دہندہ وطن کی بجائے وطن فروش کہنے کی جرأت کریں تو اسے جرأت بے جا کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔

مصر۔ وفد اور بادشاہ کی کشاکش آخر رنگ لاکر رہی اور پچھلے چھ مہینوں کے ہنگاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وفد کے رہنما مصطفےٰ نحاس وزارت سے برطرف کر دیئے گئے اور پارلیمنٹ کو ایک ماہ کی چھٹی مل گئی، نئی وزارت وفد دشمن جماعتوں پر مشتمل ہے۔ بھلا اسے پارلیمنٹ کی وفدی اکثریت کیوں قبول کرنے لگی۔ ظاہر ہے کہ ایک مہینے کے بعد یا تو یہ پارلیمنٹ بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ یا کوئی دوسری وزارت وجود میں آئے گی۔

وفدی وزارت کیوں ٹوٹی؟ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ وفدی حضرات سمجھتے ہیں اور ان کا سمجھنا تعداد کے اعتبار سے زیادہ بے محل بھی نہیں کہ مصر عبارت ہے وفد سے اور وفد مصر سے، دوسری تمام جماعتیں غدار اور وطن فروش ہیں۔ اور ان کا مصر کے نام پر بولنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، کہتے ہیں کہ جب ۱۸۸۱ء میں مصری قوم پرستوں نے قصر شاہی کے سامنے مظاہرہ کیا تو خدیو توفیق جھلا کر محل سے نکلا اور مصری قوم پرستوں کے لیڈر اعرابی پاشا سے پوچھنے لگا کہ تم کون ہو اور اس مظاہرے سے تمہارا کیا مطلب ہے، اعرابی پاشا نے جواب دیا کہ "میں مصر ہوں"۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس سرزمین میں جہاں کے بادشاہ اپنے آپ کو مصر تو کیا بندوں کا "ربکم الاعلیٰ" کہلوانے کے عادی تھے۔ ایک عامی مصری نے "میں مصر ہوں" کہنے کی جرأت کی۔

۱۸۸۱ء کو زمانہ بیت گیا، نہ مصری قوم پرست رہے اور نہ خدیوؤں کا غلبہ و اقتدار رہا۔ برطانی سامراج نے سب کو پیس کر رکھدیا لیکن "میں مصر ہوں" کا نعرہ ہر مصری کے دل کو برابر گرماتا رہا۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے دن آئے تو سعد زغلول نے پھر اسی نعرہ کو بلند کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف مرحوم کو انگریزوں سے بھڑنا پڑا اور دوسری طرف بادشاہ اور بادشاہ پرست جماعتوں سے، آج بھی نقشہ ہے، توفیق نہ ہوا، فاروق ہو گئے اور فواد نہ ہوئے ان کے فرزند ارجمند ہو گئے۔

انگریز جانتا ہے کہ اگر آج یہ مصری بادشاہ کو غیر مصری کہہ کر اس کے اقتدار کو ختم کریں گے، تو دوسری زد لامحالہ اُن پر بھی پڑے گی۔ کیونکہ بادشاہ تو کسی نہ کسی طرح مصری بن بھی سکتا ہے۔ لیکن "جان بل" کے لئے سینگ کٹوانا ناممکن ہے۔

وفد کی غلطی یہ ہے کہ وہ مہینوں کی راہ پلوں میں طے کرنا چاہتے ہیں چنانچہ دوسرے ملکوں میں

جو باتیں بحث و مباحثہ سے حل ہو جاتی ہیں۔ یہاں ان کے لئے فرانسیسیوں کی طرح انقلاب کرنا پڑتا ہے ۱۹۳۰ء میں بھی نحاس پاشا پر یہی گذر رہی تھی۔ پارلیمنٹ سرتاسر وفدی تھی۔ موصوف نے دستور سے بادشاہ کے اختیارات ختم کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ کا اقتدار تو کیا ختم ہوتا، وزارت ختم ہو گئی اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی۔ اور پورے چار برس تک وفدی بری طرح پٹتے رہے۔ اس مار پیٹ سے کچھ حاصل ہو جاتا تو مضائقہ نہ تھا لیکن ہوا یہ کہ اس جنگ ہنسائی کے بعد وہ سب کچھ مان لیا جن سے پہلے انکار تھا۔ نذر سر تسلیم خم کر کے انگریزوں کے صدقہ میں وزارت پائی۔ عقل و تدبر کی جگہ جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

رونا تو یہ ہے کہ ۹۵ فی صدی مصری آبادی کی کسی کو بھی فکر نہیں اور جس مصر کی نمائندگی کا ہر ایک کو دعویٰ ہے، اس کی کوئی خبر نہیں لیتا۔ بیشتر فلاحین کی زمینیں اجنبی بنکوں کے پاس رہن ہیں۔ اُمرا ر مال میں مست ہیں۔ پڑھا لکھا طبقہ (آفندی) روزی کے چکر میں سرگرداں ہے۔ اہل دین پریشان ہیں کہ نوجوان شراب و جوا کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ اور عورتیں اور لڑکیاں یورپ پرستی میں دھن دولت اجنبی مصنوعات کی نذر کر رہی ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ خلفشار اور مصریوں کی جذباتی طبیعت، آخر انقلاب کیوں نہیں ہوتا؟ یہ سب برطانیہ کے دم قدم کی برکت ہے کہ جذبات کا کھولاؤ صرف آپس کی دھینگا مشتی تک رہ جاتا ہے اور تھوڑے سے قتل و خون سے یہ بلا ٹل جاتی ہے یوں بھی مصر میں وضع احتیاطاً کا یہ حال ہے کہ نہ کوئی عام جلسہ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہر دو قانون کی نظر میں جرم ہیں۔ کبھی کبھی تو مخالف رہنماؤں کو بغیر کسی "عذر شرعی" کے قاہرہ سے باہر جانے سے روک دیا جاتا ہے، ہاں وضع احتیاطاً کی تعزیرات میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ کہیں لوگوں کا دم نہ رکنے لگے۔ اور مجبوراً گریباں کو چاک کرنے تک نوبت نہ پہنچ جائے چنانچہ زبان کی تو نہیں قلم کی پوری آزادی ہے۔ اس آزادی کا ثمر یہ ہے کہ اخبارات کے ہاتھ سے نہ کسی کی آبرو محفوظ ہے اور نہ عزت ایک دوسرے کے خلاف وہ وہ غلاظت اچھالی جاتی ہے کہ خاک روب کو گھن آئے، یہ ہیں کرشمے برطانی سامراج کے!

نئی وزارت کے صدر محمد محمود پاشا ہیں اور ان کے دست راست صدقی پاشا، ان دونوں کے منہ کو پہلے ہی ڈکٹیٹری کا لہو لگ چکا ہے، اگر خلیفہ سلطنت (برطانیہ) کی طرف سے اذن مل گیا تو آپ عنقریب سن لیں گے کہ پارلیمنٹ بالکل ختم ہوگئی اور نئی وزارت نے قانون سازی کا بار بھی خود ہی سنبھال لیا بادشاہ بیچارا قانوناً بالغ سہی لیکن عقل کے اعتبار سے تو ابھی نابالغ ہی ہے، ہاں اس کو علی ماہر پاشا جیسا آدمی سرپرست مل گیا ہے۔ پاشائے موصوف سیاسی جوڑ توڑ میں بہت نام پیدا کر چکے ہیں اور رائے عامہ ان سے اتنی خفا بھی نہیں کیونکہ یہ پردے کی دوسری طرف آنے کے زیادہ قائل نہیں، ایک فریق تو یہ ہوا۔ دوسرا فریق محمد محمود اور صدقی کا ہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے کہ ان میں سانپ اور نیولے کا بیر تھا لیکن اب تو یہ ایک ہی معلوم ہوتے ہیں، تیسرا فریق وفدیوں کا ہے۔ اب ہوگا یہ کہ ان تینوں میں رسہ کشی ہوگی اور ظاہر ہے اسی میں برطانیہ کا بول بالا رہے گا۔

ایران۔ شیعہ اور سنی کا جھگڑا کوئی آج کا تو ہے نہیں پر ہماری قوم کے دور انحطاط میں اس نے جو ناگوار شکل اختیار کی ہے کونسا سمجھدار مسلمان ہے۔ جو اسے اچھی نظر سے دیکھتا ہوگا۔ جب تک قوم میں زندگی تھی، اس قسم کے جھگڑے جنگ کے میدانوں میں نمٹ جاتے تھے۔ لیکن جب قوم اپاہج ہوگئی اور اقتدار کی باگ مسلمانوں کے پیشہ ور فوجی جماعتوں کے ہاتھ میں آگئی تو علماء نے شیعہ اور سنی کے اختلافات کو اپنا شغل خاص بنالیا۔ قوم کا خلاقی معیار گر چکا تھا، و [illegible] خلوص نیت اور تزکیہ نفس کی بجائے محض ذاتی اغراض اور سیاسی دھڑا بندیوں کا آلہ کار رہتا ہوا یہ کہ ان علمی بحثوں اور مذہبی مناظروں نے دلوں میں وہ ناسور پیدا کر دیئے کہ ان کا زہر ہمارے قومی جسم کی نخ نخ میں سرایت کر گیا۔ جب انیسویں صدی کے آخر میں یورپی سامراج کی لوٹ نے مسلمانوں کو چونکا دیا اور اپنی حالت کا جائزہ لینے کے لئے اپنے آگے پیچھے دیکھنے لگے تو اور قومی امراض میں انہیں شیعہ سنی کی دشمنی بھی نظر آئی، زمانہ کا تازیانہ سخت تھا، اور ملی مفاد کے لئے اتحاد امت ناگزیر، آخر دونوں طرف کے اہل تدبر کی طرف سے صلح و مودت کی کوششیں کیوں نہ ہوتیں، وقت سازگار تھا، اختلاف کی خلیج آہستہ آہستہ پاٹی جانے لگی، جو گتھی تیرہ صدیوں کی علمی بحثوں اور جنگی معرکوں سے نہ سلجھی تھی اُسے مختصر سی مدت میں تقدیر

کے ناخن نے سلجھا دیا، جنگ عظیم کے بعد عراق کے شیعہ اور سُنی بھائی بھائی بن کر اجنبی کے خلاف لڑے، اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایران بھی شیعہ اور سُنی کی تفریق کو مٹا رہا ہے۔

۱۹۳۱ء کے آخر میں یا ۱۹۳۲ء کے شروع میں بیت المقدس میں ایک موتمر ہوئی تھی جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمائندے اور مقتدر رہنما شریک تھے۔ یہ اپنی قسم کی پہلی موتمر تھی جس میں مسلمانان عالم ایک ملت کی شکل میں نظر آئے۔ شیعی دنیا کے مجتہد اعظم بھی اس موتمر میں شریک تھے، ایک نماز میں دنیا نے دیکھا کہ مجتہد اعظم امام ہیں اور ان کے پیچھے تمام فرقوں کے علماء کبار کھڑے ہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر ایک صاحب نظر مسلمان رہنما نے کہا تھا کہ جس اختلاف کی بنیاد اسلام میں آج سے تیرہ سو برس قبل پڑی تھی۔ آج اس کو ختم کرنے کی طرح ہم نے اس ارض پاک میں ڈال دی ہے،

ایران کی تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے شیعہ سُنی کی تفریق قانوناً منع کر دی ہے اور یہ فرمان جاری کر دیا ہے کہ کوئی ایرانی اپنے آپ کو شیعہ یا سُنی نہ لکھے۔ تعزیہ داری کے سلسلہ میں جو بیہودہ رسوم داخل ہو گئی تھیں ان کو قطعی طور پر روک دیا ہے اور آئندہ سے ان کاموں کے لئے سرکاری خزانے سے امداد دینے کا طریقہ بھی منقطع کر دیا ہے، حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ان رسوم پر جو اسراف ہوتا تھا وہ اب تعلیم کی مدمیں صرف ہوگا، آل محمد صلعم کی محبت کا کون مسلمان ہے جو منکر ہو سکتا ہے لیکن اس محبت کا مظاہرہ گھناونے طریقوں سے ہوتا ہے ان کو نہ علماء شیعہ پسند کرتے ہیں اور نہ عام سمجھ دار مسلمان،

اسلامی ممالک میں عموماً اور مصر میں خاص طور پر اہل علم کے حلقوں میں فقہ اسلامی کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ اور خود دار قوم دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین پر کب تک مطمئن رہ سکتی ہے پچھلے دنوں مصر میں ایک صاحب نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ موجودہ زندگی کی ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم جب فقہ اسلامی میں تہذیب و تجدید کی کوشش کریں تو فقہ کے اور مذاہب کے افکار و آراء کے ساتھ ساتھ اہل یمن کے زیدیوں اور اثنا عشریہ والوں کی فقہ کو بھی پیش نظر رکھیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ملت اسلامی کا یہ رجحان اسلامی فرقوں کی باہم آویزش کو بالکل ختم کر دے گا۔ اور مسلمان اپنی تاریخ کی عظمت اور اس کی قابل تقلید روایات کو ملی نقطۂ نظر سے دیکھنا

ہندوستان

ہندوستان کی مالیات کا مسئلہ ۔ ۲۰ اور ۲۱ جنوری ۱۹۳۸ء کو دہلی میں ہندوستان کے تمام فائنانس منسٹروں کی ایک خاص کانفرنس مرکزی حکومت کے وزیر مالیات کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں کچھ بحث ومباحثہ ہوا اس کی تفصیلی اور مستند روئداد تو اخباروں میں شائع نہیں ہوئی ۔ البتہ نمائندہ اخبار نے جب ایک وزیر مالیات سے ملاقات کی تو انہوں نے کانفرنس کے متعلق اپنے تاثرات بتائے کہا کہ ہم اپنے درمیان اختلاف رکھنا منظور کر لیا ہے ۔

یہ جواب بہت دلچسپ ہے لیکن پھر بھی یہ معلوم کرنے کو طبیعت چاہتی ہے کہ اس کانفرنس کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس میں کن باتوں پر ایسا شدید اور بنیادی اختلاف ہوا کہ بغیر کسی سمجھوتہ کے سب فریق اختلاف جاری رکھنے پر راضی ہو گئے اخبار کے نمائندے نے کچھ کھوج لگانے کی کوشش کی چنانچہ اس نے خبر دی کہ اختلاف اس بات پر تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے کیا حدود ہونے چاہئیں ۔ نئے ایکٹ کے ماتحت پوزیشن مبہم ہو گئی ہے اور بہت ممکن ہے کہ دستور ہند کے نقشہ نمبر ۲ میں "اشیاء کی فروخت کے محاصل" کا جو فقرہ درج ہے اس کی صحیح تفسیر وتعبیر کے لیئے فیڈرل عدالت تک جانے کی نوبت آئے اسی طرح کچھ وزیروں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک صوبوں کو ٹیکسوں کی ان حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جو قانوناً مرکزی حکومت کے قبضہ میں ہیں اس وقت تک صوبوں کی کوئی خاص آمدنی نہیں ہو سکے گی ۔ اس کے علاوہ کانفرنس میں بجلی اور تمباکو کے ٹیکس پر بھی غور کیا گیا اور چھوٹے چھوٹے صوبوں کی طرف سے مزید امداد کے لیئے مطالبہ پیش کیا گیا لیکن مرکزی حکومت کی طرف سے یہ بتایا گیا کہ اس مطالبہ کو منظور کرنا مشکل ہے ۔

اس مسئلہ کے بارے میں ہماری رہنمائی کا دوسرا ذریعہ وزیر مالیات صوبہ سرحد کی تقریر ہے آپ نے مقامی ہندو کالج کے ایک مباحثہ میں حصہ لیا جس کا موضوع تھا ۔ آیا نئے آئین کے ماتحت صوبجات کے مالی ذرائع قومی تعمیر کے کام کیلئے کافی ہیں یا نہیں آپ نے اپنی تقریر میں ان مالی مشکلات کا تذکرہ کیا ۔ جن کی موجودگی میں آپ کے لیئے قومی تعمیر کا کام وسیع پیمانہ پر کرنا سخت مشکل ہے آپ نے قومی تعمیر کے لیئے روپیہ حاصل کرنے کے چار طریقے بتائے ۔ ان میں پہلا طریقہ تخفیف کرنے کا ہے دوسرا جدید ٹیکس لگانے کا تیسرا مرکزی حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کا اور چوتھا قرض حاصل کرنے کا ۔ آپ نے بتایا کہ تخفیف اس لیئے نہیں کی جا سکتی کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہیں جدید آئین کی رو سے محفوظ ہیں نیا ٹیکس لگانا بھی سخت مشکل ہے ۔ کیونکہ لوگ غریب ہیں اور ملک میں اس وقت ٹیکس کا جو بوجھ ہے ۔ وہی بہت بھاری ہے ۔ اگر اور ٹیکس لگایا گیا تو سخت ایجی ٹیشن شروع ہو جائے گا ۔ مرکزی حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کا طریقہ بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مرکزی حکومت ابھی تک غیر ذمہ دار ہے اور سر اٹو نیمیر کے ثالثی فیصلہ پر پانچ سال تک نظر ثانی نہیں کی جائے گی ۔ قرض البتہ لیا جا سکتا ہے لیکن قرضہ کے بھی حدود ہیں اور ایسا قرض دینے والا

کوئی نہیں ملتا جو دے کر بھول جائے اور سود اور اصل کا کبھی مطالبہ نہ کرے ۔

اخبار کے نمائندہ کی قیاس آرائیوں اور زیر سرحد کے ان اشاروں سے تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کانفرنس کے بحث و مباحثہ کی نوعیت کیا رہی ہوگی لیکن اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں جدید دستور کی ان دفعات کا خلاصہ جو مالیات سے متعلق ہیں اور سر آٹو نیمیر کے ثالثی فیصلہ کے اہم اقتباسات کو یہاں پیش کر دیا جائے

دستور ہند میں مالی دفعات۔ سب سے پہلے ہم ٹیکسوں کی ان حدود کو دیتے ہیں جنھیں جدید دستور نے فیڈرل اور صوبوں کی حکومتوں کیلئے مقرر کیا ہے۔

فیڈرل ٹیکسوں کی فہرست میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہیں :۔

تمباکو اور دوسری ایسی اشیار پر محصول جو ہندوستان میں بنائی یا پیدا کی جاتی ہیں۔ اکسایز کے محاصل لیکن ان میں مندرجہ ذیل شامل نہیں ہیں ۔

(i) آدمیوں کے استعمال میں آنے والی الکوہل کی شراب ۔

(ii) افیون بھنگ اور دوسری نشہ لانے والی دوائیں اور اشیار

(iii) ایسی دوائیں یا زینت کے سامان جن میں الکوہل یا کوئی اور چیز جس کا نمبر (ii) میں ذکر کیا گیا ہے ملی ہوتی ہوں کارپوریشن ٹیکس۔ نمک پر ٹیکس۔ آمدنیوں پر ٹیکس لیکن اسمیں زراعتی آمدنی شامل نہیں ۔

پونجی کی سرمایہ دارانہ حیثیت پر ٹیکس جس میں افراد اور کمپنیوں کی زراعتی زمین شامل نہیں ہے ۔

کمپنیوں کے سرمایہ پر ٹیکس ۔

زراعتی زمین کے علاوہ باقی سب جائداد کے ترکہ پر ٹیکس ۔

ہنڈیوں۔ پرامیسری نوٹوں، چیکوں، اعتبارناموں۔ بیمہ کی پالیسیوں، عرضی ناموں اور رسیدوں پر اسٹامپ ٹیکس

جو مال یا مسافر ریل یا ہوائی جہاز سے جائیں ان پر ٹرمنل ٹیکس ۔

ریلوے کے کرایہ اور آدمیوں اور مال کے کرایہ پر ٹیکس ۔

صوبوں کے ٹیکسوں کی فہرست میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہیں ۔

مالگذاری

صوبہ میں جو چیزیں بنائی یا پیدا کی جائیں ان میں حسب ذیل اشیار پر اکسایز کا محصول :۔

(i) آدمیوں کے استعمال کے لئے الکوہل کی شراب ۔

(ii) افیون بھنگ اور دوسری نشہ والی دوائیں اور چیزیں ۔

(iii) ایسی دوائیں یا زینت کے سامان جن میں الکوہل یا کوئی اور چیز جسکا نمبر (ii) میں ذکر کیا گیا ہے ملی ہوئی ہوں ۔

زراعتی آمدنیوں پر محصول۔

زمینوں عمارتوں، مکان میں لگی ہوئی انگیٹھیوں اور کھڑکیوں پر ٹیکس۔

زراعتی زمین کے ترکہ پر محصول۔

کان کنی کے حقوق پر محصول۔

کیپیٹیشن ٹیکس

علمی پیشوں، تجارتوں، پیشوں اور ملازمتوں پر محصول۔

جانوروں اور کشتیوں پر محصول۔

کسی مقامی علاقہ میں سامان کے داخلہ پر محصول۔

تعیشات پر محصول جس میں لہو ولعب، تفریحات، جوا اور سٹہ پر بھی محصول شامل ہے۔

فیڈرل قانونی فہرست میں اسٹامپ کے جو محصول شامل ہیں ان کے علاوہ دستاویزوں پر اسٹامپ کا محصول۔

ملک کے اندر پانی کے راستہ سے جو مال یا مسافر جائیں ان پر محصول۔

ٹول

اس فہرست میں جتنے معاملات شامل ہیں ان سے متعلق فیس لیکن اس میں عدالت کی فیس شامل نہیں ہے۔

فیڈرل اور صوبہ کے ٹیکسوں کی ان فہرستوں کو دیکھنے کے بعد اب آیئے جدید دستور کی چند دفعات کا بھی سرسری مطالعہ کریں۔ یہاں اس دستور کی دفعات (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۴۰) (۱۴۱) اور (۱۴۲) سے بحث کی جائے گی۔

دفعات (۱۳۷) (۱۳۸) اور (۱۴۰) میں چند خاص محصولوں کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ انھیں کون عاید اور وصول کرے گا اور وصول ہو جانے اور خرچ نکالنے کے بعد خالص آمدنی کی تقسیم کس طرح پر کی جائے گی۔

دفعہ (۱۳۷) میں مندرجہ ذیل محاصل کو پیش نظر رکھا گیا ہے:۔

زراعتی زمین کے علاوہ دوسری زمینوں کے ترکہ پر محاصل۔

ایسے اسٹامپ کے محاصل جن کا ذکر فیڈرل ٹیکسوں کی فہرست میں کیا گیا ہے۔

ریلوے یا ہوائی جہاز سے جو مسافر یا سامان جاتا ہے اس پر ٹرمنل ٹیکس۔

ریلوے کے مسافروں اور مال پر کرایہ۔

ان سب کو فیڈریشن عاید اور وصول کرے گی اور ان سے جو خالص آمدنی حاصل ہوگی وہ صوبوں اور فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے درمیان ان اصولوں کے مطابق تقسیم کر دی جائے گی۔ جن میں فیڈریشن کی مجلس قانون ساز مقرر کرے گی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان مدوں سے جو زائد محصول (سورچارج) لگایا جائے گا اس کی حقدار فیڈریشن ہوگی۔

دفعہ (۱۳۸) میں زراعت کی آمدنی کے علاوہ باقی سب آمدنیوں کے محصول کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انہیں بھی فیڈریشن عاید اور وصول کرے گی۔ لیکن خالص آمدنی کا ایک مقررہ تناسب فیڈریشن کی آمدنی میں شامل نہیں کیا جائے گا بلکہ صوبوں اور فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے درمیان طے شدہ اصول کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔

لیکن اس شرط کے ساتھ سورچارج کی پوری آمدنی فیڈریشن کو ملے گی۔

چونکہ اوپر کہا گیا ہے اس کے باوجود فیڈریشن کو اختیار ہوگا کہ ایک مقررہ مدت کے واسطے آمدنی کے اس تناسب کو بھی جو صوبوں اور فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اپنے لئے ہی رکھ لے۔

دفعہ (۱۴۰) میں نمک کے محصول اور اکسائز اور برآمد کے فیڈرل محصول کا تذکرہ ہے۔ انھیں بھی فیڈریشن ہی عاید اور وصول کرے گی۔ لیکن فیڈرل مجلس قانون ساز اگر چاہے تو اس مقصد کا ایک قانون بنا کر ان کی خالص آمدنی کے ایک حصہ یا کل کو ان اصولوں کے مطابق جو قانون میں موجود ہوں گے صوبوں اور فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے درمیان تقسیم کر سکتی ہے۔

لیکن جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے باوجود جوٹ کے محصول برآمد میں سے نصف حصہ یا ملک معظم باجلاس کونسل اگر چاہیں گے تو اس سے زیادہ حصہ فیڈریشن کی آمدنی کا جز نہ بن سکے گا اور یہ حصہ ان صوبوں میں جہاں جوٹ پیدا کیا جاتا ہے۔ جوٹ کی پیداوار کے تناسب کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔

دفعہ (۱۴۱) میں بتایا گیا ہے کہ کسی ایسے ٹیکس کے بارے میں جس سے صوبوں کو دلچسپی ہے یا جس سے "زراعتی آمدنی" کے مفہوم میں تبدیلی ہوتی ہے کوئی قانون فیڈرل مجلس قانون ساز کے کسی ایوان میں پیش نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کے پیش کرنے کی گورنر جنرل اپنے اختیار تمیزی سے پیشگی منظوری نہ دے دیں۔

دفعہ (۱۴۲) میں ہدایت ہے کہ فیڈریشن کی آمدنی میں سے ایسی رقوم جنھیں ملک معظم باجلاس کونسل مقرر کریں۔ ایسے صوبوں کو سالانہ امداد کے طور پر دی جائیں جن کے متعلق ملک معظم یہ فیصلہ کریں کہ ان میں مدد کی ضرورت ہے اور اس ذیل میں مختلف صوبوں کے لیے مختلف رقمیں مقرر کی جا سکتی ہیں۔

لیکن شرط یہ ہے کہ سوائے سرحدی صوبہ کے کسی اور دوسرے صوبہ کی امداد میں اس وقت تک اضافہ نہیں کیا جائے گا جب تک کہ فیڈرل مجلس قانون ساز کے دونوں ایوان اس اضافہ کے واسطے گورنر جنرل کے سامنے ملک معظم کی خدمت میں پہنچانے کے لئے ایڈریس پیش نہ کریں گے۔

یہ تو دستور ہند کی دفعات ہوئیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فیڈریشن قائم ہو جائے گی اس وقت بھی بہت سی باتیں مبہم رہیں گی اور اختلاف رائے کی صورت میں عدالت کی طرف فیصلہ کے لیے رجوع کرنا پڑے گا۔ اور جب تک فیڈریشن قائم نہیں ہوتی اسوقت تک مرکزی اور صوبہ کی حکومت کے تعلقات میں اور بھی

زیادہ گومگو کی کیفیت باقی رہے گی جس کے لئے فنانس منسٹروں کی کانفرنسیں بلانا پڑیں گی اور جو اختلاف کو قائم رکھنے پر راضی ہو کر منتشر ہو جایا کریں گی۔

جب جدید دستور ہند کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو سکریٹری آف اسٹیٹ نے سر آٹو نیمیر کو جو برطانیہ کے محکمہ مالیات کے قابل ترین افسر سمجھے جاتے ہیں۔ دستور ہند کی دفعات (۱۳۸) (۱۴۰) اور (۱۴۲) کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا اور انہوں نے اپنی رپورٹ ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو شائع کی جس میں سر آٹو نے سفارش کی کہ صوبائی خود مختاری کو اپریل ۱۹۳۷ء میں شروع کیا جا سکتا ہے اور فیڈریشن کو اس کے ایک سال بعد اور انہوں نے بتایا کہ اگر مالیات کا انتظام دور اندیشی کے ساتھ کیا جائے تو جدید دستور کی وجہ سے جو خرچ پیدا ہو جائینگے انھیں پورا کیا جا سکتا ہے۔

ان کی سفارشات انکم ٹیکس اور صوبوں کی امداد سے متعلق ہیں۔ سر آٹو نے انکم ٹیکس میں سے صوبوں کا حصہ ۵۰ فیصدی مقرر کر دیا۔ برما کو خارج کرنے کے بعد انہوں نے ہندوستان کے انکم ٹیکس کا تخمینہ ۱۲ کروڑ روپیہ سالانہ کا کیا جس کا نصف یعنی ۶ کروڑ صوبوں کو دیا جائے گا لیکن پانچ سال تک یہ مرکزی حکومت کے پاس ہی رہے گا۔ چھٹے سال سے پانچ سال کی مدت میں آہستہ آہستہ ہر سال مساوی رقم کے اضافہ کے ساتھ صوبوں کا حصہ صوبوں کو منتقل کر دیا جائے گا۔ گویا دس سال میں صوبوں کو اپنا پورا حصہ مل جائے گا لیکن اس میں بھی دستور ہند کی دفعہ (۱۳۸) کی شرط نمبر ۲ لگی ہوئی ہے جس کے ذریعہ فیڈریشن ایک مقررہ مدت کے واسطے انکم ٹیکس کے حصہ کو ادا کرنا ملتوی کر سکتی ہے۔ پھر ایک اور بھی شرط لگا دی گئی ہے۔ جس سے صوبوں کو انکم ٹیکس سے حصہ ملنا غیر متیقن ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انکم ٹیکس اور ریلوے کی آمدنی کو باہم منسلک کر دیا گیا ہے۔ جب تک انکم ٹیکس کے حصہ اور ریلوے کی آمدنی دونوں کو ملا کر حکومت کو ۱۳ کروڑ روپیہ حاصل نہ ہوں گے۔ اس وقت تک صوبوں کو انکم ٹیکس سے حصہ نہ دیا جائے گا۔

صوبوں کی امداد کچھ صوبوں کے لیے سر آٹو نیمیر نے تجویز کیا کہ صوبائی خود مختاری کے شروع ہوتے ہی انھیں فوری امداد دی جائے کچھ امداد تو نقد کی صورت دی جائے کچھ اس قرضہ کو معاف کر کے جو اپریل ۱۹۳۶ء سے پہلے پہلے لیا گیا ہو۔ اور کچھ جوٹ ٹیکس میں سے ۱۲ ½ فی صدی اور زائد رقم نکال کر تقسیم کرنے سے

چنانچہ بنگال، بہار، آسام، سرحدی صوبہ اور اڑیسہ کا کل قرضہ معاف کر دیا گیا اور صوبہ متوسط میں ۱۹۳۶ء سے قبل کا تمام بقیہ قرضہ اور ۱۹۳۱ء سے قبل کے قرضہ کا تقریباً دو کروڑ روپیہ معاف کر دیا گیا۔

سالانہ نقد امداد حسب ذیل مقرر کی گئی۔ ممالک متحدہ پانچ سال تک پچیس لاکھ۔ آسام تیس لاکھ، اڑیسہ چالیس لاکھ سرحدی صوبہ ایک کروڑ جس پر پانچ سال کے بعد مزید غور کیا جائے گا۔ سندھ ایک کروڑ پانچ لاکھ جسے دس سال کی مدت میں آہستہ آہستہ کم کر دیا جائے گا۔

جس سالانہ امداد کو سرآٹو نے مقصد قرار دیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

بنگال	۷۵ لاکھ
بہار	۲۵ "
صوبہ متوسط	۱۵ "
آسام	۴۵ "
سرحدی صوبہ	۱۱۰ "
اڑیسہ	۵۰ "
سندھ	۱۰۵ "
صوبجات متحدہ	۲۵ "

مرکز پر اس کی وجہ سے ایک کروڑ ۹۲ لاکھ روپیہ سالانہ کا مزید خرچ بڑھ گیا ہے۔
اس کے علاوہ اڑیسہ کو ۱۵ لاکھ اور سندھ کو ۵ لاکھ بالمقطع دے دیئے جائیں گے۔
انکم ٹیکس میں سے صوبوں کو حسب ذیل تناسب کے ساتھ حصّہ ملے گا۔
مدراس ۱۵، بمبئی ۲۰، بنگال ۲۰، یو۔پی ۱۵، پنجاب ۸، بہار ۱۰، سی۔پی ۵، آسام ۲، سرحدی صوبہ ایک، اڑیسہ ۲، اور سندھ ۲،

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا مرکز اس زاید خرچ کو برداشت کر سکے گا یا نہیں سرآٹو نے بیان کیا کہ ان دو کروڑ روپیہ سالانہ کے علاوہ برما کے علیحدہ ہو جانے سے مرکزی حکومت کو پونے تین کروڑ کا اور بھی خسارہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اس لئے اگر مرکزی حکومت کو اس تمام خسارہ کو فوراً صرف ایک سال کے مالی: سال سے ۳۷-۱۹۳۶ء میں برداشت کرنا پڑتا تو بجٹ کی تیاری کا مسئلہ ایک ناقابل حل معمہ بن جائے۔ لیکن خوش قسمتی سے ۳۶-۱۹۳۵ء کی متوقع توفیر کی وجہ سے امداد کے سلسلہ کو ۴۳-۱۹۳۷ء سے ہی شروع کرنا ممکن ہوگیا ہے اور اس کے بعد کے سالوں کے لئے اعتماد کے ساتھ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ مرکزی حکومت کے وسائل کی ترقی میں کوئی خاص وقت واقع نہیں ہوگی لیکن اخفائے حقیقت ہوگا اگر یہ بات بھی صاف صاف بیان نہ کر دی جائے کہ آئندہ چند سالوں میں محاصل کے بوجھ میں کسی تخفیف کا امکان سوائے اس صورت کے کہ معاشی حالات میں توقع سے زیادہ بہتری پیدا ہو جائے بہت کم نظر آتا ہے۔

ان تمام واقعات کے پیش نظر سرآٹو اس نتیجہ پر پہنچے کہ دستور ہند کے حصہ سوم (یعنی صوبائی خودمختاری) کو ایک سال کے بعد شروع کیا جا سکتا ہے۔

نیمیر رپورٹ پر اعتراضات نیمیر رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہندوستان میں اس پر ہر طرف سے خوب لے دے کی گئی سوائے صوبہ متوسط کے اور صوبوں نے اس کی تجویزوں پر اعتراضات کیئے اور ان کے ساتھ جو برا سلوک کیا گیا تھا اس کے خلاف سکریٹری آف اسٹیٹ سے احتجاج کیا۔ صوبوں کی شکایات میں بڑی نفسانفسی کی کیفیت پائی جاتی تھی ہر صوبہ اپنے مطالبہ کو سب سے زیادہ ضروری اور جائز سمجھتا تھا اور مرکز سے زیادہ امداد کا طلبگار تھا۔ اور دوسری طرف حکومت ہند نے جو مراسلہ بھیجا اس میں یہ بتلایا گیا کہ اگر نیمیر رپورٹ کی فیاضانہ تجاویز کے مطابق صوبوں کی امداد کی گئی تو اس کے وسائل بہت تنگ اور ناکافی ہوجائیں گے۔ لیکن لارڈ زٹیلینڈ نے اپنے مراسلہ مورخہ ۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں حکومت ہند کو مطلع کیا کہ ملک معظم کی حکومت نے سر آٹو نیمیر کی تجاویز کو تمام و کمال قبول کرلیا ہے۔

اب سر آٹو کی رپورٹ کو سکریٹری آف اسٹیٹ اور حکومت ہند ایک ثالثی فیصلہ کے نام سے تعبیر کرتی ہیں اور جیسا کہ ثالثی فیصلوں کا قاعدہ ہے اس فیصلہ سے کوئی فریق مطمئن نہیں ہے۔ ہر فریق یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس فیصلہ سے نقصان ہوا ہے۔ متصادم اغراض و مقاصد اور مطالبات کے ہوتے ہوئے کسی ایسے فیصلے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی جو سب کے لئے یکساں طور پر پسندیدہ ہو۔

بعض صوبوں کو خاص طور پر شکایت ہے۔ مثلاً اڑیسہ کو یہ شکایت ہے کہ سندھ کو تو ایک کروڑ ۵ لاکھ روپیہ دیا گیا اور مجھے صرف ۵۰ لاکھ۔ صوبوں کے استحقاق کو سامنے نہیں رکھا گیا بلکہ ان کی ضرورتوں کا خیال کیا گیا۔ جن صوبوں نے اپنی مالی حالت کو کفایت شعاری اور قابلیت سے درست حالت میں رکھا تھا وہ سب سے زیادہ نقصان میں رہے اور جو فضول خرچ اور نااہل تھے وہ بڑے مزے میں ہیں۔ مثلاً بمبئی کو یہ شکایت ہے کہ مسٹن کے غیر منصفانہ فیصلہ کی وجہ سے سولہ سال تک جس تکلیف دہ کفایت شعاری سے ہم کو کام کرنا پڑا اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ چونکہ ۲۵ فیصدی انکم ٹیکس بمبئی سے وصول کیا جاتا ہے اور بمبئی کو اپنی صنعتی آبادی کے لئے بہت خرچ کرنا پڑتا ہے اس لئے انکم ٹیکس میں سے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے تھا۔ یہ صوبہ اپنا مقابلہ بنگال سے کرتا ہے جس نے اپنے میزانیہ میں توازن پیدا کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اسی طرح اور بھی صوبوں کو شکایتیں ہیں۔ پھر سب مل کر مرکزی حکومت سے شکایت کرتے ہیں کہ مرکزی حکومت کا خرچ بہت زیادہ ہے خصوصاً فوج کے محکمہ کا خرچ۔ مرکزی حکومت کو اپنے محکموں کا خرچ کم کرکے صوبوں کو قومی تعمیر کے کاموں کے لئے روپیہ دینا چاہئے۔

غرضکہ یہ شکایتیں اور چپقلیں ہیں جنکا مطالعہ بہت دلچسپ ہے اور غالباً انہی کا مظاہرہ فائنس منسٹروں کی کانفرنس میں بھی کیا گیا ہوگا۔

سنہ ۱۹۳۶ء کا ریلوے بجٹ۔ گذشتہ سال ہندوستان کی ریلوں کے لئے بڑے صبر آزما تھے۔ اس دور میں جس

قدر خسارہ سرکاری ریلوں کو اٹھانا پڑا اس کی مثال ہماری تاریخ ریلوے میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس خسارہ کی عظمت کا اندازہ ساڑھے کروڑ کی اس کثیر رقم سے کیا جاسکتا ہے جو ابتک سرکاری ریلوں پر واجب الادا ہے اور جس کے ادا ہونے کی کوئی صورت مستقبل قریب میں نظر نہیں آتی۔ پھر بھی وزیر کامرس سر ظفر اللہ خاں کے اعلان نے جو گذشتہ بجٹ کے موقع پر انہوں نے کیا تھا، امید کی کرن چمکادی جب تقلیل اخراجات کا مرحلہ درپیش تھا، اور تخفیف ملازمان کی تیاریاں کی جارہی تھیں وہاں ساڑھے چار کروڑ منافع کی پیشگوئی نے تن مردہ میں گویا جان ڈالدی۔ اخراجات کی محدود راہیں کھل گئیں۔ حکومت کی طرف سے ایک فیصدی حصے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ملازمین اجرت میں اضافہ کی امیدیں کرنے لگے۔ اور بیکاروں کے لئے اسامیاں قائم ہونے لگیں۔ غرض کہ نفع سے زیادہ منصوبوں کا مظاہرہ ہوا لیکن حقیقت حال کی طرف توجہ کیجائے تو معلوم ہوگا کہ سال رواں کے اخراجات کا پروگرام پوری دوراندیشی کے ساتھ وضع نہیں کیا گیا تھا اور بعض اہم مدات کو تشنہ چھوڑ کر نسبتاً غیر ضروری مصارف عمل میں لائے جارہے تھے۔

اس موقع پر سرکاری ریلوں کے اخراجات اور آمدنی کو قدرے وضاحت کیساتھ پیش کردینا نامناسب نہ ہوگا۔ ۱۹۳۶ء کے ابتدائی چھ مہینوں میں (یعنی اپریل تا ستمبر) مسافروں سے حاصل کی ہوئی مجموعی آمدنی بمقابلہ سال گذشتہ کے (انھیں مہینوں کے) بہت بہتر تھی لیکن اکتوبر ۱۹۳۶ء میں یہ نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ ۱۹۳۶-۳۷ء کے جو اعداد اسوقت پیش نظر ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال سرکاری ریلوں میں مسافروں اور مال کی مجموعی آمدنی ۳¾ کروڑ بڑھ گئی ہے اور برخلاف اسکے ریل چلانے کے اخراجات میں ٹوٹ پھوٹ اور مرمت کی مدیں بمقابلہ سال گذشتہ کے ۷۰ لاکھ کی کمی واقع ہوئی ہے۔ اسیطرح رقوم سود کی مد بھی قریب ۵۰ ہزار کے کم ادا کرنے پڑے ہیں۔ الغرض جملہ حسابات کے بعد ریلوے کی خالص آمدنی میں بمقابلہ سال گذشتہ اس سال ۴½ کروڑ کا منافع رہا ہے۔ لیکن یہ نفع امید افزا ہونے کے باوجود اسقدر قابل اطمینان نہیں کہ ترقی آمدنی کی آئندہ کوششیں معرض التوا میں ڈال دی جائیں۔

اس لئے ویج وڈ کمیٹی کو دعوت دی گئی کہ وہ ریلوے کے تمام کارخانوں کا معائنہ کریں اور اخراجات کو کم کرنیکی تدبیریں بتادیں۔

اس میں شک نہیں کہ ریلوے (اور خصوصاً سرکاری ریلوے) کارخانوں پر ضرورت سے زیادہ رقم صرف کر رہی ہے۔ اگر سامان ریل تیار کرنیکی مشینوں اور کارخانوں کے اخراجات میں کمی کی جاسکے تو یقین ہے کہ مسافروں کے راحت وآرام کا زیادہ خیال ممکن ہوگا لیکن عام لوگ جو مشینوں کے ماہر نہیں ہیں اس مسئلہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتے پھر بھی جستہ جستہ مثالوں سے یہ اندازہ لگالینا ناممکن نہیں ہے کہ ریلوے کے کارخانوں میں تخفیف اخراجات کی بڑی گنجائش ہے۔ تجربے کے لئے کوئی چھوٹا سا پرزہ ریلوے کے کسی کارخانے سے تیار کرائیے اور اس کی قیمت کا مقابلہ کسی دوسرے کارخانے کے تیار کردہ اسی پرزہ سے کیجئے۔ یقیناً دوگنے اور تگنے سے زیادہ کا فرق پایا جائے گا۔ ایسی صورت میں ویج وڈ کمیٹی کا مشورہ قابل قدر ہونا چاہئے تھا لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اس کمیٹی کی جولانگاہ ریلوے کے کارخانوں ہی تک محدود ہی نہ رہی۔ اسلئے جو رپورٹ انہوں نے حال میں شائع کی ہے اس میں کارخانوں کے علاوہ دیگر مختلف موضوع پر بھی بحث کی ہے۔ حکومت ہند اور عام پبلک ویج وڈ کی ان سفارشوں پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جن کا اثر ملک کی مالیات پر پڑنے والا ہے لیکن درحقیقت اخراجات کے کسی خاص شعبے پر بحث کرتے ہوئے ہم اکثر غیر متعلق شعبوں کو بھی فراموش نہیں کرسکتے کیونکہ بہر حال ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا لازمی ہے اور خصوصاً جبکہ ہماری موجودہ آمدنی کی

ترقی نے ابھی تک قابل اطمینان صورت اختیار نہیں کی ہے اس لئے ووڈ کمیٹی بھی تنظیم اخراجات پر سفارش کرے گی۔ وہ کارخانوں کے علاوہ اخراجات کی دیگر مدوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ووڈ کمیٹی کی تمام سفارشوں کو آنکھ بند کر کے منظور کر لیا جائے لیکن ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ریلوے کی آمدنی کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ریلوے کے کارخانوں کی کارکردگی میں بھی کمی نہ واقع ہو اور قرض اور دیگر واجب الادا رقموں کا بار بھی جلد سے جلد ریلوے کے سر سے اتر جائے۔

واجب الادا رقموں کا انتظام اس وقت تیس کروڑ چوہتر ہزار کی کثیر رقم تقسیم مالیات کے معاہدے کی رو سے سرکاری ریلوں پر حکومت ہند کے حق میں واجب الادا ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے کے خسارہ کی رقم جو بذریعہ قرض پوری کی گئی تھی۔ اکتیس کروڑ چونتیس لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساڑھے چار کروڑ کا منافع ساٹھ کروڑ کے عظیم الشان قرض کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے اور منتظمین ریلوے نے اس رقم کو ادا کرنے کی کیا تدبیر سوچی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ حکومت ریلوے کو ساٹھ کروڑ کی چھوٹ دیدے تاکہ ریلوے کے اخراجات کی از سر نو تنظیم کی جاسکے؟ اس مسئلے پر جو مباحثے مرکزی مجلس قانون ساز میں ابتک ہوئے ان سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت ایسی کثیر رقم کو ہاتھ سے جانے نہ دے گی۔ اب دوسری صورت سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ التوا کی درخواست کی جائے اور ادائیگی رقم کے لئے ۱۹۴۳ء تک مہلت حاصل کی جائے۔ ہونے کو تو یہ درخواست منظور ہو گئی لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ۱۹۴۳ء میں اتنی کثیر رقم کی ادائیگی کیونکر ممکن ہوگی۔ خصوصاً جبکہ اس سال کے ریلوے بجٹ میں اس کے لئے کوئی رقم محفوظ نہیں رکھی گئی ہے۔

حالات سفر میں ترقی شاید اس موقع پر یہ کہا جائے کہ حالات سفر کو مزید اخراجات سے اس طرح بہتر بنایا جاوے گا کہ زاید آمدنی میں ایک معتدبہ رقم کا اضافہ ہو سکے۔ اب ایک نظر بعض ان اخراجات پر ڈالئے جو مسافروں کی تعداد اور ان سے حاصل کی ہوئی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے عمل میں لائے جارہے ہیں۔ ایک بہت بڑی رقم اول درجے کے ڈبوں کو نئے طریقے سے تعمیر کرنے میں صرف کی جارہی ہے تاکہ انکو موسمی اختلافات سے محفوظ کر دیا جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان ڈبوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ اول تو اول درجہ کے مسافر یوں بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ اس پر ان ڈبوں میں سفر کے مزید اخراجات برداشت کرنیوالے اتنے مسافر کہاں مل سکیں گے جن سے ریلوے کی خالص آمدنی میں کسی خاص ترقی کی امید کی جاسکے۔ اسی طرح نئی چند آسامیاں بھی قائم کی گئی ہیں جنکا مطلب شائد ریلوے کی کارکردگی کو بڑھانا ہوگا۔ یہی صورت مختلف دیگر تجاویز کی بھی ہے جو زیادہ تر مرمت اور معمولی تعمیرات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فروعی تدابیر مسافروں کے تکلیفوں کا حل نہیں ہوسکتیں اور اگر ان کی مصیبتوں کا ازالہ نہ کیا گیا تو آمدنی میں اضافہ ہونا بھی محال ہے۔ موجودہ ریلوے ٹائم ٹیبل پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ریلوں کی تعداد میں کمی اور کرایوں میں زیادتی کر دی گئی ہے۔ کیا ماہرین ریلوے اس تدبیر کو معاشی سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس صورت سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے گا۔ مسافروں میں آمدنی کا سب سے بڑا عنصر تیسرا درجہ ہے۔ آج کئی سال کا زمانہ گذرا جب سے یہ وعدہ کیا جارہا ہے کہ اس درجے کے مسافروں کے لئے نئے قسم کے آرامدہ ڈبے تیار کئے جائینگے

اور کبھی کبھی یہ خبر بھی کانوں تک آتی ہے کہ اس قسم کے ڈبہ کا معائنہ ریلوے ممبر یا ریلوے بورڈ کے کسی ممبر نے دہلی میں
کیا ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا دن آئے گا جب تیسرے درجہ کے مسافر اس نئے ڈبے سے مستفید ہونگے
ریل سڑک۔ ہوا اور پانی کا مقابلہ شاید اس وقت تک ہماری ریلیں یہ سمجھ رہی ہیں کہ آمد و رفت کے میدان میں ان کا
مدمقابل کوئی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو انھیں معلوم ہو جانا چاہئیے کہ سڑک اور ہوا کا مقابلہ بہت جلد ناقابلِ برداشت
طاقت حاصل کرنے والا ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں پروازی کی گنجائش دنیا کے ہر ملک سے زیادہ امید افزا
اور ریلوں کے لئے ہمت شکن ہے۔ اس کے علاوہ ریل کی متوازی سڑکیں دن بدن مقابلہ کو شدید بنا رہی ہیں
ایسی صورت میں اگر اونچے درجہ کے مسافروں اور خاص قسم کے ضائع ہو جانے والے سامان تجارت ہوائی جہاز اچک
لیں اور تیسرے درجے کے مسافروں پر موٹر لاریاں قابض ہو جائیں تو آخر ریلیں کیا کریں گی؟

گذشتہ سال کے ریلوے بجٹ میں ان حالات کو پس پشت ڈال کر مسافروں کی اکثریت کو مطمئن کرنے
کی صورت اختیار نہیں کی گئی تھی اور نہ رقوم واجب الادا کے پورا کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ
فروری کے بجٹ میں ان امور کا کافی خیال رکھا جائے گا ورنہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ریلوے کی آمدنی کم
از کم مسافروں کی جانب سے ضرور گھٹ جائے گی اور اس وقت ریلوے کے پاس کوئی ایسی تدبیر نہ ہوگی جو گذشتہ نقصانات
کی تلافی کر سکے۔

بچوں کی نئی کتابیں

۱۔ لال مرغی باتصویر :۔ عبدالواحد صاحب سندھی نے چھوٹے بچوں کے لئے لال مرغی مینڈک اور خالہ بلی کی اَن بن اور بعد میں پھر دوستی بہت اچھے پیرایہ میں لکھی ہے۔ صفحات ۲۸ قیمت ۲ر

۲۔ چھدّو اور دوسری کہانیاں :۔ اس میں چار بہت دلچسپ کہانیاں ذرا بڑے بچوں کے لئے ہیں چھدّو اور پیا چھوتو محترمہ رقیہ ریحانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ آخری قدم۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب کی۔ اور چوتھی پان کو امتیاز حسین صاحب بی۔ اے (جامعہ) قیمت ۳ر

۳۔ چھوٹا چمتو :۔ از محمد حسین حسان ایڈیٹر پیام تعلیم۔ ایک ننھے منے چوہے کی شوخی اور شرارت کی دلچسپ کہانی بہت اچھی ہے۔ قیمت ۲ر

۴۔ انعامی مقابلہ :۔ از محمد حسین حسان ایڈیٹر پیام تعلیم۔ بڑے مزے کی کہانی ہے۔ جیسے تمہارے مدرسے میں ہاکی فٹ بال کرکٹ وغیرہ کے آئے دن مقابلے ہوتے رہتے ہیں اسی طرح میاں الو کے مشورے سے بہت سی چڑیوں نے گھونسلا بنانے کا مقابلہ کیا ہے اور خود الو صاحب جج بنے ہیں۔ جگہ جگہ چڑیوں کی تصویریں بھی ہیں قیمت ۳ر

۵۔ عقاب اور دوسری کہانیاں :۔ یہ ذرا بڑے بچوں کے لئے ہے۔ سب کی سب بہت اچھی اور دلچسپ ابو کی بکری کو ذرا دیکھو جانور بھی غلام رہنا پسند نہیں کرتے تو بھلا انسان کا کیا کہنا۔ بیچاری لڑتے لڑتے آخر میں مرجاتی ہے۔ لیکن غلام رہنا پسند نہیں کرتی۔ قیمت ۴ر

۶۔ پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی :۔ کسان کی کھیتی اور پوری کا نکل بھاگنا، اس کا پیچھا اور کسان کی بیوی اس کے ساتھیوں، خرگوش، لومڑی، اور کتوں میں کسی کے ہاتھ نہ لگنا بہت ہی مزیدار ہے قیمت ۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور

"القریش"

سادات قریش کا اصلاحی مجلہ، چوبیس سال سے بالالتزام امرتسر سے ماہوار شائع ہوتا ہے اور سلطان العلوم اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے ملطفات شاہانہ سے مدارس محروسہ سرکار عالی کے نام جاری ہے۔

القریش، نہایت محنت و عرق ریزی کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے۔ عام دلچسپ و نتیجہ خیز، تاریخی و ادبی مضامین کے ماسوا "بصائر و عبر" پر قابل قدر مقالات، واقعات حاضرہ پر بہترین شذرات اور "تذکرہ برادری" کے زیر عنوان برادری سے متعلقہ تمام امور حسن و خوبی کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں۔

"القریش" کے کہنہ مشق فاضل مدیر کو خدمات جلیلہ کے صلہ میں قوم کی طرف سے "زر نقد کی تھیلی" اور "محسن القوم" کے مفتخر خطاب کی پیشکش القریش کے صوری و معنوی محاسن کا بیّن ثبوت ہے۔ ہر بہی خواہ قوم کا فرض ہے کہ وہ اس کی اعانت سے اپنی قوم کے اصلاحی و ارتقائی امور میں حصہ لے۔

قیمت سالانہ صرف تین روپے

ملنے کا پتہ۔ **مینجر "القریش" شریف گنج امرتسر**

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اُردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم
دہلی

زیر ادارت شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے

عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے (۶)　　ششماہی تین روپے آٹھ آنے (۳/۸)

نمونے کے پرچے کے لئے ۵۔ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

مینیجر کلیم، ۴ جانتی نواس، دریا گنج، دہلی



مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیرادارت:- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۳۰	ستمبر ۱۹۳۸ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۱۔	قومیت و ملیت	"ایک جامعی"	۱۹۳
۲۔	نظم اقبال پر ایک سرسری تنقید	خانصاحب مشتاق علی خاں صاحب رہتک	۲۰۱
۳۔	سخنے چند	جناب جلیل احمد صاحب قدوائی	۲۱۴
۴۔	وفاق ہند	جناب حسن سجانی صاحب متعلم جامعہ	۲۱۵
۵۔	کیفیات	جناب کیف شاہجہانپوری	۲۴۰
۶۔	اسپین کی خانہ جنگی	جناب محب الحسن صاحب بی اے (لندن) امرتسر	۲۴۲
۷۔	دنیا	خواجہ محمد شفیع صاحب دہلی	۲۴۸
۸۔	معاشرتی اصلاح اور قومی ترقی	جناب محمد عرفان صاحب ندوی متعلم جامعہ	۲۵۲
۹۔	غزل	جناب جلیل قدوائی صاحب	۲۶۹
۱۰۔	رفتار عالم (ممالک غیر)	م - م	۲۷۰
۱۱۔	تعلیمی دنیا	جناب عبدالغفور صاحب لکچرر ٹریننگ کالج علیگڈھ	۲۷۷

قومیت اور ملیت

(۲)

(ایک جامعی)

اگست کے "جامعہ" میں آپ نے دیکھا کہ مشرقِ قریب کے اسلامی ملکوں میں قومیت اور ملیت کے تصادم نے کون سی شکل اختیار کی، مصر، شام، عراق اور دوسرے عربی بولنے والے ملک اس بھنور سے آسانی سے نکل گئے، شاید ترکوں اور ایرانیوں کو ابھی اس گرداب میں کچھ دن اور تھپیڑے کھانے پڑیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ترکی اور ایرانی فطرت، قومیت کے مغربی تصور سے ضرور اباکرے گی اور چنگیز و ہلاکو اور کیخسرو و دارا کو محمدؐ (فداہ ابی وامی) اور ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کے مقابلہ میں نیچا دیکھنا ہوگا

حجاز، شام، عراق، ٹیونس اور مراکش کی تمام تر آبادی مسلمان ہے، جو تھوڑے بہت غیر مسلم ہیں وہ بھی تہذیب و تمدن میں مسلمان ہیں، ان کی قومیت عربیت ہے جو سر تا سر اسلام ہے، قومیت کا وہ عنصر جو اسلام سے لگا نہ کھاتا تھا وہ آج سے تیرہ سو برس قبل رسول اللہ صلعم اور ان کے جانشینوں کے ہاتھوں فنا ہو چکا، ان عربوں کی قومی زندگی کے تمام سرچشمے اسلامی ہیں، ادب، شعر، فلسفہ اور تمدن الغرض ماضی کا ہر ورق زریں اسلام کے عہد اقبال کی داستان ہے، راقم سطور کو بغداد میں دارالعلوم نعمانیہ کے شیخ اعلیٰ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دارالعلوم امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر واقع ہے، اور شیخ موصوف کا شمار "قدامت پسند" علما میں ہوتا ہے۔ گفتگو کا موضوع شیعہ اور سنیوں کے اختلافات تھے، شیخ موصوف نے فرمایا کہ "میرا بس چلے تو عراق میں نہ کوئی شیعہ رہنے دوں، اور نہ کوئی سنی، عراق میں بسنے والے سب عراقی ہوں اور بس"، "قومیت اسلام" کے علمبردار اس بات پر ناک بھوں چڑھائیں گے لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ عراقیت میں اسلامیت "سنیت" اور "شیعیت" سے کہیں زیادہ ہے۔

شام و فلسطین میں عیسائی عربوں کی بہت بڑی آبادی ہے، یہ مذہباً عیسائی ہیں لیکن ان کا مزاج عربی ہے، انجیل پڑھتے ہیں لیکن قرآن ازبر یاد کرتے ہیں، حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذکر مبارک سے اپنی روحانی تشنگی بجھاتے ہیں، اور امرالقیس، فرزدق، جریر، متنبی، ابوالعلا معری، شوقی اور حافظ ان کا ذہنی سرمایۂ تسکین ہیں رسول اللہ صلعم ان کی نظر میں زعیم عرب، قرآن عربی زبان کا شاہکار، اور خالدؓ، عمرؓ، عمرو بن عاص اور معاویہ "رجالات عرب" ہیں، ظاہر ہے ان حالات میں مسلم اور غیر مسلم کا تمدنی اختلاف کیسے ہو سکتا ہے۔

مصر میں شروع شروع میں قومیت اور ملیت کا قدرے تصادم ہوا، "مصریت" پر زور دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکمراں طبقے بیشتر غیر مصری یعنی ترک تھے اور یہ مصریوں کو گنواروں (فلاحین) کی قوم کہتے، لیکن جوں ہی متوسط طبقوں کے ہاتھ میں قیادت آئی، "مصریت" کے ساز خاموش ہو گئے، قبطی یعنی مصر کی قدیم عیسائی آبادی کو تمدنی طور پر مسلمان بننے میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ اُن کی زبان عربی ہے، اُن کا ذہنی و ادبی سرمایہ تمام تر عربی ہے، انجیل عربی میں پڑھتے ہیں، اور گرجوں کی مذہبی زبان بھی عربی ہے، حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر سے ان کو کوئی کد نہیں ہو سکتی، عربوں نے مصر کو اپنا غلام نہیں بنایا بلکہ اسے رومیوں کے استبداد سے نجات دی، عرب رومیوں کی طرح مصر کے اجنبی حکمراں نہ تھے۔ وہ وادیٔ نیل میں بس گئے، اور مصریوں کے ساتھ کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ایک مغربی مورخ کی رائے میں فتح کے ایک سو برس بعد مصری اور عربی میں تمیز کرنا مشکل تھا، قبطیوں اور مسلمانوں کے میل کی ایک اور وجہ نکالی گئی، رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک زوجہ محترمہ ماریہ مصری تھیں، اور اُن سے آپ کے فرزند حضرت ابراہیم پیدا ہوئے، قبطی عنصر کا تمدنی طور پر مسلمان اکثریت میں مدغم ہو جانا بالکل فطری چیز ہے۔

ایران اور ترکی میں قومیت کے عناصر ایک حد تک قوی ہیں۔ اسلام سے قبل ایران تہذیب و تمدن میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا اور عربی فتح ایرانی قومیت کی شکست ثابت ہوئی تھی، عباسی عہد میں ایران میں اس کے خلاف ردِّعمل ہوا، لیکن یہ ردِّعمل عربیت کے سراسر انکار تک نہیں پہنچا، ایرانیوں

نے عربی زبان چھوڑ دی لیکن اپنی قومی زبان میں عربی کو بہت نمایاں حیثیت دی، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بنی امیہ سے بگڑے تو آل علی سے عقیدت و شیفتگی بدستور رہی، ان بنیادوں پر ایرانی قومیت کی تشکیل ہوئی۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ ایران "کفرِ عرب" کو کبھی اپنا ایمان بنا لے گا دور از قیاس نظر آتا ہے۔

ترکوں کا "قومی" جوش بہت تازہ ہے، اور اس کو زندہ رکھنے کے لئے ترکوں کی نسلی تاریخ میں کوئی خاص مواد بھی موجود نہیں، مغربیت کا سیل ترکی سے صرف ان خس و خاشاک کو بہا لے جانے میں کامیاب ہوگا جو غلط طور پر اسلامی شعائر سمجھے جاتے تھے، کمالی رہنما لاکھ سر ماریں ان کو نئی قومیت کی تعمیر کے لئے کوئی نیا اساس ملنے کا نہیں، اُن کے مورخ ترکی قوم کی شاندار قدامت کے نت نئے نظریئے گھڑا کریں لیکن اس نظریہ سازی سے نئی ترکی بننے سے رہی، دلوں کی زندگی چند پڑھے لکھوں کی سیاہ اوراق سے بدلا نہیں کرتی، کمالی رَو ایک موسمی چیز ہے، اور اس کو بقا نہیں۔

عالمِ اسلام میں مغربی طریقہ کی قومیتوں کے زوال کے یہ ادبی اسباب ہیں، اِن کے علاوہ بہت سے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی موثرات ہیں جو ان کو باہم ملانے میں بڑا کام کر رہے ہیں۔

اب اس تاریخی پسِ منظر کی روشنی میں ہندوستان کو دیکھئے، مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ محمد بن قاسم سندھ سے آگے نہ بڑھ سکا، محمد ابن قاسم کو حجاج بن یوسف ثقفی والی عراق جس کو بنو امیہ کا اژدہا کہیں تو بے جا نہ ہوگا فرستادہ تھا لیکن اس کے باوجود محمد ابن قاسم نے مفتوح ہندوؤں کے ساتھ غیر معمولی روا داری برتی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے تلوار کی بجائے قرآن کو فتح و تسخیر کا ذریعہ بنایا۔ سندھی جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے، اور سندھ صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بن گیا۔

عربوں کی جگہ وسط ایشیا کے نومہذب اور نومسلم ترکوں نے لی تو اسلام ایک نیا جنم لے چکا تھا، ان سورماؤں نے اسلام کو محض جلالی رنگ میں دیکھا تھا اور اس میں یہ بیچارے اپنی جنگجویانہ فطرت سے مجبور بھی تھے محمد بن قاسم نے نہ سندھ کے باشندوں کے صنم خانے توڑے، اور نہ اُن کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگائی بلکہ سیاسی فتح کے بعد اشاعتِ اسلام سے ان کو اپنایا، چنانچہ سندھ کی سرزمین ایک نئے نور سے چمک اٹھی، اور اس کی تابانیوں سے افق اسلام نے بھی جلا پائی،

محمود غزنوی جو محمد بن قاسم سے تین سو برس بعد ہندوستان پہنچا، اس نے بُت فروشی پر بت شکنی کو ترجیح دی لیکن اس بُت شکنی کا سبب جذبۂ اعلائے کلمۂ حق نہ تھا بلکہ بتوں کا سونا چاندی، اور زر و جواہر تھے، غزنویوں، غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں اور مغلوں نے جہاں کشائی اور جہاں داری سے اپنا کام رکھا، ان کو فرمانبردار رعایا کی ضرورت تھی جو جزیہ و خراج سے ان کے خزانے بھر دیتی، اسلام کی اشاعت اور اس کے فیض سے دوسروں کو نہال و شاداب کرنے کا بار اُنھوں نے کبھی اپنے سر نہ لیا۔

فوجی طبقوں کی عملداری میں کسی ایسے نظامِ سلطنت کا قیام جس کو عامۃ المسلمین کی تائید حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ ہندوستان کا یہ اسلامی دور امیروں کا دور کہلاتا ہے، ہر نیا سلطان اپنے اردگرد امیروں کے گروہ جمع کرتا، سلطان زبردست ہوتا تو امیر اطاعت و فرمانبرداری کا دم بھرتے اور کمزور سلطان ان امیروں کے ہاتھ کٹھ پتلی بن جاتا، پھر ان میں آپس میں جوتیوں میں دال بٹتی، سازشیں ہوتیں، اور آخر خون خرابے تک نوبت پہنچتی، یہ انقلاب کسی نئے سلطان کو اورنگ سلطنت پر جلوہ افروز کرتا، جو اپنے لئے نئے امیر چنتا۔

قطب الدین ایبک تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کی یہ تدبیر کی کہ اپنے غلاموں میں سے بہت سے امیر بنائے ان امیروں کی ایک زندہ مثال التمش ہے، قطب الدین کے لاولد مرنے پر ان امیروں میں آپس میں سرپھٹول ہوئی، اور بہت سے اس ہنگامے کی نذر ہوئے، امیروں کی تباہی نے التمش کا راستہ صاف کر دیا، اس نے اپنے من مانے امیر بنائے، غیاث الدین بلبن کا زمانہ آیا تو اس نے امراء کے متعلق ایک نیا دستور بنایا اور حسب و نسب کی صحت امارت کی شرط اولین قرار پائی، بلبن خاندان کو زوال ہوا تو خلجیوں کا سکہ چلا، علاء الدین خلجی نے امیروں کے ایک بالکل نئے طبقے کی ترتیب دی اور اس کے عہد سلطنت میں ہندی امیروں کا زور ہوا، ان میں سے ملک کافور اور خسرو خاں نے علاء الدین اور اس کے بیٹے قطب الدین کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی وجہ سے نومسلم امراء کے خلاف سخت ردّعمل ہوا اور غیاث الدین اور محمد تغلق نے ان امراء کی بجائے پردیسیوں کو اپنایا، امراء سازی کا یہ سلسلہ مغلوں تک برابر چلتا رہا، آخر میں اکبر اعظم نے اپنی سلطنت کی بنیاد نئے آئین پر رکھی،

طوائف الملوکی کے اس دور میں عوام الناس کو کون پوچھتا تھا ان کا کام تو صرف حکمرانوں کی اطاعت و فرمانبرداری تھا، سیاسی امور میں ان کو کوئی دخل نہ تھا، اور سیاسی انقلابات ان کی نظر میں "خر آمد و گاؤ رفت" کا مضمون تھے، یہ تو کہیئے کہ صوفیوں کے فیوض کی برکتیں ہیں کہ آج ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے ورنہ ہمارے مسلمان سلاطین کا بس چلتا تو وہ جزیہ کی کمی کے خیال سے بنی امیہ کے حکام کی طرح اسلام لانا جرم قرار دیتے اور آج بنگال و پنجاب میں صوبہ متوسط کی طرح مسلمان چار پانچ فیصدی سے زیادہ نہ ہوتے۔ صوفیوں کے حلقوں نے عامۃ الناس کو اسلام سے روشناس کیا۔ اور ان کی مساعی سے ہندوستان میں "قومیت اسلام" کی بُری بھلی جو کچھ بھی ہو بنیاد پڑی؛

اکبر اعظم، افغانوں پر اعتبار نہ کرسکتا تھا، اس کے ہم قوم ترکمانی تخت یا تختہ سے کم پر راضی نہ ہوتے تھے، آخر سلطنت کو استحکام کیسے نصیب ہوتا؟ مجبوراً اس نے اپنے پیشرووں کی طرح سلطنت کے نئے حلیف ڈھونڈے، بیشک عباسیوں نے بنی امیہ کا زور توڑنے کے لئے ایرانیوں کو ملایا لیکن ایرانی مسلمان تھے، برامکہ خاندان کی ہمدردیاں لاکھ ایرانیوں سے ہوں لیکن اُن کی شوکت و اقبال سے اسلام کا آفتاب اقبال چمکا، مامون کی ماں ایرانی الاصل تھی۔ اور ایرانی خون کا مامون کی رگوں میں جوش مارنا فطری تھا لیکن ایرانی اثرات سے سلطنت اسلام کو نقصان کی بجائے نفع پہنچا، اکبر اعظم کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، راجپوتوں کے تقرب نے اسلامی ہند کی عمارت کو وہ صدمہ پہنچایا کہ جس کی تلافی جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب سے بھی نہ ہوسکی، اس بیان سے مقصود اکبر اعظم کی سیاست کو متہم کرنا نہیں، سیاسی ضروریات کے تقاضے خیال پرستی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اکبر راجپوتوں کو ساتھ نہ ملاتا تو مغل اتنی بڑی حکومت بھی قائم نہ کرتے لیکن اس عظمت کی بنیادیں کھوکھلی تھیں، اورنگ زیب کے مرتے ہی یہ سربفلک عمارت دھم سے نیچے آرہی، حکمراں طبقہ کا شیرازہ بکھرا تو سلطنت بے سری فوج کی سی ہوگئی، عامۃ المسلمین سیاسی جھگڑوں سے پہلے ہی کنارہ کش تھے، اس لئے اُن میں کسی سیاسی شعور کا نہ ہونا محل تعجب نہیں ہوسکتا، مسلمانوں کے فوجی طبقوں میں کوئی ملی یا قومی احساس نہ تھا، ان کو مرہٹوں کی فوج میں جگہ ملی تو نمک خواری کا حق ادا کرنا اپنا فرض سمجھا، سکھوں کی

حکومت آئی تو رنجیت سنگھ کے دست و بازو بن کر اپنے مسلمان بھائیوں کا سر کچلنے لگے، جاٹوں کی غارتگری میں اُن کا ساتھ دیا۔ الغرض ابر و باد کے طوفان میں جو حالت ریت کے ذرّوں کی ہو جاتی ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہو گئی۔

۱۸۵۷ء سے پہلے عامۃ المسلمین میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے تھے، وہابی تحریک اس بیداری کا ایک مظہر تھا، اس تحریک کے مخاطب عامۃ المسلمین تھے، اور اس کا ظہور مسلمانوں کے حکمران اور اعلیٰ طبقوں کی عین اخلاقی اور سیاسی موت کے زمانہ میں ہونا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ قدرت ہندوستان سے اسلام کے نئے آفتاب کے طلوع کے سامان فراہم کر رہی تھی اور صد ہزار انجم کا خون ایک نئی سحر کو پیدا کرنے میں لگا ہوا تھا، یہ کہنا کہ اسلام کو مرہٹوں، راجپوتوں اور سکھوں سے انگریزوں نے بچایا ایک اتنا بڑا اتہام ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی، سچ تو یہ ہے کہ انگریزوں نے اسلام کی اٹھتی ہوئی لہر کو دبایا۔ اور پانچ چھ سو برس کے بعد عوام مسلمین میں زندگی کی جو شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اُسے ایک مدت کے لئے ماند کر دیا۔

مسلمانوں کے حکمران اور اعلیٰ طبقے غدر کی نذر ہوئے، اور جو بچ نکلے وہ فرنگی قہر و غضب سے اتنے سہم گئے کہ "حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں" کے نغموں میں قومی خسارے کے صدمہ کا غم غلط کرنے لگے، وہابی تحریک کو بڑی سختی سے کچل دیا گیا۔ اعلیٰ متوسط طبقے علی گڈھ تحریک کے گن گانے لگے، اور حکومت نے ان کو دلکش اور فیض رساں مناصب کی چاٹ لگا دی، اور عوام ملّاؤں، پیروں، سرکار، دولت مدار اور مہاجنوں کا شکار بننے کے لئے چھوڑ دئے گئے، ۱۸۵۷ء سے پہلے عوام مسلمانوں کی بیداری کا یہ حشر ہوا کہ خود وہابی تحریک کے علمبردار نئے حالات سے متاثر ہو گئے، اور مصلحتِ وقت کو مقصودِ اصلی پر ترجیح دینے لگے۔

۱۸۵۷ء سے اب تک ہماری ملی زندگی ایک خلفشار کے عالم سے گذر رہی ہے، حالی کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے ایک مبصر لکھتے ہیں:-

"اس یاس و بے دلی سے حالی کو نجات دینے والا جو شخص تھا، جس نے اس

نازک وقت میں مسلمانوں کی دست گیری کی، سر سید احمد خاں کو اس تدبر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی، انھوں نے دیکھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا اب کوئی مرکز باقی نہیں رہا ہے، اور ان کا انتشار انھیں ہلاکت کی طرف لئے جا رہا ہے، مصلحت شناسی کی نظر سے زمانہ کے رنگ کو پہچان کر انھوں نے ایک طرف تو تمدن و معاشرت کے بکھرے ہوئے اجزا کو "قوم" یا "ملت" کے شیرازہ میں باندھنے کی کوشش کی، اور دوسری طرف حکومت وقت سے جہاں تک اس ذلت و افتادگی کی حالت میں ممکن تھا عزت کے ساتھ مصالحت کرنے کا ڈول ڈالا، جسے آج ان کے موافقین اور مخالفین دونوں اپنی کم نظری سے ابدی وفاداری کا عہد سمجھتے ہیں۔"

سر سید کے خلوص اور حسنِ نیت پر کون شک کر سکتا ہے لیکن ان کا سیاسی تدبر مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید نہ ہوا "ملت" یا "قوم" کے ارکانِ ترکیبی کے انتخاب میں انھوں نے وہی غلطی کی جو ان سے پہلے ہمارے سلاطین کرتے آئے تھے ممکن ہے سر سید مرحوم معذور ہوں، اعلیٰ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کا عوام کو سمجھنا، اور ان کی قیادت کرنا مشکل ہو گا، اُن کے آرزوں سے بھرے ہوئے دل اور بے تاب طبیعت نے انھیں دہلی تحریک کا ہمدرد بنایا لیکن خاندانی وراثت نے انھیں عوام سے ملنے نہ دیا، ان کی سیاست نے اعلیٰ متوسط طبقوں کو ذلت و افتادگی میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پر نازش بے جا کرنا سکھایا، اور ان کی مذہبیت نے عوام اور عوام کے ترجمان علمار کو ان سے بدظن کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۶ء تک علی گڈھ تحریک علی گڈھ کالج کے انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں آلہ کار بنی رہی، اور ہمارے کارواں کے حدی خواں کو بھی علی گڈھ کالج کے طلبہ کو یہ پیام دینا پڑا ؎

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

سرسید کا زمانہ بیت گیا، محمد علی اور آزاد ہماری کشتی کے ناخدا بنے، ۱۹۰۸ سے ۱۹۳۰ کے دور کو ہم محمد علی کا دور کہہ سکتے ہیں، یہ دور ایک مسلسل ہنگامہ ہے، مسلمانوں کی کشتی منجدھار میں سے جا رہی تھی، پرانے ناخداؤں سے نوجوان مایوس ہو چکے تھے، نئے ناخدا بڑی ہمت کے مالک تھے، لیکن طوفان اس بلا کا تھا کہ یہ کشتی ساحلِ امن سے دُور ہی رہی اور ناخدا تھک تھک کر ہمتیں ہار گئے، محمد علی کی ہمت آخر وقت تک نہ ٹوٹی لیکن جان نے رفاقت نہ کی اور موجوں کے ریلے نے کشتی کو پہلے سے بھی زیادہ خطرناک بھنور میں ڈال دیا۔ اب بھانت بھانت کے ملاح ہیں، کوئی کسی کی نہیں سنتا، جو کسی کے جی میں آتا ہے کرتا ہے، حالت نازک سے نازک تر ہو رہی ہے اور کشتی گرداب بلا میں بدستور ہچکولے لگا رہی ہے۔

" مردے از غیب " کی طرف ہر شخص کی آنکھیں لگی ہیں، یہ " مردے از غیب " کب ظاہر ہوگا اور کس نہج پر اپنی سیاست کا ڈول ڈالے گا۔ اس کے متعلق آئندہ پرچہ میں کچھ لکھنے کی جرأت کی جائیگی ۔

نظم اقبالؔ پر ایک سرسری تنقید

(جناب خانصاحب محمد مشتاق علی خاں، رہتک)

اقبال کی نظم نہ شاعری ہے۔ نہ بصیغۂ مبالغہ ساحری۔ جن کا زیر و بم ایک ہنگامی تلاطم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اقوام عالم کے لئے ایک پیام زندگی ہے۔ جسے بانگ سروش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے "شمع اور شاعر" کے مکالمہ میں اقبال خود کہتا ہے۔

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری ہاں سُنا دے محفل ملت کو پیغام سروش

اقبال کی شاعری کو تین حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور مشق سخن کا زمانہ ہے۔ جس میں رنگا رنگ دلاویزیاں موجود ہیں۔ مگر یہاں بھی زندگی اور زندہ دلی کا عنصر غالب اور خودی و خودداری کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن جس چیز نے اقبال کو بین الاقوامی شہرت بخشی۔ وہ اسکی فارسی مثنوی ہے جس میں وہ ایک ہادی برحق اور رہبر کامل کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

ابتدا میں ایک ہی مثنوی مدنظر تھی۔ جس کے متعلق سنہ ۱۹۲۰ء میں علامہ مرحوم نے خود فرمایا تھا۔ کہ اسکی تکمیل کے بعد میں یہ سمجھونگا۔ کہ میرا مقصد زندگی ختم ہو چکا۔ مگر کار فرمائے قضا و قدر کو اقبال سے بہت کام لینا منظور تھا۔ اس لئے بجائے ایک کے دو مثنویاں عالم وجود میں آئیں۔ اور "اسرار خودی" و "رموز بیخودی" کے بعد ہی "پیام مشرق" بھی طلوع ہوا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ جو ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

"اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کا اقبال ایک پختہ کار شاعر، نبض شناس حکیم اور رہبر کامل کے لباس میں جلوہ نما ہوا ہے۔ اسے اسکی شاعری کا دوسرا دَور تصور کرنا چاہئے۔ لیکن "پیام مشرق" سے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جسمیں وہ تمام ممالک مشرقی کی نمایندگی کرتا ہے۔ اور ازاں بعد منازلِ ارتقاطے کرتا کرتا اُس مقام محمود پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے تمام اجزائے کائنات ایک کُل کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

"پیام مشرق" کی اشاعت پر پروفیسر آرنلڈ کا ایک ناقدانہ مضمون کسی انگریزی اخبار میں میری نظر سے گذرا تھا۔ جس میں "پیام مشرق" پر ایک عالمانہ تنقید کی گئی تھی۔ اور بعض اشعار کو انگریزی کا جامہ پہنایا گیا تھا اُس وقت یہ شعر مجھے بہت پسند آیا تھا ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں   خواب را مرگ سبک دان مرگ را خواب گراں

یعنی خواب کیا ہے۔ ایک ہلکی سی موت ! اور مرگ کیا ہے۔ ایک گہرا خواب !!

اس کے علاوہ پروفیسر صاحب نے ان دو شعروں کو بھی اپنی زبان میں نظم کیا تھا ؎

میاسا بزم بر ساحل کہ آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش درآویز   حیات جاوداں اندر ستیز است

ان اشعار کی شانِ نزول یہ ہے۔ کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں جبکہ تحریک خلافت اور کانگریس اپنے شباب پر تھی۔ کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار "جان بل" میں ایک کارٹون شائع ہوا جس میں ایک حسین عورت کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے "مادرِ ہند" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس کے آگے دوسری تصویر تھی جس پر "مسٹر گاندھی" لکھا تھا۔ یہ عورت آنکھیں بند کئے گاندھی جی کے پیچھے تھی۔ اور گاندھی سے آگے سمندر اور چٹان تھی تصور یہ پیش کیا گیا تھا۔ کہ بھارت ماتا اندھا دُھند مہاتما گاندھی جی کے پیچھے لگی ہوئی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کہ یا تو وہ سمندر میں غرق ہو جائے۔ یا چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

اخبار "زمیندار" کے ایک رکن ادارہ نے یہ تصویر علامہ مرحوم کو دکھائی۔ اسے دیکھ کر آپ نے مذکورہ بالا دو شعر موزوں کئے۔ اور فرمایا کہ اسی تصویر کے ساتھ انھیں "زمیندار" میں شائع کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اربابِ ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مگر اُس وقت ہم سمجھے تھے۔ کہ ان شعروں میں صرف ایک ہنگامی کیفیت ہے۔ لیکن جب پروفیسر آرنلڈ کی نظرِ انتخاب نے انھیں اپنی تنقید کے لئے منتخب کیا۔ تو مجھے اس "ہر دم تازہ" کلام کی اہمیت محسوس ہوئی۔ اور آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ویسا ہی محرک و موثر ہے۔

اقبال کی تازہ ترین مطبوعات " بال جبریل " اور " ضرب کلیم " ہیں ۔ جو تیسرے دور کی پختگی کا پتہ دیتی ہیں ۔ جس کی ابتدا " پیام مشرق " سے ہوئی ۔ اب اقبال شاعری یا پیغمبری نہیں ۔ بلکہ تیراندازی کرتا ہے ۔ اور جو کچھ کہتا ہے ۔ بالکل اسی طرح کہہ جاتا ہے ۔ جس طرح کہ وہ خود محسوس کرتا ہے ۔ گویا ایک وارداتِ قلب ہے ۔ اور قال نہیں ۔ بلکہ حال ہے ۔ یا یوں کہیے کہ زبان و قلب کا وصل ہو چکا ہے اس لئے جو بات نکلتی ہے ۔ وہ جذبات کو بھڑکانے اور روح کو گرمانے والی ہے ۔ جسمیں نہ کوئی تمہید ہے نہ تکلف و تصنع ۔ سیدھی بات سیدھے تیر کی طرح دل میں اتر جاتی ہے ۔ اور اب اس کا روئے سخن تمام دنیا اور کل بنی نوع انسان کی طرف ہے ۔

" بالِ جبریل " اور " ضربِ کلیم " میں اقبال نے زندگی اور لوازمِ زندگی ، رازِ حیات اور فلسفہ مرگ کے مسائل حل کئے ہیں ، اقوامِ عالم سے خطاب کیا ہے ، نوجوانوں کو درسِ زندگی دیا ہے ۔ طالب علم اور معلم دونوں کیلئے مشعلِ ہدایت تیار کی ہے ، درویشی و تونگری ، فقر و سلطنت اور سرمایہ داری و مزدوری کی کیفیت کو بے نقاب کیا ہے ۔ جمہوریت کی عقدہ کشائی کی ہے ۔ اور معرکۂ عشق و عقل سے زمینِ شعر کو گلرنگ کیا ہے ۔ غرض کوئی شے نہیں جو یہاں حاضر نہ ہو ۔

طالب علموں اور نوجوانوں کے لئے اقبال کی دعا ہے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے پھر اِن شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

ایک جگہ نوجوانوں کی رگِ ہمت و تدبیر کو یہ کہکر بھڑکایا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

یعنی اگر نوجوان آزادیٔ فکر و ضمیر سے ہمکنار ہو جائیں ۔ تو نظرِ ہمت اتنی بلند ہو جاتی ہے ۔ کہ آسمان کو اپنی زمین تصور کریں ۔

موجودہ مدارس و مکاتب کے خود فراموش اثرات کا رونا ان الفاظ میں رویا ہے ؎

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ

یعنی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہاں خدا پرستی کی بجائے بُت پرستی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر رونا اس بات کا ہے کہ بُتوں کی تراشش نہ آذری ہے۔ نہ برہمنی۔ بلکہ صرف حکّام پرستی اور خود فراموشی کے بُت گھڑے جاتے ہیں۔ جو نوجوانوں کو گھر اور گھاٹ دونوں سے کھو دیتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے ؎

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

"خداوندانِ مکتب" میں مدرس، معلّم، انسپکٹر، ڈائرکٹر اور منسٹر سبھی شامل ہیں۔ اقبال کو ان سب سے یہی شکایت ہے کہ اولادِ آدم کو مفلوج و محکوم بنا دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے بچے تمام عالم کو مسخر کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ بھلا یہ کیا انصاف و دیانت ہے۔ کہ شاہین و عقاب کے بچوں کو زمین پر رینگنا سکھایا جائے۔ اور انسان کے بچوں کو ہر باطل قوت کے آگے سر جھکانے کی تعلیم دی جائے۔

پھر کہتا ہے۔ بلکہ تنبیہ کرتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

یعنی وہ بچہ شاہیں جو گدھوں میں پرورش پا کر بڑا ہوا ہو۔ اُسے شاہبازی کے طریقوں سے کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔ پس یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جن نوجوانوں نے مدرسہ میں غلامی اور محکومی پر قناعت کرنے کی تعلیم پائی ہے اُن سے جہاں بانی اور کارفرمائی کی توقع کی جائے!

مسلم ہندی یا بالفاظ صحیح تر قوم مغل کے لئے اقبال کا فتویٰ یہ ہے ؎

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا ہو تاجِ تیموری

یہ فطرتِ انسانی ہے کہ اگر کسی کی حقیر سے حقیر شے بھی کوئی بزور و قوت لینا چاہے۔ تو وہ اسکی حفاظت میں اپنی جان لڑا دیتا ہے۔ بلکہ پہلے سے تدابیر تحفظ کر لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کی حفاظت و نگہداشت ہی نہ کر سکے تو اس پر قابض و متصرف رہنے کا اہل نہیں۔ اور نا اہل شخص یا افرادِ قوم ہرگز درخورِ اعتبار نہیں۔ اس لئے جو قوم تاج و تخت تیموری جیسی بیش بہا دولت کی حفاظت نہیں کر سکی۔ اس کا کوئی

دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ پس اگر یہ قوم یا کوئی فردِ قوم امارت کا دعویٰ کرے تو اسے بھی تسلیم نہ کرو۔ اور فقر کی دعویٰ دار ہو تو اُسے بھی جھٹلا دو۔ کیونکہ درویشی کی اہل بھی وہی قوم ہو سکتی ہے، جو سلطنت کی اہل ہو۔

"خواجگی" کے عنوان سے اقبال نے چند نہایت بلیغ شعر قلمبند کئے ہیں ؎

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم ... اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور ... سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی ... پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

یعنی دور حاضر اور عہد قدیم میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ اب بھی چند مذہبی اجارہ دار اور چند سیاسی ٹھیکیدار تمام دنیا پر مسلّط ہیں۔ اور انسانی ہمت و تدبیر کو نشوونما سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر اس میں سیاست کے دعویداروں یا خرقہ پوشوں کی قابلیت کو مطلق دخل نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بندگانِ خدا کا اثرِ غلامی قبول کرنا فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ اس لئے پیروں کو مرید اور صاحب اقتدار لوگوں کو فرماں بردار بندے خود بخود مل جاتے ہیں۔ اور کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ اندر سے ٹھوس ہیں۔ یا کھوکھلے۔ بس جس طرح زمانہ قدیم میں خود ساختہ معبودوں اور مفروضہ خالقوں کی پرستش ہوتی تھی۔ اسی طرح اب اکابر و عناصر کی پرستش کی طرف رجحان ہے۔ گویا عوام الناس بلکہ خواص تک کی خوئے غلامی اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ اب اس میں نہ پیری کی کرامت کو دخل ہے۔ نہ میری کی سیاست دانی کو۔ بلکہ لوگ از خود انکی طرف جھکے چلے آتے ہیں۔ بس زمانہ جاہلیت اور زمانہ حال میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

"ہنرورانِ ہند" کے عنوان سے چار شعر اس طرح لکھے ہیں:۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ... ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں ... زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند ... کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ... آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ایک فاضل علوم مشرقی و مغربی اب سے پندرہ بیس سال پیشتر مجھ سے فرمانے لگے۔ کہ جب شیکسپیر سے لوگوں نے کہا کہ تم یاس انگیز افسانوں پر اپنا زورِ طبیعت کیوں نہیں دکھاتے تو اس نے جواب دیا کہ میں اس طرزِ تحریر سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ اسے ایکٹر سٹیج پر نبھا نہیں سکتے۔ شیکسپیر کا یہ قول دہرانے کے بعد وہ صاحب کہنے لگے کہ اگر یاس انگیز افسانوں کا سٹیج پر ادا کرنا دشوار ہے تو ان کا لکھنا دشوار تر ہے پھر یہ کیا بدمذاقی ہے کہ ہندوستانی افسانہ نویس بد انجام افسانے ہی لکھتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ شیکسپیر اور انگلستان کے متعلق تو یہ قول درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی فسانہ نگار نیک انجام افسانے لکھیں تو وہ اس حد تک بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جس حد تک کہ بد انجام افسانوں میں کامیاب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ہندوستانی کی زندگی بجائے خود ایک داستانِ درد ہے۔ اور وہ اپنے حسبِ حال ہی بہتر لکھ سکتا ہے۔ دوسرے غلامی اور محکومی نے بقول اقبالؔ اُسے زن مزاج بنا رکھا ہے۔

اقبالؔ کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے کہ ہندوستانی مفکروں، شاعروں، مصوروں اور سیاست دانوں تک کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ اور سب کے سب تابوت بردوش ہی نظر آتے ہیں۔

"نوبل پرائز" حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر ٹیگور جاپان بھی گئے تھے۔ وہاں آپ ایک مجمع میں اپنی ویدانت بیان کر رہے تھے۔ تو اس وقت ایک جاپانی نے کہا کہ ٹیگور تمہارا فلسفہ ایک مفتوح قوم کا فلسفہ ہے۔ جسے سننے کے لئے ہم ہرگز تیار نہیں۔"

اقبالؔ اس مجہولیت سے نہ صرف ہر ہندوستانی کو بلکہ ہر انسان کو بچانا چاہتا ہے۔ اور فکرِ انسانی کو عقابی پرواز میں دیکھنا چاہتا ہے۔

غلامی اور محکومی سے بچنے کے لئے اقبالؔ یہ نسخہ تجویز کرتا ہے:۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں — زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

انسان کی بیشتر مصیبتیں اور تمام تر کمزوریاں غرض پرستی کے تحت میں آتی ہیں۔ انسان کیوں مادی اور فانی طاقتوں کے آگے جھکتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی غرض مندیاں اُسے مجبور کرتی ہیں۔ ایک انسان کیوں

دوسرے انسان سے ڈرتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی طمع نفسانی قوت مردانگی کو سلب کردیتی ہے ؎

آنچہ شیراں راکند روبہ مزاج
احتیاج است، احتیاج است، احتیاج

اگر انسان حقیر خواہشات نفسانی کو ترک کردے، تو کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔ اور پھر اُسے نہ ڈرنے کی نوبت آئے۔ نہ ڈرانے کی ضرورت باقی رہے۔ اور جب اس کی نیک نیتی میں بے خوفی کا بھی اضافہ ہوجائے تو اُسکا محکوم و مجبور رہنا غیر ممکن ہے۔ بس اپنے دل کو پاک رکھو اور لذت و شہوات کے غلام نہ بنو۔ پھر کوئی دنیاوی طاقت تمھیں غلام نہیں بنا سکتی۔

خدائی اور بندگی کا موازنہ اس طرح کیا ہے:۔

خدائی اہتمام خشک و تر ہے — خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی! استغفراللہ — یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

کسی کام کی ذمہ داری اگر احساس فرض کے ساتھ لی جائے۔ تو وہ ایک بڑی مصیبت اور درد سری ہے۔ اور جتنی بڑی ذمہ داری ہوگی اتنی ہی وبال جان ہوگی۔ اس لئے سب سے بڑی دردسری تمام امور کائنات کی ذمہ داری ہے اور یہ ایسا دردسر ہے کہ خداوند عالم ہی اسے گوارا کرسکتا ہے۔ میں تو اس خدائی اور کارفرمائی کے نام سے بھی کانپتا ہوں، اور اِسے دردسر سے کم نہیں سمجھتا۔ لیکن بندگی اور اطاعت ایک نہایت خوفناک مصیبت ہے۔ جو اس دردسر کے مقابلہ میں دردِ جگر سے کم نہیں۔ اور بہرحال دردِ جگر پر دردِ سر کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ایک اجرائے حکم اور دوسرا تعمیل حکم ہے۔

غالب کا شعر ہے:۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی ایمان رکوع و سجود میں نہیں بلکہ وفاداری کے عہد صادق کا نام ایمان ہے۔ اس لئے جس

برہمن نے تادمِ زیست بُت پرستی کی ہو اور بُت کے قدموں ہی پر جان دیدی ہو۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ مرنے کے بعد اچھے سے اچھا مقام حاصل کرے۔

مگر اقبالؔ کہتا ہے:۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مُسلمانی　　نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

یعنی اگر تپشِ عشق سے غیر مسلم کا دل بھی متاثر ہو تو وہ صاحبِ ایمان ہے۔ لیکن اگر مردِ مسلمان ہزار سجدے کرنے کے باوجود بھی تنگ دل اور تیرہ باطن رہے تو وہ ایمان سے محروم ہے مطلب یہ کہ ایمان صفائی قلب میں ہے ورنہ خالی آرائشِ گفتار اور زینتِ لباس تو مہا پاپ اور سب سے بڑی بے ایمانی ہے۔

پھر کہا ہے:۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے　　لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

یعنی بندۂ مومن کے لئے علم ظاہری کافی نہیں۔ جو بسا اوقات عقلِ انسانی کا سب سے بڑا پردہ بن جاتا ہے۔ اور قوتِ عمل کو بھی سلب کر دیتا ہے۔ بلکہ اس میں عشق کی حرارت بھی ہونی چاہیئے۔ اور منزلِ عشق مقامِ علم سے بہت آگے ہے، اگر بندہ مومن وہاں پہنچ جائے تو لذتِ شوق اور نعمتِ دیدار دونوں سے شاد کام رہتا ہے۔ حالانکہ عام قاعدہ کے مطابق نعمتِ دیدار کے بعد لذتِ شوق فنا ہو جاتی ہے۔ جب علم و عقل کسی کام سے عاجز آجاتے ہیں تو وہاں عشق ہی رہنمائی اور دستگیری کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی مہمیں اسی کی بدولت سر ہوئی ہیں۔ ورنہ عقل بے چاری تو سرنگوں ہو چکی تھی۔ اقبالؔ نے کہا ہے:۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

———— ۶ ————

مخلوقِ خدا کی مصیبتوں کو خالقِ ارض و سما کی جناب میں یوں بیان کیا ہے:۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں　　کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری

جب سب ارکینِ سلطنت اور عہدیدار و اہلکار عیار ہوں ۔ اور خلقِ خدا اِن سے تنگ آکر یہ فیصلہ کرلے کہ ان دنیا داروں کو چھوڑ کر معرفت کے دعویداروں ہی سے دار وئے دل طلب کی جائے ۔ تو یہاں بھی یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ شیخ و برہمن اور صوفی و مُلّا سب عیار و مکار ہیں ۔ اور اب پتہ چلتا ہے کہ شیطان ہر لباس میں جلوہ گر ہے ۔ غرض دیر و حرم سب میں اندھیرا ہے ۔ ایسی حالت میں دنیا کا کیا حال ہو ۔ اور خلقِ خدا کو کون سنبھالے ۔

پھر کہا ہے :۔

رہ و رسمِ حرم نا محرمانہ کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اور بھی سنئے :۔

حق را بسجودے صنماں را بطوافے بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھادو

یعنی یہ دین کے ٹھیکیدار جب خدا کے سامنے جاتے ہیں تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں ۔ اور جب بتوں سے دو چار ہوتے ہیں تو ڈنڈوت کرنے لگتے ہیں ۔ غرض کارسازِ حقیقی اور معبودِ خیالی دونوں سے مکر و فریب کرتے ہیں ۔ اور جب یہ خدا سے نہیں چوکتے تو انسان بیچارہ کو تو کیا بخشتے ۔ اور چونکہ مساجد و منادر اور کلیسا و کنشت ہی ان کی شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کے اڈے ہیں ۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ مسجد اور مندر سب کا تعزیہ ٹھنڈا کر دیا جائے ۔

"مُلّا اور بہشت" کے عنوان سے چند لطیف اشعار قلمبند کئے ہیں ۔ اس قطعہ کا آخری شعر یہ ہے :۔

ہے بدآموزیِ اقوام و ملل کام اس کا اور جنّت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

یعنی مُلّا کی تو زندگی اور دل لگی ہی بدآموزیٔ اقوام و ملل اور بدگوئیٔ خلقِ خدا میں ہے ۔ اور اس عیب جوئی و نکتہ چینی کے بہترین اڈے آج کل کی عبادت گاہیں ہیں ۔ پس اگر تو نے اسے بہشت میں داخل کر دیا تو اس کی زندگی ہی حرام ہو جائیگی ۔ کیونکہ وہاں نہ تو مسجد ہے ۔ جہاں اڈا جما کر یہ سب کو بُرا بھلا کہہ سکے اور نہ کلیسا و کنشت ہیں جنھیں مدمقابل اور حریف قرار دیکر یہ اپنے دل کا بخار نکال سکے ،

پس بہتر یہی ہے کہ اسے جنت سے دور رکھا جائے۔

———— ۷ ————

اقبال نے آزادی، فکر و عمل اور خودی بمعنی خودداری پر کثرت سے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک شعر یہ ہے :-

نہ میں اعجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی   کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

وہ اپنے آپ کو کسی ملک و ملت اور کسی قوم و فرقہ سے منسوب کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ سب ایسی پابندیاں ہیں کہ جذبات خودی و آزادی کو پرورش نہیں ہونے دیتیں۔ نیز ان کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کر رہا ہے۔ اور اولادِ آدم وسعتِ فکر و نظر سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو :-

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا   یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اُسے دینی یا دنیاوی کوئی پابندی گوارا نہیں۔ بلکہ دنیا و عقبیٰ دونوں سے بے نیازی اسکا مسلک آزادی ہے۔

———— ۸ ————

سائنس کی جدید تحقیقات یہ ہے کہ نظر آنے والے ثوابت و سیار سے اوپر اسی قسم کے اور بھی چاند ستارے اور کرّے موجود ہیں۔ غالب کہتا ہے :-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یعنی اگر عرش سے دوسری طرف ہمارا مکان ہوتا تو کیا اچھی بات تھی۔ کیونکہ اس صورت میں ہمارا منظر بلندی ایک اور آسمان اور ثوابت و سیار ہوتے اور نظر آنے والا آسمان ہماری زمین قرار پاتا۔ غالب اگرچہ اور بلندیوں کا تو قائل ہے۔ مگر وہاں تک پہنچنے کے لئے صرف دستِ دعا بلند کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ لیکن اقبال کہتا ہے :-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر!   چمن اور بھی ، آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا   ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یعنی ستاروں سے آگے یقیناً اور جہاں بھی ہیں۔ اور تلاش و تحقیق کے دروازے کھول کر وہاں تک پہنچ جانا ایسا فرض انسانی ہے ۔ جو ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ جس عالمِ رنگ و بو میں تم آباد ہو، مت سمجھو کہ دائرۂ کائنات یہیں ختم ہو گیا بلکہ اس طرح کے بہت سے عالم موجود ہیں۔ جنھیں آباد کیا جاسکتا ہے اور چونکہ تم بنی نوعِ انسان اور اشرف المخلوقات ہو اس لئے تلاش و تحقیق اور عمل پر مصروفیت تمھارا فرض انسانی ہے اگر تم ایک دفعہ احساسِ فرض کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاؤ تو نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کا ابدی سلسلہ قائم ہو سکتا ہے۔

پھر کہتا ہے :-

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا   حیات۔ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یعنی جتنے معلوم مقامات ہیں اُن سب سے آگے غیر معلوم مقامات بھی ہیں ۔جن کا نہ صرف سراغ لگانا بلکہ وہاں تک پہنچ جانا تیرا فرض ہے۔ اور حیات صرف اسی چیز کا نام ہے کہ ہر ساعتِ زندگی میں آگے ہی قدم بڑھتا رہے۔



اقبالؔ بحرِ تصوف کا بھی ایسا غواص ہے کہ زمین کی تہ تک نکال لاتا ہے۔ ذیل کے دو معرکۃ الآرا شعر دیکھنے سے اربابِ ذوق و نظر پر روشن ہو سکتا ہے۔ کہ ترجمانِ حقیقت شاعر کس مقامِ بلند پر متمکن ہے:-

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے   مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے ۔ کیا بتائے ؟   اگر ماہی کہے ۔ دریا کہاں ہے ؟

یعنی سوائے ذاتِ احدیت کے کوئی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہے۔ یہ زمین و آسمان اور

مکان ولامکاں محض اندازِ بیان اور مرگ وزیست صرف حسنِ ادا ہے۔ جن کا وجود اسی وقت تک محسوس ہوتا ہے۔ جب تک تو خود فراموشی میں مبتلا ہے۔ لیکن اگر تیرا قلب حسّاس اور دل درد آشنا ہو۔ تو رازِ حقیقت تجھ پر منکشف ہو سکتا ہے۔ مگر یہ راز سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ اسکی گرہ کشا تیری تخلیقِ خودی ہی ہوسکتی ہے۔ اور خودی تیرے اندر اور تو اصل ذات کے اندر موجود ہے۔ لیکن پھر بھی تو پوچھے۔ کہ کہاں ہے۔ تو یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے ماہی خضرؑ سے سمندر کا پتہ دریافت کرے۔ حالانکہ وہ ہر وقت سمندر ہی میں رہتی ہے۔



اقبال ایک مومنِ خالص کی نظر سے تمام دنیا کو دیکھتا ہے۔ وہ غریبوں اور بیکسوں کو فائز المرام اور مسکینوں محتاجوں کو شادکام دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ بندگانِ خدا کی محکومی و غلامی سے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ بنی نوع انسان کی مظلومی و مجبوری سے اس کے سینہ میں داغ لگ جاتا ہے۔ اور خلق اللہ کی ابتری و بیکسی پر اس کے جگر میں ناسور پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی حقیقی مساوات کا علمبردار ہے جس میں نہ کوئی حاجت مند ہو۔ نہ حاجت روا۔ اور نہ کوئی ڈرنے والا باقی رہے نہ ڈرانے والا۔ اس شریف جذبۂ انسانیت سے متاثر ہو کر اُس نے "فرمانِ خدا" بنام فرشتگان میں اپنے احساسِ قلب کا یوں اظہار کیا ہے:۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے ۔۔۔ کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ۔۔۔ اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے ۔۔۔ بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے ۔۔۔ میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

اقبال کس مقام پر ہے۔ اور کس غزل کی اُسے تلاش ہے، شیخ اور صوفی و مُلّا اس کی نظر

میں کون ہیں، عشق و علم کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک غزل کے چند بصیرت افروز شعر پیش کر کے میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں:-

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی　　ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند　　اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی　　شیخ کہتا ہے کہ "ہے یہ بھی حرام" اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی　　رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے　　علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

لختے چند

(جناب جلیل قدوائی، ایم اے)

(۱)

منائی تھیں دل نے جہاں رنگ رلیاں | محبت کی سونی پڑی ہیں وہ گلیاں
بہت گل محبت کے کُھلا چکے ہیں | بہت کھل رہی ہیں محبت کی کلیاں
ترے حسن کے گرچہ سب طور بدلے | مگر عادتیں وہ نہ تیری بدلیاں[۱]
مقرر ہیں راہیں، معین ہیں رستے | یہ الفت کی وادی ہے تو بچ کر چلیاں
ترا ذکر کیا ہے جلیلؔ عاشقی میں
میاں کوہکن نے بھی ڈھوئی ہیں ڈلیاں

(۲)

اُس بُت کی کشیدگی نہ پوچھو | آنکھوں کی رمیدگی نہ پوچھو
دیدار کو میں ترس گیا ہوں! | اب میری ندیدگی نہ پوچھو
ہے تیر نظر جو دل میں پیوست | کچھ اُس کی خلیدگی نہ پوچھو
حال دل زار حسن کے اُس کی | رنگت کی پریدگی نہ پوچھو!
گلنار ہوئے ہیں جیب و دامن | اشکوں کی چکیدگی نہ پوچھو
حیراں ہوں جلیلؔ رُخ پر اُس کے
ہے ایسی دمیدگی، نہ پوچھو!

[۱] متروک طرز ہے مگر پیاری! ج

وفاق ہند

(از جناب حسن سبحانی صاحب متعلم جامعہ)

قبل اس کے کہ ہندوستان میں وفاقی حکومت کی شان نزول بیان کر کے اسکا ایک عام جایزہ لیا جائے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وفاقی حکومت کی تعریف اور اس کی تھوڑی بہت تاریخ بیان کر دی جائے۔

اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اس طرح مل کر ایک نئی ریاست بنائیں کہ ان کا انفرادی وجود بھی قائم رہے اور اس اتحاد سے جو ریاست بنی ہے اس میں ایک اچھی ریاست کے تمام اوصاف بھی موجود ہوں تو اسے وفاق یا Act of union کہتے ہیں اس تعریف کو سمجھنے کے لئے سیاسی اتحاد کی بعض اور صورتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایک صورت تو دو ریاستوں کے متحد ہونے کی یہ ہے کہ ریاستیں علیحدہ علیحدہ ہوں لیکن ان کا بادشاہ ایک ہی ہو ۱۶۰۲ء میں اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ جیمس ششم انگلستان کا بادشاہ بھی ہو گیا۔ دونوں ریاستوں کا وجود جدا جدا قایم رہا دونوں کے داخلی قانون میں فرق تھا صرف بادشاہ کے ایک ہونے کے باعث خارجی حکمت عملی یکساں تھی۔ یہ صورت ۱۷۰۷ء تک قایم رہی اس کے بعد قانون اتحاد

کی رو کے دونوں ریاستوں نے اپنی انفرادیت کو چھوڑ دیا اور ایک ریاست متحد ہو گئی۔ وفاق کی دوسری صورت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ریاستیں کسی خاص مقصد کے لئے متحد ہو جائیں، ان کی جداگانہ حیثیت قایم رہے لیکن ایک مشترک مقصد کے لئے وہ مشترک ادارے قایم کر لیں ان اداروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ریاستوں کی سعادت قایم رہتی ہے اور اگر وہ چاہیں تو ان مشترک اداروں کو توڑ سکتی ہیں اس اتحاد کو اتحاد جزوی یا Confederation کہیں گے اور یہ وفاق کی ادنیٰ صورت ہے۔ امریکہ میں ۱۷۸۱ء سے ۱۷۸۹ء سوئزرلینڈ میں ۱۸۴۸ء تک اور جرمنی کی ریاستوں میں ۱۸۶۶ء تک اسی قسم کا اتحاد تھا۔

وفاق اتحاد کی ان تمام صورتوں سے مختلف ہے وفاق میں شریک ہونے والی ریاستیں اپنی خود مختاری کا ایک بڑا حصہ قربان کر دیتی ہیں۔ داخلی امور میں کسی قدر اختیارات کو محفوظ رکھ کر باقی تمام اختیارات اس جدید ادارہ کو سپرد کر دیتی ہیں جو ان کے اتحاد سے پیدا ہوتا ہے اور جسے بلحاظ قوت و اقتدار ان سب پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور جو ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے یعنی وفاق میں ریاستوں کی انفرادیت کا کچھ حصہ محفوظ رہتا ہے اور کچھ حصہ اس میں مدغم ہو کر ایک اعلیٰ ریاست کی تشکیل کرتا ہے۔

وفاقی نظام حکومت دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ آج سے دو سو برس پہلے اس کا کہیں وجود نہیں تھا۔ نہ عالم حقیقت میں اور نہ عالم خیال میں۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ فلسفی جو بڑی ریاستوں کو انفرادی آزادی کے لئے خطرناک اور سچی سیاسی زندگی کے لئے ناموزوں سمجھتے تھے چھوٹی ریاستوں کو اتحاد کا سب سے مناسب اور معقول ذریعہ قرار دیتے تھے ان میں بعض نے ایسی ریاستوں کے اتحاد کا خاکہ بھی پیش کیا تھا جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ دنیا کا ایک اتحاد ہونا چاہئے کیوں کہ اس کے سوا انسانیت کو فساد اور جنگ کے عظیم الشان نقصانات سے بچانے کی اور کوئی تدبیر کامیاب ہی نہیں ہو سکتی لیکن ایک ایسے اتحاد اور وفاقی حکومت میں بہت بڑا فرق ہے۔ ریاستیں صرف ایک غرض سے متحد ہوتی ہیں یعنی حفاظت اور اس اتحاد کو مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ اتحاد کا یہ شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔ کوئی ایک ریاست باقی ریاستوں پر غالب نہ آ جائے کسی ریاست کی کمزوری سے غلط فایدہ نہ اٹھایا جائے۔ ایک مجلس یا عدالت قائم کر دی جاتی ہے کہ ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرے اور سب کو معاہدہ اتحاد کا پابند رکھے۔ لیکن یہ سارا فیصلہ صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہر ریاست آزاد اور خود مختار رہ سکے اور یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ اگر کسی ریاست کو اتحاد میں شریک رہنا اپنے مفاد کے خلاف معلوم ہو تو اسے کوئی دستور، کوئی قانون یا ہمدردی اور وفاداری کا کوئی جذبہ علیحدہ ہونے سے روک نہیں سکتا اس کے برخلاف وفاقی حکومت کے تمام ارکین ایک دستور کے ماتحت ہوتے ہیں اور فرماں برداری کے کوئی اختیارات انھیں حاصل نہیں ہوتے ان کے وضع کئے ہوئے قوانین دستور کے خلاف ہوں تو وہ منسوخ سمجھے جاتے ہیں ان کی عدالتوں اور فوج، ان کے مالی اور

تجارتی معاملات پر وفاق کی نظر اور اسکا اثر ہوتا ہے گویا وفاقی نظام میں اراکین وفاق کے علاوہ ایک اند ایسی ریاست وجود میں آجاتی ہے جو تمام اراکین پر حاوی ہوتی ہے اور جس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ اراکین کو دستور کی پابندی اور اپنے احکامات کی تعمیل پر مجبور کر سکے ۔

سیاسی نقطۂ نظر سے وفاقی حکومت اٹھارویں صدی کی پیداوار ہے وفاق کا تجربہ پہلے پہل امریکہ کی نوآبادیوں نے کیا جب کہ وہ برطانوی ریاست سے علیحدہ ہو گئی تھیں اور انھیں خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑا تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ کے بہترین سیاسی مفکروں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک مجلس عامہ، عدالت اور مجلس قانون ساز کو برابر کا رتبہ نہ دیا جائے اور اسی طرح اختیارات کا توازن نہ قایم کیا جائے تب تک قوم آزادی کی صحیح لذت سے آشنا نہیں ہو سکتی ۔ لیکن کامیاب اور کار پرداز جمہوری حکومت کا صرف ایک مثالی نمونہ ان کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ تھا انگلستان کا دستور جس کی وہ نقل نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ انگلستان میں ریاست کی حیثیت مفرد تھی اور امریکہ کی مختلف نوآبادیوں کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی ذات کو کسی ہمہ گر نظام میں بالکل محو کر دیں ۔ اسی سبب سے امریکہ کا پہلا دستور ریاستوں کے اتحاد کا ایک نمونہ تھا مگر چند سال کے تلخ تجربے نے امریکی مفکروں کو یقین دلا دیا کہ صرف ریاستوں کے اتحاد سے کام نہیں چل سکتا اور وہ ایک وفاقی حکومت کی تشکیل میں لگ گئے وہ ان خامیوں سے بخوبی واقف تھے جو وفاقی حکومت میں لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں اور بعد کی تاریخ نے ان اندیشوں کو سچ کر دکھایا امریکہ کی طرح اور ممالک میں بھی وفاقی نظام پر کسی نہ کسی صورت میں عمل ہو رہا امریکہ کے علاوہ جرمنی کا وفاق بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔

جرمن اور امریکہ میں وفاق کے جو تجربات ہوئے انھیں کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی وفاق نشو و نما ہو رہا جو ان سے بہت مختلف ہے اور جو کسی صورت میں وفاقی نظام کے لئے نظیر نہیں قرار دیا جا سکتا، مگر اس سلسلہ میں اسکا ذکر کر دینا ضروری ہے یہ برطانیہ اور اسکی نوآبادیوں کا وفاق ہے اس وفاق کے اراکین اس وقت کینیڈا، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، اسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اور آئرلینڈ ہیں یہ وفاق کسی اصول کے ماتحت نہیں، اسکا مقررہ دستور نہیں بعض اعتبار سے تو وہ ریاستوں کا اتحاد ہے کیوں کہ

اس کے بیشتر اراکین مصلحت کی وجہ سے اس سے علیحدہ نہیں ہوتے مگر اس کی برابر کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ان کے اختیارات روز بروز بڑھتے رہیں دیکھنے میں یہ وفاق ایک مفرد ریاست کی شان رکھتا ہے اس لئے کہ وہ ایک ہی بادشاہ کے زیر نگیں ہے۔

یہاں تک تو وفاق کی تاریخ اور اس کی تھوڑی بہت تعریف بیان کی گئی ہے ذیل کے سطور میں ان خصوصیات کو بیان کیا جائیگا جو دنیا کی تمام وفاقی حکومتوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔

وفاقی حکومت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آئین اساسی یا Constitution کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن کا آئین اساسی تحریری شکل میں نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد بعض روایات پر قایم ہے ان میں چند روایات اتنی قدیم اور اہم ہیں کہ انھوں نے قانون کی شکل اختیار کر لی ہے ان ممالک میں انگلستان کی مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے انگلستان میں آئین سیاسی کسی جگہ لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ فرماں روائی کے سارے کام روایات کے سہارے انجام پاتے ہیں صرف قانونی روایت یہ بن گئی ہے کہ پارلیمنٹ کو تمام اختیارات حاصل ہیں" پارلیمنٹ عورت کو مرد اور مرد کو عورت بنانے کے علاوہ تمام کام کر سکتی ہے" مشہور مقولے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے پارلیمنٹ کے اختیارات کتنے وسیع اور غیر محدود ہوتے ہیں یہ واضح رہے کہ وہ خود اپنے حقوق کو گھٹانے اور بڑھانے کی مجاز ہے اور وہ جو قانون بھی منظور کرلے اس میں کسی قسم کے چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پارلیمنٹ میں بادشاہ کی ذات بھی شامل ہے اور اسی لئے بادشاہ کی منظوری تمام قوانین کو رائج کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کے آئین کے مقابلہ میں تحریری آئین ہوتے ہیں وہ تمام قوانین جو آئین سیاسی کے جزو میں قلمبند ہوتے ہیں اور پھر ان کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ہے دنیا کے اکثر ممالک میں اب تحریری آئین کا رواج ہے۔

آئین اساسی کی صرف اسی نہج پر تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ایک صورت اور بھی ہے وہ یہ کہ آئین اساسی میں تبدیلی کیوں کر ہوتی ہے اگر آئین اساسی میں تبدیلی کا وہی طریقہ ہے جو کسی معمولی قانون بنانے کا ہوتا ہے تو ایسے آئین اساسی کو ترمیم پذیر کہیں گے اور اگر اس میں تبدیلی کسی ایسے خاص طریقے سے ہوتی ہے

جو معمولی قوانین بنانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تو اسے استوار (Rigid) کہیں گے ظاہر ہے کہ استوار سے استوار آئین بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ترمیم ممکن نہو لیکن فرق صرف طریقہ کار کا ہوتا ہے اگرچہ استوار آئین کو بھی بدلنے کا طریقہ آسان بنایا جا سکتا ہے لیکن بالعموم طریقہ اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ آئین اساسی کی تبدیلی کسی فوری جذبہ کے ماتحت عجلت میں نہو سکے۔

وفاق کا آئین مختلف ریاستوں میں سمجھوتہ کا نتیجہ ہوتا ہے وہ اپنی سیادت قربان کرتی ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان امور کے علاوہ جن کا مرکزی حکومت کے اختیار میں ہونا ناگزیر ہے ان کے اختیارات قایم رہیں اور ان اختیارات کو ان کی مرضی کے خلاف کسی عام جوش کے ماتحت نہ چھینا جائے لہذا وفاقی حکومت کا آئین بالعموم تحریری بھی ہوتا ہے اور استوار بھی۔ ممکن ہے کہ آیندہ چل کر اختیارات کے متعلق جھگڑا ہو ایسے مواقع پر تحریری دستاویزوں میں شک و شبہہ کو کم دخل ہوتا ہے ان ہی وجوہ کی بنا پر وفاقی حکومتوں میں آئین اساسی کو ایک مقدس میثاق کا درجہ حاصل ہوتا ہے جس میں ترمیم عجلت کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور جسے نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وفاق ایک متحد ریاست کو تقسیم کرنے کے بعد وجود میں آیا ہے تب بھی تحریری و استوار آئین کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ وفاق میں عدالت کو ایک خاص رتبہ حاصل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے لئے ایک آزاد عدالت کا وجود ناگزیر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ملک میں ایک وقت میں دو حکومتیں قایم ہیں اور ہر شہری دونوں حکومت کا ماتحت ہے تو بعض اوقات مشکلات کا پیش آنا ممکن ہے اس بات کا امکان ہے کہ کسی معاملہ کے سلسلہ میں مقامی و قومی حکومتوں میں اس بات پر نزاع ہو جائے کہ وہ کس سے متعلق ہے ممکن ہے کہ مرکزی یا مقامی مجلس آئین ساز ایک ایسا قانون مرتب کرے جو دوسروں کے حقوق میں دست اندازی کرتا ہو تو ان حالات میں ایک ایسے آزاد ادارہ کی ضرورت ہوتی ہے جو متنازعہ فیہ امور کا قانونی فیصلہ کر سکے یہی سبب ہے کہ وفاقی حکومتوں میں عدالت کو سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے عدالت وفاقی حکومتوں کے درمیان آئین کی پاسبان ہے اسکی دیانت اور آزادی عمل پر حقوق و فرائض کی تفویض کا دارومدار ہے لہذا اسے تمام سیاسی اثرات سے کلی طور پر آزاد رکھا جاتا ہے اور اس پر کسی قسم کی

کوئی پابندی عاید نہیں ہوتی۔ جب تک ایک طاقتور عدالت قایم نہو وفاق کا وجود ہردم خطرہ میں رہتا ہے۔

وفاقی نظام کی تیسری خصوصیت مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق ہے عام طور پر مجالس آئین ساز کے دو ایوان ہوتے ہیں ایک میں براہ راست نمایندگی سے قوم کے نمایندے منتخب ہوتے ہیں جو آبادی کے لحاظ سے چنے جاتے ہیں دوسرے ایوان میں ریاستوں اور صوبوں کے نمایندے ہوتے ہیں۔

وفاق میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ تقسیم اختیارات کا ہے اس لئے کہ ہر وفاق میں شہریوں کو دو حکومتوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے ایک تو مقامی حکومت اور دوسری مرکزی حکومت اس لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں حکومتوں کے اختیارات کو قانوناً بالکل واضح کردیا جائے۔ عام طور پر ان کا تذکرہ آئین سیاسی میں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بعض اختیارات ایسی نوعیت کے ہیں کہ وہ صرف مرکزی حکومت ہی کو سپرد کئے جاسکتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں وفاق بے کار ہے ان میں سے چند کا تذکرہ غالباً بے جا نہو گا۔

(۱) امور خارجہ:- تمام بین الاقوامی معاملات میں وفاق کی حیثیت ایک ریاست کی ہوتی ہے لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ریاست اپنے خارجی امور کو خود ہی طے کرے تاریخ میں کوئی ایسی مثال آپ نہیں پائیں گے کہ جس میں ہر ریاست کو خارجی امور کے سلسلہ میں آزادی عمل حاصل رہی ہو۔ متحدہ طریقہ کار کے لئے ضروری ہے کہ ریاستوں کی خارجی حکمت عملی میں یک جہتی اور یک رنگی ہو اسی لئے امور خارجہ ہمیشہ مرکزی حکومت کو تفویض کئے جاتے ہیں۔

(۲) دوسرا اہم مسئلہ دفاع کا ہے لہذا بحری و بری اور ہوائی افواج پر وفاق کو پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے اس کے بغیر نہ یہ ممکن ہے کہ مرکزی حکومت بین الاقوامی امور میں اختیار و اقتدار کے ساتھ نمایندگی کرے اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہر ریاست پر اپنا دبدبہ قایم رکھ سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ وفاق کا وجود ہی صرف اس طرح قایم رکھ سکتا ہے کہ مرکزی حکومت کی افواج پر پوری نگرانی ہو اور صرف اسی قوت کے بھروسہ پر وہ ہر ریاست کی بغاوت کو فرو اور اگر غیر ممالک سے جنگ کا موقع آئے تو پوری قوت کے ساتھ اس میں شریک ہو سکتی ہے۔

(۳) ایسی خدمات جن کا تمام ملک سے تعلق ہے مثلاً ڈاک خانہ، تار، ٹیلیفون، ریلوے وغیرہ

ان کو اگر ہر ریاست کے سپرد کر دیا جائے تو نظم و نسق قایم رکھنے میں دشواریاں ہوں گی اور اس کے بغیر ملک کو کوئی فایدہ نہ ہوگا اس کے علاوہ ان شعبوں کے ذریعہ مرکزی حکومت کو آمدنی ہوتی ہے جو ضروری کاموں پر خرچ کی جاتی ہے۔

(۴) امور تجارت جو تمام ملک سے متعلق ہوں، تجارتی قوانین، سکہ، اوزان کی یکسانیت سے اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ تجارت کی آسانی اور مفاد کی یگانگت قوم کے تمام اجزا کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیتی ہے ایک بڑی ریاست منڈیوں کی تلاش، تجارتی مراعات کے حصول، تجارتی حقوق کے تحفظ، صنعت و حرفت کی ترقی اور جدید وسائل کے پیدا کرنے میں ہمیشہ زیادہ کامیاب ہوتی ہے یہ مقصد صوبوں یا جزوی ریاستوں کے ذریعہ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔

(۵) امور تجارت کے نام کے ساتھ بینک، وسائل آمد و رفت، سڑکیں، ریلیں، بحری بری اور ہوائی راستوں کی نگرانی کا بھی ذکر آتا ہے یہ بھی مرکزی حکومت کے سپرد ہوتے ہیں کہ ان سے تمتع حاصل کرنے کی صلاحیت صرف ایک بڑی اور منتظم ریاست ہی میں پائی جا سکتی ہے۔

(۶) غیر ملکیوں کے حقوق کا تحفظ، شہری بننے کے قواعد، اقلیتوں کی حفاظت، آبادی سے متعلق دوسرے امور بھی عام طور پر مرکزی حکومت کے سپرد ہونے چاہئیں یہ وہ اختیارات ہیں جو عام طور پر مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا ہونا بھی ممکن نہیں ہے اس لئے کہ ہر وفاق میں تقسیم کی تفصیلات میں فرق ہوتا ہے یہاں پر چند ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے جو کم و بیش تمام وفاقی حکومتوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ امور ایسے ہیں جن کا وفاق کے تمام رقبہ سے تعلق ہے ہر ریاست اور صوبہ کے اختیارات کی فہرست بنانا بہت ہی وقت طلب امر ہے اس لئے کہ ان میں بہت تنوع ہوتا ہے ایسے امور ہمیشہ مرکزی حکومت کے تحت انجام پانے چاہئیں ان میں تنوع کا سبب مقامی حالات میں اختلاف اور تاریخی اثرات ہیں۔ اگر وفاق ایسی صورت میں مرتب ہوا کہ جزوی ریاستوں کو اپنے حقوق سے دست برداری گراں گذرتی تھی تو انھوں نے زیادہ سے زیادہ حقوق جو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھے جا سکتے تھے اپنے لئے محفوظ کر لئے لیکن اگر وفاق

کسی اعلیٰ قوت نے مرتب کیا تو صوبوں اور جزوی ریاستوں کے حقوق کو کم کر دیا اس وفاق کی بہترین مثال ہندوستان کا مجوزہ وفاق ہے۔

حقوق کے تعین کے باوجود ایک حلقہ ایسا رہ جاتا ہے جو اس تعین کی دسترس سے باہر ہوتا ہے انسان ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے جس وقت وفاق مرتب ہوتا ہے اس وقت زندگی کے بہت سے شعبے ظہور پذیر نہیں ہوتے بلکہ بعد میں نمایاں ہوتے ہیں۔ بہت سی صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جو قانون وضع کرنے والوں کے ذہن میں نہیں تھیں ان کو اختیارات باقیہ کہتے ہیں اکثر وفاق ان اختیارات کو جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کر دیتے ہیں بعض وفاق ایسے بھی ہیں جو انھیں مرکزی حکومت کی نگرانی میں رکھتے ہیں لیکن ایسے وفاق کی تعداد کم ہے اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان سے مسئلہ کا خاطر خواہ تصفیہ نہیں ہوتا کیوں کہ یہ کون بتا سکتا ہے کہ آیندہ جو صورت پیش آئے گی اس کی نوعیت کیا ہوگی؟ لیکن اسکا علاج یہ ہے کہ اختیارات کی فہرست میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ ہوتا رہے بعض ممالک میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کو بعض متعین اور بعض غیر متعین امور میں یکساں اختیار دے دئے گئے ہیں وہ اس امید پر کہ جب مناسب ہوگا آیندہ ظہور میں آتے رہیں گے اگر کوئی مسئلہ محض مقامی نوعیت رکھتا ہے تو مرکز اس میں دست اندازی نہیں کرے گا اور اگر اس کی مرکزی حیثیت ہوئی جس کا کہ ملک سے تعلق ہے تو مرکز اس کے متعلق قانون وضع کر دے گا اس صورت میں دستور اساسی میں مذکور ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر جزوی ریاست یا صوبہ کوئی قانون بنائے اور اس مسئلہ پر مرکز بھی قانون وضع کرے تو مرکزی قانون کو تفوق حاصل ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت در پردہ تمام اختیارات باقیہ مرکز کے سپرد کر دیتی ہے۔

وفاقی نظام کی اس مختصر تعریف اور اس کے تاریخی پہلو پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب ہم ہندوستان کے وفاق کا ایک عام جائزہ لیں گے اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ آیا وہ ملک کے مطالبات کو کس درجہ تک پورا کرتا ہے اور ملک کی ہر ترقی پسند سیاسی جماعت اسے قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں؟

۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت ہند نے قرطاس ابیض شایع کیا اس میں وفاق ہند کی تشکیل کی

تجویزیں درج تھیں۔ ان تجویزوں پر غور و خوض کرنے کے لئے دارالعوام اور دارالامرا کے ممبروں کی ایک مشترکہ کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی نے ہندوستان کے اعتدال پسند حضرات سے مشورہ لیا اور تجویزوں پر غور کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی۔ اسی رپورٹ پر جو ماہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پیش کی گئی تھی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء مبنی ہے جدید دستور کے رو سے تاج انگلستان کے ماتحت ایک وفاقی حکومت قائم ہوتی ہے اس میں گورنروں اور چیف کمشنروں کے صوبے اور وہ ریاستیں شامل ہوں گی جو شمولیت پر کسی نہ کسی طرح تیار ہو جائیں۔

جدید دستور کی جن تجویزوں کو آخری طور پر اختیار کرکے قانونی جامہ پہنایا گیا ہے انھیں قبول کرنے کے لئے ملک کا کوئی طبقہ تیار نہیں ہے۔ کانگریس کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ وہ تو نو آبادی طرز حکومت لینے پر بھی راضی نہیں ہے مگر اعتدال پسند، ہندو فرقہ پرست، مسلم فرقہ پرست، ریاستیں غرض کوئی بھی اس دستور سے خوش نہیں ہے حکومت برطانیہ کے مدبروں نے دستور اساسی بنانے کی گذشتہ دس سال میں جتنی کوشش کی ہے ان سب میں خوف اور گھبراہٹ کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہتے اس لئے ایک مرتبہ جس چیز کو ایک ہاتھ سے دیتے ہیں اسے دوسرے ہاتھ سے لے لیتے ہیں بعض نہایت معقول، اعتدال پسند، وقیع اور مستند لوگوں کا خیال ہے کہ نئے دستور کا مسودہ پرانے دستور سے بھی بدتر ہے اور اس دستور سے پرانے دستور ہی پر قناعت بہتر ہے ذیل کی سطور میں وفاق ہند کے خاص خاص پہلو پر نظر ڈالی جائیگی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی مجوزہ وفاق ملک کے لئے کس درجہ ناقابل قبول ہے۔

وفاقی مجلس قانون ساز وفاق ہند کا سب سے دلچسپ پہلو وفاقی مجالس قانون ساز کی ساخت ہے فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کے ۲۵۰ نمائندے ہوں گے اور دیسی ریاستوں کے زیادہ سے زیادہ ۱۲۵ کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہند کے ۱۵۶ نمائندے اور دیسی ریاستوں کے زیادہ سے زیادہ ۱۰۴۔

کونسل آف اسٹیٹ کے انتخاب کا حق جائداد کی بنیاد پر قیود کے ساتھ ہوگا اس لئے صرف دولتمند

زمیندار، سرمایہ دار اور تاجروں کے طبقہ کی اس میں نمایندگی ہوگی اور فیڈرل اسمبلی دوسرے عام باشندگان کی نمایندگی کرے گی دونوں ایوانوں میں برطانوی ہند کی نشستوں کی تقسیم فرقہ وارانہ اصول پر ہوگی ہندو، مسلم، سکھ، ہریجن، عیسائی، انگلو انڈین اور یورپین سب کو جداگانہ انتخاب کا حق ہوگا صنعت و حرفت تجارت پیشہ، مزدور پیشہ اور مستورات کی نمائندگی کے لئے چند نشستیں مخصوص کر دی گئی ہیں۔

فیڈرل اسمبلی کی جملہ نشستوں کی خانہ پُری بالواسطہ طریق انتخاب سے ہوگی یعنی وہ لوگ اس میں آئیں گے جن کا انتخاب صوبہ جاتی مجلس قانون ساز کے اراکین کریں گے اور اس میں ہر فرقہ یا ہر جماعت کے لوگ علیحدہ علیحدہ رائے دیں گے البتہ کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہند کے نمایندوں کا انتخاب براہ راست ان حلقہ ہائے انتخاب سے ہوگا جن میں رائے دہندگی کا حق بہت ہی محدود اور صرف ملکیت و جائداد کی بنیاد پر حاصل ہوگا۔ دیسی ریاستیں خود اپنے نمایندے مقرر کریں گی جن کی نامزدگی والیٔ ریاست کرے گا چہ تصور ریاستوں پر نشستوں کی تقسیم ہر ریاست کی اہمیت اور اس کے مرتبہ کے لحاظ سے کی جائے گی۔

یہاں پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان وفاقی ایوانوں کی ساخت کچھ ایسی رکھی گئی ہے کہ یہ ہندوستان کی تمام رجعت پسند قوتوں کا ایک مرکز بن جائے۔ فرقہ وارانہ اصول پر نشستوں کی تقسیم، فیڈرل اسمبلی کے لئے بالواسطہ انتخاب، کونسل آف اسٹیٹ میں صرف صاحب جائداد طبقوں کی نمایندگی اور پھر دونوں ایوانات میں دیسی ریاستوں کی اتنی کثیر تعداد میں نمایندگی کے صاف معنی یہ ہیں کہ وفاقی مجلس پر ان عناصر کا قبضہ ضروری ہے جو شہنشاہیت کے حامی اور آزادی کے دشمن ہیں۔

نشستوں کی عام فرقہ وارانہ تقسیم "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے زرین اصول کے مطابق کی گئی ہے ہمارے بدقسمت ملک میں حکومت برطانیہ کا یہ کوئی اچھوتا اصول نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس بدنصیب ملک میں برطانوی حکومت کا قیام ہی اس اصول پر منحصر ہے۔ حکومت عمداً فرقہ وارانہ سوالات اٹھاتی ہے اور ضرورت کے وقت ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ سے لڑاتی رہتی ہے چنانچہ یہی نہیں کہ اس دستور میں فرقہ وارانہ تفرقہ اندازیاں کثرت سے موجود ہیں بلکہ انھیں اس طریقے سے داخل

کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کے چند طبقوں میں جو فرقہ وارانہ عداوت موجود ہے وہ اور زیادہ گہرا رنگ اختیار کرلے اس کی وجہ سے یہ بیماری ہندوستان میں اور زیادہ پھیلے گی اور اس طریقے سے مجالس قانون ساز کو فرقہ وارانہ جھگڑوں کے لئے اکھاڑا بنایا جارہا ہے کہ صرف جداگانہ طریق انتخاب کی سازگار فضا میں تمام فرقوں کے رجعت پسند عناصر پھلتے پھولتے ہیں۔

ایوان ادنیٰ یعنی فیڈرل اسمبلی کے لئے بالواسطہ انتخاب اور ایوان اعلیٰ کونسل آف اسٹیٹ کے لئے براہ راست انتخاب کا جو نرالا اور دلچسپ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس میں ایک بڑا مقصد پوشیدہ ہے دنیا کی ساری جمہوریتوں کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ ایوان ادنیٰ کا انتخاب براہ راست عام باشندگان کو کرنا چاہئے جن کی کہ وہ نمائندگی کرتا ہے اور ایوان اعلیٰ کا انتخاب چونکہ وہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے براہ راست کیا جائے یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس میں کسی انتخاب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ "صاحب بہادر" ہندوستان کے جمہور کی رائے سے خوف زدہ ہیں ملک کے دباؤ اور اثر سے کچھ مجبور ہوکر صوبجاتی مجالس قانون ساز میں براہ راست طریقہ انتخاب کا حق دے دیا ہے لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ ملک میں سامراج کی مخالف تحریکوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے وفاقی مجلس کو ہر طرح سے بچایا جائے چنانچہ بالواسطہ طریق انتخاب کا صریح مقصد یہ ہے کہ کانگریس کو فیڈرل اسمبلی پر قبضہ کرنے سے روکا جائے اگر قوم کو براہ راست حق رائے دہندگی دیا جاتا تو فیڈرل اسمبلی میں کانگریس اکثریت میں ہو جاتی لیکن بالواسطہ انتخاب میں کانگریس امیدوار صرف انھیں صوبہ جات سے فیڈرل اسمبلی کے لئے منتخب ہوں گے جہاں صوبہ جاتی مجالس میں کانگریس کی اکثریت ہے یا کم از کم وہ خاصی تعداد میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بالواسطہ طریق انتخاب کا پورا خاکہ اس طور پر بنایا گیا ہے کہ اس ملک کی ہر حریت پسند جماعت کو اعلیٰ مجالس قانون ساز پر غلبہ حاصل کرنے سے روکا جائے۔ ہمارے ملک کے مستقل حقوق قائم رکھنے والے لوگ کونسل آف اسٹیٹ میں داخل ہونے کے بعد فیڈرل اسمبلی کے ترقی خواہ اراکین کی راہ میں مزاحم ہوں گے اسی لئے کونسل آف اسٹیٹ کو بالکل وہی اختیارات قانون سازی اور مالیات حاصل

ہوں گے جو فیڈرل اسمبلی کو دئے گئے ہیں کونسل آف اسٹیٹ جیسے ایوان اعلیٰ کو، جس میں سرمایہ داروں، دولت مندوں، زمینداروں اور بڑے تاجروں کی نمایندگی ہو، ایوان ادنیٰ کے مساوی اختیارات دیا جانا جمہوریت کے اصول کے بالکل خلاف ہے لیکن حکومت ہند ہندوستان کو اپنا دشمن بنانے کے بعد اب یہ چاہتی ہے کہ اس ملک کے مستقل حقوق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ اتحاد قایم کرے اور وہ اس کے لئے تیار ہیں اس لئے کہ خود ان کا وجود بھی برطانوی شہنشاہیت کا رہین منت ہے۔ یہی مقصد تھا جس کو پیش نظر رکھ کر برطانوی پارلیمنٹ کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ دیسی ریاستوں کو وفاق میں غیر معمولی اہمیت دے۔ چنانچہ فیڈرل اسمبلی میں کل نشستوں کی ۳۳ فیصدی دیسی ریاستوں کے قبضہ میں ہوگی اور کونسل آف اسٹیٹ میں ان کی نمایندگی ۴۰ فیصدی ہو جائے گی مجموعی حیثیت سے گویا وفاقی مجلس میں ۴۰۰ اراکین برطانوی ہند کی نمایندگی کریں گے اور ۲۲۹ دیسی ریاستوں کی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات صاف طور سے ظاہر ہے کہ وفاقی مجلس سے یہ بعید ہے کہ وہ ترقی پسند ہو یا قوم کے بلند حوصلوں کا ساتھ دے سکے۔ اس میں رجعت پسند جاگیردار اور فرقہ پرست عناصر کا غلبہ ہوگا جو حکومت کی جماعت سے مل کر ایک جماعت بنالیں گے اور گورنر جنرل اسی جماعت کی مدد کے بھروسہ پر اپنے غیر محدود اور مطلق العنان اختیارات کو قوم کے خلاف استعمال کرے گا۔

وفاقی مجلس کے اختیارات باوجود اس کے وفاقی مجلس میں اکثریت رجعت پسندوں اور محبان حکومت کی ہوگی برطانوی حکومت کو پھر بھی اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر اس جماعت کو مالیات یا قانون سازی کے حقیقی اختیارات دے دئے گئے تو ممکن ہے یہ کبھی مار آستیں ثابت ہو۔ چنانچہ محکمہ فوج اور محکمہ معاملات خارجہ کہ سیاسی حیثیت سے دونوں سب سے زیادہ اہم محکمے ہیں وفاقی مجلس کے حدود اور اثر و اقتدار سے باہر ہوں گے ان محکموں کے متعلق نہ وہ قانون بناسکتی ہے اور نہ ان کے مصارف مقرر کرنے میں وہ کوئی رائے و مشورہ دے سکتی ہے گویا اس کا وجود اور عدم وجود کم از کم ان دو محکموں کے لئے یکساں ہے گورنر جنرل خود محکمہ جات فوج، معاملات خارجہ کا ذمہ دار ہوگا اور ان کی پوری پوری نگرانی کرے گا دوسرے یہ کہ گورنر جنرل کی منظوری بغیر کوئی مسودہ قانون نہیں بن سکتا ظاہر ہے کہ گورنر جنرل صاحب کسی ایسے

مسودہ کو قانون ہی کیوں بننے دیں گے جو ان کی قوم اور حکومت کے مفاد کے خلاف ہو۔ تیسرے یہ کہ گورنر جنرل کی اجازت حاصل کئے بغیر کوئی ایسا بل یا کوئی ترمیم وفاقی مجلس میں قانون نہیں بن سکتی جو

(۱) پارلیمنٹ کے کسی قانون کی کسی دفعہ کو در آنحالیکہ وہ برطانوی ہند پر حاوی ہو مسترد کردے یا اس میں ترمیم کرے یا اس کے منافی ہو۔

(۲) گورنر جنرل کے کسی قانون یا اس کے نافذ کردہ کسی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کو مسترد کردے یا اس میں ترمیم کرے یا اس کے خلاف ہو۔

(۳) یا ان معاملات پر اثر انداز ہو جن کے متعلق گورنر جنرل کو اپنی رائے سے عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہو۔

(۴) محکمہ پولیس کے سپاہی یورپین رعایا کے متعلق ضابطہ فوجداری کو مسترد کردے یا اس میں ترمیم کرے

(۵) ایسے اشخاص پر جو ہندوستان میں نہیں رہتے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ہندوستان میں رہتے ہیں زیادہ شرح سے محصول عاید کرے یا ان کمپنیوں پر نسبتاً زیادہ محصول عاید کرے جن کا انتظام اور اہتمام کلیتاً بیرون ہند میں نہیں ہوتا ہے۔

(۶) یا اثر انداز ہو وفاقی محصول آمدنی کی کسی ایسی رعایت پر جو اس وجہ سے عطا کی گئی ہو کہ اس آمدنی پر مملکت انگلستان میں بھی محصول لگایا جاتا ہے۔

ہندوستان کی فوج اور خارجی تعلقات کے سلسلہ میں وفاقی مجلس قانون ساز کو کسی قسم کی رائے اور مشورہ دینے کا حق نہ ہوگا اور نہ بغیر گورنر جنرل کے اجازت کے کسی اہم معاملہ کے متعلق کوئی قانون بنا سکتی ہے اور جن امور میں وہ کوئی قانون بنا بھی سکتی ہے اسے گورنر جنرل خود اپنی رائے پر عمل کر کے مسترد کر سکتا ہے۔ اور پھر وفاقی مجلس قانون ساز کی بے بسی یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی اپنی آزادی پر دو اور زبردست دستوری پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں اول تو یہ وفاقی جماعت قانون ساز میں وفاقی عدالت یا کسی ہائی کورٹ کے جج کے طرز عمل پر (جو اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں اختیار کیا ہو) بحث نہیں ہو سکے گی دوسرے اگر گورنر جنرل (با اختیار خصوصی) یہ فیصلہ کرے کہ کسی مسودہ قانون پر بحث کرنے یا اس میں ترمیم کئے

جانے سے اسکی مخصوص ذمہ داریوں کی انجام دہی میں (جو قیام امن کے سلسلہ میں اس کے سپرد ہیں) فرق پڑتا ہے تو وہ وفاقی مجلس قانون ساز کو ہدایت کر سکتا ہے کہ اس مسودہ قانون یا اسکی ترمیم کے سلسلہ میں مزید کارروائی نہ کی جائے یا کارروائی شروع ہو چکی ہو تو اسے جاری نہ رکھا جائے۔

اس کے علاوہ گورنر جنرل صدر یا اسپیکر سے مشورہ لئے بغیر اختیار خصوصی سے کام لیتے ہوئے ایسے قاعدے بنا سکتا ہے جن کی پابندی کرنے سے وفاقی جماعت قانون ساز ممبر مندرجہ ذیل باتوں سے محروم رہیں گے:-

(۱) کسی ریاست کے متعلق ایسے سوالات پوچھنا یا ایسے معاملات زیر بحث لانا جن پر وفاقی جماعت قانون ساز کو (اس ریاست کے سلسلہ میں) کوئی قانون بنانے کا اختیار نہیں ہے۔

(۲) گورنر جنرل کی مرضی کے بغیر:-

(۱) ملک معظم یا گورنر جنرل یا کسی بیرونی سلطنت کے تعلقات یا ملک معظم یا گورنر جنرل یا کسی ہندوستانی ریاست کے متعلق سوالات پوچھنا یا ان پر بحث کرنا۔

(۲) قبائلی علاقوں یا خارج از دستور علاقوں کے انتظام کے متعلق سوالات پوچھنا۔

واضح رہے کہ کس خوبی کے ساتھ ہندوستانیوں کو سرحدی شمالی صوبہ کی سیاسیات سے الگ کر دیا گیا ہے گورنمنٹ اہل سرحد پر خواہ کتنی ہی زیادتیاں کیوں نہ کرے یا انہیں غلام بنانے پر کروڑ ہا روپے خرچ کیوں نہ کئے جائیں لیکن بقیہ ہندوستان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے مظلوم بھائیوں کی زبانی ہمدردی بھی کر سکیں۔

(۳) کسی صوبے کے متعلق گورنر جنرل بہ اختیار خصوصی نے جو قدم اٹھایا ہو اسے زیر بحث لانا یا اس پہ سوالات کرنا۔

(۴) کسی والی ریاست یا اس خاندان کے کسی فرد کے ذاتی طرز عمل کو معرض بحث میں لانا یا اس کے متعلق سوالات دریافت کرنا۔

غرض ان قوانین اور پابندیوں سے صاف صاف ظاہر ہے کہ مجلس قانون ساز کو مطلق اختیارات

حاصل نہیں ہیں۔

وفاقی مالیات | امور متعلقہ مالیات پر وفاقی مجلس کے اختیارات اور بھی زیادہ کم ہوں گے سالانہ مصارف، دو حصوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے یعنی (۱) وہ مصارف جو وفاق کی آمدنی سے ادا کئے جائیں گے۔ (۲) وہ مصارف جن کی ادائگی وفاق کی آمدنی میں سے کرنے کی تجویز پیش کی جائے گی اول الذکر کے لئے وفاقی مجلس کی منظوری ضروری نہیں ہے۔ اس میں حسب ذیل مصارف شامل ہیں:۔

(۱) گورنر جنرل کی تنخواہ بھتہ اور اس کے دفتر سے متعلق دیگر مصارف۔

(۲) مطالبات قرض جن کی ذمہ داری وفاق پر ہے۔

(۳) وزرا، اراکین کونسل، مشیر مال، سرکاری وکیل اور چیف کمشنران وغیرہ کی تنخواہیں اور بھتہ۔

(۴) وفاقی عدالت کے ججوں کی تنخواہ، بھتے اور پنشن نیز ہائی کورٹ کے ججوں کی پنشن جو واجب الادا ہو۔

(۵) محکمہ فوج، معاملات خارجہ، اور کلیسا کے مصارف۔

(۶) دیسی ریاستوں کے ساتھ ملک معظم کی طرف سے تعلقات قایم رکھنے کے سلسلہ میں جو مصارف ہوں۔

(۷) اس کے علاوہ اور کوئی مصارف جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ وفاق کی آمدنی سے منظور کرے۔

دوسرے قسم کے مصارف کے لئے جو وفاق کی آمدنی سے تجویز کئے جائیں گے، وفاقی مجلس کی منظوری حاصل کی جائے گی لیکن گورنر جنرل کو چونکہ آخری منظوری کا اختیار ہوگا اس لئے وہ سالانہ میزانیہ میں ایسی رقوم داخل کر سکتا ہے جو وفاقی مجلس نے نامنظور کر دی تھیں یا ان میں کمی کر دی تھی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ میزانیہ کا وہ حصہ جس کے لئے وفاق کی رائے کی ضرورت نہیں ہے وفاق کے کل مصارف کے کم از کم ۸۰ فیصدی پر مشتمل ہے اور پھر بھی باقی ماندہ ۲۰ فیصدی بلکہ اس سے بھی کم پر وفاقی مجلس کو اختیارات کلی نہ حاصل ہوں گے اس لئے کہ گورنر جنرل خود اپنی رائے سے ہر دو ایوانوں کے کسی فیصلہ کو جو مالیات سے متعلق ہو مسترد کر سکتا ہے۔ وفاقی مجلس قانون ساز کی ان مجبوریوں پر نظر ڈالئے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسے ہندوستان کی مالیات میں کچھ دخل نہیں ہے اور وہ دستور کے اس شعبہ میں بھی بے کار اور بے بس ہے۔

تجارت | تجارت کے لحاظ سے تو جدید دستور نے ۱۹۱۹ء کے انتظامات کو ضرور قائم رکھا ہے لیکن دوسرے مالیاتی امور میں اس نے جدید قیود اور پابندیاں وفاقی مجلس پر عاید کردی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم وہ ہیں جو مجلس قانون ساز کو اس قسم کے قوانین منظور کرنے سے باز رکھتی ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ اس ملک میں برطانیہ کی تجارت اور مالیات کے مفاد کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں۔ گورنر جنرل کی دیگر خصوصی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہر اس کارروائی کو روکے جس کے ماتحت ہندوستان میں برطانیہ کے مال کی درآمد کے ساتھ امتیازی یا تعزیری برتاؤ کیا جائے خصوصی ذمہ داریوں کے معاملہ میں گورنر جنرل خود اپنی رائے اور اختیار تمیزی پر عمل کر سکے گا۔ اور جہاں تک اس ذمہ داری کا تعلق محصولات درآمد و برآمد سے ہے اس میں امتیازات خواہ براہ راست کئے جائیں یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں اسکا اطلاق ہو سکے گا اس کی وجہ سے گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ اگر مجلس قانون ساز کے کسی قانون کا منشا برطانوی مال کے مقابلہ میں ہندوستانی مصنوعات کی مدد کرنا ہو تو وہ اسکو مسترد کر سکتا ہے اس دفعہ کے تحت مجلس قانون ساز ہند کی تجارتی پالسی گورنر جنرل کے ارشاد و ہدایت کے مطابق ہوا کرے گی۔

مجلس قانون ساز ہند اس قسم کا کوئی قانون منظور نہیں کر سکتی ہے جس سے کہ برطانوی نژاد اور برطانوی رعایا کے ہندوستان میں داخلہ پر یا ان کے لئے جائداد کی فروخت اور اس پر قبضہ یا سرکاری ملازمت یا کوئی دوسرا مشغلہ تجارت، کاروبار اور دیگر پیشہ اختیار کرنے پر قیود اور پابندیاں عاید ہوں۔ اسکا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس ملک کی معاشی زندگی میں برطانیہ کو جو حقوق اور مراعات حاصل ہیں اسے مجلس قانون ساز ہند معرض بحث میں نہیں لا سکتی۔

وہ برطانوی کمپنیاں جو ہندوستان میں تجارت کر رہی ہیں مجلس قانون ساز کے اثر اور دباؤ سے کلیتاً آزاد ہوں گی اور اس ایکٹ کی دفعہ ۱۱۲ کے مطابق کسی کمپنی کو جو برطانوی قوانین کے تحت قایم ہوئی ہو ہندوستان کے کمپنی ایکٹ پر مجبور نہیں کیا جا سکتا مجلس قانون ساز کو ہرگز اختیار نہ ہوگا کہ اس قسم کی کمپنیوں کو قوانین ہند کے مطابق قایم کرنے کا مطالبہ کرے یا اس کے دفتر کی رجسٹری، اس کے سرمایہ، قومیت مستقل سکونت

یا بود و باش وغیرہ پر یا مجلس نگراں کے اراکین یا حصہ داروں عہدہ داروں، ایجنٹ اور ملازمین پر بھی کوئی پابندی عاید کرے۔

دفعہ ۱۱۲ نے یہ قرار دیا ہے کہ محصولات کے مقابلہ میں برطانوی اور ہندوستانی کمپنیوں کے ساتھ ایک ہی قسم کا برتاؤ کیا جائیگا اور دفعہ ۱۱۴ میں ایک یہ بھی اہم شرط داخل کی گئی ہے کہ ہندوستان میں جو بڑی کمپنیاں قایم ہیں وہ بھی اسی حد تک حکومت کے عطیات امداد، اور اعانت کی مستحق ہوں گی جس طرح کہ ہندوستانی کمپنیاں۔

اخیر میں یہ ایک شرط رکھی گئی ہے (دفعہ ۱۱۵) کہ ممالک برطانیہ کے اندر رجسٹر شدہ کسی جہاز کے ساتھ وفاقی یا صوبہ جاتی قانون کے ذریعہ یا اس کے تحت کوئی ایسا طرز عمل نہیں اختیار کیا جائیگا جس کا اثر خود جہاز یا اس کے مالک افسروں، ملاحوں یا اس کے تجارتی مال واسباب پر پڑے در آنحالیکہ برطانوی ہند کے اندر رجسٹر شدہ جہازوں کے حق میں اس کی وجہ سے کوئی رعایت ہوتی ہو۔

تجارت سے متعلق ان تمام مراعات اور آسانیوں سے جو حکومت برطانیہ نے اہل انگلستان کے لئے روا رکھی ہیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کی صنعت کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھنا چاہتی اور ہندوستانیوں کو لباس اور سامان آرائش کے معاملہ میں بھی مانچسٹر اور لنکا شایر کے تجار اور سرمایہ داروں کا محتاج رکھنا چاہتی ہے۔

ریزرو بنک اور ریلوے | اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی لایق ذکر ہے اور وہ یہ کہ وفاقی مجلس کو ریزرو بنک اور ہندوستانی ریلوں پر بہت کم اثر اور اقتدار حاصل ہوگا اس لئے کہ اس میں برطانوی سرمایہ بہت زیادہ لگا ہوا ہے گورنر جنرل خود اپنی رائے اور تمیز سے ریزو بنک کے گورنر اور ڈپٹی گورنر کا تقرر کر دیگا اور وہی ان کو برخاست بھی کر سکتا ہے اس کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ مرکزی بورڈ کو برطرف کرنے یا بنک کا حساب چکانے کے لئے جو کارروائی چاہے کرے ریلوں کا انتظام اور نگرانی ایک مخصوص جماعت کے سپرد ہوگی جس کا تقرر آئین پارلیمنٹ کے ذریعہ ہوگا اور اسکا نام Federal Railway Authority ہوگا اس جماعت کے لئے اراکین میں سے کم از کم تین اراکین کا تقرر گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوگا اور خصوصی ذمہ داریو

کے سلسلہ میں جو اختیارات گورنر جنرل کو حاصل ہیں ان کا اطلاق ریلوے اتھارٹی پر بھی ہوگا۔

ہندوستان میں برطانیہ کو جو زبردست مستقل حقوق حاصل ہیں انھیں اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر ان آئینی تیور اور پابندیوں کی حقیقی اہمیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ ہندوستان میں برطانیہ کا جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اس کی مجموعی رقم تیرہ ارب روپئے ہوتی ہے سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں برطانوی کمپنیوں کی تعداد جو ہندوستان میں تھیں ۹۱۱ تھی اور وصول شدہ سرمایہ ۱۰ ارب ۸ کرور روپئے تھا ان میں سب سے زیادہ ہم کمپنیاں بنکوں کی ہیں اس کے علاوہ بیمہ کمپنیاں، ریل اور ٹریم، تجارتی و صنعتی کمپنیاں، سن کے کارخانے، چائے کے کمپنیت، اور مختلف دھات کی کانیں ہیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم از کم ۱ ارب ۱۶ کرور روپئے ہر سال برطانوی سرمایہ کے سود یا کمپنیوں کے منافع کی صورت میں ہندوستان سے انگلستان چلے جاتے ہیں ہندوستان کی بحری تجارت کا بہت بڑا حصہ برطانوی جہازوں پر جاتا ہے بحری تجارت میں ہندوستانی جہازوں کا حصہ مشکل سے ۲ فیصدی ہے اور ساحلی تجارت پر تقریباً ۵ فیصدی۔

یہ تجارتی اور صنعتی مراعات اور حقوق رکھنے والے انگریز نہ صرف یہ کہ غریب ہندوستان کے معاشی وسائل پر قابض ہیں بلکہ کھلے طور پر ہندوستانی کمپنیوں اور تاجروں کے خلاف نقصان دہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں اگر ہم اپنے ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان شریف اور تعلیم یافتہ ڈاکوؤں کو جو اپنے فن میں پیشہ ور ڈاکوؤں سے بھی زیادہ ہشیار اور باکمال ہیں اپنے ملک سے نکال دیں کہ اس کے بغیر ملک کی صنعت کا پنپنا نہایت ہی مشکل ہے لیکن اگر آپ جدید دستور پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہیں تو خوش خبری سن لیجئے کہ اس نے ایسی کوئی کارروائی کرنی بالکل ناممکن کر دی ہے جس سے کہ آپ کے غریب ملک کی تجارت کو فروغ ہو اور یہاں کے رہنے والے خوش حال ہو جائیں اگر آپ نے ہندوستان کی صنعت کی امداد و سرپرستی کے لئے کوئی تدبیر اختیار کی تو گورنر جنرل اس کو خلاف قاعدہ قرار دے کر مسترد کر دے گا ہر معاملہ میں اسکا فیصلہ ایک اٹل اور امٹ فیصلہ کا حکم رکھے گا جس میں کسی حجت کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

گورنر جنرل کے اختیارات ہندوستان کے موجودہ دستور میں گورنر جنرل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، بادشاہ وقت کے

نائب ہونے کی حیثیت سے فرماں روائی کے سارے اختیارات اسے بخش دئے گئے ہیں اگر آپ گورنر جنرل کے ہمہ گیر اور غیر محدود اختیارات پر ایک گہری نظر ڈالیں تو وہ ان اختیارات سے کسی طرح کم نہ ثابت ہوں گے جو کسی زمانہ میں ایشیا کے مطلق العنان بادشاہوں کو حاصل ہوا کرتے تھے۔ اگر ہندوستان کے مجوزہ دستور کو آپ جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لاٹ صاحب کو بشرطیکہ خدا آپ کو یہ شرف بخشے، دیکھ لیجئے کہ ایک ذاتِ واحد میں سارا دستور سمٹ کر رہ گیا ہے۔ گورنر جنرل دستور ہند کے نظام شمسی کا وہ آفتاب ہے جس کے گرد سارے سیارے چکر لگاتے ہیں اور وہ اپنی روشنی سے ساری دنیا کو نہ سہی تو کم از کم سارے ہندوستان کو ضرور منور کرتا ہے۔ اس بیان میں شاعرانہ مبالغہ سے نہیں کام لیا گیا ہے بلکہ حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ذیل کے سطور میں آپ کو اس دعوی کا ثبوت ملے گا۔

جدید دستور کا کمال، جسے ہم ہندوستانی جاہل اور تنگ نظر ہونے کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتے ہیں یہ ہے اگر ایک طرف وفاقی مجلسیں کمزور اور بے کار بنادی گئی ہیں تو دوسری طرف تمام اختیارات وائسرائے کے ہاتھ میں دے دئے گئے ہیں پہلی بات تو یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ محکمہ جات فوج، معاملات خارجہ اور مالیات کی نگرانی خود گورنر جنرل بہ نفس نفیس فرمایا کریں گے اور جہاں تک ان محکموں کا تعلق ہے وہ وزیر ہند کو جواب دہ ہوں گے۔ ان اہم ترین محکموں پر کامل اقتدار کے علاوہ انہیں مندرجہ ذیل اختیارات بھی حاصل ہوں گے:-

(۱) اگر ضروری سمجھے تو مجلس قانون ساز کی منظور کردہ مسودہ کو قبول کرنے سے انکار کردے اور اسکو قانون نہ بننے دے۔

(۲) بعض خاص قسم کے قوانین مجلس میں پیش کرنے کے لئے سابقہ منظوری عطا کرنا۔

(۳) کسی مسودہ قانون کو ملک معظم کی منظوری کے لئے روک لینا۔

(۴) مالیات کے متعلق مجلس قانون ساز کے کسی فیصلہ کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کرنا۔

(۵) خاص احکامات یعنی Ordinance کسی وقت بھی جاری کرنا۔

(۶) مجلس قانون ساز کی منظوری بغیر خود گورنر جنرل کے ایکٹ کے نام سے قوانین بنانا۔

(۷) مجلس قانون ساز کی طلبی اور برخاستگی۔

(۸) مجلس قانون ساز کے ہر دو ایوانات کا مشترک اجلاس کرنا۔

(۹) مجلس قانون ساز میں کسی مسئلہ پر بحث روک دینا۔

(۱۰) مجلس قانون ساز کے اختلافِ رائے کے باوجود کوئی کارروائی کرنی۔

(۱۱) ایسی حالت میں کہ آئینی نظامات بالکل موقوف ہو جائیں جملہ اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لینا۔

گورنر جنرل کے اختیارات صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں بلکہ اسے "اختیارات خصوصی" کے نام سے اور بھی کچھ اختیارات دئے گئے ہیں جو مندرجہ بالا اختیارات سے بھی زیادہ دلچسپ اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ اختیارات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہندوستان یا ہندوستان کے کسی حصہ کو بدامنی کا کوئی شدید خطرہ لاحق ہو تو اس کی طرف سے ملک کا تحفظ۔

(۲) وفاقی حکومت کے مالی استحکام اور اس کی ساکھ قایم رکھنے کی ذمہ داری۔

(۳) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ۔

(۴) سرکاری نوکروں کو جو حقوق دئے گئے ہیں ان کے حقوق کا تحفظ اور سرکاری نوکروں کے جایز مفاد کی حفاظت۔

(۵) شعبہ عامہ کے دائرہ عمل میں ان مقاصد کا حاصل کرنا جو امتیازات سے متعلق دفعات میں ظاہر کئے گئے ہیں۔

(۶) برطانوی یا برمی مال سے کوئی امتیازی سلوک روا رکھا جائے تو اسے روکنا۔

(۷) کسی ریاست یا اس کے حکمراں کے حقوق اور وقار کا تحفظ۔

(۸) اس بات کا خیال رکھنا کہ تمیز خصوصی یا انفرادی رائے کے استعمال میں گورنر جنرل کے راستہ میں کوئی روک نہیں ہے۔

دستور میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ جہاں تک گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں کا تعلق ہے وہ اپنے

فرایض کی انجام دہی میں خود انفرادی طور پر فیصلہ کرے گا کہ کیا کارروائی کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ ہر اس معاملہ میں جس کا تعلق گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری سے ہے اس کا فیصلہ آخری سمجھا جائیگا اور اس قسم کے فیصلہ کے حجت کے متعلق اس بنا پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے گا کہ اسے اپنے شخصی فیصلہ سے کام لینا چاہئے تھا یا نہیں ان تمام معاملات میں جس کا تعلق اس کی خصوصی ذمہ داریوں سے ہے وزیر ہند گورنر جنرل کی نگرانی کیا کرے گا۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے اور بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ خصوصی ذمہ داریاں اس قدر مختلف النوع ہیں اور ان میں اتنی لوچ اور وسعت رکھی گئی ہے کہ گورنر جنرل ہر وقت مجلس قانون ساز کی رائے کو پس پشت ڈال کر کسی ایک تدبیر سے کام نکال سکتا ہے۔

خصوصی ذمہ داریوں کی اصل اہمیت اور ان کے ہمہ گیر اثر کو ہمیں نہ بھولنا چاہئے۔ امن وامان کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی خصوصی ذمہ داری سے یقیناً ملک کی تمام حریت پسند اور آزادی خواہ جماعتوں کو پسپا کرنے کا کام لیا جائے گا اور قانون وضابطہ کے نام پر عام باشندگان کے مخالفانہ جوش اور جذبات کو دبانے کی کوشش کی جائے گی۔

اس ملک کی مالیاتی استحکام کے تحفظ کی ذمہ داری کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے معتد بہ سرکاری قرضہ کے اس بار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قایم رکھا جائے جو گذشتہ سو سال کے اندر حکومت نے صرف برطانیہ کے مفاد کی خاطر نیز نفع بخش جنگوں پر خرچ کرنے کے لئے فضول قرض لے لے کر اکٹھا کر دیا ہے ۱۹۳۴ء حکومت ہند کے کل قرضہ کی میزان ۱۲ ارب ۱۲ کرور روپئے تھی جس میں سے ۵ ارب ۱۲ کرور روپئے برطانیہ میں قرض لے گئے۔ چنانچہ محصول ادا کرنے والوں پر یہ ایک بہت ہی بڑا بار ہے اور ان کو کروروں روپئے سالانہ اس قرض کا سود ادا کرنا پڑتا ہے اور چونکہ اس قرض کا بیشتر حصہ ان مصارف کے لئے لیا گیا ہے جن سے ہندوستانیوں کو کسی نوع کا فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اس کے برخلاف اس ملک پر برطانیہ کا تسلط اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان کی آمدنی پر اس کا بار پڑتا رہے لیکن جدید دستور کے ماتحت سرکاری قرضہ کا بوجھ بدستور قایم رہے گا۔

برطانوی تجارت اور مصنوعات کے خلاف مضرت رساں برتاؤ کرنے کے متعلق گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داری کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی معاشی زندگی پر برطانوی سرمایہ اور تجارتی مفاد کا تسلط قایم رکھا جائے اور ہندوستان کی تجارت، صنعت اور جہازرانی کو خاص طور پر ترقی دینے اور اس کا تحفظ کرنے سے مجالس قانون ساز کو روکا جائے۔

دیسی ریاستوں اور اس کے فرماں رواؤں کے حقوق کے تحفظ کی مخصوص ذمہ داری کی غرض یہ ہے کہ جاگیرداری کے نظام کو سامراجی نظام کے سہارے اور تقویت کے لئے قایم رکھا جائے۔

اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری گورنر جنرل کے ہاتھ میں ایک ایسا جادو ہے جس کے زور سے وہ ایک فرقہ کو دوسرے سے لڑا سکتا ہے اور اس صورت سے فرقہ وارانہ جھگڑے اور عداوتوں کو ترقی دے سکتا ہے۔

سرکاری ملازموں کے حقوق اور مفاد کا تحفظ اس لئے گورنر جنرل کرے گا تاکہ موجودہ ہندوستانی سول سروس کو قایم رکھا جائے جو نہ صرف یہ کہ دنیا میں سب سے زیادہ گراں خرچ ملازمین ہیں بلکہ باشندگان ملک کے ساتھ ان کا برتاؤ حد سے زیادہ حاکمانہ اور غیر شریفانہ ہے یہ ہندوستانیوں پر اس شان سے حکومت کرتے ہیں گویا یہ بھی جارج ششم کے خاندان میں سے ہیں۔

سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ اہم وہ اختیارات ہیں جو فوج اور معاملات خارجہ کے متعلق گورنر جنرل کو بخشے گئے ہیں۔ فوج اور معاملات خارجہ کے متعلق خصوصی ذمہ داری کا راز یہ ہے کہ برطانوی سامراج اپنی اس طاقت اور قوت کو قایم رکھنا چاہتی ہے جس پر ہندوستان میں اس کی حکومت کی بنیاد ہے اسی کے ساتھ ساتھ وہ مشرق میں برطانوی اثر و اقتدار کو بڑھانے کے لئے ہندوستان کو مستقر بنانا چاہتی ہے ہندوستانی فوج جس پر ۵۰ کرور روپئے ہر سال خرچ ہوتے ہیں مستقلاً جنگ کے لئے رکھی جاتی ہے اس لئے نہیں کہ ہندوستان کو اس کی ضرورت ہے بلکہ اس لئے کہ بیرون ہند میں برطانوی مفاد کے تحفظ کے لئے اس کی ضرورت ہے ہندوستان کے ہزاروں تعمیری کاموں کو روک کر پچاس کرور کی خطیر رقم اس فوج پر خرچ کی جاتی ہے جو برطانوی سامراج کے اقتدار اور دبدبہ کو قایم رکھنے کے لئے ہندوستان۔

میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہے گورنر جنرل اس معاملہ میں اپنی خصوصی ذمہ داری کے فرائض کو بڑی احتیاط سے انجام دے گا تاکہ ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کا قلع قمع نہ ہونے پائے۔

دیسی ریاستیں اور وفاق | وفاق ہند کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستان کی ریاستوں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے انگریز سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستانی حکمراں فیڈریشن میں شامل ہو گئے تو انھیں ہندوستان کی عام سیاسی بیداری کو ختم کرنے میں ان سے بہت زیادہ مدد ملے گی انگریز اپنے اس خیال میں بالکل درست ہیں اور دوستی کی اسی اُمید پر وفاقی مجلس میں دیسی ریاستوں کو بہت زیادہ نمایندگی دے دی گئی ہے۔

وفاق میں دیسی ریاستوں کے داخلہ کا کوئی اثر ان معاہدوں پر نہیں پڑے گا جو شاہ برطانیہ اور والیان ملک کے درمیان ہوتے ہیں اور نہ ان کی مطلق العنانی پر۔ دستور میں یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ چونکہ شاہِ برطانیہ کے ساتھ دیسی ریاستوں کے براہ راست معاہدے اور تعلقات ہیں اس لئے دیسی ریاستوں پر جو حقوق، اختیارات عملداری بادشاہ کو حاصل ہے ان پر عمل درآمد وائسرائے بہ حیثیت نائب بادشاہ کے کیا کرے گا اور وفاقی حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا اب سوال یہ ہے کہ ریاستوں کی اندرونی خودمختاری میں کوئی دخل اندازی ہو سکے گی یا نہیں ؟ اوّل تو یہ کہ وفاقی مجلس کے کل قوانین کا اطلاق ریاستوں پر نہیں ہوگا ریاست کے فرماں روا کو اجازت دی جائے گی کہ وہ داخلہ کے شرائط میں ان امور کو خاص طور سے بیان کر دے جن کے متعلق وہ وفاقی مجلس کو اپنی ریاست کے لئے قانون سازی کی اجازت دینے پر آمادہ ہے باقی دوسرے امور میں وہ وفاقی مجلس کے قوانین سے بالکل آزاد ہوگا علاوہ بریں ریاستوں کے اندر وفاقی مجلس کے قوانین کا نفاذ ریاست کے اہل کاروں کے ذریعہ ہوگا نہ کہ وفاقی حکومت کے ملازمین کے ذریعہ چنانچہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گو وفاقی مجلس کے ایوان ادنیٰ میں ۳۳ فیصدی اور ایوان اعلیٰ کی ۴۰ فیصدی نشستوں پر ریاست کا قبضہ ہوگا اور برطانوی ہند کے لئے قانون سازی کے وہی اختیارات انھیں بھی حاصل ہوں گے جو صوبہ جات کو دئے گئے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے وفاقی مجلس قانون ساز کو کوئی اختیار ان ریاستوں کے لئے قانون سازی کا نہ ہوگا۔ سوائے چند مقررہ امور کے

متعلق جن کو فرماں روایان ریاست منظور کرلیں اسکا مطلب یہ ہوا کہ یہ فرماں روا وفاقی مجلس کے جمہوری قوانین کو شکست بھی دے سکتے ہیں اور ریاستوں میں اپنی مطلق العنانی طرز حکومت کو بھی قایم رکھ سکتے ہیں دستور میں کوئی ایک شرط بھی ایسی نہیں ہے جو ریاستوں کے لئے یہ لازم کرے کہ وہ وفاق میں شرکت کے بعد یا تو اپنی رعایا کو جمہوری نظام عطا کردیں گی یا کم از کم ان کے بنیادی حقوق ہی متعین کردیں گی ایک اور بات جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ برطانوی سامراج ریاستوں کو ملک کی رائے عامہ کے خلاف ایک آڑ بنانے کی فکر میں ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر شروع شروع ریاستوں کی تعداد جو وفاق میں شریک ہو، دیسی ریاستوں کی کل نشستوں کو پُر کرنے کے لئے کافی نہو تو باقی نشستوں کی خانہ پُری بھی داخل شدہ ریاستیں کریں گی تاکہ ریاستیں اپنے مفاد کا کما حقہ' تحفظ کرسکیں دیسی ریاستوں کے حقوق اور ان کے فرماں رواؤں کے حقوق وریرینہ کا تحفظ گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داریوں میں داخل کردیا گیا ہے برطانوی حکومت نے ہمیشہ دیسی ریاستوں کو بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھنا اپنا خاص فرض سمجھا ہے اور ان کے فرماں رواؤں کی مطلق العنانی قایم رکھنے میں ہمیشہ مدد کی ہے۔

وفاق ہند کے ہر پہلو کو اجاگر اور اس پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ وتنقید کرنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ اس مختصر سے مضمون میں اسکی گنجایش۔ لیکن پھر بھی وفاق ہند کی جو نامکمل تصویر میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ برطانوی سامراج نے ہندوستان میں اپنی جڑوں کو اور زیادہ مضبوط اور پائیدار کرنے کے لئے وفاق کا یہ سارا کھیل کھیلا ہے اور وفاق کے پردہ میں ہندوستان کو دوامی غلامی کی بشارت دی ہے۔ سارا کا سارا دستور ایک ایسی قوم کی ذہنیت کا آئینہ دار ہے جو ساری دنیا کو تو تہذیب وشرافت کا سبق سکھاتی ہے لیکن خود کبھی اس کا ثبوت نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ سارے دستور میں آپ آزادی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں دیکھیں گے ۳۵ کروڑ انسانوں کی قسمت چند گورنروں اور اعلیٰ حکام کے ہاتھ میں سونپ دی گئی ہے ملک کو افلاس ونکبت اور جہل ولاعلمی کے عالمگیر مرض سے بچانے کے لئے کوئی قابل عمل تجویز پیش نہیں کی گئی ہے۔ ملک کے معاشی حالات کو درست اور قومی تعمیری کاموں کو شروع کرنے کا کہیں ذکر تک بھی نہیں ہے۔ صرف دنیا کو دکھانے اور عام ہمدردی حاصل کرنے کے لئے

اصلاحات اور خود مختاری کا راگ گایا جارہا ہے ورنہ حقیقت میں موجودہ دستور ۱۹۳۵ء کے دستور ۱۹۱۹ء کے دستور سے بھی زیادہ مہمل اور ناقابل قبول ہے ظلم و استبداد پر اسکی بنیاد رکھی گئی ہے اور ملک کے کسی مطالبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں آزاد نہیں کہی جاسکتی جب تک اسے تجارت، فوج، مالیات، امور خارجہ، صنعت و حرفت کے محکموں پر پورا اقتدار نہو اور اس کے افراد دنیا کی ہر قوم اور ہر جماعت کے ساتھ باعزت اور خودارانہ معاہدہ کرنے کا حق نہ رکھتے ہوں ایسی آزادی سے کیا حاصل جس میں آپ اپنے ضمیر کی آواز کو بلند نہ کرسکیں اور ان خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار نہ کرسکیں جو آپ کے دل و دماغ سوچتے ہیں آزادی کی نعمت تو قوم میں عزت نفس، اور خود داری پیدا کرتی ہے کیا ہندوستان کے موجودہ دستور نے کوئی ایسی نعمت اس ملک کے رہنے والوں کو بخشی ہے۔

میرے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے جب کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے مذہبی و معاشری اختلافات مٹا کر آپس میں شیر و شکر ہوجانا چاہئیے۔ اور ملک کی آزادی کی خاطر ایک متحدہ محاذ قایم کرکے جلد سے جلد غلامی کے جوئے کو گردن سے اتار دینا چاہئیے۔ ہمارے اختلافاتِ قومی ولی ہندوستان کو روز بروز کمزور اور دوسروں کی نگاہ میں ذلیل کررہے ہیں۔ ہندوستان کی نجات اس کے بسنے والوں کے سچے اتحاد و اتفاق پر مبنی ہے قوم و ملک نااتفاقی و شقاق کا خمیازہ ایک عرصہ سے بھگت رہے ہیں کیا اب بھی ہندو مسلمانوں کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا رہیگا اور یہ سیاست و مذہب کے جزوی اختلافات پر آپس میں دست و گریباں ہونا انسانیت و شرافت کا معیار سمجھتے رہیں گے۔ دنیا کی ساری قومیں ترقی و کامیابی کے میدان میں فراٹے بھر رہی ہیں اور ہندوستان کو ابھی اسی جھگڑے سے نجات نہیں ملی کہ خدا کو خدا کہا جائے یا رام اگر یہ نادانی و نافہمی کچھ اور زیادہ عرصہ تک رہی تو ہمارا ملک دائمی غلامی کے جال میں اس طرح پھنسے گا کہ پھر کبھی آزادی کی فضا میں سانس نہ لے سکے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا جب کہ چڑیاں کھیت چگ گئی ہوں گی اور ہم اپنی غفلت اور ناسمجھی پر کف افسوس مل رہے ہوں گے۔

کیفیات

(از جناب کوکب صاحب شاہجہانپوری)

وہ تو کب ملتے ہیں، لیکن آپ کھو جاتا ہوں میں
بس اسی منزل میں کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں

حالِ دل، دل کھول کر، کب اُن سے کہہ پاتا ہوں میں
جی اُمنڈتا ہے، مگر گھٹ گھٹ کے رہ جاتا ہوں میں

خندۂ اہلِ جہاں پر اشک بھر لاتا ہوں میں
اپنے پیماں توڑتے ہیں آپ، شرماتا ہوں میں

اپنے دل کو دے رہا ہوں آپ ہی کیا کیا فریب
آہ، اک بے کس کو کس کس طرح بہکاتا ہوں میں

اب مری جمعیتِ خاطر پریشانی میں ہے
یعنی خود اپنے تصور سے بھی گھبراتا ہوں میں

میں نہیں ملتا، اگر وہ مل بھی جاتے ہیں کبھی
مجھ کو ترساتے ہیں وہ، اور ان کو ترساتا ہوں میں

آ رہے ہیں یاد رہ رہ کر گذشتہ سانحات
خود بخود بھولا ہوا افسانہ دُہراتا ہوں میں

ضبط کرنے سے جو پھر دل میں اُتر آتے ہیں اشک
سرد آہوں سے اُنھیں شعلوں کو بھڑکاتا ہوں میں

مجھ سا بے تاب و تواں، اور امتحانِ عاشقی
ذکر بھی کرتے ہوئے اب اس کا تھراتا ہوں میں

مجھ کو ترکِ "آرزو" سے جان دینا سہل تھا
لیکن اُن کے واسطے اس کو بھی ٹھکراتا ہوں میں

مجھ کو سودا ہی سہی لیکن، اسے کیا ہو گیا
ناصحِ مشفق کو سو سو طرح سمجھاتا ہوں میں

ہمنوائے غیر ہو سکتا نہیں خود آشنا
طنزِ اہلِ دہر کو خاطر میں کب لاتا ہوں میں

دیکھیے، مشکل ہوا جاتا ہے پھر ضبطِ جنوں
آپ کو معلوم ہے! دیوانہ کہلاتا ہوں میں

آرزو مشکل نہیں، مشکل ہے ترکِ آرزو
اپنے دل پر، آپ ہی یہ کیا ستم ڈھاتا ہوں میں

ہر قدم پر اور ہو جاتا ہے اندازِ خرام
ہر نفس پر آپ کو بدلا ہوا پاتا ہوں میں

"خود گرفتار" اور آزادی، یہ ممکن ہی نہیں
ڈگمگا جاتا ہے دل، جس راہ پر لاتا ہوں میں

پھر اُنھیں قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں ہمنشیں
روکنا پھر مجھ کو، پھر بے خود ہوا جاتا ہوں میں

حسرتِ عرضِ تمنا ہے کہ چھپتی ہی نہیں
بند کرتا ہوں زباں کو، دل کو ٹھیراتا ہوں میں

اب سے نامِ آرزو بھی لب پہ آ سکتا نہیں
لے، زباں دیتا ہوں ظالم، لے قسم کھاتا ہوں میں

دیدہ و دل کا اب اس کے بعد جو انجام ہو!
آخری آنسو، ترے قدموں پہ بکھراتا ہوں میں

کوکبؔ! اُمیدِ وفا رکھتا ہے دل احباب سے
اُن انگاروں پہ کیا کیا پھول برساتا ہوں میں

اسپین کی خانہ جنگی

اسپین میں جب سے خانہ جنگی شروع ہوئی ہے۔ انگلستان میں تقریباً ہر ہفتے ایک کتاب یا رسالہ اس کے متعلق نکلتا ہے۔ اگرچہ ان میں بہت سے تو پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہوتے تاہم اس سے پبلک کے سیاسی شعور اور بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ یہی حال دیگر مغربی ممالک کا ہے۔ جہاں تک کہ اُردو زبان کا تعلق ہے (مجھے ہندوستان کی دیگر زبانوں کا حال معلوم نہیں) میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر کوئی کتاب یا رسالہ تو درکنار ابھی تک کوئی جامع مضمون بھی نہیں نکلا۔ یہاں میں کوشش کروں گا۔ کہ مختصراً اسپین کی خانہ جنگی کی وجوہات پر روشنی ڈالوں۔ اور اس کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے دکھلاؤں۔

اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسپین کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی جائے۔ جب سے اس ملک کے بادشاہ اور امرا مسلمانوں پر غالب آئے۔ وہ اپنے آپ کو عیسائیت کا علمبردار سمجھنے لگے۔ بعد میں اس اصول پر انھوں نے پروٹسٹنٹ مذہب کی بھی مخالفت کی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندوں نے مذہبی تعصب پر زندگی کے ہر پہلو کو قربان کر دیا۔ مثلاً تجارت وصنعت کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے کبھی ترقی نہ حاصل کر سکی۔ امرا کے پاس بڑی بڑی ریاستیں تھیں اور یہ پادری اور رہبانوں سے مل کر رعایا کا خون چوستے رہے۔ ان حالات میں درمیانی طبقے کے لئے کلیسا روم نے تجارت کی ہمیشہ مخالفت کی یہی وجہ تھی کہ درمیانی طبقہ سولھویں صدی کی تجدید عیسائیت (Reformation) کا حامی رہا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایک بڑی حد تک یہ اس تحریک کا بانی تھا۔ صنعت وحرفت اور تجارت کے راستے مسدود ہو گئے۔ فرانس کے درمیانی طبقے اور عوام نے مل کر ۱۷۸۹ء کے سرمایہ دارانہ انقلاب کے ذریعہ سے جاگیرداری نظام کی بیخ کنی کی اور مساوات و آزادی کا پیام تمام یورپ میں پہنچا دیا۔ اسپین میں بھی ان دو قوتوں میں انیسویں صدی میں تصادم ہوتا رہا لیکن نظام جاگیرداری اور کلیسا کی قوت بدستور قائم رہی۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو آزادی بیان وخیال

نصیب نہ ہو سکی، تعلیم عام نہ ہوئی اور صنعت و تجارت میں بھی اسپین دیگر مغربی ممالک سے پیچھے رہ گیا۔
امرا کے ظلم و استبداد کی وجہ سے عوام ہمیشہ نالاں رہے اور اپنی نجات حاصل کرنے کے لئے کوشاں۔
ان حالات میں رجعت پسند جماعتوں میں اور ان میں جو استبداد کو مٹانا چاہتی تھیں کشمکش لازمی تھی۔ یہی
اس خانہ جنگی کا اصل سبب ہے۔

آخرکار ۱۹۳۱ء میں جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔ اسکا مقصد ملک میں صنعتی ترقی دینا۔ امرار
اور کلیسا کی طاقت کو توڑنا۔ اشاعت تعلیم اور آزادی مذہب و بیان وغیرہ کو قائم کرنا تھا۔ یہ حکومت
اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتی اگر اصلاحات کے معاملے میں بے اعتدالی سے کام نہ لیتی۔ مثلاً
جب عوام نے گرجاؤں کو منہدم کرنا شروع کر دیا، خانقاہیں جلادیں اور مختلف قسم کی زیادتیاں کیں،
تو گورنمنٹ نے ان کا کوئی تدارک نہ کیا۔ بلکہ حالات کو بدتر بنانے کے لئے کلیسا کی مالی امداد بند کر دی
اور ہر مذہب کو آزادی دے دی گئی یسوعیوں کو ملک سے جلاوطن کر دیا، تعلیم مذہبی راہنماؤں
کے ہاتھ سے لے لی، کلیسا اور امرار کی زمینیں کسانوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کر لیا، مرد اور عورت
میں مساوات تسلیم کر لی۔ اور مسئلہ طلاق جو کلیسائے روم کے نزدیک ناجائز ہے جائز قرار دیا۔ ان
قوانین سے نہ صرف رجعت پسند جماعتیں برانگیختہ ہوئیں بلکہ پارٹی کے بھی بہت سے لوگوں نے
ان کو ناپسند کیا مذہب تو اہل ہسپانیہ کی گھٹی میں پڑا ہے۔ الکازمورا جو کہ پہلے جمہوریت کا وزیر
تھا اور بعد میں پریذیڈنٹ ہو گیا کلیسا کی مخالفت پر تیار نہ تھا نیز کابینہ کے اور بہت سے ارکان بھی
کلیسا کے معتقد تھے اور انہیں اس کی مخالفت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان باتوں کے باوجود بھی یہ حکومت
اپنے نصب العین میں کامیاب ہو جاتی۔ اگر اپنی پالیسی سے عوام کا اعتماد اور ہمدردی نہ کھو دیتی۔

جمہوریہ نے ازانا (ـہ ـہ ـہ ح ھ) کی زیر وزارت رجعت پسند جماعت کی وقتی سرکوبی کے
بعد اشتمالیوں اور نراجیوں وغیرہ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سینکڑوں اشتمالی بغیر کسی قانونی
تحقیقات کے جلاوطن کر دئے گئے جس کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں ہڑتالیں شروع ہو گئیں
چنانچہ اس حکومت سے جن جماعتوں کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں وہ غیر مطمئن اور نالاں نظر آنے

لگیں۔ جن اصولوں کے تحفظ کی خاطر جمہوریت معرضِ وجود میں آئی تھی یہ حکومت انھیں کی نفی بن گئی۔ یہ کسی جماعت کو خوش بھی نہ کر سکی بلکہ الٹا ناراض کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازانا (۱۹ء ۔۔ ۔۔) کو استعفیٰ دینا پڑا اور قدامت پسند پارٹی برسرِ اقتدار آئی (۱۹۳۳ء) اس کے زیرِ قیادت دو سو برس میں رجعت پسند جماعتوں نے بڑی ترقی اور مضبوطی حاصل کر لی۔ آزانا کی زیرِ وزارت جو مفید قوانین نافذ ہوئے تھے۔ خاموش کر دیے گئے۔ کلیسا اور امراء کی طاقت پھر عود کر آئی۔ کٹیالونیا اور باسک کو جو آزادیاں ملی تھیں پھر چھین لی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوسٹاریا میں ایک زبردست بغاوت ہوئی جس میں تقریباً تین ہزار آدمی زخمی ہوئے اور ایک ہزار جانیں تلف ہو گئیں۔ اسی طرح بارسیلونا اور دیگر مقامات پر بھی لوگ گورنمنٹ کی مخالفت کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر کار ملک کی جتنی بھی انتہا پسند جماعتیں تھیں وہ فسطائی اور رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کرنے پر تل گئیں۔ اور جب ۱۹۳۶ء میں انتخاب ہوا۔ تو ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور نئی گورنمنٹ کی وزارت تعمیر ہوئی۔

اس نئی گورنمنٹ سے لوگوں کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن افسوس کہ ان پر پہلے کی طرح اوس پڑ گئی۔ کسانوں کو یہ امیدیں تھیں کہ اب زمینیں ان کے ہاتھ آ جائیں گی۔ لیکن اس حکومت نے سوائے وعدوں کے اور کچھ نہ کیا۔ اور مزدوروں کی جماعتوں پر سختی کرنا شروع کر دی۔ جمہور کی یہ حالت دیکھ کر فسطائی اور شاہی نے یہ طے کیا کہ زبردستی ملک پر قبضہ کر لیں۔ فسطائی جماعت نے گذشتہ دو سال میں اپنے کو کافی منظم کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اٹلی کی حبشہ پر فتح نے انکو بڑی تقویت پہنچائی۔ چونکہ اطالوی فسطائی حبشہ پر قبضہ کرنے پر کامیاب ہو گئے۔ اس لئے ان لوگوں نے خیال کیا کہ ہم بھی اسی طرح اسپین پر قابض ہو جائیں گے۔ مسولینی نے بھی باغیوں کو ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ وہ اس زعم میں تھا کہ اگر فسطائی کامیاب ہو گئے تو نہ صرف اسپین اٹلی کے زیرِ اثر ہو جائیگا بلکہ مغربی بحیرۂ روم بھی برطانوی اور فرانسیسی طاقت کو کمزور کرنے کی یہ بہترین چال تھی۔

فوج کے افسران بھی بغاوت کے لئے تیار تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں جس پارٹی کی بغاوت میں سرکوبی کی تھی۔ وہی اب برسرِ اقتدار تھی اور دیگر رجعت پسند جماعتیں بھی اسکی حامی تھیں۔

یہ موقع بغاوت کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اس لئے کہ جمہوریت پسند پارٹی اور دوسری انتہا پسند جماعتوں میں ہر وقت جوتا چل رہا تھا۔ اگر یہ گورنمنٹ یادہ جو ۱۹۳۱ء میں قائم ہوئی تھی حماقتیں نہ کرتی۔ تو یہ خانہ جنگی ہرگز نہ ہوتی۔ لیکن اس نے اپنی پالیسی سے ان[۱] پارٹیوں کو جنھوں نے اسے حکومت دلائی تھی۔ اپنا دشمن بنالیا۔ اگر یہ عوام کی دلجوئی کرتی تو فسطائی قوتیں ہرگز اس کے مقابلہ پر کھڑا ہونے کی جرأت نہ کرسکتیں۔

ان وجوہات کے علاوہ ایک سبب جو اس وقت کی اور اس سے پہلے کی خانہ جنگیوں کا کسی حد تک ذمہ دار ہے۔ وہ اہل اسپین کی انفرادیت پسند طبیعت ہے۔ یہ البتہ انکی جغرافیائی اور معاشی ماحول کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس نے اسپین کی تاریخ پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس انفرادیت کا نتیجہ ہے کہ اسپین میں نراجی پارٹی بہت طاقتور جماعت ہے۔ یہاں کبھی مختلف جماعتوں نے ایک دوسرے سے تعاون نہیں رکھا۔ اور یہی جمہوریت کی کمزوری کا باعث ہے۔ اس وقت تک بھی گورنمنٹ کی پارٹیاں آپس میں معرکہ آرا ہیں۔ قومی مفاد و مقاصد اکثر جماعتی مفاد و اغراض پر قربان کردئے جاتے ہیں۔ اس کے متعلق پروفیسر کیسٹی لیجو، پروفیسر اورٹیگا اور غیر ملکی محققین بالکل ہمرائے ہیں۔ اسی انفرادیت کی وجہ سے اہل ہسپانیہ مرکزی حکومت کے سخت مخالف ہیں۔ گیلیشیا، باسک، کیٹیلونیا وغیرہ کے لوگ اپنی تہذیب زبان اور قومیت کے تحفظ کے دلدادہ ہیں۔ یہ لوگ فسطائی حکومت کے خلاف اس وجہ سے لڑتے ہیں کہ اس کے قائم ہونے پر انکی آزادی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

لڑائی دو برس سے ہو رہی ہے۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ فسطائی قوتیں کامیاب ہو جائیں گی لیکن اس سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ ملک میں ان کے زیادہ پیرو ہیں۔ برخلاف اس کے زیادہ تر لوگ جمہوریت کے طرفدار ہیں۔ فرانکو کو اس وقت تک جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں۔ وہ جرمنی اور اٹلی کی مدد سے اور انگلستان اور فرانس کی چشم پوشی اور بزدلی سے۔ خانہ جنگی کے شروع میں عدم مداخلت

---

[۱] مزدوروں کی پارٹیوں سے مراد ہے۔

کی کمیٹی میں یہ طے ہوا تھا کہ کوئی مغربی طاقت اسپین میں کسی جماعت کو مدد نہ پہنچائے۔ اس پر جرمنی اور اٹلی نے وعدہ خلافی کی اور فرانکو کی مدد کرتے رہے۔ یہ ممالک فاشسٹی جماعت کی فتح چاہتے تھے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے نہ صرف مغربی بحیرۂ روم میں ان کا وقار و قوت بڑھ جائے گی۔ بلکہ اسپین کی معدنیات سے بھی وہ پورا پورا فائدہ حاصل کرسکیں گے۔ گورنمنٹ برطانیہ کا رویہ فسطائیوں کے موافق رہا۔ اور اس نے سوا کانفرنس منعقد کرنے کے اور کوئی عملی کارروائی نہ کی۔ برطانیہ اسی پالیسی سے فسطائیت کو قوت پہنچا رہی ہے۔ اس کو یہ ڈر ہے کہ اگر عوام کی فتح ہوگئی۔ تو انگلستان پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا اور اس کی وجہ سے اشتراکیت قوت پکڑ جائے گی۔ انگریز حکومت یہ نہیں چاہتی کہ موجودہ نظام ذاتی ملکیت خطرہ میں پڑ جائے۔ فرانکو کی فتح سے انگلستان کی شہنشاہی کو اگرچہ نقصان پہنچے گا۔ تاہم فرانکو سرمایہ داروں کا نمائندہ ہے لہذا اس کے ہاتھوں سرمایہ دارانہ نظام کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ انگریز ہر حالت میں اشتراکیت پر فسطائیت کو ترجیح دیگا۔ اگرچہ روس نے کچھ مدد دی لیکن وہ اتنی کافی نہ تھی کہ گورنمنٹ فرانکو کا مقابلہ کرسکتی جسکو ہٹلر اور مسولینی ہر قسم کی مدد پہنچا رہے تھے۔ اس پر بھی گورنمنٹ کی افواج نے بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ اور اب آئندہ اسپین کا کیا حشر ہوگا۔ اس پر کوئی مستقل رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن بدقسمتی سے اگر فرانکو کامیاب ہوگیا۔ تو ملک کے اندر استبداد و مظالم کا اسی طرح بازار گرم ہو جائے گا۔ جیسا کہ جرمنی میں ہو رہا ہے۔ فسطائی مزدوروں کی جماعتوں کو بالکل نیست و نابود کر دیں گے۔ کلیسا اور امراء کا پھر دور دورہ ہوگا۔ اور ہر جگہ رجعت پسندی کی حکومت ہوگی۔ یورپ کی سیاسی فضا بھی اس کے اثر سے بچ نہ سکے گی۔ فرانکو چونکہ جرمنی اور اٹلی کی مدد سے کامیاب ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ کچھ عرصہ ان دونو کے زیر اثر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر یورپ میں جنگ چھڑ گئی۔ تو وہ فرانس کو تین سرحدوں پر لڑنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں مغربی بحیرۂ روم میں جرمنی اور اٹلی کے اثر قائم ہو جانے کے یہ معنی ہونگے۔ کہ فرانس اپنے افریقہ والے مقبوضات سے مالی اور جنگی مدد لینے سے قاصر ہو جائیگا۔ انگلستان کو بھی مصر اور ہندوستان کی آمد و رفت کے متعلق دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فسطائی

ممالک کی قوت جوں جوں بڑھ رہی ہے۔ توں توں وہ دنیا کو بربادی اور جنگ کے نزدیک لا رہی ہے۔ لیکن اگر جنگ عظیم چھڑ گئی (اگرچہ اسکا وقت معین نہیں کیا جا سکتا) تو برطانیہ اور فرانس بہت حد تک اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ فسطائی قوتوں کی ترقی کی بہت حد تک یہ دونو حکومتیں ذمہ دار ہیں ؛

دنیا

(گذشتہ سے پیوستہ)

یہ کون چرواہا پھٹے کپڑے بُرے حال گنتی کی دو چار بکریاں لئے چلا جارہا ہے۔ اچھا۔ یہ تو تاکش تیمور ہے جو ایان بوغاخان کی اولاد نرینہ لانے کا بیڑا اٹھا کر چلا تھا۔ دشت و بیاباں نور و برفانی پہاڑ بے آب و گیاہ میدان پے سیر کرتا۔ گرم و سرد روزگار دیکھتا۔ دل قول کا پاس توم کا خیال لئے تلاش مقصود میں رواں دواں ہے۔ سامنے سے ایک مسافر آتا نظر پڑا دعا سلام کے بعد دریافت کیا کہ اس علاقہ میں کہیں دختوئی شراول نامی سردار کا قبیلہ رہتا ہے۔ جواب نفی میں ملا۔ ہاتھ پیر جواب دے گئے پر مغل دل نے جواب نہ دیا۔ آس ٹوٹ گئی ہمت نہ ٹوٹی۔ بھوک نے ستایا چاروں طرف نظر دوڑائی کچھ نظر نہ آیا۔ ایک پتھر پر جو بیٹھا۔ بکریوں کو دیکھا تو گنتی کی رہ گئی ہیں۔ زادِ راہ محدود اور منزل مقصود مفقود نظر آئی۔ بکری کاٹنا نامناسب اور اشتہا کا تقاضہ شدید۔ طبع حاضر نے تدبیر نادر ہشں کی بکریوں کے کان کاٹ پیٹ بھر لیا۔ چلتے چلتے کچھ ڈیرے نظر آئے غریب الوطن نے غنیمت جانا جاکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ دختوئی شراول کا قبیلہ کچھ عرصہ یہاں قیام کر مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ امید کا آفتاب جو عرب یاس میں غروب ہو چکا تھا پھر طلوع ہوا۔ رات بسیرا لے زمین کا مسافر۔ آسمان کے مسافر کے ساتھ شرق سے غرب کی جانب روانہ ہوا۔

تاکش تیمور یاوس ونا امید کبیدہ خاطر ایک کبود رنگ کی بکری لئے بیٹھا ہے۔ راہ گیر سے عادت کے مطابق دختوئی شراول کے قبیلہ کی بابت دریافت کیا معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پر ڈیرہ ڈالے پڑا ہے۔ باتوں باتوں میں معلوم کر لیا کہ ان لیک کا بیٹا جو ایان بوغاخان سے ہے اس وقت پندرہ سال کا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی امید کی ایک صورت نظر آئی۔ رگوں میں خون دوڑ گیا۔ دماغ کامیابی کی تدابیر سوچنے لگا۔

آواز:۔ ہمت مرداں مدد خدا ۔ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوگا۔

تاش تیمور خائز المرام ایان بوغا خان کے بیٹے تغلق تیمور کو اس کے باپ کے قبیلہ کی طرف لئے جاتا ہے۔ شاد کام ہے تیز گام جا رہا ہے۔ خان کی اولاد ہے خان بنے گا۔ تغلق تیمور ہوائے سروری در سر اڑا چلا جاتا ہے۔ گرم جوش مسافر مصائب اور منزلیں طے کرتے برفانی علاقہ سے گذر رہے ہیں۔ نگاہ نے لغزش کی قدم ڈگمگایا تغلق تیمور نا آموزدہ کار برف کے غار میں جا پڑا۔ تاش تیمور غار کے کنارہ سر پکڑے بیٹھا ہے۔ قسمت سر غار کھڑی مسکرا رہی ہے۔ بہ آواز حال مژدہ سنا رہی ہے کہ اس لڑکے سے مجھے کام لینا ہے اس نونہال کو بار آور ہونا ہے۔ دور سے قافلہ آتا نظر آیا جان میں جان آئی۔ امید نے صورت دکھائی۔ قافلہ سالار کو ساری داستان سنائی اور مدد چاہی ——

تاش تیمور کمر میں رسی باندھ غار میں کود پڑا مصلحتاً پہلے خود اوپر آیا پھر تغلق کو باہر نکالا۔

آج اکسو شہر میں جشن ہے۔ ایان بوغا خان کا قبیلہ اپنے سردار کے بیٹے ہونے والے سردار تغلق تیمور کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ فنونِ سپہ گری دکھائے جا رہے ہیں۔ سب اہل شہر خوشیاں منا رہے ہیں۔ آج امیر بلاجی کی آرزو بر آئی خدا نے سردار کی صورت دکھائی۔

للہ الحمد براں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد زپس پردہ تقدیر پدید

کتک کی جامع مسجد میں بڑا اجتماع ہے آج روز جمعہ ہے۔ بعد نماز شیخ جمال الدین نے اعلان عام کیا کہ میں تم سے رخصت ہوتا ہوں تمھارے افعالِ بد و اعمال زبوں کی پاداش میں عذاب الٰہی نازل ہونے والا ہے اب قیامت میں ملاقات ہوگی۔ اتنا کہہ چلدیئے مؤذن ہم عنانی کی اجازت لے ساتھ ہولیا۔ ابھی تین فرسنگ گئے تھے کہ کچھ ضروری کام یاد آیا اور مؤذن کتک واپس گیا جب مسجد کے قریب سے گذرا تو عصر کا وقت تھا دل نہ مانا عادت نے قدم تھام لئے۔ مینار پر چڑھ اذان کہی اب جو نیچے اترا تو راستہ بند پایا۔ پھر اوپر آیا۔ دیکھا تو آسمان پر سے خاک برس رہی ہے اور راہ مسدود ہوگئی ہے۔ آہستہ آہستہ خاک مینار تک آن پہنچی اور یہ کود جان بچا شیخ سے جا ملا اور سارا

ماجریٰ کہہ سنایا۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں مسافر بے گل پہنچے۔ ایک جگہ بیٹھ کر دم لے رہے تھے کہ کچھ سپاہیوں نے آ کر گرفتار کیا۔ کشاں کشاں سردار پاس لے گئے۔ سردار۔ تغلق تیمور تھا اور اذنِ عام دے رکھا تھا کہ آج ہر شخص سیر و شکار میں شریک ہو۔ یہ عدول حکمی میں گرفتار ہوئے۔ عذر پیش کیا کہ غریب الوطن کتک سے آئے ہیں جو برباد ہو گیا حکم سے آگاہ نہ تھے ورنہ بسر و چشم بجا لاتے۔ تغلق تیمور اس وقت اپنے کتوں کو سور کی ہڈیاں کھلا رہا تھا شیخ سے خطاب کیا اور کہا "تم اچھے ہو یا یہ کتے" شیخ نے جواب دیا "اگر مجھ میں نورِ ایمان نہیں تو یہ کتے مجھ سے بہتر ہیں ورنہ میں ان کتوں سے بہتر"۔ تغلق نے پوچھا کہ ایمان کیا چیز ہے جو انسان کو کتے پر فوقیت دیتا ہے" شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی۔ تغلق ابھی بااختیار نہ تھا وعدہ کیا کہ جب اختیار پاؤں گا ایمان لاؤں گا۔ وعدہ لیا کہ اگر میرا وعدہ یاد دلاؤ گے مجھے مومن بناؤ گے۔

شیخ جمال الدین بسترِ مرگ پر ہیں۔ بیٹا ارشدالدین قریب بیٹھا ہے۔ شیخ نے دو گھونٹ پانی کے پیئے اور ارشدالدین کو قریب تر آنے کا اشارہ کیا۔ اعضا و جوارح جواب دے چکے ہیں پر ہوش و حواس ابھی باقی۔ لب بمشکل جنبش کرتے ہیں۔ زبان لڑکھڑاتی ہے۔ بات زبان پر آ کر رہ جاتی ہے باپ نے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیٹے نے تکیوں کے سہارے بٹھایا دو گھونٹ پانی پلایا۔ حلق تر ہوا، زبان میں طاقت آئی بیٹے سے کہا کہ مدت ہوئی میں نے خواب دیکھا تھا کہ چراغ لئے چٹان پر چڑھ رہا ہوں اور اس کی روشنی سے مشرق و مغرب منور ہے" اس کے بعد بے ربط ٹوٹے پھوٹے فقروں میں تغلق تیمور کا واقعہ بیان کیا اور اس خدمت کے انجام دینے کا وعدہ لیا۔

صبح صادق ہے شب زندہ دارانِ انجم چادر نور اوڑھا چاہتے ہیں۔ عاملانِ کارخانۂ عالم نے والّیل گردانی اور والشمس کھولی۔ روزِ روشن کا پرچم نورانی لہرایا رات نے اپنا ڈیرہ اٹھایا۔ مغلوں کے ڈیرے ایک میدان میں پڑے ہیں۔ ارشدالدین نے ایک ڈیرہ کے قریب بہ آوازِ بلند اذان کہی۔ سوار آئے اور گرفتار کر کے لے گئے۔ خان کے سامنے پیشی ہوئی۔ اس نے غضبناک انداز میں کہا کہ تو کون ہے جو سوز میری نیند خراب کرتا ہے" ارشدالدین نے جواب دیا کہ آپ تک پہنچنا چاہتا تھا جب اور کسی طرح

رسائی نہ ہوئی تو یہ طریقہ اختیار کیا' الکریمُ اذا وَعَدَ وفا۔ آپ نے مدت ہوئی میرے باپ شیخ جمال الدین سے ایمان لانے کا وعدہ کیا تھا آج میں اس کے ایفا کا طلبگار ہوں'۔ تغلق تیمور بولا' مجھے اپنا وعدہ یاد ہے جب سے بااختیار ہوا شیخ کا منتظر ہوں' ارشدالدین نے کہا' وہ تو راہیٔ ملک بقا ہوئے اور مجھے وصیت کر گئے'۔ خان ایمان لایا۔ صبح پہلا آدمی جو دربار میں آیا امیر تولیک تھا۔ تغلق نے پوچھا۔ کہ اسلام قبول کروگے'؟ تولیک نے جواب دیا کہ تین سال ہوئے مجھکو کاشغر میں ایک نیک بندہ نے مسلمان کیا تھا مگر آپ کے خوف سے ظاہر نہ کرتا تھا'۔ خان اور امیر گلے ملے بالآخر ایک ایک کرکے سب ایمان لائے۔ حتیٰ کہ نوبت جرس تک پہنچی اس نے کہا کہ اگر یہ شخص میرے ملازم ستنقتی بوقا کو زیر کرے تو میں ایمان لے آؤں گا میں نے اس کو دیکھا ہے کہ اونٹ کے دوسالہ بچہ کو بے تکان اٹھا لیتا ہے۔ مولانا ارشدالدین نے خدا پہ بھروسہ کر شرط منظور کی۔ چند لمحہ کا ٔ زوری کے بعد بوقا زمین پر تھا اور مولانا اس کے سینہ پر۔

آواز:۔ ہاں ایمان کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے۔

بعد مغرب دن بھر کے بچھڑے ہوئے سارے صحن فلک پر جمع ہوئے اور مغل بھی نماز ادا کر یک جا ہو بیٹھے۔ ترا گی۔ قبیلہ کا خان دوران گفتگو میں بولا۔' رات میں نے خواب دیکھا اس کی تعبیر چاہتا ہوں۔ سب غور سے سننے لگے۔ خان نے کہا کہ دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی چہرہ والے عرب نے مجھے شمشیر برہنہ دی۔ جب میں نے چلائی تو اس میں سے شعلہ نکلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے تلوار گلاب پاش سے بدل گئی اور اس کی پھوار دور دور پہنچی'۔ یہ خواب سن کر سب کی رائے ہوئی کہ شیخ شمس الدین سے تعبیر طلب کی جائے۔ ترا گی اور قبیلہ کے چند بزرگ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے جواب ملا کہ فرزند ارجمند مبارک ہو۔ اس کی تلوار دنیا کو کفر اور بت پرستی کی گندگی سے پاک کرے گی ایمان پھیلائے گی۔ اس کی اولاد لاتعداد ہوگی اور ممالک دور دراز تک پہنچے گی ؁

معاشری اصلاح اور قومی ترقی

(جناب محمد عرفان صاحب ندوی متعلم جامعہ)

اقوام عالم کی زندگی کا انحصار ان کی معاشرتی اصلاح پر ہے۔ قومیں اسی وقت تک منازل ترقی بھی طے کرتی ہیں جب تک اُن کے اندر معاشرتی خوبیاں موجود رہتی ہیں۔ گویا معاشری اصلاح اور قومی ترقی آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ کسی قوم کی معاشری اصلاح کے لازمی معنی یہ ہوں گے کہ وہ قوم ترقی یافتہ ہے۔ اور جب کبھی آپ کسی قوم کو قعر مذلت میں گرا دیکھیں تو آپ فوراً سمجھ جائیے کہ وہ جماعت معاشرتی خرابیوں، بے ہودہ رسم ورواج، اور اس سے بھی زیادہ دماغی اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہے، اقوام کا بام ترقی پر پہنچنا اسی وقت ممکن ہے جب اصلاح معاشرت کو شمع راہ بنایا جائے اور پھر اس کا بجھنا ہی اندھیری اور بھیانک رات کا آجانا ہے جو اتنی دراز ہوتی ہے کہ "مریض نیمجاں" کو انتہائی کرب ذہنی اور سخت اضطراب کے بعد بھی سپیدہ صبح دیکھنا پھر نصیب نہیں ہوتا۔

اوپر کے بیان کو تاریخی شواہد اور براہین کے ساتھ مبرہن کیا جاسکتا ہے۔ یونان وروم دنیا کی زبردست سلطنتیں گذری ہیں جنھوں نے اعلیٰ تہذیب وتمدن کے ذریعہ جو اصلاح معاشرت ہی کا نتیجہ ہے اپنے اپنے زمانہ میں دنیا کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ اُن کا تمدن ایک عرصہ تک تمام دنیا پر سکہ جمائے رہا، اور ان کی تہذیب ایشیا کے ہر ملک میں قابل تقلید رہی۔ اس سے کہیں زیادہ شاندار روایات اسلام نے چھوڑیں۔ اسلام نے اصلاح معاشرت کا جو بیڑا اٹھایا تھا وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے، اس نے ایک ایسی قوم کو اصلاح کر کے بام ترقی پر پہنچایا جو اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ جاہل، ناسمجھ اور فسق وفجور میں مبتلا تھی۔ بت پرستی، وہم پرستی، جنگ جوئی، ضعیف الاعتقادی اور جہالت کے تہ بہ تہ پردے اس پر پڑے ہوئے تھے۔ اسلام نے ان کی اصلاح کی اور جب تک اصلاحی صورت قائم رہی مسلمان دنیا پر بھاری رہے۔ ترقی کی، اور کرتے گئے یہاں تک کہ آخری زینہ پر

پہنچ گئے اور ثریا کو جا لیا۔

تاریخ واقعات کو دھراتی ہے۔ پست کو بلند اور بلند کو پست کرنا زمانہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، وہ قوم جو ایک عرصہ تک سربلند و باقبال رہ چکی تھی، آج ذلیل و خوار ہے۔ جو کبھی گمراہوں کی ہدایت، بھولے بھٹکوں کی راہ نمائی، اور پریشان خاطروں کے لئے اطمینان وسکون قلب کے سامان مہیا کرتی تھی آج خود اس پر عرصہ حیات تنگ ہے۔ جو کبھی آفتاب بن کر اپنے حسن کی روشنی سے ایک عالم کو منور کر چکی ہے آج اس کے پاس ٹمٹماتا دیا بھی نہیں جو اس کے چار قدم آگے کے راستہ کو ہی روشن کر سکے۔ اپنا بہترین سرمایہ حیات ڈبو کر آپ نادار بن گئی۔ دوسروں نے اس کے اصولوں کی برتری اور خوبی کو تسلیم کر کے اپنی مشعل راہ بنا لیا اور یہ گم گشتہ راہ ہی رہی۔ وہ معاشرتی بلند اصول جو اس کا طرہ امتیاز تھے آج ایک ایک کر کے اس سے رخصت ہو چکے ہیں اور یہ ہے کہ روز بروز پستی کی طرف کوچ کر رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ قوموں کی معاشرت بھی بدلتی رہتی ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ نئی نئی ضروریات اور احتیاجات پیدا ہوتی ہیں۔ سوسائٹی کے سامنے پرانے اصول کی جگہ نئے اصول حیات آتے ہیں۔ اور اسی لئے "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ" اور "اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا" کی تعلیم کے ماتحت ہر باخبر اور ہوشمند قوم کے لئے اپنی برائیوں کو دور کرنے اور دوسروں کی اچھائیاں اور خوبیوں کو اختیار کرنے کا راستہ کھلا ہوا ہے تاکہ اس پر زمانہ کا ساتھ نہ دینے کا الزام نہ عائد ہو۔ سوسائٹی کا حقیقی مقصد یہی ہونا چاہئے کہ وہ سماج کی غیر ضروری اور تکلیف دہ جکڑبندیوں سے آزاد ہو کر افراد کی ترقی اور خوبیوں کی وسعت کو جگہ دینے کے لئے اپنا دامن وسیع کرے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ ہماری معاشرت نے اس وقت کیا کچھ رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اور سوسائٹی کس حد تک اسکی اصلاح کر رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سوسائٹی اسی رنگ میں رنگ کر قومی ترقی کے لئے اور مشکلات پیدا کر رہی ہے۔

معاشی خرابی اور اس کی اصلاح مسلمان اس وقت پیشوں اور ہاتھ کے کاموں کو حصول معاش کے لئے اختیار کرنا باعث ذلت و توہین سمجھتے ہیں۔ ان کی اس میں کسر شان ہے کہ وہ اپنے ہاتھ

پاؤں چلاکر اپنی روزی اپنی قوت بازو سے حاصل کریں۔ بھیک مانگنا گوارا کرلیں گے ہٹے مسٹنڈے ہونے کے باوجود بلا احساس شرم دست سوال دراز کرنے میں ان کو ذرا بھی باک نہ ہوگا۔ لیکن اس میں ان کو شرم محسوس ہوگی کہ سر پر ڈلیا اٹھا کر مٹی پھینکیں، لکڑیاں پھاڑا کریں، زمین کھودیں یا ہنسیے سے گھاس کاٹیں اور اس کو بیچ کر اپنی روزی باعزت طریقہ پر حاصل کریں۔ یہ دریوزہ گری اختیار کرنے والا طبقہ قوم کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہے۔

یہ حالت تو ہوئی غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کا رجحان لے دے کر ایک ملازمت کی طرف رہ گیا ہے۔ اور ملازمت اتنی کہاں رکھی ہے کہ اس ٹڈی دل لشکر کے لئے وسعت پیدا کرے۔ تعلیم حاصل کرنے اور ڈگریاں لینے کے بعد ملازمت نہ ملنے کی صورت میں یہ تو کبھی خیال بھی نہیں گذرتا کہ روزی حاصل کرنے کا ذریعہ ان کے لئے "پیشہ" یا ہاتھ پاؤں کی محنت بھی بن سکتی ہے۔ اور اس وجہ سے بیکاری کا ایک مستقل اور کٹھن مسئلہ قوم کے سامنے بہت مہیب شکل میں رونما ہوتا ہے، اور بہت سے نونہالان قوم اس مسلسل اور پیہم کشمکش کی تاب نہ لاکر اپنی عزیز اور نامراد زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کی پیشوں سے بیزاری اور ملازمت کی طرف عام رجحان قومی ترقی کے لئے بہت مضر ہے ملازمت ایک کام ضرور ہے جسکو اور معاشی ذرائع موجود نہ ہونے کی صورت میں اگر اختیار کرلیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہ بالکل واقعہ ہے کہ ملازمت اعلیٰ اخلاق مثلاً حریت، آزادی ضمیر، مساوات، حب الوطن اور حب قوم کے پاکیزہ جذبات کو بالکل پامال کر ڈالتی ہے۔ اور آدمی بس بندہ زر نبکر شکم پرست بن جاتا ہے۔ جس سے قومی ترقی کو نقصان عظیم پہنچتا ہے۔ کیونکہ جس قوم کا "دل و دماغ" ہی اس سے سرتابی کرے اس کی فلاح و بہبود کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

قومی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ دونوں میں پیشوں کی اہمیت اور ان کی عظمت و برتری کا احساس پیدا کرایا جائے۔ گداگروں کا ایک بڑا طبقہ جو قوم کے لئے ایک بدنما داغ ہے اس کے لئے کام مہیا کیا جائے۔ اور اسے اخلاقی قوت سے اور یوں نہ ہو سکے تو بجبر اسکے اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے جس سے امید ہوتی ہے کہ قوم ترقی کی منزلوں پر گامزن ہو سکے گی۔

طریقہ بود و باش اور اسکی اصلاح مسلمانوں کے رہنے سہنے اور بود و باش کے طریقوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی حالت قابل اطمینان نہیں ملے گی۔ مکان بنانے میں اس کا قطعاً خیال نہیں رکھا جاتا کہ وہ صحت بخش طریقہ پر بنائے جائیں۔ جن میں نہ ہوا کا گذر ہوتا ہے، نہ دھوپ کا۔ نہایت بھنچے اور دبے ہوئے مکانات اور وہ بھی اندر سے اتنے غلیظ کہ الامان۔ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، لباس پوشاک، غرض کسی چیز میں آپ کو نفاست اور صفائی نہیں ملے گی۔ اگرچہ کپڑا تیار کراتے وقت کبھی ایک دو جوڑوں پر بس نہیں ہوتی لیکن سلیقہ سے ان کو زیب تن کئے ہوئے کبھی بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ مارے شان کے سر پر ترکی ٹوپی تو لگائی جائے گی، اور دو گرہ کی سادہ لیکن آرام دہ ٹوپی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن پھر اس کا کبھی خیال بھی نہ آئے گا کہ اس پر کتنی کیچ جمی ہوئی ہے اور خریدنے کے وقت سے لیکر آج تک کبھی ایک برش بھی اس پر پھیرا گیا ہے یا نہیں۔ نہانا چاہے صحت کے لئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو لیکن روز تو کیا مہینوں اس کی نوبت نہ آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کھانا پکانے کی جگہ۔ کھانا رکھنے کی جگہ۔ کھانے کے برتنوں وغیرہ میں صفائی اور ستھراپن کبھی چھو کر بھی نہیں گذرتا۔ عورتیں کپڑے تو بہت بھاری بنوائیں گی، لیکن وہ بھاری جوڑے آنے جانے کے لئے رکھ چھوڑے جائیں گے۔ اور گھر میں نہایت میلے اور گندے کپڑے پہنے رہنا کچھ بھی طبیعت پر نہ کھلے گا۔ نہ ہی وہ کوئی معیوب چیز شمار کی جائے گی۔ بچے جن کی اثر پذیر طبیعت پر پہلے نقوش بمنزلہ فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں ان ہی گندی، غلیظ اور غیر صحت بخش گودوں میں پرورش پاتے ہیں جب ہی بڑے ہو کر ان کی طبیعت میں لطافت اور صفائی کا کوئی میلان نہیں رہتا۔ اور گندگی ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اب آپ ہی کی ہم وطن قوم پر آپ نظر ڈالیں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آئیگا غریب سے غریب عورت جس کے رہنے کے لئے چھوٹی سے چھوٹی کوٹھری ہو، یا کسی مہاجن کا بڑے سے بڑا مکان، ہر روز صبح ہوتے ہی اس کی صفائی اور لیپ جانا اتنا ضروری اور لازمی ہے کہ کبھی فرق نہیں آ سکتا۔ گھر کے تمام برتنوں کی صفائی بلا ناغہ اور اس اہتمام سے کہ مٹی راکھ اور تیل سے رگڑ رگڑ کر ان کو جھل بل کر دیا جاتا ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے مزدور اور بڑے سے بڑے

تعلیم یافتہ کو صبح آپ اپنے ہاتھ سے لُٹیا مٹی سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے ضرور دیکھیں گے۔ کبھی آپ کی بھی اپنے لوٹے پر نظر پڑتی ہے کہ کتنے مہینوں سے اس پر پانی کا ایک ہاتھ بھی نہیں پھیرا گیا ہے، صبح سے روزان کا نہانا اور کھانا کھانے سے قبل نہا دھو چکنے کی ضروری شرط اور ہر روزان کا صاف دھوتی کرتے میں نظر آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صفائی اور نفاست اُن کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ اُن میں اس کی اہمیت کا احساس ہر چھوٹے بڑے کو پورے طور پر ہو چکا ہے۔ سکھ عورتیں بھی روز نہائی ہوئی صاف اور سادہ لباس میں نظر آتی ہیں، کھانا پکانے کا چوکا مجال ہے کہ اس کے بغیر لیپے کھانا پک جائے۔ گندگی کا چوکے کے قریب موجود ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ مجھے چونکہ دیہات کی زندگی دیکھنے کا موقع ملا ہے اور ہندو اور مسلمان دونوں کی دیہاتی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کر چکا ہوں، میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چھوت چھات کے ابتدائی وجوہ چاہے جو کچھ بھی ہوں، لیکن مسلمانوں کی طبعی گندگی اور غلاظت بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے اس جذبہ کو بڑھانے میں بہت کچھ ممد و معاون ہوئی ہے۔

ان باتوں کو یہ کہکر ٹالا نہیں جا سکتا کہ یہ نہایت معمولی اور غیر اہم چیزیں ہیں اور ان سے اور قومی ترقی سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی مگر پتہ کی باتیں ہیں قومی ترقی کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے اس زبردست اور بلند قومی اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے جس کا مشاہدہ اس وقت آپ کے پڑوسیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ معمولی اور روزمرہ کی باتوں کو اہمیت نہ دینا ہی سب سے بڑی جہالت اور پستی کی دلیل ہے۔

مصارف بیجا | مسلمانوں کی آمدنی اور خرچ پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات بہت صاف طور پر نظر آئیگی کہ ان کے اخراجات بمقابلہ آمدنی کے بہت زیادہ ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ زیر بار اور مقروض رہتے ہیں اور ان کی کمائی ایسے نامناسب اور لغو مصارف میں صرف ہوتی ہے جو نہ خود ان کی ذات کے لئے فائدہ رساں ہے نہ ان کی قوم اور ملک کے لئے۔ کپڑے عام طور پر بدیسی جو زیادہ گراں ہوتے ہیں استعمال کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پیسے سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان کی آمدنی اور خرچ میں توازن قائم نہیں ہے، متوسط درجہ کے لوگ ایک دو جوڑے پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ۷، ۸ جوڑے ایک ساتھ

بناتے ہیں، اور ہمیشہ کوشش یہی رہتی ہے اچھے سے اچھے قیمتی کپڑے کا لباس چاہے قرض ہی سے کیوں نہ ہو بنوالیا جائے۔ غرض کسی نہ کسی طرح اپنے بدن کو دیدہ زیب کپڑوں میں ملبوس دیکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں مردوں کے لباس میں اتنے کچھ تکلفات ہوتے ہوں وہاں عورتوں کے لباس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ افلاس اور تنگدستی کے باوجود ایک ایک جوڑا نہایت بیش قیمت کپڑے کا تیار کرالیا جاتا ہے۔ اور یوں قرض کرکے اپنا اور عورتوں کا شوق پورا کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو دیکھئے جو دولت و ثروت میں مسلمانوں سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ کتنی صاف، سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرتی ہے۔ عام طور پر ان میں بڑے سے لیکر چھوٹے تک سب سودیشی کپڑا استعمال کرتے ہیں جن سے ان ہی کی قوم اور ملک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ دھوتی، کرتہ اور ایک دو گرہ کی دو پلی ٹوپی جس کو جب چاہو صابن لگاکر دھولو۔ سودیشی کپڑا خریدنے کے ساتھ کم قیمت کا خاص خیال رہتا ہے۔ یہ معمولی معمولی چیزیں اور بعض لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ پاجامہ اور دھوتی کی تعداد گنانا شروع کردی۔ لیکن ان ہی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ملک و قوم کا کیرکٹر بنتا ہے۔ ان چھوٹی چیزوں میں احتیاط اور خیال کرنے سے آدمی اہم امور میں احتیاط کرنا سیکھتا ہے۔ کفایت شعاری، پس اندازی اور حب وطن جو ہندو قوم کی اہم خصوصیات ہیں یہ سب ان کی عادۃ ثانیہ ان ہی روزمرہ کے معمولات میں مسلسل کرتے رہنے سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

زندگی کے ہر ہر شعبہ میں آپ یہی نقشہ دیکھتے چلئے۔ کھانے کے مصارف کو لیجئے۔ متوسط طبقہ میں غریب سے غریب مسلمان کے دسترخوان پر آپ کو دو ایک طرح کی چیزیں ضرور نظر آئیں گی۔ آپ اس کے دسترخوان پر گوشت ضرور دیکھیں گے، چاہے موسم کے لحاظ سے وہ کتنا ہی مضر کیوں نہ ہو۔ اسکو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ تو یہ جانتا ہے کہ مسلمان کو گوشت اس لئے کھانا چاہئے کہ ہندو اس سے ناراض ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ یہ اسلامی طرہ امتیاز ہے۔ مرغن اور چٹپٹی چیزیں جو گراں ہونے کے ساتھ معدہ کے لئے مضر ہیں اور بھوک کو مارتی ہیں آپ اسے چٹخارے لیکر کھاتے ہوئے دیکھیں گے۔ برخلاف اس کے ہندو وہ غذا استعمال کرتے ہیں جو قیمت کے لحاظ سے سستی سے سستی اور افادہ اور حفظ صحت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو۔ ترکاریاں، سستے پھل، دودھ اور دہی وغیرہ ان کی خاص غذا ہے۔ ہم میں کتنے ہیں جو ترکاریاں

کی اہمیت اور حفظ صحت میں ان کے موثر ہونے کا علم رکھتے ہیں اور پھر کتنے ہیں جو استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو غذا سستے داموں ان کی محافظ صحت بن جاتی ہے ہمیں وہ گراں قیمت میں بھی میسر نہیں آتی۔ اگر یہ سچ ہے کہ غذا انسان کا مزاج بنانے اور اس کے کیرکٹر کی ساخت میں بڑا دخل رکھتی ہے تو اس کا اثر ہم ہندو قوم میں یوں دیکھ سکتے ہیں کہ وہ نہایت حلیم، بردبار اور صلح کل قوم ہے۔

غلو، مذہب اور اسکا اثر معاشرت پر

مسلمانوں کو اپنا مذہب بہت پیارا ہے۔ وہ اسکی راہ میں اپنی زندگی اور اپنا مال و متاع سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ جہاں اسلام پر، شعائر اسلام پر، ایک لفظ آئے وہاں یہ اپنا خون پسینہ ایک کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنے مذہب سے ان کی یہ شیفتگی اور والہانہ عقیدت یقیناً قابل قدر ہے اور یہی ان کا حقیقتاً وہ جوہر ہے جو ان کی ہزار کمزوریوں کے باوجود ان کی پوزیشن قائم رکھے ہوئے ہے۔

اسلام نے ہر جگہ عقل کو مخاطب کیا ہے، اپنے پیرؤں سے تدبر کرنے اور عقل سے کام لینے کا ہر جگہ مطالبہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ عرصہ سے یہ بات ان سے مفقود ہو چکی ہے۔ کورانہ تقلید انکا شیوہ ہو گئی۔ یہ لکیر کے فقیر ہو گئے اور عقل و تدبر سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ رہا۔ اس ایک نقصان سے ہی ان میں ہر طرح کی برائیاں اور بے عقلی کی باتیں زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ظاہر ہوئی ہیں، اور برابر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک موٹی سی مثال آپ کے سامنے پیش کروں قرآن پاک اور حدیث شریف میں تعمیر مساجد کو نیک کام اور باعث اجر و ثواب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن و حدیث ہی میں اور بھی بہت سے کام بھی موجب خیر اور باعث اجر قرار دئے گئے ہیں۔ بھوکے کو کھانا کھلانا۔ پیاسے کو پانی پلانا۔ قرضداروں کا قرض ادا کرنا۔ بیوہ اور یتیموں کی خبر گیری کرنا۔ مفلسوں، ناداروں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا۔ جاہلوں کو تعلیم دلانا وغیرہ۔ اب ہر مسلمان جس کو خدا نے صاحب استطاعت بنایا ہے۔ جب کبھی کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے اسکو سب سے پہلے مسجد ہی بنانے کا خیال آتا ہے، اور وہ مسجدوں کے کافی تعداد میں ہوتے ساتھ اسی جگہ ایک اور مسجد بنا کر کھڑی کر دیتا ہے، جہاں اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور جو مصلین کے نہ ہونے کی وجہ سے ویران پڑی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے کام تھے جو باعث خیر و برکت

بھی تھے اور جو ملکی یا قومی فوری ضروریات کے لحاظ سے بہت اہم قرار دئے جا سکتے تھے، لیکن ان کی طرف قطعاً توجہ نہیں کی جاتی۔ ایک بستی جہاں کنواں نہ ہو، ایک ایسا گاؤں جہاں شفاخانہ نہ ہو، ایک ایسا موضع جہاں درسگاہ نہ ہو ـــــ بلا سے نہ ہو۔ مسلمان جب سوچے گا مسجد ہی بنوانے کا تصفیہ کرے گا۔ اگر اس وقت ذرا عقل سے کام لیکر مختلف کاموں میں سے ایک کا انتخاب موقع و محل کی ضروریات کا لحاظ رکھکر کیا جاوے تو وہی کام زیادہ فائدہ رساں زیادہ موزوں اور زیادہ باعث اجر و ثواب ہو سکتا ہے۔

آج وطنی ضروریات کے لئے روپیہ کی حاجت ہے۔ قومی تعلیم کے انتظام کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے اگر اصحاب حیثیت عقل کی روشنی میں صحیح موقع و محل کا تعین کر لیں تو کچھ مشکل نہیں کہ موجودہ وطنی انجمنیں اور قومی ادارے مالی لحاظ سے مطمئن ہو کر مستحکم بنیادوں پر نہ قائم ہو جائیں۔ اور در اصل قومی ترقی نام ہے ان ہی اداروں اور انجمنوں کے پھولنے اور پھلنے کا۔

شادی بیاہ کی رسومات اور ان کا اثر معاشرت پر

شادی جس کے اصل معنی خوشی کے ہیں اور مسلمانوں میں اسکا استقبال اگرچہ نہایت شاندار طریقہ پر شادیانے بجاکر اور آتش بازی چھوڑ کر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ شادی کا پہلا دن ہی ایک مسلسل اور ہولناک ٹریجڈی کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اور اس ایک دن کی شادی کی وجہ سے بعد میں جو مصیبتیں اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا دن شادی کا نہیں بلکہ غمی کا تھا۔

شادی کے ایک دن ہی نہیں بلکہ اس کی سلسلہ جنبانی ہوتے ہی جن رسوم کی بھرمار ہوتی ہے ان کی کوئی حد نہیں۔ غریب سے غریب آدمی بھی اس وقت غنی بن جاتا ہے، اور بے دریغ روپیہ قرض لیکر اپنی خوشی سے پھلجھڑیاں چھوڑتا ہے اور طرح طرح کے بیہودہ کھیل تماشوں میں صرف کرتا ہے۔ ان بیہودہ رسوم کو مستحبات یا واجبات ہی کا درجہ حاصل نہیں ہے بلکہ فرائض سے بھی بڑھکر ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک غریب سے غریب آدمی پر بھی سب رسوم کی ادائیگی بالضرور ی ہے۔ بغیر ان کے اول تو شادی ہو ہی نہیں سکتی اور اگر کسی نے ہمت کر کے کر دی تو اپنے خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ عزیز و اقارب اس سے ملنا جلنا ترک کر دیں گے اور وہ خود مارے ندامت کے زمین میں گڑا جائے گا گویا اس نے سوسائٹی کا

بُرا جرم کیا ہے۔ ہاں عزیز و اقارب اور خود اس کو خوشی اس وقت حاصل ہوگی جب شادی کے بعد قرض کا انبار اسکی گردن پر ہو جائے اور قرضخواہ شادی کے بعد ہی سے آئے دن تقاضا کر کے ادہر میاں بیوی کا عیش اور ادھر ماں باپ کی نیند حرام کر کے جائداد نیلام پر چڑھوا دے۔

ان شادیوں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شادی، بیاہ ہونے کے لئے طرفین کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی - اکثر صورتوں میں تو ان میں اپنا نیک بد سمجھنے اور بُرے بھلے میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی اور جن میں ہوتی ہے ان میں لڑکے یا لڑکی کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنا رفیق حیات اپنی مرضی اور منشا سے منتخب کرے۔ بلکہ والدین یا سرپرستوں کی مرضی اور حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دینا ہوتا ہے - اور اس کو لڑکے اور لڑکی کی اطاعت اور فرمانبرداری کا بہترین ثبوت تصور کیا جاتا ہے - لڑکی کے منہ سے اس معاملہ میں ایک لفظ بھی نکلنا اس درجہ کی بیحیائی میں شمار ہوتا ہے جو نا قابل درگذر نہیں - اول تو ان بے زبانوں کے منہ سے اس قسم کی کوئی بات نکلنے ہی کیوں لگی۔ لیکن اگر کسی باہمت لڑکی نے اپنی زندگی خراب ہوتے دیکھکر اس قسم کا کوئی اشارہ کیا تو بس سمجھئے آفت آگئی ، ہر طرف سے تھو تھو ہونے لگتی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر دو ایسی غیر مانوس ہستیوں سے جوڑا بنتا ہے جن کے طبائع مختلف ، خیالات مختلف ، ذوق مختلف غرض کسی چیز میں مطابقت اور ہمرنگی نہیں ہوتی - اور اس سے جو نتائج آجکل کی شادیوں کے فوراً بعد ہی رونما ہوتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ طوطی اور کوا کبھی بھی ایک ساتھ زندگی نہیں گذار سکتے آپ ہزار ان دونوں کو ایک قفس میں بند کر کے رکھیں ان کی معاشرت کبھی نہیں بدل سکتی۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ان تمام بیہودہ ڈھکوسلوں کو مذہب کی پیروی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں مذہب کے اتنی ہی مخالف ہیں جتنی عقل سلیم کے - پھر یہاں یہ بھی اگر آپ سن لیں تو اچھا ہو کہ حق انتخاب کو والدین جو بلا شرکت غیرے اپنا حق تصور کرتے ہیں اس میں ان کی پسند اور انتخاب کی بڑی وجہ مال و جاہ اور دولت و ثروت کا حصول ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے ایسی مثالیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی کی شادی تین چار گنے عمر والے سے ہو جاتی ہے جو صاحب مرتبہ اور دولت مند ہو۔ اب مہر کا مسئلہ سامنے لائیے تو یہاں بھی

والدین کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو بڑے سے بڑا عدد یاد ہو وہی مہر مقرر ہو جائے۔ اور یہ فریق ثانی کی طرف سے بہت آسانی سے یوں پورا ہو جاتا ہے کہ یہ چیز کبھی دینے کی تو ہے نہیں جس میں کچھ قیل قال کی گنجائش ہو۔ اس کا خمیازہ اس وقت بھگتنا پڑتا ہے جب میاں بیوی میں اختلاف کی وجہ سے تفریق کی نوبت آئے۔ اور میاں بھی طلاق دیکر اپنا پیچھا چھٹانے پر تیار ہوں لیکن مہر کی ادائگی کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آنے لگے۔ اور یوں مہر نہ ادا کرنے کی وجہ سے بیوی کو "معلقہ" بنا کر رکھنا پڑے۔ یہاں طلاق کا لفظ آگیا تو اس کے متعلق بھی اتنا کہدوں کہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالنا موجودہ معاشرت میں اتنا بڑا جرم خیال کیا جاتا ہے جو نا قابل معافی ہے۔ چاہے میاں بیوی کُڑھ کُڑھ کر جان ہی کیوں نہ دیدیں بس یہی نہیں کر سکتے۔ اس سے خاندان کی بدنامی لازم آتی ہے جو خاندان کے لئے اتنا بدنما داغ ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔

صرف ایک شادی کے معاملہ میں جہالت کے باعث ان بیہودہ رسوم اور ان من گھڑت ڈھکوسلوں کو معاشرت میں وہ درجہ حاصل ہو چکا ہے جس نے اصل اسلامی معاشرت کے چہرہ کو چھپا دیا ہے، اور سماج میں ان کو وہ رتبہ مل چکا ہے کہ اب ان کی مکمل اصلاح معجزہ سے کم نہیں معلوم ہوتی۔ شکر ہے کہ کچھ ہی خواہان وطن نے شادی کی چند در چند اور پیچیدہ رسموں میں سے سب سے زیادہ خطرناک اور مضر رسم کے استیصال کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور ان کی کوششوں سے بچپن کی شادی کے خلاف ایک طرح کا عام جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ "Age consent committee" نے جس میں ۹ ہندوستانی اور ایک یوروپین ممبر تھا۔ اپنی رپورٹ میں تحریر کیا تھا کہ ہندوستان کی تقریباً نصف لڑکیوں کی شادی ۱۵ سال سے کم عمر میں ہو جاتی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں درج ہے کہ "دس سال کی عمر سے کم میں بیس لاکھ لڑکیوں کی شادی کی جا چکی تھی۔ اور ایک لاکھ ان میں سے بیوہ بھی بن چکی تھیں۔" سارد ا ایکٹ پاس کرنے کی جو ضرورت محسوس کی گئی اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کے مطابق عورت کی عمر جب تک ۱۴ اور مرد کی ۱۸ سال نہ ہو جائے شادی جائز نہیں سمجھی جاتی۔

لیکن اس ایک خرابی کے علاوہ اور جو جو رسوم مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں، اُن کے دفعیہ کے لئے بھی ایک متحدہ اور منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے عوام کے ذہن و دماغ سے جہالت اور توہمات کا پردہ دور کرنا ہی ضروری ہوگا۔ ورنہ ان کی جہالت اور توہم پرستی قومی ترقی کی راہ میں ہمیشہ سنگ گراں ثابت ہوتی رہے گی۔

تعلیم نسواں اور پردہ | اب وقت کا ایک اہم مسئلہ یعنی تعلیم نسواں اور اس سے پیدا شدہ ایک ضمنی بحث پردہ کے متعلق ہمارے سامنے ہے۔ قدیم و جدید نقطہ خیال کے دو مورچے ہمیں یہاں نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ تعلیم کا زبردست حامی ہے تو دوسرا اتنی ہی شدت سے اس کا مخالف۔ ایک جماعت پردہ کو ضروری سمجھتی ہے تو دوسری اسے سوسائٹی سے نکال باہر کرنے پر مصر نظر آتی ہے۔ لیکن عام طور پر بہت واضح اکثریت اسی طبقہ کو حاصل ہے جو پردہ کا حامی اور تعلیم کا زبردست مخالف ہے، اور جس کی وجہ سے مسلم قوم کا نصف عنصر بلکہ نصف سے زیادہ فطری طور پر تاریکی اور جہالت میں پڑا رہنے پر مجبور سمجھا جاتا ہے۔ اور یوں عورتیں بالکل جاہل رہتی ہیں۔ ان کا حس مردہ ہو کر یہ احساس ان میں باقی نہیں رہتا کہ جب وہ اشرف المخلوقات بن کر دنیا میں آئی ہیں تو ان پر بھی کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔ اور سوسائٹی میں برابر کا رکن ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کی بلندی یا پستی کی بہت کچھ وہ بھی ذمہ دار ہو سکتی ہیں۔

پردہ کے معنی یہ سمجھ لئے گئے ہیں کہ عورتوں کو مکان کی چہار دیواری میں اس طرح مقید کر کے رکھا جائے کہ بس ان کو موت ہی مکان کی چوکھٹ سے باہر نکال سکے۔ اور اگلے لوگوں کا یہ مقولہ کہ "عورت کا قدم گھر سے موت کے بعد ہی نکل سکتا ہے" مسلم قوم کی عام ذہنیت کو صاف طور پر ظاہر کر رہا ہے۔ اس طرح بیچاری یہ اللہ کی بندیاں مردوں کی مرضی پر بھینٹ چڑھ کر اندھیری کوٹھریوں، غیر صحت بخش مکانوں میں طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو کر بغیر کسی مقصد کے بیکار اور نامراد زندگیاں پوری کرتی ہیں۔ امیروں کے لئے تو یہ زیادہ مضر نہیں ہے۔ لیکن شہر کے غریب گھروں کی تندرستی پر اس کا بڑا خراب اثر پڑتا ہے۔

صرف ایک پردہ کی غیر ضروری حمایت اور تعلیم نسواں کی بلا وجہ مخالفت سے قوم کے جسم و دماغ

کو جیسا کچھ نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی تلافی کی اب یہی صورت ہو سکتی ہے کہ محبان قوم اصلاح معاشرت کا بیڑا اٹھائیں اور لوگوں کو نفع و نقصان سمجھا کر قومی ترقی کا مفہوم ذہن نشین کرائیں۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب قوم سے جہالت دور ہو۔

یہاں اگر ہم پردہ پر جس کو اسلامی فرض قرار دے کر اس کے ذریعہ ایک دوسرے اہم فرض یعنی تعلیم نسواں کی مخالفت کی جاتی ہے کچھ اظہار خیال اسلامی نقطہ نگاہ واضح کرنے کے لئے کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

عہد رسالت میں جو عمل تھا اس کو دیکھتے ہوئے نیز حضورؐ کے ارشادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام محدثین و فقہا اس امر کا صراحتہً اقرار کرتے ہیں کہ عورت کا گھر سے باہر نکلنا۔ عام جلسوں میں شرکت کرنا اور مریض کی عیادت وغیرہ کے لئے باہر جانا نہ صرف جائز ہے بلکہ استحبابی درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ البتہ زمانہ مابعد میں علمار نے اجتہاد کر کے اخلاقی بداعمالی کے احتمال سے ناجائز قرار دیا ہے۔ اس علمار کے اجتہاد سے قطع نظر کر کے جہاں تک اسلامی احکامات کا تعلق ہے عورتوں کے باہر نکلنے پر کوئی بندش عائد نہیں کی گئی ہے۔ اور ان کو اجازت ہے کہ ادھر ادھر چل پھر کر حوائج زندگی پوری کریں۔ البتہ آج کل کی "مغربی" دوشیزہ" کی طرح زیب و زینت کی تھرکتی ہوئی تیلی بن کر "مستقل دعوت معصیت" بن جانا نہ اسلام کا مقصد ہو سکتا ہے اور نہ کسی اصلاحی نظام کا یہ مقصد ہونا چاہئے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے سیاسی اور ملی زندگی میں عورت پر زیادہ ذمہ داریاں عائد نہیں کی ہیں کیونکہ قانون "تقسیم عمل" (جس پر ہم ابھی بحث کریں گے) کے لحاظ سے فطرتاً اس کے فرائض کو گھر کی زندگی سے متعلق کیا گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں عورتوں کے واسطے یہ دروازہ بالکل بند ہے۔ اسلام نے عورت کو تمام شرعی معاملات میں اجتہاد کا حق دیا ہے۔ میدان جنگ میں اس کو اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع عطا کیا گیا ہے۔ غرض دنیا کے تمام اجتماعی اور سیاسی مجلسوں میں عورت کو شرکت کی عام اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ عہد رسالت میں نوجوان لڑکیاں۔ خانہ نشین عورتیں "خیر و برکت" کی مجلسوں میں شرکت کرنے کے لئے علانیہ باہر نکلتی تھیں اور مسلمانوں کے تمام جلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔

اب یہ بات صاف صاف ظاہر ہو گئی کہ مسلمانوں نے پردہ کا جو مفہوم اپنے ذہن میں سمجھ رکھا ہے

اور جس کے ماتحت انھوں نے عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں مقید کر رکھا ہے اور اپنے اس فعل کو احکام اسلام کی پیروی کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ اپنے اس عمل میں جادۂ حق سے بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔

پردہ کا مسئلہ اسلامی نقطہ نگاہ سے اس طرح صاف ہو جانے پر یہ بالکل صاف نظر آرہا ہے کہ اسلام کا نظریہ تعلیم نسواں کے متعلق کیا ہوگا۔

قبل اس کے کہ عورتوں کی تعلیم کے متعلق کچھ کہا جائے اس مابہ النزاع مسئلہ پر بھی کچھ مختصراً کہنا ضروری ہے کہ عورت اور مرد کے کیا کیا فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے عورت اور مرد کا مسئلہ کچھ عجیب پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ اور ہمیشہ اس مسئلہ پر کسی نہ کسی پہلو سے بحث و مباحثہ کا دروازہ کھلا رہا ہے۔ لیکن زیادہ تر بحثیں اسی بنا پہ ہوئیں کہ عورت اور مرد کے فرائض اور ذمہ داریوں میں کوئی تقسیم نہیں کی گئی۔ آج ہم عورت اور مرد کے فرائض طے کرلیں تو تعلیم کا مسئلہ نہایت آسانی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ آج کل سماج نے عورت اور مرد کی ذمہ داریاں اور فرائض یا تو بالکل یکساں سمجھ رکھے ہیں یا ایک عنصر کو تمام ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش کرکے ناکارہ بنا رکھا ہے جس سے اس مسئلہ میں پیچیدگیاں رونما ہوگئی ہیں۔

قدرت نے مرد و عورت کو دو مختلف جنس بنایا۔ جن کی طبیعتیں اور خصائل مختلف ہیں۔ کچھ جسمانی فرق بھی رکھا۔ یہ تمام چیزیں بتلا رہی ہیں کہ ان دونوں کے فرائض بھی مختلف ہوں گے۔ قدرت نے عورت پر مرد کے مقابلہ میں بدرجہا ذمہ داریاں عائد کی ہیں۔ جس وقت ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ عورت کے لئے قدرت نے یہ طے کر دیا ہے کہ وہ گھر کے اندر حکومت کرے، اور مرد بیرونی انتظام اپنے ہاتھ میں لے مرد کمائے اور عورت انتظام کے ساتھ صرف کرے۔ عورت بحیثیت ماں کے بچوں کی لائق معلمہ ہو۔ ان کی تربیت اور ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری اس پر ہو۔ ان ذمہ داریوں کے ساتھ اگر خارجی اتنی ہی کثیر ذمہ داریاں جتنی مرد پہ عائد ہیں اس پر اور لگائی جائیں اور عورت ان کو بھی انجام دینے پر مجبور کی جائے تو ظاہر ہے کہ گھر کی وہ خوشگوار فضا باقی نہ رہے گی جو اصول "تقسیم عمل" کی اصل غرض ہے۔ اس لئے کہ اسلام میاں بیوی کے میل ملاپ اور تقسیم عمل سے گھر میں جنت کا سا امن و چین اور اطمینان و سکون پیدا کرنا چاہتا ہے جہاں

وہ بیٹیاں عیش و آرام اور کامل اطمینان خاطر کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ گھر میں خود اتنے متنوع معاشی کام ہوتے ہیں کہ ان کا سلیقہ مندی سے ادا کرنا بھی عورت کی لیاقت اور قابلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ چھوٹی سی ایک مثال کو لیجئے۔ آج کل متوسط اور اعلیٰ طبقہ کا یہ حال ہے کہ کپڑوں میں بٹن اور ہک تک درزی کی دوکان سے لگ کر آتے ہیں اور صرف کپڑوں کی سلائی پر آمدنی کا بہت کافی حصہ خرچ ہو جاتا ہے۔ سلائی بعض صورتوں میں کپڑے کی قیمت سے بھی زیادہ پڑ جاتی ہے۔ اگر کپڑے گھر میں تیار ہونے لگیں تو یہ گھر کی بہت کچھ معاشی خدمت ہوسکتی ہے۔ ایسے ہی اور گھر میں بہت سے چھوٹے چھوٹے کام ہوتے ہیں جن کو اگر عورت اپنی زیر نگرانی پورا کرائے تو گھر ایک چھوٹا سا معاشی نمونہ بن جاتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا اس کا مقصد صاف لفظوں میں یوں سمجھئے کہ افراط اور تفریط کے درمیان ایک "طریق وسطیٰ" نکالنا ہے۔ عورت کو نہ تو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ دفتر میں ٹائپسٹ بن کر اپنی معاش کا خود بندوبست کرے، اور نہ اسکو گھر میں مقید رکھکر صرف چولھے چکی کے کام تک اس کے فرائض محدود کر دئے جائیں۔ بلکہ ایک لائق معلمہ بننے کے لئے اس کو انتہائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور گھر کی ہوشیار منتظمہ بننے کے لئے امور خانہ داری میں مہارت بہم پہنچانے کا۔ کیونکہ یہی بیٹیاں آگے چل کر بیوی اور ماں بنتی ہیں اور یہی گھر کے معیار زندگی کا تعین کرتی ہیں۔

اب عورت کی تعلیم کا مسئلہ اور اس کی تعلیم کی غرض و غایت گو بالکل واضح ہو گئی۔ عورت پر بحیثیت بچوں کی معلمہ اور منتظمہ مکان ہونے کے دو جداجدا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بچوں کی تربیت لائق ماں سے زیادہ اچھی کون کرسکتا ہے۔ اس لئے اس کو اصول تربیت و تعلیم سے پورے طور پر واقف ہونا چاہیئے اور مکان کے انتظام کے لئے امور خانہ داری میں پوری مہارت ہونی ضروری ہے۔

یہ خیال یہاں بجا طور پر گذر سکتا ہے کہ میں نے عورتوں کے فرائض کو دو عنوانوں کے ماتحت محصور کر کے سیاسی اور ملی فرائض اور خدمات کے لئے بالکل گنجائش نہیں چھوڑی۔ لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ اسلام نے سیاسی اور ملی زندگی میں عورت پر زیادہ ذمہ داریاں عائد نہیں کی ہیں کیونکہ قانون

"تقسیم عمل" کے لحاظ سے فطرتاً اس کے فرائض زیادہ تر گھر ہی کی زندگی سے متعلق رکھے گئے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عورتوں کے واسطے یہ دروازہ بالکل بند ہے اگر آج اپنے فرائض مفوضہ کی ادائیگی کے ساتھ وہ قوم و ملک کی صدا کو لبیک کہکر سیاسی میدان میں اپنی خدمات پیش کرتی ہیں تو ان کی جذبہ حب وطن و قوم کی قدر اور ان کی ہمت کی داد دیے کہ اس میدان میں بھی ان کا پُر جوش طریقہ پر استقبال کیا جا سکتا ہے۔ اور اسے قومی ترقی کا آخری زینہ سمجھنا چاہیئے جب قوم کا ہر فرد اس کا خادم بن کر قوم کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک عورتیں شہریوں کے فرائض کو اچھی طرح نہ سمجھیں گی اس وقت تک ملکی اور قومی ترقی نہیں ہو سکتی ۔ عورتوں کی ذہانت، گھر کی ذمہ داریوں کا احساس، خانگی کاموں کا تجربہ، ان چیزوں سے عورتوں کی فہم و ذکاوت میں تیزی پیدا ہوتی ہے ۔ اگر ان کی معاشرتی حیثیت کو بلند کیا جائے اور ان کا مشورہ پبلک کاموں میں بھی شریک رہے تو یہ چیز قوم و ملک کے لئے مفید ثابت ہو گی ۔ تمدن کی ترقی ۔ اعلیٰ نصب العین کے حصول اور اصلاحی کوششوں کے لئے عورتیں بہت کچھ کام کر سکتی ہیں ۔

یہ ضرور ہے کہ تعلیم نسواں کے موجودہ طرز تعلیم اور نصاب تعلیم سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جو اوپر بتایا گیا اس لئے موجودہ کالجوں کی اصلاح یا ایسے علیحدہ کالجوں کا قیام ضروری ہے جہاں صحیح نصب العین کو سامنے رکھکر ان کے لئے نصاب تعلیم تیار کیا جائے اور اس کے ماتحت ان کی تعلیم خاندانی، ملکی، اور قومی ضروریات کے لحاظ سے ان کو دی جائے ۔

مردوں کی تعلیم کے بارے میں میرا یہاں کچھ عرض کرنا موزوں نہیں معلوم ہوتا ۔ کیونکہ یہ مسئلہ آج بھی خواہان ملک اور مدبران قوم کی خاص توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ۔ اس کی موجودہ خرابیوں اور ان خرابیوں کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کو انھوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا ہے ۔ اور اس کے دفعیہ اور کل نظام تعلیم کی اصلاح کی کوششیں برابر جاری ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اقتصادی اور مادی مرفہ الحالی کا انحصار ایک کامیاب صنعتی اور حرفتی نظام تعلیم ہی سے ممکن ہے، اگر ان کی مساعی کامیاب ہوئیں جیسی کہ امید ہے تو پھر اس مدت کے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آ جانا کچھ بعید نہیں ہے ۔ اور اسی مسئلہ کا

صحیح حل حقیقتاً قوم کے دل و دماغ کے لئے وہ صحیح اور مجرب نسخہ ہوگا جس سے قوم شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکے گی۔

خاتمہ کلام | ہر ہر شعبہ حیات کے اس دھندلے خاکے سے آپ نے "قومی اخلاق" کی ایک تصویر اپنے ذہن میں ضرور کھینچ لی ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں کی جہالت اور مذہبی رسوم کی بیہودہ جکڑ بندیوں نے قومی امنگوں کو کس طرح پامال کیا ہے۔ اور قوم کے عام اخلاق و عادات پر کیا کچھ اب تک اثر کیا ہے۔

عام معاشرتی حالات کا اثر قوم کی اخلاقی حالت پر نہایت اہم پڑتا ہے۔ پس جس قوم کا طرز معاشرت ہمت افزا اور جدید پرور ہے اس کے افراد بالعموم بلند خیال، عالی حوصلہ اور مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے تجارتی مرکزوں کے مصروف کار ہندوؤں اور شہروں کے کاہل پسند مسلمانوں کی حالت کے موازنہ سے معاشرت کا اثر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اگر ایک اپنے کام میں پوری تندہی اور توجہ سے مصروف ہے۔ لمحہ لمحہ اس کو جان سے عزیز ہے، اور کام کے شوق میں صحت تک قربان کرنے کو تیار ہے تو دوسرے میں اس گرم جوشی کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس افسردہ دلی اور وقت کی ناقدری کو دور کر کے شہر شہر اور قصبہ قصبہ ہر ہر فرد میں بہبودی کی امنگ اور کاروبار کا شوق پیدا کرنا قومی ترقی کی طرف زبردست قدم ہو سکتا ہے۔

اخلاق و عادات کا اثر صحت اور تندرستی پر نہایت قوی اور دیرپا ہوتا ہے۔ آج کل بدقسمتی سے مسلم قوم کے بہت سے نوجوانوں کی پس ماندگی، خستہ حالی، اور دائم المرضی کا باعث اُن کی غلط کاریاں، بے اعتدالیاں، اور اخلاقی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ بادہ نوشی اور آوارہ گردی کا رواج جس کو معاشرتی خرابیوں کی انتہائی حد سمجھنا چاہیئے آج بدقسمتی سے ہماری قوم پر مسلط ہے اور قوم کے جسم کا خون جونک کے مانند چوس رہی ہے، مسلمانوں کی اخلاقی حالت حد درجہ تشویشناک ہو چکی ہے اور اس کے بداثرات ہمارے اسکولوں اور کالجوں تک پہنچ رہے ہیں، اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری

معاشرت اس میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے، اگر اخلاقی مدافعت اور حفاظت کا جلد انتظام نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ قوم کا بہترین حصہ جس کی ذات سے قوم کی بے شمار امیدیں وابستہ ہیں ان موذی اثرات کا شکار ہو کر ہمیشہ کے واسطے مسلم قوم کی قسمت کا فیصلہ کر دے۔ لہذا بہی خواہان ملک کا اولین فرض ہے کہ اس آتش جہاں سوز کو جلد بجھائیں۔ لوگوں میں نہ صرف اپنی تحریر و تقریر بلکہ اپنے طرز عمل اور ذاتی مثال سے پاکبازی، بلند خیالی اور جدید پسندی کی مستقل عادتیں پیدا کر کے ان کو شاہراہ ترقی پر لائیں۔ اگر اخلاق کی نگہداشت نہ کی گئی تو ان عادات خبیثہ کو جو طوفان کی طرح بڑھ رہی ہیں، قوم کے لئے پیام مرگ سمجھئے۔

اب تک جو جو معاشرتی خرابیاں اس چھوٹے سے مضمون میں پیش کی گئیں ان سے بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہر ہر شعبہ حیات میں چھوٹی، چھوٹی خرابیوں اور معمولی معمولی نقائص نے ایک ساتھ ملکر مجموعی حیثیت سے کیا صورت اختیار کر لی ہے۔ اور کس طرح ان چھوٹی چھوٹی پھنسیوں نے قوم کے مضبوط اور قوی جسم کو کمزور و ناتوان کر دیا ہے، اور اگر جلد ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو ڈر ہے کہ یہی معمولی پھنسیاں کچھ دنوں میں دنبالہ کی شکل اختیار کر کے قوم کے نحیف و ناتوان جسم کو سپرد خاک نہ کر دیں۔

اگر اس قوم کو اس خطرناک صورت حال سے بچانا ہے اور اس کو ترقی کی راہ پر لگانا ہے تو زعمائے قوم ہی کا نہیں بلکہ ہم میں سے ہر فرض شناس شخص کا جو درد مند دل رکھتا ہے سب سے اول یہ فرض ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح کا علم صدق دل اور خلوص قلب کے ساتھ بلند کرے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے گھر، اپنے خاندان اپنے محلہ اور اپنے شہر سے اس کی ابتداء کرے تو کچھ بعید نہیں کہ قوم کا مرجھایا ہوا درخت پھر ہرا بھرا ہو کر برگ و بار لے آئے۔

غزل

(از جناب جلیل قدوائی صاحب بی اے)

مرا جنونِ محبت تو کوئی راز نہیں ترے ہی پاس مگر چشمِ امتیاز نہیں

سبب یہ ہے جو ہے تو کیفِ عشق سے محروم کہ سوزِ عشق تو ہے دل میں تیرے ساز نہیں

کچھ اور دن اسے رکھ آتشِ محبت پر کہ تیرے شیشۂ دل میں ابھی گداز نہیں

سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہ خاموشی بیانِ رازِ حقیقت میں ہے یہ راز نہیں

وبالِ جاں ہو نہ کیوں عشق کے اسیروں کو وہ دل جو تیری محبت سے سرفراز نہیں

کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں

بس ایک لفظ محبت کے ماسوا کیا ہے سنیں جو وہ تو مری داستاں دراز نہیں

عطائے خاص ہے تیری مرا یہ ذوقِ جنوں عطا پہ ناز ہے مجھ کو جنوں پہ ناز نہیں

کوئی کسی سے یہ کہہ دے کہ میرا عشق جلیل
بہانہ ساز ہے لیکن زمانہ ساز نہیں

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

بیماری جب زور پر ہوتی ہے تو بیمار کو بات سمجھانا، دوا اور پرہیز اور احتیاط کی مصلحتیں ذہن نشین کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی گھبراہٹ میں مریض اور تیماردار سب کے سب اسی شخص کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو مریض کو اچھا کرنے کی کوشش کر رہا ہو یہی حال کبھی جھگڑوں میں ثالث یا پنچ کا ہو جاتا ہے، کہ لوگ اسے اپنے جھگڑوں میں اُلجھا دیتے ہیں اور جب اسکا فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے تو جھگڑا کھڑا کرنے کا الزام اسی کے سر تھوپتے ہیں۔ وہ کوئی بڑا ہی شریر آدمی ہوگا جس نے ان دو بلیوں کا قصہ گھڑ لیا کہ جنھوں نے مل کر کہیں سے روٹی چرائی تھی اور اسے ایک بندر کے پاس لے گئی تھیں کہ اس کے دو بالکل برابر حصے کردے۔ بندر بڑا ایماندار تھا، اسے یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ بلیوں میں سے کسی کو اس کے حق سے زیادہ مل جائے۔ وہ ترازو لیکر بیٹھا، اور چونکہ کاٹنے کے لئے بلیاں کوئی چیز نہیں لائی تھیں اس نے روٹی کا جو ٹکڑا تول میں بھاری نکلا اسے اپنے دانتوں سے کاٹ کر چھوٹا کیا۔ وہ یہ دیکھ کر افسوس کرتا رہا کہ ایمانداری کے باوجود وہ دونوں ٹکڑوں کو بالکل برابر نہ کر سکا، اور بلیوں کے درمیان انصاف کرنے کی خواہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری روٹی بندر کے پیٹ میں پہنچ گئی۔ بلیاں بہت خفا ہوئیں، مگر آپ ہی بتائیے کہ بندر نے جو کچھ کیا اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتا تھا، اور اس پر یہ الزام لگانا کہاں تک صحیح ہوگا کہ اس نے انصاف کے نام سے اپنا پیٹ بھرا۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلسطین میں برطانوی سیاست کا مقصد عربوں کے اس لاابالی پن کا علاج کرنا ہے جو ان کی طبیعت میں ایک روگ کی طرح پھیل گیا ہے، یا ملک کی ایسی تقسیم کرنا کہ یہودیوں کے حصے میں آبادی، عربوں کے حصے میں ویرانی رہے، اور انگریزوں کے ہاتھ میں ایسے مرکز آجائیں جہاں سے وہ امن قائم رکھنے، یعنی آبادی کو ویران اور ویرانوں کو آباد ہونے سے بچانے کی تدبیریں

جلد سے جلد کر سکیں۔ بہر حال اس سیاست پر جو الزام لگائے جاتے ہیں ان سے : یار کی بے چینی بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ غصہ بھی جو حق مارے جانے پر ہر آدمی کو ہوتا ہے۔ مصلحتوں کے سمجھنے اور نیک نیتی کی داد دینے والا اس وقت کوئی بھی نہیں اس کی بھی کسی کو پروا نہیں کہ مسئلہ کتنا پیچیدہ ہو گیا ہے یہودی اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں، عرب اپنی ضد پوری کرنے پر تلے ہوئے اور بڑے افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ وہ شاہی کمیشن جس کی رپورٹ پچھلے سال شائع ہوئی سرکاری ہدایت کے مطابق تجویزیں پیش کرنے کے ساتھ رپورٹ میں ایسی بحثیں چھیڑ گیا کہ جن سے خود برطانوی سیاست پر اعتراض کا پہلو نکلتا تھا، اور اس نے فساد کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ اس کے بعد جو کمیشن بھیجا گیا اور جو ابھی فلسطین سے واپس ہوا ہے اسے زیادہ سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر اور معاملوں میں نہ الجھے، اور صرف اس پر غور کرے کہ فلسطین کو انگریزوں، یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کی ایسی کیا تدبیر ہو سکتی ہے کہ جو سب کو مطمئن کر دے۔ اس کمیشن نے کیا طے کیا ہے یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم ہے، مگر عربوں میں جو شورش ہے اس کا سبب غالباً یہ اندیشہ ہے کہ کمیشن کا فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہودی اب تک یہ کہتے تھے کہ ہم بس آباد ہونا اور اپنے گھر کو اپنا کہہ سکنا چاہتے ہیں۔ مگر تقسیم کا نام سن کر ان کے منہ میں پانی آ گیا اور طے کر لیا کہ وہ جان پر کھیل کر فلسطین کے اس حصے کو اپنے قبضے میں رکھنے کی کوشش کریں گے جو شاہی کمیشن نے ان کا حصہ تجویز کیا ہے۔

اس وقت اگر یہ طے ہو جائے کہ فلسطین اصل میں کس کا ملک، کس کا وطن ہے تو شاید اسے تقسیم کرنے یا پورا پورا کسی ایک فریق کو دیدینے کی کوئی ترکیب سمجھ میں آ جائے۔ لیکن یہ طے کرنا کچھ آسان نہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے کئی ہزار برس ہوئے فلسطین یہودی قوم کو دیا تھا، مگر پھر خدا نے اسے چھین لیا، اور اس کے بعد فلسطین اس قوم کو انعام میں دیا جانے لگا جو خدا کی طرف سے یہودیوں کو ان کی شرارتوں اور گناہوں کی سزا دے۔ مسلمان عرب پہلے لوگ تھے جنھوں نے فلسطین پر قبضہ بھی کیا اور یہودیوں کے ساتھ آدمیت بھی برتی۔ اس کا اعتراف خود شاہی کمیشن نے کیا ہے کہ عربوں کی حکومت میں یہودیوں کو پہلی مرتبہ شائستہ اور آبرو کی زندگی بسر کرنا نصیب ہوا، اور جہاں تک عربوں کا

سلسلہ پہنچا، وہ ظلم اور عذاب سے بچے رہے اس وقت جب تمام عیسائی ملکوں میں یہودی آدمیت سے خارج سمجھے جاتے تھے اور ان کو تکلیف دینا ثواب کا کام مانا جاتا تھا، وہ اسلامی دنیا میں ہر طرح سے ترقی کر رہے تھے اور علمی، تجارتی اور سیاسی زندگی میں پورا حصہ لے رہے تھے۔ لیکن تقدیر نے ان میں احسان فراموشی ایسی کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ وہ کبھی نہ اپنے خدا سے راضی رہے اور نہ خدا کے دوسرے بندوں سے۔ اس وقت بھی دیکھئے تو دنیا کی کوئی قوم ان سے خوش نہیں ہے، بس شاید فلسطین کے عرب ہی تھے کہ جو ان کی پرانی روایتوں اور ذہنی تعلقات کے خیال سے انھیں بلا تکلف اپنے ملک میں آباد ہونے دیتے۔ مگر یہاں پہنچ کر انھوں نے بڑے پیمانے پر زمینیں خریدنا شروع کیا، عربوں کو دھتکارنے لگے، اپنی آبادی اور کاروبار سے انھیں الگ رکھا اور ایسا کچھ کیا کہ اگر برطانوی سیاست ان کی پشت پر نہ ہوتی تو وہ کب کے مار پیٹ کر نکال دئے گئے ہوتے۔ مگر فلسطین کے عربوں کو دیکھئے تو ان کا اعمال نامہ بھی کچھ صاف نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جنگ عظیم سے پہلے فلسطین پر ترکوں کی حکومت تھی، یہاں کے بڑے اور با اثر لوگوں کو سلطان عبدالحمید کے زمانے میں سرکاری خزانے سے تنخواہیں ملتی تھیں اور وہ مزے میں گھر بیٹھ کر کھایا کرتے اور سلطان کی فیاضی اور رعایا پروری کے چرچے کیا کرتے تھے۔ سلطان نے ان کی ترقی کی فکر نہیں کی نہ کوئی اسکول کھولا نہ رفاہ عام کی تدبیر سوچی، جب ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے حکومت پر قبضہ کیا انھوں نے تمام تنخواہیں بند کر کے اور الٹے ٹیکس لگائے، کیونکہ وہ تمدن اور تہذیب کی زیادہ سے زیادہ نعمتیں اپنی رعایا تک پہنچانا چاہتے تھے اور اس میں جو کچھ خرچ ہوتا اس میں سب کا شریک ہونا لازمی تھا۔ ان کی پالیسی عربوں کی سمجھ میں نہ آئی، امیروں نے غریبوں کو بھڑکایا، اور جنگ عظیم کے دوران میں عرب انگریزوں سے مل گئے۔ اس اتحاد کی چند شرطیں تھیں، لیکن جو مول تول ہوا وہ انگلستان کی وزارت خارجہ اور شریف حسین اور ان کے بیٹے امیر فیصل کے درمیان ہوا، اس میں فلسطینی عربوں کے نمایندے شریک نہ تھے، اور امیر فیصل نے جب دیکھا کہ فلسطین پر قبضہ رکھنے اور حکومت کرنے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں تو انھوں نے ایک اور سودا کر لیا۔ اگر فلسطینی عربوں میں

آزادی کی خواہش کے ساتھ محنت کا شوق ہوتا، ان کا ملک سرسبز ہوتا اور شہروں میں آبادی اور کاروبار کی چہل پہل ہوتی تو تاریخ ان کے ملک کو کسی اور کا وطن ثابت نہ کر سکتی اور سیاست اسے خالی اور بے مصرف ٹھہرا کر کسی اور کے حوالے نہ کر پاتی۔ لیکن عرب تو پسینے کو خون سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں وہ آزادی اسے سمجھتے ہیں کہ ان پر کسی طرح کی پابندی اور ذمہ داری نہ ہو اور احسان کرنے والا اسی کو مانتے ہیں جو سب کچھ دیتا رہے اور ان سے کچھ نہ مانگے۔ انگریزوں سے شاید انھیں ایسے ہی احسانات کی امید تھی اور چونکہ برطانوی سیاست ان کے معیار پر پوری نہیں اتری تو وہ اس سے بگڑ گئے ہیں۔

شاہی کمیشن کی رپورٹ دیکھئے تو برطانوی سیاست پر دورخی باتیں کرنیکا الزام آتا ہے۔ پہلے عربوں سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ فلسطین سے یہودیوں کو بے دخل کرنے میں مدد دیں گے تو وہ آزاد کر دئے جائیں گے۔ پھر جب یہودی سرمایہ داروں سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہوئی تو یہودیوں سے وعدہ کیا گیا کہ ان کے لئے فلسطین میں ایک قومی وطن کا انتظام کر دیا جائیگا، لیکن نہ عربوں پر یہ ظاہر کیا گیا کہ آزادی سے کیا مراد ہے نہ یہودیوں کو بتایا گیا کہ ان کے وطن کی سیاسی حیثیت کیا ہوگی۔ جنگ عظیم کے بعد فلسطین میں انگریزوں کی عمل داری ہوگئی تو عرب اس کے منتظر تھے کہ برطانوی حاکم رکھ سکیں تو ہم اطمینان کا سانس لیں اور آزادی کی خوشی منائیں، یہودی کہتے تھے واہ، انگریز کیسے جا سکتے ہیں، وہ تو ہمارے وطن کے محافظ ہیں۔ انگریزی عمل داری سے یہودیوں کو طرح طرح سے فائدہ پہنچا، عرب ہر طرح سے نقصان میں رہے۔ یہودیوں نے اس کثرت سے آنا اور آباد ہونا شروع کر دیا کہ معلوم ہوتا تھا وہ اپنی تعداد کے بل پر ہر طرح کا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے امداد باہمی کے ایسے طریقے نکالے کہ جن علاقوں میں وہ آباد تھے وہاں کوئی عرب مزدوری کر کے دو پیسے بھی نہ کما سکتا تھا۔ برطانوی حکومت نے عربوں کے مطالبے پر بھی یہودیوں کی آبادی پر کوئی قید نہیں لگائی، یہودی پرانے شخصی تعلقات کے زور پر حکومت سے اپنے ہر کام میں مدد حاصل کر سکتے تھے عربوں کی غیرت اور جہالت نے انھیں ہر فیض سے محروم رکھا، یہاں تک کہ شاہی کمیشن کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ انگریزی عملداری میں عربوں کی ہر ضرورت اور غرض نظر انداز کی گئی ہے۔ یہودیوں کے

لالچ اور عربوں کے غصے نے آخرکار فلسطین کو بھڑوں کا چھتہ بنا دیا ہے۔ لیکن برطانیہ کے لئے بھی اپنے خاص عہدے سے عزت کے ساتھ دست بردار ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ نہر سوئز کی حفاظت کے لئے لازمی ہے کہ مشرقی بحر روم میں ایک فوجی اور بحری مرکز ہو، اور یہ مرکز اسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب اس کی پشت اور بازو مارنے کا امکان نہ ہو۔ پھر موصل سے تیل کا جو پائپ آتا ہے وہ فلسطین سے گذرتا ہے، اور حال میں جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس پائپ میں سوراخ کرنے کی نئی اور کارگر ترکیبیں نکالی ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہی عرب جنھیں کرنل لارنس نے ترکوں کے بنائے ہوئے پل پٹریاں اور سڑکیں توڑنا سکھایا تھا اب نئی حکومت کے بنائے ہوئے پلوں اور پٹریوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں اور بیس برس سے زیادہ بیکار رہنے کے باوجود ان کے ہاتھ میں پہلے کی سی صفائی باقی ہے۔ اب برطانیہ کو مجبور ہو کر مصر سے فوج کو بلانا پڑا ہے، اور شاید یہ سوچا گیا ہے کہ عربوں کے ہر گاؤں اور ہر محلے کی اس طرح ناکہ بندی کی جائے کہ ان کا کوئی رہنے والا تشدد کی جرأت نہ کر سکے اور نہ کسی باغی کو پناہ دی جا سکے۔ اب سیاست نے گویا تلوار میان سے نکال لی ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ مخالفوں کی گردن اس کا لوہا مانتی ہے یا نہیں۔

فلسطین میں پنچ بننے کی کوشش کا جو نتیجہ ہوا ہے اس سے برطانوی سیاست کو سبق لینا چاہئے تھا لیکن اس کے بجائے ایک برطانوی مدبر کو چکوسلوواکیا بھیجا گیا ہے کہ وہ حکومت اور جرمن اقلیت کے جھگڑے کو چکائے ابھی تو سب برطانیہ کی انسانی ہمدردی اور صلح پسندی کی داد دے رہے ہیں لیکن سیاست کی یہ گتھی لارڈ رنسی من کے سلجھائے نہ سلجھے گی۔ جرمن اس کی پوری کوشش کریں گے کہ لارڈ رنسی من ایک سنگین بنا کر چکوسلوواکیا کے سیاسی جسم میں بھونکیں، انھوں نے برطانیہ کی اس نئی چال کی داد دینے کے ساتھ اس قانون کی مخالفت شروع کر دی ہے جو ابھی چکوسلوواکیا کی مجلس میں منظور ہوا ہے اور جس سے اقلیتوں کو خارجی سیاست، فوج اور قومی مالیات کے سوا ہر معاملے میں سوراج کے اختیارات دیدئے گئے ہیں۔ ہٹلر کو ان اختیارات کی آڑ میں بہت کچھ کرنے کا موقعہ ملے گا، لیکن اگر برطانیہ کے ذریعہ سے یہ اختیارات بڑھا دئے جائیں تو اور بھی اچھا ہے، ہٹلر خوش تو

بہر حال تب ہی ہوگا جب سرحد سے چکوسلواکیا کی سرکاری فوج ہٹانے اور حملہ کے لئے رستہ صاف کرنے کی صورت نکل آئے، پہلے وار کے خالی جانے سے اس کی سیاست کو خاصا صدمہ پہنچا ہے اور اب وہ نہیں چاہتا کہ ناکامیابی کا کوئی اندیشہ باقی رہے۔

واقف کار لوگ کہتے ہیں کہ برطانیہ کے میدان میں آ جانے سے عالم گیر جنگ کا خطرہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ مسولینی کا دیوالہ نکل گیا ہے، ہسپانیہ کی جنگ اب واقعی خانہ جنگی ہوگئی ہے اور اس کا خوف نہیں رہا ہے کہ وہاں سے چنگاریاں اڑ کر آگ کو ادھر ادھر پھیلائیں گی۔ جاپان شل ہو گیا ہے، ایسا شل کہ برطانیہ چین کو تجارتی قرضہ دینے کے مسئلہ پر غور کیا جا رہا ہے اور جاپانی مدبر اس پر برہم ہونے کی بجائے برطانیہ سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کا ارادہ ظاہر کر رہے ہیں۔ ادھر مانچوکو کی سرحد پر روس سے جو چھیڑ چھاڑ سات آٹھ مہینے سے جاری تھی وہ اب ایک باقاعدہ جنگ بنی جا رہی ہے اور معلوم نہیں یہ چنگاری اسی جگہ پڑی پڑی بجھ جائیگی یا اڑ کر کہیں اور پہنچے گی۔ جاپانی اس وقت روس سے لڑنا نہیں چاہتے اگرچہ وہ اپنے بیانات کے مطابق، ہر مقابلے میں روسی فوج کو بھگا دیتے ہیں اور اسے وہ بھگاتے بھگاتے ماسکو تک پہنچا دیں تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ لیکن چین فتح کئے بغیر ان کے لئے ایسے محاذ پر لڑنا جو ملک سے بہت قریب ہے ان کے لئے ایک مصیبت ہوگی اور وہ اس میں بہت نقصان اٹھائیں گے۔ ادھر چینی ہیں کہ ہارتے چلے جا رہے ہیں اور ہار نہیں مانتے۔ جاپانی فوجیں ہانکاؤ کو گھیر رہی ہیں اور اس کے باوجود انھیں پورا یقین ہے کہ فتح انھیں کی ہوگی۔ کوئی ایک مہینہ پہلے ان کی فوجیں سیلاب سے فائدہ اٹھا کر صوبہ شانسی میں گھس گئی تھیں، وہاں سے جاپانی کہتے ہیں وہ نکال دی گئیں، مگر اب کہیں سے اسی طرح کی بے سر و سامان فوجیں مانچوکو میں پہنچ گئی ہیں اور وہاں کی جاپانی فوج اور آبادی کو پریشان کر رکھا ہے۔ ایسی حالت میں اگر روس نے طاقت آزمائی کی ٹھان لی تو جاپان چست ہو جائیگا یا اسے کوئی بہانہ کر کے اکھاڑے کو چھوڑنا پڑیگا، جو شکست کی ذلت اٹھانے سے بھی زیادہ ناگوار اور نقصان دہ ہوگا جاپان کے لئے امید کی صورت یہی ہے کہ روس کے ڈر سے معاملے کو آگے نہ بڑھنے

دے اور جاپان کو عزت کے ساتھ صلح کر لینے کا موقع دے روس ایشیا میں اُلجھ گیا تو پھر چکوسلو واکیا کی خیر نہیں اور چکوسلو واکیا پر قبضہ ہو گیا تو جرمنی کے لئے دو نکھی کیا چوکھی لڑنا بھی ایسا آسان ہو جائے کہ یورپ کی ہر ریاست کو اس سے دبنا پڑ یگا، اور کمیونزم سے یورپ میں جو عام نفرت ہے اس سے فائدہ اُٹھا کر ہٹلر نے اوکرائن کے زرخیز اور کم آباد صوبے پر ہاتھ مارا تو روس کے لئے اسے بچانا بہت مشکل ہو جائیگا۔ مگر دوسری طرف وقت کی مصلحت سٹالن کو ایک مختصر سی جنگ پر آمادہ بھی کر سکتی ہے سوشلزم کے اصولوں اور اس کے پیدا کئے ہوئے حوصلوں سے قومی تعمیر کا بہت کچھ کام لیا جا چکا ہے اب جوش دلانے کی اور تدبیروں کی بھی ضرورت ہے جن میں جنگ سے بہتر کوئی نہیں۔ یہ روسیوں کے قومی جذبے کو بیدار کرے گی۔ پچھلے دو سال میں بڑے بڑے لیڈروں اور فوجی افسروں کو سزائیں دینے سے جو کچھ بے چینی پیدا ہوئی ہے اسے دور کرے گی اور روس کے نئے حاکم طبقے کا تسلط مکمل ہو جائیگا۔ اس سے اسٹالن کا اپنا اثر بھی بڑھیگا اور وہ تمام صنعتی منصوبے جو ابھی پورے نہیں ہوئے ہیں تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔ یہ تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہو جائیگا کہ اسٹالن نے کیا طے کیا ہے اور اسی کے فیصلے کے مطابق ہٹلر کا رویہ بھی بدلے گا اس کا بہر حال کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ دنیا ایک حالت پر قائم رہیگی ؎

تعلیمی دنیا

(جناب عبدالغفور صاحب لکچرر ٹریننگ کالج علیگڈھ)

رسالہ نیو ایرا (New Era) جون میں تعلیمی دنیا کا نہایت بلند پایہ مجلہ ہے محمد مجیب صاحب پروفیسر جامعہ ملیہ کی قلم سے ایک مضمون جامعہ پر نکلا ہے۔ یہ مضمون اڈیٹر نیو ایرا کی درخواست پر لکھا گیا تھا نیو ایرا درحقیقت نیو ایجوکیشن فیلوشپ کا انگریزی ماہنامہ ہے اور اس کی اڈیٹر مس بیٹریس انسر ہیں جنھوں نے اس تعلیمی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ پچھلے موسم سرما میں جب فیلوشپ کے بین الاقوامی وفد نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا تو انھیں بعض اداروں میں وہ بلند اصول جاری و ساری نظر آئے جن کے لئے نیو ایجوکیشن فیلوشپ آغاز کار ہی سے علمی اور ذہنی جہاد کر رہی ہے۔ ان میں سب سے ممتاز مثال جامعہ ملیہ کی تھی۔ اسی بنا پر اڈیٹر نے ادارہ کے ایک رکن سے درخواست کی کہ وہ علمی دنیا کو اس شاندار تجربہ سے روشناس کرادیں۔ اسی نمبر میں خواجہ غلام السیدین صاحب کے قلم سے ایک مضمون ٹریننگ کالج علی گڈھ پر بھی نکلا ہے۔

نیو ایرا کے اسی نمبر میں پروفیسر پیر لووے ڈائرکٹر ژی آن ژاک روسو انسٹیوٹ فور ایجوکیشن سائنس جنیوا نے مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے جس میں انھوں نے تعلیمی ہندوستان کے مخصوص مسائل پر پرمغز انداز میں نقد و تبصرہ کیا ہے۔

ان کے خیال میں ہندوستان کی بہترین درسگاہوں میں بچوں کی نشو و نما کے مادی اور روحانی دونو پہلو پیش نظر رکھے جاتے ہیں اور اس لئے ملک کے مفید ترین ادارے تعلیم کو زراعت و صنعت سے ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پروفیسر موصوف وارد ھا اسکیم کے اپنا خرچ آپ اٹھانے کے اصول پر یقین نہیں رکھتے تاہم

انھیں امید واثق ہے کہ واردھا کی تعلیمی کانفرنس ہندوستانی دیہی مدارس کی تاریخ میں ایک قابل یادگار کارنامہ ہوگی۔

ایک طرف تو دیہی اسکولوں کی انتہائی غربت اور ناداری انھیں فرانس کے زمانۂ قبلِ انقلاب کی یاد دلاتی ہے دوسری طرف انھیں ہندوستان کے بعض ترقی یافتہ ادارے مثلاً ٹریننگ کالج علی گڈھ وغیرہ انکے بہترین تعلیمی انسٹیٹیوٹ کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے اس خوشگوار مثال کا ذکر کیا ہے جو تعلیمی ہندوستان قومیت اور بین الاقوامیت کے صحیح اور متوازن امتزاج کے سلسلے میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یعنی ہندوستان میں جذبۂ قومیت کا خمیر نفرت اور جنگ سے نہیں بنا ہے [۱]

ہندی۔ اُردو۔ ہندوستانی | انٹر یونیورسٹی بورڈ کے پچھلے اجلاس میں مسئلہ زبان پر کئی ایک دلچسپ تجویزیں منظور کی گئی تھیں اول یہ کہ ہندوستانی زبانوں کو ورنیکلر کی بجائے ماڈرن انڈین لینگویج لکھا اور بولا جائے۔ ورنیکلر کے لغوی معنی غلاموں اور ادنیٰ طبقہ کی زبان ہوتے ہیں۔ نئی اصطلاح سے ان زبانوں کو ہماری تعلیمی اور سماجی زندگی میں وہ اہمیت حاصل ہو جائیگی جو ان کا پیدائشی حق ہے۔

اس سے زیادہ دلچسپ اردو اور ہندی کی بحث تھی۔ بورڈ نے تجویز منظور کی کہ ان اداروں میں جہاں ہندوستانی زبانیں اختیاری مضمون کے طور پر لی جاتی ہیں اردو کو بھی اختیاری مضامین کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں سے استصواب رائے کیا گیا تھا کہ آیا اردو پڑھنے والوں کے لئے ہندی کا جاننا لازمی اور ہندی کے متعلمین کے لئے اردو زبان سے واقفیت ضروری قرار دی جائے یا نہیں۔

---

[۱] بنگال کا برت آچاری نوجوان قسم کھاتا ہے کہ وہ بنگال کی خدمت کریگا۔ بھارت ورش کے لئے قربانی کرے گا۔ اور بھارت کے ساتھ ساتھ دنیائے انسان کے لئے بھی جاں نثاری کا ثبوت دیگا پروفیسر موصوف اہل مغرب سے دریافت کرتے ہیں کہ یورپ کے سکاؤٹ یہ قسم کب کھائیں گے؟

نیز اردو اور ہندی کے طلبا پر دیوناگری اور اردو رسم الخط کا جاننا فرض قرار دیا جائے یا نہیں۔

اس ضمن میں مختلف یونیورسٹیوں کے جوابات ان کے ارباب اختیار کے نقطۂ نگاہ اور اس ملک کے طبقہ کی ذہنیت پر جن کی تعلیمی ضروریات کو وہ پورا کر رہی ہیں عجب دلچسپ روشنی ڈالتے ہیں علی گڈھ یونیورسٹی نے دونو تجاویز سے اتفاق کیا۔ ہند و یونیورسٹی بنارس نے دوسری تجویز کو منظور کرنے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں دونو زبانوں کا جاننا طلبا پر ناقابل برداشت بوجھ ہوگا۔ اردو کو اختیاری مضمون بنانے کے سلسلے میں انھوں نے وعدہ کیا کہ جب مالی حالات اجازت دیں گے تو ہم بخوشی اس اصول کو عملی صورت دینے کی کوشش کریں گے۔

اس کے برعکس ڈھاکہ یونیورسٹی نے جو مشرقی بنگال کی مسلمان آبادی کے لئے قائم کی گئی تھی اور جس میں مسلمان طلبار کی زبردست اکثریت تعلیم پاتی ہے تجویز کیا کہ بی اے کے امتحان میں جو طلبا اردو اختیاری طور پر لینگے انھیں دیوناگری رسم الخط کا جاننا بھی ضروری ہوگا۔

ناگپور یونیورسٹی کی رائے میں طلبار کے لئے دونو رسم التحریر سے واقفیت کی شرط اسکول کی ہائی جماعتوں ہی سے عاید کر دینا چاہیئے۔

یوپی میں دونو رسم الخط مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں اس لئے الہ آباد یونیورسٹی کی رائے میں اسے دوبارہ کالج کے درجوں میں رائج کرنا غیر ضروری ہوگا۔ پنجاب اور میسور نے دونو تجاویز سے اتفاق رائے ظاہر کیا۔

مندرجہ بالا آرا کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام ہندوستانی یونیورسٹیاں ماسوا بنارس اس بنیادی اصول پر متفق ہیں کہ طلبار کو دونو رسم الخط جاننا ضروری ہیں۔

انٹر یونیورسٹی بورڈ کے استفسارات نے ہمیں مسئلہ زبان کے اہم موضوع پر بڑی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں ہمیں امید ہے کہ وہ رسم الخط کے علاوہ دونوں زبانوں کی لغت کے مسئلہ پر بھی ایک لمحۂ فکر یہ صرف کریں گے۔ اور ملک کے مقتدر ماہرین تعلیم اور تعلیمی اداروں کے ارباب اختیار سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ سنسکرت آمیز ہندی اور عربی نما اردو کے درمیان میں بڑھتی ہوئی

خلیج کو پاٹنے کی کہاں تک کوشش کرنا چاہیئے ۔ آیا اس میں کامیابی ہو سکتی ہے ۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو اس کے لئے کیا ذرائع اور وسائل اختیار کئے جائیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ ہندوستانی وائس چانسلر مقرر ہو رہا ہے ۔ اب تک پنجاب میں یہ عہدہ حکومت کے انگریز وزیر مال یا وزیر داخلہ وغیرہ کا حق سمجھا گیا تھا ۔ شاید تعلیم کو اتنا غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ اتنے بڑے تعلیمی ادارے کے انتظام کے لئے ایک بے حد مصروف سرکاری ملازم کے فالتو اوقات کو کافی سمجھ لیا گیا تھا ۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے نظام پر حکومت کے ضبط اور اثر کو لارڈ کرزن کے ایکٹ یونیورسٹی ۱۹۰۴ء نے مضبوط کیا ۔ اس آہنی گرفت کو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی تجاویز نے ایک حد تک ہلکا کر دیا اور جو یونیورسٹیاں کمیشن کے اصولوں کے مطابق کھولی گئیں ان میں ملک کے مختلف ادبی ۔ معاشی ۔ کاروباری گروہوں اور اعلیٰ پیشوں کی نمائندگی کا خاص لحاظ رکھا گیا ۔ یونیورسٹیوں کی انتظامیہ انجمنوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے نامزدگی کے بجائے انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا ۔ لیکن اس کے باوجود بعض یونیورسٹیاں پرانے نظام پر ہی قائم رہیں اور ان میں سے پنجاب یونیورسٹی پر سرکاری اثر سب سے زیادہ غالب رہا ۔ شکر کا مقام ہے کہ اب یہ ادارہ بھی دوسری ترقی پذیر یونیورسٹیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔

جرمنی یونیورسٹیوں میں نازی حکومت کے زمانے سے طلبا کی تعداد برابر گھٹتی چلی جا رہی ہے ، ۱۹۳۲ء میں تمام یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد ایک لاکھ سولہ ہزار تھی ۔ ۱۹۳۶ء میں سرسٹھ ہزار رہ گئی ۔ حکومت کے معترضین اس کے کئی وجوہات بیان کرتے ہیں ۔ بعض تو قابل یہودی علما کے اخراج کو اس کمی کا بڑا سبب بتاتے ہیں ، بعض کا خیال ہے کہ جرمنی میں بالعموم علمی تحقیقات اور تدریس کا معیار گھٹتا چلا جا رہا ہے ، درحقیقت اس کی ایک معقول وجہ یہ بھی ہے کہ علمی اداروں ۔ اخبارات ۔ سٹیج ، سینما ان تمام ذرائع و وسائل کو جو عوام کی تعلیم و تربیت کا باعث ہو سکتے ہیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے ، جب ہم مختلف مضامین کے طلبا کے اعداد و شمار پر غور کرتے ہیں تو بے حد دلچسپ انکشافات

ہوتے ہیں۔ مثلاً علم زراعت۔ علم کیمیا اور متعلقہ مضامین کے طلبا کی تعداد میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔ مگر السنۂ جدیدہ کے پڑھنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں ان زبانوں کے متعلمین کی تعداد ۹۸۵۴ تھی ۱۹۳۶ء میں ۲۴۸۰ رہ گئی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید جرمنی قوم نئی نسل میں بین الاقوامی نقطۂ نگاہ اور رواداری پیدا نہیں کرنا چاہتی۔

ریورنڈ سی۔ ایف اینڈریوز نے ہندوستانی کے مسئلہ پر لیڈر میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اس گتھی کو بے تعصبی اور فراخدلی سے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں آزاد ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی جو سنسکرت آمیز ہندی اور عربی نما اردو کے بین بین ہوگی۔ اردو زبان کے ان معترضین کے لئے جو اس کی فارسی لغت پر اعتراض کرتے ہیں انھوں نے ماہرین علم اللغت کی علمی کاوشوں سے مثالیں لے کر ثابت کیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہی ہے۔ دو نو آرین بہنیں ہیں اور اگر ان دونوں سے نئی ہندوستانی زبان کی تعمیر میں امداد لی جائے تو کوئی وجہ تصادم یا مخاصمت نہ ہونا چاہیئے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبا نے پچھلے دنوں سماجی خدمت اور دیہات سدھار کے سلسلے میں مفید کام کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس تحریک کو منظم شکل دینے کے لئے انھوں نے انجمن امداد دیہات کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ انجمن خالصتہً سماجی خدمت کے لئے ہوگی اور اس میں کوئی فرقہ وار یا سیاسی رنگ نہ ہوگا۔ ممبروں کے لئے حاضری لازمی ہوگی اور جو ممبر تین مرتبہ سے زیادہ غیر حاضر رہیگا اسے انجمن سے خارج کر دیا جائیگا۔ ممبر ہونے کی شرائط یہ ہونگی:۔ ہر ممبر کو اس کام کے لئے خاص تربیت حاصل کرنا ہوگی۔ تہواری چھٹیوں اور موسم گرما کی تعطیلات میں ہر ہفتہ کم ازکم تین گھنٹے اس کے لئے وقف کر دینا ہوں گے۔ تربیت کے دوران میں طلبا، تین تین چار چار کی ٹولیوں میں گرد و نواح کے دیہات کا دورہ کیا کریں گے اور اس کام کے لئے تجربہ حاصل کریں گے اور دیہاتیوں سے

تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس تربیت کے بعد انکی سرگرمیوں کا مرکز انکا اپنا گاؤں ہوگا۔ جہاں وہ دیہاتی اساتذہ۔ نمبردار۔ مقامی مکھیا وغیرہ سے مل کر دیہات سدھار کا کام جاری رکھیں گے۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں خدمت خلق کی یہ پہلی آواز اٹھی ہے اور ہمیں امید ہے ملک کے طلبا اس کا پورے جوش سے خیر مقدم کریں گے ہماری یونیورسٹیاں اور کالج جہالت اور بے علمی کے اتھاہ سمندر میں چند جزیروں کے مانند ہیں جن میں ان کے گرد چھائی ہوئی تاریکی کم کرنے کے لئے ایک روشنی کا مینار تک نہیں ہے۔ مغرب میں اوکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیاں بھی جنھیں ہم استعماری اور سرمایہ داری تعلیم کا گڑھ سمجھتے ہیں (University Settlement) جیسی مفید عام تحریک جاری کر دیتی ہیں۔ اور کولمبیا (جنوبی امریکہ) جیسے غیر معروف اور پس ماندہ ملکوں کے بچے بھی جب تھکے ماندے مدرسوں سے واپس جاتے ہیں تو راتوں کو گھر کے بڈھوں اور نوجوانوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ ہمارے کالج اور مدرسے اس بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں جو تعلیمی مدرسہ اور سماج کے درمیان پیدا ہوگئی ہے اور علم کی برقی حرارت صرف مدرسے کی چاردیواری کے اندر ہی دلوں کو نہ گرمائے بلکہ ملک و قوم کو بھی حیاتِ جدید کی امنگوں سے مرتعش کردے۔

ڈاکٹر سبرائن وزیر تعلیم مدارس کے صاحبزادے مسٹر کمار منگلم کیمبرج یونین کے صدر منتخب کئے گئے ہیں۔ کمار منگلم صاحب اس سے پیشتر ہندوستان میں فیڈریشن آف انڈین سٹوڈنٹ سوسائیٹیز کے سکرٹری تھے اور ہندوستانی طلبا کی تنظیمی اور سماجی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں اس معزز عہدہ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اوکسفورڈ یونین میں باوجود جامعہ کی معروف قدامت پسندی کے ہندوستانی طلبا اکثر یونین کے صدر اور سکرٹری چنے گئے مگر کیمبرج میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا انتخاب ہے کیمبرج یونیورسٹی کے طلبا بین الاقوامی رواداری کے اس مظاہرہ پر قابل مبارکباد ہیں۔

مسٹر جان سارجنٹ ہندوستان کے نئے تعلیمی کمشنر مقرر ہوئے ہیں جو اس سے پیشتر کاؤنٹی آف ایسکس کے ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ اس تقرر پر اخباروں میں کچھ نکتہ چینی بھی ہوئی اور یہ امر بہت سے اصحاب کو گراں گذرا کہ ہندوستان کے بہت سے ذی قدر اصحاب کو چھوڑ کر ایک غیر ملکی ماہر تعلیم کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ یہ امر قابل تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کا تجربہ اور انکی ذاتی قابلیت انہیں اس ممتاز عہدے کی ہر طرح اہل بناتی ہے۔ تاہم کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہندوستان کے محکمہ تعلیم کے سب سے بڑے عہدہ دار کا ملک کی سماجی۔ اقتصادی۔ کلچرل اور روحانی زندگی سے ایک گہرا رشتہ ہو۔ اور وہ ملک کی تعلیمی ضروریات کو اس کے سیاسی اور سوشل حالات سے منطبق کر سکے۔ آج تک تعلیمی کمشنر محض پنشن خوار ڈائرکٹر تعلیمات ہوتے رہے ہیں جو اپنی عمر کا بہترین حصہ کسی صوبے کے تعلیمی محکمہ میں گزار آئے اور آخری عمر میں انھیں تعلیمی کمشنر کا عہدہ بطور انعام دیا گیا تھا۔

اس لئے وہ عمر اور صحت کے لحاظ سے بالعموم اس قابل نہ ہوتے تھے کہ ایسے اہم عہدہ کے فرائض تسلی بخش طریق پر انجام دے سکیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس عہدہ دار کا فرض انصرام امور نہیں بلکہ ایک مجموعی تعلیمی لائحہ عمل کی تشکیل دینا ہے تو اس مقصد کے لئے بھی ایسا انتخاب موزوں نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جو عمر بھر دفتری کاروبار کی الجھنوں میں پڑے رہے اور جنھوں نے محکمہ تعلیم میں رہ کر بھی دوسرے محکموں کی استبدادی ذہنیت پیدا کر لی وہ نئی نسلوں اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بدلتے ہوئے ماحول کے لئے کیا نئی تعلیمی فضا پیدا کریں گے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نیا تقرر کم از کم اس نقص سے ضرور پاک ہوگا۔

پچھلے دنوں انگلستان کے ۱۰۰ اساتذہ جو ملک کے ہر حصے سے آئے تھے ہمبرگ کو روانہ ہو گئے ہیں امسال اس جگہ ایک بین الاقوامی اخوت اور برادری کا کیمپ منعقد ہو رہا ہے جس میں فرانس بلجیم۔ ہالینڈ۔ امریکہ اور زیکوسلاواکیا کے نمایندے شرکت کر رہے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو نے اپنے پروگرام میں تعلیمی سکشن بڑھانے کا ارادہ کیا ہے۔ دہلی اسٹیشن کے ارباب اختیار اس اقدام پر قابل مبارکباد ہیں۔ متمدن ممالک میں ریڈیو تعلیمی ذرائع میں ممتاز حیثیت پا چکا ہے بعض ملکوں میں ریڈیو کے ذریعہ باقاعدہ سبق دئے جاتے ہیں۔ ملک کے متعدد لیڈر۔ ادیب اور شاعر ریڈیو پر اپنا کلام سناتے ہیں اور بچوں کی دنیا کو اس خوشگوار حقیقت کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ سب بڑے اور چھوٹے ایک ہی انسانی برادری میں منسلک ہیں۔

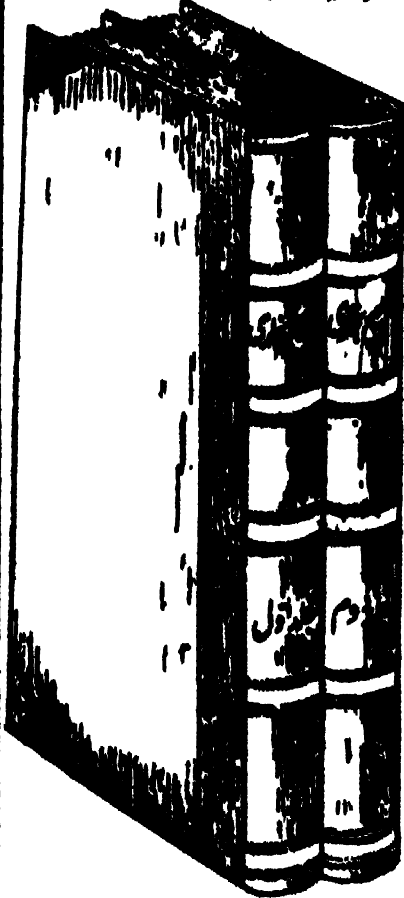
تعلیمی سکشن کی ترقی کے لئے ضرورت ہے کہ معلمین تعلیمی دنیا اور ریڈیو کے ارباب اختیار کے مابین کامل یکجہتی اور اتحاد عمل ہو۔ ریڈیو کی مختصر سی زندگی میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ماہرین تعلیم اور اساتذہ ریڈیو کے سلسلے میں بہترین خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

بی۔ بی۔ سی کے خبروں کے اڈیٹر لندن یونیورسٹی کے ایک سابق پروفیسر ہیں۔ اور ڈاکٹر اوگلوی جو بی۔ بی۔ سی کے نئے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے ہیں وہ بھی اوکسفورڈ اور بلفاسٹ میں معلمی کر چکے ہیں بہرحال تعلیمی سکشن کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے حکومت ہند کے محکمہ ریڈیو کی ایک دفتری شاخ سمجھنے کی بجائے ایک مشاورتی کمیٹی کے سپرد کیا جائے جس میں اساتذہ۔ ماہرین تعلیم۔ ماہرین نفسیات وغیرہ کی پوری نمائندگی ہو۔

تعزیت

ہمارے خاص کرم فرما جناب محمد اسمٰعیل شریف صاحب بی اے دسینئر اسسٹنٹ کمشنر واسپشل مجسٹریٹ واونگر۔ میسور کے ہم زلف اور جامعہ کے ہمدرد حضرت پیر سید شاہ محی الدین صاحب قادری کی وفات ہم سب کے لئے غم ناک ہے۔ خدا مرحوم کو فردوس بریں میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

(مدیر)



مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند)

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عا ر	۱۲ر
القول الاظہر	عہ ر	ہر
رہنمایان ہند	عا ر	عہر
امرائے ہنود	ہے ر	سے ر
القمر	عہ ر	ار
تاریخ تمدن حصہ اول	عا ر	عہر
تاریخ تمدن حصہ دوم	عا ر	عہر
فلسفۂ جذبات	عا ر	عہر
البیرونی	عا ر	عہر
دریائے لطافت	سے ر	عہر
طبقات الارض	عا ر	عہر
مشاہیر یونان و روما حصہ اول	للعہ ر	سے ر
مشاہیر یونان و روما حصہ دوم	سے ر	عہر
اسباق النحو حصہ اول	۔	ہر
اسباق النحو حصہ دوم	۔	ہر
علم المعیشت	ہے ر	ہے ر
تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے ر	عہر
تاریخ اخلاق یورپ حصہ دوم	عہر	عا ر
تاریخ یونان قدیم	عا ر	۔
نکات الشعراء	ہر	عہر
وضع اصطلاحات	ہے ر	ہے ر
بجلی کے کرشمے	۱۲ر	عہر
تاریخ ملل قدیمہ	۱۲ر	۔
محاسن کلام غالب	عہ	۱۰ر
قواعد اردو	عہر	عا ر
تذکرہ شعرائے اردو	۱۲ر	عہر
جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق	سے ر	عہر
تاریخ ہند ہاشمی	۔	عہر
مثنوی خواب و خیال	عہر	عہ
کلیات ولی	صہ	للعہ
چمنستان شعراء	صہر	للعہ
ذکر میر	۔	عا ر

المشتہر: مظفر حسین شمیم مہتمم انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیر ادارت:۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے۔ اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بہ تازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شایع ہوتا ہے۔

عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق۔

سالانہ چندہ چھ روپئے (۶) ششماہی تین روپئے آٹھ آنے

نمونہ کے پرچہ کے لئے ۹؍ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

منیجر "کلیم" ہم جانتی نواس دریا گنج دہلی

روزنامہ

ندیم بھوپال

(وسط ہند)

وسط ہند کا واحد روزنامہ۔ رائے عامہ کا صحیح ترجمان۔ ریاستہائے ہند کی بہترین مفاد کا

محافظ

ریاستوں کی رعایا کے جائز حقوق اور اصلاح و ترقی کا علم بردار

اخبار جو وسط اگست ۱۹۳۴ء سے بھوپال سے شائع ہو رہا ہے

چندہ سالانہ :- بارہ روپئے　　ششماہی :- سات روپئے

سہ ماہی :- چار روپئے　　فی پرچہ :- دو پیسہ

مشتہرین کے لئے خاص مراعات　　نیوز ایجنٹس کے لئے معقول کمیشن

منیجر اخبار روزنامہ "ندیم" بھوپال



ہندوستان

کی سب فرموں میں سب سے زیادہ اچھا اور سستا چشمہ کا ہر قسم کا سامان ہمارے ہاں مل سکتا ہے، تھوک فروشی کے علاوہ ڈاکٹروں کے نسخے بھی بارعایت اور حسن وخوبی سے تیار کئے جاتے ہیں۔ بیوپاریوں اور ڈاکٹروں کیلئے خاص رعایت ہے۔ فہرست آرڈر آنے پر فوراً ارسال کی جاتی ہے۔

ایسٹرن آپٹیکل کمپنی رجسٹرڈ بمبئی نمبر ۲ ہول سیل آپٹیشن

اینڈ ڈائرکٹ امپورٹس ۳۲۳ و ۳۲۵ عبدالرحمن سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

برانچ آفس:- ایسٹرن آپٹیکل کمپنی ۱۴۹ بوبازار کلکتہ

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

مشہور رسالہ نیرنگ خیال

صرف دو روپیہ سالانہ چندہ

میں سال بھر کے لئے آج ہی ایک کارڈ لکھ کر جاری کرا لیجئے۔ ورنہ پھر یہ موقع ہاتھ نہیں آئیگا۔ جہاں نیرنگ خیال کی خوبیوں میں اضافہ کیا گیا ہے وہاں اس کے چندہ میں بھاری تخفیف کی گئی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا آپکا کام ہے۔

نیرنگ خیال کی اشاعت بیس ہزار تک پہنچانے کیلئے یہ اقدام کیا گیا ہے اس وقت ہندوستان کا ایک بہترین رسالہ کم از کم قیمت میں آپ کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ہر ماہ ۱۰۰ صفحہ حجم اور ۱۲ تصاویر دی جائیں گی۔ جو ہندوستان کے چھ روپے سالانہ چندہ والے رسالے بھی پیش نہیں کر سکتے۔ بذریعہ منی آرڈر دو روپے۔ بذریعہ وی پی دو روپے پانچ آنے

مینیجر نیرنگ خیال بیڈن روڈ، لاہور

شاہکار (گورکھپور)

۱۹۳۱ء سے اُردو ادب کی خدمت میں ہر ایثار اور قربانی سے کام لے رہا ہے

دنیا معترف ہے کہ شاہکار کا سالنامہ جنوری ۱۹۴۰ء آپ اپنی نظیر تھا ایسا بلند معیار، ٹھوس مضمونوں، دلچسپ افسانوں اور بے مثال نظموں کا مصور رسالہ تین روپیہ سالانہ چندے میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

آپکو حیرت ہوگی کہ سالنامہ کے علاوہ گذشتہ جولائی میں عظیم الشان مصور خاص نمبر کی پہلی جلد تقریباً دو سو صفحات میں جدید اُردو شاعری کے متعلق شائع ہوئی ہے اس کے مطالعہ کے بعد "جدید اُردو شاعری" کا دنیا کو صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ حالی اور آزاد سے لیکر آج تک کے نوجوان مشاہیر شعراء تک ہر ایک کے حالات اور کلام کے مختصر نمونے تنقید کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔

دوسری جلد اور زیادہ آب و تاب سے عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ شعراء کو صلائے عام ہے کہ اپنی مجموعہ کلام (اگر شائع نہ ہوا ہو) تو غیر مطبوعہ نظموں (یا غزلوں) کے ساتھ مختصر حالات اور عکسی تصویر جلد عنایت کریں۔ تصویروں کی اشاعت کے متعلق مفصل حالات جوابی خط لکھ کر دریافت فرمانا چاہیے۔

مضامین نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مشاہیر شعراء کے متعلق مضامین اور اپنی تصویر جلد عنایت کریں۔ مضامین نگار حضرات کی خدمت میں رسالہ بلا معاوضہ حاضر کیا جاتا ہے۔

خریداری کے خواہشمندوں سے درخواست ہے کہ تین روپیہ آج ہی ارسال فرمائیے ورنہ ہزاروں کی تعداد میں چھپنے کے باوجود پہلی جلد ختم ہو جائیگی اور پھر افسوس ہوگا۔ سالانہ خریداری کی صورت میں سالنامہ اور خاص نمبر مفت پیش کئے جاتے ہیں۔

صاحبانِ اشتہار کو بھی اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ شرح اشتہارات کیلئے مہتمم اشتہارات سے خط و کتابت کیجئے۔

حدیثِ حُسن ملک کے مشہور ناظم، شاعر شباب حضرت فطرت واسطی کی پچاس ولولہ انگیز نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ جس کی ہر نظم عصر جدید کی غیر فانی شاعری اور روانی جذبات کا معیاری نمونہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

منیجر شاہکار بکڈپو گورکھپور

سلسلہ منتخباتِ نظم اُردو

۱۔ معارف ملت ۲۔ جذبات فطرت ۳۔ مناظر قدرت

مرتبہ

پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم۔اے۔ ال ال بی (علیگ)

وہ حضرات جنھوں نے اردو شاعری کی ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی داستان سمجھ رکھی ہے اس سلسلہ انتخاب کو ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل نظموں پر وہ سر دُھنتے ہیں اُن کی ہم پلہ نظمیں خود اُن کی زبان میں موجود ہیں شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے۔

معارف ملت (چار حصے)

جلد اول۔ حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں قیمت عمر

جلد دوم۔ مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل کی تصویریں۔ قیمت عہ

جلد سوم۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق شعرا کا دلپذیر کلام قیمت عمر

جلد چہارم۔ اخلاق و حکمت کے انمول موتی۔ قیمت عمر

جذبات فطرت (چار حصے)

جلد اول۔ میر و سودا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد دوم۔ غالب، ذوق، ظفر اور حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد سوم۔ تقریباً تیس قدیم، مستند اور باکمال شعرا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد چہارم۔ تقریباً ساٹھ جدید شعراء کے کلام کا دلکش انتخاب قیمت عمر

مناظر قدرت (چار حصے)

جلد اول۔ متعلق اوقات یعنی صبح شام، دن رات برسات اور بہار کے دلکش مناظر۔ قیمت صہ

جلد دوم۔ متعلق مقامات یعنی آسمان، زمین، پہاڑ جنگل اور عمارات کی صاف ستھری تصویریں قیمت عمر

جلد سوم۔ متعلق نباتات و حیوانات یعنی پھول پھل کیڑے پتنگے اور چرندوں پرندوں کا مطالعہ و مشاہدہ۔ قیمت صہ

جلد چہارم۔ متعلق عمرانیات یعنی ہندوستان کا تمدن، رسم و رواج، عید، تیوہار اور میلے ٹھیلوں کے دلچسپ حالات۔ قیمت عمر

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہو گئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون کریں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور

مکتبہ جامعہ دہلی

شعلۂ طور

(طبع ثانی)

شاعرِ فطرت حضرت جگر مرادآبادی کے دیوان "شعلۂ طور" کے دوسرے ایڈیشن میں ترتیب بالکل نئی رکھی گئی ہے جس سے کتاب کی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے، اس کے علاوہ اس ایڈیشن میں بہت کچھ تازہ کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

طبع ثانی کتابت و طباعت کی جاذبیت، جدتِ ترتیب، صحت و صفائی اور بعض دیگر خصوصیات کے لحاظ سے یہ بالکل نئی کتاب ہے۔

قیمت ۔ عہ/

مکتبہ جامعہ

دہلی ، نئی دہلی ، لاہور

بسم اللہ

جامعہ

زیرِ ادارت:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۲۹	مارچ ۱۹۳۸ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۱	وردھا کی تعلیمی اسکیم	ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی	۲۲۵
۲	ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ	پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے (علیگ)	۲۴۳
۳	جگر پارے	جگر مرادآبادی	۲۵۲
۴	مولوی نذیر احمد	جناب بشیر احمد صاحب انصاری بی اے جامعہ	۲۵۳
۵	حیات نو	جناب شیر محمد اختر صاحب	۲۷۳
۶	جگر پارے	جگر مرادآبادی	۲۹۲
۷	مسلم عوام کی تعلیم	جناب مولوی محب اللہ صاحب ندوی	۲۹۳
۸	یارانِ نجد سے خطاب	جناب آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے	۳۰۲
۹	رفتار عالم		
	ہندوستان	(ر۔ ر)	۳۰۳
	ممالک غیر	(م۔ م)	۳۰۷
۱۰	تعلیمی دنیا	جناب عبدالغفور صاحب ایم۔ اے	۳۱۶

سالانہ صہ ر — فی پرچہ ۸ ر

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

وردھا کی تعلیمی اسکیم

وردھا کانفرنس نے جو کمیٹی مقرر کی تھی اسے شائع ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں اور ہر طرف سے اُس پر بحث و تنقید کی جا چکی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رپورٹ کو بہت کم لوگوں نے پڑھا ہے جو اعتراضات ہوئے ہیں ان میں اختلاف رائے سے زیادہ شبہات کا اظہار کیا گیا ہے بعض کو دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے حسب معمول سونے والوں کو ٹھنڈے پانی سے چھینٹے دے کر جگا دیا ہے اور ان لوگوں کو جو شکایت ہے وہ اصل میں پانی سے نہیں بلکہ پانی چھینکنے والے سے ہے۔ بعض اعتراضات تعلیم کے علاوہ غلط مفہوم پر مبنی ہیں بعض "جدیدیت" کے زعم باطل پر اور بعض گاندھی جی کے مفروضہ مقصد پر۔

اس لئے اعتراضات کا جواب دینے میں ہمیں ابتدا اُن شبہات سے کرنا چاہیے جو "جدید" یا "ترقی یافتہ" ہندوستانی گاندھی جی کے ہر کام کے بارے میں رکھتے ہیں، ان حضرات کی طرف سے کوئی وقیع اعتراضات نہیں کئے جاتے کہ ان کا جواب دیا جائے۔ انھیں جو خواہ مخواہ کے شبہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم گاندھی جی کے مجوزہ نظام تعلیم کے بنیادی اصولوں کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔ انہی نے ہمارے ملک میں پہلی بار اس حقیقت کو محسوس کیا کہ ایک ایسا نظام تعلیم جو دستکاری پر مبنی ہو۔ قومیت کی تعمیر میں بہت بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے اور انہی میں یہ ہمت تھی کہ اس اسکیم کو ایک فوری مقصد کے طور پر ملک کے سامنے پیش کر دے، ورنہ یہ ہوتا کہ ماہرین تعلیم سالہا سال تک اس کا پرچار کرتے رہتے لیکن کسی کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ اسے عمل میں لانے کے لئے پہلا قدم اٹھائے۔ دستکاری کے ذریعہ تعلیم دینے کی تجویز کو لوگ محض اس وجہ سے کہ اس کی ابتدا گاندھی جی نے کی ہے لوگ جو معنی چاہیں پہنائیں لیکن "ترقی پسند" نقادوں سے یہ التجا کرنا بیجا نہ ہوگا

کہ شخصیت سے قطع نظر کرکے بجائے خود اس تجویز پر غور کریں، باوجود قدامت پسند ہونے کے کبھی کبھی گاندھی جی "جدید" چیزوں کی حمایت کرسکتے ہیں۔ اور کرتے ہیں۔ بچوں کو دستکاری یعنی باضابطہ اور بامقصد عمل کے ذریعے سے تعلیم دینا اصل میں کوئی جدید چیز نہیں بلکہ ایک بہت قدیم چیز ہے، ابتدا سے تعلیم اسی ڈھرے پر چلتی رہی ہے انفعالی کتابی تعلیم نوعِ انسانی کی تاریخ کا ایک ضمنی اور مختصر دور ہے۔ تعلیم کے اصل اصول کو لوگ تھوڑے دنوں کے لئے بھول گئے تھے۔ اور اب وہ رفتہ رفتہ انھیں یاد آرہا ہے۔ تمام دنیا کے ترقی پسند مدرسوں میں اس پر زور دیا جارہا ہے۔ اس نظام تعلیم کو جو ہندوستان میں رائج ہے۔ دنیا دقیانوسی اور فرسودہ سمجھ کر چھوڑ رہی ہے، گاندھی جی کی جدتِ فکر ہمارے جدت پسندوں سے کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ اگر یہ حضرات جو دورِ حاضرہ کے پرستار ہیں، جدید خیالات اور رجحانات سے واقف ہوتے تو وہ گاندھی جی وسعت نظر کی داد دیتے اور ان پر یہ شبہہ نہ کرتے کہ وہ انھیں اپنا عہد زریں کا تخیل قبول کرنے پر مجبور کررہے ہیں۔

اب ہم اِن در پردہ شبہات کو چھوڑ کر اُن صریحی اعتراضات سے بحث کرتے ہیں جو اس اسکیم پر کئے گئے ہیں۔ دستکاری کے ذریعے سے تعلیم دینے پر عام اعتراض یہ ہے کہ ہماری قوم کو جو تھوڑا سا موقع "تہذیبی تعلیم" پانے کا اس وقت حاصل ہے وہ اس کی وجہ سے جاتا رہے گا۔ یہ اعتراض زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے جنھوں نے انگلستان کی یونیورسٹیوں میں وہ لبرل تعلیم پائی ہے، جسے ہندوستان کے نظام تعلیم نے بھی اپنا نصب العین بنالیا ہے، اربابِ نظر پر روشن ہے کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں قطعاً ناکام رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے نصب العین اور طریق تعلیم میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ شخصی کارکردگی اور اجتماعی افادے کے لحاظ سے ہماری "لبرل" یا "تہذیبی" تعلیم سرے سے تعلیم ہی نہیں کہی جاسکتی۔

ذہنی تہذیب کوئی خارجی چیز نہیں یہ اصل میں ہمارے اندرونی ارتقا کا نام ہے، اس ذہنی نشوونما کے عمل یعنی عمل تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فرد کے ذہن کی تہذیب صرف انہی چیزوں کے ذریعے سے حاصل ہوسکتی ہے، جو اپنی ماہیت کے لحاظ سے اس منزل ارتقا سے پوری طرح یا بڑی حد تک مطابق ہو۔ جہاں تک کہ فرد پہنچ چکا ہے۔ ذہن کو تہذیب صرف اسی صفت کے پیدا کرنے سے حاصل ہے جو اس کی

وضع خصوصی سے مناسبت رکھتی ہے

جس وقت فرد کے ذہن میں تفریق پیدا ہو جائے اس وقت یہ ضروری ہے کہ اُسے اس پیشے کی تعلیم دی جائے۔ جو اُسے آئندہ زندگی میں اختیار کرنا ہے، اس منزل پر پہنچ کر جو عموماً تیرہ[۱۳] چودہ[۱۴] برس کی عمر میں آتی ہے۔ پیشے کی تعلیم شروع ہو جانا چاہیئے اور کوئی تعلیم تعلیم نہیں کہی جا سکتی۔ عام یا تہذیبی تعلیم بھی صرف پیشے ہی کی تعلیم کے ذریعے سے ممکن ہے۔ جو فرد نظری طبیعت رکھتا ہو۔ اس کے لئے اپنی قوم یا کل نوع انسانی کے تہذیبی خزانے کی کنجی نظری تعلیم کے سوا اور کوئی چیز نہیں لیکن اگر کسی عملی طبیعت کے نوجوان کو جو کسی خاص صفت سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف نظری یا جمالی تعلیم دی جائے تو اس پر تہذیبی زندگی کا دروازہ ہرگز نہیں کھل سکتا۔ اس کے لئے اس دروازہ کی کنجی صرف صنعت ہے۔ جو لوگ عام تعلیم اور تہذیبی تعلیم کا کلمہ پڑھتے ہیں وہ غالباً تعلیم کے اٹل اصول سے واقف نہیں۔

معلّم کی اور اس سماج کی جو اپنے بچے کو بڑے پیمانے پر تعلیم دینا چاہتی ہے۔ خوش قسمتی ہے کہ ایک خاص ذہنی صنعت تیرہ[۱۳]، چودہ[۱۴] سال کی عمر سے پہلے قریب قریب سب بچوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی صنعت کے ذریعے سے حقیقی تعلیم ممکن ہے۔

علمی تحقیقات سے اور روزمرّہ کے مشاہدے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ بارہ[۱۲]، تیرہ[۱۳] سال کی عمر سے پہلے بچوں کے رجحانات زیادہ تر عملی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے سوچتے ہیں اور کرنے کے ذریعے سے سیکھتے ہیں۔ گویا وہ نوع انسانی کی تاریخ کو دوہراتے ہیں۔ اس لئے کہ حقیقت میں دماغ کا کام رفتہ رفتہ ہاتھ ہی کے کام سے پیدا ہوا ہے، ہاتھ کا کام نہ صرف کُل فنون کی بلکہ کل علوم کی بھی بنیاد ہے۔ صحیح نظری دلچسپیاں علمی دلچسپیوں سے پیدا ہوئی ہیں اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ بچوں کو جبلی طور پر ہاتھ کے کام کا شوق ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی مفید ہاتھ کا کام یعنی کوئی صنعت بچے کی تعلیم کا مرکز قرار دی جائے۔ میرے خیال میں صرف یہی طریقہ ہے جس سے انھیں تعلیم دی جا سکتی ہے۔ جس سے انھیں اپنے معاشرتی اور طبیعی ماحول

کی صحیح قدر وقیمت کا علم یعنی "تہذیب" حاصل ہوسکتی ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو اس خیال سے دھوکا نہیں دینا چاہیئے کہ بچوں کے فطری تخلیقی جوش کو دبا کر اور انھیں اس پر مجبور کرکے کہ مقطع بن کر بیٹھیں اور چپ چاپ کتاب پڑھتے رہیں ہم انھیں "عام تہذیب" سے مالامال کر رہے ہیں یا ان کی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو نشو ونما دے رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہم خواہ نیک نیتی سے کیوں نہ ہو ان کی باڑھ کو روک رہے ہیں۔

اس بحث کو زیادہ طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں اس لئے کہ خوش قسمتی سے ہمارے اکثر نقادوں نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے لیکن ان میں سے اکثر شدّت سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس وردھا اسکیم میں مفید دستکاری پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ محض مکانکی کام ہو کر رہ جائے گا جس سے بچوں کی طبیعت اُکتا جائے گی بعض کا قول ہے کہ یہ بچوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بدترین صورت ہے۔ اکثر لوگ اس تجویز سے خفا ہیں کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکالے۔ میں ان سب حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ وردھا کمیٹی کی رپورٹ لکھتے وقت یہ شبہات اور اندیشے ہمارے پیش نظر تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر ہم ان نتائج پر پہنچے ہیں۔ ہم یہ جانتے تھے کہ دستکاری میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ محض مکانکی کام بن کر رہ جائے۔ ہمیں اس خطرے کا بھی احساس تھا کہ دستکاری کے معاشی پہلو پر زیادہ زور دینے سے اس کے تعلیمی مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ اگر ہمارے نقاد رپورٹ کو زیادہ غور سے پڑھتے تو وہ ہم پر یہ الزام نہ رکھتے کہ رپورٹ لکھنے والوں نے ان چیزوں سے لاپروائی برتی ہے۔ باوجود ان سب خطروں کے ہمیں یہ گوارا نہ ہوا کہ ان سے ڈر کر ہم اس طریقے کو چھوڑ دیں جس کے سوا بچوں کی تعلیم کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ خطرے ہر کام میں ہوتے ہیں اور انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایسی سلامتی چاہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کچھ نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔ اگرچہ اس میں بھی شبہ ہے کہ اس طرح ہم سلامت رہ سکیں گے۔

مکانکی کام کے خطروں کو ہم سب جانتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ کوئی قابل قدر تخلیق بغیر اس مکانکی مہارت کے ممکن نہیں ہے جو ضبط اور صبر کے ساتھ کوشش کرنے سے حاصل

کی گئی ہو۔ اور علم صرف ہمارے ذاتی تجربہ ہی سے نہیں بلکہ پچھلی نسلوں کے مجموعی تجربے سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ اچھے اسکول میں کسی نہ کسی حد تک مکانکی کام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لکھائی پڑھائی اور ریاضی کے استاد اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

اب رہی یہ بات کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکالے تو اس رپورٹ کے لکھنے والوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ "بنیادی تعلیم کی جو تجویز مجمل طور پر وردھا کانفرنس میں پیش کی گئی تھی اور جس کی تفصیل یہاں کی گئی ہے بجائے خود ایک اچھی چیز ہے اگر وہ اپنا خرچ مطلق نہ نکال سکے تب اُسے ایک معقول تعلیمی پالیسی اور تعمیر قومیت کی ایک ضروری تجویز سمجھکر اختیار کرنا چاہئیے"۔ یہ بات اس سے زیادہ صاف الفاظ میں نہیں کہی جا سکتی۔ اگر لوگ نفع بخش دستکاری کو ایک تعلیمی اسکیم کا مرکز بنانا چاہتے ہیں اور پھر اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اس سے کوئی نفع نہ ہو تو وہ خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں صریحی تناقض پایا جاتا ہے۔ نفع بخش کام اگر معقول طریقے سے کیا جائے تو اس سے نفع ہونا لازمی ہے لیکن ہمارے نقادوں کو یہ ضد ہے کہ اس سے نفع نہ ہونے پائے۔

میرے خیال میں نفع بخش کام پر زور دینے میں یہ مصلحت ہے کہ تعلیم محض سطحی بن کر نہ رہ جائے۔ لوگ اکثر "خود روفعالیت" "آزاد عمل" "بے قید نشو و نما" اور اس قسم کے چلتے فقروں سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مجھے بچوں کی تعلیم سے اتنا تعلق رہا ہے کہ میں "خود رو فعالیت" کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا مگر اسی تعلق سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ صرف وہی مشاغل صحیح معنوں میں تعلیمی ہو سکتے ہیں جو ایک معروضی مقصد رکھتے ہیں کسی شغل کے تعلیمی پہلو کا یہ تقاضا ہے کہ معروض جس قدر کو ظاہر کرتا ہے اس کا پورا پورا احترام کیا جائے اور اسے حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جائے، معروضیت ہر سچے تعلیمی عمل کی خصوصیت ہے محض تفریحی فعالیت جو محض بے مقصد ہو یا اس کے مقصد کا تعین نہ کیا جائے تعلیمی معنی میں فعالیت نہیں کہی جا سکتی، اس میں شک نہیں کہ کھیل بھی ذہنی نشو و نما کے عمل میں ایک جگہ رکھتا ہے لیکن اسکول محض طفلانہ کھیل اور حقیقی تعلیم کے کام کی بیچ کی کڑی ہے۔ اسکول کے تعلیمی مشاغل ایسے ہونا چاہئیں جو بچے میں معروضی طرز پیدا کریں، اور اُسے قائم رکھیں۔ بچے کا کام ایسا ہو جو اس لحاظ سے جانچا جا سکے کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ یہ تنقید ذاتی عمل اور صنعتی میں کام میں ہو سکتی ہے۔ اس

لئے یہ اسکول کی تعلیم کا نہایت موثر ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ پس جب معروضیت ہر سچے تعلیمی کام کی خاص صفت قرار پائی تو کمیٹی کی اس تجویز سے ڈرنے کی کیا وجہ ہے کہ طلبا، کے کام میں خوبی اور صحت پیدا کرنے کے لئے کوئی ایسا معیار ہونا چاہیئے۔ جس سے ہم اسے آسانی سے ناپ سکیں۔ اچھی تعلیم محض اس وجہ سے بُری نہیں کہی جا سکتی کہ بغیر اپنے بنیادی اصولوں کو ترک کئے بلکہ ان پر زور دیتے ہوئے وہ غرض کا ایک بڑا حصہ بھی نکال لیتی ہے، اور طلبا میں یہ اخلاقی احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ قومی تعلیم کے عظیم الشان کام میں ذاتی طور پر شریک ہے۔

بہت سے لوگوں نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا ہے کہ جبری تعلیم سات برس کی عمر پوری ہونے پر شروع کی جائے۔ ہمارے نقاد بہت خفا ہیں کہ رپورٹ کے لکھنے والوں نے سات سال سے پہلے کی عمر کو کافی اہمیت نہیں دی یہ لکھنے والوں کے ساتھ صریحی بے انصافی ہے۔ نقادوں کو یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ رپورٹ میں سات سال کا نصاب تجویز کیا گیا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ بارہویں اور چودہویں سال کے درمیان بچے تربیت اور نگرانی میں رکھے جائیں۔ اسی زمانے میں ان کے قوائے ذہنی میں تفریق شروع ہوتی ہے۔ اسی وقت انھیں آئندہ تعلیم اور پیشے کے متعلق مفید مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ اِسی وقت ان کے عنفوان شباب کے رجحانات اور دلچسپیوں پر اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا مصلحتوں سے طلبا، کو کم سے کم چودہ سال کی عمر تک اسکول میں رکھنا ہے تو پانچ سال سے تعلیم شروع کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ انھیں ۹ سال تک مفت تعلیم دی جائے اور یہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے، میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر ہم ہندوستان کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے لئے نو سال کی مفت تعلیم کا انتظام کر بھی سکیں۔ تب بھی یہ بہتر ہوگا۔ کہ طلبا، سات سے سولہ برس کی عمر تک سرکاری سکولوں میں رکھے جائیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پانچ سے سات تک کی عمر بہت اہم ہے۔ (عمر کا ایسا کونسا حصہ ہے جو اہم نہ ہو) لیکن غالباً شہریت کی تعلیم کے لئے چودہ سے سولہ تک کی عمر اس سے بھی زیادہ ہے۔ نقادوں کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ رپورٹ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب حالات اجازت دیں تو حکومت کو مدرسہ کے داخلے سے قبل نہ صرف پانچ برس

بلکہ اس سے کم عمر کے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام کرنا چاہئیے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے نقاد پانچ برس سے پہلے کی عمر کو غیر اہم نہیں سمجھتے ہوں گے۔

لیکن اگر ہم قبل مدرسی تعلیم کا ذکر نہ بھی کرتے تب بھی نقادوں کے لطف و کرم کا یہ تقاضا تھا۔ کہ وہ ہمیں موردالزام نہ ٹھہراتے۔ ایک یہی کیا اور بہت سی چیزیں ہیں جن کا رپورٹ میں ذکر کیا گیا۔ ہمارے نقاد اچھی طرح جانتے ہیں کہ کمیٹی تعلیم کی قاموس لکھنے کے لئے مقرر نہیں کی گئی۔ اس رپورٹ سے جو چار ہفتے کی مختصر مدت میں لکھی گئی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس میں کل "رطب و یابس" تعلیمی مسائل موجود ہوں کمیٹی کے ممبر دوسرے تعلیمی معاملات میں بھی اپنی رائے رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب وقت آئے گا تو وہ اُسے ظاہر بھی کریں گے لیکن رپورٹ کے لکھنے میں وہ اُن حدود کے پابند تھے جو ان کے لئے مقرر کی گئی تھیں۔

اس کے بعد تقسیم اوقات کی باری آتی ہے۔ ہمارے نقاد طیش میں آ کر پکار اُٹھتے ہیں "ساٹھ فیصدی صرف دستکاری کے لئے اور چالیس فیصدی تعلیم کے لئے"۔ مجھے اعتراف ہے کہ رپورٹ کے لکھنے والوں کے وہم و خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ دستکاری اور تعلیم ایک دوسرے کے حریف ہیں، وہ تو یہ سمجھتے تھے۔ کہ دستکاری سے تعلیم حاصل ہو گی۔ یہی ان کی ساری اسکیم کی بنیاد ہے۔ وہ عملِ تعلیم کو ایک قدر سالم سمجھتے ہیں جو وقت ہاتھ کے کام کے لئے ہے اور جو دماغ کے کام کے لئے ہے یہ سب تعلیم ہی کے لئے رکھا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نقادوں کے پیش نظر علیحدہ علیحدہ مضمون ہیں۔ میں ان کی الجھنوں کو سمجھتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں۔ وہ ذرا صبر سے کام لیں۔ ہم نے سات سال کے مقاصد تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں اگر ان کو ان مقاصد سے اختلاف ہو تو اعتراض ان پر کرنا چاہئیے نہ کہ تقسیم اوقات پر۔ اگر انہیں مقاصد سے اتفاق ہو اور پھر بھی وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے جتنا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے اندازہ میں غلطی ہوئی ہے تو انھیں اس کا ثبوت دینا چاہیئے۔ محض دعوے سے کسی بات کی تائید یا تردید نہیں ہو سکتی۔ کمیٹی نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اس نے صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ اگر بنیادی دستکاری بُنائی اور کتائی نہیں

بلکہ کچھ اور ہو تو نصاب کے مختلف حصوں کی تقسیم اوقات بدلی جاسکتی ہے۔ بہرحال اندازہ میں اگر کوئی غلطی ہے تو اسے عملی طور پر دکھانا چاہیئے۔ مجھے امید ہے کہ کچھ عرصے کے بعد چند صوبوں میں اسکیم کا عملی تجربہ اس حد تک ہو چکے گا کہ ان جزئیات میں تغیر تبدل کیا جاسکے۔

رپورٹ کے لکھنے والوں کو اول سے آخر تک اپنی کوتاہیوں کا احساس تھا اور انھیں بڑی خوشی ہوگی اگر دانشمندی اور ہمدردی سے عمل کرنے کے بعد موجودہ اسکیم میں اصلاح و ترمیم کی جاسکے۔ لیکن یہ مجھے یقین ہے اور ان سب اعتراضات نے جواب تک اس اسکیم پر کیے گئے ہیں۔ میرے اس یقین کو متزلزل نہیں کیا ہے کہ اس اسکیم کے بنیادی اصول معقول اور ناقابل اعتراض ہیں۔ انھیں ایک روز ضرور عمل میں لانا پڑے گا۔ اور ان کی مخالفت خواہ جس طرف سے بھی ہو۔ ناکام رہے گی۔ جب یہ اصول دل سے تسلیم کرلئے جائیں گے۔ تو ہندوستان کی تعلیم میں اور قومی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ

ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ جس شکل میں پایا جاتا ہے، وہ کئی باتوں کی وجہ سے مغربی ملکوں کے مسئلہ سے مختلف ہے۔ اس کی اول وجہ تو یہ ہے کہ یہاں کی کثیر آبادی کا پیشہ زراعت ہے۔ کاشتکاروں کی جوت میں جو رقبے ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور ویسے بھی زراعت کے پیشے کو چونکہ موسمی حالات کا پابند بننا پڑتا ہے، اس لئے ہندوستان کے اکثر کاشتکاروں کو سال کا خاصا بڑا حصہ یعنی ملک کے مختلف علاقوں میں پانچ سے نو مہینہ تک بے کاری میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اور اس زمانہ میں ان کے لئے کسی ضمنی پیشہ کے فراہم کرنے کی ضرورت بہت زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔ پھر وقتاً فوقتاً مونسون کے دھوکہ دے جانے کی وجہ سے خشک سالی یا قحط سالی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے تمام بارانی علاقوں کی کاشت کا سلسلہ مسدود ہو جاتا ہے اور بہت بڑے پیمانہ پر بے روزگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں بے روزگاری کی قسم اپنے نتائج کے لحاظ سے سب سے زیادہ وسیع اور ہولناک ہوتی ہے۔

زراعت کے علاوہ جب اور دوسرے پیشوں کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو دو قسم کی اور بے روزگاریاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ بے روزگاری ہے جو ہاتھ کا سخت کام کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔ اور دوسری وہ جو دماغی یا محرری یا ہاتھ کا ہلکا کام کرنے والے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اول الذکر صنعتی مزدوروں کا جہاں تک تعلق ہے ان کی بے روزگاری کے مسئلہ نے ابھی تک ہندوستان میں مغربی ملکوں کی طرح بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں کی ہے۔ ہندوستان صنعتی حیثیت سے پس ماندہ ہے۔ اس کی صنعتیں ابھی ابتدائی منزل میں ہیں۔ جو جدید صنعتیں موجود ہیں ان پر ضرور عالمگیر کساد بازاری کا اثر پڑا ہے اور صنعتی شہروں میں اس کی وجہ سے خاصی بے روزگاری پائی جاتی ہے۔ کچھ کارخانے بند ہو گئے ہیں۔ کچھ کام کرنے والے لوگوں کی تخفیف بھی کر دی گئی ہے۔ اور بہت سے ماہر اور غیر ماہر مزدور بے کار ہیں

لیکن ایسے لوگوں کی مجموعی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اور چونکہ ہمارے صنعتی مزدوروں کا تعلق دیہات اور زراعت کے کام سے باقی رہتا ہے، اس لیے جب کبھی شہروں میں بے روزگاری پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے دیہات کے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں اور زراعت کے کام میں دوبارہ لگ جاتے ہیں۔ اور ان کی بے روزگاری کی وجہ سے جو بھی مصیبت اور پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا خمیازہ شہروں کو نہیں بلکہ دیہاتوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے، اور شہر کے لوگ تنگی اور افلاس کے بھیانک مناظر دیکھنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

فیکٹریوں کے علاوہ دستکاروں اور ذاتی طور پر کام کرنے والوں میں بھی بے روزگاری پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں جو سیاسی تجارتی اور صنعتی انقلاب ہوا ہے اور جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس کا نقصان اس طبقہ کو سب سے زیادہ اٹھانا پڑا ہے۔ فیکٹری کے بنے ہوئے سستے مال نے ان کے روزگار کو ختم کر دیا ہے۔ بہت سی صنعتیں مٹ چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ مٹتی جا رہی ہیں۔ جہاں کہیں دستکاری کا یہ طبقہ ابھی تک باقی ہے عام طور پر تباہ حالی کا شکار ہے۔ ورنہ اس طبقہ کے لوگوں نے بھی زراعت ہی کے پیشہ میں آکر پناہ لی ہے اور دیہات کی بے روزگاری کے مسئلہ کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔

اس لئے آخری تجزیہ کے بعد ہندوستان کی بے روزگاری کے مسئلہ کو دو اہم عنوانوں کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے۔

(۱) دیہی بے روزگاری اور
(۲) طبقۂ متوسط کی بے روزگاری۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے وہ ہندوستان کے افلاس کے عام مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کے حل کرنے کے لئے قومی تعمیر کے نہایت ہمہ گیر کاموں کو ہاتھ میں لینا پڑے گا۔ جن میں سے چند مثال کے طور پر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

زراعت و صنعت کے پیشوں میں توازن پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانہ کی صنعتوں اور دیہی صنعتوں کو ترقی دینا اور اس مقصد کیلئے صنعتی تحفظ کی پالیسی اختیار کرنا۔ بنک کاری کو ترقی دینا۔ منصوبہ کے مطابق معاشی زندگی کی تشکیل کرنا۔ تعلیمی نظام کی اصلاح کرنا۔ صنعتی تحقیقات کی حوصلہ افزائی کرنا۔ مال کے فروخت

رنے کے طریقوں کی اصلاح کرنا فنی مشورے امداد اور حکومت کی سرپرستی حاصل کرنا۔ زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں نفع بخش یا حفاظتی نہریں تعمیر کرنا۔ کنوئیں یا تالاب بنانا۔ امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرنا۔ پختہ سڑکیں اور پل بنانا۔ جنگلات کے محکمہ کی پالیسی مقرر کرتے وقت کاشتکاروں کی ہمدردی کے پہلو کو سامنے رکھنا دیہات کے انتظام و انصرام میں دیہات کی فلاح و بہبود کو ہی مقدم سمجھنا۔ لگان۔ مالگزاری اور زمین کے عام مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حکومت کی موجودہ پالیسی میں ایسی بنیادی تبدیلی کرنا جس سے کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کے زیادہ سے زیادہ حصہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔ کاشتکاروں کو ساہوکاروں کے پنجے سے چھڑانا۔ ان کے قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا اور آئندہ کے لئے ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیئے مناسب انتظام کرنا۔ زراعتی محکمہ کی طرف سے زراعت کی ترقی کیلئے فنی معلومات بہم پہنچانا مناسب بیج، مناسب کھاد، مناسب اوزار، مناسب مویشی فراہم کرنا۔ زراعت کے ساتھ ضمنی پیشوں کو ترقی دینا اور زراعتی مال کے فروخت کرنے کیلئے سہولتیں بہم پہنچانا۔ زراعت پیشہ آبادی کے معیار زندگی کو بلند کرنا۔ انکی نگاہ میں وسعت انکے حوصلوں میں بلندی اور ان میں قدامت پرستی کی جگہ اصلاح پسندی کا جذبہ پیدا کرنا۔ انکے رقبہ زیر کاشت کو متحد اور وسیع کرنا۔ آبادی کے اضافہ کی رفتار میں کمی کرانا۔ غرضکہ ایسے اور سینکڑوں کام ہیں جنکا اختیار کرنا ملک کے افلاس کے عام مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ضروری ہے اور اس کے ساتھ ملک کی مستقل یا نیم مستقل بے روزگاری کے مسئلہ کا حل بھی وابستہ ہے۔

اب رہی تعلیمیافتہ طبقہ یا متوسط طبقہ کی بے روزگاری سو ہر چند یہ بھی ملک کے عام مسئلہ افلاس سے متعلق ہے اور عام افلاس کے دور کرنے کی کوششوں سے یقیناً اسکو بھی بہت بڑی حد تک حل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ دماغی قابلیت رکھتے ہیں انہی سے ملک کے تعمیری اور تنظیمی کاموں میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اور اسطرح انکے لئے روزگار کی بہت سی نئی راہیں نکل سکتی ہیں لیکن چونکہ تعلیمیافتہ طبقہ نے تعلیم کے جس نظام کے ماتحت تعلیم پائی ہے۔ اس کے پیش نظر ملک کی اصلاح و ترقی کا مقصد نہیں تھا۔ اس لیئے اس نظام نے بہت سے ایسے غیر موزوں لوگ پیدا کر دیئے ہیں جو غالباً اس کام میں لگنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری کا مسئلہ دراصل انہی مجبوروں اور معذوروں کا مسئلہ ہے جنکی عمر کے بہترین سال ایک غیر ضروری

اور ناموزوں تعلیم کے حاصل کرنے میں صرف ہوئے ہیں اور جواب نہ اپنے کام کے رہے ہیں نہ ملک وقوم کے کام کے تعلیمی نظام کی ہر منزل میں جس بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے وہ تو مسلم ہے ہی لیکن ان بے بسوں کے ساتھ ہمدردی کرنا بھی سوسائٹی کا فرض ہے۔ کیونکہ ان میں سے بہت سے اپنی کسی ذاتی خرابی کی وجہ سے اپنی موجودہ قابل رحم حالت میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ جماعت کی ستم ظریفیوں کا شکار ہیں۔ ایسی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں موجود تھیں جن کو تعلیم دینے کے لئے سرکار کی طرف سے پروانے ملے ہوئے تھے جنھیں سرکار، ریاستوں اور رئیسوں سے مالی امداد ملتی تھی جن کا جماعت میں ساکھ اور اعتبار تھا اور جن میں تعلیم حاصل کرنا عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان درسگاہوں کو ملک کے نوجوانوں اور ان کے والدین نے تعلیم کے لیے منتخب کیا۔ ملک کے نوجوانوں نے اپنا روپیہ اور اپنی زندگی کا نہایت قیمتی زمانہ صرف کرنے کے بعد ان کی سندیں حاصل کیں یعنی جو جو یونیورسٹی والوں نے کہا اس کی پابندی اس طرح پر کی جو خود یونیورسٹی والوں کو قابل اطمینان معلوم ہوئی۔ ان کے والدین نے سخت ایثار کئے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر، اپنی ذات پر مصیبتیں جھیل کر اپنی اولاد کی تعلیم میں بے دریغ روپیہ اس امید کے ساتھ لگایا کہ وہ ان کے لئے اور ان کے خاندان کے لیے کارآمد ثابت ہوگی لیکن جب یہ سب کچھ کیا جا چکا اور ان کے لگائے ہوئے پودے کے پھلنے پھولنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ یہ بے برگ وبار درخت ہے۔ نہ خود اپنے وجود کو قائم رکھ سکتا ہے نہ دوسروں کو سایہ اور آرام پہنچا سکتا ہے۔ اس سے والدین اور خاندان والوں کو جو مایوسی ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا چاہیئے اور خود اس بدنصیب کی ذہنی الجھنوں کا بھی کرنا چاہیئے۔ جسے جماعت نے اپنی تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے اس حالت پر پہنچا دیا ہمیں ہرگز اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا شخص جماعت کے موجودہ نظام کے خلاف جس میں لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ اس طرح کا مذاق کیا جاتا ہے۔ بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے انقلابی بن جانا اور دہشت انگیزی کو اپنا پیشہ بنا لینا بالکل قابل معافی ہے۔ جماعت کا ایسا نظام جو افراد کی قدر وقیمت کو نہیں سمجھتا اور ان کی فلاح وبہبود کی طرف سے مجرمانہ غفلت سے کام لیتا ہے۔ ہرگز افراد کی وفاداری کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ تعلیم کے منتظمین اپنے ذاتی عروج، جاہ پسندی اور عیش پرستی میں اس قدر محو ہیں خطاب

حاصل کرنے، اخباروں میں اپنی قصیدہ خوانی کرانے اور اعلیٰ مرتبوں پر پہنچنے کا انھیں اتنا لالچ ہے کہ وہ سب کام اپنی ذاتی شہرت کے لئے کرتے ہیں۔ چالبازیوں اور مکاریوں سے کام لیتے ہیں اور نئی نسل کی مشکلات کا ایمانداری کے ساتھ کوئی حل نہیں سوچتے۔ زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق کوئی مناسب منصوبہ نہیں بناتے اور ریتہ مار کر نہ خود کام کرتے ہیں اور نہ دوسروں سے کام لینا جانتے ہیں۔ ساری ذمہ داری مدرسوں کے منتظموں کی ہے۔ سزا کے اگر مستحق ہیں تو یہ لوگ ہیں۔ بدنصیب تعلیمیافتہ بے روزگاروں کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہیئے اور ان کی رہنمائی کرنا چاہیئے تاکہ جس طرح بھی ہو سکے وہ اپنی زندگی کو کچھ نہ کچھ کارآمد بنا سکیں۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ تعلیمیافتہ بے روزگاروں کا مسئلہ اہل لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ نااہلوں کی بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ اپنی توقعات میں ناکام اور اپنی جگہ پر ٹھیک نہ بیٹھنے والوں کا مسئلہ ہے ورنہ تعلیمیافتہ لوگوں کی مانگ ملک میں اسوقت جتنی زیادہ ہے اتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ ہمارے ملک میں تعلیمیافتہ لوگوں کا قحط ہے تعلیمیافتہ طبقہ ملک کا دل و دماغ ہوتا ہے۔ جب یہ اعضائے رئیسہ سالم اور تندرست ہوتے ہیں، اسوقت جسم کے تحفظ، بقا اور ترقی کی توقع قائم کی جا سکتی ہے، ورنہ جسم کا کمزور اور فنا ہونا لازمی ہے۔

ہندوستان میں قدرتی وسائل دولت غیر محدود مقدار میں موجود ہیں، مزدوروں کی بھی کثرت ہے سرمایہ کی بھی کمی نہیں ہے ضرورت ماہر اور تعلیمیافتہ مزدوروں اور منتظموں یعنی صنعتی رہنماؤں کی ہے۔ جو پیدائش دولت کے مختلف کاموں کو نفع بخش طریقہ پر تنظیم دے سکیں تنظیم تنظیم تنظیم۔ یہ وقت کی پکار ہے سائنس اور ایجاد و اختراع نے قدرتی وسائل دولت کو منظم کرنے کے جو ڈھنگ دریافت کرلیے ہیں ان کے بعد آبادی کے کسی فرد کا خوش حالی سے محروم رہنا تعلیمیافتہ طبقہ کی کوتاہی اور فرض ناشناسی کی دلیل ہے۔ دنیا کے ذرہ ذرہ نے دولت کو اگلنا شروع کر دیا ہے۔ مناسب طریقوں کو اختیار کرکے مختلف قسم کی مٹیوں سے لوہا، فولاد، تانبا، پیتل، ٹین، شیشہ، چینی مٹی اور مختلف دھاتیں اور ان کی مصنوعات تیار کی جا سکتی ہیں مٹیوں کے ملانے سے ایسے مسالے بنائے جا سکتے ہیں جن سے نہایت مضبوط

اور خوبصورت بیسیوں منزلوں کی میلوں لمبی عمارتیں کھڑی ہوسکیں۔ پل اور سڑکیں بنائی جاسکتی ہیں۔ پانی کی بہم رسانی اور اس کی نکاسی کے آرام دہ انتظامات کیئے جاسکتے ہیں۔ پھر نباتی اور حیوانی اشیاء کی لاتعداد مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں۔ ان پر کیمیاوی اور ردعمل سے ہزاروں قسم کی نئی نئی چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ جن سے زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ غذا اور کپڑے کی رسد بڑھائی جاسکتی ہے۔ جب کولتار جیسی منحوس شکل والی چیز سے خوشنما رنگ، خوشبودار سینٹ وغیرہ تیار ہوسکتے ہیں تو پھولوں، پتیوں، درخت کے گوندوں، چکنائیوں، بے جوں جانوروں کی ہڈیوں۔ کھالوں۔ خون اور دودھ سے کیا کیا چیزیں تیار ہوسکتی ہیں۔ ان کا تو ذکر ہی فضول ہے، دنیا کی جس ذلیل سے ذلیل اور بدنما سے بدنما چیز پر تنظیم کا ہاتھ لگایا جاتا ہے، وہ سونا بن جاتی ہے۔ سائنس کی ان ایجادوں اور ترقیوں کے بعد بنی نوع انسان کے کسی طبقہ کے لئے مفلس رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔ ہاں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تعلیم حاصل کی جائے۔ اور تعلیمیافتہ طبقہ دیانت اور فرض شناسی کے ساتھ اپنے جاہل بھائیوں کی صحیح رہنمائی کرے۔ تعلیم کی ضرورت جیسی اس زمانہ میں ہے، اس سے پہلے کسی زمانہ میں نہیں تھی اور تعلیم سے جو پھل آج میسر آتے ہیں وہ دنیا نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

ہمارا تعلیمیافتہ طبقہ اگر اپنے منصب کا صحیح طور پر مستحق ہوتا اور اپنے فرض کو ٹھیک طریقہ پر پورا کر رہا ہوتا تو آج ہندوستان کی یہ تباہ حالت نہ ہوتی۔ اس کے دریاؤں کا پانی سیلاب پیدا کرکے آبادیوں کو تباہ اور ویران نہ کرتا۔ بلکہ ریگستانوں کو گل و گلزار بنا دیتے۔ پانی کے بہاؤ کی قوت سے قوت متحرکہ کے خزانے اکٹھے ہو جاتے۔ جن سے لاکھوں گھوڑوں کی طاقت کے انجن دن رات چلا کرتے اور لاکھوں مشینیں مسلسل گردش کرتی رہتیں۔ اور الہ دین کے چراغ کی طرح انسان کی خدمت پر ہمیشہ مامور نظر آتیں اور اس کے اشارے پر ایک ایک رات میں جادو کے عشرت کدے تیار کرتی رہتیں اس کی کھیتیاں سرسبز ہوتیں، اس کے کھلیان معمور ہوتے اس کے یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتیں پھل اور ترکاریوں کے انبار ہوتے، سبزے اور پھولوں کی کثرت ہوتی، رنگ و خوشبو کی ہولیاں

کھلی جاتیں۔ لباس کے لئے کپڑوں کی وہ کثرت اور تنوع ہوتا کہ ہر ممکن ذوق کی رعایت کی جاسکتی۔ آمد و رفت اور خبر رسانی کے وسائل کو بے انتہا ترقی ہو جاتی۔ تفریحوں، دلبستگیوں، فنون لطیفہ اور تعلیم و تہذیب کے اداروں کو بھی خوب فروغ حاصل ہوتا۔ غرضکہ زندگی ہر جہت سے مکمل اور مطمئن ہوتی۔ لیکن پھر بھی افلاس کی محرومی اور بدنصیبی نہیں بلکہ امارت کی سیر چشمی اس کو نئی نئی راہوں کے تلاش کرنے کے لئے مضطر اور بے چین رکھتی اور اس طرح تہذیب و تمدن کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔

لیکن ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ کل قوم کی محرومیوں کو رفع کرنا تو بڑی بات ہے۔ خود اپنی ذاتی محرومیوں کو رفع کرنے سے قاصر ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر یہ نہیں جانتے کہ لفظوں میں بھی ایک جادو چھپا ہوتا ہے اور ان کے مناسب طریقہ پر ملا دینے سے سوئی ہوئی قوموں کو جگایا اور ملکوں کی قسمتوں کو بدلا جاسکتا ہے اگر وہ یہ جانتے ہوتے تو ملک میں یہ افسردگی جمود اور بے بسی ہرگز نظر نہ آتی، ہر شخص مضطرب اور بے چین ہوتا۔ نچلا بیٹھنا ننگ اور عار سمجھتا اور خدا کی دی ہوئی قابلیتوں اور نعمتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی کوشش کرتا۔ اپنا بھی بھلا کرتا اور قوم کو بھی فائدہ پہنچاتا۔ اس کا پیغام کھیت پر کام کرنے والا کسان پتھر پھوڑنے والا مزدور کشتی چلانے والا ملاح۔ غرضکہ قوم کا ایک ایک بچہ جوان اور بوڑھا سنتا اور اس کے ساز سے مست ہو کر اس جوش اور خروش کے ساتھ کام شروع کئے جاتے کہ صدیوں کے کام برسوں اور مہینوں کے کام لمحوں میں انجام پا جاتے۔ یہ کام ہمارے شاعروں، خطیبوں، مصوروں، بت سازوں کا تھا کہ وہ قوم کی ان خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتے اور اسے تیزی کے ساتھ آگے بڑھاتے۔

ہمارے تاریخ، فلسفہ، معاشیات اور سیاسیات کے ماہروں کا کام تھا کہ وہ معاشرتی زندگی کی تنظیم کی وہ راہیں نکالتے جن سے انفرادی خود غرضیوں، طبقوں اور جماعتوں کی کشمکش کے امکانات کم سے کم پیدا ہوتے اور ہم آہنگی یکجہتی اور امداد باہمی کے ساتھ تمام کام انجام پاتے رہتے۔ اور ہمارے سائنس کے گریجوٹیوں کے کرنے کے لئے جو کام ہیں وہ تو نامحدود ہیں ؎

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری کے مسئلہ کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے ہمیں

اپنے تعلیمی نظام میں ایک بنیادی انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ہم امریکہ، انگلستان جرمنی، فرانس، اٹلی اور جاپان کی مثالوں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ہمیں روس سے سبق سیکھنا ہے۔ اپنے مقاصد اور اپنی کامیابیوں دونوں کے لحاظ سے روس کی کے تجربوں میں ہمارے لئے ایک زبردست سرمایۂ بصیرت موجود ہے، روس کو جن حالات میں کام کرنا پڑا وہ ہمارے حالات سے تمام باتوں میں مشابہ نہیں ہیں بعض باتوں میں روس ہم سے زیادہ خوش نصیب تھا اور بعض میں ہم روس سے زیادہ خوش نصیب ہیں۔ اگر ہماری مشکلات زیادہ ہیں تو ہمارے لئے کوشش کے وسائل زیادہ ہیں۔ اور اگر ہمیں سہولتیں زیادہ ہیں تو ہماری ترقی زیادہ یقینی ہے، روس کی زندگی قومی منصوبہ کی پابند ہے وہاں بے روزگاری نہیں ہے۔ وہاں ہر شخص کے لئے ایک کام ہے اور ہر کام کے لئے ایک شخص ہے، روس کے نظام میں خرابیاں بھی ہیں لیکن برائیوں کو چھوڑنا اور اچھائیوں کو اختیار کرنا ہمارا کام ہے، روس کی ہمت اور حوصلہ کی قدر نہ کرنا تعصب اور تنگ نظری ہے۔ مثلاً کسی محفوظ بحری راہ نہ ہونے کی وجہ سے قطب شمالی میں جہازوں کے لئے راستہ پیدا کرنا روس کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو زرّین حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔

لیکن یہ تمام باتیں تو آئندہ سے متعلق ہیں۔ جو بے روزگاری تعلیم یافتہ طبقہ میں اس وقت پائی جاتی ہے۔ اس کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں حوصلہ اور امنگ پیدا کرکے ان کو نئی نئی راہیں نکالنے کی طرف مائل کیا جائے۔ انھیں تنظیم کے کاموں کی اہمیت سمجھائی جائے اور اصلاح و ترقی کے منصوبے بنانے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کا سبق دیا جائے۔ انھیں جدوجہد کرنا چاہیئے۔ انھیں اپنی قوتوں کو بیدار کرکے موثر بنانا چاہیئے۔ جہاں عزم مصمم ہوتا ہے۔ وہاں راہیں بھی نکل آتی۔ انھیں بری یا بھلی جیسی بھی فی الحال ممکن ہو۔ زراعت، تجارت اور صنعت کی رہنمائی کرنا چاہیئے۔ تجربہ انھیں اپنی خامیوں سے آگاہ کردے گا۔ اور ان کی مسلسل جدوجہد ترقی کی راہیں پیدا کرے گی۔ ان کی رہنمائی کسی نے نہیں کی انہیں اپنی رہنمائی خود کرنا پڑے گی تاکہ کم از کم آنے والی نسلوں کے لئے تو یہ راستہ ہموار ہو جائے حکومت کے وزیروں افسروں اور جماعت کے دوسرے با اقتدار لوگوں کو بھی چاہیئے کہ وہ مسئلہ کو اس روشنی

میں دیکھیں اور تعلیمیافتہ نوجوانوں کی فنی نااہلیت کو نظرانداز کرکے انھیں کام کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیں تاکہ وہ اہلیت پیدا کرسکیں اور اپنی قدرتی قابلیتوں کی نشو ونما کرسکیں۔

جگر پارے

(از حضرت جگر مرادآبادی)

کچھ نہ زمان و مکاں کچھ نہ سفید و سیاہ — اشہدان لا الہ ۔ اشہدان لا الہ

غنچہ و نسرین و گل، انجم و خورشید و ماہ — یہ بھی مری رہ گذر، وہ بھی میری گرد راہ

عشق نظر آفریں اور نظر معصیت — عشق تمنا نژاد ۔ اور تمنا گناہ

حاصل صد عرض غم ۔ مایۂ صد عرض شوق — اک مترنم سکوت ۔ اک متبسم نگاہ

کون تجھے پا سکے کس کو ہے یہ دستگاہ — عشق سو گم کردہ ہوش عقل سو گم کردہ راہ

دور ازل تا ابد یہ بھی کوئی سیر گاہ — فاصلۂ یک قدم، دائرۂ یک نگاہ

اسکے سوا اور کیا پیش کش حسن دوست — ایک دھڑکتا سا دل، ایک لرزتی سی آہ

قصہ ناز و نیاز کیا کہیں ہوتا ہے ختم — حسن ترا بے اماں، عشق مرا بے پناہ

تو ہے خودی ناشناس تجھ کو خدا سے کیا غرض — دیکھ تو لے کر ذرا آئینۂ مہر و ماہ

جانب ملک حبیب پھرہوں میں یوں گام زن — صبح ازل در نفس، شام ابد در نگاہ

اپنے بھی سایہ سے چل بچ کے رہ دوست میں — شوق سہی راہ نما، عشق سہی خضر راہ

اس کی وہیں تک حدود جبکی جہانتک سکت — اس کی وہیں تک ہے فکر جبکی جہانتک نگاہ

چیر کے دیکھوں اگر سینۂ مستی عشق — توڑ کے رکھدوں ابھی آئینۂ مہر و ماہ

اے کہ تو ناواقف مصلحت حسن و عشق — اے کہ تو نا محرم سر ثواب و گناہ

درس حقیقت سمجھ ۔ حاصل فرصت سمجھ — فرض محبت سمجھ ۔ معصیت گاہ گاہ

(غیر مطبوعہ)

مولوی نذیر احمد

کسی قوم کا ادب اس قوم کی علمی اور سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ گویا "ادب" وہ کسوٹی ہے جس پر قوم کے ذہنی ارتقا اور معاشرتی ترقی کو پرکھا اور خیالات و احساسات کی بلندی کو جانچا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم "اردو ادب" کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس دور میں ہماری قوم ان تمام اوصاف سے محروم ہو چکی تھی جو سماجی اور قومی نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ ہماری سلطنت کا زوال اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اس کی زندہ مثال ہیں۔ ممکن ہے بعض حضرات اس دور کی قابل قدر ادبی کاوشیں کچھ ایسی ڈھونڈھ نکالیں جو میرے خیال کو غلط ٹھیرا دیں۔ اور اس بنا پر وہ یہ کہیں کہ ہماری موجودہ حالت کے ذمہ دار ہمارے خیالات کی پستی نہیں بلکہ بعض دوسرے اسباب ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ بات صحیح ہو۔ مجھے خود بھی اس سے انکار نہیں کہ ہماری خرابی میں ہماری ذہنی پستی کے علاوہ بعض دوسری چیزیں بھی شامل ہیں لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ ہمارے یہاں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ بلند خیال اور اعلیٰ اوصاف کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

انیسویں صدی کے لگ بھگ اور خود اس صدی میں جو کچھ اردو کی خدمت کی گئی وہ اس لحاظ سے تو واقعی قابل ستائش ہے کہ ہماری زبان میں الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع اور تحریر کا ایک مخصوص اسلوب قائم ہو گیا جس کی وجہ سے "اردو" ایک مستقل زبان بن گئی اور اس کے زندہ رہنے کے سامان پیدا ہو گئے۔ مگر اس سانچے میں جو کچھ ڈھالا گیا اس میں انفرادی رنگ غالب تھا۔ اس لئے اس سے قوم کی مجموعی بہتری کی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہنے کو ہمارے یہاں شاعر بھی پیدا ہوئے اور ادیب بھی، انہوں نے شاعری بھی کی اور زبان و بیان میں نکتہ آفرینی بھی، افسانے اور قصے بھی لکھے۔ لیکن بے جان اور مردہ۔ دور سے دیکھئے لہلہاتے باغات، شاداب چشمے، رنگ برنگ کی چڑیاں اور معلوم نہیں کیا کیا نظر آئے گا۔ میٹھے میٹھے

بول۔ سریلی راگ راگنیاں سنائی دیں گی۔ قریب گئے تو فریب نظر اور فریب گوش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ سب لوگ خیالی دنیا کے رہنے والے لوگ تھے۔ شہر کی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہماری یہ خیالی دُنیا ہی زندگی کی معراج ہے۔

اس فریب خوردہ نظریہ اور تصوّر کی اس جمی جمائی محفل کا بھرم جب فرنگی استبدادیت کے ہاتھوں کھلا تو لوگوں کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ وہ مئے و مینا کی ساغر نوازیاں، رقص و سرود کی ہم آہنگیاں، گل و بلبل کی عشق ریزیاں سب خاک میں مل گئیں۔ وہ سلطنت کا نشہ جس نے بہت دنوں میٹھی نیند سلایا تھا خمار بن کر رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ کیسا بھیانک منظر تھا۔ آنکھوں کے سامنے بزرگوں کی میراث لٹ رہی تھی اور کسی کی ہمت نہ تھی کہ کم از کم زبان ہی سے روک دیں۔ ع

"آشیاں اُجڑا کیا، ہم ناتواں دیکھا کئے"۔

ہندؤں کے لئے یہ چیز کوئی نئی نہ تھی۔ ایسے اتار چڑھاؤ دیکھتے انھیں صدیاں گزر گئی تھیں۔ انھوں نے سمجھ لیا بازار کا بھاؤ ہے کبھی نرم کبھی گرم۔ چلو اس وقت یہی سہی۔ پھر کبھی دیکھ لیں گے۔ ڈھیلی بارہ آنے کا گھاٹا ہے ہونے دو۔ زندہ رہے تو کسر نکل جائے گی لیکن مسلمانوں کے لئے بازار کا سودا نہ تھا۔ قوم اور قومیت کے مٹ جانے کا سوال تھا جس کا مول تول مادی ٹکڑوں سے نہیں بلکہ روحانی اذیتوں، جسمانی مشقتوں، اور خون کی ندیاں بہا کر کیا جاتا ہے۔ ان کے پیچھے ایک شاندار ماضی، اور ان کے پاس نظام ریاست اور نظام معاشرت کا زندہ اور غیر فانی نصاب موجود تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان سب کو دُکھ پہنچانے والے ہم خود ہی ہیں۔ لیکن پھر بھی چین نہ آتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شکست نے ان کی رہی سہی ہمتیں اور بھی پست کر دیں۔ ایک طرف فرنگی جو فروشوں کے ہاتھ بک جانے کا غم اور دوسری طرف ایک نئی حکومت اور انوکھی تہذیب سے سابقہ جو کسی طرح بھی ان کی زندگی سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھی انہیں کھائے جاتا تھا۔ ان کی غیرت ہرگز یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ اپنے زندہ آئین کی موجودگی میں کسی ایسے آئین کے سامنے گردن جھکا دیں جس کی حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔ مسلمانوں میں جو لوگ سمجھ دار تھے ان کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی ان کے پاس سوچنے والے دماغ تو موجود تھے مگر اس افراتفری میں وہ بھی کوئی ایسی راہ نہ نکال سکے جو ان کی پوری قوم کو ایک مرکز

پر پہنچا دیتی۔ ان میں سے ہر ایک نے نیک دلی اور خلوص سے کام کیا۔ مگر ان کی کوششیں "جماعتی حیثیت" سے قوم میں کوئی زندگی نہ پیدا کر سکیں۔ ان کی مخلص کوششوں کی یادگار دیوبند کا اسلامی علوم کا مدرسہ اور علی گڑھ کا مغربی اور جدید علوم کا ادارہ ابتک موجود ہیں۔ اور اپنی وضع کو نبھائے جا رہے ہیں۔

فرنگی تسلط سے جس طرح ہمارے دوسرے شعبوں میں تبدیلیاں ہوئیں اسی طرح ہمارا "ادب" بھی اس سے متاثر ہوا مغربی ادب کی ملاوٹ ہمارے مشرقی "ادب" کی کہنگی پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔ اس دور میں جو اہل تصنیف پیدا ہوئے۔ انہوں نے مغربی مصنفین کی تقلید میں قلم تو اٹھائے مگر اپنا بھرم بھی قائم رکھا انھوں نے ایک نئی طرز نگارش کی بنیاد ڈالی اور اسے کمال کو پہنچا دیا۔ ان کی تقلید میں ایجاد کی شان نظر آتی ہے۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کا زمانہ بھی یہی زمانہ تھا۔ اس دور کے مصنفین میں انھیں جو نمایاں حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان کے ان ادبی کارناموں سے بخوبی ہو سکتا ہے جنہوں نے مولوی صاحب کو نہ صرف شمس العلما اور ڈپٹی بنا دیا بلکہ قوم میں انھیں وہ درجہ دیا جو اُن کے ہم عصر مصنفین میں سے شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ مولوی صاحب ایک ادیب تھے اور ادیب کی حیثیت سے انہوں نے اپنا فرض نہایت ایمانداری سے ادا کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف ان کا "ادب" اپنی زندگی کے دن پورا کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف قوم چراغ سحری بنی ہوئی ہے۔ ادیب ہونے کی وجہ سے ان کا فرض تھا کہ بیک وقت دونوں کی دستگیری کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی قوم کا جائزہ لیا۔ اپنے تنزل پذیر تمدن پر گہری اور تنقیدی نظر ڈالی۔ اور ان کی خرابیوں کو کھود کھود کر باہر نکالا۔ اس سلسلہ میں مولوی صاحب نے بہت سے افسانے اور قصے لکھے جو ایسے مسائل کے سمجھنے سمجھانے میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

افسانہ دراصل انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کا سب سے محفوظ راستہ ہے۔ اس کے ذریعہ نہایت آسانی سے نفس انسانی کی نامعلوم حقیقتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اور انسانی فطرت کی مرتب واقفیت بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ مولوی صاحب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ آدمی قصہ کہانیوں میں وہ کچھ سیکھ لیتا ہے جو برسوں کی فلسفیانہ کوششیں نہیں سکھا سکتیں۔ اس نقطۂ نظر سے انہوں نے اپنی قوم کی معاشرتی اور تمدنی اصلاح کے سلسلہ میں جو افسانے لکھے ان میں سب سے زیادہ کامیاب "ابن الوقت" "مرآۃ العروس"

"بنات النعش" اور توبۃ النصوح" سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں میں ان میں سے دو ایک کا خلاصہ اور ان کے مقصدی پہلو کی تشریح کروں گا۔

ابن الوقت :۔ یہ افسانہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے سے متعلق ہے۔ قصہ یوں ہے کہ ابن الوقت دہلی کے ایک معزز خاندان کا فرد ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے اسے انگریزی روش اور انگریزی طرز ماند و بود اچھی لگتی ہے لیکن اپنے گھر والوں اور دوسرے مسلمانوں کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا ایک دن گھر آتے وقت اتفاق سے سڑک پر اُسے ایک زخمی انگریز پڑا مل جاتا ہے۔ اس انگریز کے ملازم جاں نثار کی درخواست پر ابن الوقت اسے اپنے گھر اٹھا لاتا ہے۔ تیمار داری کرتا ہے۔ انگریز اچھا ہو جاتا ہے اسی اثنا میں آزادی کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ شہر میں لوٹ مار، اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے انگریز ابن الوقت کے گھر میں چھپا رہتا ہے۔ ابن الوقت کی طبیعت تو بچپن سے انگریز پسند تھی۔ نوبل صاحب کی صحبت اس رنگ کو اور پختہ کر دیتی ہے۔ غرض جب دلی میں امن و امان قائم ہو جاتا ہے تو نوبل صاحب کی حفاظت اور خدمت کے صلہ میں ابن الوقت کو انگریزوں کی طرف سے جاگیر اور نوکری ملتی ہے۔ اس وقت ابن الوقت کو اپنے صحیح رجحان کے پورا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ شہر سے باہر کوٹھی لے کر انگریزوں کی طرح رہنا شروع کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف ابن الوقت نماز روزے اور دوسرے اسلامی ارکان سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف دلی والے اس سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اسے کرسٹان سمجھنے لگتے ہیں، اور اس کے ساتھ کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب کچھ حرام قرار دے دیتے ہیں۔ ادھر انگریز بھی "ابن الوقت" کی اس ہمسری سے خوش نہیں ہوتے۔ نوبل صاحب کی وجہ سے کچھ دن خاموش رہتے ہیں۔ مگر ان کے جانے کے بعد کھلم کھلا اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ابن الوقت عجیب کشمکش میں پڑ جاتا ہے، ایک طرف برادری والے چھوٹ جاتے ہیں اور دوسری طرف جن کے لئے یہ برائی مول لی تھی وہ اسے غلام سمجھ کر دھتکار دیتے ہیں۔ غرض بعد از خرابی بسیار وہ راستے پر آتا ہے۔"

اس قصے کے پڑھنے والوں کو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کس حد تک انگریزی

طرزِ معاشرت کو ہندوستانیوں کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ اس سے نہ صرف ان کی غلامانہ ذہنیت کو تقویت پہنچتی ہے بلکہ ان کا مذہب بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

"جب تک ابن الوقت سیدھا سادھا ہندوستانی تھا تو صوم و صلوٰۃ کا عذر پابند رہا لیکن جس روز سے انگریزی وضع اختیار کی اس روز سے ان سب باتوں میں فرق آنے لگا۔۔۔۔۔ تبدیل وضع کے بعد بھی لوگوں نے اُسے مسجد میں جماعت سے تو نہیں بارہا اکیلے نماز پڑھتے دیکھا۔ یہاں تک کہ شروع شروع جن دنوں اس کو نماز روزے کی بہت پرحول تھی۔ کچہری کے عملے ہندو مسلمان سب قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ کیسے ہی کام میں مصروف ہوں۔ دیر سویر کی تو کہی نہیں جاتی مگر نماز ابھی تک نہیں چھوڑی۔ ہم تو روز پرائیوٹ روم میں ظہر کی بلکہ جس دن دیر تک کچہری رہتی ہے عصر کی نماز بھی پڑھتے دیکھتے ہیں لیکن انگریزی وضع کے ساتھ نماز روزے کا نبھانا تھا ذرا مشکل۔ کوٹ تو خیر اتار الگ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ کم بخت پتلون کی بڑی مصیبت تھی کہ کسی طرح بیٹھنے کا حکم ہی نہیں۔ اُتارنا اور پھر پہننا بھی دقت سے خالی نہ تھا۔ اس سے کہیں زیادہ دقت طہارت کی تھی جو نماز کی شرط ضروری ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض نماز پر انگریز سوسائٹی کا یہ اثر دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی۔ پھر نوافل، پھر سنن جاکر نرے فرض رہے۔ وہ بھی پانچوں وقت پہلی رکعت میں سورۂ عصر تو دوسری میں سورۂ کوثر، پھر جمع بین العصرین و المغربین شروع ہوا۔ پھر قضائے فائیتہ۔ پھر بالکل چٹ۔ ۔ ۔ ۔"

دوسری چیز جس پر انگریزی تہذیب نے اثر ڈالا وہ زبان تھی۔ انگریزوں کے اثر سے ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کی مادری زبان کا جو حال ہوا مولوی صاحب اس کو اس طرح دکھاتے ہیں:۔

" انگریزی عملداری سے ہماری دولت، ثروت، رسم و رواج، لباس، وضع طور طریق، تجارت، مذہب۔ علم و ہنر، عزت، شرافت، سب چیزوں پر تو پانی پھرا تھا۔ ایک زبان تھی اس کا بھی یہ حال ہے کہ ادھر انگریزوں نے عجز واقفیت

کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی، غلط، نامر بوط اردو بولنی شروع کی "ادھڑ ہر عیب کہ سلطان پسند د ہنر است"۔ ہمارے ہی بھائی بند لگے اس کی تقلید کرنے۔ ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی خاصی ریش و بروت آغاز جوانی میں ولایت گئے تھے۔ چار پانچ برس ولایت رہ کر آئے تو ایسی سٹی بھولے کہ اردو میں بہ ضرورت اگر بات کرتے تو رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں بیچ بیچ کر جیسے کوئی سوچ سوچ کر مغز سے بات اُگلتا ہے"۔

خیر یہ تو وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان میں آئے آئے تھے۔ اس وقت ان کا اثر بھی بہت زیادہ تھا۔ اور لوگ کچھ بدحواس بھی زیادہ ہو رہے تھے جو کچھ کرتے بلا سوچے سمجھے کرتے تھے۔ لیکن اب جب کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے اور حالات بھی وہ نہیں رہے ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان رونے کے قابل ہے۔

یہ تو معاشرتی، اور تمدنی باتیں ہوئیں۔ اب ذرا قوم کی معاشی حالت بھی سن لیجئے۔ اگرچہ مولوی صاحب انگریزوں اور انگریزی حکومت کی تعریفوں کے جا بجا پل باندھتے چلے جاتے ہیں لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہوتی ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی صنعتوں اور زراعت اور تجارت کو جو نقصان پہنچا مولوی صاحب جیسا آدمی کیسے برداشت کر سکتا تھا اور برداشت کے قابل بات بھی نہ تھی۔ بھلا کسی کا گھر جلے اور وہ خاموش بیٹھا رہے؟ صاف نہیں کہا لفظوں میں لپیٹ کر کہا۔ "ابن الوقت" کی زبان سے کہلوایا:-

"... اگر آپ صبر اور توجہ سے سننا چاہیں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھوں۔ آپ صاحبان کو یقین کرادوں گا کہ ہندوستان کی رعایا پہلے کی نسبت بہت سقیم الحال ہو گئی ہے۔ ذرائع معاش کے اعتبار سے ہندوستان کے لوگ چار طرح کے ہیں۔ اول کسان دوئم اہل حرفہ سوئم نوکری پیشہ چہارم تجارت پیشہ...... انگریزی عملداری سے پہلے نہ کوئی رقبہ کی پیمائش کرتا تھا اور نہ اقسام زمین دیکھتا تھا۔ پچھلی جمع پر نظر کر کے یا بہت سیانپت کی سرسری طور پر موٹا حال دیکھ کر گاؤں کے پیچھے اٹکل پچو ایک جمع ٹھیرا دی

چھٹی پائی۔ اس کے ہزاروں لاکھوں تحریری ثبوت موجود ہیں کہ ہندوستانی گورنمنٹوں میں طرح طرح کے ظلم ہوتے تھے۔ مگر سرکاری مال گذاری کے بارے میں ہمیشہ سرکار ہی مظلوم رہتی تھی۔ .... جمع کی وصولی کا یہ حال تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی بھلا مانس زمیندار وقت پر دیتا ہوگا۔ دو دو چار چار برس کی باقی داری تو ایک بات تھی۔ جب باقی بہت بڑھ جاتی تو آخر کو آدھی تہائی پر فیصلہ ہوتا تھا۔ رہے کاشتکاران کو یوں سمجھو گویا سرکار کی رعیت ہی نہ تھے۔ ان کے نیک و بد نفع و نقصان سب باختیار زمیندار۔ مگر چونکہ زمینداروں کا اپنا مفاد تھا۔ ہر زمیندار کاشتکار کو اپنی دولت سمجھتا تھا۔ ضرورت پڑے پر تخم و تقاوی سے اس کی مدد کرتا۔ خرید مویشی اور شادی بیاہ تک کے لئے اس کو قرض دیتا۔ پھر نقدی لگان کا دستور نہ تھا۔ فصل پک کر تیار ہوئی۔ زمیندار کاشتکار دونوں نے غلہ بانٹ لیا۔ کم ہوا تو کم زیادہ ہوا تو زیادہ۔ نہ حجت نہ تکرار۔ الغرض اللہ اللہ خیر صلہ اب گورنمنٹ انگریزی کے انتظام کو دیکھنا چاہئے کہ اول تو مزروعہ، افتادہ، بنجر چپہ چپہ زمین کی پیمائش کرائی۔ پھر مٹی کی ذات اور کھاد اور آبپاشی کے لحاظ سے کھیت کھیت کی حیثیت دریافت کی اور پھر کاغذات دیہی اور لوگوں کی گواہی اور ذاتی تجربوں سے یہانتک تحقیق کیا کہ اس کھیت میں یہاں تک پیداوار کی قابلیت ہے۔ اس طرح جزرسی کر کے گاؤں کی نکاسی نکال کر کہنے کو آدھا اور واقع میں اچھا خاصہ کسا ہوا دو تہائی حق سرکار ٹھیرا دیا۔ اور اتنی کاوش پر بھی ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ غایت درجہ صرف تیس برس کے لئے کہ اتنے میں زمیندار پھر پنپیں گے تو پھر نچوڑیں گے .... بندوبست کا میعادی ہونا اگر وہ زمینداران کی سخت بے دلی کا موجب ہے اور اگر سچ پوچھئے تو ملکی ترقی کا مانع ....

"اہل حرفہ کی کیفیت کسانوں سے کہیں بدتر ہے۔ یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کم تعرض کرتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نہیں کرتی۔ مگر یورپ کی کلوں نے

ان کو مار پٹرا کر دیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ اور یافت کے پیشے معدوم ہو گئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب کہاں ہیں وہ ڈھاکے کی ململ۔ بنارس کی مشروع اور نگ آباد کے کمخواب، بیدر کے برتن، کالپی کے کاغذ، کشمیر کی شالیں، لاہور کے ریشمی چوڑ ہیئے۔ اہل یورپ کیا اس پر بند ہیں کہ جس چیز کی مانگ ہندوستان سے ہوئی بنا کر بھیجدی؟ نہیں وہ لوگ رات دن اس لٹہ میں لگے ہیں کہ ہندوستان میں کیا کیا چیز پیدا ہوتی ہے، اور وہ انسان کے کس مصرف کی ہے اور اس ملک کے لوگوں کو کیا درکار ہے جو ہندوستان سے ہر طرح کی پیداوار ولایت ڈھلی چلی جاتی ہے۔ کچھ تو یورپ میں کھپی اور کچھ ہندوستان کے مصرف کی بن کر الٹی آ گئی۔ ہندوستانی اہل حرفہ تھکے تو یوں تھکے کہ یہ جو کچھ کریں اپنے ہاتھوں سے اور انسان کی قوت کا اندازہ معلوم ہے آٹھ پہر میں آخر وہ دم بھی لے گا۔ آسائش بھی کرے گا۔ اور وہاں یورپ میں کلیں ہیں کہ سارے سارے دن، ساری ساری رات برابر بے تکان پڑی چل رہی ہیں........،

اب مجھ کو صرف تجارت پیشہ لوگوں کی نسبت کچھ کہنا ہے۔ سو میں اسکو مانتا ہوں کہ انگریزی عملداری میں ایسے پیشے کے لوگوں کو کسی طرح کی شکایت نہ ہونی چاہئے۔ اس میں کسی طرح کا تنزل نہیں، مال کی آمد و شد میں سہولیت یوماً فیوماً زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عدالت کی کارروائی قابل اطمینان ہے۔ تاجر کو اور چاہئے کیا۔ مگر تجارت کو چاہئے سرمایہ، اور سرمائے ہی کا بڑا رونا ہے۔ پھر یہ پیشہ ایک محدود پیشہ ہے جسکو ہندوستان میں صرف معدودے چند اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک، دوسرے حرفہ اور اور صنعت کا کساد عین تجارت کا کساد ہے۔ اور میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ثابت کر چکا ہوں کہ ہمارے ملک کی صنعت پر اوس پڑتی چلی جاتی ہے........"

اسی کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب اس چیز پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ یورپ کی ترقی کا اصل راز کیا ہے۔ جس طرح آج کل کے مفکرین اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہماری نجات صنعتی ترقی اور صنعتی تعلیم میں مضمر ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب بھی اسی چیز پر زور دیتے ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے ہماری تعلیم اور طریقہ تعلیم سے بدظن نظر آتے ہیں چنانچہ ابن الوقت میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"یورپ کی تمام ترقی کا اصلی اور حقیقی سبب علوم جدید ہیں۔ اس زمانہ میں تعلیم وہی مفید ہو سکتی ہے جس سے یہاں کے لوگ ان علوم سے آگاہی بہم پہنچائیں۔ اور ان کی طبیعتوں میں اس بات کا شوق پیدا ہو کہ واقعات کو سوچیں اور موجودات میں غور کریں سو سررشتۂ تعلیم کا اتنا اثر تو ضرور دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا چرچا پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا ہے...... مگر اس تعلیم سے ملک کو فائدہ کے عوض الٹا نقصان پہنچنے والا ہے۔ لوگ صرف نوکری کی طمع سے پڑھتے ہیں۔ نوکری ہی ان کے نزدیک پڑھنے کی غرض وغایت ہے۔ نوکری ہی کے لئے ان کو تیار بھی کیا جاتا ہے۔ اور ان کا مبلغ علم بھی وہیں تک ہے...... اگر سچ پوچھئے تو سررشتۂ تعلیم سے جیسا کہ اب ہے ملک کا الٹا علاج ہو رہا ہے۔ ہم کو درکار تھے وہ علوم جو صنعت وحرفت کو ترقی دیں۔ اور اب لوگوں کو ایسی پٹی پڑھائی جاتی ہے کہ معدنی اور آبائی پیشوں و حرفوں سے گریز اور نفرت کرتے ہیں۔"

غرض کہ "ابن الوقت" کے جس حصہ کو بھی لے لیجئے۔ پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے ہر طبقے کے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی خرابیاں دکھائی گئیں ہیں۔ قصہ کے ہر لفظ سے یہ ٹپکتا ہے کہ مولوی صاحب اپنی قوم کو اونچے سے اونچے درجہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان میں بھی وہ تمام اوصاف پیدا ہو جائیں۔ جو انھیں آج کل کی متمدن اور مہذب قوموں کے ہمسر بنا دیں۔ اپنے یہاں کی تجارت اور صنعت کو ترقی یافتہ اور اعلیٰ پیمانہ پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ تعلیم کو جس کی مثال اس دیوار کی سی ہے جس میں ابنٹوں

کے ساتھ روڑے اور گارے کے ساتھ چونا بھی بھر دیا گیا ہو اور جو ہوا کے ایک جھونکے اور بارش کے ایک چھینٹے کی مدافعت نہ کر سکتی ہو بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس کی جگہ مفید تعلیم جس کی واقعی ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو ضرورت ہے ملک میں جاری کرنا چاہتے ہیں۔

ارادہ تو یہ تھا کہ باقی تین افسانوں کو بھی اسی طرح مع ان کے اقتباسات کے پھیلا کر بیان کیا جاتا۔ مگر خیال ہے کہ مضمون زیادہ طویل ہو جائیگا۔ اس لئے میں ان افسانوں کے مضامین کے خلاصہ ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

• مراۃ العروس اور بنات النعش ان دونوں میں ایک ہی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں عورتوں کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں۔ ہمارے یہاں جس طرح مردوں کی حالت قابل افسوس ہے اسی طرح عورتوں کی حالت بھی قابل رحم ہے۔ ان میں مذہب اور ارکان مذہب سے بیگانگی، جہالت اوہام پرستی، رسم و رواج کی پابندی امور خانہ داری میں بے سلیقگی اور اسی قسم کی دوسری برائیاں ہیں جو انہیں اچھی مائیں بننے اور سلیقہ شعار بیوی ثابت ہونے سے روکتی ہے۔ "مراۃ العروس" میں انہی چیزوں کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بنات النعش میں ان چیزوں کے ساتھ ساتھ ایسی علمی معلومات کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جن کا خیال عام طور سے پردہ نشین عورتوں کی تعلیم میں نہیں رکھا جاتا۔

توبۃ النصوح:۔ یہ کتاب مذہب اور عقائد مذہب کا خلاصہ ہے۔ مسلمانوں میں عموماً اور مغرب زدہ طبقہ میں خصوصاً اسلام اور عقائد اسلام کے ساتھ جو نا روا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب سے اسی چیز کی اصلاح مقصود ہے۔ خدا، حشر و نشر، جنت و دوزخ اور محاسبۂ اعمال کی حقانیت کو اس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی آسانی سے ان سب چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کو خدا اور خدا کے رسول کی منشاء کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ والدین کے فرائض کی بھی تشریح کی گئی ہے۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کی شخصیت کو نمایاں کرنے والے ان کے یہی افسانے ہیں۔ ان میں سے خاص طور سے جو افسانے صنف نازک کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھے گئے ہیں ان سے مولوی صاحب کے

اس صحیح رجحان کا اندازہ ہوسکتا ہے جس سے اصلاح کرنے والے میں ایک امتیازی شان پیدا ہوجاتی ہے انسان کی پہلی مکتب اور ابتدائی تربیت گاہ' اس کی ماں کی گود ہے۔ بچہ کی تعلیم اسی روز سے شروع ہوجاتی ہے جس روز وہ پہلی مرتبہ دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اگر اسی وقت سے اس کی صحیح تربیت اور خاطر خواہ نگرانی کا خیال رکھا جائے تو اس کی تمام زندگی سدھر جاتی ہے۔ بچہ کی فطرت سفید کپڑے کے مانند ہوتی ہے۔ اس پر جیسا رنگ چڑھایئے قبول کرلے گا۔ یہ چیز رنگریز کے مذاق پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کا رنگ انتخاب کرتا ہے۔ غرض بچہ کی زندگی کے بننے اور سنورنے کی ابتداً تمام ذمہ داری بچہ کی ماں پر ہوتی ہے اگر ہم اپنی قوم میں اعلیٰ تہذیب اعلیٰ اخلاق، سچے خدا پرست اور صحیح انسان دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں عورتوں کی اصلاح اور تربیت کا بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم اردو کے افسانہ نگاروں میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس راز کو سمجھا۔ اسی لئے تقریباً ان کے تمام افسانے عورتوں اور عورتوں کی معاشرت کی اصلاح سے بحث کرتے ہیں۔

مولوی صاحب سچے ادیب اور حقیقی افسانہ نگار تھے۔ فطرت کے متعلق عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ حساس دل حُسن بیان۔ جودت طبع یہ سب وہ چیزیں ہیں جو افسانہ نگار کی زندگی کا اہم جزو ہیں۔ ان میں سے ایک چیز بھی کم ہو تو افسانہ نگار نا مکمل اور اس کی ادبی کاوشیں تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں۔ مولوی صاحب کے کسی افسانے کو بھی لے لیجئے۔ ان میں یہ سب باتیں بیک وقت پائی جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے دنیائے ادب میں بہت اونچے درجہ پر نظر آتے ہیں۔

قصہ نویس کے لئے سیرت نگاری کا فن بھی بہت اہم ہے دراصل قصہ کی خوبی اور خرابی اس کے کردار کی سیرت نگاری میں مضمر ہوتی ہے۔ جس رنگ میں قصہ نویس اپنے کردار کو پیش کرنا چاہتا ہے اس میں اس رعایت سے بعض ایسے فضائل پیدا کرتا ہے جو اس کو عام طور سے ممتاز کردیتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قصہ کسی خاص مقصد کے ماتحت لکھا جائے۔ اگر قصہ لکھنے میں کوئی خاص مقصد افسانہ نگار کے سامنے نہ ہو۔ تو سیرت نگاری ناقص اور نامکمل رہجاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص رزمیہ افسانہ لکھے تو ضروری ہے کہ اس کے کردار میں جنگ وجدل، حرب وضرب اور زور قوت کے وہ

تمام اوصاف موجود ہوں جو اس کو عام بہادروں سے متمیز کردیں۔ جیسے فردوسی کے یہاں "رستم" اور داستان امیر حمزہ میں "امیر حمزہ" کے کردار۔ پھر یہ کہ جو کردار پیش کیا جائے خواہ وہ کسی قسم کا بھی ہو پڑھنے والے کو اس کی ذات سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہو جانی چاہئے۔ اس کے علاوہ قصہ میں اپنے طرز بیان سے "کردار" کو اس طرح پیش کرے کہ "کردار" قصہ کی خیالی دنیا سے نکل کر پڑھنے والے کے ذہن میں ایک محسوس اور موجود بالذات شے کی طرح اپنے تمام احساسات اور وجود کے تمام لوازمات کے ساتھ سما جاتے اور پڑھنے والے کو یہ معلوم ہونے لگے کہ جس شخص کا قصہ میں پڑھ رہا ہوں وہ کوئی خیالی تصویر نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا آدمی ہے جس سے میں خود باتیں کر رہا ہوں۔ یا خود پڑھنے والے کی شخصیت شعوری طور پر اس کے افسانوں کے کرداروں کا جزو بن جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس لحاظ سے اگر مولوی صاحب کے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے افسانہ نگاروں میں مولوی صاحب کا رتبہ اس اعتبار سے بھی بہت بلند ہے۔ ذیل میں ہم "توبۃ النصوح" کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں۔ جس سے آپ مولانا کی سیرت نگاری کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔

"جب حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا بیٹا گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دعا دوں۔ جیتے رہو۔ عمر دراز ہو خدا نیک ہدایت دے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا۔ اور فوراً میں نے اٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ تب حضرت بی نے فرمایا کہ بیٹا بُرا نہ ماننا یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں اور میں تم کو نہ ٹوکتی، لیکن تم میرے بچّوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو۔ اس سبب سے مجھے جتا دینا ضروری تھا۔"

توبۃ النصوح صـ ۶۲

اس عبارت کے پڑھنے سے ایک بہت ہی خدارسیدہ اور بزرگ عورت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے جس میں بزرگی اور شفقت کے ساتھ وہ تمام اوصاف موجود ہیں جن کو ایک ایسی عورت

میں ضرور پایا جانا چاہئے جسکو بچوں کی تربیت میں ملکہ حاصل ہو۔ اور جو تربیت کے اہم مقصد سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ پھر یہ گفتگو کا انداز کچھ ایسا جنچا تُلا ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس سے حضرت بی کی صحیح سیرت پڑھنے والوں کے سامنے آجاتی ہے اگرچہ خود مولوی صاحب نے اُن کے اوصاف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

عام طور سے قصہ میں جو کردار پیش کئے جاتے ہیں تو قصہ نویس ان کی ظاہری شکل وصورت کا بھی خاکہ بیان کرتا ہے تاکہ اس سے ان کے اوضاع و اطوار اور دماغی اور اخلاقی کیفیت کا پتہ چل سکے۔ اگرچہ اس طریقہ کو فنی اعتبار سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن میرے خیال میں اس سے خود قصہ نویس کی قابلیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ شکل وشمائل کے متعلق چند خصوصیات ایسی تسلیم کرلی گئی ہیں۔ جن کو جان لینے کے بعد کچھ قصہ نویس ہی پر منحصر نہیں ہر شخص لوگوں کے متعلق کچھ نہ کچھ بتا سکتا ہے لیکن اگر قصہ نویس اپنے کردار کی اخلاقی اور دماغی کیفیت بیان کرے تو اس صورت میں اس کی قوت مشاہدہ اور تخیل کی بلندی کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم اس اعتبار سے بھی ایک کامیاب افسانہ نویس نظر آتے ہیں "توبتہ النصوح" میں انہوں نے ایک ایسی لڑکی کا کردار پیش کیا ہے۔ جسکو ماں باپ کا لاڈ پیار اور دولت کی فراوانی نے بگاڑ دیا تھا جن الفاظ میں اس لڑکی کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جنہیں اس قسم کی باتیں دیکھنے کا خود اتفاق ہوا ہو۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

> " ادھر تو نصوح اور سلیم دونوں باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی ادھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہو گئی نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینہ کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی۔ نانی کی چہیتی، ماں کی لاڈو۔ مزاج کچھ تو قدرتی تیز، ماں باپ کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہے۔ کریلا اور نیم چڑھا، اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہو گیا۔ اب چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی مگر

رسی جلی پر بل نہ گیا۔ باوجودیکہ اجڑی ہوئی میکہ میں پڑی تھی۔ مزاج میں وہی طنطنہ تھا۔
کنوارپنے ہی میں نوگز کی زبان تھی۔ کچھ یونہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا۔ سو بیاہے
سے ان کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹا جنے پیچھے اور بھی کھل کھیلی مردوں تک کا لحاظ اٹھا دیا۔"

اچھے افسانہ نگار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی نظر چھوٹی بڑی، اہم غیر اہم سب باتوں پر رہتی ہے۔ یہ چیز بھی مولوی صاحب کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ابن الوقت میں جہاں مولوی صاحب نے ہندوستان کی مفلسی کے اہم اسباب گنائے ہیں، وہاں ان کی نظر سے وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں بچ سکیں۔ جو ان بڑے اسباب سے زیادہ ہماری مفلسی پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ جب لوگ کہیں سفر پر جاتے ہیں تو حقہ اور حقہ کے لوازمات سب ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جب تک بیل گاڑیوں میں لوگ سفر کرتے تھے یہ وضع نبھ جاتی تھی۔ لیکن جب سے ریل جاری ہوئی۔ تو بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ ریل میں آگ وغیرہ کا جلانا اور بھرنا یہ سب اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ لہذا اس کا بدل کوئی ضرور ہونا چاہئے۔ اس چیز کو مولوی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"کم بخت حقہ کی کیا تدبیر کرنی ہوگی۔ سنا ہے کہ ریل میں تو پینا نہیں ملتا۔ چلتی گاڑی میں لوگ چوری چھپے کوئلہ سلگا کر اپنا کام کر لیتے ہیں۔ پر ایسے حقہ میں کیا خاک مزا ملتا ہوگا۔ سوکھا ہوا نیچہ، خالی حقہ اس پر گھبراہٹ کہ ایسا نہ ہو اسٹیشن آجائے چرٹ سب سے اچھا کہ خاصی طرح دندناتے ہوئے پیتے چلے جارہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ہوں تو کہے اور ساتھ کے بیٹھنے والے بھی جی میں کہتے ہوں گے کہ ہاں بھئی یہ بھی کوئی ہیں۔ پر چرٹ پر کڑک جانے کا بڑا عیب ہے اور کم بخت دھواں نہیں دیتا۔ سارا بکس لیں تو حفاظت سے رہے۔ بنچ کے نیچے بھی ڈال دو کچھ پروا نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا دیسی چرٹوں کا بکس آٹھ دس آنے کو آئے گا۔ کیا بڑی بات ہے۔ راستہ تو کٹے گا۔

دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔ "توبۃ النصوح" میں نصوح بیمار پڑتا ہے۔ اگرچہ نصوح بہت زیادہ آزاد خیال اور بے پروا آدمی تھا موت زندگی دونوں میں کچھ فرق نہ کرتا تھا عموماً کہا کرتا تھا۔

"خدا کی شان ہے ایسے لوگ بھی ہیں کہ دنیا سے ان کا نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا نہیں معلوم دنیا کی کونسی ادا ان کو پسند ہوتی ہے۔ ورنہ استغفر اللہ یہ دار المحن انسان کے رہنے کے قابل ہے؟ ..... مرنا بھی ایک نعمت ہے"۔

مگر جب وہ خود بیمار پڑتا ہے اور زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو اسوقت جو اس پر کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو مولوی صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"جس جس پہلو سے غور کرتا تھا اپنا مرنا اُسے بے وقت معلوم ہوتا تھا۔ بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا کوئی عمر اس کی بیوہ ہونے کی ہے؟ نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہے کہ اس کا متکفل ہو نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل ہے کہ گھر کو سنبھالے اندوختہ جو ہے سو واجبی ہے۔ کب تک اکتفا کرے گا۔ دو ناکتخدا بیٹیاں اُس کے آگے ہیں۔ کچا ساتھ، خالی ہاتھ۔ بچوں کی پرورش کیسے ہوگی۔ کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں۔ کیا ہوگا اور کیونکر یہ پہاڑ زندگی اس کی کاٹے کٹے گی"۔

غرض جس پہلو سے نظر ڈالئے مولوی صاحب کے افسانے نہ صرف فنی اعتبار سے بلکہ اپنے مقصد کے اعتبار سے نہایت اہم اور اردو ادب کے لئے قابل ناز سرمایہ ہیں۔

ان افسانوں کے علاوہ مولوی صاحب نے مذہب پر بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں قرآن پاک کا ترجمہ اور "الحقوق والفرائض" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ قرآن کے ترجمے میں بھی مولوی صاحب کے سامنے علماء اور فصحاء نہیں بلکہ عام لوگ رہتے ہیں جنھیں اپنے مذہب اور اپنی زندگی کے دستور العمل کے متعلق کچھ نہ کچھ جاننا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن کا ترجمہ بہت سیدھی سادھی زبان میں کیا گیا ہے جو عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے تاکہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی آسانی سے سمجھ لیں کہ قرآن کیا ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے۔

الحقوق والفرائض میں "حقوق اللہ" اور "حقوق العباد" کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں عبادت کے تمام ارکان اور ان کے جزئیات پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے حصہ میں آپس کے تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً بچوں کا تعلق والدین کے ساتھ اور والدین کا بچوں کے۔ ہمسایہ کے ساتھ، رعایا کا راعی کے ساتھ اور راعی کا رعایا کے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کے بعد مولوی صاحب کی تقاریر کا نمبر آتا ہے۔ یہ تقریریں، طبیہ کالج دہلی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے جلسوں میں مختلف موقعوں پر کی گئی ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر بھی وہی مسلمانوں کی اصلاح اور مسلمانوں کی بہبودی ہے۔ زیادہ تر ان میں مسلمانوں کی مذہبی پستی کا گلہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک تقریر میں اس چیز پر روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا ہونا بھی ضروری ہے فرماتے ہیں:

"تعلیم کیسی ہی مکمل کیوں نہ ہو۔ مارلز کے بدون کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتی، اور مارلز بدون مذہب کے درست نہیں ہو سکتے۔ بیشک سوسائٹی کو مارلز کے فارمیشن میں دخل عظیم ہے۔ لیکن جو مارلز صرف سوسائٹی کے انفلونس پر مبنی ہوں راسخ نہیں ہو سکتے...... اگر دین و مذہب سے الگ رہ کر لوگوں کو تعلیم دی جائے تو میرے نزدیک اس کی مثال ایسی ہوگی کہ چلبلے اور شریر لڑکے کو راجز کا چاقو کھیلنے کے لئے پکڑا دیا جائے۔ وہ ضرور اپنا ہاتھ کاٹ کر رہے گا۔ اگرچہ تعلیم کا ایورج تھوڑا ہے۔ مگر اب بھی ایسی مثالیں بہت ہیں کہ کالج یا سکول سے نکل کر لوگ آفس لایف میں تعلیم سے راحت کی جگہ طرح طرح کی ایذائیں پاتے ہیں۔ اور ان کا یہی سبب ہوتا ہے کہ مارلز کی خبرگیری نہیں کی گئی۔ بیشک مذہب میں ایسی بھی بہت سی باتیں ہیں جن کو تمدن سے کچھ علاقہ نہیں۔ لیکن واقع میں مذہب اور خاص کر مذہب اسلام ایسا جامع دستور العمل ہے کہ کسی حالت کا آدمی ہو۔ مرد اور عورت، عالم اور جاہل، تونگر اور مفلس۔ تندرست اور بیمار، مقیم اور مسافر، حاکم اور محکوم، لاولد اور صاحب اولاد مجرد اور متاہل، اس کو تمام زندگی میں جو کچھ کرنا ہے۔ اس دستور العمل میں اس کے

لئے ہدایت موجود ہے۔"

لکچروں کا مجموعہ جلد اول ص ۲۶۵-۶۶

موجودہ تعلیم سے ہندوستان کی طبیعت پر جہاں اور بڑے اثرات مرتب ہوئے ہیں وہاں ایک اثر یہ بھی پڑا ہے کہ ہمارے قیام وطعام کے طورطریق بھی انگریزوں سے ملتے جلتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ ہم میں طالب علموں کی خوبو ہے اور نہ ہمیں طالب علم بنایا جاتا ہے۔ ایک تقریر میں مولانا نے اس پر تنقید کی ہے:۔

"ایک رنگ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کا ہے کہ ان کو: دو وقت کے کھانے کے علاوہ کہ وہ بھی انگریزی ہو تو ہڑپ اور ہندوستانی ہو تو تھو تھو دوزخ شکم بھرنے کے لئے چاہئے۔ بریک فاسٹ، اور ٹفن، اور ٹی اور ایگزاور فروٹس اور ہاٹ نوٹ۔ ہماری میٹرول اور نیشل طالب علمی میں ستر عورت اور دفع حر وبرد کے لئے، موٹا جھوٹا کپڑا میسر آگیا تو کافی سمجھا جاتا تھا۔ اب کچھ نہ ہو تو شرٹ۔ پتلون اور کوٹ، ہینڈ کرچیف، سٹاکنگز، گلوز، فر، اور پھر مصیبت یہ کہ کھانے کے کپڑے اور، ہوا خوری کے کپڑے اور، اور کالج آوزر کے اور، سونے کے اور، کھانسنے اور، چھینکنے کے اور۔ ایک پاکٹ میں بزاز، ایک پاکٹ میں درزی۔ تو بہ ہے یار دوسروں کی کمائی پر یہ شتر غمزے۔ کیا فرق ہے ان طالب علموں میں اور ان سو بجروں میں جو گرمی بھر خس خانوں میں پڑے اینڈیں۔ سو بجرا اور اس قدر آرام طلبی، اور طالب علم اور اس میں اس درجہ بناؤ سنگار۔ اسے وہ انگریزی طور کا سہی۔ یہ سنن کے طو۔ جو سکھائے جاتے ہیں۔ ہیں تو خوش لیکن یہ لوگ کالج کا سا ہموار صحن اپنے گھر میں کہاں پائیں گے۔"

- لکچروں کا مجموعہ جلد اوّل ص ۲۵۳

تقریریں دلچسپ ہیں۔ اگرچہ لفظی ہوتی ہیں۔ اور عربی اور انگریزی لفظوں کی بھرمار اور فلسفیانہ

نکتوں کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔ مگر انداز بیان ایسا دلچسپ ہے کہ سننے والے اکتاتے نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب جوش تقریر میں جس پر بہت کم مقررین قابو پا سکتے ہیں۔ اصل موضوع سے ہٹ کر ادھر ادھر نکل جاتے ہیں اور کہیں آخر میں جا کر اصل موضوع کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے تقاریر ضرورت سے زیادہ لمبی ہو گئی ہیں۔

آیئے آخر میں ایک نظر مولوی صاحب کی زبان پر بھی ڈال جائیں۔ یوں تو مولوی صاحب کا اصل وطن بجنور تھا لیکن بچپن سے دلی میں رہتے رہتے یہیں کے ہو رہے تھے۔ اسی لئے جو کچھ کہتے تھے یہیں کی بولی میں کہتے تھے اور یہیں کے محاورے استعمال کرتے تھے۔ اپنے افسانوں میں جہاں جہاں مولانا نے عورتوں کی زبان میں باتیں کی ہیں۔ اس سے دلی کی مرحوم زبان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ گھریلو محاورے جو مولوی صاحب استعمال کر جاتے ہیں۔ شاید اب دلی کے کسی گھر میں بھی سننے نصیب نہ ہوں گے۔ دلی والے مر گئے اور ان کے ساتھ ان کی زبان بھی دفن ہو گئی لیکن اگر بحیثیت مجموعی مولانا کی زبان پر نظر ڈالی جائے تو اس میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں خامیاں بھی ملینگی۔ مولوی صاحب نے اپنی عبارتوں میں بیشتر عربی کے جملے اور عربی کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے اکثر جگہ زبان کی سلاست باقی نہیں رہی۔ اس کے علاوہ مولانا نے بعض ایسے محاورے بھی استعمال کئے ہیں جو دلی سے باہر کسی دوسری جگہ سننے میں بھی نہ آتے ہوں گے۔ ایک جگہ مولوی صاحب نے اپنی زبان کے متعلق خود لکھا ہے:۔

> "میری زبان اُردو ہے اور میں اردو ہی بولتا ہوں مگر اس میں...... عربی کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس واسطے کہ میں مسلمان ہوں اور چاہتا ہوں کہ سب میری طرح کے مسلمان ہوں اور کم سے کم اتنی عربی جانیں جتنی مجھ کو آتی ہے۔"

کلام اللہ کے ترجمے میں مولانا نے بہت سی ایسی غلطیاں کی ہیں جس کی وجہ سے ترجمہ ایک حد تک غیر مستند سمجھا جاتا ہے۔ ترجمے کو سہل اور قریب الفہم بنانے کی غرض سے انہوں نے اردو کے ایسے الفاظ اور محاورے استعمال کئے جو اصل کے الفاظ یا جملوں کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں۔

زبان کی ایک خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ جس واقعہ یا جس کیفیت کو بیان کیا جائے اس کی تصویر ہو بہو پڑھنے والوں کے سامنے کھنچ جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ بیان کرنے والوں کو زبان پر پوری پوری قدرت حاصل ہو تاکہ وہ موقع اور محل کی مناسبت سے ایسے جنچے تلے الفاظ استعمال کر سکے جو سننے یا پڑھنے والوں کے سامنے اس کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر نہ رہیں۔ مولوی صاحب کے یہاں یہ بات خاص طور سے پائی جاتی ہے۔ جیسا بھی مضمون ہو اس کے ادا کرنے کے لئے ان کے یہاں الفاظ کی کمی نہیں معلوم ہوتی۔ مثال کے طور پر ایک عبارت پیش کرتا ہوں۔

> "اب سے دو رایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا رکے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا۔ ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی۔ جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی جن بازاروں میں آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ایسے اجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا۔ اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھادیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس۔ کہنے کو زندہ پر مردے سے بدتر۔ نہ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت........."

عبارت بالکل سادہ ہے کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں آیا جس سے ہیضے یا وبا کی ہیبت ٹپکتی ہو۔ مگر پھر بھی پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ میں اگرچہ زور و شور نہیں لیکن موقع اور محل کی مناسبت بدرجہ اتم موجود ہے۔

بعض لوگوں نے مولوی صاحب کی زبان پر بازاری ہونے کا الزام لگایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کتابی زبان اور عام بول چال کی زبان میں فرق برتا جاتا ہے۔ مگر مولوی صاحب نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ اور وہ بے سوچے سمجھے ایسے جملے اور لفظ استعمال کر گئے ہیں جو بے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں شاید

ان حضرات کا یہ اعتراض صحیح ہوتا اگر وہ مولانا کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ مولوی صاحب نے جو کچھ لکھا وہ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے لکھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ مولانا انہیں اسی زبان میں مخاطب کرتے جسے وہ خود بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ زبان کا سرچشمہ عام لوگوں کی بولی ہوتی ہے۔ اور اسی ٹکسال میں زبان کو کھرا کھوٹا پرکھا جاتا ہے اور یہیں نئے الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ اہل تصنیف کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ اُن الفاظ کی صحیح ترتیب اور ان کے معنی کا جو مفہوم قرار پا چکا ہے اس کو ایک نہج پر قائم رکھیں۔ اور صنعت کی قلم کاری سے ان میں وہ حسن پیدا کر دیں جو زبان کو شستہ رفتہ، اور پختہ بنا دے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عام محاوروں اور لفظوں کے استعمال سے کبھی گریز نہ کرتے تھے۔

غرض جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے مولوی نذیر احمد مرحوم اپنے ہی زمانے کے نہیں بلکہ آنے والے زمانے کے لئے بھی ایک باکمال افسانہ نگار اور ایک کامیاب مصلح ثابت ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو باغ انہوں نے لگایا ہے اس کی بہار عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ مولانا مرحوم کر گئے وہ بہت کافی ہے اور آگے اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قومی اعتبار سے ہماری حالت ابھی تک بہت پست ہے اس کے لئے ہمیں جان توڑ کوشش کرنی چاہئے۔ اگر ہمارے یہاں کے مصنف اور افسانہ نگار صحیح معنوں میں مصنف اور افسانہ نگار بننا چاہتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنی قوم کے درد کو محسوس کریں۔ اور نذیر احمد کی طرح اس درد سے بے تاب ہو کر اس کے علاج کی صحیح اور کارگر تدبیریں ڈھونڈھ نکالیں۔

حیاتِ نو

انقلاب روس کا ایک منظر

افراد:۔ وسجا ۔ ایک نوجوان کسان
فیجا ۔ ایک سپاہی
جنکویو ۔ ایک فوجی عہدیدار
دالنج ۔ فوج کا افسر

کٹیا ۔ ایک انقلاب پسند عورت
نٹاشا ۔ وسجا کی بہن ۔ دیہاتی لڑکی
بہت سے سپاہی

منظر:۔ [جولائی ۱۹۱۹ء سویٹ روس کے علاقہ لاڈمیر کے ایک غیر آباد کٹیا میں پولٹیکل پولیس کا ایک دستہ مقیم ہے اس کٹیا کا ایک کمرہ دفتر کے لئے استعمال کیا گیا ہے ۔ اس کی پچھلی طرف ایک دروازہ کھلتا ہے جس کا رخ گاؤں کی طرف ہے ۔ کٹیا کے سامنے فیجا ایک ادھیڑ عمر کا سپاہی بیٹھا لکھ رہا ہے ۔ دیوار کے پاس وسجا ایک بائیس سالہ نوجوان بیٹھا سپاہی کا کوٹ سی رہا ہے ۔ اور گا رہا ہے ۔]

فیجا ۔ وسجا ۔ تم بھی عجیب آدمی ہو ۔ کل تمہیں گولی سے اڑا دیا جائے گا ۔ اور آج تم گا رہے ہو ۔

وسجا ۔ بہت اچھا ۔ اور تمہاری حالت کیا ہے؟ کیا تم بھی میری طرح قیدی نہیں ۔ اور میں تمہاری غلامی کا نشان تیار کر رہا ہوں ۔ لو اب میں گانا بند کر دیتا ہوں ۔ کیا میری وجہ سے تمہارے کام میں کچھ خلل پیدا ہوتا ہے؟ ۔

فیجا ۔ وہ کیسے؟

وسجا ۔ میرے گانے سے ۔

فیجا ۔ ہاں یہ میرے کام میں خلل ڈالتا ہے ۔ اس تکلیف دہ کام میں ہر چیز مخل ہوتی ہے ۔ میں نے اُستاد

سے لکھنے کا ڈھنگ نہیں سیکھا۔ ان الفاظ کو تحریر کرنے سے تو پتھر توڑنا زیادہ آسان ہے۔ اور پھر پیٹ سے بھوکے رہ کر۔ لیکن تم ہو کہ گائے جا رہے ہو!

وسجا۔ آخر دل بہلاوے کے لئے کچھ تو کرنا چاہیئے [اٹھ کر میز کی طرف بڑھتا ہے] لاؤ میں تمہاری مدد کروں تمہارا خط اتنا خراب نہیں لیکن تم لکھ کیا رہے ہو؟

فیجا۔ گاؤں کے ان نوجوانوں کے نام جو سترہ سال سے بڑے ہیں۔ اور جو آنے والی جنگ میں کام دے سکتے ہیں۔

[وسجا سر ہلا کر واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے] واہ! میں تو سمجھا تھا کہ تم اس کام میری مدد کروگے اور تم میز پر جا بیٹھے ہو۔

وسجا۔ میں اس کام میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ جانتے ہو میں نے فوج میں اپنا نام کیوں نہیں لکھوایا؟

فیجا۔ اس لئے کہ تم گولی چلانا نہیں چاہتے؟ لیکن نام لکھنا اور گولی چلانا ایک ہی بات نہیں؟ اچھا جاؤ میرے کوٹ کی مرمت کر دو۔ اور اگر تم گانا چاہو تو گائے جاؤ۔

وسجا۔ تم نہیں سمجھتے کہ ان لڑکوں کے نام لکھنا اور گولی چلانا برابر ہے۔ جن لڑکوں کے نام تم لکھ رہے ہو ان کو گولی چلانی پڑیگی۔

فیجا۔ تم کتنے بیوقوف ہو۔ ان کے نام تو میں لکھ رہا ہوں۔ پھر تم خواہ مخواہ کیوں مرے جاتے ہو۔

وسجا۔ مجھے اس سے دکھ ہوتا ہے۔ اگر تم ان کے نام نہ لکھو تو اس میں کیا ہرج ہے؟

فیجا۔ تو پھر تمہاری طرح مجھے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔

وسجا۔ بہت کچھ اور پھر ــــــ

فیجا۔ یہ تم اسوقت پوچھنا جب تمہیں گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔

وسجا۔ فیجا تمدارا ذرا سوچو اگر تم یہ نام نہ لکھو تو پھر اور کون لکھ سکتا ہے؟

فیجا۔ اس سے ہمیں بہت نقصان ہوگا۔ یہاں میرے سوا اور کوئی دوسرا شخص نہیں لکھ سکتا! ہمیں کسی شخص کو ماسکو سے منگوانا پڑے گا۔

وسجا۔ اگر یہ شخص بھی ان موت کے حکمناموں کو مکمل نہ کرے تو پھر؟۔

فیجا۔ تو پھر ہمارے مخالفین کا پنجہ ہماری گردنوں پر ہوگا۔ اور ہم نیست و نابود کر دیئے جائیں گے۔ تم ڈینکن اور کالچک کو نہیں جانتے۔

وسجا۔ کون؟

فیجا۔ وہی خونخوار کتے!

وسجا۔ ہاں یہ دو شخص ہیں اور ہمارے بچوں کو تباہ کر دیں گے!

فیجا۔ یہ دو شخص نہیں بلکہ اُن کی بے انتہا فوج اور سامان جنگ۔

وسجا۔ اگر ان کے سپاہی لڑنے سے انکار کردیں۔ اور اُن کے افسر جبری بھرتی نہ کریں۔ تو پھر؟

فیجا۔ یہ فضول بات مت کہو۔ بھلا ڈینکن کے سپاہی اور گولی نہ چلائیں کیا تم نے انہیں بھی اپنی طرح کاٹھ کا الو سمجھ رکھا ہے۔ کہ جو ملا اس کی خدمت کردی! وہ تو ڈاکو اور قاتل ہیں۔ تمہاری طرح نرم دل نہیں۔

وسجا۔ مجھ میں خاص کیا بات ہے۔ میں ایک معمولی درزی ہوں — لو اپنا کوٹ [فیجا کا کوٹ اس طرف پھینکتا ہے]

فیجا۔ شکریہ۔ اس کی مزدوری کیا لو گے؟

وسجا۔ کاغذ اور پنسل۔ مجھے اپنی ماں کو ایک خط لکھنا ہے۔ کیا مجھے کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑے گا؟

فیجا۔ قاصد ابھی جا رہا ہے۔

وسجا۔ لیکن شاید تھوڑی دیر میں میرا قصہ ہی تمام ہو جائے۔

فیجا۔ ایسا نہ کہو تم بہت اچھے نوجوان ہو۔ تم بائیبل پڑھ سکتے ہو اور خط لکھ سکتے ہو۔ میرا کہنا مانو اور اپنا نام لکھو۔ لڑائی میں گولی نہ چلانا۔ بھلا وہاں تمہیں کون دیکھے گا؟۔

وسجا۔ میں انہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ ایک ایسا بھی شخص ہے۔ جو انسانوں کو گولی کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا۔ تم مجھے کاغذ دو میں لکھنا چاہتا ہوں۔ [فیجا اس کو کاغذ اور پنسل دیتا ہے وسجا

لکھنے لگتا ہے۔ کہ جیکب جو پولیس کا نوجوان افسر ہے اندر داخل ہوتا ہے]

جیکب۔ فیجا۔ کیا وہ ناموں کی فہرست تیار ہو گئی ہے؟

فیجا۔ ہاں کامریڈ فہرست تیار ہے۔ میں تو یہاں بھوکا پیاسا پڑے رہنے اور تمام دن فہرستیں تیار کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔

جیکب۔ فضول باتیں مت کرو۔ مجھے ان فہرستوں کی فوری ضرورت ہے۔ ریزرو فوج میں کوئی بھرتی نہیں ہوگی۔ اور تم اپنا دکھڑا رو رہے ہو۔

فیجا۔ روٹی کے بغیر تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اور تم جانتے ہو کہ لکھنا میرے لیے آسان کام نہیں۔ میں نے وسیجا کی طرح کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا تھا۔

وسیجا۔ بھائی خوب گاؤ۔ تمہارے دکھ کا یہی علاج ہے [جیکب کو خندہ پیشانی سے مخاطب کرتا ہے] کامریڈ خوش آمدید۔ میرا یہ خیال درست نہیں کہ گانے سے انسان بھوک کو بھول جاتا ہے؟

جیکب۔ ہاں زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ وسیجا! کیا تم لکھنا جانتے ہو؟ ہم تم سے محرر کا کام لے سکتے ہیں۔ تمہیں جنگ میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن تم کچھ عجیب آدمی ہو۔ میں تمہیں سمجھ نہیں سکا۔

وسیجا۔ اگر تم مجھے نہیں سمجھ سکے۔ تو پھر مجھے عجیب کہنے سے کیا مطلب؟

جیکب۔ یہ لمبی چوڑی باتیں مت کرو۔ تم بہت اکھڑ آدمی ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں سپاہی بن کر بہت خوش ہوں؟

وسیجا۔ تمہیں کس بات نے مجبور کیا۔ کہ تم سپاہی بنو۔

جیکب۔ زمانے کی ضرورت۔ کیا تم پرانے نظام کو پھر قائم کرنا چاہتے ہو؟ یعنی زار۔ اس کے نواب، تازیانہ کی سزا۔ اور پانچ برس کی جبری فوجی ملازمت؟ لو وہ کتیجا بھی آ گئی ہے [کتیجا فوجی لباس پہنے اندر داخل ہوتی ہے]

کتیجا۔ ذرا لپک کر میرے لئے کچھ کھانا لاؤ۔ میں بہت تھک گئی ہوں، اور میرے پاؤں

درد کر رہے ہیں۔ وسجا ذرا میرے بوٹ تو اُتار دو، اور ان کو تیل لگا کر نرم کر دو۔ تاکہ مجھے چلنے میں تکلیف نہ ہو۔

وسجا۔ تمہارے پاؤں تو بہت خراب ہو گئے ہیں۔ کامریڈ میں تمہیں موزے سی دوں گا۔ تمہاری جرابیں بھی تو اچھی نہیں ہیں [وہ بوٹ اتارتا ہے۔ اور پھر جیکب کی طرف متوجہ ہوتا ہے] مجھے اجازت دیجئے کہ میں تھوڑی دیر باہر جا کر بوٹوں کو تیل لگا آؤں۔ [جیکب مڑتا ہے۔ گویا وہ بےچین ہے]

جیکب۔ فیجا تم اس کے ساتھ جاؤ۔

وسجا۔ کامریڈ کیوں؟ تم جانتے ہو کہ میں بھاگنے والا شخص نہیں۔

جیکب۔ اور اگر تم بھاگ جاؤ تو میں تمہیں الزام نہیں دوں گا۔

کیٹجا۔ اس کے برخلاف تم بہت خوش ہو گے۔ اگر تمہارے جیسے نوجوان کو گولی کا نشانہ نہ بنا جائے تو یہ تمہارے لئے باعث مسرت ہو گا۔

جیکب۔ کیٹجا! اس کا مطلب ہے میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔

وسجا میں ڈرتا ہوں نہ میں بھاگ جاؤں گا۔

کیٹجا۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں لیکن جو کچھ ہم تمہاری نسبت خیال کرتے ہیں وہ درست ہے؟

وسجا۔ [مسکرا کر] کامریڈ تمہارا خیال درست ہے۔

جیکب تم اکیلے جا سکتے ہو۔ [وسجا جانے لگتا ہے]

کیٹجا۔ کیا تم کچھ کھاؤ گے نہیں؟ [وہ اسے روٹی اور بھنوسہ دیتی ہے۔ وسجا مسکراتا ہے۔ اور ذرا ہچکچاتا ہے]

وسجا۔ شکریہ۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں چھ بجے تک گزارا کر سکتا ہوں۔ شکریہ [روٹی لے لیتا ہے] صرف یہی، میں گوشت نہیں کھاتا [وہ جاتا ہے]

جیکب۔ جہاں دیکھو وسجا کا ذکر ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ کیا بات ہے۔ ہر جگہ اس کے نام کی قصیدہ خوانی ہو رہی ہے، اور ادھر ڈنیکن سر پر آ رہا ہے۔ [باہر سے گانے کی آواز آتی ہے۔ وسجا گا رہا ہے۔ پھر اور آوازیں بھی اس کے ساتھ مل کر گاتی ہوئی سنائی دیتی ہیں] یہ کیا ہے؟

گویا ہم کسی میلہ میں ہیں؟

فیجا۔ کامریڈ انہیں گانے دو۔ اس طرح وہ بھوک کی تکلیف کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے۔

جیکب۔ ہمیں ماننا پڑے گا۔ کہ وسجا بہت بیباک شخص ہے۔

کٹجا۔ کامریڈ ہم اسے بچا سکتے ہیں۔ یہ دیکھو میں ماسکو سے کیا لائی ہوں؟ [وہ جیب سے ایک دستاویز نکالتی ہے] حکمنامہ لینن واقعی بہت بڑا آدمی ہے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کے لئے جو جنگ کرنا یا جنگ میں مدد دینا گناہ خیال کرتے ہیں۔ ایک کونسل بنائی ہے۔ جس کا صدر طالسطائی کی کتابوں کا ناشر چرخوف ہے۔

فیجا۔ طالسطائی کتنا اچھا نام ہے۔ وسجا مجھ سے اکثر اس کے متعلق باتیں کرتا رہتا ہے وہ کسانوں ایسی زندگی بسر کرتا تھا لیکن گوشت نہ کھاتا تھا۔ اور یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔

جیکب۔ فیجا تم اپنا کام کرو [وہ حکمنامہ کو پڑھتا ہے] معاملہ بہت اہم ہے۔ ایسا شخص جو نہایت اخلاص سے اپنے مذہبی خیالات کی بنا پر فوج میں بھرتی نہیں ہوتا اُسے فوراً رہا کر دیا جائے۔ یہ خبر تو بہت اچھی ہے۔ فیجا! ذرا وسجا کو تو بلانا۔

کٹجا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں!

جیکب۔ پھر کیا! معاملہ بہت اہم ہے۔ شام کے چھ بجے اس کی مہلت ختم ہو رہی ہے۔

کٹجا۔ میں جانتی ہوں کہ معاملہ اہم ہے لیکن ہمیں نہایت شرافت سے کام کرنا ہوگا۔ سنو! کیا اس میں شک ہے کہ وہ مذہب پر راسخ الاعتقاد نہیں ہے؟ پھر کونسل کی کیا ضرورت ہے؟ اسے رہا کر دو، تاکہ وہ اپنی ماں کے پاس چلا جائے۔ اور کھیت میں کام کرے۔

جیکب۔ یہ نہیں ہو سکتا یہ قانون کے خلاف ہے۔ کونسل کی منظوری لینا چنداں ضروری ہے۔

کٹجا۔ لیکن وہ خود تو کبھی نہیں لکھیگا۔

جیکب۔ کیوں نہیں۔ وہ لکھنا جانتا ہے۔

کنٹجا ۔ میں نے جو تمہیں کہہ دیا ۔ وہ نہیں لکھے گا ۔ وہ بہت ضدی ہے ۔ وہ قربانی دے کر مثال قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ ہم پر اس کا گہرا اثر ہو ۔

جیکب ۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو ۔ وہ مذہبی دیوانہ اور اپنے ضمیر کی نجات کے درپے ہے ۔ جبتک ہم اُسے اپنے حال پر رہنے دیں ۔ وہ ہمارے ساتھ تو کوئی دلچسپی نہیں رکھتا ۔

کنٹجا ۔ کامریڈ بعض اوقات تم عقل کو جواب دے بیٹھتے ہو ۔ میری بات مانو اور اسے چھوڑ دو ۔

جیکب ۔ تم جا کر اسے ترغیب دو ۔ شاید وہ تمہارا کہنا مان جائے ۔

کنٹجا ۔ وہ کسی کی خاطر کوئی کام نہیں کرتا ۔ جسے وہ حق بات خیال کرتا ہے اسی پر ڈٹا رہتا ہے ۔

[نٹاشا ، وسجا کی چھوٹی بہن جس کی عمر سات سال ہے ۔ دروازہ میں نمودار ہوتی ہے] اندر آجاؤ ، تم کیا چاہتی ہو ؟ تمہارا کیا نام ہے ؟ [نٹاشا ایک شرمیلی لڑکی ہے ۔ اور جھٹ پیچھے ہٹ جاتی ہے] فیجا ! یہ لڑکی کیا چاہتی ہے ؟

فیجا ۔ پیاری لڑکی ! ڈرو مت ، [نٹاشا بندوقوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ایک کونے میں رکھی ہیں] ننھی لڑکی وہ تمہارے لئے نہیں ۔ بلکہ گیدڑوں کے لئے ہیں ۔

جیکب ۔ بالکل ٹھیک ! بالخصوص ڈومانگ والے گیدڑوں کے لئے ۔

کنٹجا ۔ ذرا اپنی زبان کو لگام دو ۔ نوعمر کامریڈ تم کیا چاہتی ہو ؟

نٹاشا ۔ کیا وسجا کو ہلاک کر دیا گیا ہے ؟ وہ میرا بھائی ہے ۔

فیجا ۔ اوہو ! یہ تو وسجا کی چھوٹی بہن ہے ۔ ہم نے اُسے خط لکھنے کی اجازت دے دی تھی ۔ اس لئے یہ لڑکی اُسے ملنے آئی ہے ۔

جیکب ۔ بہت اچھا پھر اُسے بلا لو ۔ [فیجا جاتا ہے ۔ اور لڑکی رونے لگتی ہے]

کنٹجا ۔ تمہارا بھائی زندہ ہے ، اپنی ماں سے کہنا کہ ہم اُسے زندہ رکھیں گے ۔ لیکن وہ خود مشکلات پیدا کر رہا ہے ۔

[نٹاشا بہت خوش ہو جاتی ہے]

نٹاشا۔[خوشی کے لہجہ میں] اماں جان کہتی ہیں کہ وسچا کی بات ہمیشہ سچی ہوتی ہے وہ خدا کی آواز سنتا ہے۔
[وسچا نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کٹچا کے بوٹ ہیں۔ نٹاشا بھائی کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتی ہے] وسچا!

وسچا۔ کامریڈ یہ لو اپنے بوٹ۔[نٹاشا سے] اماں جان کیسی ہیں؟ کیا تم نے گھاس اکٹھی کر لی؟
[نٹاشا جواب دینے کے بجائے جیکب اور کٹچا کی طرف شرمیلی نگاہ سے دیکھتی ہے]

کٹچا۔ [جیکب سے] آؤ چلیں [دونوں جھونپڑی سے باہر چلے جاتے ہیں]

وسچا۔ یہ لو خط۔ اسکو احتیاط سے رکھو۔ کہیں یہ راہ میں خراب نہ ہو جائے۔ کیونکہ بارش ہونے والی ہے۔ چھوٹے بھیّا سے کہنا کہ لکھنا پڑھنا سیکھے۔ اور تم بھی سبق یاد کرتی رہنا۔

نٹاشا۔ ہاں! بھائی جان ہمارے ہاں ایک استاد آیا ہوا ہے۔ اور وہ دالان میں بیٹھا تختہ سیاہ پر لکھ رہا تھا۔

وسچا۔ سبق پڑھتی رہو۔ دیکھنا ماں کو زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ اس کا خیال رکھنا۔[نٹاشا چیخ مارتی ہے] نٹاشا! رومت۔ اماں جان سے کہنا کہ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اس کی یاد ہر وقت رہتی ہے۔ چھوٹے بھیّا کا خیال رکھنا۔ جب کھانے کا وقت آئے۔ تو سب سے پہلے اماں کو کھانا کھلانا۔ پھر تم لوگ کھانا۔ گائے کا بچھڑا فروخت کر کے گزارہ کرنا۔ چھوٹے بھیا کو سبق کے بعد باقی وقت کے لئے بڑھئی کے پاس کام سیکھنے کے لئے بھیج دینا۔

نٹاشا۔ اگر وہ چھوٹے بھیا کو بھی پکڑنے کے لئے آگئے تو پھر؟

وسچا۔ وہ نہیں آئیں گے۔ حالات بہت جلد بدل جائیں گے۔ تم جانتی ہو کہ اسوقت جنگ برپا ہے اور وہ بھی مجبور ہیں۔ لیکن بہر حال وہ زار سے بہتر ہیں۔ جنگ بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اور چھوٹے بھیّا کو گھر پر رہنے دیا جائے گا۔

نٹاشا۔ بھائی جان۔ اماں تو کہتی تھیں کہ جنگ بہت دیر تک جاری رہے گی [چلاتی ہے] اور اگر وہ چھوٹے بھیا کو لے گئے؟

وسجا۔ خدا ہماری مدد کرے گا [ہنستا ہے] میرا چھوٹا بھائی سپاہی نہیں بنے گا۔ وہ اُسے نہیں لے جاسکتے۔ کیونکہ وہ ابھی ایک بچہ ہے۔

نتاشا۔ وہ اُسے لے جائیں گے۔ اور تم یہاں بیٹھے باتیں بناتے رہو گے۔ وہ بھلا کسی کو چھوڑتے بھی ہیں۔ جوزف لنگڑا تھا۔ وہ اسے بھی لے گئے۔ چھوٹے بھیا پوچھتے تھے۔ کہ وہ اگر اُسے پکڑنے آجائیں تو وہ کیا کرے؟

وسجا۔ میں کیا بتاؤں۔ پیٹر ابھی بچہ ہے۔ وہ کیا کر سکتا ہے۔ اُسے بس یہی کہنا کہ خوب لکھے پڑھے۔ جو کام کرے اُسے ذرا سوچ لیا کرے۔ وہ ہوشیار بہت ہے۔ اسے کہنا کہ انجیل مقدس اور ارسطاطالیس کی کتابوں کا زیادہ مطالعہ کرے۔ اور ——— [نتاشا گھبرا جاتی ہے]

نتاشا۔ بھائی جان تم اسے بھی اپنے جیسا بنانا چاہتے ہو۔ تاکہ اُسے بھی گولی سے اُڑا دیا جائے۔

وسجا۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ میری طرح نہیں ہوگا۔ شاید وہ دوسروں کی طرح سپاہی بن کر اوروں کو گولی کا نشانہ بنائے۔

نتاشا۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔

وسجا۔ خوب کہی تمہیں بھی یہ پسند نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ جنگ جلد ختم ہو جائے گی۔ اور چھوٹے بھیا کو پکڑنے کی نوبت ہی نہ آسکے گی۔ تم بھی اس وقت تک جوان ہو کر گائے کی حفاظت کر سکو گی۔ رات ہونے سے پہلے گھر لوٹ جاؤ۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ الوداع ———

[لڑکی کو دروازہ تک لے جاتا ہے۔ اور خود واپس آکر تختہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ وسجا کا چہرہ کسی خیال سے سفید ہو جاتا ہے] خداوند یسوع مسیح! [وہ بیٹھا ہوا دعا مانگ رہا ہے کہ کٹیا داخل ہوتی ہے]

کٹیا۔ وسجا! وسجا!! [وہ چند لمحے رکتی ہے۔ اور پھر بے صبری سے] وسجا سنو! ایک نہایت ضروری بات ہے۔ دعا بعد میں مانگ لینا۔ یہ دعا مانگنا کتنی واہیات بات ہے! [وسجا خاموش ہے اور جواب نہیں دیتا۔ کٹیا آہ بھر کر میز پر جا بیٹھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ متوجہ ہوتا

وسجا۔ کامریڈ۔ بھلا یہ بھی کوئی اچھی بات ہے۔ کہ کسی کی دعا میں خواہ مخواہ دخل جائے۔

کیٹجا۔ تم تو بڑے احمق ہو۔ تمہیں مذہب کا جنوں ہے۔ اور ہم لوگ عذاب میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر معاملہ اتنا اہم نہ ہوتا۔ تو میں تمہیں سمجھاتی بھی؟ اب وقت تھوڑا ہے۔ ذرا اپنی زبان کو روکو۔ اور سنو۔ [اس کا طرز گفتگو تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور وہ نہایت نرمی سے بات شروع کرتی ہے] تمہیں معلوم ہے کہ میں ماسکو گئی ہوئی تھی۔ اب یہ کاغذ پڑھو۔ [وسجا حکمنامے کو لے کر پڑھنا شروع کرتا ہے]

وسجا۔ خوب۔ لینن واقعی ایک بڑا آدمی ہے۔ زار کے عہد میں حالات اس سے بہت مختلف تھے۔ کامریڈ اب تو گویا دنیا ہی بدل گئی ہے [کیٹجا اس کی باتیں غور سے سنتی ہے]

کیٹجا۔ وسجا تمہیں اپنا بھی خیال ہے؟

وسجا۔ اپنا خیال؟ ہاں ذرا اسے دوبارہ پڑھ لوں۔

کیٹجا۔ تم کونسل کو درخواست لکھو۔ وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔

وسجا۔ وہ میری بات پر کیسے اعتبار کریں گے؟ میں یہاں ہوں۔ اور وہ ماسکو میں ہیں۔

کیٹجا۔ اس کی فکر مت کرو۔ صرف درخواست لکھ دو کہ تم مذہبی آدمی ہو اور تم نے طالسطائی کی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ شیر بیکوف ضرور تمہاری باتوں پر یقین کر لیگا۔ وہ طالسطائی کا گہرا دوست تھا اور تمہاری مدد کرے گا۔

وسجا۔ میں اپنی مدد آپ کر سکتا ہوں۔ حکمنامہ میں لکھا ہے کہ "جس کے متعلق یقین ہو جائے کہ اس کے خیالات مذہب پر پختہ ہیں تو اس کو رہا کر دیا جائے گا" بھلا تمہیں یا کسی شخص کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میرے خیالات پختہ ہیں؟ کوئی میرا سینہ پھاڑ کر نہیں دیکھ سکتا کہ میں سچ بول رہا ہوں ـــــ لیکن اب تو یہ جدوجہد ہی فضول ہے۔ کیونکہ چھ بجے میرا کام تمام کر دیا جائے گا۔

کیٹجا۔ تم نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ تم پرلے درجے کے ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔ تمہیں شہید ہونے کا شوق ہے۔

وسجا۔ کامریڈ یہ حکمنامہ بہت عمدہ ہے۔ اور میں تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

وسجا۔ تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ اس حکمنامہ سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ روس کے مزدوروں اور کسانوں کی جمہوریت کے عہد میں حالات بہتر ہیں۔ اور ماسکو کے بڑے لوگوں کے دل میں آزادیٔ ضمیر کا احترام ہے۔ لینن ہمارے دل کی آواز سن سکتا ہے۔ جو درحقیقت خدا کی آواز ہے۔ یہ واقعی نئے حالات ہیں میرے جیسے دوسرے لوگ جو انسانوں کا خون بہانا نہیں چاہتے۔ وہ بھی اس اعلان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ٹیرچنکوف ان لوگوں کے دلوں کو دیکھ سکتا ہے۔

کٹجا۔ خواہ کچھ ہو ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم تمہیں ماسکو بھیجیں وہاں تمہیں عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ تاکہ وہ تمہارے دل کے اندر نظر ڈال سکیں۔

وسجا۔ [غمگین ہوکر] کامریڈ یہ مت کرنا۔ مجھے اس سے دکھ ہوگا۔ میں اسکو پسند نہیں کرتا۔

کٹجا۔ وسجا کیا تمہیں کوئی تکلیف ہے؟ یا کسی عورت سے محبت ہے۔ کہ تم اسقدر بے دل ہوئے جاتے ہو۔ [وسجا اشارے سے اسے روکتا ہے] تم ابھی باغ زندگی کے نوخیز درخت ہو۔ تمہیں کیا خبر ہے کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ محبت۔ کتابیں اور راگ یہ ہے زندگی۔ اے کاش تم نے ماسکو کی کسی بزم نشاط میں شرکت کی ہوتی۔ یا کسی حسینہ کے لب لعلین کا گرم بوسہ تمہارے خون کو گرماتا۔ اور تم اس کی لذت محسوس کرتے۔ تم نہیں جانتے کہ تم کس چیز کو رد کر رہے ہو۔ اگر آج تمہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ تو یہ ایک ستم ہوگا۔ [وہ رکتی ہے] لیکن وسجا تم زندگی سے بیزار کیوں ہو؟

وسجا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ سورج کی کرنیں۔ پرندوں کے نغمے اور بھوک یہ بھی زندگی ہے۔ اپنے گھر کو چھوڑنا بہت مشکل ہے۔ کامریڈ گھر کا تمام بوجھ مجھ پر ہے۔ اور ان کو میری ضرورت ہے۔

کٹجا۔ تو پھر یہ کاغذ لو اور اپنی درخواست لکھدو۔

وسجا۔ نہیں۔ میری نجات کا ذریعہ وہ افسر ہے۔ جو چھ بجے آئے گا۔ اگر وہ مجھے کہہ دے۔ کہ "وسجا اب تم آزاد ہو۔ ہم تمہیں لوگوں کو ہلاک کرنے پر مجبور نہیں کرتے؟

کٹجا۔ وسجا تم بیوقوف مت بنو۔ کیا ہم لوگ قاتل ہیں؟

وسجا۔ جو کسی شخص کا خون بہائے۔ وہ قاتل ہے۔ جو شخص سپاہی بھرتی ہوگا۔ وہ گویا قتل کرنا سیکھیگا۔

کٹنجا۔ یا وہ قتل کو روکے گا۔ کامریڈ کیا تم یہ چاہتے ہو۔ کہ ہم قتل کر دئے جائیں۔ اور وہ حیات نو مٹ جائے جس کا تصور ابھی ابھی تم قائم کر رہے تھے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم پر پھر تازیانے برسیں؟

وسجا۔ جو شخص فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔ تازیانہ خود بخود اس کے سر پر نازل ہو جاتا ہے۔ کامریڈ ذرا سوچو زار کا عہد کیا تھا؟ تازیانہ۔ فوج۔ جنگ۔ پادری۔ اب یہ سب چیزیں دور ہو گئی ہیں۔ زار کی جگہ لینن نے لی ہے۔ اور وہ اس سے بہتر ہے۔ لیکن یہ کیا کہ اب پھر وہی کشت و خون کا سلسلہ جاری کر دیا جائے؟ اسے میں "نئی زندگی" نہیں کہتا۔ یہ تو وہی پرانی داستان ہے۔

کٹنجا۔ کیا ہم جنگ کرتے ہیں؟ تم تو بڑے بیوقوف ہو۔ ہم تو امن کے متمنی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہوا اور غذا ہمارے لئے ضروری ہے۔ یہ ظالم سرمایہ دار تو ہمیں جینے نہیں دیتے کیا تم چاہتے ہو۔ کہ وہ ہمیں نیست و نابود کر دیں۔ تم خود ہی اسکا حل بتاؤ۔

وسجا۔ میں کیا حل بتا سکتا ہوں۔

کٹنجا۔ تم پھر بھی سوچو۔ اگر سب دُنیا تمہاری طرح ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ [وسجا مسکراتا ہے]

وسجا۔ مجھے تم سے اتفاق نہیں۔ اگر میں آج ماسکو لکھ دوں۔ تو شاید تمہارے کہنے کے مطابق مجھے چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑے گا۔ مجھے گھر بھیج کر ایک دوسرے نوجوان کو پکڑ کر فوج میں بھرتی کر لیا جائے گا۔ جو عمر بھر مجھ پر لعنتیں بھیجتا رہے گا۔ کہ میں نے خود آزادی خرید کر اس کو فروخت کر دیا۔ لیکن اگر مجھے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ تو یہ معاملہ اور ہوگا۔ شاید لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

کٹنجا۔ تم بےفکر رہو۔ ہم تمہاری موت کو مشتہر نہیں کریں گے۔

وسجا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا مجھ پر گولی چلانے والوں کی زبان کو بند کر لو گی؟

کٹنجا۔ واہ! ان کی کیا بات ہے۔ وہ تو اس کام کے عادی ہیں۔

وسجا۔ یہ درست ہے۔ لیکن انہوں نے اس سے قبل میرے جیسے انسان پر گولی نہیں چلائی۔

جوان کا دوست ہے۔ میرا جرم صرف اسقدر ہے کہ میں دوسرے انسانوں کو قتل کرنا گناہ سمجھتا ہوں
یہ بات ان کے لئے یقیناً نئی ہوگی۔ اور وہ اس سے سمجھ جائیں گے کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

کٹجا۔ اپنی زبان کو بند کرو۔ میں یہ وعظ سننا نہیں چاہتی

وسجا۔ غالباً تم میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔

کٹجا۔ چپ رہو۔ تم نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔

[جیکوبو داخل ہوتا ہے]

جیکوبو۔ کیا اب تار دے دیا جائے؟

کٹجا اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وسجا تم بیوقوف ہی نہیں بلکہ ظالم بھی ہو۔

وسجا۔ کامریڈ معاف کرنا۔ شاید تم بھی میری ہی طرح ہو۔ اچھا۔ اب مجھے ذرا کھلے میدان میں چند منٹوں کے لئے جانے کی اجازت دیجئے۔ میں ابھی واپس آجاؤنگا۔ آپ فکر نہ کیجئے گا [باہر نکل جاتا ہے]

جیکوبو۔ یہ تو بڑا ہی ضدی نکلا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب مجھے افسر اعلیٰ کو اطلاع دینی ہوگی لیکن۔

کٹجا۔ اچھا۔ یہ حکمنامہ لے لو۔ شاید اس کے ذریعہ اس کی موت رک جائے۔ مگر۔

جیکوبو۔ مگر کیا؟

کٹجا۔ اس کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش میں میرا ارادہ بھی متزلزل ہو رہا ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ اور چاہتی ہوں۔ کہ ذرا آرام کرلوں۔ میں نیند سے تازہ دم ہو جاؤں گی۔ اور افسر اعلیٰ بھی اس وقت تک پہنچ جائے گا۔

[وہ باہر چلی جاتی ہے۔ جیکوبو حکمنامہ کو دوبارہ پڑھ رہا ہے۔ کہ والنج افسر اعلیٰ داخل ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، افسر اعلیٰ میز پر بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جیکوبو اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے]

والنج۔ کیا کوئی نئی بات ہے۔ جس پر ہم غور کریں۔

جیکوبو کچھ نہیں؟ صرف وسجا کا معاملہ زیر غور ہے۔

[والنج گھڑی دیکھتا ہے]

والنج ۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں ۔ کیا وہ نہیں مانتا ؟

جیکوبو ۔ بالکل نہیں ۔ وہ تو چٹان کی طرح مضبوط ہے ۔

والنج ۔ اچھا ۔ پھر سوا چھ بجے اس کو گولی سے اڑا دو ۔

جیکوبو ۔ [جوش میں] کامریڈ ! لیکن ایک بات ہے [وہ اپنے جوش کو ضبط کرنا چاہتا ہے] یہ دیکھو کٹیا یہ کاغذ ماسکو سے لائی ہے ۔ یہ ایک تازہ فرمان ہے ۔

[حکمنامہ اس کی طرف بڑھا دیتا ہے]

والنج ۔ کیا یہ کوئی اہم دستاویز ہے ؟ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں ۔ ساڑھے چھ بجے مجھے واپس جانا ہے اور سوا چھ بجے اس کا فیصلہ کرنا ہوگا ۔

جیکوبو ۔ معاملہ بہت اہم ہے ۔ اس کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ سزا کا حکم قانون کے خلاف دیا گیا ہے ۔

[والنج کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہیں وہ جلدی سے مڑتا ہے]

والنج ۔ یہ کیا فرمان ہے ؟ مجھے دکھاؤ ؟ [وہ حکمنامہ کو دیکھتا ہے] یہ ایک لغو چیز ہے [پھاڑ کر اسے پھینک دیتا ہے] معلوم ہوتا ہے کہ ماسکو میں ان لوگوں کو اب کوئی کام نہیں رہا ۔ اس لئے اس قسم کی فضول حرکتیں شروع ہوگئی ہیں ان کو کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ۔ اسی لئے وہ یہ معافی نامے جاری کرنے لگے ہیں میں اس حکمنامہ کو لغو سمجھتا ہوں ۔ اور کوئی بات ؟

جیکوبو ۔ لیکن ۔

والنج ۔ جانے بھی دو ۔ میں اس معاملہ کو خود سمجھ لوں گا ۔ اگر آج اس کو چھوڑ دیا گیا ۔ تو کل کوئی اور رطالسطائی کا چیلہ باہر نکل پڑے گا ۔ اور بوڑھا فیجا بھی اپنا زہد دکھانے لگے گا ۔

جیکوبو ۔ لینن تو اپنے افعال کو خوب سمجھتا ہے ۔ اس کے نزدیک لوگوں میں انقلاب کی روح پیدا ہونا ۔ فوجیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے بہتر ہے ۔

والنج ۔ شاید ایسا ہی ہو ۔ لیکن ہم ایسے لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتے جن کے نزدیک انقلاب کوئی چیز نہیں ۔

جیکوبو۔ کامریڈ۔ تم انقلاب کی اصل روح کی توہین کر رہے ہو۔

والنچ۔ انقلاب کا ناکام رہنا اس کی توہین ہوگا۔

جیکوبو۔ فوج میں بھرتی نہ ہونے والوں کو تو زار کے عہد میں بھی گولی کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا۔

والنچ۔ زار کو لوگوں کی پروا نہ تھی۔ لیکن ہمیں تو ان سے کام لینا ہے [جیکوبو خاموش ہو جاتا ہے] اب نہ یاد؟ بحث کا وقت نہیں۔ تم جا کر گاؤں کا ایک چکر لگاؤ۔ اور ٹھیک ساڑھے چھ بجے واپس آجانا۔ ہاں تو کتچا کہاں ہے؟

جیکوبو۔ وہ دالان میں سو رہی ہے۔ وہ سفر کی وجہ سے تھکی ہوئی تو تھی ہی۔ وسچا کو سمجھاتے سمجھاتے اور بھی زیادہ تھک گئی۔

والنچ۔ وہ اس کو کیا سمجھاتی رہی؟

جیکوبو۔ وسچا کو اس حکمنامہ کا علم ہے لیکن وہ اپیل نہیں کرنا چاہتا۔

والنچ۔ [زیادہ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے] وہ کیوں؟

جیکوبو۔ وہ اپنے اصول کا پکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب لوگ اپنے اصول کی خاطر لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور خود قتل ہوتے ہیں تو پھر وہ اپنے اصول پر کیوں جان نہ دے؟

والنچ قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں! کیا بیہودہ بات ہے۔ ہم تو کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہے خوب دلچسپ نوجوان۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا بھانجا یاد آتا ہے۔ جو زار کے عہد میں اسی جرم کے لئے قتل کر دیا گیا۔

جیکوبو۔ تو پھر کیا تم اس کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔

والنچ۔ جانے بھی دو۔ میں دماغی عشرت کا قائل نہیں۔ اب جاؤ۔ اور پورے ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچ جانا۔ [جیکوبو جاتا ہے] فیجا! ذرا فیجا کو اندر بھیج دو۔ میں کتچا کو نیند سے بیدار کرنا نہیں چاہتا [وہ لکھنے لگتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد فیجا داخل ہوتا ہے] تمہارے پاس اس وقت کتنے آدمی ہیں؟

فیجا۔ وسچا سمیت آٹھ۔

والنج پانچ منٹ کے بعد اپنے آدمیوں کو تیار کرو۔ بندوقوں میں گولیاں بھر لو۔ اور وسیجا کے دونو ہاتھ باندھ دو۔

فیجا۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا!

والنج۔ مگر کیوں؟

فیجا۔ میں اُس کے ہاتھ نہیں باندھوں گا۔ اور نہ اُسے گولی کا نشانہ بناؤں گا۔

والنج۔ [ہنستے ہوئے] گویا وہ اب بھی تبلیغ کر رہا ہے۔ [اپنا پستول نکال لیتا ہے] بوڑھے کھوسٹ اگر تم گولی نہ چلاؤ گے۔ تو میں خود یہ کام کر سکتا ہوں۔ اس میں ابھی دو گولیاں بھری ہوئی ہیں،

فیجا۔ کامریڈ اسے جانے دیجئے۔ یہ میرے گاؤں کا رہنے والا ہے اور میں اِسے خوب جانتا ہوں۔

والنج۔ [مایوسی سے] ان لوگوں کے ذریعہ ہم نئے دور کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔

فیجا۔ کامریڈ میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں اس کو اپنی گولی کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا۔ اس لئے میں ہوائی فائر کر دوں گا۔ باقی چھ گولیاں اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہیں۔

والنج۔ دور ہو جاؤ اور پانچ منٹ میں وسیجا زندہ نہ رہے۔

[فیجا باہر چلا جاتا ہے۔ والنج اپنے پستول کو کھول کر گولیوں کو دیکھتا ہے۔ اور پستول دوبارہ پھر میز پر رکھ دیتا ہے۔ باہر سے کسی کی آواز سنائی دیتا ہے۔ وسیجا نہایت سریلی آواز میں کہتا ہے۔ بھائیو! ادھر آؤ۔ کہاں پھر رہے ہو۔" والنج لکھنے میں مصروف ہے پھر وارنٹ حکمنامہ نکال کر گھڑی کو دیکھتا ہے]

[سپاہی قطار باندھ کر کھڑے ہو چکے ہیں۔ اور فیجا اُن کے دائیں طرف کھڑا ہے۔ والنج ان کا فاصلہ درست کرتا ہے اور وسیجا اس کی طرف گھور رہا ہے۔ وہ دروازے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور وسیجا فوراً دروازہ بند کر کے اس کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں روشن ہیں۔ لیکن اُن میں اضطراب نمایاں ہے۔ وہ والنج سے پوچھتا ہے "کیا اب بالکل بندوبست ہو چکا ہے؟ والنج سر ہلاتا ہے اور پھر سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوتا]

والنج۔ ریڈی [سپاہی فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ والنج کے ہاتھ میں سزا کا حکم ہے اور وہ پڑھتا ہے] حکومت روس کی انقلابی عدالت کے سامنے۔ ۳ جون ۱۹۱۹ء کو وسیجا ٹارکن نامی شخص کا مقدمہ ہوا۔ اس پر

فوجی خدمت سے انکار کرنے کا الزام ہے۔ کیونکہ وہ اُسے مذہبی عقائد کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کے اس سنگین جرم کی پاداش میں اُسے گولی سے اڑا دینے کی سزا دی گئی ہے۔ اُسے ۴۸ گھنٹے کی مہلت دی گئی تھی۔ کہ وہ اچھی طرح غور و خوض کرے۔ اگر وہ فوجی خدمت پر آمادہ ہو جائے۔ تو اس کو معاف کر دیا جائے لیکن اس نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ اب اُسے اس جگہ بھیجا گیا ہے۔ تاکہ سزا کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن بے سود۔ اس لئے اب حکم کی تعمیل کی جاتی ہے [وسجا سے] وسجا کیا تم سمجھ گئے ؟

وسجا۔ اب آپ درست فرماتے ہیں۔ معاملہ بالکل صاف ہے

والنج کیا تم اب بھی انکار کئے جاتے ہو۔

وسجا۔ ہاں۔

والنج۔ [سر ہلاتا ہے] کیا تمہاری کوئی خواہش ہے ؟ [وسجا اُس سے ہاتھ ملاتا ہے۔ سپاہیوں سے] تیار ہو جاؤ [سپاہی بندوقوں کو کندھوں تک لے جاتے ہیں۔ اچانک وسجا کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔ اس کے پٹھے تن جاتے ہیں] اس کی آنکھیں باہر نکل آتی ہیں۔ اور وہ ہر ایک کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ پُر درد لہجہ میں کہنا شروع کرتا ہے

وسجا۔ بھائیو! میرے جسم کو گولی کا نشانہ بنانے سے مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا۔ میرا جسم ایک قمیص کی طرح ہے۔ جسے آج یا کل ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا تھا۔ اور یہی حال آپ سب کے جسموں کا ہے۔ لیکن میری موت کس قدر خوبصورت موت ہے میں محبت اور امن کی قربان گاہ پر اپنی جان کا چڑھاوا پیش کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے تم پر افسوس ہے۔ تم مجھے قتل نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی ضمیر کا خون کر رہے ہو [اس کا جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور وہ مسکراتا ہے] میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

والنج۔ [غصے سے حکم دیتا ہے] فائر۔ [سپاہیوں کی بندوقیں خود بخود نیچے ہو جاتی ہیں۔ اور سب کے لبوں سے آہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ فیجا صرف ایک فائر کرتا ہے۔ اور اس کا نشانہ دروازہ پر لگتا ہے] بدمعاش لوگ بزدل!! فیجا! ادھر آؤ۔ اس شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔

وسجا۔ کامریڈ اس کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تمہیں ان کو دیکھنے کی جرأت نہیں؟

[والنج پستول سے فائر کرتا ہے۔ وسجا زمین پر گر پڑتا ہے۔ سپاہی اس کی لاش اٹھا کر ایک تختے پر ڈال دیتے ہیں۔ والنج گنگناتا ہے۔ اور اندر سے کنٹجا نکلتی ہے۔

کنٹجا۔ یہ فائر کیسا تھا؟ (وسجا کی لاش دیکھ کر] وسجا! [وہ کرسی پر گر پڑتی ہے۔ پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور لاش کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کا چہرہ ہاتھ سے چھو کر] یہ اب سرد ہو چکا ہے۔ وسجا! وسجا!! افسوس [والنج سے] کیا یہ بات ضروری تھی؟

والنج۔ بہت ضروری۔ معاملہ بہت نازک ہو چکا تھا۔ آخری وقت اس نے فوجیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ انہوں نے گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ اس لئے مجبوراً مجھے فائر کرنا پڑا۔

کنٹجا۔ تم بھی کتنے جوانمرد ہو! گویا وہ تم سے طاقتور تھا۔ وہ ایک قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اور تم فوجی وردیوں میں ملبوس۔ بندوق اور برچھیوں سے مسلح۔ خوب! اب تو تمہیں ان باغی سپاہیوں کو بھی گولی کا نشانہ بنانا پڑے گا۔

والنج۔ اس کی فکر مت کرو۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں لیکن وہ واقعی ایک بہت اچھا نوجوان تھا۔ وہ مرتے دم تک مسکراتا رہا۔ اس کے آخری الفاظ کتنے پیارے تھے۔ یہ جنگ ختم ہو جائے تو میں فرصت کے وقت اس کے آخری الفاظ یاد کروں گا۔ اچھا خدا حافظ۔

[والنج چلا جاتا ہے۔ جیکوبو داخل ہوتا ہے۔ وہ لاش کی طرف نہیں دیکھتا۔ بلکہ میز پر بیٹھ جاتا ہے کنٹجا ادھر ادھر کمرے میں پھر رہی ہے]

کنٹجا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ قتل کرنا انسانیت کو ذلیل کرنا ہے ہتھیار انسانیت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔ تم لوگ ان بندوقوں اور تلواروں کے ساتھ اب میری آنکھوں میں ذلیل ہو چکے ہو۔ مجھے ان چیزوں سے نفرت ہے۔

[جیکوبو کنٹجا کی کمر سے لٹکے ہوئے پستول کی طرف اشارہ کرتا ہے] مجھے اس سے بھی نفرت ہے۔ کیا اس کا نام انقلاب ہے؟ یہ تو اسی پرانی داستان کا اعادہ ہے۔ یہ قتل رد عمل کا پیش خیمہ ہوگا۔

جیکوبو۔ ہاں۔ یہ ایک عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوگا۔
کنچا۔ یہ الفاظ اب بے معنی ہیں لیکن یہ لاش ایک حقیقت ہے۔ اس نوجوان نے اپنی جان دے کر فتح حاصل کی ہے اور اُس نے مرتے دم تک مساوات کی روح کو ذلیل نہیں ہونے دیا۔ خداحافظ۔

[کمر سے پستول نکال کر اور سینے سے فوجی تمغے اتار کر میز پر رکھ دیتی ہے۔ اور دروازے کی طرف بڑھتی ہے]

جیکوبو۔ کامریڈ! تم کہاں جارہی ہو؟
کنچا۔ حیاتِ نو کی تلاش میں۔

پردہ

جگر پارے

(از حضرت جگر مراد آبادی)

تھی جو بنیاد شادی و غم کی
دل نے وہ انجمن ہی برہم کی

اس نے شانوں پہ زلف برہم کی
خیر یارب نظامِ عالم کی

آہ کی ہے صدا نہ ماتم کی
کیا طبیعت بدل گئی غم کی

تیری نسبت سے، تیری بخشش سے
اللہ اللہ راحتیں غم کی

اتنے ہی مجھ سے وہ قریب ہوئے
میں نے جتنی ہی آرزو کم کی

یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی
کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی

کوئی دیکھے تو کیا ہنسی آئے
ہائے رے بدحواسیاں دل کی

آئی تھی آج بھی نسیمِ سحر
آگ بھڑکا گئی جہنم کی

عشق کو کہیے کس طرح معراج
یہ تو فطرت ہے ابنِ آدم کی

اس سے پوچھو جمالِ شبنم کا
جس نے خود آرزوئے شبنم کی

اک خطا پر سزائے بے میعاد
ہائے تقدیر ابنِ آدم کی

تو نے ناصح! یہ کس کا نام لیا
چھا گئیں دل پہ بدلیاں غم کی

جس کا جھکنا محال تھا سو آج
عشق نے وہ نگاہ بھی کم کی

عشق کا راز غیر کیا سمجھیں
پڑ نہ جائے نگاہ محرم کی

شانِ رحمت برس پڑی کیا کیا
اس خطا پر کہ پھر خطا کم کی

دھن ہی اب اور ہے یہاں ناصح
تجھ کو سوجھی ہے شادی و غم کی

حسن آیا تھا خود منانے کو
سو توجہ ہی عشق نے کم کی

خاطرِ حسن تھی ہی کچھ برہم
دل نے دانستہ اور برہم کی

فروری ۱۹۳۸ء

مسلم عوام کی تعلیم

مسلم لیگ کا کوئی ممبر ہو یا کانگریس کا کوئی قوم پرست مسلمان، کوئی آزاد خیال اخبار ہو یا کوئی فرقہ پرور جریدہ، ہر ایک کی زبان و قلم سے یہی سننے میں آتا ہے کہ ہندوستان کی حالت دن بدن گر رہی ہے۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے اور یہ تباہ و برباد ہو رہے ہیں، یہ آواز کچھ نئی نہیں ہے، بہت پہلے یہی فسانہ جمال الدین افغانی اور سرسید کی زبان سے بھی سنا جا چکا ہے۔ اور آج بھی ملک کا ہر گوشہ اس صدا کو اس کثرت سے سُن رہا ہے کہ اب اس کے لئے اس کے اندر کوئی جاذبیت اور کوئی تحریک یا عملی ترغیب محسوس نہیں ہوتی، گذشتہ دور میں جو کچھ کہا گیا اس کے اندر درد تھا۔ ایک تڑپ تھی اور یہی وجہ ہے کہ عہد ماضی کے زعماء کے ہاتھوں، غلط یا صحیح تعمیری کاموں کی عظیم الشان بنیادیں بھی پڑیں جو اپنی بساط حدود کے اندر قومی فوائد کے کام انجام دے رہی ہیں لیکن آج کل کی چیخ پکار میں کوئی خلوص، کوئی ہمدردی، اور کوئی صحیح بےچینی نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ربع صدی کی مسلسل ہنگامہ پروری اور ان گنت انجمن سازیوں کے باوجود قوم وہیں کھڑی ہے جہاں پہلے تھی بلکہ اب تو قوم پر مایوسی و اضمحلالِ قومی کے آثار بھی نمودار ہونے لگے ہیں لیکن جیسا کہ فطرت کا دستور ہے۔ ہر تاریکی کے بعد روشنی نمودار ہوتی ہے۔ رات کے بعد دن ضرور آتا ہے۔ مجھے بھی اس ہجوم مایوسی میں اُمید کی کچھ کرنیں نظر آرہی ہیں، جدید قانون کے نفاذ کے بعد سے ہر مسلم جماعت اس بات کی کوشش میں مصروف نظر آرہی ہے۔ کہ مسلمانوں میں جلد سے جلد سیاسی قوت آجائے اور وہ اپنی موجودہ پستی سے نکل کر کسی بلند مقام پر پہونچ جائیں، میں کسی خاص سیاسی فرقہ سے تعلق نہیں رکھتا، اور نہ مجھے مسلم لیگ اور کانگریس کی جنگ میں کوئی خاص لطف آتا ہے، میرے سامنے تو صرف وہ چیزیں ہیں جنکو عملی جامہ پہنائے بغیر نہ مسلم لیگ مسلمانوں کے درد کا صحیح علاج

کرسکتی ہے اور نہ کانگریس کے شیدا و ہمنوا مسلمان، میں چاہتا ہوں کہ آج ناظرینِ جامعہ بھی میرے ساتھ ان چیزوں پر ایک نظر ڈال لیں۔

میں نے اس مضمون کا عنوان "مسلم عوام کی تعلیم" رکھا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلم ادارے جبری تعلیم نافذ کریں، ہر مسلمان لڑکے اور لڑکی کو تعلیم یافتہ بنا کر رہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کی حقیقی ترقی کے لئے عام و لازمی ابتدائی تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن جبری تعلیم کا اجرا کسی قومی ادارے کا کام نہیں۔ اس کی عام اشاعت کے لئے حکومت کے دست و بازو کی ضرورت ہوتی ہے، قانون و آئین سے مدد لینی پڑتی ہے۔ یہ کام ہمیشہ طاقت و قوت کے بل پر ہوا ہے۔ اور ہوگا۔ قومی انجمنیں اور جمعیتیں اس کے حق میں رائے عامہ کو استوار و ہموار کر سکتی ہیں، حکومت کا ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔ مگر جبر و زور نہیں کر سکتیں۔ یہ کام ان کی دسترس سے باہر ہے پس اس نظریہ کے ماتحت میری مراد اس عنوان سے صرف یہ ہے کہ ہر بالغ مسلم کو اس کی ضروریاتِ زندگی و مسائل حاضرہ سے واقف کیا جائے، تعلیم کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے۔ کہ اسکول اور یونیورسٹی کی حدود اور چہار دیواری کے اندر کتابوں کی ورق گردانی کی جائے، بڑے بڑے فلسفیانہ نظریات حل کئے جائیں اور سائنس کے حیرت انگیز تجربات سے دنیا کو استعجاب میں ڈال دیا جائے۔ بلکہ تعلیم کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ ایک شہری کو زندگی کی ضرورتوں سے واقف کیا جائے، دنیا کی رفتار سے آشنا کیا جائے، ملک کے مصائب سے آگاہ کیا جائے، عمرانی زندگی کے اصول سے باخبر کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسکو بتایا جائے کہ وہ کیا ہے؟ اور اسے کیا کرنا ہے؟ یہ وہ تعلیم ہے کہ اس سے مستفید ہونے کے لئے بڑی کتابوں کے گہرے مطالعہ اور کسی یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لینے کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ چیز تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ گھر گھر اشاعت پا سکتی ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ خلوص ایثار اور محنت ہے۔ سیاسی سربلندی کی خواہش چھوڑ دی جائے، اور محنت و مشقت شہرت اور نام و نمود کے لئے کی جاتی ہے، اگر وہ سب کی سب خاموش قومی تعمیر میں صرف کی جائے تو آج ہی ایک نئی مسلم قوم —— طاقتور اور قوی —— پیدا ہو جائے اور ہندوستان کو ہلا کر رکھدے۔

اس عام تعلیم کے سلسلہ میں ایک مشکل ضرور سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ ہندوستان ایک وسیع ملک

ہے۔ ہر صوبہ کی۔ ہر صوبہ کے ہر مغربی و مشرقی، ہر جنوبی و شمالی حصہ کی بلکہ ہر ضلع کی مشکلات، ضروریات زندگی و مسائل حیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں کسی "آل انڈیا" جمعیت کے لئے کوئی یکساں تعلیمی پروگرام تمام ہندوستان میں رائج کرنا سخت دشوار امر ہے، یہ چیز بڑی حد تک صحیح ہے اور اس دشواری کو مقامی لیڈر بڑی حد تک دور کرسکتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو "آل انڈیا" حیثیت رکھتی ہیں اور جن کی تعلیم تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے ہیں انہی عام مسائل کو عنوانات ماتحت کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مذہب۔ مسلمانوں کے ایک گروہ کو شکوہ ہے کہ ان کے ہم مذہب آزادی کی جنگ سے جی چراتے ہیں۔ کانگریس میں بلا شرط شریک ہو کر ملک کی آزادی کی جنگ میں دوسری قوموں کے دوش بدوش حصہ نہیں لیتے۔ اسلام کی عزت پر دھبہ لگاتے ہیں، اپنی غلامانہ ذہنیت سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں، دوسرا گروہ جمہوری حکومت کے اصول و آئین کو دیکھتا ہے، ڈرتا ہے کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس کی قوم کے حقوق اکثریت کے ہاتھوں نیست و نابود نہ ہو جائیں، بحث اس سے نہیں کہ کون گروہ حق بجانب ہے، اس ذکر سے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اگر آج ہندوستان کا مسلمان اپنے مذہب کی صحیح تعلیم سے اپنے دین کی صحیح روح سے واقف ہوتا تو نہ کسی کو کوئی شکایت ہوتی اور نہ کسی کو کوئی خوف اور ڈر، وہ آزادی کے لئے بے چین ہوتا۔ غلامانہ زندگی کو گناہ سمجھتا، اور ہر آن غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر حریت و استقلال حاصل کرنے کی فکر میں بے قرار رہتا۔ ہندو راج کا بھی اس کو ڈر نہ ہوتا۔ وہ سمجھتا کہ وہ دنیا میں صرف اس لئے پیدا ہے کہ حکومت کرے خدا کی خلافت قائم کرے۔ اسی کے بتائے ہوئے قانون پر دنیا کو چلائے۔ مگر مدت ہوئی کہ مذہب کی صحیح تعلیم نہ صرف ہندوستان سے بلکہ دنیا سے مفقود ہو چکی ہے۔ یہ مذہبی جہالت ان پڑھ جماعت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس معاملۂ خاص میں ہندوستان کے چوٹی کے مسلم زعمار بھی ویسے ہی کورے ہیں جیسے دیہات کا الھڑ جاہل، یقین نہ ہو تو خالص اسلامی یونیورسٹیوں کالجوں اور اسکولوں کی سیر کیجئے، ہربرٹ اسپنسر کانٹ اور ہیگل کے بیان کردہ پیچیدہ مسائل از بر ہیں۔ مگر جو چیز ان کو نہیں آتی وہ اپنے مذہب کی تعلیم و ہدایات ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ مذہب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اسکو قابل اعتنا بھی نہیں سمجھتے ہیں۔

آج مسلمانوں کو یا دوسرے لفظوں میں مذہب اسلام کو جتنا خطرہ اور شدید خطرہ اپنی مذہبی جہالت سے ہے اتنا خطرہ نہ کسی اور طاقت سے ہے اور نہ کسی اور قوم سے آج اگر مسلمان اپنے مذہب کی صحیح قدر وقیمت سے واقف ہوتا تو نہ وہ آج غلام ہوتا اور نہ اسکو کسی قسم کا خوف وخطر ہوتا۔ وہ اپنی شریعت کو، اپنے اصول کو اپنے قانون کو، اپنی تہذیب کو، اپنے تمدن کو اور اپنی ہر چیز کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا، اور انگلی دکھانے والے کا سر قلم کرلیتا۔ جمعیۃ العلماء مسلمانوں میں سیاسی قوت پیدا کرنے کے لئے قربانیاں کررہی ہے۔ مصیبتیں اٹھارہی ہے مشقتیں برداشت کررہی ہے۔ مگر افسوس کہ اتنی معمولی سی چیز اس کے ذہن میں نہیں آتی۔ کاش وہ اپنی ساری توجہ اسی عام مگر صحیح مذہبی تعلیم کی طرف صرف کرتی۔ تو آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ یاد رہے کہ جب تک ذہن میں انقلاب پیدا نہیں کیا جاتا جب تک دماغوں کو مذہبی بنایا نہیں جاتا۔ جب تک گھر گھر دینی تعلیم کا چرچا نہیں ہوجاتا۔ اسوقت تک چاہے ہندوستان ہزاروں مرتبہ آزاد ہو مگر مذہب سربلند نہیں ہوسکتا اسلام کو عظمت نصیب نہیں ہوسکتی۔ اسلام نام افراد کا نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص تعلیم و ہدایت کا ہے جب یہی چیز ذہنوں سے ناپید ہوتی جارہی ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ آزاد ہندوستان میں وہ کون سا اسلام ہوگا۔ جس کے حقوق کی حفاظت مسلم لیگ کرے گی اور جس کے سر جمعیۃ العلماء تاج رکھ کر اپنے مذہبی فرائض سے سبکدوش ہونے کے شادیانے بجائے گی۔ ضرورت ہے کہ ہر انجمن اور ہر جمعیۃ چاہے وہ کسی سیاسی نظریہ کی مالک ہو اپنے عملی پروگرام میں سب سے پہلے مذہبی تعلیم کی عام اشاعت کو جگہ دے۔ ورنہ پھر اسے کوئی حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی و ہدایت کا دعویٰ کرے۔

جغرافیہ۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ مسلم عوام کو جغرافیہ کی باقاعدہ تفصیلی تعلیم دی جائے، ان کو براعظم کی تعریف یاد کرائی جائے۔ ان کو یہ بتایا جائے کہ جزیرہ کس کو کہتے ہیں، اور جزیرہ نما کس چیز کا نام ہے بلکہ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ ضروری جغرافیائی حالات ان کے سامنے پیش کئے جائیں۔ جن کے علم کے بغیر موجودہ دنیا میں زندگی تاریکی میں گذرتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اخباری خبروں کے متعلق ہم خود اپنی کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے اور مجبوراً اخبار نویس کے مقالہ افتتاحیہ پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ میرا مقصود جغرافیہ کی تعلیم سے یہ ہے کہ سرسری طور پر عوام کو یہ بتایا جائے کہ دنیا کی وسعت

کیا ہے؟ کس کس حصہ ملک میں کون کون سی قومیں آباد ہیں؟ ان کے کیا کیا رسم و رواج اور عادات وخصائل ہیں؟ خود ہندوستان کی وسعت کیا ہے؟ ہر ہر صوبہ میں کیا طبعی اختلافات موجود ہیں؟ ہندوستان کی خاص خاص پیداوار کیا ہے؟ کون کون سی چیزیں یہاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں؟ کن کن چیزوں میں ہندوستان غیر ممالک کا دست نگر ہے؟ ابھی کن کن اور چیزوں کی پیداوار کے امکانات یہاں موجود ہیں؟ زراعت اور صنعت و تجارت کے معاملہ میں مسلمانوں کی کیا دشواریاں ہیں؟ وہ کیوں کر دور ہو سکتی ہیں؟

اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ کون کون سے اسلامی ممالک ہندوستان کی حدود کے قریب واقع ہیں؟ ان کے طبعی حالات کیا ہیں؟ ان کا کوئی باہمی سلسلہ قائم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر قائم ہو سکتا ہے تو اس کا مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت اور سیاسی قوت پر کیا اثر پڑے گا؟ اس قسم کی جغرافیائی تعلیم کا سب سے بڑا اثر یہ پڑے گا۔ کہ عامۂ مسلمین کی نظر میں وسعت پیدا ہوگی۔ اور اس وسعت سے جو عام فوائد مرتب ہوں گے۔ وہ کسی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ افسوس ہے کہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ اُن کو شمار کیا جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ کیا خود مصلحین میں بھی اتنی وسعت نظر موجود ہے؟ کیا وہ ان تمام تفصیلات سے واقف ہیں جنکا خاکہ مذکورہ بالا تحریر میں پیش کیا گیا ہے؟

اہم تاریخی واقعات۔ کسی قوم کی ترقی کے لئے، عروج کے لئے، باحوصلہ اور بلند ہمت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ گذشتہ تاریخ سے اسکو واقف کیا جائے۔ اس کی عظمت و رفعت، اس کی شان وشوکت اس کی جاہ وجلال اس کے دماغ میں تازہ کئے جائیں، اس کی فتوحات اور اسکی کشورکشائیاں اس کو یاد دلائی جائیں۔ اس کے بزرگوں کی ہمتوں اور شجاعتوں کی داستانیں اس کو سنائی جائیں، ان کو بتایا جائے کہ ان میں وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بدولت چار دانگ عالم میں وہ کوس لمن الملک بجارہے تھے، اور آج ان میں وہ کیا خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جنکے ہاتھوں آج وہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں۔ رسوا و بدنام ہیں؟ ان تعلیمات کا یہ اثر ہوگا کہ عوام اپنے حالات کا جائزہ لیں گے، اسلاف کے کارنامے سن کر ان کے قلوب میں نئے نئے ولولے پیدا ہوں گے، جوش پیدا ہوگا۔ ہمت و قوت پیدا ہوگی۔ عزم و ارادہ پیدا ہوگا۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ واپس لانے کی نہ ختم ہونے والی تمنا و آرزو پیدا

ہوگی، اسلامی تاریخ ہزار سال کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر ایک جز سیے کو سامنے لایا جائے، بلکہ یہ کیا جائے کہ وقت و حالات کے مناسب اہم تاریخی واقعات چن لئے جائیں اور انہیں کو اس کثرت سے دہرایا جائے کہ اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجائے۔ اور کبھی دماغوں سے محو نہ ہو،

سیاسی تعلیم۔ دنیا کے مختلف ممالک کی سیاسی رفتار کیا ہے؟ خود دنیا مجموعی حیثیت سے کن سیاسی مصائب میں مبتلا ہے؟ ان سوالات کو نظر انداز کیجئے، ہندوستان کا دیہاتی بلکہ شہری مسلمان بھی اپنے ملک کی سیاسیات تک سے ناواقف ہے۔ اسکو نہیں معلوم کہ اسی ملک کی دوسری اقوام کے ساتھ اس کا باہمی توازن کیا ہے؟ کون کون سے سیاسی حقوق ہیں جنکو اسے حاصل کرنا ہے اور وہ کون کون سے سیاسی فرائض ہیں جنکو اسے انجام دینا ہے؟ انگریزی حکومت ہندوستان کو آزاد نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ملک سیاسی حیثیت سے ابھی بہت پیچھے ہے، اپنے سیاسی جہل کی وجہ سے اس میں اتنی صلاحیت موجود نہیں کہ وہ جمہوریت کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو سکے اور اس کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکے۔ کم سے کم مسلمانوں کو، اگر وہ کوئی سیاسی ترقی چاہتے ہیں تو، جلد سے جلد اپنی جہالت کو دور کرنا چاہئے ۱۹۳۵ء کے قانون نے ہندوستان کو کسی قدر جمہوری اختیارات تفویض کئے ہیں۔ ان اصلاحات سے وہی قوم بہرہ اندوز ہو سکتی ہے جو اپنے حق انتخاب کی اہمیت سے واقف ہو، اس میں اخلاقی جرأت ہو کسی بڑی شخصیت سے مرعوب ہونا نہ جانتی ہو اپنے ووٹ کا استعمال دیانتداری سے کرے۔ کسی پروپگنڈے سے دھوکہ میں نہ آجائے بلکہ اپنے سیاسی مفاد کا اس کو اچھی طرح علم ہو۔ اور اپنا ووٹ اسی کو دے جس سے اس کا سیاسی مفاد وابستہ ہو۔ اور جس سے کسی سیاسی خدمت کی توقع ہو۔ اس معاملہ میں برادران وطن کی حالت مسلم عوام کے لحاظ سے کہیں بہتر ہے۔ ایک ہندو کسان اپنا ووٹ اسی کو دیتا ہے۔ جس سے اسکو توقع ہوتی ہے۔ کہ وہ اس کی زراعتی مشکلات کو دور کرانے کی ان تھک کوشش کرے گا۔ ایک ہندو مزدور ووٹ اسی کو دے گا جس کو وہ سمجھتا ہے کہ وہ محض کسی عزت کے حاصل کرنے کے لئے اسمبلی کی کوئی نشست حاصل کرنا نہیں چاہتا ہے۔ بلکہ اس کے دل میں مزدوروں کا حقیقی درد موجود ہے اور

وہ واقعتہً مزدوروں کو ان کے مصائب سے نجات دلانے کے لئے یہ ساری جدوجہد کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے مسلم عوام کے اندر ووٹ دیتے وقت اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی غیر متعلق چیز سے متاثر ہو کر ووٹ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے امیر اور زمیندار مسلم نمائندے کونسلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ جنکو عوام کی صحیح مشکلات کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔

اخلاقی تعلیم ۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی تباہ کن حد تک گر چکی ہے، انکی معاشرت سے انسانی خصائل ختم ہو چکے ہیں۔ کوئی ایسا عیب نہیں جوان کی فطرتِ ثانیہ نہ بن چکا ہو۔ کوئی ایسی برائی نہیں جس میں یہ مبتلا نہ ہوں۔ شراب یہ پیتے ہیں، جوا یہ کھیلتے ہیں، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کرتے ہیں، اسرف اور فضول خرچ یہ ہیں، شادی بیاہ میں تمام کی تمام ہندوانہ رسوم کو یہ ادا کرتے ہیں۔ جھوٹی شان و شوکت اور نام و نمود کے لئے مہاجنو کے قرض کے بار سے یہ دبے ہوتے ہیں الغرض کوئی ایسی اخلاقی خرابی نہیں جوان کی قومی بنیادوں کو کمزور نہ کر رہی ہو۔ ضرورت ہے کہ رہنمایانِ وقت مسلمانوں کی اس کمزوری طرف فوری توجہ کریں، ان کو اخلاقی تعلیم دیں۔ عاداتِ بد کے خوفناک نتائج سے ان کو واقف کریں، آزاد ہندوستان میں اس قوم کا کوئی حصّہ نہ ہوگا۔ جو اخلاقی حیثیت سے سرفراز نہ ہو، جس کی معاشرتی زندگی نقائص سے پاک اور مکمل نہ ہو ایک شراب خوار، ایک قمار باز، ایک ۔ ۔ ۔ ۔ آزاد ہندوستان میں کسی عہدہ، کسی منصب اور کسی بلند مقام کا مستحق نہیں ہو سکتا، ایک مقروض قوم، تجارت میں صنعت و حرفت میں کوئی ترقی نہیں کر سکتی زراعت کے کھیتی باڑی کے تمام راستے اس پر مسدود ہوں گے۔ جو قوت آج آپس کی گالی گلوج میں صرف کی جاتی ہے۔ کاش وہ مسلمانوں کے اس سدھار اور اصلاح و ہدایت میں لگائی جاتی۔

تعلیم اصول حفظانِ صحت ۔ اسی اخلاقی تنزل کا نتیجہ ہے کہ مسلم قوم دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اس کے نوجوانوں کے چہرہ پر کوئی سرخی اور کسی قسم کی شگفتگی نظر نہیں آتی۔ یاد رہے کہ ایک تندرست جسم ہی کے اندر ایک تندرست دماغ پیدا ہو سکتا ہے، ہمت و شجاعت کے زیور سے آراستہ وہی شخصیت ہو سکتی ہے۔ جس کے قوئ مضبوط ہوں۔ اعضا درست ہوں، اور عناصر میں اعتدال

ہو۔ایک مدقوق کے دل میں کوئی ولولہ نہیں پیدا ہو سکتا، ایک دائم المریض اپنے اندر کوئی حوصلہ نہیں پاتا جسکی صحت درست نہیں ہوتی اس کے اندر امنگوں کی کوئی چنگاری نہیں ہوتی، قلب میں کوئی تمنا نہیں ہوتی دماغ میں کوئی بلند تخیل موجود نہیں ہوتا۔ ہمارے عوام صحت کے موٹے موٹے اصولوں سے بھی ناواقف ہیں۔ زندہ قوموں کو دیکھ لو۔ ان کی صورت ہی دیکھ کر دل مرعوب ہو جاتا ہے۔ کیا اپنی قوم کو صحیح، توانا اور تندرست بنانے کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ سب سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑے کو چکا لیا جائے، یا نقطہ نظر کے ہر اختلاف کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس کی ضرورت محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے؟

اقتصادی تعلیم۔ آخر میں اس چیز کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جس کے بغیر ہم کوئی سیاسی، اصلاحی اور تعلیمی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ مسلمانوں کی اقتصادی تباہ حالی کا یہ عالم ہے کہ آج ہم کوئی قومی کام مؤثر طریقہ پر انجام نہیں دے سکتے، قومی غربت کا اثر ہماری تعلیم پر، ہماری صحت پر، ہماری سیاست پر، ہر چیز پر پڑ رہا ہے۔ آج وقت کی سب سے بڑی اور پہلی پکار یہ ہے۔ کہ اپنے افلاس کو دور کرو۔ ہندوستان کی سب سے بڑی دولت زراعت ہے، اکثر آبادی کی روزی کا انحصار اسی ذریعہ کے عروج و زوال پر ہے مسلمان بھی اسی ملک کے باشندے ہیں، ان کا ذریعۂ معاش بھی یہی ہے، ضرورت ہے کہ زراعت کے تمام اصول سے ان کو واقف کیا جائے، جدید آلات زراعت سے ان کو روشناس کیا جائے، اور ان کے استعمال کے طریقے ان کو بتلائے جائیں، ماہرین زراعت نے موجودہ زمانہ میں جو خاص خاص تحقیقات کی ہیں، ان سے ان کو مستفید ہونے کا موقع دیا جائے، اور اس سلسلہ میں ہر وہ تجویز جو حکومت یا کسی اور جانب سے زراعتی ترقی کے لئے سامنے آئے اس کی ہمیشہ ان کو اطلاع دی جاتی رہے، اس کے علاوہ خاص خاص گھریلو دستکاریاں جو کسی زمانہ میں صرف مسلمانوں کی ملکیت رہ چکی ہیں، اس کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جائے، معماری اور دوسرے فرنیچر وغیرہ کے کاموں کی اہمیت ان کے ذہن نشین کی جائے اور ان کو یہ بتایا جائے کہ اپنی روزی کمانے کے لئے جو پیشہ بھی دیانت داری کے ساتھ اختیار کیا جائے وہ بیکار بیٹھے رہنے یا خیرات و ذلت کی زندگی گذارنے سے صد درجہ بہتر ہے، کوئی پیشہ خواہ

وہ کسی قسم کا موذلیل نہیں ہے ۔ ہر پیشہ اپنی جگہ پر معزز اور اختیار کئے جانے کے قابل ہے ، جو چیز ذلیل ہے قابل نفرت و ملامت ہے وہ بیکاری کی زندگی اور کسی فیاض کی آس اور امید ہے، اس پروپگنڈا کو اگر اپنی زندگی کا ایک جز بنا لیا جائے اور عوام کے اندر پورے زور کے ساتھ پھیلایا جائے تو آج بڑی حد تک قوم کی غربت اور مالی مصیبت کم ہو جائے ،

مضمون ختم کرنے سے پہلے آخر میں ایک مرتبہ پھر گذارش ہے، کہ مسلم عوام کی عام تعلیم کا مسئلہ وقت کا اہم مطالبہ ہے جسکو کوئی انجمن نظر انداز کر کے زندہ نہیں سکتی ۔ آپ مسلمانوں کو جنگ حریت میں شریک کرنا چاہتے ہوں یا آپ تحفظ حقوق مسلمین کے حامی ہوں ۔ ہندوستان کی تمام انجمیں، سیاسی ہوں یا اصلاحی، مذہبی ہوں یا علمی، اور اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے باہم کتنی ہی متصادم ہوں، اگر آپ کو یا ان کو مسلمانوں کی واقعی کوئی خدمت انجام دینا ہے، اگر واقعی ان میں زندگی پیدا کرنا ہے، اگر واقعی ان کو سربلند بنانا اور بام رفعت پر پہونچانا ہے تو سب سے پہلے مذکورہ بالا خاکہ کے مطابق ان کے ذہن کو بیدار اور ان کے قلب کے کو روشن کرنا پڑے گا، ورنہ بغیر اس کے نہ ان میں باہمی معاونت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور نہ اپنے اندر وہ کسی قومی خدمت و آزادی کے لئے کوئی تڑپ محسوس کریں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ میری گذارشات رہنماؤں کی توجہ خاص کی مستحق ثابت ہوں ،

یارانِ نجد سے خطاب

(ایک مشاعرے کی دعوت کے جواب میں)

اب تک جسے منزل کا مقصود سمجھتے ہو — آغاز میں میرے بھی یہ رہگذر آیا تھا

میں نے بھی تخیّل کی پرواز دکھائی تھی — تاروں سے پرے جاکر میں سیر کر آیا تھا

دنیا کے دھندلکے میں الفت کی کرن لیکر — محفل کا ہر اک گوشہ پُرنور کر آیا تھا

اک شاہدِ محبوبی، اک پیکرِ رنگینی — ارمانوں کے رستے سے دل میں اُتر آیا تھا

جلووں کی فراوانی، تابانی و عریانی — عاشق کو محبت میں کیا کیا نظر آیا تھا

جچتا مری آنکھوں میں کیا حسن حقیقت کا — میں خواب کی دنیا میں پرواز کر آیا تھا

پہنائے دو عالم میں بس ایک تجلی تھی — ہر وادی و صحرا میں ایمن نظر آیا تھا

باقی تھا سرِ دار تو مر مر کے جئے جانا — میں کوچۂ جاناں میں جاں نذر کر آیا تھا

وہ جانِ حزیں جسکی قوموں کو ضرورت تھی
ہستی کے لئے جسکی ہر سانس ودیعت تھی

ہندوستان

ہری پورہ کانگریس

پچھلے مہینے ہری پورہ میں کانگریس کا اکیاون (۵۱) واں اجلاس منعقد ہوا نصف صدی کی سیاسی جدو جہد کے نتائج کا ایک عجیب مظاہرہ تھا۔ جو کام منفرد شخصیتوں نے شروع کیا تھا اور جس سے عرصہ تک کسی تعطیل کے زمانہ میں لوگوں کو تقریریں کرنے اور تجویزیں منظور کرنے کا دلچسپ مشغلہ ہاتھ آجاتا تھا۔ ہوتے ہوتے ایک عظیم الشان سیاسی ادارہ بن گیا ہے۔ اسوقت اس کے ڈیڑھ کروڑ کے قریب ممبر ہیں، گویا تعداد اراکین کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے بڑا سیاسی ادارہ ہے۔ برطانوی ہندوستان کے ایک بڑے حصہّ میں آج اس کی وزارتیں حکومت کر رہی ہیں۔ اور یہ محض پردیسی حکومت پر تنقید و نکتہ چینی کی جرات طلب مگر پھر بھی آسان کام سے آگے بڑھ کر مہمات امور کو طے کرنے اور ملکی زندگی میں عملی دخل کی ذمہ داری اٹھانے کی کٹھن منزل میں پہنچ گئی ہے۔ تمنا کی بے تابیوں سے نکل کر عمل کی صبر طلبی سے دوچار ہے۔ لیکن یہ تغیر کشاکش سے خالی نہیں۔ ہری پورہ کانگریس اس کشاکش کا ایک مظاہرہ تھی۔

انتظامات کی وسعت، اور خوبی، صحت اور صفائی، اہتمام، جزئیات تک میں خوش سلیقگی ہزارہا رضا کاروں کی خاموش خدمت، جلسوں میں بیک وقت دو دو تین تین لاکھ انسانوں کا خاموشی سے بیٹھنا۔ ان چیزوں کا اندازہ بھی اس شخص کے لیئے مشکل ہے۔ جس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا نہ ہو۔ مگر اس کا یقین بھی باہر والے مشکل سے کر سکتے ہیں کہ انسانوں کے اس ٹڈی دل میں جوش اور وارفتگی کی کیفیت کا مشکل ہی سے کہیں پتہ چلتا تھا۔ نہ نعرے تھے۔ نہ جیکارے، پرانے مشاق کبھی کبھی نعرے لگاتے تھے۔ تو کوئی مصرعہ نہ اٹھاتا تھا۔ کام کرنے والے خاموش کام میں لگے تھے۔ دیکھنے والے ان کے کام کے نتائج پر بس تحیر کے عالم میں تھے۔ کچھ لوگ ضرور تھے جو اس اطمینان اور خاموشی میں بے وقت

کی راگنی الاپتے تھے۔ مگر وہ کم تھے، اور یہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ یعنی بڑی اکثریت کو ان کا یہ انداز کھلتا ہے۔ بار بار یہ سننے میں آتا تھا کہ "یہ لوگ کام نہیں کرنے دیں گے"۔ ہری پورہ کانگریس کا غالب رنگ یہی تھا کہ "کام کرنے دو۔ باتیں کم کرو"۔ یہ خود اعتمادی کا رنگ ہے۔ اور جن لوگوں کی وجہ سے ہری پورہ پر یہ رنگ غالب تھا۔ وہ واقعی اپنے پر بڑا اعتماد رکھتے ہیں لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے۔ یہی رنگ قناعت کا رنگ بن سکتا ہے، اطمینان کا روپ لے کر بالآخر جمود کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ خصوصاً ایک ایسی قوم کے لیئے جو اپنی آزادی کے حصول میں کوشاں ہیں اور جس کی آخری منزل ابھی بہت دور ہے۔ یہ خطرہ بڑا سخت خطرہ ہے۔ اس سے پہلے بھی کانگریس میں "عملی" معتدل مزاجوں اور "خیالی" انتہا پسندوں کی ٹکر ہو چکی ہے۔ پہلے کے "عملی" لوگ اس سے بہت کم پر کام کرنے کو آمادہ تھے۔ جتنے پر آج ہیں لیکن فرق یہی تھا۔ ایک گروہ چاہتا تھا کہ جس درمیانی منزل تک پہنچنے کے لئے اتنے دن جدوجہد کی ہے اور راہ کی کلفتیں برداشت کی ہیں اس پر کچھ تو ٹہریں۔ دوسرا گروہ اس ٹہرنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں عارضی منزل کا آرام خواب آور نہ ثابت ہو۔ پہلے ایسے موقعوں پر کانگریس میں ہمیشہ انتہا پسندوں کی جیت رہی۔ اس دفعہ ملک بظاہر معتدلین کے ساتھ ہے۔

ہری پورہ کی ساری کارروائی میں اعتدال کی یہ جھلک پائی جاتی ہے۔ وفاق کا مسئلہ پیش ہوا معتدلین بھی وفاق کے مخالف ہیں۔ مگر انتہا پسند جانتے ہیں کہ یہ کیسا اختلاف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وفاق کو بروئے کار نہ آنے دینے کے لیئے بھی شاید دبی تدبیر کی جائے جو صوبوں میں دستور کو "ختم" کرنے کے لئے کی جا رہی ہے، یعنی یہ کہ اسے پوری قوت اور انہماک سے چلایا جائے! انھیں اندیشہ ہے کہ وفاق کو قابل قبول بنانے کے لیئے اگر ہندوستانی ریاستوں کے شامل ہونے پر کچھ ایسی شرائط لگ گئیں جو کانگریس والے چاہتے ہیں تو شاید وفاق کو لوگ "ختم" کرنے کی خاطر قبول کرلیں گے۔ وہ اس لیئے بات کی وضاحت چاہتے تھے۔ سب کچھ کھول کر جتانا چاہتے تھے۔ مگر معتدلین نے یہی طعنہ دیا کہ تم کو ہم پر نہیں خود اپنے پر اعتماد نہیں۔ کانگریس پر اعتماد نہیں، قوم پر بھروسہ نہیں۔ دراصل اپنے چھیٹے پن کا احساس تم کو بہکاتا ہے۔ وقت آنے دو۔ ہم تم سے پیچھے نہ رہیں گے، لیکن اسوقت بات اسی طرح کہی جائے گی۔ جیسے ہم

کہتے ہیں۔ کانگریس نے ان معتدلین کی خود اعتمادی پر بھروسہ کیا اور بات اسی طرح کہی گئی۔ جیسے یہ چاہتے تھے،

دیسی ریاستوں میں کانگریس کی شاخیں قائم کرنے کا مسئلہ آیا۔ کچھ دن پہلے وردھا میں کانگریس کی جماعت عاملہ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ شاخیں نہ قائم کی جائیں۔ لوگ اس بات پر بہت برہم تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ سے پہلے عام گفتگوؤں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس مسئلہ پر معتدلین کو شکست ہوگی، اشتراکی جماعت، ریاستوں کے لوگ، اور بہت سے غیر متعلق لوگ سب یہی کہتے تھے کہ یہ تو ریاستوں کے آگے سپر ڈالنی ہے، اپنے کروڑوں ہم وطنوں سے قطع تعلق کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب معاملہ بحث کے لیئے آیا اس وقت بھی مخالفت کا اظہار بڑی شدومد کے ساتھ ہوا۔ مگر بالآخر فیصلہ یہی ہوا اگر شاخیں قائم ہوں تو وہ سیاسی کام نہ کریں! گویا تعمیری کام میں کانگریس کا ہاتھ بٹائیں تو بٹائیں۔ مگر کسی سیاسی پیچیدگی میں کانگریس کو نہ مبتلا کریں۔ انتہا پسند کہتے ہیں کہ یہ ریاستوں سے کوئی سودا ہو رہا ہے۔ چرخے اور کھدر کے کام، دیہی صنعتوں کے احیاء اور قومی تعلیم کے تجربہ میں ریاستوں کی مدد حاصل کرنے لیئے یا اور آئندہ وفاق میں انھیں ساتھ رکھنے کے لئے ڈورے ڈالے جا رہے ہیں۔ معتدل کہتے ہیں، تم نہ کام کرتے ہو نہ کام کو سمجھتے ہو۔ ہم خالی نام نہیں چاہتے۔ بقول مولانا ابوالکلام "کھلونوں سے دل بہلانا، ہمیں منظور نہیں۔ ہمارے ہاتھ میں بہت کام ہے۔ ساری قوت اسی کے نمٹانے میں صرف کرنی ہے، ہم ریاستوں کے جھگڑوں میں پڑکر اپنا دھیان بٹانا نہیں چاہتے۔ ریاستوں میں بھی کام کو واقعی بڑھانے کا یہی طریقہ ہے۔" کانگریس نے بڑے بحث و مباحثہ کے بعد معتدلوں کی رائے ہی کو مانا۔

خیال تھا کہ ہری پورہ کانگریس کی فضا میں عام ٹھنڈک کچھ اس وجہ سے بھی ہے کہ کوئی خاص مسئلہ جوش دلانے والا سامنے نہیں۔ لیکن کانگریس شروع ہونے سے پہلے خبر پہنچی کہ صوبجات متحدہ اور بہار کی کانگریس وزارتوں نے استعفٰی دیدیا۔ اس سے گو حرارت بڑھتی نظر آئی مگر یہ بھی دھوکا تھا۔ اس خبر پر جوش سے زیادہ ہری پورہ میں ہر طرف افسوس کا اظہار ہونے لگا۔ ان صوبوں کے وزراء

جب ہری پورہ پہنچے تو یہ کہنے والے کم تھے۔ کہ شاباش تم نے پھر مورچہ جما دیا۔ اور یہ کہنے والے بےشمار تھے کہ "یہ کیا کیا؟ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے"۔ "کام کہیں اس طرح کیا جاتا ہے؟" وزیر غریب اپنی نجی گفتگوؤں میں سب کو یہی سمجھاتے ہوں گے۔ کہ بھائی ہم نے کچھ نہیں کیا ہم کو جو ہدایت مجلس عاملہ نے دی تھی اُس پر کاربند ہونے کے گنہگار ہیں۔ خاصے ذمہ دار حلقوں میں اس واقعہ سے یہ اثر تھا کہ انتہا پسند لوگوں نے وزراء کی جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ اور آخر کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہی کر دیا"۔ کام کہیں اس طرح چلتا ہے؟" لیکن باوجود اس کے یہ ضرور ہے کہ کانگریس کا اندرونی ڈسپلن اتنا اچھا ہے کہ سب نے سب کی بات اپنے اوپر لے لی۔ ورکنگ کمیٹی نے کہا ہم نے کہا تھا۔ گاندھی جی نے کہا ٹھیک کیا، جواہر لال نے کہا میں نے حکم دیا تھا۔ اور گووند ولبھ پنت نے کہا میں تنہا ذمہ دار ہوں میں نے اپنی ذمہ داری پر سب کچھ کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک کیا۔ بہرحال ذرا خیال کیجئے کہ کانگریس کے اس اجلاس کا مزاج وہ ہوتا جو معمولاً پچھلے اجلاس کا رہا ہے تو اس واقعہ کا نتیجہ کیا نکلتا۔ ایک دن نہ گذرنے پاتا اور تمام وزارتیں ساتوں کانگریسی صوبوں میں مستعفی تو ہو ہی جاتیں۔ پھر جو ہوتا سو ہوتا۔ اس مرتبہ خطیبوں نے بار بار کہا کہ بڑا سخت معرکہ درپیش ہے۔ برطانوی سامراج سے پھر ٹکر ہے۔ جنگ کے لئے کمر باندھو وغیرہ وغیرہ مگر نہ اس پر کوئی نعرہ ہوتا تھا نہ جے۔ اس کے لئے زیادہ تر لوگ یہی سوچتے تھے کہ کام کہیں ایسے ہوتا ہے چنانچہ یہی ہوا کہ کام کی تدبیر نکالی گئی۔ معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا اور آج یہ دونوں وزارتیں پھر اپنا کام کر رہی ہیں۔

غرض ہری پورہ کی ساری کاروائی میں معتدل مزاج کام کرنے والوں کی فتح رہی۔ اس پر انتہا پسند گروہ جس قدر خفا ہو کم ہے۔ اور وہ واقعی خفا ہے بھی۔ اسے اندیشہ ہے اور یہ اندیشہ بالکل خیالی نہیں، کہ اگر کام سے بھی دلچسپی رہی تو موجودہ دستور کی گتھیوں میں قومی تحریک الجھ کر رہ جائے گی۔ اور 'بنیادی' تعمیر نو کا کام شروع ہی نہ ہو سکے گا۔ ان کے اس خیال میں شخصی شبہ کی آمیزش بھی ہے۔ مگر سیاسی تحریکوں کے نشیب و فراز سے واقفیت بھی اس اندیشہ میں شامل ہے۔ دوسری طرف اعتدال پسندوں پر نظر ڈالیئے تو وہ تن آسان اور آرام دوست اعتدال پسند نہیں۔ جن سے کانگریس

کی پچھلی تاریخ ناآشنا نہیں۔ بلکہ سب کے سب آزمودہ کار سپاہی ہیں۔ ہر طرح کی تکلیفیں جھیل چکے ہیں۔ اور اس کے بظاہر کوئی آثار نہیں کہ آئندہ تکلیفوں سے جی چراتے ہیں۔ ہاں وہ واقعی سمجھتے ہیں کہ کچھ مفید کام کرنے کا موقع ہے۔ قومی تحریک کی بنیادیں مضبوط کرنے کا وقت ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے۔ سب سے زیادہ گاندھی جی کی شخصیت سے اس جماعت کی ساکھ قائم ہے۔ اس لیئے کہ اگر ایک طرف گاندھی جی کا بالطبع اعتدال پسند ہونا مسلم ہے تو دوسری طرف اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی بڑا سے بڑا انتہا پسند اپنے خواب کی تعبیر کے لیئے اس معتدل مزاج "رجعت پسند" سے زیادہ عملی کام نہیں کر سکا ہے۔

اس مرتبہ کانگریس میں یہ سوال بھی ہر زبان پر تھا کہ "گاندھی جی کے بعد کیا ہوگا۔ ان کو انتہا پسند بُرا بھلا کہہ لیتے ہیں مگر جانتے ہیں کہ ان کے بغیر گاڑی آگے نہیں چلتی اس لیئے ان کی مان لیتے ہیں۔ مگر ان کے بعد اس سوال کا بھی کچھ کچھ جواب پچھلی کانگریس میں ملتا ہے۔ جواہر لال نہرو جنھیں عام طور انتہا پسندوں کا سالارِ کارواں سمجھا جاتا ہے تقریباً ہر معاملہ میں اعتدال پسندوں کے ساتھ رہے عجب نہیں کہ یہ کانگریس کے دونوں گروہوں میں مفاہمت کا وہ کام کامیابی سے انجام دے سکیں جو اب تک گاندھی جی کو کرنا پڑا ہے۔

(ر۔ ر)

ممالکِ غیر

فرانس۔ وسط جنوری میں موسیو شوتان کی وزارت نے، جو پچھلے سال جون میں قائم ہوئی تھی، استعفا دیدیا، اور پانچ دن کی گفت وشنید کے بعد موسیو شوتان ہی نے ایک نئی وزارت بنائی، فرانسیسی دارالعوام میں کسی ایک پارٹی کی تعداد اتنی نہیں ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک حکومت کر سکے اور وہاں کی سیاسی زندگی میں وزارتوں کا بننا اور ٹوٹنا وہی حیثیت رکھتا ہے جو تاش کے کھیل میں ایک بازی کا ختم اور دوسری کا شروع ہونا۔ لیکن اسوقت فاشزم اور جمہوریت کے مقابلے نے فرانسیسی وزارتوں کے معاملات اور مدبروں اور پارٹیوں کے داؤں پیچ کو ایک خاص اہمیت دیدی ہے۔ حکومت پر قدامت پسند فرقے قابض ہو جائیں تو فاشسٹ انقلاب ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں اور انتہا پسندوں کو موقع ملا تو وہ روس کی تقلید کئے بغیر نہ مانیں گے۔

فرانس کی اندرونی سیاست نٹوں کے تماشے سے بہت ملتی ہے۔ قومی بینک، سنیٹ اور دارالعوام تین کھمبے ہیں ہر وزارت کی پالیسی ایک تجویز ہوتی ہے کہ اس اس طرح سے رسے باندھے جائیں تو بہت مضبوط رہیں گے اور پھر ہر وزارت ان پر نٹوں کی طرح اپنے کرتب دکھاتی ہے۔ پبلک تماشا دیکھتی ہے اور شور مچاتی ہے۔ مگر جب کسی طرف لوگ اپنے پاس والے کھمبے کو ذرا جھکتے یا ہلتے دیکھتے ہیں تو وہ جھٹ سے رسا ڈھیلا کر دیتے ہیں اور وزیر قلابازیاں کھاتے دھڑام دھڑام زمین پر آ گرتے ہیں۔

فرانس کا قومی بینک سرمایہ داروں کا مورچہ ہے۔ سنیٹ قدامت پسندوں کا اور ایوان عام مدبروں کا۔ وزیر ایوان عام کے ارکین ہی ہوتے ہیں اور میزانیہ بھی وہی تیار کرتے ہیں لیکن سنیٹ

کی مخالفت بڑی رکاوٹ ہوسکتی ہے اور قومی بینک کے ڈائرکٹر جب چاہیں ذرا سے اشارے پر وزارت کے گھروندے کو توڑ سکتے ہیں۔ قوم اخبار پڑھتی ہے۔ ووٹ دیتی ہے۔ مگر چونکہ اس کا سرمایہ قومی بینک کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے بینک کے ڈائرکٹروں اور بڑے حصہ داروں کے مقابلے میں وہ کسی کی خطابت اور قابلیت کو نہیں مانتی۔ پچھلے سال جون میں موسیو بلوم کی وزارت قومی بینک کی ٹکر سے ٹوٹی۔ اس لئے کہ فرینک کی قیمت مقرر کرنے کے جو اختیارات موسیو بلوم چاہتے تھے وہ قومی بینک انھیں دینے پر تیار نہ تھی۔ اور موسیو شوتان کی وزارت میں جو کایا پلٹ ہوئی وہ بھی اسی بینک اور ان سرمایہ داروں کا کرشمہ ہے جو بینک پر حاوی ہیں۔ اب تک قومی بینک صرف یہ طے کرتا تھا کہ عام خوشحالی اور مدبروں کی کامیابی کا وہ اپنی پالیسی میں کہاں تک لحاظ رکھ سکتا ہے۔ اب اس کے فیصلوں پر جمہوریت کی بقا کا دارومدار ہے۔ وہ مان جائے تو فرانس اشتراکی ہوسکتا ہے، اور زور لگائے تو فاشسٹ ہوجائے گا۔

جمہوریت کی جان بچانے کے لئے اشتراکی اور اشتراکیت کی طرف مائل پارٹیوں نے "قومی محاذ" کے نام سے اشتراک عمل کا ارادہ کیا۔ اور موسیو بلوم کی وزارت اسی کی کارپردازی کا پہلا نمونہ تھی۔ لیکن قومی بینک کو سیاسی مصلحتوں اور حوصلوں سے کوئی مطلب نہیں۔ "قومی محاذ" کو وہ اپنے خالص معاشی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اگر قومی سرمائے کو محفوظ رکھنے میں "قومی محاذ" کے ٹوٹ جانے اور فاشسٹ حکومت قائم ہونے کا اندیشہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اشتراکیوں کو سرمائے پر اختیار نہیں دیا جاسکتا اس لئے موسیو بلوم کو حکومت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اب بڑے سرمایہ داروں نے دیکھا کہ شوتان وزارت میں چند لوگ ایسے ہیں جنھیں الگ کردیا جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ موسیو شوتان نے قلابازی کھائی اور اب نیا تماشا شروع کرنے پر تیار ہوئے ہیں۔

وزارت کی یہ کایا پلٹ ایوان عام کی ایک دلچسپ واردات بھی ہے۔ اس وقت ایوان میں بائیں طرف سے شمار کیجئے تو ۷۲ کمیونسٹ، ۱۴۶ سوشلسٹ، ۱۱۱ ریڈیکل سوشلسٹ (جو دراصل ریڈیکل یعنی انتہا پسند نہیں بلکہ محتاط یعنی ڈرپوک سوشلسٹ ہیں)، ۹۵ وسطی (یعنی بیچ میں بیٹھنے اور دائیں بائیں

دونوں طرف جھکنے اور جھانکنے والے) اور ۱۲۷ دائیں جانب کے، یعنی شاہی پرست سے لے کر ہر قسم کے قدامت پسند ہیں۔ موسیو بلوم کی وزارت کا دار و مدار کومیونسٹ، سوشلسٹ اور بعض ریڈیکل سوشلسٹ نائبوں پر تھا۔ شوتان کی مرحوم وزارت میں گیارہ سوشلسٹ تھے۔ نئی وزارت میں دو وزیر دائیں طرف کے ہیں۔ باقی سب ریڈیکل ہیں۔ سوشلسٹوں نے موسیو شوتاں سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں کام چلانے کا موقع دیں گے۔ کومیونسٹوں نے کہا ہے کہ ہم ابھی کوئی وعدہ نہیں کرتے۔ جیسا موقع ہوگا ویسا رویہ اختیار کریں گے۔ یہ وزارت اقلیت کی ہے اور قائم اس لئے ہوسکی کہ اس کے سوا "قومی محاذ" کا نام باقی رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

موسیو شوتان کی پچھلی وزارت ٹوٹی اس سبب سے کہ ان کی کومیونسٹوں سے لڑائی ہو گئی تھی۔ ۲۹ر دسمبر کو، خاص اس وقت جب وزارت اس کوشش میں لگی تھی کہ مزدوروں اور کارخانہ داروں میں مصالحت ہو جائے۔ پیرس میں ہڑتال کرا دی گئی۔ اس کی ذمہ داری سراسر کومیونسٹوں پر آتی ہے اور موسیو شوتاں کے ساتھ سوشلسٹ نائبوں نے بھی کہا کہ جھگڑے کے لئے موقع اور طریقہ دونوں بہت نامناسب ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی کھلی ہوئی تھی کہ بڑے سرمایہ دار مصالحت کے لئے تیار نہیں تھے، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ موسیو بلوم کے بنائے ہوئے قانون پر جس کے مطابق ہر جھگڑے میں مزدور اور سرمایہ دار فوراً معاملے کو پنچوں کے سپرد کرنے پر مجبور تھے۔ عملدرآمد ہو اور موسیو شوتان کی جو تجویز تھی کہ ایک طرف سرمایہ داروں کو قانون کی پیروی پر مجبور کیا جائے اور دوسری طرف مزدوروں کو اشتعال انگیزوں سے بچانے کی کوشش کی جائے وہ بھی انھیں منظور نہ تھی۔ کومیونسٹوں کے جو مطالبے تھے ان پر بھی وزارت کوئی توجہ نہیں کر رہی تھی۔ اور صنعت اور تجارت کو فروغ دے کر عام حالت درست کرنے اور فرنیک کا نرخ قائم کرکے موجودہ گرانی کو دور کرنے کی جو تدبیریں اس نے سوچی تھیں۔ ان میں اصلاحوں کا ذکر بھی نہ تھا جنھیں کومیونسٹ اصولاً لازمی یا عملاً مفید سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہڑتالیوں کو اکساتے رہے۔ ہڑتالوں کی ایک وبا سی پھیل گئی۔ اور فرنیک کی قیمت کچھ گر گئی۔ موسیو شوتان نے یہ دیکھکر اپنے دل میں طے کر لیا کہ کومیونسٹ محض اپنی غرض

سے ان کی وزارت کی حمایت کرتے ہیں، اور اس طرح کا احسان لینا انھیں گوارا نہ ہوا۔ انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ وہ ایسی وزارت نہیں چاہتے جو سوشلسٹ حضرات کے کرم پر گذر کرتی ہو، اور ان کی وزارت کے سوشلسٹ اراکین نے استعفا دیدیا یعنی وزارت ٹوٹ گئی، یا یوں کہئے کہ دوسرا جنم لینے کی خاطر موسیو شوتان نے خودکشی کرلی۔

سرمایہ دار اور بہت سے قدامت پسند چاہتے بھی تھے کہ وہ اس طرح خودکشی کریں، اور ان کی خواہش کا یہی ایک سبب نہیں تھا کہ حکومت مزدوروں کو ان کا حق دینا چاہتی تھی۔ پچھلے سال فرانس میں دو اطالوی قتل ہوئے، اور یہ جرم سیاسی معلوم ہوتا تھا۔ پھر ستمبر میں ایک بڑے دفتر میں بم پھٹنے کی واردات بھی ہوئی، شوتان کے سابق وزیر داخلہ، موسیو دوموآ نے تحقیقات شروع کرائی، اور ایسی مستعدی سے کہ کئی جگہ مختلف قسم کے سامان جنگ کے گودام ڈھونڈ نکالے۔ اور سراغ رسانی نے معاملے کو فرانس کے باہر اٹلی کی خفیہ وحشت انگیز فاشسٹ جماعتوں تک پہنچادیا۔ یہی زمانہ نیون کانفرنس کا تھا۔ جب شوتان وزارت ہسپانیہ کے معاملے میں ذرا سختی کرنے یعنی باغیوں کی علانیہ مخالفت کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، بڑے سرمایہ دار، جو سوشلسٹ جماعت کے اثر کو بڑھنے نہیں دینا چاہتے، اور اکثر قدامت پسند جنھیں فاشزم، پرولتاری حکومت سے زیادہ قابل برداشت معلوم ہوتی ہے۔ سمجھ گئے کہ اگر ذرا اور ڈھیل دی گئی تو بڑا نقصان ہوجائیگا فرنیک ذرا سا گرادینا اور رہل چل میں وزارت کا تختہ پلٹ دینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

جرمنی جرمنی کی داخلی سیاست کا رنگ دو واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جن کا بھید ابھی تک پورا پورا کھلا نہیں ہے۔ ان میں سے ایک تو وزیر مال اور سرکاری بینک کے صدر ڈاکٹر شاخت کا استعفیٰ ہے جو انھوں نے پچھلے نومبر میں داخل کیا اور دوسرا موقعہ جنرل بلومبرگ کی معزولی اور ہٹلر کا محکمہ فوج کو براہ راست اپنے ماتحت کرلینا ہے۔ ڈاکٹر شاخت نے اتنی مدت سے جرمنی کی مالیات کو سنبھالے رکھا ہے اور ایسی قابلیت کے آدمی ہیں کہ ان کی علیحدگی سے یقیناً جرمنی کی تجارت کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن نازی لیڈر اس نقصان سے ڈرنے کی جگہ اس بات پر خوش ہیں کہ اب ملک کی معاشی پالیسی بالکل ان

کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ بڑے سرمایہ دار اس پر کہاں تک مطمئن یا خفا ہیں۔ اس کا اندازہ ابھی نہیں کیا جا سکتا یہ تو آہستہ آہستہ ظاہر ہوگا۔ مالیات کی طرح فوج پر نازیوں کا پورا قبضہ ہو گیا ہے۔ اور اس معاملے میں فوج کی رائے معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ نازی حکومت نے پروپگنڈا اور سنسرشپ کا ایسا مکمل انتظام کیا ہے کہ مخالفت کا پتہ نہیں اسی طرح چلے گا۔ جیسے شب برات کا آتشبازی سے۔

معاشی پالیسی میں دو رائیں تھیں۔ ایک ڈاکٹر شاخت کی تھی کہ صنعت کو جہاں تک ہو سکے سہارا دیا جائے اور موجودہ صورت حال میں بیرونی تجارت کو بڑھانے کی جو تدبیریں بھی ہو سکیں اختیار کیجائیں لیکن کاروبار اپنی اور برائی ضرورت کو سمجھنے اور کمی کو پورا کرنے سے بڑھتا ہے، اور نازی فلسفہ سیاست میں اصل چیز یہ ہے کہ قوم اپنی تمام ضروریات پوری کر سکے، اور ایسے خام مال کے لئے کسی دوسرے کے دست نگر نہ ہو۔ جس کے بغیر لڑائی جاری نہیں رکھی جا سکتی۔ نازی مدبر ڈاکٹر شاخت کے مقابلے میں دوسری رائے پر عمل کر رہے ہیں۔ جو چار سال کے منصوبے کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کی جنگی تنظیم مکمل کی جائے، اور ترقی میں جو رکاوٹیں کمزوری اور صلح پسندی نے ڈالی ہیں وہ دور کی جائیں۔ اس تنظیم نے ایک سامان جنگ، جہاز، ہوائی جہاز، آب دوز، سڑکیں اور فوج کے متعلق اور تمام چیزیں تیار کرنے میں اتنا سرمایہ لگایا ہے کہ کاروباری زندگی میں چہل پہل نظر آنے لگی ہے لیکن اس تنظیم سے اصل دولت میں اضافہ نہیں ہوتا، جرمنی میں اسوقت خاصی گرانی ہے اس لئے کہ باہر سے اناج وغیرہ جیسی ضرورت کی چیزیں کم آتی ہیں اور حکومت کا قرضہ برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ابھی تک نازی پروپگنڈا لوگوں سے کہلوا رہا ہے کہ "ہمیں توپیں چاہئیں، مکھن نہیں چاہیئے"۔ اور جب مکھن کے خیال سے لوگوں کے منہ میں پانی آنے لگتا ہے تو پروپگنڈا ذرا شدید کر دیا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس طرح کب تک کام چل سکے گا۔

محکمۂ فوج میں جو انقلاب ہوا ہے۔ اس کا ملک کے مستقبل پر شاید اتنا اثر نہ ہو جتنا کہ نازیوں کی معاشی پالیسی کا۔ ایک زمانہ تھا جب فوج خاص قیصر کے ماتحت تھی اور جرمن چانسلر کو بھی اس کے معاملات میں دخل دینے کی مجال نہ تھی۔ جنگ کے بعد جو انقلاب ہوا اس نے فوج کی

سیاسی حیثیت بہت گھٹا دی اور صلحنامہ ورسائی نے اس کی تعداد اتنی کم کردی کہ وہ بڑا مرتبہ رکھنے کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اندرونی سیاست میں پھر بھی کسی پارٹی کے لئے فوج کو اپنے ساتھ ملا لینا بڑی کامیابی تھی۔ اور فوج کی مخالفت یعنی ان عہدہ داروں کی جو فوج میں ہر دلعزیز سمجھے جاتے تھے۔ ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے فوجی خدمت جبری کردی، اور اب فوج بھی اس حد تک ان تحریکوں کے اثر میں آگئی ہے جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اسے اپنی الگ رائے رکھنے والی جماعت سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ اصل میں ہٹلر نے اپنے لئے اسی وقت میدان صاف کرلیا تھا جب ۱۹۳۴ء میں فون شلائشر قتل ہوا۔ ہٹلر کے سپہ سالار بن جانے اور ایک کمیٹی کے ذریعے سے فوج کا انتظام کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اختلاف رائے کی جو ذراسی گنجائش تھی وہ بھی اب نہ رہی ہے،

جرمنی۔ آسٹریا اور اٹلی جب سے روم برلن اور لندن پیرس سیاست کے دو محور بنے ہیں۔ ہر فریق اس کوشش میں لگ رہا ہے کہ اپنی رفتار کی تعداد اور اپنی کفالتی معاشی خودمختاری کا حلقہ بڑھائے، اٹلی کو حبش کی جنگ کے دوران میں بندشوں کا جو تجربہ ہوا اسکے بعد سے اس نے جنوب مشرقی یورپ میں اپنی پالیسی بدل دی اور پرانی عداوتوں کو مٹا کر اب یوگوسلاویا سے صلح کرلی ہے کہ جنگ کے وقت دشمن پشت پر حملہ نہ کرسکیں۔ اور خام مال اور خصوصاً اناج کی کمی اٹلی کو بے دست وپا نہ کردے۔ یوگوسلاویا سے اس طرح کی مفاہمت ممکن نہ تھی۔ جب تک کہ جرمنی کو اس کے معاوضے میں کچھ دے کر راضی نہ کیا جائے۔ کیونکہ جرمنی کو وہی ضرورتیں جو اٹلی کی ہیں، جنوب مشرقی یورپ کی سیاست میں الجھائے رہتی ہیں۔ اور جرمنی نے حبش اور ہسپانیہ کی جنگ میں اٹلی کا ہمدرد اور حامی بن کر معاوضہ وصول کرنے کا حق بھی حاصل کرلیا تھا۔ اسی سبب سے اٹلی نے جرمنی کو اختیار دے دیا ہے کہ آسٹریا کی سیاست کو اپنے اثر میں لائے۔

ہٹلر اور آسٹریا کے چانسلر ڈاکٹر شُشنگ کی حال میں جو ملاقات ہوئی اس میں مسولینی کا ہاتھ تھا، اور صرف اسی قدر نہیں کہ اس نے ٹیلیفون کے ذریعے سے ملاقات طے کرائی پچھلے سال اپریل میں ڈاکٹر شُشنگ نے یہ دیکھ کر کہ ہٹلر کو بہت ڈھیل دی جارہی ہے مسولینی سے ملاقات کرکے

اسے اپنی پالیسی کا حامی بنانے کی کوشش کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ آسٹریا کو ایک طرف نازیوں اور دوسری طرف ان فرقوں سے بچایا جائے جو ہاپسبرگ خاندان کی حکومت دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس ملاقات اور گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور اس وقت ہٹلر سے جو ملاقات ہوئی اس میں جرمن فوج اور ان مسلح سپاہیوں کا جو کہا جاتا ہے ڈاکٹر شُشنگ کو گھیرے کھڑے تھے جتنا دباؤ پڑا اتنا ہی اثر مسولینی کی سرد مہری کا تھا۔

مضمون لکھنے کے وقت تک ان مطالبات کی تفصیل معلوم نہیں ہوئی جو ہٹلر نے منظور کرائے ہیں، لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آسٹریا کی حکومت پر نازیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور وہ موقع کو دیکھ کر جرمنی اور آسٹریا کو ایک قوم، ایک ملک، اور ایک مورچہ، بنانے کی تمام تدبیریں کرینگے، اس کا یورپ کی سیاست پر کیا اثر پڑے گا؟ انگلستان اور فرانس یہ کہیں گے کہ معاہدوں اور خصوصاً سٹریزا میں ۱۹۳۴ء میں جو محاذ بنا تھا اس کے رو سے وہ آسٹریا کا الگ وجود قائم رکھنے کا وعدہ کر چکے ہیں اور اب تک جو کچھ حال کھلا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ یہی رویہ اختیار کریں گے لیکن جرمنی اور آسٹریا کے مل جانے سے ان کا کوئی فوری نقصان نہیں جو انھیں اس پر آمادہ کرے کہ بات کو لڑائی تک پہنچائیں۔ جرمنی کی اس چال سے چکوسلواکیا بے شک گھر جاتا ہے، اور اس سے بھی انگلستان اور فرانس کا پرانا عہد و پیمان ہے۔ لیکن چکوسلواکیا رہا تو کیا فائدہ اور نہ رہا تو کیا نقصان؟ جمہوری حکومت، آزادی، خود مختاری، یہ جمہوریت کے جلوس میں نکالنے کے لئے بڑے شاندار جھنڈے ہیں لیکن لڑائی اور پروپگینڈا میں بڑا فرق ہے خصوصاً جب لڑائی صرف کسی دوسرے کی خاطر ہو۔ برطانوی اور فرانسیسی مدبر جہاں یہ سوچیں گے کہ چکوسلواکیا اور آسٹریا کے جرمنی میں فنا ہو جانے سے ان کی ناک کٹے گی۔ وہاں وہ یہ بھی سوچیں گے کہ جرمنی سے لڑائی مول لی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اور جرمنی کے حوصلے ادھر پورے ہوئے تو عالم گیر جنگ بیس پچیس برس کے لئے ٹل سکتی ہے یا نہیں۔

بہرحال لیگ پر کمزوروں کو اعتبار نہیں رہا ہے۔ وسطا اور جنوب مشرقی یورپ کی ریاستیں

اس پر بھروسا کرنے کی جگہ اپنے درمیان اتحاد اور اشتراک عمل کی تدبیریں سوچنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ اگر ان تمام ریاستوں میں ایک نازی پارٹی نہ ہوتی اور جرمنی یا اٹلی کی سرپرستی اسے ریاست کے اندر ریاست اور قوم کے اندر قوم نہ بنا دیتی تو امن اور ترقی کی یہ صورت لیگ جیسے ڈھونگ سے بہتر ہی ہوتی لیکن حال یہ ہے کہ سیاست اور معیشت میں جو قدم وہ رکھتی ہیں وہ فاشسٹ سیاست کے جال میں پڑتا ہے اور ہر قدم ان کے پاؤں کے لئے ایک نئی زنجیر بن جاتا ہے۔ ان ریاستوں کی آزادی اور خود مختاری کا اگر اب کوئی سہارا رہ گیا ہے تو جرمنی اور اٹلی کی رقابت ہے۔ ان کے بچنے کی امید انھیں کی کھٹ پٹ میں ہے۔

جرمنی اور اٹلی کی سیاست کا برطانیہ پر یہ اثر ہوا ہے کہ مسٹر ایڈن کو استعفیٰ دینا پڑا۔ اب ہم دیکھیں گے کہ برطانیہ لیگ اور بین الاقوامی قانون جمہوریت اور اخلاق کا پردہ پھاڑ کر انگریزی سیاست بے حجاب ہو جائے گی۔ اور فاشسٹ ریاستوں کے ساتھ مل کر اپنی حفاظت اور ترقی کی تدبیریں کرے گی۔ جب عدالت اور قید خانہ کا ڈر نہ ہو تو مجرم ہونا تھانے دار ہونے سے واقعی بہتر ہے۔

لیگ کا سرپرست اور بین الاقوامی معاہدوں اور اخلاقی اصولوں کا محافظ ہونے۔ یا یوں کہئے سمجھے جانے۔ کے سبب سے حبش کے معاملے میں انگلستان بہت نقصان میں رہا۔ اور اگرچہ چین کے مسئلے میں ویسی غلطیاں نہیں کی گئیں۔ لیکن وہاں جاپان کی بے باکی اور ادھر بحر روم میں اٹلی کے تیغ جھاڑ کر پیچھے پڑ جانے سے برطانوی تجارت اور سرمایہ کو خاصا صدمہ پہنچا۔ اب جو ظاہر ہو گیا ہے کہ اٹلی اور جرمنی مل کر ایک دوسرے کے فائدے کی صورتیں نکال رہے ہیں، اور انھیں زیادہ کامیابی ہوئی تو ان کا اتحاد بہت پختہ ہو جائیگا۔ تو برطانوی مدبروں نے اپنا رویہ بدلنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ پچھلے سال ہمارے سابق وائسرائے لارڈ ہیلیفکس، جن کا معمولاً اللہ والوں میں شمار ہوتا ہے۔ جرمنی بھیجے گئے تھے کہ لین دین کی بنا پر کوئی سمجھوتا ہو سکے تو کریں اور جرمنی اور اٹلی کی دوستی میں رخنہ ڈالیں۔ اس کی کوئی صورت نہ نکلی۔ اور ادھر اٹلی ہر معاملے پر گفتگو کرنے پر تیار تھا۔ اس لئے کہ اس کی دھونس آگے نہیں چلتی اور برطانیہ نے آبرو کی خاطر اور زیادہ نقصان اٹھانا نہیں چاہا۔ مسولینی کا مطالبہ تھا کہ ایڈن کو درمیان سے ہٹاؤ تو بات چیت شروع ہو۔

اور اب کئی مہینے بچکچانے اور بغلیں جھانکنے کے بعد وزیر اعظم کو اس کا موقع ملا ہے کہ مسٹر اِیڈن کا استعفیٰ منظور کریں اور برطانیہ کے خلوص کا ثبوت دیں۔

برطانیہ اور اٹلی کے درمیان کئی جھگڑے ہیں جنھیں چکانے سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔ برطانیہ اٹلی کا حبش پر قبضہ تسلیم کرے گا۔ اٹلی انگریزوں کو اس کا موقع دے گا کہ حبش میں اپنا سرمایہ لگائیں۔ ریڈیو پر اٹلی جو پروپگینڈا برطانیہ کے خلاف مشرق قریب کے ملکوں میں کر رہا ہے وہ بند ہو جائے گا۔ انگریز نہر سوئیز کو اٹلی والوں کے لئے محفوظ کر دیں گے۔ اور اٹلی والوں کو اطمینان ہو جائے گا کہ مالٹا میں انگریزوں کی بحری اور ہوائی قوت کا کوئی بڑا مرکز نہ بنے گا۔ اسی طرح ہسپانیہ میں دونوں فرینکو سے سمجھوتا کریں گے جنوبی ہسپانیہ کے جزیرے اطالوی قبضے میں نہ آئیں گے اور ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کی تجارت انگریزوں کے ہاتھ سے نہ جائے گی۔

اٹلی اور انگلستان کے درمیان سمجھوتا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ چکوسلوواکیا، پولینڈ اور روس کی سرحد کو محفوظ رکھنے کا ذمہ انگلستان کے سر سے ہٹا۔ اور اسے اس طرح فاشسٹ قوتوں سے ملتے ہوئے دیکھ کر ناممکن ہے کہ فرانس بھی ایسا ہی رنگ اختیار نہ کرے۔ اب فرانس اور بلجیم کا سہارا ہٹلر کے وعدے اور جرمنی کی دوستی ہوگی۔ باقی ملکوں کا اللہ مالک ہے۔

یورپ کے دو محاذ

روم برلن محاذ

غیر معین مگر روم برلن محاذ کی طرف مائل

لندن پیرس محاذ

غیر معین مگر لندن پیرس محاذ کی طرف مائل

غیر جانب دار

ناروے
سویڈن
فن لینڈ
اسٹونیا
لٹویا
لتھوانیا
ڈنمارک
آئرلینڈ
برطانیہ عظمیٰ
ہالینڈ
جرمنی
پولینڈ
روس
فرانس
زیکو سلاویکیہ
آسٹریا
ہنگری
رومانیہ
سوئٹزرلینڈ
اٹلی
یوگوسلاویہ
بحر اسود
بلغاریہ
البانیہ
ترکی
پرتگال
اسپین

تعلیمی دُنیا

واردھا تعلیمی رپورٹ پر تبصرے

ایجوکیشنل انڈیا۔ مسولی پٹم ۔ اس رپورٹ نے ان بنیادی اصلاحات اور تبدیلیوں کو جو تعلیمی نظام کی بہتری کے لئے ضروری ہیں۔ بے حد مفید اور مدلل طریق سے واضح کر دیا ہے ۔کمیٹی ان افراد پر مشتمل تھی جو اپنے علمی رتبے اور علمی تجربے کے لحاظ سے اس موضوع پر ایک ماہر کی حیثیت سے رائے دے سکتے ہیں ۔خوش قسمتی سے کمیٹی کو صدر ایسا ماہر تعلیم ملا جو ہر لحاظ سے اس معزز جگہ کو پُر کرنے کے قابل تھا۔ رپورٹ اپنا خرچ آپ اٹھانے والی تعلیمی تجویز کی بہترین ماہرانہ علمی تفسیر ہے۔ رپورٹ نے ایک قیمتی خدمت یہ انجام دی ہے کہ اس سے بنیادی اور اہم عنصر کی غیر ضروری اور فروعی چیزوں سے تمیز ہوگئی ۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ رپورٹ تمام صوبوں میں نئے تعلیمی ڈھانچے کو تیار کرنے کے لئے علمی بنیاد کا کام دے گی ۔ رپورٹ کے مرکزی اصول حقیقت اور بصیرت پر مبنی ہیں اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کانگریسی کیا تمام صوبوں بلکہ ہندوستانی ریاستوں میں بھی اس رپورٹ کا تعلیمی نظریوں اور عمل پر گہرا اثر پڑے گا ۔

آخر میں ایڈیٹر نے قارئین سے درخواست کی ہے کہ وہ رپورٹ کا بہ نظر غور مطالعہ کریں اور اس کی حمایت میں حتی الوسع تبلیغ اور پرچار کریں تاکہ اس تجویز پر جلد سے جلد عملدرآمد ہو جائے ۔

ہندو مدراس میں ایک استاد کی قلم سے ۔ وردھا تعلیمی رپورٹ کے شائع ہونے سے ہمارے ملک کی تعلیمی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا ہے ۔ ذاکر حسین رپورٹ قومی ترقی کی شاہراہ پر وہ خطرے کا نشان ہے جو موجودہ ضرر رساں تعلیم کی حدبندی کرتا ہے ۔ اور ایک حد تک اپنا

خرچ آپ برداشت کرنے والی تجویز کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ جسکی بنیاد پیداواری اصول پر قائم ہے اور جس کا مطمع نظر بچے کی مکمل ہستی یعنی اس کے جسم اور ذہن دونوں کی تربیت ہے۔ اپنے مقاصد اور طریق عمل کے لحاظ سے رپورٹ ہندوستانی تعلیم کے احیار کی علمبردار ہے۔

ریکٹر لارن زلیاکس - ملک کی ابتدائی تعلیم کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے زبردست جہاد کی ضرورت ہے اور میرے خیال میں وردھا اسکیم اس مقصد کے لئے ایک مجاہدانہ اور قابل تعریف اقدام ہے۔ یہ تجویز ایک ایسی ہستی کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ جس میں ایسے مجاہدانہ ارادوں کو عملی شکل میں لانے کا جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

ڈاکٹر ٹیگور - حال میں مہاتما گاندھی نے اپنی توجہ تعلیم عامہ کے مسئلہ پر مرکوز کردی ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اس سے مستقبل قریب میں ہی شاندار نتائج پیدا ہوں گے۔ دنیا میں کوئی فرد غریبوں کے بچوں سے مہاتماجی سے زیادہ محبت نہیں کرتا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ جب اس تجویز پر عمل شروع ہو جائے گا تو ہمیں اس عملی بزرگ کی قابلیت کا جنکا عمل قول سے ہمیشہ بڑھ کر رہتا ہے، ایک نیا ثبوت ملیگا۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک سب کمیٹی متعین کی ہے جو واردھا رپورٹ پر غور وخوص کرنے کے بعد اپنی رائے کانفرنس کے سامنے پیش کرے گی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اس کمیٹی میں شمولیت کے لئے دعوت دی گئی ہے۔

مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ نے پچھلے اجلاس میں وردھا رپورٹ پر بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ تعلیمی ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ جو اس کا ملک کی تعلیمی ضرورت کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے۔ کمیٹی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ڈاکٹر ضیارالدین صاحب بھی شامل ہیں۔

حکومت بہار کی طرف سے ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور خواجہ غلام السیدین صاحب شامل ہیں کمیٹی کا اہم مقصد ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان کے مسئلہ پر غور وفکر کرنا اور اس کے متعلق مناسب

تجاویز پیش کرتا ہیں۔

اسپین کی تعلیمی فوج۔ بہت سے لوگوں کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ ہسپانیہ کے میدان کارزار میں خندقوں کے اندر بھی تعلیم اور تعلّم کا کام جاری ہے۔ اس کا آغاز بعض لکھے پڑھے سپاہیوں نے کیا۔ جنھوں نے اپنے ناخواندہ بھائیوں کو اخبارات کے ذریعہ سے تعلیم دینا شروع کی۔ اسکے بعد کمسٹریٹ کے محکمے نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اور بھی ترقی دی۔ پھر ہسپانیہ کی تعلیمی فیڈریشن نے محاذ جنگ پر ۲۵۰ مدرسے کھول دیئے۔ بالآخر اس کی پوری ذمہ داری وزارت معارف نے اپنے سر لے لی۔ آج ملیشیا (Militia) کی ایک خاص فوج منظم ہوچکی ہے۔ جس میں نوسو ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ قانون۔ تجارتی و صنعتی مضامین کے سند یافتہ اور ماہرین شامل ہیں۔ ان کی کوششوں سے بے پڑھوں کی تعداد میں معتدبہ کمی واقع ہوگئی ہے۔

حیدرآباد میں شفٹ (Shift) اسکول اسکیم:۔ ریاست حیدرآباد میں لازمی ابتدائی تعلیم کو جاری کرنے اور پھیلانے کی غرض سے محکمہ تعلیم نے پچھلے دو ماہ سے بعض چیدہ اضلاع کے منتخب گاؤں میں شفٹ اسکولوں کی اسکیم جاری کی ہے۔ ان مدرسوں میں کچھ تعلیم تو صبح ہوتی ہے اور کچھ شام کو۔ اور طلباء اپنی سہولت کا لحاظ کرکے ان میں سے کسی ایک وقت میں مدرسے میں حاضر ہو سکتے ہیں یہ مدرسے موجودہ ابتدائی اسکولوں کے علاوہ قائم کئے گئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ دس سال کے اندر اس قسم کے اسکول ریاست کے ہر گاؤں میں قائم ہوجائیں گے۔ ابتدائی اسکول کی مدت تعلیم بھی شاید ۴ سال سے ۶ سال کردی جائے گی۔ تاکہ بچے نئے مدرسوں کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں اب تک اس قسم کے پچاس مدرسے کھل چکے ہیں۔

راجر مارٹن دوگارڈ کے ناول "۱۹۱۴ء کی گرمیاں" (جس پر مصنف کو نوبل پرائز ملا ہے) کی ایک تقریظ کے سلسلے میں مصنف کی نجی زندگی اور نفسیاتی حالات کے متعلق عجیب انکشاف ہوا۔ خود اپنے وطن میں بھی راجر مارٹن دوگارڈ کو لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک کامیاب اور ہر دلعزیز

مصنف نہیں ہے۔ اسکی پرانی تصنیفات برابر دوبارہ چھپ رہی ہیں بعض نئی کتابوں پر بہت اچھے ریویو ہوئے ہیں اور بعضوں کے عمدہ اور قیمتی ایڈیشن بھی طبع کئے گئے۔ مگر مصنف کو شہرت اور نام و نمود سے طبعاً نفرت رہی ہے اک دفعہ اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا "ادب کے متعلق تو میری رائے یہ ہے کہ اگر طبیعت میں امنگ ہو تو انسان کچھ نہ کچھ لکھے ضرور۔ مگر خدا کے واسطے اس کے متعلق گفتگو نہ کرے"۔

اس اصول پر عمل کرتے ہوئے وہ ہمیشہ تقریر کرنے یا اخبارات میں بیان دینے سے بچتا رہا۔ نہ اس نے کبھی کسی ادبی جنگ میں حصہ لیا اور نہ ہی کسی عام جلسے میں تقریر کی۔ اپنے اس ناول کے شائع ہونے کے بعد چند ہفتے کے سوا وہ عوام کے دل سے اپنے آپ کو بھلانے اور فراموش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب سویڈن سے تار پر خبر آئی کہ دوگارد کو نوبل پرائز ملا ہے تو نیس میں اس کے مکان کو اخبار نویس اور تصویر لینے والوں نے جن میں بعض مقامی، بعض پیرس کے اور چند غیر ملکی تھے۔ نرغے میں لے لیا۔ لطف یہ کہ اس وقت مکان میں کوئی شخص بھی موجود نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ جونہی دوگارڈ کو اخباروں کے دفاتر سے (ایک گھنٹے پہلے) نوبل انعام ملنے کی خبر ملی وہ ایک سفری تھیلا لے کر چلتا ہوا اور جاتے وقت کہہ گیا کہ وہ سیر و تفریح کے لئے باہر جا رہا ہے اب اس کے بعد اس کی تلاش سارے فرانس میں شروع ہوئی۔ گاڑیوں میں جستجو کی گئی۔ ہوٹل کے رجسٹروں کی ورق گردانی ہوئی، پولیس کی تفتیش جاری ہو گئی۔ اور سرحد پر تو باقاعدہ پہرہ لگ گیا۔ پیرس میں یہ افواہ گرم ہو گئی کہ مارتن دوگارڈ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ نہ معلوم کس نے؟۔ کیونکہ اس کا تو کوئی دشمن ہی نہ تھا۔ اس دوران میں دوگارڈ پچھلی رات کو اپنے کمرے میں خاموشی سے آگیا۔ اور بعینہ ایک چور کی طرح کھڑکیاں اور روشندان بند کر کے چھپ کے بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں مبارکباد اور استفسار کی تاریں بحری پیغامات، خطوط، کتب فروشوں کی چٹھیاں میز پر اکھٹی ہوتی رہیں، دو دن تک نوبل انعام پانے والا مصنف اندر بیٹھا رہا، گوشت اور انڈے

اُڑا تا رہا) رہا اور جب کبھی اسے اپنے بند دروازے کے باہر پاؤں کی آہٹ معلوم ہوتی تھی تو تو اسکو کپکپی چڑھ جاتی تھی۔

"۱۹۱۴ء کی گرمیاں" ایک طویل ناول (تھیبالٹ) کا آخری جزو ہے جسمیں مصنف نے جنگ عظیم کے حالات ایک کہانی کی صورت میں لکھے ہیں۔ مصنف خود جنگ میں شریک تھا اور رسد رسانی کے محکمہ میں ایک ۳۶ گاڑیوں کے سکشن کا افسر تھا۔ جو الساس اور سوم کے مابین فوجی خدمت انجام دیتی تھیں۔

سویٹ روس کے اخبارات ۔ دنیامیں صرف سویٹ روس ہی ایسا ملک ہے۔ جہاں اخبار وں کی اشاعت کے اعداد وشمار، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے برابر ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں زار کے زمانے میں ۲۷ لاکھ کل اشاعت تھی۔ اب وہ چار کروڑ کی شاندار تعداد تک پہنچ چکی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سال کے دوران میں روس اس لحاظ سے دنیامیں اول نمبر حاصل کرے گا۔ روس میں اخبار نویس کا فرض ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اخبارات کا کام نئی سماج کی تشکیل میں اعانت کرنا اور بہتر شہری تیار کرنا ہے۔ بقول لینن اخباروں کا مقصد ایک بننے والی عمارت کے لئے بانس اور بلیاں فراہم کرنا ہے۔ اور یہ تعمیری کام نہ صرف یورپی آبادی کے لئے ہی ضروری ہے بلکہ ان لکھوکھا ایشائی قوموں اور انسانوں کے لئے بھی جو سویٹ روس میں شامل ہیں۔

صوبجات متوسط کی حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ جو فلموں، نقشی یا تصویری طرز تعلیم کے ذریعہ سے بچوں اور بالغوں کی تعلیم اور تربیت جسمانی کے انتظام کے امکانات اور اہمیت پر تحقیقات کرے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں یہ کمیٹی ایک مبسوط اسکیم تیار کرے گی اور اس مقصد کے لئے طریق کار اور ذرائع واضح کرے گی۔ مغربی ممالک فلم۔ ریڈیو وغیرہ جیسے عجیب ذرائع تعلیم کے لئے بے حد مفید اور معاون ثابت ہوئے ہیں۔ نفسیاتی لحاظ سے فلم ریڈیو سے زیادہ مؤثر اور جاذب توجہ ہے، بچے بالعموم یا تو سماعی حافظہ رکھتے ہیں یا عینی، ریڈیو میں صرف سماعی

تصور ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے! اور فلم میں دونوں نیز بعض مضامین ہیں مثلاً سائنس بالخصوص علم الاجسام (فزیالوجی)
جغرافیہ۔ تاریخ وغیرہ میں تو فلم تعلیم کا نہایت ضروری جزو ہے۔ بعض صوبوں میں مرکزی ٹکسٹ بک کمیٹیاں ایک مشین
چند فلمیں اور ایک ملازم صدر مقام پر رکھتی ہیں، اور جگہ جگہ اسکولوں میں دورہ کر کے یہ فلمیں دکھائی جاتی ہیں
ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک مرکز کے بجائے ہر ضلع بلکہ ہر تحصیل میں ایسے مرکز قائم کر دیے جائیں۔ اور
بڑے اداروں کو ترغیب نیز مالی امداد بھی دی جائے تاکہ وہ خود اپنے استعمال کے لئے ایک مشین رکھ سکیں
فلموں کی بہم رسانی کا کام محکمہ تعلیم اپنے ذمہ لے۔ اور مناسب قسم کی فلمیں مدرسوں میں تقسیم کرنے کا کام کرے
اس کے ساتھ ساتھ اس اخلاقی تخریب کا بھی انسداد ہونا چاہیئے جسکا عام بازاری فلمیں دیکھ کر بچوں میں پیدا
ہونے کا امکان ہے، ہمارے ہاں بورڈ آف سنسر سیاسی رنگ کی فلموں پر تو کمال احتیاط کرتے ہیں۔ مگر
ان فلموں کے خلاف جو بچوں کے سامنے بدترین قسم کے نفسانی جذبات کا مظاہرہ کرتی ہیں کوئی پابندی
عاید نہیں کرتے۔ متمدن ملکوں میں ہر فلم یا تو "یو" یعنی یونیورسل فہرست میں ہوتی ہے جسے سب دیکھ سکتے ہیں
یا "اے" یعنی محض بالغوں (اڈلٹ) کے لئے۔ اس معمولی سی احتیاط سے نئی پود سینما کے مہلک اثر سے
ایک حد تک محفوظ رہ سکتی ہے۔

نیو ہسٹری سوسائٹی نیویارک کی طرف سے ایک کل دنیا کے مقابلۂ مضمون نویسی کا اعلان کیا گیا
جس میں ایکہزار ڈالر سے لیکر پچاس ڈالر تک کے انعامات ہوں گے۔ اس مقابلہ کے لئے ہر ملک کے نوجوان
اس موضوع پر مضمون لکھ سکتے ہیں "کل دنیا کس طرح ہمہ گیر جنگی تیاری کو بند کر سکتی ہے"۔ اس مضمون
کے سلسلے میں اس پتے پر خط و کتابت کرنا چاہیئے۔ "ورلڈ لمیٹیشن فنڈ۔ ۱۳۲ ایسٹ۔ ۱۶۵ اسٹریٹ
نیویارک"۔ یہ سوسائٹی ہر سال باقاعدہ بین الاقوامی اخوت اور مفاہمت کے مختلف پہلوؤں پر نوجوانوں
سے مضامین لکھاتی ہے۔ جو بہترین قرار دیئے جاتے ہیں۔ انہیں انعام ملتا ہے۔ پچھلے سال سوسائٹی نے
ایشیائی نوجوانوں کے لئے ایک خاص مقابلے کا انتظام کیا تھا جس میں بعض ہندوستانیوں کو بھی
انعام ملے۔

امریکہ کے بہت سے اسکولوں میں ورلڈ لیٹرس ایجنسی کے گشتی نمائندے کی طرف سے ہر ہفتے ایک چٹھی بھیجی جاتی ہے۔ اساتذہ ان چٹھیوں کو جغرافی تعلیم اور دوسرے ملکوں کے حالات بتانے میں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح گھروں میں بڑوں بوڑھوں اور بچوں سبھی کے لئے ایک نیا اور دلچسپ موضوع گفتگو تبادلۂ خیالات کے لئے مل جاتا ہے۔ یہ چٹھیاں بالعموم مکسیکو۔ گواٹی مالا وغیرہ۔ لاطینی امریکہ نے مختلف ممالک سے لکھی جاتی ہیں۔ دو چٹھیوں میں ان ممالک کے صدر جمہوریہ کی طرف سے امریکہ کے بچوں کے نام مبارکباد اور محبت ومودت کے پیغام ہیں بعض چٹھیوں میں لاطینی امریکہ کے بچوں کی طرف سے امریکی بچوں کے پیغام ہیں۔ بعض بعض بڑے دلچسپ ہیں۔ ماناگوا کی ایک بچی اسکلڈا جسکی عمر ۱۲ سال ہے۔ لکھتی ہے کہ "وہ اس دن کاکس بے چینی سے انتظار کررہی ہے۔ جب وہ بڑی ہوکر امریکہ جائے گی۔ اور پہلی مرتبہ برف دیکھے گی"۔ گواٹی مالا۔ کا ایک انڈین نسل کا بچہ لکھتا ہے "میں تمہارے ملک کے بڑے دخانی جہاز اور عمارتیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے آپ کے ہاں دس دس منزل کی عمارتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو ایک ہی منزل ہوتی ہے۔ میں انڈین نسل کا بچہ ہوں اور مجھے اپنی قوم اور خاندان پر فخر ہے"۔

اردو کے تعلیمی رسائل میں پیام تعلیم پہلا رسالہ ہے۔ جس نے ہندوستانی بچوں کو خط وکتابت کے ذریعہ غیر ممالک کے بچوں سے روشناس کرایا کسی آئندہ اشاعت میں ہم ان چٹھیوں کے اقتباسات ہدیہ ناظرین کریں گے جو مختلف ممالک سے جامعہ کے بچوں کو پہنچی ہیں۔

اگرچہ جاپان کی تعلیمی حالت بہت اچھی ہے، اور پچھلے ستر سال میں جاپان نے اس لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کی ہے، تاہم اپنی مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی کی طرح اہل جاپان عورتوں کی اعلےٰ تعلیم کے مسئلہ پر بھی بے حد قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ایک محکمہ جاتی رپورٹ کی روسے جاپان میں عورتوں کی تعلیم کا مقصد تربیت اخلاق ہے۔ اور ان کے لئے محض وہ علم ضروری ہے۔ جو انہیں اچھی مائیں اور بیویاں بنا سکے اور اس خاندان کی زندگی کو مسرور اور خوشگوار بنانے میں مدد

دے جس میں انکی شادی کی جائے گی۔

اس لحاظ سے اگرچہ ابتدائی درجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں کوئی تمیز نہیں لیکن ثانوی درجے میں پہونچتے ہی ایک بین تفاوت محسوس ہونے لگتا ہے۔ لڑکوں کے ثانوی مدارس مڈل اسکول کہلاتے ہیں اور لڑکیوں کے ہائی اسکول جس سے مقصد شاید یہ معلوم ہوتا ہے کہ ثانوی تعلیم لڑکیوں کی ضرورت کے مطابق کافی بلند ہے۔ لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں معمولی اسکولی مضامین کے علاوہ امور خانہ داری۔ سینا۔ پردنا۔ کشیدہ کاری وغیرہ بھی شامل ہیں۔ سب سے دلچسپ وہ اسکول ہیں جو نایومی گگو کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ اسکول آئندہ بیوی بننے والی لڑکیوں کے لئے مخصوص ہیں جن میں انتظام امور خانہ داری، کھانا، پکانا، آداب نشست و برخاست۔ طعام۔ چائے نوشی تسلیم و کورنش۔ گھر کی تزئین و آرائش۔ رنگوں کے جوڑ۔ پھولوں کی تربیت اور سجاوٹ وغیرہ میں تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدرسوں میں طالبات جوق درجوق داخل ہوتی ہیں۔

یونیورسٹیوں میں بالعموم لڑکیوں کو داخل نہیں کیا جاتا اور ان کی باری اکثر اسوقت آتی ہے جب تمام لڑکے لئے جا چکتے ہیں لطف یہ کہ عورتوں کے لئے کوئی علیحدہ یونیورسٹی بھی نہیں۔ ۱۹۳۶ء میں عورتوں کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے روپیہ فراہم کیا گیا۔ اور جب محکمہ تعلیم کو منظوری کے لئے درخواست دی گئی۔ تو اس کا جواب یہ ملا کہ "عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم فراہم کرنے کے لئے قواعد مرتب نہیں کئے گئے۔"

لڑکوں اور لڑکیوں کی اکٹھی تعلیم۔ انگلستان میں پچھلے دنوں ہالوے کالج کی جوبلی بہت دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ اس ادارہ کی بنیاد ایک مخیر ہمدرد کے ہاتھوں پڑی۔ یہ ادارہ صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔ اس سلسلے میں ولایت کا مشہور تعلیمی رسالہ جرنل آف ایجوکیشن جو انگلستان کے تعلیمی حلقوں کے اعتدال پسند اور ارباب اختیار کا جریدہ ہے۔ اس تقریب پر ان الفاظ میں قلم فرسائی کرتا ہے "ہم میں بہت سے مخلص اہل علم لڑکوں اور لڑکیوں کی اکٹھی تعلیم کے حامی ہیں۔

فرانس میں تو اسے بہت بُری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انگلستان میں بھی بلند نگاہ ماہرینِ طب اب بالتصریح کہنے لگے ہیں۔ کہ عورت اور مرد کے قوائے ذہنی کے طریقِ عمل یکساں نہیں ہیں۔ بہر حال یہ کہنا تو بالکل لغو ہے کہ عورت کی دماغی قوتیں مرد سے گھٹیا ہیں۔ اسکے خلاف تو ہمارے سامنے بے شمار نظائر اور شواہد موجود ہیں۔ تاہم بالعموم تجربتہً یہی ثابت ہوا ہے کہ مرد اور عورت کے لئے علیحدہ علیحدہ کام کرنا ہی بہتر ہے" اس کے بعد یہ رسالہ بہی خواہان قوم اور ارباب دولت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کے کالج کھولنے کے لئے چندہ دیں۔ اور اس قسم کے علیحدہ ادارے قائم کریں تاکہ آکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ میں باہمی تعلیم سے جو بڑے نتائج پیدا ہو گئے ہیں کم ہو جائیں۔

اب کے آل انڈیا تعلیمی کانفرنس کا تیرھواں اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا کانفرنس کے مختلف شعبوں میں تعلیمی مقالے پڑھے گئے۔ تقریریں اور بحث مباحثہ بھی ہوئے۔ مگر سب سے پر جوش اور دلچسپ مباحثہ کانفرنس کے آخری اجلاس میں اس تحریک پر ہوا کہ مادری زبان تعلیم کے تمام درجوں کے لئے ذریعہ تعلیم قرار دی جانا چاہیئے۔ پروفیسر سدھانت لکھنؤ یونیورسٹی نے اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی کہ یونیورسٹی تعلیم کے علاوہ مادری زبان ذریعہ تعلیم ہونا چاہیئے۔ اس ترمیم کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے دو دلچسپ سبب بیان کئے۔ جن کے باعث مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں ناقابل عبور دقتیں پیش آینگی اول یہ کہ ہر صوبے میں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہیں اور اس کی مثال انہوں نے یو۔ پی میں مقامی بولیوں کے اختلاف سے دی۔ شاید پروفیسر موصوف زبان اور بولی کو ایک ہی سمجھے۔ یا شاید انہوں نے اردو۔ بنگالی۔ تامل۔ تلگو۔ گجراتی وغیرہ زبانوں کے حلقۂ اثر کو محض اضلاع میں محدود سمجھا۔ اگر وہ کانگریس کے صوبوں کی زبانوں کے لحاظ سے تقسیم پر غور فرما لیتے۔ تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ محض معدودے چند علاقوں کے سوا ہندوستان بہت آسانی سے لسانی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مدراس ہی کو لیجئے۔ اس صوبے میں چار زبانیں ہیں۔ مگر ہر ایک کا علاقہ بالکل علیحدہ ہے اور بجائے خود ان میں کم از کم دو زبانیں اتنے ادب اور وسعت کی حامل ہیں کہ آسانی سے ذریعہ تعلیم قرار دی جا سکتی ہیں۔ دوسری وجہ اس سے بھی دلچسپ تھی۔ موصوف کے خیال میں مغرب کے بڑھتے ہوئے

ادب کو ترجمے کرنے کا ارادہ دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ جو ناممکن العمل ہے۔ اس جوش میں وہ یہ بھی کہہ گذرے کہ "مغربی علوم سے پوری واقفیت رکھنے کے لئے تو ہمیں ایک سے زیادہ مغربی زبان جاننا ضروری ہے، اور اگر مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا تو ہم مختلف ترقی پذیر مغربی زبانوں کے سرمائے سے محروم ہو جائیں گے"۔ اس لحاظ سے تو ٹالسٹائی۔ گوئٹے۔ دانتے، یا والیٹر کے تصنیفات انگریزی زبان میں پڑھنا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ جب ان کو ہندوستانی زبان اپنا نہیں سکتی تو انگریزی زبان میں ہی کیا خصوصیت ہے کہ دوسرے ادب کی روح اس میں آسانی سے حلول کر جائے۔

اس ترمیم کی پروفیسر سیدین نے پُرزور مخالفت کی۔ ان کی تقریر میں نہ صرف ایک قومی جذبہ اور خودداری کی شان تھی۔ بلکہ تعلیمی۔ تاریخی۔ منطقیانہ لحاظ سے برہان قاطع تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس ترمیم کا آج منظور کیا جانا ناممکن نظر آتا ہے، اور نہ ہی یہ ترمیم محرک کی وسیع النظری کے شایان شان ہے۔ آج دنیا کی تعلیمی تاریخ میں ایک بھی مثال ایسی موجود نہیں کہ ایک قوم کے تمدنی سرمایہ اور اسکی ذہنی قوٰی نے ایک غیر زبان کے ذریعہ نشو و نما پائی ہو۔ انگلستان جرمن اور روس بھی ایک زمانے میں فرانسیسی زبان اور تمدن کے زیر اثر اور خوشہ چیں تھے مگر جونہی کہ ان قوموں نے اس امر کا احساس کیا کہ وہ اس طریق پر ان کے توار کی اٹھان اور ترقی ناممکن ہے تو انہوں نے مادری زبان کو ہی اپنے جذبات وتخیل کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا۔ کیا کلکتہ یونیورسٹی کے سینیٹ ہال میں کوئی یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہے کہ بنگالی زبان میں مختلف علوم وفنون کو اپنانے اور ان تصنیفات کے ترجمہ کی اہلیت نہیں جو یونیورسٹی تعلیم کے لئے ضروری ہوں۔ اس اہم مسئلہ پر قطعی اور حتمی فیصلہ کو التوا میں ڈالنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم شکست اور عجز کی راہ عمل اختیار کر رہے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کی علمی بے مائگی کی آج سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا معاملہ ہے ان کے ساتھ اچھوتوں کا سلوک کیا گیا اور جب تک ہمارے ملک کی تعلیمیافتہ جماعتوں کا اوڑھنا بچھونا خیالات کا اظہار کیا سوچنے کا بھی ذریعہ ایک غیر ملکی زبان رہے گی۔ ہندوستانی زبانوں میں ادبی اور لسانی سرمایہ کا فقدان جاری رہے گا۔

کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ہمارے ملک کے بہترین مفکر اور مصنفین ایک غیر ملکی زبان

میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ آج ڈیڑھ سو سال کی طویل مدت سے ہم ایک غیر زبان میں تعلیم دینے کا تجربہ کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ایک فرد کی ذہنی اور دماغی قوتیں برقرار رہیں تو اس مقابلہ میں ایک ہزار افراد کی قوت اظہار و فکر مفقود ہو گئی۔"

رائے شماری پر ایوان نے تقریباً متفقہ طور پر اصلی تجویز کے حق میں رائے دی اور پروفیسر سعادت کی ترمیم مسترد کر دی گئی۔

پچھلے دنوں علیگڈھ میں ایک ماہر تعلیم نے جو حال ہی میں امریکہ کی سیر سے واپس آئے ہیں۔ وہاں کی تعلیمی اداروں پر تقریر کی۔ اور اس سلسلے میں اندھوں اور بہروں اور گونگوں کی تعلیم کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے امریکہ کی عظمت کا اسوقت احساس ہوا۔ جب میں نے دیکھا کہ ان کے نظام تعلیم نے اندھوں کو دیکھنا بہروں کو سننا اور گونگوں کو بولنا سکھا دیا۔ صدر نے اپنی تقریر میں ہندوستانی تعلیم پر ایک نہایت دلچسپ طریق سے تنقید کی۔ کہ ایک تو وہ تعلیم ہے جس سے کائنات احساسات میں زندگی کی نئی رو دوڑ جاتی ہے۔ اور مردہ رگیں حیات نو کے پیام سے مرتعش ہو جاتی ہیں۔ اور ایک ہمارا نظام تعلیم ہے۔ جس نے آنکھوں والوں کو اندھا، سننے والوں بہرہ اور بولنے والوں کو گونگا بنا دیا۔ کیا اس افسوسناک المیہ نتیجہ کی وجہ ایک غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا نہیں ؟ ۔

القریش

سادات قریش کا اصلاحی مجلہ، چوبیس سال سے بالالتزام امرتسر سے ماہوار شائع ہوتا ہے
اور سلطان العلوم اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے تلطفات شاہانہ سے مدارس
محروسہ سرکار عالی کے نام جاری ہے،

القریش، نہایت محنت و عرق ریزی کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے، عام دلچسپ
نتیجہ خیز تاریخی و ادبی مضامین کے ماسوا "بصائر و غیرہ" پر قابل قدر مقالات، واقعات حاضرہ
پر بہترین شذرات اور "تذکرہ برادری" کے زیر عنوان برادری سے متعلقہ تمام امور حسن و خوبی
کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں،

"القریش" کے کہنہ مشق فاضل مدیر کو خدمات جلیلہ کے صلہ میں قوم کی طرف سے
"زرنقد کی تھیلی" اور "محسن القوم" کے مفتخر خطاب کی پیشکش القریش کے صوری و معنوی محاسن کا
بین ثبوت ہے۔ ہر بہی خواہ قوم کا فرض ہے کہ وہ اس کی اعانت سے اپنی قوم کے اصلاحی و
ارتقائی امور میں حصہ لے۔

قیمت سالانہ تین روپے

ملنے کا پتہ۔ مینجر "القریش" شریف گنج امرتسر

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیر ادارت شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا۔ جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے،

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے

عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے (۶ عہ) ششماہی تین روپے آٹھ آنہ (۳/۸ عہ)

نمونے کے پرچے کے لئے ۵ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

مینیجر کلیم، ۴ جانتی نواس، دریا گنج، دہلی

عکسی قرآن مجید

مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور

بحمدللہ کہ انجمن حمایت اسلام لاہور نے چھ برس کی محنت شاقہ اور بصرف زر کثیر ایک ایسا دیدہ زیب نسخہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں دیا ہے، جس کو کتابت کی اغلاط سے پاک ہونے کے لحاظ سے مستند ترین کہنا چاہیئے یہ قرآن حکیم نہ صرف حسن طباعت وکتابت، اور عمدگی کاغذ کے اعتبار سے رائج الوقت نسخوں سے بہت زیادہ بہتر اور نفیس ہے بلکہ اپنے باطنی محاسن کی وجہ سے بھی بے نظیر ہے، یہی وجہ ہے، کہ ہندوستان بھر کے علماء زعماء اور اسلامی اخبارات نے اسی بہت زیادہ پسند کیا اور ہر مسلمان کو مشورہ دیا کہ اس بیش بہا نسخہ کو حاصل کر کے سعادت و برکت حاصل کرے،

خدا کا شکر اور احسان ہے، کہ عوام اور خواص دونوں میں اس قرآن مجید کو قبولِ عام نصیب ہوا، اور پہلے ایڈیشن کو شائع ہوئے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، کہ مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور انجمن کو اسے دوبارہ طبع کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

قرآن مجید کا ثانی ایڈیشن پہلے زیادہ دیدہ زیب صورت میں طبع ہو کر انجمن کے کتب خانہ میں آچکا ہے، اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے اسے طلب کیا جا رہا ہے آپ بھی اسقدر خوبیوں والے قرآن حکیم کو حاصل کر کے اس سے اپنے گھر کی رونق کو دوبالا کریں، اور خود بھی پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں، یہ قرآن حکیم اس قابل ہے کہ مہربان ماں، باپ اسے اپنی چہیتی بیٹیوں کے جہیز میں ایک گرانقدر عطیہ کے طور شامل کریں، اور دونوں جہاں میں سرخروی حاصل کریں۔

اس نسخہ قرآن حکیم کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچانے کی خاطر انجمن نے اس کا ہدیہ بہت کم کر رکھا ہے اور غریب سے غریب مسلمان اسے آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے؛

ہدیہ قسم اول (جہیز وغیرہ میں دینے کیلئے) پچیس ۲۵ روپے۔ ہدیہ قسم دوم پانچ روپے ۵۔ ہدیہ قسم سوم تین روپے ۳

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور

بقائے صحت کیلئے ایک اچھی دوا

OKASA اوکاسا

دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایک بہترین چیز ہے

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔

اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے

سو ٹکیوں کا بکس دس روپے (عـہ۱۰)　　آزمائش کے لئے ۳۰ ٹکیاں چار روپے (للعہ)

اوکاسا کے استعمال سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی ٹکیاں استعمال کی جائیں۔ اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبہ پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے۔

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے یا ذیل کے پتے سے بھی منگا سکتے ہیں

اوکاسا کمپنی برلن، انڈیا (لمیٹیڈ) نمبر ۱۲ ریمپرٹ رو پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶ بمبئی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۶۲

آپ کا بچّہ

اگر لکھنے پڑھنے سے جی چراتا ہے تو اسے

پیام تعلیم

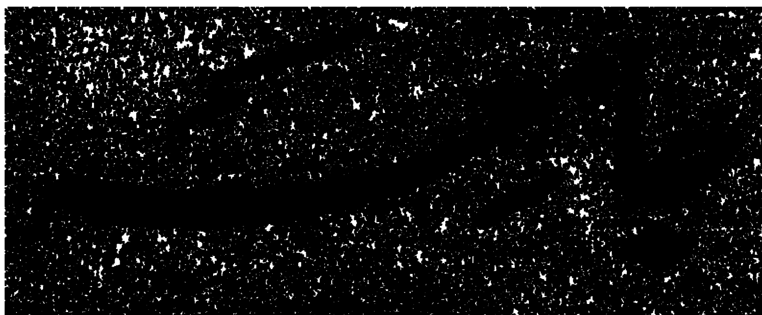
با تصویر

پڑھنے کو دیجئے۔ پیام تعلیم کے پر لطف اور مفید تعلیمی مشغلے، اچھی اچھی اخلاقی نظمیں اور عام معلومات کے دلچسپ مضمون دیکھ کر بچہ خود بخود پڑھنے لکھنے کی طرف مائل ہو جائے گا اور اس کا تعلیمی ذوق اس کے مطالعہ سے روز بروز نشو و نما پانے لگے گا۔ بچے جن مضامین کو پڑھنے سے مدرسے میں جی چراتے ہیں پیام تعلیم کے ذریعے نہایت کامیابی سے سیکھ لیتے ہیں اور اپنے ذہن پر کسی قسم کا بار نہیں محسوس کرتے۔

ابتدائی تعلیم کے ماہرین نے پیام تعلیم کو بچوں کا بہترین رسالہ تسلیم کیا ہے اور ابتدائی مدارس میں بچوں کو اس کا مطالعہ کرانے کی سفارش کی ہے۔

چندہ سالانہ عہ فی پرچہ ۴ر

مکتبہ جامعہ :- دہلی - نئی دہلی - لاہور



مکتبہ جامعہ دہلی

پیامِ تعلیم

(سالنامہ)

سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ یہ خاص نمبر ہر اعتبار سے بچوں کے لٹریچر میں ایک نئی چیز ہوگی۔

اس میں صرف وہی چیزیں نہ ہوں گی جنھیں بچے چند دن میں پڑھ کر رسالہ الماری میں رکھ دیں بلکہ وہ سال بعد تک ان کے ہاتھوں میں رہے گا۔ وہ معلوم کر سکے گا کہ پڑھنے کے علاوہ کون کون سے مشغلے ان کے لئے مفید ہیں اور وہ اپنے ہاتھ اور دماغ کی کوشش سے کیسی کیسی اچھی مفید اور عجیب چیزیں بنا سکتے ہیں۔

کتاب نما

ادب اردو کے شائقین کے لئے مکتبہ جامعہ کا یہ رسالہ بہت ضروری ہے۔ تمام جدید کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے سے ہمیشہ مل سکتی ہے کسی قابل ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں۔ کتاب نما پڑھ کر اردو ادب کی رفتار ترقی سے واقف رہیں گے۔ چندہ سالانہ صرف ۸ر

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور

Regd, L. No 1892.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیرادارت :- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے، پی، ایچ، ڈی

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۳۸ء	جلد ۳۰

فہرست مضامین

۱-	زندگی یا موت -	جناب ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری ایم اے ـ پی ایچ ڈی	۲۸۷
۲-	غزل	حضرت جگر مرادآبادی	۳۱۴
۳-	اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات پر ایک نظر	جناب احمد علی صاحب علوی متعلم جامعہ	۳۱۵
۴-	ڈاکٹر انصاری اور فن مصوری - -	جناب عبدالغفور صاحب ایم اے علیگڈھ	۳۳۸
۵-	مزار رہنما (نظم)	جناب مجاز بی اے	۳۴۶
۶-	دنیا	خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی	۳۴۷
۷-	تنقید و تبصرہ	- - -	۳۵۳
۸-	رفتار عالم (ممالک غیر)	م - م	۳۶۶
۹-	تعلیمی دنیا	جناب عبدالغفور صاحب ایم اے علیگڈھ	۳۷۲

زندگی یا موت؟

(ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری بی اے جامعہ، پی۔ ایچ ڈی، برلن)

زندگی یا موت یہ وہ اہم ترین سوال ہے جو زمانہ نے مسلمانان ہند کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب یہ خود انکی اپنی مرضی پر موقوف ہے کہ " زندگی کو پسند کرلیں یا موت کو" وقت کی صبا رفتاری نے آج تک کسی کے لئے بھی انتظار نہیں کیا ہے اور نہ وہ ان کے لئے اپنی رفتار کو دھیمی کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ ہواؤں کے طوفان دریاؤں کے تلاطم۔ موجوں کے تھپیڑے۔ اپنے ہنگامہ شورش میں مشغول ہیں۔

دریا کو اپنی موج سے طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار لگے، درمیاں رہے

آفتاب، ماہتاب، ستارے، زمین و آسمان بلکہ کل کائنات اپنی تعمیر میں منہمک ہے۔ نشو و نما کی ہنگامہ آرائیاں جاری ہیں۔ بقا اصلح کی خونچکاں تلوار اغیر پس و پیش کمزوروں اور ناکاموں کی گردن کو اڑا دیتی ہے اس ہمہ گیر قانون کے سامنے عاجزی و انکساری بھی رحم و کرم کے لئے داد و فریاد کا کام نہیں دیتی۔ وہ بے پناہ ہے۔ اسکی اس طاقت میں لوگوں کو ظلم و خوں فشانی دکھائی دیتی ہے۔ مگر وہ اپنے داخلی فطری قانون سے مجبور ہے۔ وہ ضعیفوں کے لئے قوت والوں کو روک نہیں سکتا۔ وہ ناکاموں کے لئے قابل انسانوں کی راہ میں روڑا نہیں اٹکا سکتا ہے۔ وہ ذلیل بھیک مانگنے والی اقوام کے لئے سربلند و خوددار اقوام کی راہ میں کیوں مزاحم ہو؟ وہ تو صرف ان اقوام کا ساتھ دیتا ہے جو اپنی قوتوں کی صحیح طور پر جانچ کریں۔ زمانہ اور زمانہ کی تحریکات کو سمجھیں اور پھر اپنی داخلی قوتوں، تاریخی بنیادوں، زمانہ کی تحریکوں پر ایک بلند و بالا نصب العین استادہ کریں۔ پھر اس بلند و بالا نصب العین کو شور و ہنگامہ کے ذریعہ نہیں بلکہ استقلال اور پائدار عمل کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کریں یہ زندگی کا قانون ہے۔ ایسی زندگی کا جو پھولتی ہے اور پھلتی ہے۔ جو لوگوں کو آرام کے لئے ٹھنڈا سایہ اور کھانے

کے لئے میٹھے پھل دیتی ہے۔ وہ زندگی جو انسان کو تری و تازگی بخشتی ہے۔ جو اس کے جسم میں صحت و رخون اور اس کی روح میں پُر کیف نغمہ بھر دیتی ہے۔ جس سے انسان حیوانی بنیادوں سے بلند ہو کر نفسی اور روحانی منازل کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے۔

مسلمانانِ ہند | بد قسمت مسلمانانِ ہند حیران و پریشان ہر ایک کا منہ تکتے ہیں۔ اس یتیم بچہ کی طرح جس کے والدین کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا ہو اور جو شفقت و محبت کے لئے ہر ایک کا منہ تکتا ہو۔ اسکا چہرہ پژمردہ۔ اسکی جبیں غم آلود اور اسکی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہوں۔ اُن کے سر پر کوئی بھی محبت سے ہاتھ پھیرنے کے لئے تیار نہو۔ اپنے محبت بھرے آغوش میں کوئی بھی انکو لینے کے لئے آمادہ نہ ہو۔ اس کی قسمت میں ہر طرف سے بے رخی۔ بے پروائی اور جھڑکی لکھی ہوئی ہو۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمہ نے مسلمانانِ ہند کو یتیم کر دیا۔ پہلے انھوں نے انگریزوں کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ شروع شروع میں انھوں نے اپنی ملکی مصالح کے باعث ان کی طرف کچھ توجہ شروع کی لیکن فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ نہ اصلی محبت ہو سکتی تھی اور نہ تھی۔ بعد میں پھر انھوں نے ہندوؤں کی طرف رخ کیا۔ وہاں بھی بعینہٖ وہی پیش آیا۔ اب وہ ایک مایوس جھنجھلائے ہوئے بچے کی طرح خفا و غصہ ہو رہے ہیں۔ حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تحریری معاہدہ چاہتے ہیں۔ لیکن نہ تو در اصل یہ حقوق منظور کئے جاتے ہیں اور نہ کوئی معاہدہ ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن بفرضِ محال اگر یہ سب کچھ کر بھی دیا جائے اور اس کے بعد پھر اس سے انکار کر دیا جائے تو پھر یہ کیا کریں گے۔ وہی چیخنا و چلّانا وہی شور و شغب۔ اور بالآخر وہی بے بسی و مایوسی۔
بد قسمتی سے مسلمانانِ ہند کے سامنے اس وقت نہ کوئی نصب العین ہے اور نہ کوئی متعینہ راہِ عمل۔ وہ ایک منتشر پریشان جگہ کی طرح ہیں جسکا کوئی نگہبان نہیں۔ انکی قومی زندگی ایک حقیر بے مایہ تنکے کی طرح ہو گئی ہے جس کو ہوا کی رو جدھر چاہے اُڑا کر لے جائے۔ راہ ہی متعین نہیں ہے تو راہبر کا متعین ہونا کیسا۔ یہ شعر ؎

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ابھی تک اسی طرح صادق آتا ہے جس طرح آج سے ربع صدی قبل مسلمانان ہند بیچارے اُس گم کردہ راہ کی طرح ہیں جو ایک خوفناک بگولہ میں گھر گیا ہو۔ وہ مخبوط الحواس حیران و سراسیمہ ہر سمت دوڑ کر جاتا ہو اور وہاں سے پھر ہواؤں کے طوفان اور گرد و غبار کے تھپیڑے اس کو واپس کر دیتے ہوں۔ اس کش مکش میں بالآخر وہ غریب اپنی آنکھوں کی بینائی بھی کھو دیتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک یہ نوبت تو نہیں پہنچی ہے لیکن ڈر ہے کہ اس پریشانی۔ سراسیمگی اور انتشار کے اس خوفناک طوفان سے جلد نجات حاصل نہ کی گئی تو ہماری قومی بصیرت ہی غائب نہ ہو جائے۔ قومیت۔ اشتراکیت فسطائیت۔ اور خدا جانے کون کون سی تحریکات ہندی مسلمان کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ ہر تحریک اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ اپنے درد کی دوا کے لئے اسکی طرف بے ساختہ دوڑا ہوا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے مرض کا علاج کہیں بھی نہیں ہوتا۔ اس کی بیماری بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس کی تشنہ کامی کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔ دوسروں کے لئے یہ تحریکات چشمۂ لقا ہی کیوں نہ ثابت ہوں لیکن مسلمان کی پیاس کو تو یہ ذرا بھی بجھا نہ سکیں۔ اس قدر متضاد تحریکات کی کش مکش دنیا کے کسی بھی خطہ میں اس وقت اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ ہندوستان میں ہے۔ یہاں بہت سی مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ یہ جدید تحریکات کی کش مکش کا بھی یہ آماجگاہ بن گیا ہے ان مختلف عناصر کے باعث یہاں کا تمدنی مسئلہ دراصل بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ مسلمانان ہند کے لئے اپنا نصب العین متعین کرنیکے بعد ضروری ہے کہ وہ ان تحریکات کے ان عناصر کو تو قبول کرلیں جو خود انکی اپنی تمدنی تاریخی روایات سے ہم آہنگ ہوں لیکن ان کو مسترد کر دیں جو ان سے متضاد ہیں؛ بچہ کی طرح کوئی قوم بھی اس وقت تک صحیح طور پر نشو و نما نہیں پا سکتی جب تک کہ وہ اپنے داخلی نفسی قویٰ کی پابند نہ ہو۔ پھر تاریخی ارتقا کے دور میں اس نے جو مستقل عادات اختیار کرلی ہے اس کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے قبل اس کے کہ ہم عہد جدید کی تحریکات سے بحث کریں اور دیکھیں کہ وہ کس قدر ہمارے تمدنی

نصب العین میں جذب ہو سکتی ہے ہمیں خود اپنے تمدن کی ماہیت اصلی کا پتہ چلا لینا ضروری ہے۔ تاریخی ارتقا کے دور میں اس نے جو مخصوص نفسی کیفیات اختیار کر لی ہیں اس سے بھی ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ صرف انھیں بنیادوں پر ہم زندگی کی عمارت کو کھڑا کر سکتے ہیں اور صرف یہی بنیادیں پختہ اور مستقل ثابت ہو سکتی ہیں۔

۲۔ تمدن اسلامی کی ماہیت | اسلامی تمدن کی عمارت کلیتاً روحانیت پر استادہ ہے۔ اسلام کائنات کی اصل "روح" قرار دیتا ہے۔ مادہ ایک ضمنی اور حقیر چیز ہے جس کو روح اپنے اظہار کے لئے پیدا کرتی ہے اور فنا کرتی ہے۔ روحانی ارتقا ہی اصلی ارتقا ہے۔ اس روحانی ارتقا کے لئے کارساز حقیقی نے اسی طرح سامان مہیا کر رکھا ہے جس طرح مادی ارتقا کے لئے اس نے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ جس وقت گرمی سے زمین خشک بیابان ہو جاتی ہے۔ سرسبزی و شادابی کی جگہ خشکی و افسردگی لے لیتی ہے تو رحمت الٰہی باران رحمت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ جھلس دینے والی ہواؤں کی بجائے فرحت انگیز ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ بادل آسمان پر گھر آتے ہیں۔ اور آناً فاناً زمین پر موتیوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ خزاں بہار سے بدل جاتی ہے خشک ندی نالے پانی سے لبریز ہو کر ہنگامہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ رنگ برنگ کے پھول سوکھی ہوئی زمین کو لالہ زار کر دیتے ہیں اسی طرح جب دلوں کی روحانی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ غریب انسان مایوس و ہراساں ہو جاتا ہے۔ اس کے نفس کا تعلق اصلی سرچشمہ حقیقت سے باقی نہیں رہتا تو رحمت الٰہی اپنا نزول کرتی ہے۔ پیغمبر کی شخصیت انسانی زندگی کو گھیر لیتی ہے۔ اور رحمت ایزدی پیغمبر کے ذریعہ اپنا روحانی فیض نازل کرتی ہے خشک انسانی زندگیاں سرسبز ہو جاتی ہیں۔ انسانی اخوت و ہمدردی کی نہریں اس میں بہنا شروع ہو جاتی ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر شعبہ اس روحانی فیض کے باعث پھلنا اور پھولنا شروع ہوتا ہے تمدن انسانی میں وہ کلیاں پھوٹتی ہیں۔ پھول کھلتے ہیں اور پھل آتے ہیں کہ انسان خود اس پر رشک کرنے لگتا ہے۔ مذہب، اخلاق، سیاست، معیشت غرضکہ تمدنی زندگی کا ہر شعبہ مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیاد خود غرضی اور نفسانیت پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ ایک اعلیٰ روحانیت اور انسانی ہمدردی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور

اور پھر زندگی کا ہر شعبہ ایک دوسرے علیحدہ نہیں ہوتا بلکہ ایک نظام میں منسلک ہو جاتا ہے۔

ہر پیغمبر کا ظہور ایک نئے تمدنی دور کا محرک ہوا ہے۔ جب انسان کی روح مادی قید و بند سے آزاد ہوتی ہے تو وہ دنیا کی دیگر بندشوں کو بھی کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس آزادی روح کا اظہار مذہب و اخلاق علم و فن۔ سائنس ٹیکنک وغیرہ میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلعم کی روحانی تعلیمات نے جب روح انسان کو آزاد کیا اور اس کا رشتہ اس کے اصلی سرچشمہ سے جوڑ دیا تو بہت ہی تھوڑے عرصہ میں دوسرے تمدنی صیغوں میں حیرت انگیز ترقی شروع ہو گئی عربوں نے پہلے تو اخلاقی تعلیم کے ذریعہ اپنے نفس پر فتح حاصل کی۔ پھر ملکوں کو فتح کیا پھر علم و فن کے خزانوں کو فتح کیا۔ آزادی کی روح جو قرآن کی تعلیمات نے مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی وہ ان کے زوال کے بعد یورپ میں پہنچی اور عہد جدید کے تمدن احیا کا باعث ہوئی۔

قرآن کی تمام تعلیمات کا مرکز ایک خدا کا تصور ہے۔ جو تمام کائنات کا اصلی روحانی عنصر ہے جو اعلیٰ ترین نصب العین ہے اگر جدید مغربی فلسفیانہ اصطلاح میں گفتگو کی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ "اعلیٰ ترین قدر" ہے۔ ایک خدا کے تصور سے لازماً منطقی طور پر انسانیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی پیدا کردہ تمام مخلوق باہم ایک دوسرے کی بھائی بھائی ہے۔ ان میں باہم کسی قسم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ انسانیت کا یہ تصور ہی وہ معیار دیتا ہے جس سے ہم ہر تمدن کو پرکھ سکتے ہیں۔ ہر وہ تمدن جو انسانیت کو مساوی تسلیم کرے اس کے لئے ایک ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کرے جو اس تصور کے حصول میں مدد ہو تو وہ صحیح ہے۔ رسول اللہ نے ایک ایسے ہی تمدن کی بنیاد ڈالی تھی جس میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی مساوات کا خیال پیش پیش تھا۔ مساوات سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر قسم کے نفسیاتی اختلافات سے چشم پوشی کر لی جائے۔ بلکہ انسان کی داخلی بنیادوں، اس کی فطری صلاحیتوں، اس کے طبعی رجحانات کا خیال کرتے ہوئے۔ اس کی انفرادی آزادی قائم رکھتے ہوئے جہاں تک ہو سکے اس کی جسمانی نفسیاتی اور روحانی ارتقا میں مدد پہنچائی جائے۔

اسلامی احکامات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کے ذریعہ شریعت اسلامیہ میں انسان کی

اس مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی مساوات کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلامی احکامات کے فلسفہ کو تفصیلی طور پر بیان کرنیکا یہ وقت نہیں ہے لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ روحانیت کی بنیاد پر یہ ہیئت اجتماعیہ کی ایک ایسی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں کہ انسانیت کا نصب العین عملی جامہ پہن سکے۔ ان احکامات کو مرتب کرتے وقت نہ نصب العین سے چشم پوشی کی گئی ہے اور نہ انسان کی نفسیاتی بنیادوں سے جیسا کہ ہم آگے چل کر مطالعہ کریں گے۔

اسلامی تعلیمات پر ایک نہایت ہی سرسری نظر مسلمانان ہند کے نفسی سوال کو سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ انھیں کوئی بھی چیز متحرک نہیں کر سکتی جب تک اس کا تعلق اس بنیادی امر سے نہ ہو۔ مسلمانان ہند کی تحریک مندرجہ ذیل تین عناصر سے لازماً مرکب ہو گی۔

۱۔ خدا کا تصور

۲۔ انسانیت کا نصب العین

۳۔ اسلامی تمدن

مسلمانان ہند کی نفسی زندگی کے ان عناصر کو سمجھنے کے بعد اب ہمارے لئے یہ آسان ہو گیا ہے کہ ہم اب اس بات کو متعین کریں کہ وہ کس حد تک ہند جدید کی تحریکات کو قبول یا رد کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی بنیادی قومی خصوصیتوں کو قائم رکھتے ہوئے ان تحریکات میں حصہ لیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر وہ انکو قربان کر دیتے ہیں تو ہم اس کو انکی قومی موت تصور کرتے ہیں۔ زندگی یا موت صرف حیوانی زندگی یا موت کا نام نہیں ہے کسی قوم کی نفسی یا روحانی موت اس کی حیوانی موت سے زیادہ دردانگیز ہے یہ بہتر ہے کہ انسانوں کے کسی گلہ کا دنیا میں وجود ہی نہ ہو۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت خود کو قوم کے نام سے تعبیر کرتی ہے تو اس کے لئے اپنی نفسی و روحانی زندگی کو باقی رکھنا ازبس ضروری ہے۔ انسانوں کو صرف انسان کی طرح زندہ رہنا چاہیئے اگر وہ صرف حیوانی زندگی پر قانع ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنی جگہ چوپاؤں کے لئے خالی کر دے۔

۲۔ تحریک قومیت و کانگریس | ہندوستان کی تحریکات میں سب سے اول جو چیز ہمیں اپنی طرف

متوجہ کرتی ہے وہ ہندوستان کی قومی تحریک ہے۔ اس قومی تحریک نے بہت سی صورتیں اختیار
کی ہیں۔ اولاً تو ہندوؤں کی وہ تحریک ہے جو ہندوؤں کے عہد ماضی کا دوبارہ احیا چاہتی ہے اس
تحریک کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ایک نہایت جابرانہ ہے جسے مسلمانوں کا وجود ہی ہندوستان
میں برا معلوم ہوتا ہے اور وہ جبراً اگر انکا بس چلے تو مسلمانوں کو ہندوستان میں ختم کر دینا چاہتی
ہے۔ ہندو مہا سبھا اور آریہ سماجیوں کی تحریک اسی قسم کی ہے۔ ان تحریکات سے تو ہمارا ظاہر
ہے کہ کوئی بھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا یہاں تو مکمل کھلا مخاصمت ہے۔ یہ فسطائی تحریکات ہیں جو
اپنی نسل اور قوم کی برتری کے خیال پر مبنی ہیں ہندوؤں کی دوسری تحریک وہ ہے جو سیاست
اور معیشت میں تو مسلمانوں کو حقوق دینا چاہتی ہے اور وہ ان کے تمدنی معاملات میں بھی مداخلت
نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن وہ خود ہندوؤں کے لئے قدیم ہندو تہذیب کا احیا چاہتی ہے۔ اس
تحریک کے سب سے بڑے علمبردار گاندھی جی ہیں۔ ڈاکٹر ٹیگور بھی تقریباً انھیں خیالات کے
حامی ہیں لیکن ان پر مغربی تہذیب و تمدن کا کافی اثر پڑا ہے۔ اس لئے ان کے خیالات میں
زیادہ لوچ ہے۔

اس تحریک سے مسلمانانِ ہند کو دراصل کوئی وجہ شکایت نہیں ہو سکتی ہندوؤں کو اس بات
کا حق حاصل ہے۔ گاندھی جی بہ صورت ہندو ہیں اور اگر وہ ہندی ساہتیہ سمیلن یا ہریجن سیوک سنگھ
کے لئے کام کرتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اگر مسلمان ان کے ان کاموں پر معترض ہیں
تو بجا طور پر ہندو بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کی تصنیف پر معترض ہو سکتے ہیں۔ کوئی
تمدن دراصل اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب اولاً اس میں زندگی کی صلاحیت ہو۔ پھر وہ زندگی
کے مسائل حل کر سکے اور اس کے بعد اس تمدن کو علمی جامہ پہنانے اور حفاظت کرنے کے لئے ایک
مستقل مزاج اور ایثار کرنے والی جماعت بھی موجود ہو مسلمان کسی دوسری قوم کی ترقی کو بہرصورت
اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے تو روک نہیں سکتے۔ اور نہ اس طرح اپنی تہذیب
و تمدن کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ گاندھی جی کا کانگریس پر ۱۹۲۰ء سے اس قدر زیادہ اثر ہے کہ

کانگریس اور گاندھی جی دراصل ہم معنی الفاظ ہوگئے ہیں۔ مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ گاندھی جی مذہباً ہندو ہیں اور ان کے خیالات پر جین مت اور مسیحی فلسفہ کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ حالانکہ کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک ہیں جو مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتے اور جب سے کانگریس برسر اقتدار آئی ہے اس میں بہت سے مہا سبھائی بھی حکومت میں اپنا رسوخ پیدا کرنے کے لئے شریک ہوگئے ہیں۔ کانگریس بیشک ہندی تحریک قومیت کی علمبردار ہے۔ لیکن اس علمبرداری کے صرف اس قدر معنی ہیں کہ وہ ہندوستان کی غلامی کی بندشوں کو توڑنا چاہتی ہے اور یہاں کی غربت کو دور کرنا چاہتی ہے وہ دراصل وسیع معنوں میں تمدنی ادارہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہر قسم کے خیالات رکھنے والے لوگ جمع ہیں البتہ وہ ہندوستان کی آزادی کے معاملہ میں متفق ہیں۔ لیکن چونکہ کانگریس میں اس وقت اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لئے جس جگہ ہندو کوتاہ خیال اور متعصب ہوتے ہیں وہاں وہ اس سے مہا سبھائی خیالات کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اس میں ہندوؤں کا بھی قصور ہے اور مسلمانوں کا بھی۔ ہندوؤں کا اس لئے کہ ابتک وہ صحیح قومیت کے مفہوم سے ناآشنا ہیں اور مسلمانوں کا اس لئے کہ انھوں نے کانگریس کو ایک خوفناک چیز سمجھ کر بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ وہاں موجود نہیں ہیں تو ان کے حقوق کی اس جگہ حفاظت کون کریگا۔

ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا۔ یہاں کی غربت کو دور کرنے کے لئے کوشش کرنا مسلمانان ہند کا وطنی اور مذہبی فریضہ ہے۔ اور یہ فریضہ سوائے ان لوگوں کے ساتھ تعاون کے حاصل نہیں ہوسکتا جو اس مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ گذشتہ بیس برس میں اس کے لئے کانگریس نے جو کچھ کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسری جماعت نے نہیں کیا ہے۔ اور کانگریس کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ خلافت کی تحریک کو تو چھوڑ دیئے کہ وہ ایک مذہبی تحریک تھی لیکن سنہ ۱۹۳۰ سنہ ۱۹۳۲ء کی خالص وطنی تحریک میں بھی مسلمانوں نے کافی قربانیاں کی ہیں مسلمانان ہند نے عام طور پر ضرور اس تحریک میں حصہ نہیں لیا لیکن سرحد کے بہادر پٹھانوں نے اس فرض کفایہ کو اپنا خون بہا کر پورا کر دیا۔ جو ہندو اور مسلمان بغیر ہندو مسلم اتحاد نے

ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں وہ دراصل ایک مغالطہ میں مبتلا ہیں انگریزوں کی قوت کو ہٹانا دراصل اس قدر آسان نہیں ہے۔ جب تک کہ ہندو اور مسلمان یکجا ہو کر اس کو دور کرنے کی کوشش نہ کریں گے ان کے لئے نا ممکن ہے کہ وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں۔ انگریز ہر وقت اپنی قدیم پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" پر عمل پیرا ہو گا اور نادانستہ طور پر ہندو اور مسلمان اس کے ہاتھ کا کھلونا بنے رہیں گے۔

گاندھی جی کے زیر اثر کانگریس نے عدم تشدد یا اہمسا کو بھی بحیثیت ایک اصول کے تسلیم کر لیا ہے۔ اگر عدم تشدد کے یہ معنی ہی ہیں کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے تو بحیثیت اخلاقی نصب العین کے مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اسلام کی اخلاقی تعلیم میں بھی یہ سب سے اعلیٰ اخلاقی اصول ہے لیکن اگر اس کا یہ مفہوم ہے کہ کسی صورت اور کسی حالت میں بھی قوت کو استعمال نہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسلام بعض صورتوں میں بدی کو دور کرنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اور ایسی صورتوں میں دراصل قوت کا استعمال بدی نہیں رہتا بلکہ نیکی ہو جاتا ہے۔ ٹالسٹائی سے ان سیحی خیالات کو گاندھی جی نے لیا اور وہ حتی المقدور کانگریس کو اپنے خیالات کا حامل بنانا چاہتے ہیں۔

۴۔ متحدہ تحریک قومیت کے مقاصد اور مسلمان

گاندھی جی اور ان کے متبعین تو ہندوؤں کے تمدن کی ترقی خود انکی تاریخی روایات پر کرنا چاہتے ہیں اور وہ مسلمانوں کا بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ خود ان کی تاریخی روایات کے مطابق ترقی کریں۔ لیکن ہندوستان میں ایک زبردست طبقہ ایسا بھی ہے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت کی تعمیر چاہتا ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور اس کی بجائے مغربی وضع کی ایک قومیت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ مذہب کا وہ کھلم کھلا مخالف تو نہیں ہے مگر اس کو صرف ایک خانگی چیز تسلیم کرتا ہے۔ وہ صرف شہریت کی بنا پر قومیت کو استوار کرنا چاہتا ہے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اس قدر مذاہب موجود ہوں غالباً اس کے سوائے کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہیں ہے کہ ریاست اور مذہب بالکل جدا گانہ ہوں ہندوؤں کے لئے تو اس تحریک میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چونکہ اکثریت انکی ہے اور وہ اپنی حکومت کے ذریعہ اپنے تمدنی اثرات کو غالب

کرنے کی کوشش کریں گے اور پھر اگر اس متحدہ قومیت کی کوشش سے کوئی نئی مشترک چیز بھی پیدا ہو جائے تو بہر صورت ہندوؤں کو وہ ناگوار نہیں ہو سکتی چونکہ ہندو بہر حال ہندو رہتا ہے چاہے وہ ایک خدا کو تسلیم کرے یا ہزاروں کو۔ زندگی کے بارے میں وہاں کوئی متعین راہ نہیں ہے۔

مسلمان متحدہ قومیت کی تحریک کے صرف اس پہلو کو تو تسلیم کرسکتے ہیں کہ ملک کے لئے آزادی حاصل کی جائے یا ہندوستان کے معاشی مسائل کا حل کیا جائے لیکن وہ اس کو تسلیم نہیں کرسکتے کہ اپنی قومی ہستی کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں ضم کردیں۔ زندگی کے متعلق انکا خاص تصور ہے۔ وہ اس تصور کے ماتحت زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے عادی ہیں اور [illegible] یہ سمجھتے ہیں کہ انکا تصور زندگی نہ صرف ان کے لئے مفید ہے بلکہ ہندوستان اور تمام دنیا کے لئے بھی مفید ہے وہ دنیا کی [illegible] کو حل کرنے کے [illegible] اپنے پاس ایک نسخہ کیمیا رکھتے ہیں جس کو وہ کسی حیثیت پر بھی [illegible] نہیں ہیں۔ وطن [illegible] وہ بت بناکر پرستش نہیں کرسکتے گو کہ وطن کو آزاد کرنے [illegible] کے مسئلہ کو حل کرنے میں وہ کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں ظاہر ہے کہ جو [illegible] کا مذہب سے تعلق نہ ہوگا۔ باوجود ہندوؤں کی کوشش کے بھی غالبًا اس کا کسی خاص مذہبی فرقہ سے تعلق نہ ہو سکے گا۔ اس صورت میں مسلمان صرف یہ کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے مذہبی اور تمدنی امور کے لئے اپنی ایک علیحدہ جماعت قائم رکھیں اور اپنی تاریخی روایات کے مطابق ملک کی دیگر جماعتوں کے ساتھ مشترک معاملات کے لئے اتحاد عمل کریں۔

لیکن ایسی متحدہ قومیت جس میں انکا [illegible] اسکا خاص تصور زندگی۔ انکی مخصوص تاریخی روایات [illegible] ان کے لئے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

[illegible] خیالات ملک پر [illegible] ہو جائیں [illegible] زندگی [illegible] جو موجود [illegible] جن کے لئے ایک سرفروش جماعت اپنی زندگیاں وقف کردیتی ہے کہ جنہ [illegible] اپنی زندگی کا آخری

خون بھی بہانے کے لئے آمادہ رہیگی۔

۵۔ اشتراکیت ہندوستان میں | کانگریس پر تسلط حاصل کرنے کے لئے چند نوجوان جماعتیں ہندوستان میں کوشش کر رہی ہیں۔ یہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی، کمیونسٹ پارٹیاں ہیں اس کے علاوہ ٹریڈ یونین کانگریس وغیرہ بھی انہیں خیالات کی حامل ہیں اگرچہ اس وقت تک کانگریس سے باہر ہیں۔ اس تحریک کے سب سے ممتاز رہبر پنڈت جواہرلال نہرو ہیں۔ یہ دراصل بین الاقوامی تحریک اشتراکیت کی صرف ایک شاخ ہے جس کا مرکز روس ہے۔ مارکس اس کا بانی ہے۔ لینن نے اس کو ایک قابل عمل اصول بنا دیا ہے اور اسٹالن اسکو اس وقت عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ ہندوستان میں یہ تحریک سرعت سے بڑھ رہی ہے اور ممکن ہے کہ بلد کانگریس پر اس کا پورا قبضہ ہوجائے اس وقت حکومت اشتراکیت کی تعلیم کی حامل ہوجائیگی۔

اشتراکیت کا مفہوم ہے باہم مل جل کر کام کرنا اور اس جدوجہد سے جو حاصل ہو اس کو آپس میں برابر تقسیم کرلینا۔ اس قسم کی اشتراکیت اکثر پیغمبروں کے زمانہ میں پائی گئی ہے حضرت عیسیٰ اور ان کے حوارین اسی اصول کے قائل تھے۔ ہندوؤں میں بھی گرو اور چیلوں کی زندگی میں اسی قسم کی معیشت کا وجود ملتا ہے۔ عیسائی کلیاؤں میں بھی اسی قسم کا معاشی نظام پایا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت اس قسم کے تمام اشتراکی نظامات سے بحث نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف اس باقاعدہ اشتراکی نظام اور اس کی تعلیمات سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس کا بانی کارل مارکس ہے اور جس کو عملی جامہ لینن اور اسٹالن نے پہنایا ہے۔ اس لئے کہ یہی تعلیمات ہیں جو ہندوستان میں پھیل رہی ہیں اور ہمیں انھیں سے دوچار ہونا ہے۔

مسیحی اشتراکیت کے خلاف مارکس کی اشتراکیت بالکل مادی ہے۔ یہاں مسیح کی طرح مادہ کی تحقیر منظور نہیں ہے بلکہ مادہ ہی سب کچھ ہے۔ روٹی اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اس سے انسان اپنی جسمانی ضرورت پوری کرے تاکہ وہ زندہ رہ کر حانی منازل ترقی طے کرسکے بلکہ روٹی خود بالذات مقصود ہے۔ روٹی خود خدا ہے۔

کارل مارکس کے بارے میں سمجھنے کے لئے اس وقت کی سوسائٹی کا نظام سمجھ لینا ضروری ہے۔
پھر مارکس کی تعلیمات اس کی انفرادی نفسی کیفیت سے بھی بہت متاثر ہوئی ہیں۔ مارکس کا عہد
سرمایہ داری کا عہد تھا جس میں چند انسانوں کے پاس بے پناہ دولت جمع ہوگئی تھی اور مزدور فاقہ کش
تھے۔ حقیقت میں انفرادیت کی نشو و نما کی نحوست تھی۔ سرمایہ دار اور علماء کی کلیسا عوام کو لوٹنے میں
باہم ایک دوسرے سے متحد ہوتے تھے۔ بیچارہ مارکس خود تمام عمر غریب و مفلس اور پریشان
حال ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھرتا رہا۔ بندوں کی شفقت اور محبت سے انسان
خدا کی محبت سمجھتا ہے۔ وہ اس سے اکثر محروم رہا۔ نسل کا یہودی۔ ذہنی اعتبار سے بہت بلند
جس کے باعث اس کی طبیعت بے چین اور زود حس ہوگئی تھی۔ وہ سوائے اس کے کچھ کر ہی نہیں سکتا
تھا کہ تمام انسانیت کی دیرینہ روایات اڑانے کا تہیہ کرلے۔ وہ انسانیت کے مذہب اخلاق سیاست
وغیرہ سب روایات درینہ کا مذاق اڑانا چاہتا تھا۔ وہ اس میں کس حد تک کامیاب رہا
اس کو آج دنیا دیکھ رہی ہے۔

(۱) ہیگل کا ذہنی بنیاد | مارکس کی تعلیمات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اس کا
ذہنی پہلو اور دوسرا اس کا معاشی پہلو۔ مارکس ہیگل کا شاگرد تھا۔ ہیگل نے اپنے اثبات نفی اور ترکیب
والے نظریہ سے تمام کائنات کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ہیگل کے لئے ذہنی عین آخری حقیقت
تھی۔ اس دنیا میں اس عین کی حامل حکومت ہے اس لئے حکومت ایک مقدس چیز ہے۔ فائرباخ
نے اس تعلیم کو الٹ دیا۔ دنیا کی اصل عین نہیں ہے بلکہ مادہ ہے۔ گو کہ ہیگل کے اصول تضاد کو
اس نے بجنسہ باقی رکھا۔ کائنات خدا کے باعث وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ خدا انسانی دماغ کی ساخت
کے باعث وجود میں آیا ہے جو کہ مادی ہے۔ مارکس نے فائرباخ کا یہ نظریہ تسلیم کرلیا اور اس نے
مذہب ... تمام ذہنی تحریکات کو مادی تحریکات کے عمل اور ردعمل کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی
تاریخی مادیت (Historical Materialism) مارکس کی تعلیمات کی اولین خشت
ہے۔ مارکس یہ غلطی کبھی بھی نہ کرتا اگر وہ نفس انسانی کے مختلف عناصر کو اچھی طرح سمجھ جاتا

انسانی شعور مادہ نہیں ہے۔ مادہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ زمان و مکان کا پابند ہو۔ لیکن شعور مکان کی پابندیوں سے بالکل آزاد ہے۔ یہ مسئلہ مستقل بحث کا طالب ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ پھر انسانی شعور میں اخلاقی، مذہبی اور جمالی عناصر خود اپنی مستقل بالذات حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی روحانی تعلیمات کے کون سے مادی محرکات تھے؟ خود رسول اللہ کی تعلیمات میں بھی حریت مذہبی جذبہ کام کر رہا تھا۔ بعد میں اسلامی اقوام نے دیگر ممالک کو فتح و معاشی وجوہ کی بنا پر فتح کیا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذہب مادی وجوہ کی بنا پر پیدا ہوا۔ جو منکرین رسول اللہؐ کے زمانہ کے مذہبی انقلاب کو مادی محرکات سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل مذہب اور ایک مذہبی قوم کے دیگر سیاسی و معاشی اعمال میں خلط مبحث کرتے ہیں۔ کتنے شعرا نے شعر صرف مادی مفاد کے لئے کہا ہے؟ کتنے بہترین صناعوں کی صناعی صرف دام و درم کی محتاج تھی؟ دنیا میں آج تک کتنے انقلاب ہو سکتے اگر انسانوں کے دل اخلاقی احساس سے لبریز نہ ہوتے؟

نری مادیت جو دنیا کو صرف ذرات کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے انسان کو کبھی بھی تسلی نہیں دے سکتی۔ انسان صرف حیوانی زندگی گذارنا نہیں چاہتا۔ مادیت کا لازمی نتیجہ "لذتیت" ہوتا ہے جس پر ایک نظام اجتماعی کو کبھی بھی استوار نہیں کیا جا سکتا۔ مارکس انسانوں کو آئندہ نسلوں کے لئے قربان کرنے کو کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی راحت و عیش قربان کر دیں۔ اگر دنیا مادی ذرات کی ایک اندھی کشمکش ہے جس کا نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی مفہوم تو انسان کیوں اپنی راحت و عیش کو قربان کرے۔

مارکس کہتا ہے کہ سوسائٹی کے مختلف طبقات میں ہمیشہ سے جنگ چلی آ رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امیروں نے ہمیشہ غریبوں کو لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ یونان کے امیروں نے غلاموں کے ساتھ بدترین سلوک کیا۔ کارخانہ دار اور مزدوروں میں جنگ جاری ہے۔ لیکن یہ قانون ایسا ہمہ گیر نہیں ہے جیسا کہ مارکس اس کو پیش کرتا ہے۔ جس طرح امیر غریب کا دشمن ہے اسی طرح امیر امیر کا بھی دشمن ہے۔ امیروں میں بعض ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو غریبوں کے بھی دوست ہیں۔

مارکس کا یہ نظریہ اس بات پر مبنی ہے کہ وہ انسانیت کا اصل جذبہ محبت و ہمدردی تسلیم نہیں کرتا بلکہ نفرت عداوت یہ فطرتِ انسانی کے اعلیٰ نہیں بلکہ اسفل پہلو کی طرف دیکھتا ہے۔ اس میں در اصل وہ بہت کم قصوروار ہے چونکہ انسانیت نے اکثر پست اسفل پہلو کا مظاہرہ کیا ہے۔ حکومتوں اور مذہبی پیشواؤں نے خونخوار درندوں کی طرح عزیزوں کو خاک و خون میں ملایا ہے۔

۷۔ **اشتراکیت کا معاشی نظریہ** | مارکس کا "قدر زائد" (Surplus Value) کا نظریہ صحیح ہے۔ دولت جماعت کی عمومی ترقی کا نتیجہ ہے جس میں مزدوروں اور کسانوں کا زبردست ہاتھ ہے مگر اصل نفع سرمایہ دار کی جیب میں جاتا ہے اس نظریہ پر مبنی یہ خیال کہ دولت پر اجتماعی قبضہ ہونا چاہیئے صحیح ہے۔ بڑی بڑی صنعتیں اگر انفرادی ملک ہونگی تو اس کا لازمی نتیجہ سرمایہ داری ہوگا اور اس سے بے روزگاری اور غربت پیدا ہوگی۔ غربت نفس انسانی میں اعلیٰ جذبات کی بجائے اسفل جذبات پیدا کریگی۔ محبت کی بجائے نفرت ہمدردی کی بجائے مقابلہ لازماً پیدا ہوگا اور جماعت کے مختلف طبقات میں ہمیشہ جنگ جاری رہیگی۔ طبقات کی جنگ ختم کرنیکا سب سے موثر ذریعہ یہی ہے کہ ان طبقات کے اختلافات کو بہت کم کر دیا جائے لیکن مارکس اس فرق کو بالکل ہی مٹا دینا چاہتا ہے جو فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ انسان مختلف قویٰ اور صلاحتیں لیکر پیدا ہوا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ سب کو کلی طور پر مساوی کر دیا جائے۔ اگر جماعت کو ایک مرتبہ ایسا کر بھی دیا جائیگا تو پھر وہ اپنی فطری حالت پر عود کر آئے گی۔

معاشی نقطہ نظر سے بھی مارکس کی اس تعلیم پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ وہ (Private enterprise) انفرادی جد و جہد کا خاتمہ کر دیتی ہے جس پر در اصل تمام انفرادی اور اجتماعی ترقی کا دار و مدار ہے۔ لینن نے جب مارکس کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو اس کو مارکس کے بہت سے فرضی نظریوں کو خیرباد کہنا پڑا۔ ذاتی ملک کو کسی حد تک تسلیم کئے بغیر نہ لینن کچھ کر سکا اور نہ اسٹالن۔

اشتراکیت نے مثبت۔ روس میں بہت کچھ بے روزگاری کو دور کیا۔ بچوں۔ عورتوں اور

ضعیفوں کی نگاہ داشت کی۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی۔ سائنس و ٹیکنک میں تحقیقات کیں۔ لیکن ساتھ ہی ان مسائل کو حل کرنے کے لئے انفرادی آزادی کو قربان کر دیا۔ شعور انسانی کے بہترین عناصر خصوصاً مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ کلیسا کا جھوٹا مذہب۔ سرمایہ داری کی پشت پناہ عیسائیت برباد ہو جاتی تو ہمیں کچھ رنج نہ ہوتا۔ لیکن وہاں تو ایک خدا کی بجائے اب "روٹی" کی پرستش ہوتی ہے اور رزق کا دینے والا رزاق العالمین نہیں ہے بلکہ "لینن" کا بت ہے جس پر احترام و عقیدت کے پھول نچھاور کئے جاتے ہیں۔ سرمایہ داری کے پنجہ سے نکالنے کے لئے اشتراکیت نے انسانیت کو "بندۂ شکم" بنا دیا ہے۔ انسانیت اپنے اعلیٰ درجہ کی بجائے حیوانیت کی منزل میں آ تر آئی ہے۔ انسانی اعمال کے محرکات اعلیٰ روحانی و اخلاقی مقاصد نہیں بلکہ زبان اور پیٹ کی حیوانی لذات ہیں۔

جو کچھ سرمایہ داری نے انسانیت کے ساتھ سلوک کیا تھا اس سے کم برا سلوک اشتراکیت نے نہیں کیا ہے۔ قتل انفرادی آزادی دونوں میں مفقود۔ جابر و ظالم حکومتیں دونوں کا لازمی نتیجہ۔ سرمایہ داری کے نئے مظہر فسطائیت میں بھی وہی ہو رہا ہے۔ اٹلی اور جرمنی میں ویسی ہی انفرادی آزادی کو کچلنے والی حکومتیں قائم ہیں جس طرح روس میں۔ اٹلی نے حبش کو ہضم کر لیا۔ جرمنی نے آسٹریا کو ختم کر دیا۔ جاپان سالم نحیف و ناتوان چین کو نگلے چلا جا رہا ہے۔ برطانیہ کا دست خونیں ابھی تک ہندوستان کے گلے کو دبائے ہوئے ہے۔ فرانس کے مظالم سے عالم اسلامی ابھی تک نوحہ خواں ہے۔ قوت کے نشہ سے یہ مخمور سلطنتیں غالباً بہت جلد آپس میں ٹکرائیں گی اور انسانیت کا سارا امن و امان خاکستر ہو جائیگا۔ ہماری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی۔

۸۔ اسلامی اجتماعیت [illegible] اور اس کا ذہنی پس منظر

ہندوستان کی تحریک قومیت اور اشتراکیت کے سرسری مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانان ہند کو ان میں سے ایک بھی کلی طور پر مطمئن نہیں کر سکتی۔ دونوں تحریکوں میں ایسے بہت سے عناصر ہیں جو ہماری قومی زندگی کی بنیادوں [illegible] تہذیب کے بالکل خلاف ہیں [illegible] قائم رکھنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم اپنی تعلیمات کو عہد جدید کی روشنی میں دوبارہ مرتب کریں اور ان کے ذریعہ آجکل کے

تمدنی مسائل حل کرنے کی کوشش کریں۔

(الف) مذہبی تصور | مادیت کا یہ طوفان سب سے بڑا خطرہ ہے جو اس وقت انسانیت کو پیش ہے۔ اسلام اس کا سخت ترین مخالف ہے۔ وہ انسان کو حیوان نہیں رکھنا چاہتا بلکہ حیوانیت کے درجے سے بلند کرکے اعلیٰ روحانی منازل طے کرانا چاہتا ہے۔ خدا کا تصور انسانیت کی سب سے اعلیٰ قدر ہے اور اس کے تحت میں وہ تمام کائنات کی زندگی کو منظم کرنا چاہتا ہے ہم اس مسئلہ کی نوعیت پر اس وقت تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ اشارتاً ہم پہلے ہی اس کا ذکر کر چکے ہیں ہر صورت یہ یقین ہے کہ انسانیت کی پیاس صرف مادی چیزوں سے نہیں بجھ سکتی بلکہ اس کو داخلی روحانی تسکین کی ضرورت ہے جو صرف ایک سچے مذہب ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ مذہبی جذبہ یعنی تمام کائنات کو ایک واحد نظام میں مرتب کرنیکا جذبہ۔ اپنی زندگی کو ایک بامقصد اور بامعنی بنانیکا جذبہ۔ انسانی زندگی کو ابدی قرار دینے کا جذبہ انسان کی فطرت میں داخل ہے جس سے وہ کبھی بھی آزاد نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر خدا کی پرستش بند کروائی جائیگی تو اس کی مخلوق "لینن" اور دیگر رہنماؤں کے بتوں کی پرستش شروع کر دیگی۔

(ب) اخلاقی تصور | خدا کے تصور کا لازمی منطقی نتیجہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے عالمگیر انسانیت کا نصب العین ہے۔ اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی بھی اساس ہے۔ فطرت انسانی بد نہیں بلکہ نیک ہے۔ ماحول صرف اس کی فطرت کو خراب کر دیتا ہے انسان بالطبع بد پیدا نہیں ہوا ہے اس لئے اپنی جدوجہد اور عمل کے ذریعہ وہ سربلند ہو سکتا ہے۔ انسانیت کے گناہوں کے لئے کسی کو کفارہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خدائی قوتوں کا مظہر ہے اس لئے اسلامی اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ خود کو خدائی قوتوں سے متصف کرے (لذتیت) Hedonism افادیت (Utilitarianism) وغیرہ کا اسلام مخالف ہے چونکہ وہ اخلاقی قدور کو مستقل بالذات تسلیم کرتا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان اسلام میں عیسائی کلیسا کی طرح کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اخلاقی فرائض بلا واسطہ اس تعلق کے باعث پیدا ہوتے ہیں جو بندے کو

اس کے خالق سے ہے۔ اسلامی اخلاقی تعلیمات کا مقصد انفرادی ضمیر کا نشوونما ہے لیکن یہ نشوونما بغیر اجتماعی زندگی کے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اسلامی اخلاقی تعلیم اجتماعی بھی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں دراصل انفرادیت اور اجتماعیت کو باہم یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ نہ یکطرفہ انفرادیت کو پسند کرتا ہے اور نہ یکطرفہ اجتماعیت کو۔ جماعت کی اس وقت تک ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ افراد کی ترقی نہ ہو۔ لیکن اگر افراد بغیر جماعتی بندشوں کے ترقی کرنا چاہیں تو اسکا نتیجہ صرف نزاع ہوتا ہے۔ اجتماعی ماحول کے بغیر انسان دراصل انسان ہی نہیں ہو سکتا۔ صحیح انفرادیت اور صحیح اجتماعیت باہم ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔

۹۔ اسلامی اجتماعیت کا اجتماعی تصور (الف) سیاسی تصور :- اسلام میں سیاست کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ انسانیت کے اخلاقی نصب العین کی پابند ہے۔ ریاستوں کو انسانیت کے نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میکاولی کے سیاسی تصور کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ سیاسی قوت حاصل کرنے کے لئے انسان ہر قسم کے جائز و ناجائز ذرائع استعمال نہیں کر سکتا۔ ریاست خود بالذات کوئی مقدس اور سب سے بلند ادارہ نہیں ہے جس طرح کہ ہیگل سمجھتا تھا یا آج کل کی فاسستی حکومتیں (جرمنی۔ اٹلی) سمجھتی ہیں۔ اسلام اقوام کی آزادی کو اس طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح کہ وہ افراد کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن یہ آزادی اخلاقی قوانین کے تابع ہے۔

سیاست کے اس نظریہ سے لازماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام شہنشاہیت کا مخالف ہے وہ ایک قوم کی دوسری قوم پر بغیر اس کی مرضی کے حکومت کبھی بھی تسلیم نہیں کرتا وہ جمہوریت کا قائل ہے۔ شہریوں کو اپنے امام کو منتخب کرنے کا حق حاصل ہے اور وہ امام اسی وقت تک حکومت کر سکتا ہے جب تک کہ وہ قرآن و سنت کا پابند ہو اور جمہور کی اکثریت اس کے خلاف نہ ہو۔ قرآن میں دیگر احکامات کی طرح سیاسی احکامات بھی درج ہیں۔ اور یہ سیاسی احکامات مسلمانوں کے لئے سیاسی آئین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بین الاقوامی سیاست میں جدید حالات میں اسلام صرف ایک بین الاقوامی وفاق کا ہی

قائم ہو سکتا ہے۔ اقوام آزاد ہوں لیکن وہ انسانیت کی خدمت کے لئے باہم متحد ہوں اسلام کا سیاسی نصب العین تو دراصل تمام دنیا میں ایک عالمگیر حکومت کا قیام ہے لیکن جب تک انسانیت کا شعور عام نہ ہو جائے اس وقت تک صرف یہی درمیانی راہ ممکن ہو سکتی ہے۔

(ب) معاشی تصور | ایک خدا کے تصور اور انسانیت کے نصب العین کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں میں جہاں تک ہو سکے نہ صرف سیاسی حقوق میں بلکہ معاشی حقوق میں بھی مساوات ہو۔ دولت کی بالذات اسلام میں کوئی حیثیت نہیں ہے وہ صرف ایک ذریعہ ہے اپنی ذات اپنے خاندان اور انسانیت کی خدمت کا۔ حصول دولت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ اشتراکی بھی جب انسان کی مادی ضروریات پر بہت زائد زور دیتے ہیں اور "روٹی" کو انسانوں کا خدا بنا کر پیش کرتے ہیں تو وہ انسان کی نفسی و روحانی زندگی کی تحقیر کرتے ہیں۔ مادی ضروریات کا پورا ہونا بیشک نفسی زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن مادی ضروریات تو بالذات کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ صرف ایک ذریعہ ہیں۔ اور ذریعہ کو مقصد قرار دینا دماغ کے الجھاؤ کا بین ثبوت ہے۔ اسلام دراصل نہ غربت کو پسند کرتا ہے اور نہ امارت کو۔ وہ مسیحی راہبوں یا ہندو جوگیوں کی طرح دولت سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا اور نہ وہ اہل مغرب کی طرح دولت کی پرستش کروانا چاہتا ہے۔ رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کا اسوۂ حسنہ اس معاملہ میں ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ وہ تجارت کرتے تھے۔ دولت جمع کرتے تھے لیکن اس کو صرف بھی اسی فراخدلی کے ساتھ کرتے تھے۔ ذاتی جدوجہد کو (Private initiative) معیشت میں اسلام نے ختم نہیں کر دیا ہے کیونکہ جماعت کی ترقی کا دراصل یہی موجب ہوتی ہے۔ مارکس کے خیالات کو جب لینن نے عملی جامہ پہنانا چاہا تو اسے بھی یہی کرنا پڑا۔ لیکن اس ذاتی جدوجہد کے لئے اجازت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ افراد جماعت کو لوٹیں بلکہ اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ وہ خود بھی آرام سے زندگی گذاریں اور جماعت کے لئے بھی آرام کے وسائل مہیا کریں۔ اس بنا پر جب حد سے زائد دولت بڑھانا شروع کی جاتی ہے تو اسلام اس کو روک دیتا ہے۔ وہ طرح طرح کے ٹیکسوں کے

ذریعہ انفرادی دولت کو اس قدر بڑھنے نہیں دیتا کہ وہ جماعت کے لئے مضر ثابت ہوں۔ مثلاً وہ زکوٰۃ لازم کرتا ہے تاکہ اس پیسہ سے اور بہت سے کاموں کے علاوہ غریبوں کے لئے ایسے کام مہیا کئے جائیں تاکہ وہ اپنی روزی کما سکیں۔ ان تمام اقوام کا بیت المال میں جمع ہونا ضروری ہے تاکہ اجتماعی طور پر معاشی خرابیوں کا سدباب ہو سکے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی وجہ سودی کاروبار ہے۔ روپیہ کے ذریعہ روپیہ کمانا یہ وہ لعنت ہے جس میں انسانیت اس وقت کیا ہمیشہ سے مبتلا چلی آتی ہے۔ اہل زر اس کاروبار کے باعث بے بس ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو اس طرح زائد محنت نہیں کرنا پڑتی۔ جب وہ محنت سے واقف نہیں ہوتے تو وہ انسانیت کے درد دکھ کا کیا نہیں چلا سکتے۔ انسانیت کی محبت کے لئے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ وہ صرف تو انسان دکھائی دیتے ہیں لیکن باطناً وہ خونخوار درندے ہوتے ہیں۔ مفروضہ انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ اس میں خود محنت و مشقت کا ولولہ باقی نہیں رہتا اور وہ بالآخر فنا ہو جاتا ہے۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر ان تمام برائیوں کا انسداد کر دیا ہے۔ جب سرمایہ ہی کسی انسان کے پاس جمع نہیں ہوگا تو پھر سرمایہ دارانہ نظام کیا؟

وراثت کے قوانین کے ذریعہ سے بھی اسلام نے دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکا ہے۔ دولت اس قدر حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دار کا وجود بھی نہیں ہو سکتا۔

زمین کو اسلام نے بعض مفسرین کی رائے کے مطابق قوم کی عام ملک تسلیم کیا ہے۔ اجارہ کی اس نے بیخ کنی کر دی ہے۔ مثلاً اس امید پر کہ غلہ کی قیمت آئندہ زائد ہوگی کوئی شخص اپنے مکان میں غلہ جمع نہیں کر سکتا حالانکہ لوگوں کو اس وقت غلہ کی ضرورت ہے۔ [illegible] غور سے پڑھنے سے یہ باتیں واضح ہو سکتی ہیں [illegible]۔ صرف مارکس و لینن کے اقوال سند رکھتے ہیں امام ابوحنیفہؒ و امام شافعیؒ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام ایسا معاشی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے جہاں ذاتی ملکیت قائم رہے تو نہ ہو لیکن سرمایہ داری بھی پیدا نہ ہو سکے۔ وہ معیشت میں [illegible]

اور اجتماعیت (Socialism) کی خوبیوں کو جمع کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسانی اشتراکیت کے ذریعہ انسان کی عملی قوتوں کو برباد نہیں کرنا چاہتا اور نہ انسانی انفرادیت کے ذریعہ اس کو حریص و طامع بنانا چاہتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی انفرادیت کو بھولنا نہیں چاہتا گو کہ وہ ایک اجتماعی نظام زندگی ہے۔ وہ ریاست کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ سماج کی بہبودی کے لئے افراد کی معاشی جدوجہد کی دیکھ بھال کرے اور بوقت ضرورت اس میں مداخلت بھی کرے اور اگر معاشی نظام نے اس قدر پیچیدگی اختیار کر لی ہے اور سرمایہ داری کی خرابیوں کا انسداد ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ بڑی بڑی صنعتیں ریاست کے قبضہ میں نہ آ جائیں تو اسے اس قسم کی کسی اصلاح سے عار نہیں ہے۔

اسلام کی تعلیمات جامد نہیں ہیں بلکہ نامی ہیں۔ اپنی روح اور اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے وہ زمانہ کی ہر قسم کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کا معاشی نظام دراصل عہد حاضر کی معاشی مشکلات کا حل ہے۔ " اجتہاد " کے ذریعہ اس وقت کے حالات کے لئے معاشی اصولوں کو فقہ اسلامی کی روشنی میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس اجتہاد سے ہر وقت کام لیا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس وقت تک امت اسلامیہ پر ایک جمود و تعطل طاری ہو گیا ہے وہ اسلام کی روح سے محض ناواقف ہو گئی ہے۔

۱۰۔ **اسلامی اجتماعیت اور مادی اشتراکیت کا فرق** | اسلام کے اس تصور زندگی کو ہم جدید علمی اصطلاح میں اسلامی اجتماعیت کے نام سے تعبیر کریں گے۔ اشتراکیت اور اس میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اس کی بنیادیں روحانی ہیں۔ اسلامی اجتماعیت مادہ کو نہیں بلکہ روح کو اصل حقیقت سمجھتی ہے۔ اس فلسفہ میں بھی اصول تضاد کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ تضاد مادہ اور روح کا ہے اور روح حقیقت کا اثباتی پہلو ہے اور مادہ اس کا منفی پہلو، روح بالآخر مادہ پر غالب آ جاتی ہے۔ اور اس ترکیب کے باعث انسان اپنی ترقی کی ایک منزل اور طے کر لیتا ہے۔

دنیا میں دو متضاد جماعتوں کے تصادم کے باعث انقلابات ہوتے ہیں لیکن انقلاب کے اصل عوامل صرف مادی نہیں ہوتے۔ یہ عوامل اکثر نفسی و روحانی ہوتے ہیں۔ جب انسانی شعور

ترقی کرتا ہے۔ اسکا اخلاقی حس تیز ہو جاتا ہے۔ وہ ایک غیر محسوس مذہبی فریضہ محسوس کرنے لگتا ہے اس وقت وہ انقلاب پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور بغیر مادی مفاد کا خیال کئے ہوئے وہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام غربا انقلاب میں ایک طرف ہوں اور تمام امرا ایک طرف۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ غریبوں کے انقلاب کی راہ نمائی ایسے افراد نے کی ہے جو خود غریب خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے یہ کام صرف اس لئے کیا کہ انکا اخلاقی احساس بلند ہو گیا تھا۔

اسلامی اجتماعیت کی بنیاد انسانوں کے باہمی مقابلہ اور عداوت پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کی محبت اور تعاون پر مبنی ہے۔ وہ خونی انقلاب کے ذریعہ لوگوں کو برباد نہیں کرنا چاہتا بلکہ تعلیم قانونی اصلاحات اور رائے عامہ کی تربیت کے ذریعہ انقلاب کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اگر یہ انقلاب پرامن ذرائع سے نہ ہو سکے تو وہ قوت کو بھی ایک حد تک استعمال کرنا جائز سمجھتی ہے۔ لیکن یہ قوت کا استعمال اسی وقت جائز ہے جب وہ انسانیت کی محبت کی خاطر کی جائے اور اس سے ایک ایسی جماعت کا قیام مقصود ہو جس میں ظلم و تشدد نہ پایا جائے۔ اسکی مثال ایسی ہے جس طرح کہ مرض کی خطرناک صورت میں ڈاکٹر آپریشن کو جائز قرار دیتا ہے حالانکہ گاندھی جی اور (Pacifism) کی طرح یہ عدم تشدد کو اعتقاداً تسلیم نہیں کر سکتی یعنی یہ کہ تشدد کا استعمال بہر حال و بہر صورت قابل ملامت ہے۔

اسکا نعرہ جنگ یہ نہیں ہے کہ "دنیا کے مزدور متحد ہو جاؤ" بلکہ یہ ہے کہ "زمین پر بسنے والے انسانو متحد ہو جاؤ۔" ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں کی تعلیمات ان خیالات سے سب سے قریب تر ہیں اس لئے وہ پہلے مسلمانوں کو باہم ان مقاصد کے لئے متحد کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ دوسری قوموں کے لئے نمونہ کا کام دیں۔ دوسرے لوگ بھی اگر وہ ان مقاصد سے متفق ہیں تو اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔

۸۔ اسلامک سوشلسٹ پارٹی (Islamic Socialist Party) ہی ہے جس نے کہ وہ عظیم الشان کام جسے ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام دینا ہے اس طرح نہ صرف وہ اپنے میں زندگی پیدا کر سکتے ہیں بلکہ انکا وجود ہندوستان۔ عالم اسلام اور تمام دنیا کے لئے مبارک ثابت ہو سکتا ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں کون ہے جو اس مقدس فریضہ کو ادا کرے؟ جمعیۃ العلماء ہند کی مذہبی اور ملکی خدمات قابل قدر ہیں۔ لیکن جمعیۃ صرف علما کے طبقہ کی جماعت ہے وہ عوام کی نمائندہ جماعت نہیں ہے اور یہ کام تو صرف جمہور اسلام کے نمائندے ہی انجام دے سکتے ہیں۔

مجلس احرار کی سرفروشیوں سے انکار نہیں ہے لیکن کچھ دنوں سے انکا آفتاب غبار آلود مطلع میں چھپ گیا ہے۔ اور یہ مجلس تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعت بھی نہیں کہلا سکتی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے کچھ دنوں سے کروٹ بدلی ہے۔ اس کا آئین بھی اب جمہوری کر دیا گیا ہے لیکن اس پر ابتک سرمایہ داروں کا قبضہ ہے کانگریس کی نقالی کے طور پر تو اس نے ملک کی مکمل آزادی اور معاشی پروگرام کو تسلیم کر لیا ہے لیکن یہ صرف نقل ہی نقل ہے۔ اصل کا پتہ تک نہیں ہے۔ ابھی تک اس پر خان بہادروں۔ سروں۔ نوابوں۔ اور راجاؤں کا قبضہ ہے جو اس کی مسلمہ عوام کی جماعت بننے کی راہ میں حائل ہیں۔

خدائی خدمت گاروں کی جماعت ایک نہایت بہادر اور باعمل جماعت ہے لیکن اس کا اثر و اقتدار بہرصورت صرف ایک صوبہ تک محدود ہے۔

مسلمانان ہند میں ویسے ہی کیا کم نفاق اور جماعت بندی ہے کہ ایک نئی جماعت کے قیام کا خیال پیش کیا جائے۔ برسات کے کیڑوں کی طرح جماعتیں ابھر رہی ہیں اور بگڑ رہی ہیں خصوصاً سرزمین پنجاب تو اس معاملہ میں بہت زرخیز ہے۔ نئی نئی جماعات کا قیام دراصل ہماری بربادی کا پیش خیمہ ہے بلکہ اب یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ان تمام جماعتوں کو ختم کر دیا جائے اور مسلمانان

ہند کی دراصل ایک ہی جماعت موجود ہے۔ اسلامی تعلیم کی جس کے لئے ہم نے جدید علمی اصطلاح "اسلامی اجتماعیت" وضع کی ہے حامل ہو۔ جو کوئی جماعت اس تعلیمات کو قبول کرے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے اور اس کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کرنے اور قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے ہم سب کو اس میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ وہی مسلمانانِ ہند کی واحد جمعیت ہو اور اسی کو اسلامی اصولوں کے تحت میں اجتہاد کا حق ہو۔

ایسی اسلامی جمعیۃ کا قیام اسلامی ممالک میں بہت آسان ہوتا اور وہ بہ عجلت بالآخر حکومت پر قبضہ کر کے اس کے ذریعہ اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی۔ ہندوستان میں چونکہ ایک دوسری قوم بھی آباد ہے اس لیے اس قسم کی ایک جماعت کا قیام بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔

۱۲۔ اس پارٹی کا پروگرام اور ملک کی دیگر جماعتیں | اس جماعت کا دوگونہ پروگرام ہوگا۔ اولاً اخلاقی اور مذہبی جو اس جماعت کے صرف مسلم اراکین کے لئے مخصوص ہوگا۔ دوم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاسی اور معاشی پروگرام۔ اس پروگرام سے جو غیر مسلم متفق ہوں گے وہ بھی اس جماعت میں شریک ہو سکیں گے۔ مختصراً جمعیۃ کے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں گے۔

۱۔ روحانیت کی بنیادوں پر ایک نظام زندگی کا قیام

۲۔ انسانیت کے نصب العین کو عملی جامہ پہنانا

۳۔ ہندوستان کی مکمل آزادی

۴۔ ایک ایسے معاشی نظام کا قیام جس میں سرمایہ داری کا تو خاتمہ کر دیا جائے مگر انفرادی جدوجہد کا خاتمہ نہ کیا جائے۔

ان اصولوں کے لئے تفصیلی پروگرام جمعیۃ خود مرتب کرے گی۔ اول الذکر دو مقاصد صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوں گے اور موخر الذکر مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے۔

اس جمعیۃ کا اپنا ایک آزاد اور مستقل وجود ہونا چاہئے لیکن ملک کے دیگر سیاسی ادارے

مثلاً اگر کانگریس انکو شرکت کی اجازت دے تو ان کو فوراً اس میں شریک ہو کر اپنے مقاصد کو وہاں بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس طرح کہ آج کل کانگریس سوشلسٹ پارٹی کر رہی ہے لیکن اس جمعیۃ کو بہر صورت اپنے نظام کا پابند ہونا چاہیئے۔ اس طرح پر جمعیۃ مندرجہ ذیل مقاصد پورے کر سکے گی۔

۱۔ یہ مسلمانوں اور دیگر تمام اقلیتوں کے حقوق (مذہبی، سیاسی و تمدنی) کی محافظ ہو گی

۲۔ یہ ملک کی آزادی کامل کی طرف رہنمائی کرے گی۔

۳۔ یہ ایک معاشی اجتماعی نظام کو قائم کرنے کی کوشش کریگی۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی کی موجودگی میں ایک غالب اسلامی جمعیۃ کے قیام کی کیوں ضرورت ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ کانگریس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ اقلیت کو اپنی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ جماعت کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ ہندوستان بالخصوص نہایت ہی متعصب ملک ہے یہاں اقلیتوں کی قسمت کو غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑا نہیں جا سکتا۔

دوم مسلمان واقعتاً ملک کی کل آزادی چاہتے ہیں۔ اگر ہندو انگریزوں کے ساتھ ملکر ڈومینین اسٹیٹس پر صلح کرلیں تو ہم ملک کی آزادی کے لئے اور آگے جدوجہد کر سکیں۔

سوم کانگریس پر ابتک سرمایہ داروں کا بہت اثر ہے۔ پنجاب اور بنگال میں اب تک وہ ساہوکاروں۔ بنیوں اور زمینداروں کا ساتھ دیتی ہے۔ ہم واقعتاً ایک اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں چونکہ سب سے زیادہ قلاش مسلمان ہی ہیں اور ویسے بھی ہمارا اسلامی فریضہ ہے کہ سب سے زیادہ غریبوں کی خدمت کریں۔ سوشلسٹ پارٹی سے بھی ہمیں پورا اتفاق نہیں ہے۔ اولاً تو وہ مادئین اور ملاحدہ کی ایک جماعت ہے۔ اور مادیت ہمارے بنیادی نفسی خصوصیتوں کے خلاف ہے ہمیں ڈر ہے کہ اس وقت تو وہ مذہبی (بے عملی) کا وعظ کرتے ہیں لیکن جب انکا پورا قبضہ ہو جائیگا تو یہ مذہب اور آزادی ضمیر پر ویسی ہی پابندیاں عائد کریں گے جس طرح کہ روس میں آج کل ہیں۔

دوم ان کے معاشی حل سے ہمیں کلی اتفاق نہیں ہے۔ وہ مقابلہ چاہتے ہیں ہم تعاون

وہ ذاتی ملک کو بالکل فنا کر دینا چاہتے ہیں ہم صرف سرمایہ داری کو۔ بہرصورت ہماری جمعیۃ کسی کی خواہ مخواہ مخالفت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ ان جماعتوں کے سیاسی اور معاشی پروگرام کا اس حد تک ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہے جہاں تک اس کے بنیادی اصول اور اسکا سیاسی اور معاشی پروگرام اس کو اجازت دیتا ہے۔

اس جمعیۃ میں غالب اکثریت چونکہ مسلمانوں کی ہوگی اس لئے وہ ہندوستان کے ان صوبوں پر تو قبضہ کرلے گی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مثلاً بنگال۔ پنجاب۔ سندھ صوبہ سرحد اور بلوچستان۔ البتہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے مثلاً بمبئی۔ مدراس۔ سی پی۔ بہار، ممالک متحدہ۔ آسام وغیرہ میں اس کو دقت پیش آئے گی۔ لیکن اس جماعت کی اصل کامیابی دراصل مسلمانوں کی قلت یا کثرت پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان تعلیمات کی سچائی پر ہے جو یہ جماعت پیش کر رہی ہے۔ وہ تعلیمات کس حد تک عہد جدید کی تمدنی مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں اور کس حد تک ایک سرفروش جماعت اس کے لئے ایثار و قربانی سے کامیابی کا راستہ مہیا کرتی ہے۔ اگر یہ ضروری اسباب میسر آگئے تو غیر اسلامی صوبوں میں بھی یہ جماعت کامیاب ہو کر رہیگی۔

۱۴۔ تحریک پاکستان اور اسکی غلطی | بعض حضرات کہتے ہیں کہ کیوں نہ شمالی ہند ہندوستان سے علیحدہ کر دیا جائے تاکہ وہاں صحیح اسلامی تہذیب و تمدن کی نشو و نما ہو سکے اور اسلامی سیاسی و معاشی نظام قائم کیا جا سکے۔ مثلاً پاکستان کی تحریک کے حامل یہ خیال پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ خیال دراصل خوف پر مبنی ہے۔ ہمیں اکثریت سے خائف نہ ہونا چاہیئے ہم کو ان سے علیحدگی اختیار کرنی چاہیئے بلکہ۔۔ ان کے ساتھ مل کر زندگی گذارنی چاہیئے تاکہ ہم اپنی زندگی اور اپنی تعلیمات سے ان کو متاثر کر سکیں۔ اگر خود ہم میں زندگی ہے تو ہم تمام دنیا کو اس رنگ میں رنگ سکتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی تاریخی روایات کو بہرحال اس قدر جلد فراموش نہ کر دینا چاہیئے۔ چند لاکھ مسلمانوں نے ہندوستان کی تاریخ کی کایا پلٹ دی لیکن اس وقت ہم آٹھ کروڑ ہونے کے باوجود بھی بے دست و پا ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ علیحدگی سے قوم زندہ نہیں ہو سکتی بلکہ صرف مقابلہ اور جد و جہد سے۔

۱۴۔ مسلمانانِ ہند کی غلامی اور اس سے نجات کا واحد طریقہ | اسلامی حکومت کے تباہ ہونے کے بعد مسلمانان ہند نہ صرف سیاسی و معاشی غلامی میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ وہ بدترین قسم کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہو گئے ہیں انگریزوں کی ریاست کے ساتھ وہ انگریزوں کے تمدن اور علم وفن کو سب سے اعلیٰ سمجھنے لگے چنانچہ انھوں نے انکی ذہنی غلامی شروع کر دی ۔ اب ہندوؤں کا اقتدار ہو رہا ہے تو وہ ان سے مرعوب ہو رہے ہیں اور بھارت ورش کے دیوتاؤں کی پرستش شروع کرنا چاہتے ہیں۔ کل ان کا خیال ہو کہ شاید اشتراکئین قابض ہو جائیں اس لئے وہ اندھا دھند اس تحریک کے پیچھے بھی دوڑنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ غرضکہ ان میں کوئی بھی نفسی توازن باقی نہیں ہے ۔ ہر چیز وہ غیروں کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اپنی چیز سے وہ ناواقف محض ہیں اگر کسی قدر سطحی طور پر واقف بھی ہیں تو اس کو حقیر سمجھتے ہیں علما کا زائد وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چند قابل قدر ہستیوں کو چھوڑ کر صرف مسح و وضو کے مسائل بیان کرنے ہی میں صرف ہوتا ہے ۔ ایک پر قدامت پرستی چھائی ہوئی ہے تو دوسرے پر جدید مغرب پرستی کا بھوت سوار ہے۔ یہ بھوت چاہے وطن پرستی کی صورت میں نمودار ہو یا اشتراکیت کی صورت میں۔ اسلام کی تعلیمات ' اسکی روح ' اور جدید مسائل کے لئے اس کے بیش حل سے کوئی بھی واقف نہیں ہے ۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ اسلام ایک اعتدال پسند مذہب ہے جو انفرادیت اور اشتراکیت کی خطرناک صورتوں کے درمیان انسانیت کے لئے ایک موزوں راہ تبلاتا ہے ۔ یہ مشرق کے ترک دنیا کے فلسفہ اور مغرب کے دنیاداری کے فلسفہ کے درمیان ایک صراطِ مستقیم ہے جس میں انسان کی سعادت مضمر ہے۔

خود مسلمانوں کی زندگی کے باعث بھی دراصل یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اصلی اسلامی تعلیم کے عامل مسلمانوں میں بہت کم ہیں۔ قارون کی طرح مسلمانوں نے بھی دولت وحشمت کے ڈھیر جمع کر رکھے ہیں۔ فرعون کی طرح ان میں بھی ظلم ، استبداد اور شہنشاہیت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ مخلوق خدا ٹکڑے ٹکڑے کو ترس رہی ہے ۔ انسانیت ظلم و جور کی چکی میں پسی جا رہی ہے۔ ان کے علما صحیح خداترسی کی بجائے اپنی شکم پری کی فکر میں منہمک ہیں ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو سوائے عیش و آرام

کے کسی دوسری چیز کی فکر نہیں ہے۔ عوام کو تو چھوڑئے بچارے غریب مفلس - نہ دین سے واقف نہ دنیا سے۔ روحانیت اور اخلاق کے مدعی لوگ انکے پیٹ میں روٹی کا ٹکڑا بھی نہ ڈالیں اور رزاق العالمین کی درگاہ میں ہر وقت سربسجود ہونیوالے مسلمان اگر انکی بےبسی پر ترس بھی نہ کھائیں تو بھلا وہ کس طرح رزاق العالمین اور ایک روحانی اخلاقی نظام پر یقین کریں۔ مادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو صرف اسلامی تعلیمات روک سکتی ہیں اور یہ بھی صرف صحیح اسلامی تعلیمات۔ روحانی بنیادوں پر جدید سیاسی ومعاشی مسائل کا حل صرف اسلام پیش کرسکتا ہے لیکن مسلمان تو قرانی تعلیمات کے چند حصوں کو تسلیم کرتے ہیں، اوران حصوں کو جن سے انکی جیب پر ضرب پڑتی ہے ترک کر دیتے ہیں۔ اگر مسلمان واقعتاً اپنی ہندوستان کی اور تمام عالم کی نجات چاہتے ہیں تو ان کو مکمل اسلامی تعلیم کے نظام کو لیکر آگے بڑھانا چاہیئے۔ اس تعلیم کے لئے ان کو قربانی کرنا چاہیئے۔ انفعال پذیری کو چھوڑکر انکو خود اب اپنی تعلیمات اور عمل سے دنیا کی رفتار پر اثر ڈالنا چاہیئے۔ جو دوسروں پر اثر نہیں ڈالتا اس پر دنیا خود اپنا اثر ڈالتی ہے۔ جو دنیا کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتا دنیا اس کو خود اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔

اس دنیا میں کسی چیز کو بھی سکون حاصل نہیں ہے۔ انسان آگے بڑھتا ہے یا پیچھے ہٹتا ہے اگر مسلمانان ہند آگے بڑھیں گے تو نئی زندگی کی راہیں (اپنی تمام رنگینیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ) انکے لئے کھلی ہوئی ہیں۔

لیکن وہ اگر ساکن رہیں گے تو ان کے لئے مہیب وغضب ناک موت منہ کھولے کھڑی ہے یہ اب انہیں طے کرنا ہے - وہ زندگی چاہتے ہیں یا موت ؟

جگر پارے

(حضرت جگر مراد آبادی)

اسی چمن میں ہمارا بھی اک زمانا تھا ... یہیں کہیں کوئی سادہ سا آشیانہ تھا
الہٰی توبہ! میں اس جذبِ دل سے باز آیا ... کہ آج اُس کا ہر انداز والہانہ تھا
شباب و عشق کا اپنا بھی اک زمانا تھا ... خبر نہیں کہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا
تمھیں گذر گئے دامن بچا کے ورنہ یہاں ... وہی شباب، وہی دل، وہی زمانہ تھا
چمن، چمن تھا میری چشمِ شوق میں جبتک ... شرار و برق کے سائے میں آشیانہ تھا
کہاں کے حسن و محبت، کہاں کی مہر و وفا ... بس ایک سحر جوانی تھا اور زمانا تھا
مٹا مٹا سہی ظالم ۔ وہ دل تھا میرا دل ... بجھا بجھا سہی پھر بھی چراغ خانہ تھا
خوشا وہ دور کہ جب عشق ہی زمانا تھا ... نہ دشت و در تھے نہ گلشن نہ آشیانہ تھا
کہاں کا واقعہ، بس اتنا یاد ہے اب تک ... نگاہ مل کے ہٹی تھی کہ دل نشانہ تھا
نظر نے اور کیا کیا، حصول غم کے سوا ... کہ ربطِ خاص محبت تو غائبانہ تھا
تری قسم، ارے او جلد روٹھنے والے ... غرورِ عشق نہ تھا نازِ عاشقانہ تھا
بھلا دیا ہمیں تو نے، تو رنج کیا لیکن ... ہمیں بھی تیری محبت کو بھول جانا تھا

سمندِ عشق کہاں، سیر گاہِ شوق کہاں
کہ ہر نفس رہِ منزل میں تازیانہ تھا

اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات پر ایک نظر

(جناب احمد علی صاحب علوی متعلم جامعہ)

لوگ کہتے تو یوں ہیں کہ اردو زبان کی ابتدا حضرت امیر خسروؒ سے ہوئی، پر وہ زبان اور تھی۔ اصلی بات یہ ہے کہ اُردو نام کی زبان اس کے بہت دنوں بعد مغلیہ شہنشاہی کے شروع میں پیدا ہوئی۔ دکن میں قطب شاہی خاندان نے شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت نے اور اودھ میں نوابوں نے اس کو گودوں میں کھلا کر پروان چڑھایا۔

شروع شروع میں دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو بھی صرف بات چیت کرنے اور اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے ہی تھی مگر تھوڑے دنوں کے بعد ہی صوفیوں نے تصوف کے رسالوں اور نصیحتوں کے خزانوں سے اسے مالا مال کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی کے لفظ برج بھاشا میں سموئے۔ اب کیا تھا شاعروں نے بھی اسے اپنانا شروع کر دیا۔

ولیؔ، خان آرزوؔ، شاہ مبارکؔ، میرؔ و سوداؔ اور پھر حضرت خانخاناں نے سدا بہار پھولوں کے تختے لگائے۔ اب اردو علمی اور ادبی زبان بننے لگی۔ دفتری زبان فارسی ہونے کے باوجود عام ہندوستانی قوموں نے تحریر و تقریر کا ذریعہ اسے ہی بنایا۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا اور اردو زبان و قواعد کی ترتیب و تدوین شروع ہوئی۔ اس زمانے میں بہت سے ناول، قصے اور کہانیاں لکھی گئیں۔ فلسفہ اور اخلاق کی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ اس کالج کا قیام تو اس لئے ہوا تھا کہ افتراق و اختلاف کا بیج بوئے اور ہندوستانی جماعتوں میں تفریق پیدا کرے اور اس میں کامیابی بھی ہوئی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ ہندو اور مسلمان جہاں مشترک تہذیب و تمدن میں الگ الگ رستہ پر لگ گئے وہاں قومیت کا احساس بھی شروع ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد ہندو اور مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا ہو چلا جس نے

آخر میں غدر ۵۷ء کی تحریک کی۔

اُردو ادب میں سیاسی رجحان کی ابتدا ۱۸۳۷ء میں شروع ہوئی جبکہ سب سے پہلا اُردو اخبار عالم وجود میں آیا۔ اور اس زمانے سے اُردو ادب میں ہمارے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حالات پر بحث و نظر شروع ہو گئی۔

۵۷ء تک اخبارات میں اور بعض دوسری کتابوں میں بھی سیاسیات اور معاملات خارجہ پر کافی تنقید کی گئی جیسا کہ آگے کی تحریروں میں سے گا۔ لیکن ۵۷ء کے بعد تقریباً خاموشی اختیار کر لی گئی اور اگر کبھی کچھ لکھا جاتا تو بہت نرمی کے ساتھ بلکہ یوں کہئے کہ خوشامد اور چاپلوسی کے لہجے میں اظہار خیالات کیا جاتا۔

اردو ادب کے ۲ دور کئے جا سکتے ہیں

۱۔ برطانوی سامراج سے قبل سامنتی سامراج کا دور

۲۔ برطانوی سامراج یا صنعتی سامراج کا دور

شاید آپ کہیں کہ سیاسی اور معاشی زندگی کے ان ادوار سے ادب اور خاص کر اردو ادب کو کیا تعلق؟ اس لئے آیئے ہم اور آپ ادب کے نظریے پر تھوڑی سی باتیں کر لیں تاکہ ایک دوسرے کا نقطۂ خیال سمجھ سکیں اور پھر اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات کا ذکر کیا جائے۔

"ادب انسانیت کا نقاد ہے، وہ انسانیت کی بلندی و پستی کا ظاہر کرنے والا اور اسکی خامکاریوں کو بے نقاب و عریاں کرنے والا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان کی حیات چند روزہ کو دائم و قائم بنا دے اور اس کی بے کلی اور تڑپ اس لئے ہوتی ہے کہ وہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں بلکہ دراصل حالات اور ماحول اس کے غلام و بندے ہیں۔ وہ آدمی کو یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب تغیر پسند، دورِ جدید کا رہنما اور قدامت شکن ہے۔" (میکسم گورکی)

ہمارے ایک نوجوان ادیب نے کہا ہے۔

"ادب ماضی، حال اور مستقبل میں تعلق پیدا کرتا ہے رنگ و نسل، ملک اور قوم کا رشتہ توڑ کر انسانی وحدت کا سبق دیتا ہے۔"

ایک یونانی فلاسفر نے ادیب اور ادب کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

"......... ادیب اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یعنی ادب جذبات کی اصلی مصوری کرتا ہے۔"

مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں ادب کیا ہے اور اسے ہماری زندگی کا رفیق اور ساتھی بننا چاہیئے یا نہیں؟ ادب کیونکر بنا؟ کے سوالات قائم کر کے غور کیجئے۔ مانا کہ یہ سوالات فرسودہ اور پرانے سہی مگر صرف یہ خیال کرتے ہوئے کہ آجتک جتنے جوابات دیئے گئے وہ مکمل نہیں ہیں اور اس بنا پر ضرورت ہے کہ ہم اور آپ اور ہر اُردو ادب سے ذوق رکھنے والا اپنی کوشش اور اپنی بساط کے موافق ان کے حل کی تلاش کرے اور انھیں مکمل بنانے کی جرارت کرے۔ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسکی قسمت ہی میں یہ کامیابی اور خوش نصیبی لکھی گئی ہو یعنی یہ منصب تکمیل اسے ہی ودیعت کیا گیا ہو۔

ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق ادب در اصل سماج کے وسیع اور بلند درخت کی ایک شاخ ہے چنانچہ اسی لئے سماج کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کے متعلق کچھ سوچے اور اپنی رائے کا اظہار بھی کر دے تاکہ آئندہ غور کرنے والے، سوچ بچار کر کے راستہ تلاش کرنے والے اس کی روشنی، چمک اور ہدایت سے بہرہ مند اور فیضیاب ہو سکیں۔

موجودہ دور میں ہماری سماجی کشمکش اور افکار اتنی ترقی کر چکے ہیں، اور کرۂ ارض کا ہر آباد و معمور حصہ اس معاشی زمانے اور ابتلا کے اس دور سے گذر رہا ہے جو آج تک ہماری اس اجڑی دنیا، تباہ حال و پریشان خیال دنیا میں نہ آیا تھا۔ بنا بریں آج ہی ہمکو اسکی اشد ترین ضرورت ہے کہ ہم غور کریں، سوچیں اور فکر کریں کہ ابتک ہمارے اسلاف نے کیا کیا اور اب اخلاف کو کیا کرنا چاہیئے کہ اس عالم حیرانی و سرگردانی سے ہٹ کر سکون، اطمینان اور فارغ البالی کی جنت تک پہنچ سکیں۔

لہٰذا ہم کو گذشتہ زمانے کے ادیبوں اور سوچنے والوں کے کارنامے پورے غور و فکر کے ساتھ جانچنے چاہئیں انکے کاموں کی پڑتال کرنی چاہیئے، انکے افکار و آرا کا تجزیہ کرنا چاہیئے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو اور ہم یہ سمجھ سکیں کہ ہمارے پیشروں پر حالات اور ماحول کی فضا نے کیا اثر ڈالا تھے اور ہم اس سے کیا کیا نتائج نکال سکتے ہیں اور کون کون سے فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے بلکہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ یہ طے کر لینا چاہیئے کہ ہر دور کا لٹریچر حقیقتاً اس دور و فضا کی اقتصادی اور معاشی ترقی و تنزل کا ایک آئینہ ہوتا ہے اس زمانے کے خد و خال کا مکمل ٹھیک ٹھیک عکس اور چربہ یعنی صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں یوں کہا جائے۔

"زندگی اور ادب ایک دوسرے کا آئینہ ہیں"

اس سے قبل ایک یونانی فلاسفر کا قول نقل کیا گیا ہے کہ "ادب جذبات کی اصلی مصوری کا نام ہے" اب اگر اس خیال کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ بہت صاف، روشن اور واضح ہے۔

جذبہ دراصل گرد و پیش کے ماحول ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ہمارے جذبات ہمارے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے، پیدا ہوتے، اور مٹتے رہتے ہیں۔ غمناک مناظر ہمیں آنسو بہانے پر مجبور کرتے ہیں خوشی کا ماحول اور اسکی فرحتیں ہمیں ہنسا کر ہی چھوڑتی ہیں۔ یعنی حالات کی تبدیلی۔ مناظر کی الٹ پلٹ ہماری خوشی، مسرت اور ہنسی، رونے، منہ بنانے اور افسردگی کے اصلی اسباب اور حقیقی وجوہ ہیں۔ اس کی ایک مثال ایک نوجوان ہندوستانی ادیب کی زبانی سنئے۔

"موت اور بھوک کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ ایک کیلئے قدرت، دوسرے کے لئے سماج ذمہ دار ہے اگر یہ دونوں مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت (افسردگی) کم ہو جائے گی اور فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اُسے رنج دیا کریں گی"

ہم نے اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادب کے متعلق مندرجہ بالا خیالات صرف اس لئے نہیں پیش کئے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ہمارا موضوع بحث مختصر ہو جائے بلکہ جب ہم نے اس نظریہ کے مطابق اپنے ادب کا جائزہ لیا تو ہمیں بڑا دکھ ہوا کیونکہ ہمارے ادب میں حقیقی سیاسی رجحانات کی تحریریں بہت کم ملتی ہیں۔ اخبارات اور رسائل (صرف موجودہ دور کے) کے علاوہ بہت کم کتابیں ایسی ملیں گی جن میں ہمارے مصنفین نے حالات کی تصویر ... کے مطابق کھینچی ہو اور آئندہ زندگی کی کوئی خیالی تصویر بھی پیش کی ہو۔ یہ حال ... سکا اُسے ... آئندہ سطور میں اظہار خیال کیا ہے اور مثال کے طور بعض تحریریں بھی زیب قرطاس کی ہیں۔

ہمارا گذشتہ ادب کیا تھا اگر اس پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف دو طبقے ... کے مالک تھے ایک تو صوفیا، علماء، دوسرے امراء و ... ظاہر ہے کہ ان کو سماج اور ... کی ... کی زندگی سے نہ تو تعلق تھا اور نہ انکو اس کی ضرورت ہی تھی۔ اس لئے آپ ... گذشتہ شعراء ادبا کے کارنامے پڑھ کر یہ محسوس کریں گے اور آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اُردو کے گذشتہ ادب میں ... منافقت کا حصہ بہت وافر ہے۔ ... کی باغ و بہار ... عجائب ... والی ... میر تقی میر کی غزلیں اور مثنویاں رنج و الم کی داستانیں، منافقت کی کہانیاں، اور جنوں بھوتوں یا پریوں کے قصے ہیں نہ کہ اصلی زندگی کی تفسیر و تشریح۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بہت کم ہے اور تقریباً بیکار ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

یہ شعر بڑے دردناک ہیں، انکی زبان اور بندش بہت خوب ہے۔ مگر ہم نے ... اس رونے سے حاصل کیا اور اس قنوطیت کا ... کیا ہے!

سودا کا شہر آشوب، گھوڑے کی ہجو فنی حیثیت سے کتنی ہی کامل سہی پر یہ تو بتلایئے کہ اسے زندگی کی دشواریوں سے کیا تعلق، زندگی کے مصائب کا اس میں کون سا حل ہے۔ کیا درفنے،

پیٹنے اور واویلا کرنے سے زندگی سدھر جاتی ہے ؟

بھوتوں، دیوؤں، عفریتوں اور پریوں کی داستانیں آخر ہمیں عمل کا کونسا سبق دیتی ہیں۔
اُردو ادب میں تین بہت بڑی اور خطرناک خرابیاں آپ کو نظر آئیں گی۔

(۱) موضوعات بہت پرانے، کہنہ و فرسودہ اور محدود ہیں۔

(۲) معانی و مقاصد کو لطف بیان اور زیب داستان پر قربان کر دیا گیا ہے۔

(۳) ادب پیشہ تھا۔

یہ کیوں ہوا ؟ سبب وہی ہے جو اوپر بتلایا گیا کہ امرا و صوفی علم و فن کے واحد ٹھیکیدار تھے۔ اُردو ادب کی تاریخ پڑھ ڈالئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ سوائے چند شاعروں اور نثر نویسوں کے سب کے سب نثار اور شاعر، امرا تھے یا ان کے دست نگر۔ اس لئے ان کے یہاں خوشامد، چاپلوسی اور بھٹی نظر آتی ہے یا اپنے مصائب کا رونا تاکہ پیسے ملجائیں۔ جو ادیب صوفیوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ سماج اور زندگی سے بیزار یا بالفاظ دیگر فانی دنیا سے غیر متعلق ہو کر دنیائے ابدی کی سیر میں مصروف۔ اس لئے ان کے یہاں بھی ماحول کی تصویر کشی سے معذوری ملے گی۔ اب ظاہر ہے کہ جب وہ ماحول کی مصوری نہ کر سکے تو بھلا مصائب کا حل کیا پیش کرتے۔

۱۸۴۷ء سے اردو ادب میں سیاسی رجحانات کی ابتدا ہوئی ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا تھا تو مصائب کا ایک اور پہاڑ آ پڑا جس سے وہ پھوڑا جو پک رہا تھا پھوٹ گیا مگر ظالم فصاد نے پٹی اتنی کس دی کہ خون کا باہر نکلنا محال ہو گیا۔ اخبارات پر پابندی عائد کر دی گئی۔

بیچارے بہادر شاہ ظفر پکڑ کر رنگون بھیج دیے گئے۔ ساتھیوں اور غلاموں نے اُف نہ کی اور کرتے تو کس طرح توپوں کے دہانے اور پھانسی کے پھندے سامنے تھے۔ لوگوں کے دل پر کیا گذر رہی تھی اس کا اندازہ آپ ایک جلے ہوئے دل کی آہ یا ٹوٹے ہوئے تاروں کے اس نغمے سے کر سکیں گے۔

نہ کسی کے آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں | جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا کوئی میرا سنکے کریگا کیا | میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں
میں رہوں کہاں میں بسوں کہاں نہ یہ مجھسے خوش نہ وہ مجھسے خوش | میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں میں فلک کے دل کا غبار ہوں
مرا رنگ وروپ بگڑ گیا، مرا بخت مجھسے بچھڑ گیا | جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں

اس زمانے (۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۶ء) میں اخبارات کے علاوہ دوسری کتابوں میں بہت کم کیا بلکہ تقریباً سیاسی تحریریں ملتی ہی نہیں اس لئے مجبوراً بعض اخبارات سے ہی چند تحریریں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے مارچ میں یعنی غدر سے قبل یہ خبر شائع ہوئی ہے

"اعلان شاہ ایران کی کئی کاپیاں گلیوں اور سڑکوں کے نکڑ پر چسپاں ہیں اس اعلان کی ایک نقل ہمارے ایک معزز دوست نے کرلی ہے جو جامع مسجد کی پشت پر چسپاں ہے .... مختصراً اس کا حاصل یہ ہے کہ:-

"جو لوگ مذہب حق کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ عیسائیوں کی مدد نہ کریں۔ ...... اور ہم مسلمانوں کی مدد کریں وہ وقت قریب آرہا ہے کہ ما بدولت (شاہ ایران) تختِ ہند پر متمکن ہوں گے اور رعایا کو اتنا ہی خوشحال بنادیں گے جتنا کہ انگریزوں نے مفلوک الحال بنادیا ہے اور ہم کسی کے مذہب میں مداخلت نہ کریں گے۔"

ایڈیٹر نے اس خبر پر ایک نوٹ بھی لکھا ہے:-

"ہندوستانی تو صرف اس وقت خوش ہوں گے جبکہ شاہ ایران شاہ عباس صفی کی طرح ہمارے خاص بادشاہ کو سلطنت دیدیں اور تعجب نہیں جو وہ ایسا کریں کیونکہ خود تیمور نے ایرانیوں کو سلطنت بخشی تھی اور نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی احسان کے بدلے شاہ عباس صفی نے ہمارے ہمایوں کی مدد کی تھی۔"

صادق الاخبار ۱۹ مارچ ۱۸۵۷ء

مندرجہ بالا خبر اور نوٹ سے یہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی عام آبادی کے جذبات

کیا تھے اور ان میں کس حد تک سیاسی شعور پیدا ہو چلا تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد ایک اخبار میں شائع ہوا ہے:۔

"امیر نے یہ سن کر کہا کہ جب گورنمنٹ (ہند) پر کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ لوگ لاکھوں پونڈ صرف کر دیتے ہیں اور اب جبکہ ایرانی روسیوں کی تحریک پر افغانستان پر چڑھائی کر رہے اور محض گورنمنٹ ہند کو دق کرنے کی نیت رکھتے ہیں تو گورنر جنرل نے ...
... امیر (افغانستان) کے عہد و پیمان پر غور کیا ہے کہ وہ قائم رکھنے کے قابل ہیں یا نہیں:"

غدر ۱۸۵۷ء تک اردو پریس نے کافی تنقیدیں کی ہیں سیاسی خبریں شائع کی ہیں اور سیاسی و معاشی معاملات پر آزادانہ رائے زنی کی ہے، مگر جب ان باتوں کی روک تھام کے لئے پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا تو ان کا لب و لہجہ بدل گیا اور اب ان کا موضوع سخن اشاعت علوم مغربی، تعلیم کی خوبیاں بیان کرنا، یہ کہنا کہ ہمارے فضل و ہنر کی نسبت پڑھنا ہو گیا تھا۔ اور اس سے جو فرصت ملتی تو امراء اور نوابین کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے۔ انگریز حاکموں کی مدح و ثنا کی جاتی۔

اسی زمانے میں سر سید احمد خاں مرحوم ریفارمر بنے اور سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ رسالہ اسباب بغاوت لکھ کر چھپوایا مگر ۵۰۰ نسخے ممبران پارلیمنٹ کو بھیجدیئے اور ایک گورنر جنرل کو تاکہ بغاوت پھیلانے کے جرم میں پکڑے نہ جائیں۔ انہوں نے حکومت اور ملک کو تلقین کی کہ ہندوستانیوں سے ملیں اور ان کے خیالات، جذبات اور کیریکٹر کو سمجھیں۔

۱۸۶۸ تا ۱۸۷۰ تقریباً دس سال تک اخبارات نے خاموشی اختیار کرنے کے بعد ۱۸۶۸ء سے پھر ہلکی تنقیدیں لکھنی شروع کیں اگرچہ احتساب اب بھی شدید تھا اور لکھنے والے ڈر ڈر کر اظہار خیال کرتے تھے۔ سر سید کی تعلیمی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ بعض کتابوں میں بھی معاشی سیاسی اور تعلیمی مسائل پر کبھی کبھی تھوڑی جرأت کر کے اظہار خیال کیا گیا۔ انگریز عہدے داروں کے اسول حکومت پر تنقید کی گئی اور ان سے خواہش کی گئی کہ ہندوستانیوں سے مساویانہ تعلقات پیدا کریں۔

"غلط فہمی حاکم و محکوم کو عملداری انگریزی کے نامطبوع کرنے میں بڑا دخل ہے۔ حکام اوائل عمر سے عموماً ولائت میں تعلیم پاتے ہیں۔ وہاں کی رسم و رواج و قید و ضوابط و عادات و خیالوں سے واقف ہوتے ہیں اور انھیں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی عادات اور ان کی عقائد سے انکو بخوبی علم نہیں ہوتا۔ انکی ساری کارروائی انہی اصولوں اور خیالات پر مبنی ہوتی ہے جو انھوں نے اوائل عمر سے اپنے وطن میں کسب کئے ہیں...... اور اس امر کے خواہاں ہوتے ہیں کہ ہندوستانی بھی انہی اصولوں پر چلیں۔" اکمل الاخبار ۲۹ جولائی ۱۸۶۶ء

اس دور میں غالب کے روزنامچے میں جس کے ٹکڑے اخبارات میں بھی شائع ہوئے حسب ذیل عبارتیں ملتی ہیں۔ اگرچہ شاعروں کی طرح وہ بھی صرف اپنے حزن و ملال ہی کا اظہار کرسکے ہیں تاہم ان میں اصلی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

"اس چرخ کج رفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک، مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک (درد) اور تو یہاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا" روزنامچہ غالب صہ ۳۲

ایک دوسری جگہ شہر کی حالت بیان کرتے ہیں اور جو سختی آنے جانے والوں پر تھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔

"رہنا شہر میں بے حصول۔ اجازت حاکم احتمال ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو لونہ ہوا اگر خبر ہو جائے تو البتہ قیامت ہے۔ دلی کی عملداری میرٹھ، آگرہ اور بلاد شرقیہ کے مثل نہیں ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے میں ہو وہ ویسا کرے۔"
روزنامچہ صہ ۴۳

ایک جگہ بہت لطیف پیرایہ میں انگریزی حکومت کی او روزانہ کی زندگی پر اشارہ کرتے ہیں۔

"سنتے ہیں کہ نومبر کی ساتویں تاریخ ۹ اور ۱ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہی ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دے رکھا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضہ قدرت میں رکھا آدمی کو بدنام کیا۔" صہ ۳۲

آپ نے ملاحظہ کیا کتنے عمدہ پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ میر تقی میر نے ایک شعر میں شاید خدا اور قضا کے متعلق نہیں بلکہ ہماری سرکار کی اس پالیسی کے متعلق یہ فرمایا ہے:۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی ۔ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

۱۸۶۵ء کے بعد ملک میں سیاسی جذبات اور قومی احساسات بیدار ہونے لگے۔ انکم ٹیکس کے خلاف جذبات کا ریلا خوب زوروں پر آبلا۔ بجٹ پر بھی اردو اخبارات میں خوب خوب بحثیں ہوئیں۔ ہندوستانیوں کے خون کے قصاص کا مسئلہ بھی زیر بحث رہا۔ سوامی دیانند سرسوتی، اور سر سید احمد خاں کی تحریکیں چلیں اور ان مباحث نے اردو ادب پر بھی اثر ڈالا۔ انکم ٹیکس کے مسئلہ پر ایک اخبار نے لکھا:۔

"۱۴ مئی ۱۸۶۹ء کے اجلاس کلکتہ میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے انکم ٹیکس کی نسبت ایک سال سے زیادہ جاری رہنے کے نسبت اہل فرنگ کی مانند گرفت کی ہے۔ پس ہم (ہندوستانی) بھی بایں لحاظ انگریزوں کے مثل ہیں کہ جو محصول اپنے ذمے ہم خود تجویز نہ کریں اس کو ہم اپنے ذمے قائم رکھنا پسند نہیں کرتے۔" اکمل الاخبار ۲۸ مئی ۱۸۶۹ء

دربار دہلی کے موقع پر نواب مردان علی خاں صاحب نے ایک بیان پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا۔ جس کا نام ہند کے مطالبات ہے۔

ہند کے مطالبات

"سرکار کمپنی تاجر تھی مگر اب شاہنشاہی دور ہے اس لئے برتاؤ بھی شہنشاہی ہونا چاہیئے۔ یہ دربار کھیل تماشے کیلئے نہیں ہوا ہے۔ اس لئے ہمارے ان مطالبات کو منظور کیا جائے۔

(۱) جے پور کو نصف سانبھر واپس ملے۔

(۲) مارواڑ کو نصف سانبھر اور علاقہ تالاب امرکوٹ و گھر امٹر واڑہ واپس ہوں

(۳) گوالیار کو قلعہ گوالیار واپس کر دیا جائے۔

(۴) اودے پور کو علاقہ گنگا پور وغیرہ علاوہ نیمچ کے ملے۔

(۵) نظام کو برار دیدیا جائے۔

(اس کے بعد حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔)

عہد سابق دیسی ارکان کے کام اور انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ سرحدیں مستحکم تھیں رعایا خوشحال تھی اور صرف تیس کروڑ آمدنی تھی۔ دس لاکھ فوج تھی اور اس پر بھی شاہی خزانے معمور، عجب کہ اب ۳۵ کروڑ آمدنی ہے اور صرف دو لاکھ ساٹھ ہزار فوج اور سرکار پر باوجود اجرائے نوٹ کے ازحد قرض...... ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

سالانہ بجٹ خوب بنتا ہے مگر جب بچت نہیں تو لفافہ ہے بارک اسٹری کمسریٹ اور مہم وغیرہ میں کروڑوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ یہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔ سرکار ایسی لکھ لٹ ہے کہ پنڈورہ کی لوٹ بھی اس نے مات کردی۔ کوہ نور ۱۲/۱۱/۱۸۸۶ء

ان حالات کے زمانے میں سرسید کیا لکھ رہے تھے وہ تہذیب الاخلاق سے پیش کیا جائیگا مگر دو تین تحریروں کو اور ملاحظہ کیجئے۔

یہ مصیبت کس کے آگے روئیں کہ انگریزی عملداری نے ہماری دولت و ثروت، رسم و رواج، لباس وضع، تجارت، مذہب، علم و ہنر، تہذیب و عزت، طور، طریقہ سب چیزوں پر تو پانی پھیر ہی تھا ایک زبان تھی اب اس کا بھی یہ حال ہے کہ انگریزوں نے عجز واقفیت کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی، غلط، نامربوط اردو بولنی شروع کی اور ادھر ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر است۔ ہمارے بھائی بند بھی لگے اسکی تقلید کرنے۔ ابن الوقت ص۴

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے اس زمانے میں بہت کچھ لکھا مگر انہوں نے یا تو معاشرتی ناول لکھے یا انگریزوں کے حکم کے مطابق قانون فوجداری کا ترجمہ کیا۔ البتہ اسی زمانے میں شبلی، سجاد حسین وغیرہ نے سیاسی مباحث پر قلم اٹھایا۔ شبلی نے بہت سی تاریخی کتابیں لکھیں اور نظمیں بھی کہیں جس سے ہیں

یہ احساس ہونے لگا کہ ہم کیا تھے۔ کیا ہو گئے اور اب کیا کریں۔ سجاد حسین مرحوم نے اس دور میں سب سے بڑا کام کیا ان کا اخبار اودھ پنچ مذاق ہی مذاق میں معاشی، سیاسی اور تمدنی معاملات پر سب کچھ کہہ جاتا تھا انھوں نے حکومت پر بھی تنقید کی۔ ہمارے لیڈروں کو بھی ٹوکا اور ہماری غفلت اور بے حسی پر ہمیں بھی ڈانٹا۔ ان کی کوششوں سے اور انکی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ سیاسی، معاشی معاملات پر قلم اٹھانے لگے اودھ پنچ نے چار بہت مشہور لکھنے والے پیدا کئے سید محمد آزاد۔ احمد علی شوق۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور مرحوم اکبر الہ آبادی۔ ان کے علاوہ شرر بھی اسی زمانے سے لکھنے لگے تھے۔ اگرچہ اودھ پنچ تھا تو ادبی اخبار مگر اس نے سیاسی بیداری میں بہت کام کیا۔ ولائت سے واپسی کے بعد سر سید نے جہاں تعلیم پر بہت زور دیا تھا وہاں وہ سب ہندوستانیوں کو تہذیب اور معاشرت میں بھی انگریز بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس مسئلے میں انکی مخالفت بہت شدید کی گئی اور وہ ناکام ہوئے۔ اودھ پنچ چونکہ مزاحیہ اخبار تھا اس لئے اسے بہت آسانی تھی کہ سیاسی مباحث پر مذاق میں جو چاہے لکھے۔ انگریزوں کی دماغی حالت اور انکی پالیسی پر مضمون ذیل میں جو تبصرہ ہے اُسے ملاحظہ کیجئے۔

مسٹر اودھ پنچ کی اقلیدس

حدود

(۱) عہد نامہ ایک ایسی تحریر ہے جو ہر وقت ٹوٹ سکتی ہے

(۲) سول سروس وہ میوہ ہے جو سفید رنگ کے لئے مخصوص ہے

(۳) والیسرائے ایک بڑا عہدہ دار ہے جو شاعری کے شلے پر قیام رکھتا ہو اور بدر چاچ کے جواب میں موقع بے موقع اسپیچ بصورت اسپنج کہتا ہو۔

(۴) جسکا سر چھوٹا اور کم وزن ہو وہ دیسی ہے۔

(۵) اس قطعے (اودھ) میں جس شخص کے پاس علاقہ ہو (خواہ چھوٹا یا بڑا) اور اسکی توقیر نہ ہو تو اسے تعلقہ دار کہتے ہیں۔

(۶) تخفیف ایک نشیب ہے جس میں سرکار بآسانی گر پڑتی ہے۔

اصولِ موضوعہ

(۱) ہر ٹیکس ہر جگہ جاری ہو سکتا ہے۔

(۲) ہر صوبہ ہر ملک ضبط کیا جا سکتا ہے۔

(۳) دیسیوں کو خوش کرنے کیلئے زبانی وعدے شاہی اشتہارات میں درج ہو سکتے ہیں۔

علوم متعارفہ

(۱) دیسی باوجود تعلیم کے دیسی ہے

(۲) اگر یورپ میں نقصان ہو تو ہندوستان میں تخفیف کی جائے۔

(۳) دیسیوں کی ہر بات قابل مضحکہ ہے۔

دعویٰ

(۱) دیسیوں کو باوجود ذی علم اور لائق ہونے کے ذلیل کرو۔

(۲) دیسی صرف تباہ و برباد کئے جانے کیلئے پیدا ہوا ہے۔

عمل

(۱) ایک قاعدہ ایسا مقرر کرو کہ ۱۹ برس سے زیادہ عمر کے لوگ سول سروس کے امتحان میں شریک نہیں ہو سکتے۔

(۲) دیسیوں کو سول سروس میں کوئی عہدہ نہ دو۔

(۳) دیسی جو رائے دے اس کی حقارت کے ساتھ ہنسی اڑاؤ۔" (انتخاب اودھ پنچ ص ۱۳۲ تا ۱۳۵ ملخصاً؛ (اودھ پنچ ۲۲ اگست ۱۸۷۷ء)

ہماری شاعری میں ابھی تک سیاسی رجحانات بہت کم تھے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے ایک نئی راہ نکالی تھی مگر انکا فلسفہ طنز ہے۔ وہ رجعت پسند تھے اور قدامت کے بڑے دلدادہ و علمبردار۔ انکا طنز صرف مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا پڑا ہے اور اگر زیادہ گہری نظر اور غور و فکر سے ان کی

شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ صنعتی زندگی یا حرفتی دور کے بہت بڑے مخالف تھے اور انکی شاعری سماجی تحریک کی نزعی ہچکیاں کہی جا سکتی ہے۔ اکبر اپنی تہذیب و تمدن کے مٹنے پر مرثیئے کہتے تھے۔ ماتم کرتے تھے لیکن قومیت کی تباہی انھیں محسوس بھی نہ ہوتی تھی۔ حالی اور آزاد نے بھی غزل کے مختصر میدان کو چھوڑ کر نظم کے وسیع، طویل اور ناپیدا کنار صحرا میں شبدیز قلم کو تگ و پو کے لئے چھوڑ دیا

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل (غالب) کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

آزاد کو سیاسی شعور نہ تھا اور آخر عمر میں ان کی دماغی حالت بھی خراب ہو گئی تھی ورنہ ممکن تھا کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ بھی کچھ کہتے۔ حالی کی مسدس اس زمانے کی بے مثل چیز ہے اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی قومی نظمیں کہی ہیں۔

اس عصر میں بہت سے معاشی مسائل پر نظمیں کہی گئی ہیں اور ابنائے ملک کو تجارت صنعت و حرفت کی تباہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو جو صنعت و حرفت کے متعلق کہی گئی ہے۔ شاعر کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

دل ساکنانِ ہند سے کیونکر خفا نہ ہو	افسوس یاں تو صنعت و حرفت ذرا نہو
ہر شخص کو وہاں کے یہی دھن ہے رات دن	ممکن ہے کوئی بات نئی ڈھونڈتا نہ ہو
طاقت ہے یورپینوں کی شے ہو نہیں لطیف	ممکن ہے ہند کی کوئی شے بدنما نہو
تشبیہ انکی دیتا ہوں اس جانور سے میں	آنکھیں تو کھل رہی ہوں ولے دیکھتا نہو
اعضا ترے درست ہوں پھر لوٹڑی بنے	اے بے حجاب تجھکو ذرا بھی حیا نہ ہو
گر یہی حالتیں دل وحشی تری رہیں	کیا جانے کیا ہو، دیکھیئے کیا جانے کیا نہو
مشکل وہ کونسی ہے جو آساں نہو کبھی	افسوس دل سے چاہو اگر تم تو کیا نہو

بلبل بھی نالہ سنتے ہی بیدار ہو گئی
اے بے خبر، خبر تجھے مطلق ذرا نہ ہو

سرسید نے انگلستان سے واپسی پر بڑے زور و شور سے تعلیمی تحریک شروع کی اور اسی سلسلے میں اخبار بھی نکالا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے سفر نے ان کی نظروں میں خیرگی اور چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ ہندوستان آکر جو تاریکی کا سامنا ہوا تو ہوش ...... اڑ گئے۔ علی گڈھ کالج قائم کیا تو ان کی کوشش یہ تھی کہ آکسفورڈ اور کیمبرج بنا دیں بلکہ ان کے اختیار میں ہوتا اور ان کا بس چلتا تو ہندوستان کو انگلستان بنا دیتے۔ تھے وہ بڑے دھن کے پکے اور قدرت نے ان کو بہت ذہین بنایا تھا۔ مقبول بھی تھے۔ اس لیے اٹھے اور سارے ملک پر چھا گئے۔ مگر ان کی راہ نمائی غلط راہ کی طرف تھی اس لیے مسلمانوں نے جہاں انکی تعلیمی تحریک سے منافع حاصل کئے وہاں سیاسی دنیا میں نقصان بھی اٹھائے۔ شروع شروع میں انھوں نے سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جیسا کہ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے۔

> مجھے یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات مٹ نہ جائیں اور ان کو حکومت کے قانون میں دخل ہو۔ اسوقت تک دونوں قوموں (انگریز و ہندوستانی) کے درمیان اصلی دوستانہ تعلقات قائم نہ ہوں گے۔ زندگی، سوشل، خوشی و موافقت پولٹیکل ہمسری سے ہی، ایک قانون کے زیر حکم رہنے سے اور یکساں عدالتوں کے تابع رہنے سے پیدا ہوتی ہے ...... اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یورپین ہوں یا یوریشین، اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور ان کے پولٹیکل حقوق یا کانسٹی ٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیئے۔" (تہذیب الاخلاق)

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام مسٹر ہیوم اور چند دیگر لبرل انگریزوں کی کوشش سے ہوا تو سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے اسباب کیا تھے۔ چند باتیں تو بہت روشن ہیں اور باقی کچھ پس پردہ۔

سب سے پہلا سبب یہ تھا کہ سرسید کی دوستی ان انگریزوں سے تھی جو کنسرویٹو (قدامت پسند)

خیال کے تھے اور وہ ہندوستانیوں میں ذرا سا سیاسی شعور بھی اپنے مفاد کے لئے مضر سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے سرسید کو ذریعہ بنایا۔ دوسری بات سرسید کو یہ سمجھائی گئی کہ ہندو تعلیم اور تجارت میں بہت ترقی حاصل کر چکے ہیں اور اگر سیاسی مسائل میں مسلمان ان کے ساتھ ساتھ چلے تو تعلیمی کمزوری کی بنا پر وہ ہندوؤں کے غلام بنجائیں گے۔ یہ سبب ذرا معقول بھی کہا جا سکتا ہے تیسرا سبب یہ بھی تھا کہ سرسید قائد تھے سپاہی بننا انھیں نہ آتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس کی بہت سخت مخالفت کی اور مسلمانوں کو سیاسی میدان سے واپس ہٹایا۔ اس سے چند نقصان ہوئے۔

۱۔ ملکی سیاسیات سے علیحدگی اختیار کرنے سے مسلمانوں کی سیاسی بصیرت سے محرومی۔

۲۔ انگریزوں کی مرضی کے مطابق ہندو اور مسلمان قوموں میں افتراق وعناد کی پیدائش۔

۳۔ اُردو اور ہندی کے جھگڑے کی ترقی جس سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور جس کی تلافی ابتک نہ ہوسکی۔ بلکہ اب اور بھی شدت ہوگئی ہے اور جھگڑے کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

۱۸۸۳ء میں مسٹر بیک علی گڈھ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تشریف لائے اور انکا اتنا شدید اثر سرسید پر پڑا کہ رسالہ اسباب بغاوت ہند کا مصنف اور مندرجہ بالا تحریر لکھنے والا جو انگریزوں سے ہمسری و برابری کا داعی تھا اپنے مقام سے ہٹ کر پستی کی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس کے ثبوت میں چند ٹکڑے ان کی تحریر و تقریر سے زیب قرطاس ہیں۔

"ہر شخص جانتا ہے کہ ترکوں کے آگے یونانیوں کی کیا حقیقت ہے اگر وہ مقابلہ پر آجائیں تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہے اسی طرح یونانیوں کو ترک ماریں گے۔ اندیشہ تو یہ تھا کہ یونانیوں کو ترکوں سے مقابلہ کی جرات کیونکر ہوئی اور اسی لئے یہ خیال ہوتا تھا کہ در پردہ کوئی بڑی طاقت یونانیوں کی مدد پر ہے اس شبہ کو مسٹر گلیڈ اسٹون (سابق وزیر اعظم برطانیہ) کی نامعقول تقریروں اور ٹیلی گراموں نے زیادہ قوی کر دیا تھا مگر ہر سمجھدار سمجھ سکتا ہے کہ گلیڈ اسٹون حکومت پر نہیں ہے اور نہ وہ قلیل ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ کا

گورنمنٹ پر اثر پڑ سکتا ہے۔" (آخری مضامین سرسید صہ ۶)

مندرجۂ بالا تحریر تو ان کی آخری تحریروں میں سے ہے اس سے قبل کی حالت کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے کیجئے۔:-

"آپ نے جو کچھ ذکر ان خدمتوں کا کیا ہے جو میں نے گورنمنٹ کی کیں۔ میں آپ کی اس قدردانی کا ممنون ہوں لیکن آپ (طلبائے لاہور) اس بات کو یاد رکھئے کہ مجھ سے اگر کوئی اچھی خدمت۔ یا وفاداری گورنمنٹ کی ہوئی تو وہ بالکل میں نے اپنے مذہب کی پیروی کی ہے میں اپنے خدا اور رسول جن کا میں ماننے والا ہوں اور جن پر میں یقین رکھتا ہوں۔ یہی حکم سمجھتا ہوں کہ جس حاکم کی امن میں رہیں اس کی اطاعت کریں۔ پس میں نے جو کچھ کیا اپنے خدا اور رسول کی اطاعت کی۔ بیشک میں نے گورنمنٹ کی اطاعت کی ہے مگر اس کا اصلی سبب وہی تھا۔ تمام ہندو اور مسلمان اس کو یاد رکھیں کہ رعیت کا کام ہے کہ جس حاکم کی اطاعت میں ہوں اور اس کے امن میں ہوں اس کی اطاعت کریں۔" (مجموعہ لکچر صہ ۲۰۶)

اس سے زیادہ تکلیف دہ اور افسوسناک روش کانگریس کی مخالفت اور ہندوؤں کی مخالفت میں تھی۔ انکی ایک عبارت حالی نے نقل کی ہے۔:-

"ہندو، اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر میں مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔" (حیات جاوید صہ ۱۴۲)

اس کے علاوہ مندرجۂ ذیل سطور ملاحظہ کرنے پر انکی دماغی حالت اور قلبی تکلیف کا زیادہ صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ کانگریس اور بنگالی ہندو کی مخالفت نے اب جنون کی شکل اختیار کر لی تھی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ برٹش گورنمنٹ کی حکومت میں تمام چیزیں اچھی ہیں۔ .... اسوقت سلطان روم جو مسلمان شہنشاہ ہیں .... انکی مسلمان رعایا کو ان سے کچھ شکایات ہیں .... کوئی سلطنت ایسی نہیں ہے کہ تمام لوگ اس سے راضی ہوں اگر ہم کو بھی انگریزی گورنمنٹ سے کچھ شکایت ہے تو نئی بات نہیں خدا کی گورنمنٹ میں بھی

تو لوگ اس کا شکریہ نہیں ادا کرتے ۔ میں نہیں کہتا کہ گورنمنٹ سے کچھ نہ مانگو ....
مگر وہ جو وہ تم کو دے سکتی ہو .... اگر تم ایسی چیز مانگتے ہو جو وہ نہیں دے سکتی
تو گورنمنٹ کا قصور نہیں بلکہ مانگنے والے کی بیوقوفی ہے اور جو کچھ مانگو اس طرح پر نہیں
کہ گورنمنٹ کے تمام کاموں کو ظالمانہ کہو .... اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دار کو دشنام
دہی ...... جس قدر سخت و نا ملائم الفاظ ہوں وہ لارڈ لٹن اور لارڈ ڈفرن کے حق
میں ادا کرو اور تمام انگریزوں کو ظالم بتاؤ ۔ اور اسی مضمون سے اخباروں کے کالم
کے کالم سیاہ کر دو ۔ ان باتوں سے کچھ نہیں مل سکتا ۔ تمھارے اوپر خدا نے انھیں
حاکم کر دیا ہے ۔ یہ خدا کی مرضی ہے ۔ ہمیں خدا کی مرضی پر شاکر رہنا چاہیئے ۔ اور خدا کے
حکم کی اطاعت کر کے ان کا (انگریزوں کا) وفادار اور دوست رہنا چاہیئے ۔ نہ کہ ان پر
بیجا الزامات لگائیں اور دشمنی پیدا کریں ۔ نہ یہ عقلمندی کا کام ہے اور نہ ہمارے پاک
مذہب کی ہدایت ہے ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولیٹیکل شور و
غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں
اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں ۔ پس ہم کو اپنی قوم کی تعلیم کی کوشش کرنی
چاہیئے ۔ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹہ میں ہم کو تباہ کر دیں ۔
اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے ۔ بیرونی پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا
ہے جو تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے وہ انہی کے پاس رہنے دو کیونکہ ہم سے
دوکان پر بیٹھ کر آٹا دال نہ بیچا جائے گا ۔ نہ سوت کپاس ۔ ہمارے ملک کی پیداوار کی
تجارت جو انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وہ ان سے چھیننے کی کوشش کرو ۔ ان سے کہدو
کہ اب آپ تکلیف نہ کریں ہم خود اپنا چمڑا انگلستان جانوروں کی ہڈی امریکہ اور روئی و غلہ
یورپ پہنچا دیں گے یہ کبھی مت خیال کرو کہ گورنمنٹ تمھاری اس تجارت میں ہرج ڈالے
گی ۔ مگر یہ سب باتیں حاصل ہونا تعلیم کی ترقی پر موقوف ہیں ۔" (مجموعہ لکچر سر سید ص ۲۶۲)

آپ نے دیکھا کہ آپ کا ماحول کیونکر بدلا جا رہا ہے۔ آپ کے ادب میں کس چیز کا اضافہ کیا جا رہا ہے؟ کون سے سیاسی رجحانات پیدا کئے جا رہے ہیں۔ سرسید کی اس تحریک مخالفت نے ملکی ادب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ادب کا کام اتحاد و اتفاق نہیں بلکہ منافرت و نفاق پھیلانا ہو گیا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوؤں سے منافرت پیدا کی جانے لگی۔ غلامی پر خوش ہونے کی تلقین کی جانے لگی مگر سجاد حسین اور ان کے ساتھیوں نے اودھ پنچ کے ذریعے سے اور سرسید کے بعض مخالفین نے دوسرے اخباروں کے ذریعے سے ایک متحدہ محاذ جنگ قائم کر کے، ایک نیا اور مضبوط مورچہ بنا کر اس کے خلاف جنگ کی اور ان کی تحریر و تقریر کا رد کیا۔ جس سے ایک حد تک ملکی ادب اور اردو ادب نے ایک نئی کروٹ لی اور ملکی تحریک نے پھر سنبھالا لیا۔ ہماری شاعری اس دور میں کس حالت سے گذر رہی تھی اس کے اندازے کے لئے چند نظموں اور مختلف شعروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ کسی نامعلوم الاسم شاعر نے کہا ہے

اے ساکنانِ خطۂ ہندوستاں بڑھو — آگے نکل رہے ہیں بہت کارواں بڑھو

تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو — کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو

بیٹھے ہو پاؤں ادڑ کے کیوں کنج غم میں تم — دیکھو ذرا نشیب و فراز جہاں بڑھو

ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہے — چلا رہا ہے طوطیِ ہندوستاں بڑھو

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے اس زمانے میں ایک نئے طرز کی ابتدا کی اور غزل کی تنگنائی چھوڑ کر نظم کے وسیع میدان میں آ کر سیاسی۔ معاشی اور تمدنی مسائل پر روشنی ڈالی۔ ہندوستانی عورت کی ناگفتہ بہ حالت پر سب سے پہلے قلم اٹھایا اور ان کو پستی سے نکالنے کی کوشش کی۔ بیوہ کی مناجات اور دیگر پرجوش۔ سادہ اور اصلیت کے مطابق نظمیں لکھیں۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

اے ماؤ بہنو بیٹیو — دنیا کی زینت تم سے ہے

ملکوں کی بستی ہو تمھیں — قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو — عفت کی تم تدبیر ہو

گھٹی میں ہے مہر و رضا — انسان عبارت تم سے ہے

ایک اور مقام پر ہندوستانی عورت سے اس طرح کلام کرتے ہیں۔

جو سنگ دل سفاک پیاسے تھے تمہارے خون کے ۔۔۔ ان کی تو بے رحمیاں مشہور عالم ہیں مگر

تم نے تو جن اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ ۔۔۔ شوہر ہوں آپس یا پدر یا ہوں برادر یا پسر

گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے ۔۔۔ وہ نیک ہوں یا کہ بد سب متفق اس رائے پر

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں ۔۔۔ آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر

تم اس طرح مجہول و گمنام دنیا میں رہو ۔۔۔ ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمہاری کچھ خبر

ان کی سب سے مشہور نظم مسدس حالی ہے جو ۱۸۷۹ء میں لکھی گئی۔ یہ مسدس مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان ہے اور بڑی پُردرد۔ اس کتاب نے ہماری شاعری پر بے انتہا اثر ڈالا حقیقت یہ ہے کہ ادب میں سب سے زیادہ موثر شئے شعر ہے۔ قوموں کی تباہی اور ترقی میں شاعری کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہماری شاعری چونکہ بالکل فارسی شاعری کا چربہ ہے۔ اور فارسی شاعری کو مغلیہ سلطنت کے آخری تاجداروں کی عیاشی اور عیش کوشی نے حقیقت اور جذبات سے دور کرکے صرف استعارات وتشبیہات سے بھر دیا تھا۔ کیونکہ ہر طرف بزم نشاط و محفل رقص، شراب و ساقی، کے جھگڑے رہتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ رزمیہ مثنویاں، زوردار قصائد۔ کے بجائے غزل ہی غزل رہ گئی تھی۔ ہم نے فارسی شعرا کی تقلید کی اور جلوۂ یار و مئے ناب کے سوا کچھ نہ نظر آیا۔ یہ قصے تھے دلچسپ لہذا رنج وغم، کے ماحول میں اسی سے دلبستگی حاصل کی اور آج تک ہماری فطرت پر وہ اثر باقی ہے۔ جب جلوۂ یار اور مئے ناب میں کمی ہونی شروع ہوئی تو استعارات وتشبیہات کے گورکھ دھندے اور صنائع و بدائع کے طلسمات پیش نظر رہنے لگے۔ اس سے دل اکتایا تو پھر راجہ اندر اور انکی پریاں۔ عجائبات کا پٹارہ لئے سامنے موجود۔ غرضکہ جب تک حکومت تباہ نہیں ہوئی یہ حال رہا اس کے بعد ہم تھے اور غلامی کی لعنت سامنے، اب مصائب کے سمندر کی لہریں اژدہے بن کر نگلنے کو موجود نتیجہ یہ ہوا کہ عیاشوں اور بزدلوں کی عادت کے مطابق آہ و نالے پر کمر باندھی۔ اپنا آشیاں برباد کر چکے تھے صیاد کے کاشانے کو فریاد کے دھویں سے اڑانا چاہا۔ اس میں ناکامیابی پر غم غلط کرنے کے لئے۔ بے خودی اور مستی کی

عادت بادۂ انگوری سے ڈالی تب حکومت بالکل [illegible] ٹھوکریں کھانے لگے
تو پایا نشہ ذرا کم ہوا مگر پھر خمار کی انگڑائیوں نے [illegible]
برداشت کرنے تب آنکھیں کھلیں کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چلی [illegible]
زوال آنکھوں کے سامنے آیا کچھ نے اس کو اب بھی خواب سمجھا [illegible]
اور جھٹ پٹ اٹھے کمر باندھ کر میدان میں ڈٹے۔ ان کے [illegible] اور [illegible]
تھے۔ مصائب کے سمندر سے ساحل مراد تک پہنچنے کے لئے ان دونوں نے [illegible]
اکبر نے بھی ساتھ دینے کی کوشش کی۔ ایک آدھ بار چپو ہاتھ میں لیا اور کشتی کو کھینے کی کوشش کی
مگر وہ بہت جلد تھک گئے اور دھارے کی تیزی نے کشتی کو دوسری طرف پھیر دیا۔

حالی کی مسدس سے چند ٹکڑے نذر ہیں۔ ممکن ہے کہ [illegible] اس بیان کی تائید ہو سکے

بیڑا ایک گرداب میں پھنس رہا ہے ــ پڑا پیچھے ہٹتا ہے جو کھویں [illegible]
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے ــ کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خندہ زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو ــ کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو ــ نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے (مسدس حالی)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:-

رئیسوں کی جاگیرداروں کی دولت ــ فقیہوں کی دانشوروں کی فضیلت
بزرگوں کی اور واعظوں کی نصیحت ــ ادیبوں کی اور شاعروں کی فصاحت
جنچے تب کچھ آنکھوں میں اہل وطن کی ــ جو کام آئے بہبودی تن کی

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت — جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت — نہ شخصی بزرگی نہ شخصی حکومت

وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہوگی جڑ اس گلستاں میں جس کی (مسدس حالی)

ایک نظم میں مادر وطن سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ تباہی کا سبب افتراق وعناد ہے۔ افتراق پیدا کرنے والے کون ہیں یہ بھی بتلا دیا۔ مرض کی تشخیص صحیح اور نسخہ کے بعد بھی اگر ہم علاج نہ کریں تو الزام طبیب پر کیوں دیا جائے۔

اے مقدس آریہ ورت آئی کیا تجھ پہ بلا — جس نے بزم یکدلی کو تیری برہم کر دیا
کوچ کر جاتا نہ گر تجھ سے وفاق اتحاد — کون تھا جو تیری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا
تو کہاں اور اہل مغرب کے بھلا حملے کہاں — ہاں مگر نا اتفاقی کی ملی تجھکو سزا

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

جنگ وخونریزی کے خود آکر ہوئے وہ رہنما — ورنہ فتنے کا قدم یاں تک کبھی آیا نہ تھا
یک بیک آیا خلل امن واماں میں ہر طرف — اک تنزل پڑ گیا ہندوستاں میں ہر طرف

اب اکبر مرحوم کے چند شعر سنئے تباہی سے بچنے کی تدبیر بتاتے ہیں:-

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو — باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

ہونی ہے نصیب تلخ کامی تم کو — محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو
اغیار نہیں بنا سکتے تم کو غلام — ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

ہمارے بعض غزل گو شعرا کے یہاں بھی کچھ کچھ نئے اشارات ملتے ہیں مصائب پر افسردگی اور

رونا تو پرانا شیوہ تھا مگر اب حقیقت کی آمیزش نے اثر کو بڑھا دیا ہے۔ ان اشعار سے جہاں دل کی کرب و تکلیف کا پتہ چلتا ہے وہاں کچھ کچھ خواہش نجات بھی آچلی ہے۔

اور کچھ باتیں کر دلے ہمصفیرانِ چمن ‏ ‏ ‏ یہ نہ پوچھو کیوں قفس میں مجھکو آرام آگیا

نگاہِ یاس سے ہے آئینۂ غمِ فردا ‏ ‏ ‏ نظر کے سامنے ساماں ہیں قیامت کے

مری ضد میں چمن کو بجلیوں نے خاک کر ڈالا ‏ ‏ ‏ کہاں سے کنج میں پھولوں کی طرح آشیاں رکھدے

یہ گمراہی یہ خود آگہی اچھی نہیں اے دل ‏ ‏ ‏ کسی وادی میں کھو جا اور اپنی جستجو کر لے

تمام رات ستاروں نے مجھکو سمجھایا ‏ ‏ ‏ کہ فکر کر کوئی دنیا نئی بسانے کی

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب ‏ ‏ ‏ موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

(باقی)

ڈاکٹر انصاری اور فن مصوری

(جناب عبداللہ صاحب ایم اے لیکچرار مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج علی گڈھ۔)

میرے لئے یہ صبح نئی دلی کی پہلی صبح تھی۔ سردیوں کے دن تھے اور گرم گرم دھوپ ایک سردیوں سے اکڑی ہوئی دنیا کے بند ڈھیلے کررہی تھی۔ کناٹ پلیس میں زرد زرد دھوپ کا سیلاب آگیا تھا۔ میرے ارد گرد چمکتی ہوئی سنہری دھوپ کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو معلوم ہوتا کہ زرد چمکیلی لہروں پر بہتا ہوا چلا جارہا ہوں میرے بدن کا ہر مسام اس پیاسے مسافر کی طرح تھا جو گنگا کے کنارے پہنچ کر ایک گھونٹ میں ہی دریا کی وسعت کو ختم کردینا چاہتا ہے۔ اس آتش سیال کی تلچھٹ تک پی جانا چاہتا ہے۔ میرے ارد گرد ایک تمدن تھا جس کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ تھی۔ ایک تہذیب تھی جس میں ایک قدم کی لغزش موت کا پیام لئے ہوئے تھی۔

اس ماحول میں میرے دل میں کچھ غیر معمولی تمنائیں تڑپ رہی تھیں۔ کوئی نامعلوم خواہش میرے دل میں ایک ہلکا ہلکا درد، ایک چبھن ایک ناقابل اظہار بےچینی تھی شاید میں اپنے آپ کو اس نئے ماحول سے ہم آہنگ نہیں کرسکا۔۔۔ عجب مجھے الف لیلہ کے مشہور قالین پر اچانک ایک چھکڑے اور پیادہ پا رفتار پر چلنے والے تمدن سے اس قدر سرعت کی رفتار کے تمدن میں منتقل کرنے سے ذہنی یا نفسی صدمہ ہوا۔ میں نے ایک مرتبہ ایک کمہار کو لاری میں دیکھا تھا۔ اگرچہ موٹر کی رفتار اس کے گدھے سے زیادہ تیز تھی اور اس میں وہ دلچسپ ٹھوکے بھی نہ تھے جو گدھا اپنے سوار کو ہر قدم پر دیے جاتا ہے۔ تاہم کمہار کا سر چکرا رہا تھا اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اس بھوپوں گاڑی کی تیز رفتاری کی تاب نہ لاسکتا تھا۔

شاید میری بے چینی ..... جسمانی نہیں تھی۔ میں اس تہذیب جدید کے جزیرے میں جو فلاکت اور ناداری کے سمندر میں اپنی چمکیلی سنگ مرمر جیسی دودھیا سفید عمارتوں سے برفیلی چوٹیوں کا نظارہ پیش کر رہا تھا اور گرد و نواح کے تاریخی ماحول میں مطابقت پیدا نہ کر سکا میں ایک تاریخی شہر میں تھا۔ وہ جگہ جہاں انسان کے تخیل نے پتھر اور اینٹ کو احساس حسن کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا۔ جہاں کے رہنے والوں کے ہاتھ میں سنگ موسیٰ اور مرمر موم بن گئے۔ جن کے ہاتھوں نے چونے اور گارے میں زندگی کی سوتیں دوڑا دیں میرے ایک جانب ایک سڑک دور تک چمکیلے فیتے کی طرح پھیلتی چلی گئی تھی۔ جہاں جامع مسجد دہلی کے انڈوں جیسی سفیدی والے گنبد آسمان کی طرف جھک رہے تھے دوسری جانب سنٹرل ایشیا کے نوادر کا عجائب خانہ اور اس کی بیٹھواں سنگین عمارت اس کو دیکھ کر میرے دل میں وہی خوف پیدا ہوا تھا جو ایک انقلابی کو پیرس کا بدنام آفاق قید خانہ Bastille دیکھ کر ہوتا ہوگا۔ ایک وہ دن تھا جب بابر نے ان ہندی صناعوں کی دلکش طور کی تعریف کی تھی جو انھوں نے مرکزی ایشیا کی دلھن یعنی بخارا کی جامع مسجد بنانے میں استعمال کی تھیں اور ہندوستان کے زندہ دل اور صاحب مذاق فاتح کو اعتراف تھا کہ ہندوستان کے صناعوں اور کاریگروں کی چابک دستی نے اس کے وطن کی تزئین اور خوبصورتی میں کتنا حصہ لیا۔ آج ہم نے بابر کی فتح کا تاریخی انتقام لے لیا یعنی اس کے وطن کے نوادر کو بدصورتی اور بدنمائی کے شاہکار میں محبوس کر دیا۔

میرے ایک طرف بہت دور صبح کے دھند میں قطب مینار نظر آ رہا تھا۔ صبح کے دھند نے مینار کے نچلے حصے کو چھپا دیا تھا۔ اور قطب مینار کسی آسمانی شہر کے مینار کی مانند نظر آ رہا تھا۔ یا ایک آتشیں گیند جس کو کسی جناتی ہاتھ نے آسمان سے نیچے لٹکا دیا ہو۔ وہ مینار جس پر کسی زمانے میں انسان نے اللہ کا نام بلند کیا۔۔ وہ عمارت جس نے فن تعمیر کی

دلفریب سطور میں ہند و مسلم اتحاد کو ازلی نقش دیدیا۔ وہ زمانہ جس کے ذریعہ انسان نے دکھادیا کہ وہ اللہ کی عنایت کی ہوئی قوتوں سے کس قدر بلند تعمیر کر سکتا ہے۔ اور اس بلندی سے اس عالمگیر ہستی کی برتری اور عبودیت کا اعتراف کرتا ہے۔

میرے دوسری جانب باب الفتح یا گیٹ آف وکٹری تھا جس کا بھدا طرز مجھے ہمیشہ کسی دیہاتی گرجا کے بلفری کی تصویر یاد دلا دیتا ہے۔

پچھلے دنوں جب ایک مشہور انگریز ماہر فن تعمیر نے مغل دہلی اور انگریزی دہلی کا موازنہ کیا تھا تو اسے زمانہ جدید کی یادگار مغلیہ عمارتوں کے مقابلے میں ایک طفلانہ کوشش اور وقت کو مٹانے والی ہیبت ناک قوت کے خلاف اک بے مایہ اور کمزور چیز نظر آئی۔ جہاں مغلیہ دہلی ایک باوقار ملکہ کی مانند ہے جس کے خد و خال میں جس کی لباس کی ہم آہنگی میں حسن و توازن کی ازلی دلکشی موجود ہے وہاں نئی دہلی موجودہ زمانے کی اڑتی ہوئی تتلی ہے جس کے رنگ شام کے بادلوں کی طرح ہر لحہ نئی جھلک دکھاتے ہوں میرا دل بے چین تھا مجھے اس سطحی زندگی سے، مجھے اس سطحی تمدن سے مجھے اس سطحی فن تعمیر سے جو روح کی بجائے جسم کو۔ جو تخیلات کی بجائے محسوسات کو مطمح نظر بنائے ہوئے تھا۔ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرا دل اس ازلی اور ابدی حقیقت کے لئے تڑپ رہا تھا جس کے حسن کی جھلک تاج محل کے پتھر کی بولتی ہوئی رگوں میں نظر آتی ہے۔ میرا دل فضائے بسیط اور وقت کی تنگ وادیوں سے چھٹ کر کسی ایسی دنیا کو چاہتا تھا جہاں اہل دنیا کے یہ فلسفیانہ اصول بچوں کے کھلونے ہوگئے ہوں، جہاں وقت کے دریا کا برق صفت بہاؤ ہمالیہ کے گلیشیر کی طرح منجمد ہو کے رہ گیا ہو۔ جہاں فاصلہ کو مسجد کے قالین کی طرح لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔

بعض اوقات دل اک غیر محسوس طریق پر آنے والے واقعات کا ترجمان ہوجاتا ہے اور فاؤسٹ کے جادوگر کے اس متحرک گنبد کی طرح آنے والی امیدوں اور خوف

کو شیشے کے دھندلکے میں واضح کر دیتا ہے۔ اس جامِ جم کی طرح جس کی سطور و نقوش میں آئندہ کے واقعات حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو میری نگاہوں کے مقابل ایک اشتہار لگا تھا" فنون لطیفہ کی سالانہ نمائش" معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیر معلوم طاقت کسی پوشیدہ مقناطیسی قوت نے۔ مجھے یہاں کھینچ کر لا ڈالا ہے۔ جہاں میرا بے چین دل۔ میری پھڑ پھڑاتی۔ روح سکون حاصل کر سکتی ہے۔

میں اوپر چلا گیا۔ یہ ہندوستانی آرٹ کی نمائش تھی۔ وہ آرٹ جس کا رنگین تخیل میرے سامنے اکبر کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ جب وہ ایک کمہار کے بچے کو جو کوئلہ سے محل کی دیوار پر لکیریں کھینچ رہا تھا مشہور شاہی نقاش استاد عبدالصمد کے سپرد کر دیتا ہے اور یہی بچہ بڑا ہو کر جہانگیر کے دربار کی زندگی کو آئندہ نسلوں کے لئے کاغذ اور رنگ کے ذریعہ حیات دوام دیتا ہے۔ مغل آرٹ! وہ مغل آرٹ جس میں بولتا چالتا۔ جیتا جاگتا کاغذ مغل دربار، شکار، رقص و سرود، رنگینیٔ چمن، محفل برسات کی خاموش فلم دکھاتا ہے وہ فلم جس کا ہر manner ایک ماہر فن کا شاہکار تھا۔

مگر یہ نمائش ہندوستان کے فن جدید کا مظاہرہ تھی۔ جس میں ایک طرف تو ہندو تخیل بنگالی اسکول کے دلکش رنگوں اور روحانی لحاظ سے متکلم سطور میں پیش کیا گیا تھا۔ کہیں مہاتما بدھ ایک خوابیدہ انداز میں فضا کو گیان اور دھیان سے معمور کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف عمر خیام ٹھیٹھ ہندوستانی پس منظر اور لباس میں داد عیش دے رہے تھے۔ بہر حال پوری نمائش نمونہ تھی زندگی کے اس تنوع اور رنگ برنگی کا جس کا نظارہ ہم ہندوستان کے دیہاتی میلوں میں پاتے ہیں۔ جہاں گہرے رنگوں کا طوفان ہوتا ہے۔ جہاں ہر دیہاتی نازنین کے سر پر قوس قزح پھولی ہوتی ہے۔ جہاں ایک جانب مذہبی تقدس بھبوت رمائے موجود ہے تو دوسری جانب مادی زندگی کی دلچسپ رنگینیاں

بھی اسی تصویر کا ضروری پس منظر مہیا کر دیتی ہیں، اور خود مصور بھی زندگی کے متحرک اور متنوع البم کا دلچسپ شاہکار تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، قدرے پریشان بال، اک عجب اندازِ استغنا اک عجب ادائے بے توجہی۔ اس کی طرز۔ چال ڈھال میں عجب دلکش غیر ہم آہنگی اور بے ترتیبی تھی۔

نمائش میں کئی ایک اسکول کے انداز کی چیزیں موجود تھیں۔ مذہبی۔ رومانی۔ جذباتی۔ میری نگاہ کے ساتھ ساتھ مصور کی چھلکتی ہوئی تنقید بھی تصویروں پر سے گذرتی جا رہی تھی۔ یہ مس شیر گل کا کام ہے اس میں جدید اصولوں کے مطابق جزئیات نہیں دکھائے جاتے۔ دیکھنے والے کا فرض ہے کہ اس قسم کا غیر ضروری عنصر خود مہیا کرے۔ یہ مصور کے ایک شاگرد کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ مصور کا اپنا مجموعہ ہے، عید کا چاند، مرقدِ عاشق۔ درگاہ کا نظارہ، مگر سب سے دلچسپ تصویر اک اندھی ماں کی تھی جس کو اس کی کمزور بچی لاٹھی سے پکڑے لئے جا رہی تھی ان کے پیچھے اک طوفان چلا آرہا تھا۔ خوفناک بادل آسمان پر چھٹ رہے تھے۔ دور دور تک چرند و پرند کا نام و نشان نہ تھا۔ اب بھی میں جب آنکھیں بند کر کے اس کا تصور کرتا ہوں تو ہزار شور میں بھی میرے دل کی گہرائیوں میں وہ سکوت و خاموشی چھا جاتی ہے۔ جو اس تصویر کی فضا کی روح تھی۔ اور اس خوفناک سکوت میں فطرت کی اس ڈراؤنی گود نہیں

بلکہ جنگل میں ہندوستان کی یہ مظلوم بیٹی خدا معلوم کہاں چلی جا رہی تھی۔ دور، دور، بہت دور افق سے پرے شاید وہ کسی ایسے جہان کی تلاش میں نکلی تھی جہاں کے باشندے دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی کھاتے ہوں گے۔ جہاں محبت اور انسانی ہمدردی کا ابلتا ہوا چشمہ زمین کو سیراب کرتا ہوگا۔ جب میں اور مصور تصویروں کو دیکھ کر لوٹے تو ایک مرتبہ مصور پھر اس تصویر کے سامنے رک گیا۔ اس کا دل جذبات سے پُر تھا۔ اور اس کی زبان ان خیالات کی ترجمانی سے قاصر تھی۔ کہنے لگا کہ بس میرے لئے تو اگر کوئی تصویر ہے تو یہی ہے۔ دیکھو یہ تصویر میرے ملک کی صحیح تصویر ہے۔ تم اس میں اک کمزور عورت دیکھ رہے ہو نہیں

نہیں میرے لئے یہ مادر وطن ہے، بھارت ماتا اپنی انتہائی غربت، انتہائی افلاس، انتہائی بیکسی میں، بھارت ماتا جس کی بیٹی اس کی نئی نسل ہے۔ وہ بھارت ماتا جسے خود پتہ نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

میں رخصت ہونے کو ہی تھا

کہ دفعتاً اس نے مجھ سے پوچھا آپ کو معلوم ہے ہماری تصویروں پر بہترین تنقید کس نے کی؟ مجھے اس کا جواب سننے کا بے حد اشتیاق تھا۔ ہندوستانی اور دوسرے اداروں میں اکثر رائے لکھنے کے لئے ایک کتاب رکھی ہوتی ہے جس میں لوگ اپنے تاثرات کو لکھ جاتے ہیں۔ گویا ادارے کے ارباب اختیار صرف زبانی تعریف کو ہی شہد کے گھونٹ بنا کر نہیں پیتے بلکہ چاہتے ہیں کہ ان ذہنی تاثرات کی بھی ایک تصویر لے رکھیں۔ اور شاید ان کو یہ بھی ڈر ہے کہ اس زمانے میں آرٹ کی ابدی اپیل کے لئے بھی لوگ حسب ضرورت عارضی نظریہ رکھتے ہیں، اور جب اس کیف رنگ و بو سے دور ہو جائینگے تو شاید وہ اپنی رائے بدل ڈالیں گے۔ بہرحال کچھ بھی ہو میں ایک امریکن سیاح کا لطیفہ نہیں بھولتا جو اس نے شانتی نیکن کے ارباب مہمان خانہ سے کیا۔ مہمان خانے کے مہتمم نے چلتے وقت ان کے سامنے رائے بک پیش کر دی۔ امریکن سیاح نے قلم اٹھایا۔ اور بعینہٖ اسی جنبش اور گھماؤ سے گویا نپولین کسی سپاہی کو جرنیل کا عہدہ عطا کر رہا ہے۔ لکھ دیا۔ O.K.

کچھ اسی قسم کی لمبی کاپی اس نمائش گاہ میں بھی موجود تھی۔ اور چونکہ منصور کی نقاشی کے تخیلی پہلو اور سرمئی قلم کے کام نے ان کے سٹڈیو کو چار چاند لگا دئے تھے ان کے ہاں بھی شانتی نکیتن کی طرح مشہور و معروف اکابرین کی کوئی کمی نہ تھی۔ پہلے ہی لارڈ ریڈنگ کا نام نظر آیا۔ وہ نام جو اگر کسی ہندوستانی راجہ کی کتاب پر لکھا جاتا تو شاید ہیرے جواہرات میں جڑوا کر عبادت کے لئے رکھ لیا جاتا۔ اس کے بعد کئی وائسرائے

الٹ پلٹ کر دے گئے۔

کہیں کہیں نام جھلک جاتے تھے۔ اروِن۔ ولنگڈن۔ لارڈ تھلون۔ مگر واہ رے آرٹسٹ۔ تمہارے فنا فی الفن ہونے کا کیا کہنا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو ایک ایک نام پر، گھنٹوں قصیدہ خوانی کرتا۔ اور اس معزز ہستی کی آمد کے جزئیات کو بیان کرتا۔ فلاں لارڈ اس تصویر کے سامنے یوں جھکے۔ انہوں نے غور سے دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں اتنے ملی میٹر بند کرلیں۔ انہوں نے ازراہ خوشنودی اتنے دانت دکھائے۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لئے تمام رجسٹر مردہ کی کتاب Book of the dead. تھی جو قدیم مصری دفینوں میں مردوں کے ساتھ بند کر دیتے تھے۔ اس کی نگاہ میں یہ بلند پایہ دستخط کرنے والے محض اس نا سمجھ بچے کی طرح تھے جو ایک خوبصورت گڑیا کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

آخر کار اس کے چہرے پر کامیابی کی روشنی چمکی۔ ایک سکوت آمیز تبسم کے ساتھ اس نے کتاب کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا یہ رہا! نقاش خود۔ اس فرطِ عقیدت سے لبریز اس جوش سے کیف اندوز ہو رہا تھا جس سے وہ الفاظ جھلک رہے تھے۔ اس کا چہرہ اک جذبۂ افتخار سے تمتما اٹھا اور وہ والہانہ جوش سے پکار اٹھا۔ دیکھو زندہ دل یوں داد دیا کرتے ہیں! میں نے جھک کر دیکھا تو ڈاکٹر صاحب کے مخصوص انداز میں لکھا تھا۔

I have & really lived through these brief moments.

معلوم ہوتا ہے قدرت نے ڈاکٹر انصاری کو آرٹسٹ کا دل و دماغ دیا تھا یہ کیف آور الفاظ ایک ایسی ہستی کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس نے اس رنگین دنیا کے حسن کو ایک زندہ دل شاعر کی نگاہ سے دیکھا ہو۔

آرٹسٹ کے دل میں ان الفاظ کو پڑھ کر پھر ایک جوش اٹھا۔ کہنے لگا "سچ بتاؤ ایسی اچھی، تنقید بھی کبھی دیکھی، ہم ڈاکٹر صاحب کی صفات کہاں تک گنائیں، ڈاکٹر صاحب ہمارے بڑے

مربی تھے۔ انھوں نے محض الفاظ سے ہی ہماری ہمت نہیں بڑھائی بلکہ عملاً بھی اس کا اکثر ثبوت دیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے آدمی تھے۔ بڑے اور بہت بڑے۔ نہ صرف خود اونچے تھے بلکہ اوروں کو اونچا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اک مقناطیس تھے جس سے ناقص لوہا بھی لگ کر جاذبیت پیدا کر لیتا ہے۔ وہ سماج اور فن کی دنیا کے مہکتے ہوئے پھول تھے جن کی صحبت میں گلِ ناچیز بھی مشک و عنبر کا ہم پایہ ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب خود آرٹ کے قدردان تھے اور ان کے دل سے چنگاریاں اُڑ، اُڑ کر دوسرے دلوں میں بھی یہ آگ لگا سکتی تھیں۔

ایک مرتبہ مصور نے ولایت میں تاج محل کی تصویر تیار کی۔ یہ اس کا پہلا مقبول شاہکار تھا۔ ایک نمائش کے موقعہ پر ملکہ میری نے اس کو بے پسند کیا اور خاص اپنے لئے خرید لیا۔ ہندوستان پہنچکر مصور نے اس کی ایک نقل تیار کی مگر یہاں قدردان کہاں! دن اور ہفتے انتظار میں گزر گئے۔ اتنے میں ایک دن ڈاکٹر انصاری آپہونچے۔ کہنے لگے اچھی چیز ہے دیکھا جائے گا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب مہارانی ٹراونکور کا علاج کر رہے تھے ایک تو تصویر اچھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا پر اثر بیان اور تعریفی کلمات۔ اسی دوران میں کہیں آپ نے نواب بھوپال سے بھی ذکر کر دیا۔ اب ایک چیز کے دو خریدار پیدا ہو گئے اور دونوں منہ مانگی قیمت دینے والے شاید مصور کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس کی تصویر کی اصل نہیں بلکہ نقل کیلئے، دو خریدار پیدا ہو گئے

مصور جوش میں خدا جانے کیا کہتا چلا گیا۔ مگر میرے کانوں نے اس سے زیادہ نہ سنا۔

اس کمرے کی دھندلی روشنی میں یہاں دو بجے ہرے بھرے سے مزار پر چاند کی روشنی میں رات کی ساکن فضا کو معصوم گیتوں سے مرتعش کر رہے تھے۔ جہاں مہاتما بدھ اپنی معنی خیز مسکراہٹ سے وزیٹر کو اک مشفقانہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ اس کمرے کی معنی خیز خموشی میں جہاں جذبات واحساسات کا طوفان بپا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی روح موجود ہے اور مجھے اور مصور کو ایک شان کبریانہ سے تک رہی ہے۔

مزارِ رہنما

از جناب مجاز بی اے (علیگ)

یہ چند اشعار میں نے اپنے مخلص دوست ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی تحریک پر ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مزار کے لئے قلمبند کئے تھے۔ (مجاز)

سنیں اربابِ دل، اہلِ نظر بھی
نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی

مریضِ عشق بھی اور چارہ گر بھی
رہِ الفت کا سالک بھی خضر بھی

خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں
خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی

سکونِ دہر، تقدیسِ کلیسا
گدازِ امتِ خیر البشر بھی

یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گذر بھی

دنیا

(جناب خواجہ محمد شفیع صاحب، دہلی)

بعد مغرب، دن بھر کے بچھڑے ہوئے ستارے صحن فلک پر جمع ہوئے اور مغل بھی نماز مغرب ادا کر یکجا ہو بیٹھے۔ طراغے۔ قبیلہ کا خان دوران گفتگو میں بولا۔ "رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر چاہتا ہوں"۔ سب غور سے سننے لگے۔ خان نے کہا "دیکھتا کیا ہوں کہ ایک نورانی چہرہ والے عرب نے مجھے شمشیر برہنہ دی، جب میں نے چلائی تو اس میں سے شعلے نکلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے تلوار گلاب پاش سے بدل گئی اور اس کی پھوار دور دور پہنچی" یہ خواب سن کر سب کی رائے ہوئی کہ شیخ شمس الدین سے تعبیر لی جائے۔ قبیلہ کے چند معمر اور وجیہ افراد شیخ کے پاس گئے اور خواب بیان کیا۔ جواب ملا۔ "فرزند ارجمند مبارک ہو جس کی تلوار دنیا کو کفر اور بت پرستی کی آلودگی سے پاک کر کے ایمان پھیلائے گی۔ اور اس کی اولاد و احفاد اقصائے عالم میں پھیلے گی۔

امیر طراغے اپنی بیوی کو وضع حمل کے بعد شیخ کی خدمت اقدس میں قدم بوسی کے واسطے لیکر حاضر ہوا ہے وہ سر تیسویں سورۃ تلاوت فرما رہے ہیں۔ امیر کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا اور فرمایا۔ "ہم نے تمہارے لڑکے کا نام تمر رکھا"

مکتب فطرت کا بہترین شاگرد کتاب حیات کے سات ورق گردان چکا اور مکتب میں بیٹھا ہے۔ استاد نے شاگردوں سے سوال کیا کہ بہترین نشست کونسی ہے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔ اب نظریں تیمور پر ہیں۔ وہ کھڑا ہوا اور بولا۔ "بیٹھنے کا بہترین طریقہ دو زانو ہے، چونکہ ہمارے رسول نے نماز میں اسی طرح بیٹھنے کو فرمایا ہے۔

ہفت اقلیم پر فتح پانے والا سپاہی جنگ زیست کی سات رتیں سر کر چکا ہے۔ سپہ سالار بنا ایک ٹیلہ پر کھڑا ہم مکتبوں کو دو ٹولیوں میں تقسیم کر کے لڑا رہا ہے۔ جس فریق کو کمزور پاتا ہے اسے

کمک پہنچاتا ہے۔

آواز :۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات - پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔

ببازی اگر نیز آہنگ بود　　عدیش زد بہیم و اورنگ بود

بآئینِ فرماں دہی داشت میل　　شدندے برش کودکاں خیل خیل

شدہ کودکے برسپاہش امیر　　یکے نصب گشتے برسم وزیر

تیمور سولہ سال کا ہے اور اپنے باپ کے ساتھ خانقاہ کی طرف جا رہا ہے۔ خدا پرست خانۂ خدا میں جا بیٹھے۔ باپ نے بیٹے سے کہا "جانِ پدر ہمارے آبا و اجداد نسلاً بعد نسلٍ چغتائی اور برلاس قبیلے کے سپہ سالار رہے ہیں۔ آج تک میں حسبِ دستور اس کام کو انجام دیتا رہا حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم مجاز میری نظر میں فریبِ نظر ہے۔ اس قلزمِ فنا کی خوش آئندہ۔ خواب آور۔ اور مہلک لہروں میں پھنس کر مینائے[۵] مقصود کو فراموش کرنا نہیں چاہتا۔ چاہتا ہوں کہ اس عالمِ آب و گل سے پالودہ دامن نکل جاؤں۔ اب یہ منصب بسلسلہ نسب تمہیں پہنچا ہے مبارک ہو۔ میں دست بردار ہوتا ہوں۔ یہ گاؤں اور یہ خانقاہ میرا لگایا ہوا باغ ہے۔ اب تم اس کی آبیاری کرنا۔ خاندان کی آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔ ہمارے خاندان کا سلسلہ طومونا خاں Tumanah khan تک پہنچا ہے اور ان کا سلسلہ Japhet بن نوح سے جا ملتا ہے۔ اس خاندان کا شخص اول جو مشرف بہ اسلام ہوا۔ قراچار نویان Karachar Nuyan تھا۔ عقل بالغ اور وجدان سلیم سے بہرہ ور تھا اسلام لایا اور قبیلے والوں سے کہا "بھائیو میں اپنے گرد و پیش ایک عالم دیکھتا ہوں لیکن فراست سے سمجھتا ہوں کہ اور بھی عالم ہیں۔ اسی طرح وجدان سلیم یقین دلاتا ہے کہ خالق جزو کل قادر مطلق ذات واحد ہے۔ جب اس عالم فانی کو اس نے برگزیدہ فرمایا اپنا پیر تو اسی پر ڈالا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نائب بنا کر بھیجا اور ان کے نائب خلفا ہیں۔

---

[۵] بندگاہ

بیٹا اپنے جدِ اعلیٰ کا یہ قول میرے لئے باعث تسلی و تشفی ہے اور میں نے صدق دل سے اسلام قبول کیا ہے۔ تم کو وصیت کرتا ہوں کہ۔

اوّل تو:- اسلام پر اعتقاد واثق رکھنا۔ صراطِ مستقیم سے نہ ڈگمگانا۔ علما و فقرا کی عزت کرنا۔ درویشوں سے طالب دعا رہنا۔ سادات کی خدمت کرنا اور خلق خدا پر ترحم۔

دویم:- تبلیغ اسلام کرنا۔

سویم:- اپنے کو خادم خدا سمجھنا۔ قضا و قدر پر ایمان رکھنا۔ حکم قضا سے برافروختہ خاطر نہ ہونا۔ خدمت خلق خدا لازم سمجھنا۔

چہارم:- دوستوں کے ساتھ تلطف اعزا کے ساتھ التفات سے پیش آنا۔ ظلم و تعدّی سے احتراز کرنا۔ قبائے انصاف زیب بر۔ تین دن سے زیادہ کسی کو قید نہ رکھنا۔ بند محبت سے پابند کرنا۔ بری صحبت سے بچنا۔ رعایا پر لطف و کرم کرنا۔ ورنہ اقتدار کھو بیٹھو گے۔

جب باپ یہ سب نصیحتیں کر چکا بیٹے نے قبلہ رو بیٹھ اُنپر کاربند ہونے کا تہیّہ کیا۔

مرد میدان مرد خدا کے سامنے آتا ہے۔ دنیوی تاجدار مخدوم روزگار صاحب خدمت کے دربار میں حاضر ہے۔ معتقدین اور اہل حال و قال حضرت امیر کلال کو گھیرے بیٹھے ہیں اور تیمور صفِ نعال میں حاضر ہے۔ دُرِ دریائے معرفت کی نگہ گوہر شناس گوہر یکتائے تاج سروری و دُردانۂ طرۂ خسروی تیمور پر پڑتی ہے۔ صاحب کشف و کرامت بیک نظر حقیقت حال کو سمجھ جاتے ہیں۔ اپنے پاس بلا کر بٹھاتے اور کہتے ہیں۔ 'یہ لڑکا گو دیکھنے میں چھوٹا ہے لیکن رتبہ میں سب سے بڑا ہے' اتنا کہہ کر قدرے آرام فرماتے ہیں۔ جب بیدار ہوتے ہیں تو خادم کچھ روٹیاں اور مٹھائی پیش کرتا ہے۔ سات روٹیاں اور تھوڑی مٹھائی تیمور کو عطا ہوتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے 'اس میں سے تھوڑا تھوڑا کھا۔ ہفت اقلیم کی سلطنت تیرے لئے ہے' حاضرین محفل تیمور کو بنظر استعجاب دیکھتے ہیں۔

آواز:- بزرگ کردہ اورا فلک نہ بیند خورد عزیز کردہ اورا جہاں ندارد خوار

آج تیمور اور اس کے والدین حضرت امیر کلال کے دربار میں حاضر ہیں۔ اخروٹوں کی ایک ٹوکری حضرت کلال کے سامنے رکھی ہے طراغے کو حکم ہوتا ہے کہ ان کو گن۔ وہ تین سَو ستر نکلتے ہیں ارشاد ہوتا ہے کہ تیمور کی اولاد میں ستر افراد تین سَو سال تک صاحب طبل و نگیں رہیں گے بشرطیکہ تبلیغ اسلام اور آلِ رسول کا احترام کرتے رہیں۔

سر یر آرائے سمائے سروری۔ ماہتاب فلکِ فرماں روائی۔ اٹھارویں منزل میں ہے۔ بیمار ضعیف۔ بیہوشی و نحیف پلنگ پر پڑا ہے۔ اعزا مثل بنات النعش گھیرے ہیں۔ مرگ و زلیست میں کش مکش ہے۔

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں سر بسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے

علاج صدآزار نے آنکھ کھولی۔ انار کے چند دانے کھا بیہوش ہوگیا۔ اقربا رونے لگے۔

گر از من نشانِ مرگ ظاہر شد کہ می بینم عزیزاں را نہانی آستیں بر چشم تر امشب

اطبا سمجھ گئے کہ تیمور[۵۱] موت کے آہنی پنجہ میں ہے۔ تدبیر سے کام لیا لوہے کو آگ دکھائی۔ سابہ اور ابہام کے درمیان داغا۔ بیمار ہوش میں آیا۔ بولا " مجھے بھوک لگی ہے۔ یخنی اور تیماخ لاؤ۔ سیر ہوکر کھایا اور سوگیا۔ پسینہ آیا اور مزاج رو بہ اصلاح۔

تیمور باپ کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ دوران گفتگو میں اپنے آباؤ اجداد کی بابت دریافت کیا۔ باپ نے جواب دیا " ترکوں کی تواریخ میں لکھا ہے کہ ہماری نسل یافث اغلان سے چلتی ہے جن کو ابوالاتراک بھی کہتے ہیں۔ یافث اغلان ترکوں کے تاجدار اول جعفت Tapha r کے بیٹے تھے جب کہ جعفت کا پانچواں لڑکا اولجہ خان Olmez kh. khan تخت نشین ہوا۔ خدائے متعال نے اس کو جڑواں بچے دئے۔ ایک کا نام تاتار اور ایک کا مغل رکھا۔ اولجہ خان نے اپنی زندگی میں

---

[۵۱] تیمور۔ بمعنی فولاد

سلطنت ترکستان ان دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دی۔

تاتار- اور مغل نے با اختیار ہونے کے بعد طریق حقیقت ترک کر دیا اور مذاہب غیر حق پر گام زن ہوئے۔

تاتار کے آٹھ لڑکے تھے جن سے آٹھ اولوس Oulus قبیلوں کا سلسلہ چلا۔ مغل کے نو[9] لڑکے۔ جن سے نو قبیلوں کی بنا پڑی- یہ دونوں جتھے ترکستان کے میدانوں میں اکثر مصروف جنگ رہتے تھے۔

آخرالامر طومنا خاں برسر اقتدار آیا۔ اس کے ہاں کجولی اور قبلائی خاں توام لڑکے ہوئے۔ جب یہ دونوں بھائی جوانی کو پہنچے تو کجولی نے خواب دیکھا کہ اس کے بھائی قبلائی خاں کے سینے سے دو ستارے بلند ہوئے اور غروب ہو گئے۔ بعدہٗ ایک اور ستارہ طلوع ہوا۔ جو آب و تاب میں آفتاب جہاں تاب کا ہم پلہ تھا- یہ خواب بیٹے نے باپ سے بیان کیا۔ اس نے بشارت دی کہ تیرے بھائی کے ہاں تیسری پشت میں با اقبال کام گار و کام راں لڑکا ہوگا۔

کچھ عرصہ بعد طومنا خاں نے خوانین اور بزرگان قوم کو مدعو کیا۔ اس مجمع کے روبرو دونوں بھائی بغل گیر ہوئے اور عہد کیا کہ باہمی جنگ و جدال سے احتراز کریں گے اور یہ قرار پایا کہ خانی کا اعزاز قبلائی خاں کی اولاد میں رہے گا اور کجولی کی اولاد سپہ سالار- اور یہ قول و قرار ایک تختی پر کندہ کر کے محفوظ کیے گئے۔

۷۳۶ھ میں قبلائی خاں کے بڑے بیٹے منغو بہادر Mango-Bahadur کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کے دونوں ہاتھوں میں خون تھا- تیموجے Temuzin نام رکھا۔ انچاس برس کی عمر میں سخت خطروں اور دشواریوں کے بعد یہ لڑکا تخت ترکستان پر متمکن ہوا۔ اسی دن ایک مرد خدا برسر دربار آیا اور اعلان کیا کہ بارگاہ باری تعالیٰ سے چنگیز خاں کا خطاب اور تاجداری ہفت اقلیم تجھے عطا ہوئی ہے۔

چنگیز خاں نے اپنی وفات کے دن صبح کے وقت حکومت ماوراء النہر اپنے بڑے لڑکے

چغتائی خاں کو دی اور قراچار نویان ولد ایزد امجان برلاس Ayzdaumjan Barlas ولد کجولی بہادر کو وزارت اور سپہ سالاری عطا فرمائی قراچار نویان میرے چوتھے اور تمھارے پانچویں جد ہیں بعدہٗ وہ عہد نامہ طلب کیا جو کجولی اور قبلائے خاں کے درمیان ہوا تھا۔ پہلے چغتائی خان نے پڑھا اور پھر قراچار نویان کو دیا اور گورگان (شہریار جلیل القدر) کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

قراچار نویان کو خدا نے لڑکا دیا جس کا نام انجل نویان رکھا۔ قراچار مجوسی کیش تھا جو خدا کا وجود ہر شئے میں مانتے ہیں۔ یہ اعتقاد قراچار کے واسطے باعث تشفی نہ تھا اس وجہ سے اکثر بزرگان دین سے جویائے حق رہتا۔ اس ہی سلسلہ میں کسی مسلمان سے اعتقادات اسلام دریافت کئے اس نے۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ کی تلقین کی۔ قراچار ایمان بالیقین لایا اور وسعت ملک میں دین پھیل گیا۔ پھر انتظام ملک داری کی طرف رجوع ہوا اور سرزمین ایران کو ایلات میں منقسم کر دیا۔ اور کیش کے سرسبز میدانوں کو اپنے قبیلہ برلاس کے لئے مختص کیا۔ پھر ملک گیری کا ارادہ کیا۔ کاشغر۔ بدخشاں۔ اندیجان۔ حصار۔ اور خراسان کو فتح کر اپنا ذاتی تعلقہ بنا لیا۔

جب قراچار نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا تو اس کا خلف الرشید۔ ایلطی قوص Aeltaiquz عہدہٗ سپہ سالاری پر مامور ہوا بعدہٗ جب تمھارے دادا امیر برقل سپہ سالار ہوئے تو قبیلہ میں فساد و عناد کی گرم بازاری تھی اس فضا سے برداشتہ خاطر ہو کر عہدہ سے دست بردار ہوئے۔ ان کے بعد میں قبیلہ کا سردار بنا اکثر درویشوں کی خدمت میں رہتا تھا اور طالب دعا۔ کہ رب کریم مجھے فرزند ارجمند عطا فرمائے۔

میں صحبت مصاحبین خدا میں حاضر تھا کہ ایک نجومی آیا اور کہا کہ "گردشِ کواکب انجم سے یہ بات آشکارا ہے کہ ۷۳۶ھ میں تمھارے صلب سے فاتح عالم پیدا ہوگا۔

آوازہ۔

در احکام ہفت اختر آمد پدید   کہ دنیا بدو دار خواہد کلید

تنقید و تبصرہ

دلی کا سنبھالا | سنتے آئے ہیں اور دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے کہ مرنے والا بیمار مرتے مرتے ایک بار سنبھالا لیتا اور موت کے سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے ایک دفعہ ابھرتا ہے۔ بیماری کی ساری تکلیفیں دور ہو جاتی ہیں اور موت کی سب علامتیں غائب منہ پر رونق اور بدن میں جان سی آ جاتی ہے۔ بےچینی کا تڑپنا سکون سے بدلتا ہے اور کرب آرام سے۔ جو دیکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ بیمار تیماردار دونوں کی آس بندھ جاتی ہے۔ یاس و ناامیدی کے چھائے ہوئے بادل پھٹتے ہیں اور زندگی کا بجھتا ہوا چراغ پھر سے روشن ہو جاتا ہے اسی کو سنبھالا کہتے ہیں مگر سنبھالا لینے والا ابھی سنبھلنے نہیں پاتا کہ دفعۃً صرصرِ فنا کا جھونکا آتا ہے اور ایک جانِ ناتواں کے چراغ کے ساتھ ہزاروں امیدوں کی شمعیں بجھاتا ہوا اس شانِ بےنیازی سے نکل جاتا ہے کہ گویا کہیں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ان کو پروا بھی نہیں ہوتی کہ پسماندوں پر اب کیا گزر رہی۔ وہ روتے رہ جاتے ہیں اور اتنا روتے ہیں کہ ان کا رونا بھی اکثر ایک یادگار بن جاتا ہے۔ ادبی دنیا میں مرنے والوں کی تاریخ اور مرثیے رونے والوں کے رونے ہی کی تصویریں ہوتی ہیں جن کو مرنے والوں کے نام لیوا چھاتی سے لگائے لگائے پھرا کرتے ہیں۔

یہ سانحہ جسے سنبھالا کہنے میں کچھ آدمی ہی کو پیش نہیں آتا بلکہ جس چیز کے لئے استعارۂ حیات و ممات ممکن ہے ادبی دنیا میں وہ بھی سنبھالا لیتا ہے۔ خواہ وہ علم ہو یا ہنر، تہذیب ہو یا تمدن، قوم ہو یا حکومت، شہر ہو یا ولایت اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دلی کا سنبھالا کیا ہوگا۔ اگر نہیں سمجھے تو مجھ سے سنئے۔

دلّی، پرانی دلّی نہیں بلکہ شاہجہاں کی نئی دلّی کبھی سارے ہندوستان کی راج دھانی بلکہ ساری راج دھانیوں کی رانی تھی، دنیا بھر کی خوبیاں اس کی ذات میں جمع تھیں، طاقت و شوکت، تہذیب و تمدن، آن بان کونسی بات تھی جو بدرجۂ کمال اس میں نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے سدا ہے

نام سائیں کا آخر اس کا بھی آخری وقت آیا۔ رفتہ رفتہ دم خم سب رخصت ہوئے ضعف کی بیماری نے زور پکڑا اور نوبت یہاں تک آئی کہ جان پر آن بنی مگر مرتے مرتے اس نے بھی سنبھالا لیا۔ تن مردہ میں جان سی آگئی وہ دم خم تو اب کہاں تھے مگر کچھ کچھ اہل کمال اس میں وہ پیدا ہوئے اور جا بجا نظر آنے لگے جو ایک مدت سے مفقود تھے، اسی دور مختصر کی ایک داستان کا نام دلّی کا سنبھالا ہے۔ دیکھنے والوں نے اس دور کو دیکھا۔ جو دیکھا تھا اولاد کو سنا گئے۔ ان سننے والوں نے اپنی اولاد کو پہنچایا۔ وہی سنی سنائی باتیں ہیں جن کو خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے دلّی کا سنبھالا نام کتاب میں درج کر دیا ہے۔

یہ داستان یا ستان کیا ہے اور لکھنے والے نے کیسی لکھی ہے اس کی تفصیل خود کتاب بتائے گی اجمال اس کا یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں دلی کے آخری دور، اس دور کی سوسائٹی اس کے علم و ہنر فضل و کمال، اخلاق و ادب، طرز ماند و بود، طور معاشرت انداز نشست و برخاست، ناچ رنگ، بولی ٹھولی کی ایک خوبصورت و خوش رنگ تصویر کھینچی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی بہت سی بھولی بسری باتیں اور حکایتیں اس سے یاد آ جاتی ہیں، اور پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپکو کسی اور ہی عالم میں پاتا ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں بہت سی مجلسیں جمائی اور محفلیں سجائی ہیں پلاٹ داستان کا خیالی ہے مگر اشخاص تقریباً سب واقعی۔ نام البتہ کسی کسی کے بدل دئے ہیں وہ بھی بمصلحت، ورنہ کتاب کی بات بات حقیقت واقعی کا آئینہ ہے زبان کتاب کی خاص دلی کی زبان ہے۔ وہ بھی روزمرہ اور محاورات میں ڈوبی ہوئی مگر رواں اور اتنی رواں کہ رکنا، اٹکنا الجھنا جانتی ہی نہیں، انداز بیان سادہ بھی ہے اور رنگین بھی متانت لئے ہوئے بھی اور شوخی میں ڈوبا ہوا بھی مگر ہر رنگ اپنی جگہ پر کھلتا ہوا فنی اصطلاحات بھی جو ادب و انشا پردازی کا ایک لوازمہ ہیں، جا بجا آ جاتی ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ بڑا لطف دیتی ہیں ادب لطیف کے شوقینوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ کتاب کی کتابت میں کہیں کہیں غلطیاں ہیں جو نہ ہونی چاہئے تھیں۔ امید ہے کہ مکتبہ جامعہ ملیہ دوسرے اڈیشن میں صحت کتابت کا زیادہ اہتمام کرے گا۔

"ع"

تین پیسے کی چھوکری (از جناب قاضی عبدالغفار صاحب) داستانِ حسن و ہوس کو قاضی صاحب موصوف جس انتظام اور شرح و بست کے ساتھ بیان کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ کتابِ دل ان کے روبرو کھلی رہتی ہے۔ بادۂ حسن چھلکتی اور اربابِ عشق سے چھیڑ چھاڑ ان کا پرانا مشغلہ ہے۔

قاضی صاحب کی انگلیاں وہ انگلیاں ہیں جنھوں نے صحیفۂ عشق کی برسوں ورق گردانی کی ہے۔ نبض عاشق کو پہچانتے شکنِ جبینِ حسن کو جانتے اور سیہ مست طبع بوالہوس سے پوری طرح واقف ہیں۔

پہلی کہانی خنگ اوہم ہوس رانی کی داستان ہے۔ اس میدان میں مصنف کی طبع چابک دست شہسوارانہ کلیلیں کرتی چلی جاتی ہے۔

استیف۔ گاؤں کا بچھیرا سمندِ حسن کی چالوں سے ناآشنا ملکہ تہیدیرا کی نظر چڑھ جاتا ہے اور انجام کار نذرِ امواج باسفورس ہوتا ہے۔

اس تین پیسے کی چھوکری کے دستِ قدرت میں عنانِ فرسِ قسمت جن چالوں سے آتی ہے وہ اس طبقہ کے پرانے ہتکھنڈے ہیں جن سے مرد آشنا ہوتے ہوئے ناآشنا بنتے اور "ہلاکِ فریبِ مجاز" ہوتے ہیں۔

استیف نوگرفتارِ حسنِ مرد آزما سے دوچار ہوتا ہے تو جو کیفیات دل و دماغ پر طاری ہوتی ہیں ان کا سمجھنا اور بیان کرنا قاضی صاحب کا حق ہے اور حق ادا کرتے ہیں۔

جہاں تک داستان کی زبان کا تعلق ہے خامۂ تنقید سرِ نیاز جھکا کر عرض پرداز ہے کہ قابل مصنف نے اس جانب زیادہ کاوش نہیں کی ورنہ قاضی صاحب جیسے ادیب سے ایسے پیش پا افتادہ سہو ہو جانے قرینِ قیاس نہیں مثلاً صفحہ گیارہ پر فرماتے ہیں کہ "ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اس کو کبھی بھاتا نہ تھا۔ اب وہ منظرِ عام پر تھرکنے کی بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشین حسن فروش بن بیٹھی"۔ ہماری رائے میں اس جملہ میں زبان کا توازن قائم نہیں رہا ایک طرف بھاتا نہ تھا' اور تھرکنے' پر نظر پڑتی ہے دوسری طرف 'منظرِ عام' اور مخصوص خلوتوں میں بلند نشین حسن فروش بن بیٹھی' نظر آتا ہے۔ آگے چل کر صفحہ بارہ پر فرماتے ہیں۔ 'حسین تھیوڈورا اپنی دکانِ حسن کھولتے ہی دلوں

کی مالک۔ آنکھوں کا تارا۔ کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی' اس نقرہ کی آخری تینوں صفتیں یعنی 'آنکھوں کا تارا۔ کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ' زبان میں حسن فروشی معشوق کے لئے نہیں بلکہ اولاد کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی صفحہ پر آگے فرماتے ہیں 'نوجوان شہنشاہ جشینین بارہا اس کو تھیٹر میں ناچتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجوم عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا' جہاں تک ہمارا علم ہے چہل پہل کرنا نہیں بولا جاتا۔

'وہ میرا انتظار کر رہی ہے' کے عنوان سے جو چیز لکھی گئی ہے پرواز تخیل شکوہ زبان اور انداز بیان میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ تاہم کہیں کہیں زبان کی طرف سے 'بے پروائی ظاہر ہوتی ہے مثلاً صفحہ چونتیس پر تین سطروں میں سات جگہ لفظ 'تھی' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تکرار طبع لطیف پر بار ہے۔ ہم قابل مصنف سے نیاز مندانہ درخواست کریں گے کہ اپنے قدر دانوں کی خاطر۔ زبان اردو کی خاطر۔ زبان کی طرف ذرا زیادہ اعتنا فرمایا کریں۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی تحریر ایک گلزار ہے۔ اگر یہ کانٹے نہ ہوں تو بے خار بن جائے۔

'میں' کے عنوان سے جو مضمون ہے اس کی تعریف حدِ امکان سے باہر ہے۔ زبان مرصع ہے ہر لفظ لعل و گہر۔ کیفیات حیات جو غیر محسوس طریقہ پر ہر نوجوان پر طاری ہوتی ہیں ان کا مرقع ہے۔ شہباز تنقید پابوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

قمیص۔ ترجمہ ہے لیکن ترجمہ معلوم نہیں ہوتا صفحہ اکسٹھ پر شرابیوں کی بے ربط گفتگو سہل الممتنع کا نمونہ ہے۔ صفحہ انچاس پر ایک سطر میں چار جگہ لفظ 'تھا' اور ایک جگہ 'تھی' استعمال کیا گیا ہے اور سارے پیراگراف میں جو دس سطروں کا ہے اس لفظ کی تکرار چھبیس جگہ نظر آتی ہے اور مضمون کو نظروں سے گراتی ہے۔

'دیوتاؤں کا صدقہ' چاہ کن را چاہ درپیش کی اچھی مثال ہے۔

'ڈپٹی صاحب کا کتا' اور 'سراغ رساں' پولیس کی ذہنیت اور قابلیت کی مثال کا ایسا نمونہ ہے جو ہندوستان میں دن رات نظر آتا ہے لیکن نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ادیب انہی چیزوں کو پیش

کرتا ہے اور پڑھنے والا کہتا ہے' یہ بھی میرے دل میں ہے'۔

'سزائے موت' کی زبان نہایت عمدہ اور اندازِ بیان بہت سلجھا ہوا ہے۔ لیکن اس قسم کے مضامین عموماً کسی تخیل کے ماتحت لکھے جاتے ہیں۔ یعنی ملک یا قوم کا کوئی قانون یا دستور مدِنظر ہوتا ہے اس کی ہجو یا مدح مدعا۔ لیکن قاضی صاحب کے اس مضمون کا کچھ عقدہ نہیں کھلتا۔ یا تو عنقائے معنی ایسا بعید ہے کہ شاہینِ فہم و فراست کی گرفت میں نہیں آتا یا عنقا ہے۔

'گھوڑا' اُمگور کا تخیل ہے۔ گھوڑا استعارہ ہے اور نفس مدعا کچھ اد طبیعت سزائے موت میں اس ہی مدعا کی تلاش ہے جو نہیں پاتی اور کمی محسوس کرتی ہے۔ قاضی صاحب کے ترجمہ کی یہ خصوصیت ہے کہ مضمون کو کچھ ایسا اپنا لیتے ہیں کہ اپنا بنا لیتے ہیں۔

'نتیجہ برا ہے' میں ماسٹر صاحب کی تصویر مصنف نے ایسی کھینچی ہے کہ گویا آنکھوں کے سامنے لا بٹھایا۔ روزمرہ کی زندگی میں اکثر خاص قدرت کے نمونے نظر آتے ہیں لیکن قاضی صاحب کی نظر درکار ہے جو ان کا اس طرح جائزہ لے لے۔ اس مضمون میں بھی زبان میں ایک چیز نظر آتی ہے جس کو کہتے ہوئے زبان رکتی ہے۔ صفحہ ۱۳۲ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں 'عینک۔ اپنے خانہ کے اندر ملفوف ہو جاتی تھی' ہمارے خیال سے خانہ میں چیز ملفوف نہیں ہوتی۔ داخل ہوتی ہے۔ رکھی جاتی ہے۔ بند کی جاتی ہے۔ 'لف' کے معنی لپٹنے کے ہیں اور خانہ میں چیز لپٹتی نہیں۔

'فریب' ترجمہ ہے اور بہت اچھا ترجمہ ہے۔

'میں اکیلا ہوں' میں فلسفۂ موت و زیست اچھے الفاظ اور اچھے انداز میں لکھا گیا ہے۔

کتاب زیرِ نظر قابلِ قدر ہے۔

"خ۔ م۔ ش"

تاجدار بیوی کا بے تاج شوہر | (از آنریبل سر شیخ عبدالقادر صاحب) افراد کے نام حسنِ ذوق کا نتیجہ ہیں اور نہایت موزوں۔ زبان شستہ ہے۔

تیسری سطر میں شعر انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا ہے اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔

گفتگو کی زبان بولنے والے کے مناسب اور صنف نازک کے مطابق ہے۔ بعض بعض جگہ شہزادی اور ملکہ کی زبان میں توازن لفظی قائم نہیں رہتا۔ لیکن جب ہم بولنے والوں کے کیرکٹر پر غور کرتے ہیں تو یہ عیب نہیں رہتا۔ وہ عورتیں ہیں لیکن سیاست سے وابستہ۔ پس زبان میں بھی دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔

مدبر الملک جو کچھ کہتا ہے نہایت ادب لیکن وثوق کے ساتھ۔

صفحہ ۸۰ پر شہزادی حسن پسند اپنی بھتیجی ملکہ جمیلہ سے شہزادہ غیرت مند کی تعریف کرتی ہے ملکہ جواب میں کہتی ہے "مجھے اس کو دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے"! آگے چل کر شہزادہ غیرت مند اپنے باپ طامع شاہ کے روبرو ملکہ کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے۔ کہ آپ کی لطف آمیز مہمان نوازی۔ واللہ یہ سیر نہ بھولے گی"، ملکہ کی بات زیادہ اور شہزادہ کی قدرے کم مشرقی طبیعت کو اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ قصہ مغرب کا ہے مشرق کا نہیں۔

زبان میں کہیں کہیں معمولی سقم نظر آتے ہیں صفحہ ۱۰۴ پر فرماتے ہیں کہ "از روئے کانسٹی ٹیوشن کے اس کے بعد کے کیا"۔ واللہ اعلم کاتب کی غلطی ہے یا مصنف سے سہو ہوا ہے صفحہ ۱۸۱ پر شہزادہ غیرت مند ملکہ جمیلہ سے کہتا ہے "اس وقت مجھے بے کلی سے ذرا کل آئی ہوئی ہے"۔ اس ضمن میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ مندرجۂ ذیل شعر پر برسر مشاعرہ جو مومن پر اعتراض ہوا تھا اس کی یہاں بھی گنجائش ہے ؎

وہ شوخ گرم گرم جو آکر چلا گیا — وہ بے کلی ہوئی کہ مجھے غش سا آگیا

"وطن آخر وطن ہے"، ترجمہ ہے اور صاف طور پر ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ بہر کیف اس قسم کے افسانوں کی ملک اور قوم کو ضرورت ہے۔

"دل ہی تو ہے" ترجمہ ہے اور بہت اچھا ترجمہ ہے۔

کتاب زیر تبصرہ اچھی ہے اور پڑھنے کے قابل۔

"خ۔ م۔ ش"

یادگارِ محشر | از عبداللہ صاحب محشر مرحوم مرتبہ اشفاق حسین خانصاحب گورکھپوری۔ مطبوعہ آسی پریس گورکھپور۔ سائز چھوٹا صفحات ۸۴۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً اشفاق حسین خانصاحب ہی سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب مسٹر عبداللہ صاحب محشر مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جس کو ان کے دوست اشفاق حسین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ مرحوم سینٹ انڈریوز کالج گورکھپور میں بی اے میں تعلیم پا رہے تھے کہ عین آغاز شباب میں صیاد اجل کی نذر ہو گئے۔ اسی سبب سے ان کا اپنا کلام صرف ۶۲ صفحوں پر مشتمل ہے جو صفحہ ۲۳ سے لیکر صفحہ ۸۴ پر ختم ہو جاتا ہے۔ شروع میں جناب مجنوں گورکھپوری اور دیگر حضرات کے مختصر نوٹ ان کے کلام اور حالات زندگی کے متعلق درج ہیں جن کو مشکل ہی سے تبصرہ یا تنقید کہا جا سکتا ہے۔ کتاب میں مرحوم کی دو تصاویر بھی شامل ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔

مصنف نے باوجود کم سنی کے قریب قریب ہر صنف شعر میں طبع آزمائی ہے لیکن کلام کا بیشتر حصہ غزلوں ہی پر مشتمل ہے جن کی تعداد پچیس تیس سے زائد نہ ہوگی۔ جو پختگی کہنہ مشق شعرا کی خصوصیت ہوتی ہے وہ تو محشر صاحب کے کلام میں نہ ملیگی لیکن ان کے بعض اشعار میں جاذبیت ہے جو کیف و اثر سے خالی نہیں اور جو اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ وہ اگر زندہ رہتے تو آئندہ چل کر ایک خوشگو شاعر ہو جاتے۔ اشعار میں کہیں کہیں جذبات کا سیلاب بھی امڈا نظر آتا ہے اور بعض جگہ دلپذیر و دلفریب تراکیب بھی ملتی ہیں جس سے کلام میں مزید دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ ان کے کلام کے درج کئے جاتے ہیں:-

کس کے حسن شوق افزا کی نمائش کیلئے　　ذرہ ذرہ اس جہاں کا آئینہ بردوش ہے
المدد اے ضبط جاں راز افشا ہو نہ جائے　　اس فضائے صبح میں کوئی سراپا گوش ہے

اللہ رے فریب تماشائے رنگ و بو　　دنیا کو بھی نظر نے پری خانہ کر دیا
مرجع ہے تشنگان مئے عشق کا یہی　　اہل جنوں نے دشت کو میخانہ کر دیا

اف تری زلفوں کا شانوں پر بکھرنا الاماں   حسن کی معصومیت منت کش شانہ نہیں

(ح - ی - ع)

ہندوستان کی کہانی | از عبدالسلام قدوائی ندوی۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ سائز درمیانہ صفحات ۶۷۔ قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک رسالہ ہے جس کو مصنف نے ابتدائی مدارس کے بچوں کے لئے سہل اور آسان زبان میں تحریر کیا ہے۔ اب تک جتنی کتابیں چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اُن میں زیادہ تر افسانوی رنگ جھلکتا ہے۔ اگرچہ یہ رنگ بچوں میں تاریخ جیسے خشک مضمون کا ذوق پیدا کرنے کے خیال سے اختیار کیا گیا ہے لیکن بعض حضرات پر یہ رنگ اس بری طرح غالب ہے کہ انھوں نے ان کتابوں میں من گھڑت اور بے بنیاد قصے بھی لکھ ڈالے ہیں جو تاریخی اعتبار سے ہرگز قابل اعتماد نہیں۔ ا جدید تحقیق نے ان واقعات کو قطعاً بے بنیاد ثابت کر دکھایا ہے مگر لکھنے والے " بلیک ہول " جیسے جھوٹے واقعات کو ابھی تک برابر داخل کتاب کئے جاتے ہیں اور بچوں کو غلط اور فرضی تاریخی واقعات سے روشناس کراتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے جو تاریخی حیثیت سے غیر مستند ہو۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بچوں کے لئے مفید ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے افسانوی رنگ بھی اختیار نہیں کیا ہے بلکہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے لکھا ہے۔

کتاب میں شروع سے لیکر انگریزوں کے زمانہ تک کی تاریخ درج ہے لیکن افسوس ہے کہ مصنف نے بعض چیزوں کو اس قدر اختصار کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ مزید شرح و بسط کی محتاج ہیں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت کی تاریخ ۴۰ صفحوں میں ختم ہوتی ہے لیکن ہندوؤں کے زمانہ کی تاریخ صرف چار صفحوں میں تحریر کی گئی ہے۔ اسی طرح انگریزی عہد حکومت کے بعض واقعات کو بھی بیحد مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے ضرورت ہے ان کو کسی قدر اور پھیلاؤ کے ساتھ تحریر کیا جائے تاکہ کتاب میں توازن قایم رہے اور ہندوستان کے سیاسی اور تاریخی ارتقا کو بچے آسانی سے سمجھ سکیں۔ کتاب کا کاغذ اور چھپائی عمدہ مگر قیمت زیادہ ہے۔

(ح - ی - ع)

تعمیر نو | مصنفہ عبداللہ انور بیگ صاحب۔ مطبوعہ اُردو اکیڈمی پنجاب لاہور۔ قیمت عمہ

عہدِ حاضر میں جبکہ تمام قومیں سیاسی اور اقتصادی تگ و دو میں بازی لے جانے کی فکر میں ہیں، نظام کہن کو شکست کیا جارہا ہے، ہماری سوسائٹی ایک زبردست انقلابی دور سے گذر رہی ہے اور ہر قوم کے لئے مختلف مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ہندوستان بھی بین الاقوامی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن آج بھی ہندوستانی مسلمانوں پر جو کسل و جمود طاری ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان کو ایک شاہراہ عمل دکھلا کر ان میں ہیجان و ولولہ پیدا کیا جائے اور قصر اسلام کی از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔

مسلمان آج ہر جگہ پستی میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں جس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کی روایات کو ترک کر دیا، قرآن پاک جو ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، بجائے اس کے کہ اقوام ہماری تقلید کرتیں ہم ان کے مقلد بن گئے اور اپنے اخلاق حمیدہ کو چھوڑ کر بداخلاقیوں کی دلدل میں جا پھنسے۔ اسلام میں حکومت کی بنیاد جمہوریت پر قائم تھی، ہمارے خود پرست بادشاہوں نے رائے عامہ کی پروا نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی اور اقتصادی کمزوری پیدا ہو گئی۔

مصنف نے کتاب میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب و علل سے اچھی طرح بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ اب ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ انھوں نے زور دیا ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی روایات کو پھر سے زندہ کریں اور قرآن پاک کو علوم جدیدہ کی روشنی میں مطالعہ کریں اور اس کے مطابق عمل کریں کیونکہ عمل ہی زندگی کا دوسرا نام ہے، عمل ہی سے ہم اپنے لئے فردوس تیار کر سکتے ہیں اور عمل ہی سے ہم اپنے آپ کو جہنم میں ڈال سکتے ہیں ورنہ ع "یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے" انہوں نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ موجودہ مادی دور میں سائنس اور مشین سے استفادہ کرنا لازمی ہے کیونکہ دورِ حاضر کی ایجادات سے روگردانی کے معنی یہ ہیں کہ ہم افلاس و بیچارگی میں گھر جائیں۔ مسلمانوں میں

تجارتی ذہنیت کی تربیت کی بھی ضرورت بتلائی ہے کیونکہ صنعت وحرفت اور تجارت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ من حیث الکل عبداللہ انور صاحب کی یہ تصنیف پڑھے جانے کے قابل ہے۔

(ح۔ ی۔ ع)

مطائبات | از سندباد جہازی مطبوعہ اُردو اکادمی پنجاب لاہور۔ چھوٹا سائز قیمت عہ

یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً اخبار احسان لاہور میں سندباد جہازی صاحب کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین سیاسی لطیفوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض صرف پھبتیاں ہیں۔ کتاب مجموعی طور پر اچھی ہے۔ کہیں کہیں لطیف مذاق کی چیزیں بھی نظر آجاتی ہیں جیسے "سرشہاب الدین کی بھینس"، "مصنوعی دل"، اور "علمی ذوق رکھنے والی گائے" وغیرہ۔ کتابت چھپائی معمولی ہے۔ (ح۔ ی۔ ع)

تفسیر جواہر | علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری کی مشہور عربی تفسیر کا اردو ترجمہ جزاول تاسورۂ بقرہ۔ مترجمہ مولانا عبیدالرحمٰن صاحب رحمانی استاد جامعہ عربیہ دارالسلام عمرآباد۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، طباعت وکتابت وکاغذ عمدہ ضخامت ۲۰۰ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸۔ قیمت فی نسخہ ؎۔ ملنے کا پتہ :- سکریٹری صاحب عمر لائبریری عمرآباد متصل آمبور ضلع شمالی ارکاٹ صوبہ مدراس۔

علامہ طنطاوی جوہری زندہ مفسرین میں سے ہیں۔ اور انکی تفسیر نے شہرت عام حاصل کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کی موجودہ عہد کی حالت اور ضرورت کو پیش نظر رکھکر قرآن کریم کی تشریح کی ہے۔ یہ تفسیر بہت مطول ہے۔ مولانا عبیدالرحمٰن صاحب رحمانی نے اسکی نافعیت کو دیکھتے ہوئے اس کا ترجمہ اردو میں کیا۔ کے محمد اسمٰعیل صاحب صدر جامعہ دارالسلام عمرآباد نے ازراہ خدمت اسلام اس کے مصارف طباعت اپنے ذمہ لئے اور کے محمد ابراہیم صاحب سکریٹری عمر لائبریری

نے اس کو چھپوا کر شائع کیا۔

ترجمہ صاف اور اچھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ کتاب اردو ہی میں لکھی گئی ہے۔ ابھی اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ امید ہے کہ بقیہ جلدیں بھی سلسلہ وار شائع کی جائیں گی۔

تراجم علمار حدیث ہند | جماعت اہل حدیث کا آج سے پچیس سال پہلے سے یہ خیال تھا کہ انکے علمار کی تاریخ میں ایک کتاب مرتب کی جائے۔ چنانچہ اسی وقت سے علمار کے تراجم فراہم کئے جانے لگے جن میں سے بعض بعض اخبار اہل حدیث امرت سر میں شائع ہوتے رہے۔ امسال مولوی ابو یحییٰ امام خانصاحب نوشہروی نے علمار حدیث کے تراجم جن کی تعداد دو سو سے بھی زیادہ ہے جمع کر کے مندرجہ بالا نام سے شائع کئے ہیں اس میں صرف دہلی اور صوبہ متحدہ کے گذشتہ اور موجودہ علمار اہل حدیث کے تراجم ہیں۔ دوسری جلد میں بقیہ حصص ہند کے علمار اہل حدیث کے تراجم ہونگے اس کتاب میں مصنف نے بہت محنت کی ہے۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ سالہا سال سے وہ اس میں لگے ہوئے تھے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی تجارت اور مالی حالت بھی اس کے پیچھے خراب کر لی۔ جا بجا سفر کیا اور علمار سے ملاقاتیں کیں اور ان کے حالات فراہم کئے جس کے بعد یہ کتاب جو ،، ۵ صفحوں کی ہے شائع کر کے جماعت اہل حدیث کی دیرینہ آرزو پوری کی۔ اگرچہ یہ پہلی کوشش ہے اور ابھی اس میں اضافہ اور اصلاح کی گنجائش ہے لیکن پھر بھی نہایت قدر کے قابل ہے۔ مجھے امید ہے کہ جماعت اہل حدیث کے افراد اپنی اس متاع گرانمایہ کو جو ان کے علمار کے حالات میں ہے شوق سے خریدیں گے۔ اور مصنف کی حوصلہ افزائی کریں گے تاکہ وہ دوسری جلد بھی شائع کر سکیں۔ قیمت فی نسخہ عہ ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ عبدالحیٔ دارالاخوان مقام سوہدرہ۔ گوجرانوالہ۔ پنجاب

طلوع اسلام | یہ رسالہ دہلی سے مولوی محمد عثمان صاحب کی ادارت میں مئی ۳۸ء سے ماہوار نکلنا
شروع ہوا ہے۔ اس کے پیش نظر مسلمانوں میں خالص اسلامی اور جماعتی زندگی پیدا کرنا ہے۔ اور قرآن کریم
اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اشعار کے حقائق کی توضیح اسکا نمایاں امتیاز ہے۔ اب تک اس کے پانچ نمبر
نکل چکے ہیں۔ مقاصد اور مضامین کے لحاظ سے ہر نمبر اپنے سابق سے بڑھ کر ہے۔ اور ہم کو معلوم
ہوا ہے کہ جن خوبیوں کا یہ حامل ہے، انکے مطابق اس کی قدردانی بھی ہو رہی ہے۔ یہ رسالہ کسی کی
ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے اور اس کی
آمدنی صرف اسی رسالہ پر یا اسکے مقاصد کے متعلق دیگر تصانیف پر خرچ کی جائے گی۔
ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو پابندی وقت کے ساتھ ۲۰×۲۶/۸ کی تقطیع پر ۸۰ صفحات کی
ضخامت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ قسم کا۔ قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔ (صہ)
ملنے کا پتہ :- دفتر رسالہ طلوع اسلام - بلیماران، دہلی۔

برہان | یہ ماہانہ رسالہ دہلی کی ندوۃ المصنفین کی طرف سے جولائی ۳۸ء سے شائع ہونا شروع
ہوا ہے۔ یہ جماعت علمار دیوبند کی ہے جنھوں نے اس سال ندوۃ المصنفین دہلی اس غرض سے
قائم کی ہے کہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے عہد حاضر میں مسلمانوں کی رہنمائی کرے اور علوم مغربیہ
و مادیہ کے رواج کے باعث مذہب سے مسلمانوں کو جو بعد ہوتا جارہا ہے اس کو روکنے کی موثر تدابیر
اختیار کرے۔ یہ حضرات اپنے ارادوں میں پختہ اور مقاصد میں مخلص ہیں اور ضروریات زمانہ اور اسلامی
علوم سے باخبر۔ اس لئے مجھکو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو اپنے مقاصد میں کامیاب کریگا۔
رسالہ کے مدیر اور مرتب مولوی سعید احمد صاحب اکبر آبادی ہیں جو دیوبند کے فارغ التحصیل
ہیں اور ایم اے کی ڈگری اور اس کے ساتھ اسلامی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اور سلیقۂ تحریر میں بھی ممتاز ہیں۔
ابتک اس رسالہ کے تین نمبر نکل چکے ہیں جو اپنے مقاصد کے لحاظ سے نہایت موزوں اور
مضامین کے لحاظ سے نہایت اچھے ہیں - اور مزید براں کتابت طباعت اور کاغذ کے لحاظ

سے ممتاز ہیں۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔
ملنے کا پتہ :- ناظم صاحب ندوۃ المصنفین - قرولباغ - نئی دہلی۔

نیپّون | یہ عربی زبان کا ماہوار رسالہ جاپان کے دارالخلافہ ٹوکیو سے نکلنا شروع ہوا ہے جسکا پہلا نمبر جنوری ۳۸ء کا ہمارے پاس ریویو کی غرض سے موصول ہوا ہے۔ رسالہ مصور ہے اور کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے انگریزی کے اچھے اچھے رسالے بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس میں جاپان کے جغرافی، تاریخی، تعلیمی، صنعتی اور قوت دماغی وغیرہ کے حالات کے متعلق مضامین ہیں نیز جاپانیوں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کا جو احترام ہے اس کی بھی تشریح ہے۔ اور غالباً اس رسالہ کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کے ذریعہ سے مسلمانوں کے ساتھ جاپانی قوم کا رشتۂ مودت مستحکم کیا جائے۔ معلوم نہیں کہ جاپانی زبان میں بھی کوئی اس قسم کا رسالہ وہاں نکالا جاتا ہے یا نہیں جس کے ذریعہ سے جاپانی قوم جو اس رسالہ کے بیان کے مطابق اسلام کے قریب تر آچکی ہے کچھ اسلامی تعلیمات سے واقف ہو۔ (ا - ج)

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

ہٹلر نے چکوسلوواکیا فتح کرلیا، جو لوگ اس کی سیاست کو سمجھے نہ تھے ان کا خیال تھا کہ وہ لڑیگا، جو برطانیہ اور فرانس کی سیاست کو سمجھتے نہ تھے ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں مل کر اس کی مخالفت کریں گے اور روس اور شاید رومانیہ ان کا ساتھ دیگا ہٹلر کے حملے کی تاریخ بھی معلوم کرلی گئی تھی اور اس میں بھی شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ اسی تاریخ کو یورپ کے بارود خانے میں آگ لگ جائے گی، لیکن ہٹلر نے اپنا مطلب حاصل کرلیا اور بارود خانہ ویسا ہی ٹھنڈا پڑا ہے، بارود ہوتی تو جلتی۔ برطانوی سیاست کا ارادہ تو اسی وقت ظاہر ہوگیا تھا جب لندن ٹائمز نے دوستانہ طریقے پر چک حکومت کو مشورہ دیا کہ سڈیٹن علاقے کو الگ کردے، لیکن یہ ارادہ پہلے تو ٹائمز پر خفا ہو کر چھپایا گیا اور پھر فرانس کی تیاری کے چرچے کرکے اور برطانیہ کی اس قدیمی وفاداری کا بار بار اعلان کرکے جو ہر دوست کے آڑے وقت میں کام آتی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہر فون ربن تروپ، گینیرال فون گورنگ اور ہر ہٹلر کو اس غلط فہمی میں ڈال رہے ہیں کہ انگلستان اور فرانس نہ لڑنا چاہتے ہیں نہ لڑنے کو تیار ہیں، اس لئے ہٹلر کو یہ بات صاف صاف بتا دینا چاہیئے کہ انگلستان اور فرانس اپنے معاہدوں کی پابندی کریں گے یہ دکھانے کے لئے کہ یہ خالی دھونس نہیں ہے، انگلستان اور فرانس کے فوجی افسروں میں لمبے مشورے بھی ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہٹلر بغلیں جھانکنے لگے، چنانچہ اخباروں نے مشہور بھی کردیا کہ وہ سخت پس وپیش میں ہے اور اپنی تقریریں بار بار پھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور پھر نئے سرے سے لکھتا ہے، یعنی کوئی نئی پالیسی سوچتا ہے اور پھر اس کی رائے بدل جاتی ہے۔ مگر ١٢ ستمبر کو دوشنبے کے دن جب ہٹلر کی تقریر ہوئی تو اس سے نہ پریشانی ظاہر ہوتی تھی نہ ارادے کی کمزوری، ہاں یہ ضرور تھا کہ اس میں جنگ کا اعلان نہیں تھا۔ صرف یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ سڈیٹن جرمن

آبادی کو فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ چکوسلوواکیا کی ریاست میں شامل رہنا چاہتی ہے یا جرمنی میں شامل ہونا۔ اس کے علاوہ تنبہ کی بات صرف ایک اشارہ تھا فلسطین اور نوآبادیوں کی طرف لیکن ایسی اشارہ بازی سیاسی آداب کے خلاف ہے ہم یہاں اسکا ذکر نہیں کر سکتے۔

ہٹلر کی اس تقریر کا سب کو انتظار تھا اور اگرچہ اس میں کوئی ایسی صفت نہیں تھی کہ اسے سیاست کا سبق سمجھ کر سنا جائے، ہمیں بعد کو معلوم ہوا کہ بعض ملکوں میں تقریر کے وقت کیبنٹ کا اجلاس کرایا گیا اور تمام وزیروں نے بیٹھ کر ریڈیو پر اسے سنا۔ اس کے جواب میں یہ خبر پھیلانا مناسب سمجھا گیا کہ برطانوی وزارت کی طرف سے ہٹلر کو ایک تحریر بھیجی گئی تھی جس میں برطانیہ کے ارادے اور ذمہ داریاں واضح کردی گئی تھیں تاکہ وہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو دماغ کے اندر اور خصوصاً ہٹلر کے سے منچلے دماغ کے اندر اسی طرح جمع ہوتی رہتی ہیں جیسے جسم پر میل۔ برطانوی حکومت جو اپنے ہاں کے اخباروں کو خوب جانتی پہچانتی ہے اس خبر کی تردید بھی نہ کرپائی تھی کہ اخباروں کے ایک گروہ نے جن کا مالک اور پالیسی ایک ہے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سڈٹین جرمن آبادی سے عام ووٹ لیا جائے کہ وہ کیا چاہتی ہے یعنی وہی کہنے لگے جو ہٹلر کہہ رہا تھا اور جسے کہتے ہوئے برطانوی اور فرانسیسی وزیر شرماتے تھے۔ حکومت اور اخباروں کی ملی بھگت ہونا بیشک برا ہے۔ لیکن اخبار اگر اپنی طرف سے اس کا انتظام کر دیں کہ سیاست قلابازیاں کھائے اور اس کے چوٹ نہ لگے تو یہ ایسا احسان ہے جس کی برطانوی حکومت ہمیشہ قدر کرتی رہی ہے۔

ہٹلر نے ۱۲ ستمبر کو تقریر کی اور اس سے ایک دن پہلے ہی سڈٹین جرمن لیڈر گفتگو اور مصالحت کی کوششوں کا پردہ ہٹا کر میدان میں آ گئے۔ انھوں نے پہلے ہی سے آپس میں طے کر لیا تھا کہ اس روز ہر جگہ بلوے ہوں گے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے توڑے جائیں گے۔ چک پولیس اور سرکاری ملازموں اور دفتروں پر پتھر برسائے جائیں گے اور ہر طرح سے چکوں کو چھیڑ کر ایسی وارداتوں کا انتظام کیا جائیگا کہ جنھیں جرمنی سیاست دخل اندازی کا بہانہ بنا سکے۔ انھوں نے اپنی طرف سے تو کوئی کسر نہیں رکھی، لیکن چک حکومت نے بڑی موقع شناسی صبر اور احتیاط سے کام لیا، اور پولیس

نے کہیں بھی زیادتی کی تو فوراً تفتیش کرائی اور الزام ثابت ہو گیا تو سزا دینے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ مگر بات اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایسی شرافت اور صلح پسندی صرف نقصان سے بچا سکتی تھی، فائدے کی امید رکھنا فضول تھا۔ سڈٹین جرمن حکومت کو اس لئے چھیڑ رہے تھے کہ انھیں امید تھی کہ ۱۲ کی شام کو جرمن فوجیں سڈٹین علاقوں میں داخل ہو جائیں گی، اور فساد کرنے والے اگر کسی کو سرحد کی طرف سے آتے دیکھتے تو دوڑ کر پوچھتے تھے کہ بتاؤ جرمن فوجیں کہاں تک پہنچی ہیں۔ مگر جرمن فوجوں کی اب ضرورت نہیں رہی تھی۔ چک حکومت کے حواس درست رہے تھے تو کیا، برطانیہ اور فرانس کی بے چینی حد سے گذر گئی تھی، وہ آپس میں بار بار ٹیلیفون پر مشورے کر رہی تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر چمبرلین نے نہ اپنی حیثیت کو دیکھا نہ اپنے بڑھاپے کو نہ اپنے نزلہ کی مستقل شکایت کو، اور ہٹلر سے ملنے کو پہنچ گئے۔ کوئی سمجھا کہ وہ بزرگانہ نصیحت کرنے جا رہے ہیں، جو زیادہ عقیدت رکھتے تھے انہیں امید تھی کہ وہ ہٹلر کے کان نہ اینٹھیں تو ایسی سخت سست ضرور کہیں گے کہ وہ آئندہ پھر ایسے جھگڑے کھڑے نہ کرے لیکن مسٹر چمبرلین چند گھنٹے گفتگو کرنے کے بعد واپس آگئے تو ان تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، اور جب کیبینٹ سے مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ ان کا ہٹلر سے دوبارہ ملاقات کرنے کے لئے جانے کا ارادہ ہے تو سب کو پتہ چل گیا کہ ملاقات میں مسٹر چمبرلین نے ہٹلر کو نصیحت نہ کی ہوگی بلکہ خود اس کی تقریر کے پھیر میں آگئے اور اس کے جوش سے مرعوب ہو گئے۔ اس طرح ایک چال جو باہمت اور روشن خیال سیاست کا کارنامہ معلوم ہوتی تھی محض ایک تجارتی چال بن گئی۔ یعنی سیٹھ صاحب ایک من چلے کو جوان کی اور ان کے پڑوسی کی دکان لوٹنے کی دھمکی دے رہا تھا جب اور کسی طرح راضی نہ کر سکے تو خود دوڑ کر اس کے پاس پہنچے، مگر اس پر نہ ان کی شخصیت کوئی اثر ڈال سکی نہ ان کی دولت، اور وہ دل میں یہ ارادہ لیکر واپس ہوئے کہ یہ آدمی ہے بڑا بے ڈھب، اور دوکان بچانا ہے تو یہ جو کچھ مانگ رہا ہے دینا ہی پڑے گا خالص سیاسی اعتبار سے دیکھئے اور یہ بھول جائیے کہ چال کا نتیجہ کیا نکلا تو مسٹر چمبرلین بے شک تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے رسم و رواج کا خیال نہ کیا۔ اس غصہ کو پی گئے جو شورش پسند مخالف جان بوجھ کر

پیدا کرتے ہیں اور امن قائم رکھنے کی خاطر بڑے ہوتے ہوئے چھوٹے کے سامنے جھک گئے۔ مگر دوسری ملاقات کے اعلان نے اس تدبیر کی سیاسی آبرو کو بھی بگاڑ دیا۔ اگر درمیان میں صلح نہ ہو گئی ہوتی تو مسٹر چیمبرلین ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ کیبنٹ کے کارندے کی حیثیت سے جاتے، اب جو وہ صلح کے بعد جا رہے ہیں تو اس سے ذرا سی اشک شوئی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

پیرس میں بعض واقف کاروں کا خیال تھا کہ چیمبرلین اپنی خواہش سے نہیں بلکہ فرانس کے وزیر اعظم دلادیئے کے اصرار پر ہٹلر سے ملاقات کرنے گئے۔ بعد کے واقعات کو دیکھتے ہوئے کوئی تعجب نہیں کہ موسیو دلادیئے کی طرف سے اصرار کیا گیا ہو۔ جب کیبنٹ کے سامنے وہ شرائط پیش کی گئیں جن پر کہ ہٹلر نے مسٹر چیمبرلین اور فرانس کے ذمہ دار وزیروں کو بتایا تھا کہ وہ مصالحت کرنے پر راضی ہے تو فرانسیسی سیاست کی قلعی کھل گئی۔ یہ سیاست ہٹلر کی ہر دھمکی اور ہر چال کا جواب تو دے رہی تھی مگر یہ جانتے ہوئے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور نہایت ہی ادنیٰ قسم کا جھوٹ جو پکڑا جاتا ہے اور بدنام و رسوا کرتا ہے۔ فرانس اور انگلستان میں جو مشورے ہوئے ان میں سمجھئے موسیو دلادیئے مسٹر چیمبرلین سے کہہ رہے تھے کہ بھئی ہٹلر ہمکو دھمکیاں دے رہا ہے اور ان کا جواب دینا لازمی ہے، لیکن اگر اس نے کہیں چیکوسلوواکیا پر حملہ کر دیا تو ہم بری طرح سے پھنس جائیں گے، کہ ہم کو کرنا ضرور پڑیگا اور لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں۔ اگر ہم پٹ گئے تو جانو تم کو بھی میدان میں آنا ہی پڑے گا، اور ہم جانتے ہیں کہ تم بھی لڑائی سے بھاگ گئے ہو۔ اس لئے اگر اس بدنامی اور نقصان سے بچنا چاہتے ہو تو جلد کوئی تدبیر کرو۔ مسٹر چیمبرلین اس کا اس طرح جواب دیتے ہوں گے کہ ہاں ہم بھی اپنی آبرو رکھنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہٹلر جب ڈکرے تو ہم بھی غرائیں، لیکن ہمارے شہری کبھی اس پر تیار نہ ہوں گے کہ چیکوسلوواکیا کی ریاست کے ایک حصے کو بچانے کے لئے اپنا خون بہائے، اور ہٹلر نے ملک میں اپنا پروپگنڈا بھی اتنا کر لیا ہے کہ لوگ اس کے مطالبے کو بالکل غلط اور بے جا نہیں سمجھتے۔ ہٹلر کو یہ سب معلوم ہے، اور اسی وجہ سے کہ وہ ہماری

غلطیوں کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتا پھر یہ بھی دیکھو کہ ہمارا تمھارا معاملہ تو صاف ہے۔ تمھارے ملک پر کوئی حملہ کرے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ تمھاری مدد کریں، لیکن اگر تم کسی سے اپنے معاہدوں کے سبب سے اُلجھ جاؤ تو تمھیں اس کا حق نہیں کہ ہم کو اُلجھ جانے پر مجبور کرو۔ چکوسلوواکیا کو تمھاری سیاست نے بنایا، تمھاری سیاست نے قائم رکھا، اب یہ تمھاری سیاست ہی کا فرض ہے کہ اس کی سلامتی کی تدبیر کرے۔ اس میں ہم تمھاری مدد کریں گے، لیکن صرف گفتگو اور مصالحت کی کوشش تک، مار پیٹ ہونے لگی تو ہم الگ ہو جائیں گے۔ یہ ہمارا کام نہیں۔

آپ نے یہ بات سنی ہوتی تو سمجھ جاتے کہ مسٹر چمبرلین کی بھی ایک رگ دبتی ہے یعنی اگر فرانس اور جرمنی میں چل گئی تو اس کی جلد نوبت آجائیگی کہ برطانیہ بھی پل پڑنے پر مجبور ہو، اور ایسی مصیبت سے بچنے کے لئے انھوں نے ہٹلر سے ملاقات کرنے کی ٹھانی۔ چکوسلوواکیا سے فرانسیسیوں اور انگریزوں کو کتنی ہمدردی ہے یہ ہم نہیں جانتے اور اس پر غور کرنا فضول ہے جب واقعات نے صاف ظاہر کر دیا کہ انگلستان اور فرانس چکوسلوواکیا کو سلامت رکھنے کی فکر میں تھے ہی نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ جرمنی اعلان جنگ نہ کرے اور چکوسلوواکیا کو ان معاہدوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ ملے جو انگلستان اور فرانس کو اس کی مدد کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کوشش میں انھیں پوری کامیابی ہوئی۔ سڈٹین علاقہ میں ۱۲ ستمبر سے بڑے پیمانہ پر بلوے ہونے لگے اور آخر کو خاص اس دن جبکہ مسٹر چمبرلین ہٹلر سے ملاقات کرنے کو گئے تھے چک حکومت نے مجبور ہو کر سڈٹین پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کر دے۔ پھر ہزاروں سڈٹین جرمنی بھاگ کر جرمنی پہنچے اور وہاں ملک کو آزاد کرنے کے لئے رضاکاروں کی ایک فوج بنائی جس کی تعداد تین چار دن میں چالیس ہزار کے قریب ہو گئی۔ اب لڑائی چھڑنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی مگر اس کے چھڑنے ہی سے پہلے فرانس اور برطانیہ نے فیصلہ کر لیا کہ ہٹلر کے مطالبے منظور کر لینے چاہئیں، اور جب انھوں نے منظور کر لیا تو پھر بیچارے چک کیا کر سکتے تھے یورپ کی جمہوری حکومتوں کی آبرو چین کے بدلے بیچ دی گئی ہے، لیکن تجربہ تو یہی سکھاتا ہے کہ آبرو کے بغیر چین کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

انگلستان اور فرانس نے یہ طے کیا ہے کہ وہ سڈٹین علاقے جہاں جرمن آبادی ۵۰ فیصدی سے اوپر ہے چک ریاست سے الگ کر دئے جائیں، جہاں جرمنی اکثریت ۵۰ اور ۵۰ کے درمیان ہے وہاں کی حکومت جس قدر ممکن ہو خود مختار کر دی جائے یہاں تک تو خیر چکوسلوواکیا کا اپنا معاملہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا ہے کہ چکوسلوواکیا کی اپنی کوئی خارجی پالیسی نہ رہے یعنی ریاست اپنے طور پر کسی دوسری ریاست سے معاہدہ وغیرہ نہ کر پائے، بلکہ اس کے تمام پڑوسی اور ان کے ساتھ انگلستان فرانس اور اٹلی اسے سلامت رکھنے کی ذمہ داری لیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چکوسلوواکیا کے فرانس اور انگلستان سے جو خاص معاہدے تھے وہ سب منسوخ ہو گئے، اب وہ خاص ان سے مدد نہیں مانگ سکتا اور اگر اس نے کبھی مانگی تو بڑے لمبے مشورے کئے جا سکیں گے کمیٹیوں کے بیسیوں جلسے ہونگے، اور اس کا کوئی خطرہ نہ ہوگا کہ فیصلہ کرنے یا صاف بات کہنے کو کہا جائے، شاید قبل اس کے کہ تمام فریق چکوسلوواکیا کے محافظ بننے پر راضی ہو جائیں ہنگری اور پولینڈ اس پر منہ ماریں گے اور کچھ نہ کچھ مار ہی لے جائیں گے ہنگری نے بسم اللہ تو کر ہی دی ہے۔

چکوسلوواکیا کی ریاست کے گھُل کر مردہ ہو جانے سے یورپ کی سیاست کی ایک گتھی سلجھ گئی ہے اور جب تک کوئی اور ٹھنڈا نہ پڑے اس سیاست کی سانس چلتی رہے گی۔ آگے کیا ہوگا یہ ہم سے نہ پوچھئے۔ ابھی تو بس ہٹلر کی جوانی نے ادب کی ان رسموں کو توڑا ہے جو بڑے بوڑھوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں نے کہہ بھی دیا ہے کہ ہمیں بس چین سے رہنے کی خواہش ہے، ہم تمہارے دشمن یا مخالف نہیں۔ اب ہٹلر کا جوش ہوگا اور سیاست کے ہنگامے۔

(باجازت اے۔ آئی۔ آر)

تعلیمی دنیا

(جناب عبدالغفور صاحب ایم۔ اے۔ لکچرار مسلم یونیوسٹی ٹریننگ کالج علی گڈھ)

ڈاکٹر کرشنن نے جو ڈاکٹر رامن کے ایک ہونہار شاگرد ہیں کرشنن ایفکٹ کے نام سے نئی قسم کی شعاع معلوم کی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے رسالہ انڈین ایکادمی فار سائنس میں مضامین کا ایک سلسلہ بھی لکھا تھا۔ اس اہم تحقیقات کے سلسلے میں مغربی سائنس داں بھی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ رائل سوسائٹی آف لندن کی پچھلی اشاعت میں کیوندش۔ کیمبرج یونیوسٹی کے ایک مشہور ماہر طبیعیات نے پروفیسر فاؤلر کا ایک مقالہ اس موضوع پر چھاپا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ڈاکٹر کرشنن کے تجربی نتائج اور نظریوں کی تائید کی ہے۔ ان کے خیال میں نئی ایجاد طبیعیات اور کیمیا کے بہت سے اہم مسائل کے لئے بڑی اہم اور ضروری ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر کرشنن ہندوستانی سائنس دانوں کے اس ممتاز گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی تعلیم و تربیت کے لئے کسی مغربی ادارے کے مرہون منت نہیں ہوئے انہوں نے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ہی انتہائی علمی اعزاز حاصل کئے۔ یہاں کے معملوں میں تحقیقاتی کاوشیں کیں۔ اور ہندوستانی اداروں میں سامان اور سرمایہ کی کمی کے باوجود دنیا کے سائنس دانوں کی صف اول میں جگہ لی۔ اس بلند مرتبت گروہ کا پہلا رکن رامانجم۔ دوسرے رامن۔ تیسرے۔ میگھ ناتھ سہا۔ اور چوتھے کرشنن ہیں۔ ہم علم میں کسی اجارہ داری یا جھوٹے جذبۂ افتخار کے قائل نہیں۔ تلاش علم انسان کا فرض ہے اور یہ چشمہ خواہ آکسفورڈ سے پھوٹ نکلا ہو یا کولمبیا سے۔ ہر سچے متلاشی کا حق ہے کہ وہیں جاکر اپنی پیاس بجھائے۔ تاہم ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقوں میں جو ایک مذموم نفرت ہندوستانی ڈگریوں کے متعلق پائی جاتی ہے وہ کس قدر الم انگیز ہے۔ ہندوستانی

یونیورسٹی کے ارباب اختیار ایک ولایتی ادارے کے تھرڈ کلاس کو اپنے فرسٹ کلاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر رامن یا اس انگریز ہمدرد کی جگہ جس کی نگاہ جوہر شناس نے رامانجم کے دل ودماغ کو ایک نظر میں جانچ لیا تھا اس قسم کے لوگ ہوتے تو دنیا کرشنن ایفکٹ اور رامانجم کی ریاضی کی تحقیقات سے محروم رہ جاتی۔

انڈلیشر اکاڈیمشروپرائن Indeschen Akademischen Verein

پچھلی جولائی میں پروفیسر ساھنی (لکھنؤ یونیورسٹی) نے وی آنا میں ایک بڑے مجمع اور مشہور ہندوستانیوں کی موجودگی میں بھارت بھون کا افتتاح کیا جو ہندوستان اکادمک ایسوسی ایشن وی آنا کا مرکز ہوگا۔ انجمن کے صدر نے پروفیسر ساھنی سے مرکز کی افتتاح کی درخواست کرتے ہوئے انجمن کی بنیاد اور اس کی علمی اور سوشل دلچسپیوں کی تاریخ بیان کی۔ یہ انجمن دس سال پہلے سوبھاش چندر بوس کے مبارک ہاتھوں سے معرض وجود میں آئی اور اس پودے کی آبیاری وہ پرجوش طلبا اور ڈاکٹر حضرات کرتے رہے۔ جو تعلیم یا سیاحت کے سلسلہ میں وی آنا آتے تھے۔ اس قسم کی انجمنیں۔ برلن۔ پیرس۔ لندن۔ روم وغیرہ میں بھی قائم ہیں اور یہ نہ صرف ہندوستانی اصحاب کے لئے ایک معاشی اور علمی مرکز کا کام دیتے ہیں بلکہ یہ ادارے ان ممالک میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کے بہترین تبلیغی مرکز ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ان غلط فہمیوں کا بھی اکثر ازالہ کرتے رہتے ہیں جو ہندوستانیوں کے متعلق اکثر طبقے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

کل دنیا کی دوسری نوجوان کانفرنس پہلی نوجوان کانفرنس جنیوا میں ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تھوڑے عرصے میں کانفرنس بڑی ہردلعزیز ہو چکی ہے اس کے ممبروں کی تعداد چار کرور تک پہونچ چکی ہے۔ امسال یہ کانفرنس واسر کالج نیویارک میں منعقد

ہوئی۔ اس میں تقریباً ۵۲ قوموں اور ملکوں کے نمایندے شریک ہوئے کانفرنس کا ایک اہم بنیادی اصول امن وآتشی کا پرچار ہے اور شاید اسی لئے اس مرتبہ جرمنی۔ اٹلی اور جاپان نے کانفرنس کی دعوت قبول نہیں کی۔ ہندوستان سے بھی نوجوان کارکن اور طلبا کی کانفرنس کے نمایندے شرکت کے لئے روانہ ہو چکے ہیں ان میں مسٹر پربودھ چندر۔ خواجہ احمد عباس اور مسٹر مہر علی کے نام قابل ذکر ہیں نیویارک میں کانفرنس کے مندوبین کا استقبال ایک شاندار جلوس کے ساتھ کیا جائے گا جس میں مشہور مصنفین۔ اہل قلم۔ فلم ایکٹرز۔ اساتذہ اور طلبا شریک ہونگے کانفرنس کے پنڈال میں ہر نمایندہ اپنی قوم اور ملک کا مخصوص لباس پہنکر تقریر کرے گا اس جدت کا مقصد دنیا پر یہ واضح کرنا ہے کہ اس کانفرنس کے پلیٹ فارم پر رنگ و مذہب تراش خراش کسی بات کی تمیز نہیں۔

پروفیسر نکولاس رورچ نے جن کا ذکر ہم ان اشارات میں ایک مرتبہ کر چکے ہیں رسالہ ٹزکلچر کے جولائی نمبر میں ان احسانات کا تذکرہ کیا ہے۔ جو مشرق نے مغربی تمدن پر کئے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں۔

" زراعت میں مشرق نے مغرب کو بہت کچھ سکھایا۔ مکئی ایشیا سے آئی۔ نیشکر۔ چاول۔ نیل۔ زعفران۔ چائے۔ اور بہت سے پھلدار درختوں اور سبزیوں کا اصلی وطن مشرق ہی تھا۔ ہر سال ہزاروں زائرین جو ارض مقدس کی زیارت کو جاتے تھے۔ اپنے ساتھ واپسی پر خوبصورت پھولدار پودوں کے بیج لے آتے تھے۔ آڑو دمشق سے لایا گیا۔ قبرس۔ غازہ۔ اسقلون کی شرابیں۔ یونان اور فلسطین کی کشمش۔ عربی النسل گھوڑے۔ قراباغ اور قرا شلغ نسلیں۔ گدھے خچر۔ یہ سب ایشیا کی عظیم الشان وسعتوں کے تحفے ہیں۔ پون چکیاں بھی ایشیا ہی سے لائی گئیں۔

صنعت وحرفت اور اس کی پیداوار کے لئے تو مغربی ممالک ہمیشہ ایشیا کے مرہون

منت رہے۔ انطاکیہ اور طرابلس کی شکر۔ بیروت کی روئی۔ ٹائر کا ریشم۔ موصل کی ململ۔ ایران کے قالین۔ قرطبہ کا چمڑا۔ یہ سب معاشی زندگی کی رنگینیاں مشرقی ممالک کے طفیل یورپ میں پہونچیں۔ اس کے علاوہ روزمرہ بول چال اور لغت میں سینکڑوں مشرقی الفاظ داخل ہوگئے۔

میدانِ جنگ میں اہلِ مشرق نے فنونِ حرب۔ فوجوں کے ضبط کے اصول سکھائے مشرقی ممالک سے روابط ہونے کے بعد یورپ میں نائٹ فوجی شہسواروں کے سلسلے یا آرڈرز قائم ہوگئے۔ مغربی جنگجو زرہیں استعمال کرنے لگے۔ اور دمشق کی تلواریں تو اپنی خوبی کی وجہ سے اب تک مغرب میں ضرب المثل ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔ کہ دنیا میں بڑی ہستیوں کی ممتاز خصوصیت احسان شناسی رہی ہے۔ اہلِ مغرب کو بھی ان کی مبارک مثال کی پیروی کرنا چاہیئے۔ اور ان تمام افراد اور اہم احسانات کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جو اہلِ مشرق نے ہم پر کئے ہیں۔"

سی۔ پی کے مسلمانوں کا نمایندہ وفد مسٹر شکلا وزیر اعظم صوبجات متوسط سے ملا۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے شکلا کی توجہ مسلمانوں کی ان شکایات کی طرف مبذول کرائی جو انہیں ودیا مندر اسکیم کے متعلق پیدا ہو چلی ہیں۔ مسلمانوں کے خیال میں ودیا مندر کے نام میں فرقہ دارانہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔ اور لفظ 'مندر' دوسرے لفظوں سے مل کر بھی اپنے مذہبی معنی برقرار رکھتا ہے۔ وزیر اعظم کے خیال میں لفظ مندر یہاں محض گھر کے مترادف ہے اور اسکو کوئی مذہبی رنگت نہیں دی جا سکتی ہے۔ ان کے خیال میں ارکان وفد اور لیڈروں کو چاہیئے کہ اس کا صحیح مفہوم عوام پر واضح کر دیں۔

وفد کی دوسری درخواست یہ تھی کہ فی الحال 'پرائمری اسکول' کا نام برقرار رکھا جائے۔ اور اگر کوئی نیا نام رکھنا ضروری ہی ہے۔ تو اس بارے میں پہلے اسمبلی کے مسلمان ممبروں سے مشورہ لیا جائے۔ وزیر اعظم نے اس تجویز کو منظور کر لیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بالتصریح اعلان کیا کہ موجودہ کانگریس حکومت کا منشا اردو اسکولوں کو بند

کردینے کا نہیں ہے۔ نیز حکومت لوکل باڈیز کی اردو اسکولوں کے نام ودیا مندر میں بدلنے کے سلسلے میں ہمت افزائی نہ کریگی۔ نصابی کتب کی کمیٹوں میں سب زبانوں کی مناسب نمایندگی ہوگی۔

ودیا مندر کے متعلق مقتدر مسلم لیڈروں اور ارباب علم نے مسلمانوں کا نظریہ واضح کردیا ہے۔ پچھلے دنوں مولوی عبدالحق صاحب نے ملک و قوم کی توجہ اس صریح بے انصافی کی طرف مبذول کرائی ہے جو مندر کے نام کی ترویج میں اور اردو اسکولوں کی ہمت افزائی کے سلسلے میں اختیار کی جارہی ہے۔

جہاںتک لفظ مندر کا تعلق ہے اس کے معنی لغوی ہیر پھیر یا اس کی لسانی تاریخ کے مطالعہ سے بدسے نہیں جاسکتے۔ ہر لفظ کے لک تو وہ معنی ہوتے ہیں جو ہمیں کسی سستی لغت کی کتاب سے مل سکتے ہیں۔ اور ایک اس لفظ کے ..... مذہبی یا نفسیاتی مطالب ہوتے ہیں۔ جو چوں "بو بہ گلاب اندر" اس میں مضمر اور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اور یہ معنی ایسے لطیف اور حروف سے یکجاں ہوتے ہیں کہ یہ تشریح توضیح کی تاب نہیں لاسکتے تاہم قوم کی معاشی اور روحانی زندگی کا عکس لکھے ہوئے حروف نہیں ہوتے بلکہ یہی مطالب اور ذہنی 'ماحول' ہوتے ہیں جن کا ہر لفظ حامل ہوتا ہے۔ لفظ 'مندر' متفقہ طور پر ایک خاص مذہبی رنگت لئے ہوئے ہے۔ اور یہ اس زمانہ میں بنا ہوگا جب ہندوؤں کی معاشی اور مذہبی زندگی میں گہرا رشتہ ہی نہ تھا بلکہ دونوں ایک ہی تھیں۔ اور یہی مذہبی رنگ اس میں اب تک موجود ہے۔

آچاریہ نرندر دیو صاحب نے جن کا یو۔پی تعلیمی اصلاحاتی کمیٹی اور یوپی تعلیمی اصلاحات سے خاص تعلق ہے۔ کانپور میں طلبا کے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے تعلیمی کمیٹی کی چند اہم تجاویز کی طرف اشارہ کیا۔ کمیٹی نے اساتذہ کی سروس کو محفوظ کرنے کے لئے تجویز ہے، کہ

کوئی استاد بغیر انسپکٹر کی منظوری کے برخاست نہ کیا جائے۔ نیز ہر برخاست شدہ ٹیچر کی اپیل ایک مرکزی تعلیمی بورڈ میں سنی جایا کرے۔ نیز اساتذہ اور انتظامیہ انجمنوں کے مابین اختلاف کی صورت میں مرکزی بورڈ اساتذہ کا ایک ادارے سے دوسرے میں بدلنے کا انتظام کردیا کرے۔ مالی وجوہات کی بنا پر اساتذہ کی تنخواہوں میں ترقی کی سفارش کرنا تو ناممکن تھا تاہم ان کے لئے کم از کم شرح تنخواہ مقرر ہو سکے گی جو ہر استاد کو ملنا چاہئے۔

ان کے خیال میں صنعتی تعلیم کا مقصد اسکولوں میں طلبا کو کامیاب کماؤ بنانا نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے ایک ہم آہنگ اور متوازن تربیت کے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے

ہندوستان میں قومی امدادی اداروں کے بہی خواہ کمیٹی کی اساتذہ کے شرائط ملازمت کے متعلق سفارشات پر اظہار استحسان کریں گے۔ ان مدارس میں اساتذہ کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اور اکثر انتظامیہ کمیٹی کے ہر ممبر یا منیجر کے رحم پر ہوتے ہیں۔ مگر ایک حد تک اس کی ذمہ داری خود اساتذہ کرام پر بھی عاید ہوتی ہے۔ آج کل ترقی پسند ممالک کیا ہندوستان میں بھی مزدوروں۔ کاریگروں تک نے اپنی یونین اور انجمنیں قائم کرلی ہیں۔ مگر اساتذہ جو بچوں کو اتفاق اور امداد باہمی کے اصول پڑھانے کے دعویدار ہیں اس پر عملاً کام کرنے کو تیار نظر نہیں آتے۔ آج انگلستان کے ہر معمولی دیہی مدرسہ کا استادؔ بھی رائل سوسائٹی فار ٹیچر کا ممبر ہے۔ اور استبدادیت پسند منیجر کے سامنے وہ ایک بے چارہ اور کم حیثیت مکتب کا ملا نہیں۔ بلکہ ایک باوقار۔ با اثر اور منظم جماعت کا فرد ہے اگر ہندوستانی اساتذہ بھی اپنی انجمنوں کی تنظیم میں سرگرمی دکھائیں اور ان کو جیتی جاگتی زندگی سے متحرک چیز بنا دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا ان کی شرائط ملازمت پر ہی نہیں بلکہ عام تعلیمی حالت اور ضبط پر اچھا اثر پڑے۔

آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس منعقدہ شملہ میں تقریر فرماتے ہوئے

ڈاکٹر مسٹر گوکل چند نارنگ نے ہندوستانی زبان کی قومی اور کلچرل اہمیت پر خاص طور پر بحث کی۔ ان کے خیال میں ایک مشترکہ زبان کا وجود متحدہ قومیت کے لئے سب سے ضروری چیز ہے۔ ان کے خیال میں آسٹریا اور ہنگری۔ انگلستان اور آئرلینڈ وغیرہ کی علیحدگی کی سب سے بڑی وجہ ان دونوں ممالک کی زبانوں کا مختلف ہونا تھا۔ اور اگر ہمیں ہندوستان کے منتشر شیرازہ کو متحد و متفق کرنا ہے تو ایک مشترکہ زبان اس کے لئے اولین شرط ہے۔ ان کے خیال میں ایک خوددار قوم کے لئے یہ امر موجب ندامت ہے کہ وہ بین الصوبائی تبادلۂ خیالات کے لئے ایک غیر ملکی زبان کا سہارا لے۔

ہندی اردو کے مسئلہ پر ان کے خیالات مخصوص اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پنجاب ہندو مہاسبھا کی روح رواں ہیں اور اس کے سیاسی اور سماجی عقائد کے حقیقی، نمایندے کہلائے جا سکتے ہیں۔ پھر وہ پنجابی سیاست کے بھی ایک درخشاں ستارے ہیں ان کے مفصلہ ذیل الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم زبان کے بارے میں ہمارے فرقہ دار گروہوں اور انجمنوں میں بھی نئی ذہنیت پیدا ہو چلی ہے جو ایک حد تک امید افزا ہے "جب میں ہندی کو مشترکہ زبان بنانے کے لئے اپیل کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ نہیں کہ ہندی اور زبان ہے اور اردو اور زبان۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مشترکہ زبانیں ہیں اور ان کا نام ہی ہندوستانی زبان ہے۔ ہمارے مسلم دوستوں کو کسی قسم اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے اگر وہ چاہیں تو ہندی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھہ سکتے ہیں"۔

ان کے ان الفاظ کا ڈاکٹر کرتو کوٹی شنکر آچار کی اس تقریر سے مقابلہ کرنا چاہئے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ہندوستان ہندواستھان ہے اور دوسری قومیں یہاں محض ان کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کر کے رہ سکتی ہیں۔

اپنے ایڈریس کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے ہندی اور دیوناگری رسم الخط کی پرزور حمایت کی ہے۔ ان کے خیال میں ہندی زبان کی خصوصیت محض یہ دو چیزیں

ہی ہونا چاہئیں۔ فارسی زبان شیریں ہے اور پچھلے سالوں میں فرانسیسی زبان اور اس کے تمدن کے اثر نے ایرانیوں میں اس شیرینی کو اس قدر تیز کر دیا کہ یہ حنظل بن کے رہ گئی۔ اور ان کے ماہرِ تعلیم اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں کہ اپنے بچوں کو فرانس میں تعلیم دینے کی بجائے جرمنی میں بھیجیں تاکہ فرانسیسی شیرینی جوان بچوں کو ایک تنزل یافتہ تمدن کے گہوارے میں پرورش کر رہی ہے جرمنی ضبط اور احساسِ فرض سے بدل جائے۔ پھر شیرینی کے معیار بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پروفیسر یونے۔ نوگوچی شاعرِ جاپان کو اپنے دورۂ ہندوستان میں اردو غزلوں اور گانوں میں بہ نسبت کسی اور زبان کے زیادہ مٹھاس ملی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جو زبان " صوبے کی حد بندی میں جکڑی ہوئی ہو۔ وہ ملک کی مشترکہ زبان بننے کے قابل نہیں " اگر مشترکہ زبان کا معیار یہی ہے تو ہمیں خوف ہے کہ ہندی زبان اس پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اگر ہندی زبان۔ یو۔ پی اور بہار میں رائج ہے تو اردو زبان کا سکہ ہر اس جگہ ٹکسالی ہے جہاں مسلمان بستے ہیں اگر برما کے دشوار گذار جنگلات میں اردو اسکول قائم ہیں سرحد کا پٹھان بچہ۔ سندھ کا دیہاتی بمبئی کا تاجر اور مدورا کا مسلمان بساطی بھی اردو جانتا ہے۔ اس کی بیوی بچے گھر میں اردو بولتے ہیں۔ اس کی تہذیب و تمدن۔ اس کے رہنے سہنے۔ اس کے خیالات اور اس کے مذہب کا آئینہ یہی زبان ہے۔

آج مدراس کی ترقی پسند حکومت صوبے میں ہندی کی ترویج پر زور دے رہی ہے اور تامل اور تلگو بولنے والے طبقات کی طرف سے اک زبردست ستیہ گرہ کی تحریک جاری کر دی گئی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس زبان کو جنوبی ہندوستان کے دراوڑی تمدن سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور جنوبی ہندوستان کے غیر برہمن اس کی جبریہ تعلیم کو ایک جارحانہ کارروائی سے کم نہیں سمجھتے۔ مگر مدراس کے مسلمانوں کے خیالات

اور جذبات کا ذریعہ اظہار اردو زبان ہی ہے۔ ان کے مذہبی مبلغ۔ ان کے قائدین کرام ان کے اساتذہ اسی زبان کے ذریعہ عوام کے سامنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو زبان صوبائی خلیجوں کو پاٹ کر ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل کر چکی ہے جو ہندی زبان کو حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم بیرونی ممالک کو دیکھیں تو جہاں جہاں مسلمان زائر، مسلمان ملازم یا مسلمان کاریگر پہونچتا ہے وہاں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، کابل کے بازاروں میں۔ آبادان کے کارخانوں میں۔ مکہ و مدینہ کے نخلستانوں میں ہر جگہ اردو زبان سے کاروباری کام چلایا جا سکتا ہے۔ اردو زبان ایسے مخصوص رسم الخط کے ذریعہ اس اس عظیم الشانی لسانی برادری میں شامل ہے جس کا سکہ ٹیونس سے پیکن تک چلتا ہے اور یہ اس زبان کی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ سینگا پور کی ملائی زبان۔ مالدیپ کی مقامی بولی۔ مشرقی افریقہ کی سواہلی بخارا کی ترکی۔ سب عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ اگر نائیجریا کا مسلمان حکمران ایک سوداگر کو پروانۂ راہداری دیتا ہے تو اسی رسم الخط میں۔ اور اگر جبل القمر دریائے نیل کے منبع کا رہنے والا خانہ بدوش کسی کو پیغام بھیجتا ہے۔ تو خط نسخ میں

اگر ہندوستان کو ایک بین الاقوامی ادبی اور کلچر برادری میں معزز جگہ لینا ہے تو خط نسخ ایک حد تک اس کے لئے راستہ تیار کر سکتا ہے۔ اور یہ نہیں تو بقول سبھاش بابو اور بنگال اسکول لاطینی رسم الخط اختیار کر لینا چاہیئے۔ جہاں تک بین الاقوامی سوال کا تعلق ہے دیوناگری رسم الخط خارج از بحث ہے۔

مصفی کبیر

"مصفی کبیر" صفائی خون کیلئے بے نظیر دوا ہے۔ خارش یعنی کھجلی، داد، برص، گنج، چھاجن (ڈنگیا) جھائیں، کیل، مہاسے، گرمی دانہ، پھوڑے پھنسی، آنکھیں دکھنا، سوزاک، آتشک، گٹھیا، جذام (کوڑھ) عرق النسا، بواسیر، ایڑی کا درد وغیرہ کیلئے اکسیری دوا ہے۔ اسکے علاوہ ملیریا بخار۔ مرض پائیوریا وغیرہ میں بیحد نافع ہے شریفی دواخانہ دہلی کو ناز ہے کہ اس نے ایسی بے بہا قابل قدر ایجاد کی ہے جس کا جواب کم از کم ایشیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا۔

قیمت فی شیشی بارہ خوراک آٹھ آنہ　　کم از کم آٹھ شیشیاں استعمال کرنی چاہئیں

ملنے کا پتہ

شریفی دواخانہ یونانی بازار بلیماران پوسٹ بکس نمبر ۳، دہلی

مصری جدید برقعہ

تشریح بالائی حصہ	دو حصوں میں منقسم	تشریح زیرین حصہ
سر سے شروع ہو کر ہاتھوں کی لمبائی تک رہتا ہے اسمیں نہایت خوبصورت چنٹ دار ٹوپی ہے جسکے پہننے سے نہ سر کا شیب ظاہر ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کی تکلیف		کندھے سے شروع ہو کر پیر کے ٹخنے تک رہتا ہے اسکی وضع مثل اور کوٹ کے ہے کمر کے اوپر خوبصورت پلیٹ پڑی ہیں پہلو میں جیب ہے کالر بھی مثل اور کوٹ کے ہے

بشرط واپسی منگائیں۔ آپ کندھے سے پیر کے ٹخنے تک اور سر کی گولائی ناپ کر روانہ کریں قیمت سفید یا رنگین سوتی ۶؎، ٹسری ۸؎ کریپ سلک ۱۲؎ بوسکی سلک ۱۵؎ ناپسند ہونے پر اسی روز واپس کریں۔

خاتون اسٹور ۲۵ فتحپوری بازار، دہلی



اوکاسا :۔ دل و دماغ، گردوں، معدہ، اور ہاضمہ میں سے ہر ایک پر پورا پورا اثر کرتا ہے۔

اوکاسا :۔ کا اصلی اثر غدودوں پر ہوتا ہے اس سے تمام جسمانی طاقت اور قوتِ مردانگی از سر نو پیدا ہونے لگتی ہے
عورتوں پر بھی یہی اثر ہوتا ہے جس سے انکا بانجھ پن اور عام کمزوری اور حیض کا نہ آنا اور اس قسم کی تمام شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔

اوکاسا :۔ اشتعال انگیز یا گرمی پیدا کرنے والی دوا نہیں ہے۔

اوکاسا :۔ ایسے اجزاء سے بنی ہوئی ہے جو آپ کے جسم میں موجود ہیں۔ اس لئے آپ ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔

"مردانہ طاقت بحال کرنے کیلئے آج ہی سے اوکاسا شروع کر دیجئے"

خریدتے وقت مردوں کے لئے اوکاسا (سلور) اور عورتوں کے لئے اوکاسا (گولڈ) طلب کیجئے

قیمت چھوٹا بکس ۳ روپے، بڑا بکس دس روپیہ — اوکاسا ہر اچھے دوا فروش کے ہاں ملتا ہے۔

پارک منشن دہلی گیٹ، دہلی یا براہ راست اوکاسا کمپنی (برلن) لمیٹڈ پوسٹ بکس ۵۹۵ بمبئی

ہندوستانی بچّوں کا بہترین رفیق

رسالہ غنچہ
ہفتہ وار
بجنور

ہندوستان سے سالانہ ... ششماہی ...

ملنے کا پتہ:- محمد حمید حسن مالک رسالہ غنچہ بجنور (یو-پی)

ممالک غیر سے قیمت سالانہ ...



مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند)

نام کتاب	مجلد	غیرمجلد
فلسفۂ تعلیم	؏	عہ ۱۲ر
القول الاظہر	عہ	۸ر
رہنمایان ہند	عار	عہر
امرائے ہنود	ہیے	سے
القمر	عہر	۱۰ر
تاریخ تمدن حصہ اول	عار	عہر
تاریخ تمدن حصہ دوم	عار	عہر
فلسفۂ جذبات	عہر	عہ
البیرونی	؏ر	عہر
دریائے لطافت	سے	عہر
طبقات الارض	عہر	؏
مشاہیر یونان و روم حصہ اول	للعہ	سے
مشاہیر یونان و روم حصہ دوم	سے	عہر
اسباق النحو حصہ اول	.	۶ر
اسباق النحو حصہ دوم	.	۴ر
علم المعیشت	صہر	صہ

نام کتاب	مجلد	غیرمجلد
تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے	عہر
تاریخ اخلاق یورپ حصہ دوم	عہر	عہ
تاریخ یونان قدیم	عار	.
نکات الشعراء	عہر	عہ ۱۲ر
وضع اصطلاحات	ہے ۱۲ر	ہے ۴ر
بجلی کے کرشمے	عہ ۱۲ر	عہ
تاریخ ملل قدیمہ	عہ ۱۲ر	.
محاسن کلام غالب	عہر	۱۰ر
قواعد اُردو	عہر	عار
تذکرہ شعرائے اُردو	عہ ۱۲ر	عہ ۶ر
جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق	سے	عہر
تاریخ ہند ہاشمی	.	عہ ۱۲ر
مثنوی خواب و خیال	عہر	عہ
کلیات ولی	صہ	للعہ
چمنستان شعراء	صہر	للعہ
ذکر میر	.	عار

المشتہر منظفر حسین شمیم مہتمم انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد دکن

بڑھاپے کی برکتیں

از خواجہ عبد المجید دہلوی

خواجہ صاحب نے اپنے خاص انداز میں ایک مناظرے کا نقشہ کھینچا ہے۔ مناظرے کا موضوع ہے "بڑھاپے کی برکتیں"۔ ایک منچلے مناظر مولوی عتیق الحق موضوع کی تائید میں تقریر کرتے ہیں اور اس خوبی سے شیب کو شباب کے مقابلے پر مستحسن ثابت کرتے ہیں کہ مجمع حیران رہ جاتا ہے۔ چند نوجوان جرأت لب کشائی کرتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب طرز استدلال کے سامنے انہیں جھکنا پڑتا ہے۔ ایک بوڑھے بھی جو بڑھاپے کے ہاتھوں اپنے تجربے بیان کرکے مولوی صاحب کے دعوے کو باطل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مناظر صاحب ان کے دلائل کو اس طرح رد کر دیتے ہیں کہ وہ بھی ایک لمحے کے لئے لطائف پیری کے مزے لینے لگتے ہیں اس پر زبان کا لطف مستزاد ہے۔

خوشنما ٹائپ کی نہایت روشن طباعت، کاغذ اعلیٰ۔

کتاب مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۵ اکتوبر تک شائع ہو جائے گی۔

شاہکار (گورکھپور)

سنہ ۱۹۲۲ء سے اُردو ادب کی خدمت میں ہر ایثار اور قربانی سے کام لے رہا ہے

دنیا معترف ہے کہ شاہکار کا سالنامہ جنوری ۱۹۳۵ء آپ اپنی نظیر تھا ایسا بلند معیار ٹھوس مضمون دلچسپ افسانوں، اور بے مثال نظموں کا مصور رسالہ تین روپے سالانہ چندہ میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ سالنامہ کے علاوہ گذشتہ جولائی میں عظیم الشان مصور خاص نمبر کی پہلی جلد تقریباً دو سو صفحات میں جدید اردو شاعری کے متعلق شائع ہوئی ہے اس کے مطالعہ کے ساتھ جدید اردو شاعری کا دنیا کو صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ حالی اور آزاد سے لیکر آج تک کے نوجوان مشاہیر شعراء تک ہر ایک کے حالات اور کلام کے مختصر نمونے تنقید کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔

دوسری جلد اور زیادہ آب و تاب سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ شعراء کو صلائے عام ہے کہ اپنے مجموعہ کلام (اگر شائع نہ ہوا ہو تو غیر مطبوعہ نظموں یا غزلوں کے ساتھ مختصر حالات اور عکسی تصویر جلد عنایت کریں۔
تصویروں کی اشاعت کے متعلق مفصل حالات جوابی خط لکھ کر دریافت فرمانا چاہیئے۔

مضامین نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مشاہیر شعراء کے متعلق مضامین اور اپنی تصویر جلد عنایت کریں
مضامین نگار حضرات کی خدمت میں رسالہ بلا معاوضہ حاضر کیا جاتا ہے۔

خریداری کے خواہشمندوں سے درخواست ہے کہ تین روپے آج ہی ارسال فرمائیے ورنہ ہزاروں کی تعداد میں چھپنے کے باوجود پہلی جلد ختم ہو جائے گی اور پھر افسوس ہوگا۔ سالانہ خریداری کی صورت میں سالنامہ اور خاص نمبر مفت پیش کئے جاتے ہیں۔

صاحبان اشتہار کو بھی اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ شرح اشتہارات کے لئے مہتمم اشتہارات سے خط و کتابت کیجئے۔ حدیثِ حسن ملک کے مشہور ناظم شباب حضرت فطرت واسطی کی پچاس ولولہ انگیز نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے جس کی ہر نظم عصر جدید کی غیر فانی شاعری اور رومانی جذبات کا معیاری نمونہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول

منیجر شاہکار بکڈپو گورکھپور

بہت سستا اور بہت اچھا، بڑا سائز، ۱۲ صفحات، رنگین ٹائیٹل

ہفتہ وار اخبار جدت مرادآباد

شمع وطن کا پروانہ، مذہب کا شیدائی۔ اصلاح ملت کا حامی، ہندوستانیوں کے مفاد کا پاسبان، مسلم جذبات کا ترجمان، زمینداروں و غرباء کے حقوق کا نگہبان مشرق و مغرب کے علم و ادب کا نایاب مرقع نہایت آب و تاب کے ساتھ کثیر تعداد میں شائع ہو کر ملک سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔

اس اخبار میں دلکش نظمیں۔ ممالک اسلامی کی خبریں۔ دلچسپ افسانے۔ روحانیات۔ مفرحات۔ اسلامی تعلیمات، مفید معلومات۔ ریاستوں کے حالات سیر و سیاحت، ادب لطیف، معاشرت اور اہم تاریخ اسلام، آرٹیکل اور ٹ۔ ملکی و غیر ملکی تازہ ترین خبروں کے عنوانات ہوتے ہیں۔ اس اخبار کے لئے مایۂ ناز اہل قلم و قابل فخر انشاء پرداز حضرات کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اور یہ اخبار ملک کے بہترین اہل قلم کے دماغی افکار کا نتیجہ ہے۔ یہ اخبار نیا نہیں ہے بلکہ اس کی گیارھویں جلد ہے جو بڑے سائز کے ساتھ رنگین ٹائیٹل، بہترین کتابت، برقی مشین کی نایاب طباعت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

ان اوصاف کے باوجود قیمت صرف تین روپیہ سالانہ اور شش ماہی مقرر کی گئی ہے تاکہ ہر شخص بآسانی خرید سکے لہٰذا آج ہی اخبار کی قیمت بھیجکر آپ اپنے نام یہ اخبار جاری کرا لیجئے۔ مشتہرین کے لئے جدت بہت نفع بخش اخبار ہے ایسے ہی کثیر الاشاعت اور موقر اخبار میں اشتہار دینے سے مشتہرین فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

نئے ایجنٹ صاحبان ایجنسیوں کے لئے درخواست بھیجیں

منیجر اخبار جدت مرادآباد (یوپی) پرنس روڈ

باتصویر ہفتہ وار

معموں کا اخبار

خوشوقت

ناظرین آپ کو بہت پسند آئیگا اور اُسے دیکھکر آپ بھی کہیں گے کہ ایسے اخبار کی ضرورت تھی۔

صرف ایک روپیہ رعایتی سہ ماہی چندہ بھیجکر آپ بالفعل صرف تین مہینے کیلئے "خوشوقت" کے خریدار ہوجائیے۔ دو پرچے دیکھنے کے بعد اگر "خوشوقت" آپ کو ناپسند ہوا تو آپ کا روپیہ بلا تأمل واپس کردیا جائیگا

"خوشوقت" میں اعلیٰ معیار کے چلیپائی (کراس ورڈ) اُردو معموں کے علاوہ بمبئی کے مشہور انگریزی اخبار السٹریٹڈ ویکلی کے انگریزی معموں کی اُردو تشریحات اور حل بھی شائع ہوتے ہیں۔

منیجر اخبار "خوشوقت" دہلی شاہدرہ

سلسلہ منتخباتِ نظمِ اُردو

۱۔ معارف ملت ۲۔ جذباتِ فطرت ۳۔ مناظرِ قدرت

مرتبہ

پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے۔ ال ال بی (علیگ)

وہ حضرات جنھوں نے اُردو شاعری کی ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی داستان سمجھ رکھی ہے اس سلسلہ انتخاب کو ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل نظموں پر وہ سر دھنتے ہیں ان کی ہم پلہ نظمیں خود ان کی زبان میں موجود ہیں شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے۔

معارف ملت (چار حصے)

جلد اوّل۔ حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں۔ قیمت عہ

جلد دوم۔ مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل کی تصویریں۔ قیمت عہ

جلد سوم۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق شعرا کا دلپذیر کلام قیمت عہ

جلد چہارم۔ اخلاق و حکمت کے انمول موتی۔ قیمت عہ

جذباتِ فطرت (چار حصے)

جلد اول۔ میر و سودا کے کلام کا انتخاب۔ قیمت عہ

جلد دوم۔ غالب، ذوق، ظفر اور حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد سوم۔ تقریباً بیس قدیم، مستند اور باکمال شعرا کے کلام کا انتخاب۔ قیمت عہ

جلد چہارم۔ تقریباً سائٹھ جدید شعرا کے کلام کا دلکش انتخاب قیمت عہ

مناظرِ قدرت (چار حصے)

جلد اول متعلق اوقات یعنی صبح، شام، دن، رات، برسات، اور بہار کے دلکش مناظر۔ قیمت عہ

جلد دوم متعلق مقامات یعنی آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل اور عمارات کی صاف ستھری تصویریں قیمت عہ

جلد سوم متعلق نباتات و حیوانات یعنی پھول پھل، کیڑے، پتنگے اور چرند و پرند کا مطالعہ و مشاہدہ۔ قیمت عہ

جلد چہارم متعلق عمرانیات یعنی ہندوستان کا تمدن، رسم و رواج، عید، تیوہار اور میلے ٹھیلوں کے دلچسپ حالات۔ قیمت عہ

مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون کریں گے۔